الفرقان
لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

جلد ۴۱ | بابتہ ماہ محرم الحرام ۱۳۹۳ھ مطابق مارچ ۱۹۷۳ء | شمارہ (۱)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۵ ر اپریل تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر پرو پرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افتتاح جلد چہل و یکم

خدا کا ہزار ہزار شکر کہ الفرقان نے عمر کی وہ منزل طے کر لی جسے انسانی زندگی میں ایک خاص خط فاصل قرار دیتے ہوئے قرآن اس منزل پر ایک سلیم الفطرت انسان کے دل سے اُٹھنے والا ایک عرفانی نغمہ ان الفاظ میں سناتا ہے۔

حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰہُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (الاحقاف ع ۲)

(حتی کہ) جب پہونچا وہ اپنی پختگی کو، یعنی چالیس سال کو کہا اے میرے رب مجھے توفیق دے۔ تیرے اس احسان کا شکر ادا کرنے کی جو تو نے مجھ پر فرمایا اور میرے والدین پر فرمایا۔ اور توفیق دے کہ نیک عمل کروں جو تجھے پسند ہوں۔ اور (اے میرے پروردگار) درستی کر میرے لیے میری اولاد میں، میں رجوع ہوتا ہوں تیری طرف اور میں تیرے فرمانبرداروں میں ہوں!

الفرقان اور اس کا مرتب، جو اب سے چار سال پہلے اس منزل سے گزر چکا ہو، اپنے رب کی اس لطیف ہدایت پر سر شکر جھکاتے اور زبان و حال دونوں میں اس ہدایت سے ہم آہنگی کی توفیق مانگتے ہیں۔ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ۔

اس چالیس سال میں کتنے ہی مضامین اور مقالات الفرقان میں ایسے نکل چکے ہیں جن میں دینی اور فکری رہنمائی کا بڑا سامان ہو اور کچھ ایسے جن کی تاریخی اہمیت ہو، خود ناظرین الفرقان میں بھی اب غالباً زیادہ تر وہ لوگ ہیں جن کی نظر سے یہ نہیں گزرے دوسروں کا تو سوال ہی کیا، اس لیے جی چاہتا ہو کہ ایسے مضامین کا ایک مجموعہ الفرقان کے خاص نمبر کی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ الفرقان کے موجودہ حالات میں اگرچہ یہ ایک مشکل کام ہو کیونکہ یہ بہت ضخیم نمبر ہوگا لیکن ارادہ ہو کہ انشاء اللہ یہ کام اسی سال کے اندر کیا جائے، خدا کرے کہ شائقین اور اپنے ناظرین کا کچھ اچھا تعاون بھی اس سلسلہ میں حاصل ہو جائے۔

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مرکزی قانون کمیشن کے چیرمین اور سابق چیف جسٹس (سپریم کورٹ) ڈاکٹر پی۔ بی گجندر گڈکر نے ایک حالیہ لیکچر میں روایتی قانون اور سماجی تبدیلیوں کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "یکساں سول کوڈ کی طرف پہلے قدم کے طور پر مسلمانوں کے لیے شادی اور طلاق کے (نئے) قوانین بنائے جانے چاہئیں" آپ نے فرمایا کہ "مسلم پرسنل لا ملک کی جمہوری روایات سے میل نہیں کھاتا اور اس میں تبدیلی ایک ناگزیر ضرورت کا درجہ رکھتی ہے" آپ نے اس بارے میں مسلمانوں کی مخالفت کو "اُن کے ایک متشدد مکتب فکر کی مخالفت" بتاتے ہوئے اور اس کی مذمت کرتے ہوئے حیرت ظاہر کی ہے کہ وہ پارلیمنٹ تک کو مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہے، اور اس کا سبب آپ نے "مسلمانوں کی ظلمت پسندی" بتائی ہے۔

مسٹر گجندر گڈکر کے یہ خیالات کچھ نئے نہیں ہیں، سپریم کورٹ سے ریٹائر ہونے کے بعد کئی بار انھوں نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چند ہی سال پہلے انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کانوکیشن ایڈریس میں بھی جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کو نصیحت کی تھی کہ وہ اپنے عام مسلمان بھائیوں کو سمجھائیں کہ شادی اور وراثت وغیرہ کے جو قوانین قرآن دیتا ہے وہ اب برمحل نہیں ہیں۔ اور موصوف کی اس نصیحت سے مسلمانوں کے بزعم خود "جدید دانشوروں" کی کافی ہمت افزائی بھی ہوئی۔

مسٹر گجندر گڈکر تو غیر مسلم ہیں اور اسلامی قوانین پر کسی خصوصی مطالعہ کی شہرت بھی نہیں رکھتے، اُنھیں کے ہم پیشہ مسٹر اے کے فیضی جو مسلمان بھی ہیں اور اسلامی قانون پر سند

مانے جاتے ہیں خود ان کا یہ حال گزشتہ سال الفرقان ہی کے ذریعہ سامنے آچکا ہے کہ وہ اپنی عالمی شہرت کے باوجود اسلامی قانون اور اس کی تاریخ کی بہت سی موٹی موٹی باتوں سے بھی صحیح واقفیت نہیں رکھتے[1]۔ ایسی حالت میں مسٹر گجندر گڈکر سے اسلامی قانون کی صحیح واقفیت کے بارے میں جو توقع کی جا سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔

ان حضرات سے پوچھئے تو سکنڈ ہینڈ (بالواسطہ) مطالعہ کے بارے میں یہ کبھی کہنے کو تیار نہیں ہو سکتے کہ ایسے مطالعہ کی بنیاد پر بھی قطعی اور فیصلہ کن اظہار رائے کا حق کسی شخص کو مل سکتا ہے، لیکن اسلامیات کے بارے میں یہ سبھی حضرات جیسے طے کر چکے ہیں کہ سکنڈ ہینڈ مطالعہ ہی اصلی اور صحیح واقفیت کا ذریعہ ہے اور اس کی بنیاد پر جو سمجھ میں آئے [illegible] بت [illegible] اتھ کہا جا سکتا ہے۔

اب تک کے تجربے اس خوش گمانی کی اجازت تو نہیں دیتے کہ مسٹر گجندر گڈکر نے اسلامی قانون کے ایسے مطالعہ کی جہم سرکی ہو جس کے بعد انھیں قطعی ریمارک کرنے کا حق ہو جاتا ہو۔ لیکن فرض کیجئے کہ ایسا ہے بھی تو کیا اس رعونت کا بھی کوئی حق اس سے پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ظلمت پسندی کی گالی بے تکلف زبان پر آجائے؟ جہاں عدالت عالیہ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس کا یہ حال ہو وہاں کے عام لوگوں کے ہاتھوں اس مسلمان قوم پر جو کچھ بھی گزر جائے کم ہے! وہ آدمی مسلمانوں کے پرسنل لا کو جمہوری روایات سے میل نہ کھانے کا طعنہ دے رہا ہے جس کے خود لب و لہجے اور طرز کلام کا بھی جمہوریت کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں۔ ملک کی ایک پوری قوم کو ظلمت پسند کہہ ڈالنا کونسی جمہوریت کے آداب سے میل کھاتا ہے؟ اسے شاید مسٹر گجندر گڈکر ہی بتا سکیں! ورنہ ہمارے ملک میں تو بعد از خرابی بسیار ہی سہی یہ مان لیا گیا ہے، اور مسلمانوں کے سیاق و سباق ہی میں مانا گیا ہے، کہ من حیث القوم کسی گروہ کو سیاسی گالی بھی دینے کی اجازت جمہوریت کے منافی ہے (مثلاً نا وفادار یا پاکستانی کہنا[2])

افسوس ہے مسلمانوں کے (یعنی خود اپنے) حال پر کہ ملک کا ایک ذمہ دار آدمی، قانون کمیشن کی چیرمینی جیسے عہدۂ جلیلہ پر فائز، اولاً تو مسلمانوں کی ادبی، فکری اور اعتقادی شخصیت پر ایسا

---

[1] الفرقان بابت ماہ مارچ ۷۲ء فیضی صاحب کے مقالے "مسلم پرسنل لا" کا جائزہ۔ از مولانا برہان الدین سنبھلی۔

[2] حکمران کانگرس کے پہلے عام اجلاس (۱۹۶۹ء) کی کارروائی۔

بے باکانہ حملہ کر گزرے اور پھر اسے اس پر کسی معذرت کی بھی ضرورت نہ محسوس ہو! مسٹر گجیندر گڈکر کی ذمہ دارانہ پوزیشن کو دیکھئے، اُن کے ثقافتی مرتبے کو دیکھئے، ملک میں جمہوریت پر فخر کو دیکھئے، کوئی بات بھی مسٹر گجیندر کو اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اس زبان میں کسی قومی اکائی پر اظہار خیال کریں۔ لیکن یہ مسلمانوں کی زبوں حالی ہے کہ ان کے بارے میں کوئی چیز، کسی کو کسی بات سے روکنے والی نہیں، ورنہ اس لیکچر کے بعد مسٹر گجیندر گڈکر کو بلا معذرت کیے، قانون کمیشن کی چیرمینی پر رہنا آسان نہ ہوتا۔

نیز مسلمانوں کی پست حالی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسٹر گجیندر گڈکر، اس طرح کے ریمارک جب تک چاہیں پاس کرتے رہیں۔ مگر کیا انھیں اس کا بھی پتہ ہے کہ جس پارلیمنٹ کو وہ مسلمانوں کے "ظلمت زدہ" گھر میں یکساں سول کوڈ کی قندیل جبریہ روشن کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں وہ اس یکساں سول کوڈ کے مقصد سے کیسے کیسے قوانین کے مسودوں کو اپنے خوردخوض سے مشرف کر رہی ہے؟ حال ہی میں ایک بل متبنّیٰ گیری (ADOPTION OF CHILDREN) کے سلسلے میں حکومت کی طرف سے راجیہ سبھا میں پیش ہوا ہے۔ کیسے سمجھ لیا جائے کہ مسٹر گجیندر گڈکر جب یہ مذکورہ بالا لیکچر دے رہے تھے تو وہ اس بل سے لاعلم تھے، جس میں دقیانوسیت، رواج پرستی اور عقل و انصاف سے روگردانی کے تمام خصائص موجود ہیں؛ —— اس بل میں متبنّیٰ گیری کے بعینہٖ ہندو قانون کو برقرار رکھتے ہوئے کہا گیا ہے کہ متبنّیٰ کا کوئی رشتہ اپنے اصل گھرانے سے باقی نہیں رہے گا (سوائے اس کے کہ شادی کے معاملے میں جو رشتہ دار اس کے محرم ہوتے ہیں یعنی جن سے شادی نہیں ہو سکتی، وہ محرم ہی رہیں گے) اس گھرانے کی کسی وراثت کا حق اُس کے لیے نہیں رہے گا۔ اُس کے ماں باپ اس کے ماں باپ نہیں رہیں گے۔ تمام رشتے تبنّیت (Adoption) کے بعد اُس گھرانے میں منتقل ہو جائیں گے جس میں اس کو متبنّیٰ بنا لیا گیا ہے متبنّیٰ گیر (Adopter) اس کا باپ اور اُس کی بیوی اس کی ماں ہو گی، ان کی وراثت کا وہ مثل اُن کی حقیقی اولاد کے وارث ہو گا۔

یہ ہے اُس روشنی کا ایک نمونہ جسے ہماری سیکولر اور سوشلسٹ حکومت ہندو سماج سے نکال کر مسلم سماج اور دیگر اقلیتی سماجوں کو بھی عطا کرنے کے لیے سوچ رہی ہے، اور پارلیمنٹ نے بھی اسے غوروخوض کے لیے بخوشی قبول کر لیا ہے۔ کیا یہ بات عقلیت، سماجی انصاف، معاشرہ کی تجدید (Modernization) اور دقیانوسیت کو رد کرنے کی جیسی کسی اُس بات سے بھی میل کھاتی ہے جس کے مسٹر گجیندر گڈکر علمبردار ہیں اور جسے وہ ہماری پارلیمنٹ کی اصل فطرت سمجھ کر اُسے مشورہ دے رہے ہیں کہ مسلمانوں کے

"تاریک" سماج کو بھی اپنی نور افزا بنیادوں پر استوار کرنے کی خدمت انجام دے؟ ایک بے اولاد شخص کو ضرورت ہو سکتی ہے کہ وہ کسی دوسرے کے بچے کو گود لے لے، لیکن ایسا ہونے پر اُس بچے کو اپنے اصل ماں باپ سے کاٹ دینا، اُن کی وراثت سے محروم کر دینا، دوسری تمام رشتہ داریاں القط کر دینا کسی دورِ ظلمت میں پسند کی جانے والی باتیں ہوں تو ہوں ہمارے ترقی پسند اور عقلیت پرست دور سے ان باتوں کا کیا جوڑ؟ زیادہ سے زیادہ کوئی خاص مذہبی فلسفہ ان باتوں کا جواز پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن ایک سیکولر حکومت کا نہ صرف اس خاص مذہبی سماج میں ان باتوں کو روا رکھنا بلکہ دوسرے سماجوں تک بھی ان کو وسیع کرنے کی بات سوچنا، سیکولرازم کو ایک مذہب کی سرپرستی کی خوبصورت آڑ بنا لینے کے سوا اور کیا کہلانے کا مستحق ہے؟ یہ بل جب سامنے آیا تو حیرت ہو گئی کہ سیکولرازم کے جھنڈے تلے ایسی شرمناک حد تک کھلی ہوئی غیر سیکولر قانون سازی بھی ہو سکتی ہے اور یہ بدگمانی سو فی صدی حقیقت شناسی پر مبنی نظر آنے لگی کہ یکساں سول کوڈ کا منصوبہ اکثریت کے خاص رنگ میں سب کو رنگ لینے کے سوا اور کوئی اصل غرض و غایت اپنے پیچھے نہیں رکھتا۔ مگر حیرت اور اذیت کے باوجود یہ شاید اچھا ہی ہوا کہ حکومت اور پارلیمنٹ نے اپنا بھرم خود اپنے ہی ہاتھوں کھول دیا۔ اب اس حسرت کا بوجھ اٹھانے کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ ؎

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

تو کیا ارشاد ہے ہمارے سابق چیف جسٹس کا اس اڈاپشن بل کے بارے میں، جسے ہماری سیکولر اور ترقی پسند حکومت نے یکساں سول کوڈ کی طرف ایک قدم کے طور پر پارلیمنٹ کے سامنے رکھا ہے اور پارلیمنٹ نے اس پر غور کرنا منظور کیا ہے؟ کیا یہ ظلمتیں دور کرنے والا قدم ہے؟ اس سے عقلیت پسندی کو قوت ملے گی؟ جمہوری روایات کو فروغ ہوگا؟ حقیقت پسندانہ زاویۂ نظر قوم میں پیدا ہوگا؟ ترقی پسند سماج وجود میں آئے گا؟ یا عہدِ ظلمت کا احیاء ہوگا؟ عقلیت کی تحریک چوٹ کھائے گی؟ جمہوریت شخصی مفادات کی بیڑیوں میں کسے گی، حقیقت کی جگہ خرافات کا اور ترقی پسندی کی جگہ رجعت پسندی کا بول بالا ہوگا؟

یہ بل اپنی ضرورت کے سلسلے میں بتاتا ہے کہ سماج کے لاوارث، آوارہ گرد اور ضرورتمند بچوں کا مسئلہ حل کرنا ہو، لیکن اس کی دفعات بولتی ہیں کہ ایسے بچوں کے مفاد سے درحقیقت کوئی مطلب نہیں،

صرف ایک ہندو رواج کو زمانے کے ایک قابلِ قبول عنوان سے دوسرے سماجوں میں بھی داخل کر دینا ہو۔ البتہ اس میں جو کھلی مضرتیں، زمانے کے اخلاقی بگاڑ اور کچھ نئے حالات سے پیدا ہو گئی ہیں ان کے پیشِ نظر کچھ نئی قانونی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ ورنہ جس قسم کے بچوں کی ضرورت کا نام اس میں لیا گیا ہے اُن کی ضرورت کی تکمیل سے اسے کوئی سروکار نہیں!

مگر کیوں اس پر تعجب کیا جائے کہ مسٹر گجندر گڈکر قانون سازی کے سلسلے میں حکومت اور پارلیمنٹ کے اس قسم کے عملی رجحانات کے باوجود مسلمانوں پر برہم ہو رہے ہیں کہ وہ انھیں پرسنل لا میں ترمیم کا حق کیوں نہیں دیتے! مسٹر گجندر گڈکر نے تو خود اسی لیکچر میں، علاوہ ان کے غیر جمہوری لب و لہجے کے، یہ تجویز بھی بڑی شد و مد سے موجود ہے کہ دستور سے مذہبی تبلیغ کی آزادی اور تبدیلیِ مذہب کا حق نکال دیا جائے۔ وہ اس آزادی کی خرابیاں گناتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اسی آزادی سے یہاں اقلیتیں وجود میں آئی ہیں" اور یہ کہ "یہ آزادی مذاہب کی برابری کے دستوری حق کے خلاف ہے" ـــــ تو جس شخص کو یہاں اقلیتوں کا وجود اچھا نہیں لگتا اور جو مذہبی تبلیغ اور تبدیلی کی آزادی میں اکثریت کے مذہب کا خسارہ دیکھ کر اس آزادی کو ختم کر دینے کا خواہاں ہو اس کی نظر میں اس اڈاپشن بل میں کیا برائی ہو سکتی ہے! پارلیمنٹ کے زیرِ غور بل اور مسٹر گجندر گڈکر کی یہ تقریر دونوں اس بات کا آخری درجہ کا ثبوت ہیں کہ یکساں سول کوڈ کی "ترقی پسندانہ" باتوں کے پیچھے مسلمانوں کو ہندو بنانے کے سوا کوئی دوسری فکر کام نہیں کر رہی ہے۔ ورنہ اگر یہ فکر حقیقت پسندی کی، عقل و فطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگی کی اور سماجی زندگی کو واقعی سہولت و انصاف کے تقاضوں پر استوار کرنے کی ہوتی تو مسلمان اس یکساں سول کوڈ کی تحریک کا چیلنج اس اعتماد کے ساتھ قبول کر سکتے تھے کہ ان کی شریعت کے معاشرتی قوانین کے سوا کوئی اور قوانین اس معیار کے نہیں مل سکتے۔ بالکل تازہ مثال اس اعتماد کو حوصلہ بخشنے والی یہ موجود ہے کہ ہندو کوڈ میں طلاق کے بعد دوسری شادی کی مدت کم سے کم ایک سال رکھی گئی تھی مگر چند سال کے تجربے کے بعد لوگ چیخ پڑے ہیں اور اب یہ سوچا جا رہا ہے کہ یہ مدت گھٹا کر تین ماہ کر دی جائے[1] جو عورتوں کی حد تک تو گویا قرآن والی ہی مدت ہے[2] ـــــ لیکن اسکو کیا کیجئے کہ ایسی باتیں فطرت کی تعزیریں بھگتنے کے بعد ہی سوجھتی ہیں۔ ورنہ یا تو خدا اور اسکے پیغمبر سے متکبرانہ بے نیازی کے تحت "اندھا دھند تجربوں" کی طرف طبیعت جاتی ہے، یا پھر احیائی ذہنیت فرسودہ قوانین ہی کو کچھ میک اپ کے ذریعہ اس زمانے میں بھی چلانے کی سجھاتی ہے جس کے بعد کوئی راستہ مسلمانوں کیلئے اسکے سوا نہیں رہتا کہ وہ اس یکساں سول کوڈ سے معافی چاہیں۔

---

[1] ۲۰ فروری کے اخبارات میں یہ خبر آ چکی ہے۔ [2] قرآن میں تین حیض (یا تین طہر) مدت ٹھہرائی گئی ہے۔

كتاب المعاشرة والمعاملات

مَعَارِفُ الحَدِيث

(مُسلسل)

نکاح و ازدواج اور اُس کے متعلّقات

[اس سلسلہ کی اس سے پہلی قسط اب سے قریباً ایک سال پہلے صفر ۱۳۹۲ھ کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی۔ اُس کے بعد سے دو طویل بیرونی سفر پیش آئے اور ان کے علاوہ بھی حالات ایسے رہے کہ اس سلسلہ کی کوئی قسط مرتب نہ ہو سکی، اتنے طویل وقفہ کے بعد اب پھر یہ سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ تسلسل کے ساتھ جاری رہ کر تکمیل کو پہونچے۔]

نکاح اور شادی کا طریقہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں عربوں میں مرد و عورت کے باہمی تعلق اور اولاد سے متعلق کئی طریقے اور ضابطے رائج تھے، اُن میں سے بعض نہایت گندے اور شرمناک تھے۔ ایک طریقہ اصولی طور پر صحیح اور شریفانہ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی اصلاح فرما کر بس اسی کو باقی رکھا اور دوسرے سارے طریقے یکسر ختم فرما دیئے اور اُن کو سنگین گناہ اور جرم قرار دیا ــــــ

آپ نے اپنے طرز عمل اور ارشادات سے نکاح و شادی کا جو عمومی طریقہ مقرر فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ مرد کی طرف سے عورت کے اولیاء اور سرپرستوں کو پیام دیا جائے اور رشتہ کی طلب و استدعا کی جائے، وہ اگر رشتہ کو مناسب اور قرین مصلحت سمجھیں تو عورت کے عاقلہ بالغہ اور صاحب رائے

ہونے کی صورت میں اس کی مرضی معلوم کر کے اور کمسن ہونے کی صورت میں اپنی مخلصانہ اور خیر خواہانہ صوابدید کے مطابق رشتہ منظور کریں اور نکاح کر دیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہی طریقہ فطرت و حکمت کے عین مطابق ہے۔

نکاح و شادی کی اصل ذمہ داریاں چونکہ منکوحہ عورت پر عائد ہوں گی اور وہی ساری عمر کے لیے اُن کی پابند ہو گی اس لیے اس کی رائے اور رضامندی لینا بھی ضروری قرار دیا گیا ہے، اور اس کے نفس کا اصل مختار خود اسی کو قرار دیا گیا ہے، ولی اور سرپرست کو حق نہیں ہے کہ اُس کی مرضی کے خلاف کسی سے اس کا نکاح کر دے ـــــ اسی کے ساتھ عورت کے شرف نسوانیت کی رعایت سے ہدایت فرمائی گئی کہ معاملہ اولیاء اور سرپرستوں ہی کے ذریعہ طے ہو اور وہی عقد نکاح کرنے والے ہوں۔ یہ بات عورت کے مقام شرف کے خلاف ہے کہ کسی کی بیوی بننے کا معاملہ وہ خود براہ راست طے کرے اور خود سامنے آکر اپنے کو کسی کے نکاح میں دے ـــــ علاوہ ازیں چونکہ کسی لڑکی کے نکاح کے کچھ اثرات اُس کے خاندان پر بھی پڑتے ہیں اس وجہ سے بھی اولیاء (خاندانی بزرگوں) کو کسی درجہ میں دخیل قرار دیا گیا ہے ـــــ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر سارا معاملہ عورت ہی کے ہاتھ میں دے دیا جائے اور اولیاء بے تعلق رہیں تو اس کا بہت زیادہ امکان ہے کہ بیچاری عورت دھوکہ کھا جائے اور کسی کے دام فریب میں آکر خود اپنے حق میں غلط فیصلہ کر لے، ان سب وجوہ کی بنا پر ضروری قرار دیا گیا ہے کہ (خاص استثنائی صورتوں کے علاوہ) نکاح و شادی اولیاء ہی کے ذریعہ ہو۔

نکاح و شادی کے سلسلہ میں ایک رہنمائی یہ بھی فرمائی گئی ہے کہ جس عورت سے نکاح کرنے کا ارادہ ہو وہ اگر دیکھی بھالی بالکل نہ ہو تو اگر ہو سکے تو پیام دینے سے پہلے ایک نظر دیکھ لیا جائے تاکہ بعد میں کوئی خرخشہ پیدا نہ ہو (یہ مقصد ایک درجہ میں قابل اعتماد عورتوں کے دیکھنے سے بھی پورا ہو سکتا ہے)

ایک ہدایت یہ بھی فرمائی گئی کہ اگر کسی عورت سے نکاح کے لیے کسی دوسرے مرد کی طرف سے پیام دیا جا چکا ہے تو جب تک اس کے لیے انکار نہ ہو جائے اور بات ٹوٹ نہ جائے اس کے لیے پیام نہ دیا جائے ـــــ اس کی حکمت ظاہر ہے۔

نکاح کے لیے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ خفیہ نہ ہو، کچھ لوگوں کی موجودگی میں علانیہ ہو جو اس کے شاہد اور گواہ ہوں، بلکہ بہتر بتایا گیا ہے کہ مسجد میں ہو، ــــــ اسی طرح نکاح کے موقعہ پر خطبہ بھی مسنون ہے۔

مرد کی طرف سے عورت کے لیے مہر کا نذرانہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے

ان سب امور اور نکاح کے دوسرے متعلقات سے متعلق احادیث ذیل میں پڑھیے!

مرد عورت کے جوڑ ملاپ اور اس سے پیدا ہونے والی اولاد کے بارے میں زمانۂ جاہلیت کے طریقے اور ضابطے:۔

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النِّكَاحَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ كَانَ عَلٰى اَرْبَعَةِ اَنْحَاءٍ فَنِكَاحٌ مِنْهَا نِكَاحُ النَّاسِ الْيَوْمَ يَخْطُبُ الرَّجُلُ اِلَى الرَّجُلِ وَلِيَّتَهُ اَوْ اِبْنَتَهُ فَيُصْدِقُهَا ثُمَّ يَنْكِحُهَا وَنِكَاحٌ اٰخَرُ كَانَ الرَّجُلُ يَقُولُ لِامْرَأَتِهِ اِذَا طَهُرَتْ مِنْ طَمْثِهَا اَرْسِلِي اِلٰى فُلَانٍ فَاسْتَبْضِعِي مِنْهُ وَيَعْتَزِلُهَا زَوْجُهَا وَلَا يَمَسُّهَا اَبَدًا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ حَمْلُهَا مِنْ ذٰلِكَ الرَّجُلِ الَّذِي تَسْتَبْضِعُ مِنْهُ فَاِذَا تَبَيَّنَ حَمْلُهَا اَصَابَهَا زَوْجُهَا اِذَا اَحَبَّ وَاِنَّمَا يَفْعَلُ ذٰلِكَ رَغْبَةً فِي نَجَابَةِ الْوَلَدِ فَكَانَ هٰذَا النِّكَاحُ نِكَاحَ الْاِسْتِبْضَاعِ، وَنِكَاحٌ اٰخَرُ يَجْتَمِعُ الرَّهْطُ مَا دُونَ الْعَشَرَةِ فَيَدْخُلُونَ عَلَى الْمَرْأَةِ كُلُّهُمْ يُصِيبُهَا فَاِذَا حَمَلَتْ وَوَضَعَتْ وَمَرَّ عَلَيْهَا لَيَالٍ بَعْدَ اَنْ تَضَعَ حَمْلَهَا اَرْسَلَتْ اِلَيْهِمْ فَلَمْ يَسْتَطِعْ رَجُلٌ اَنْ يَمْتَنِعَ حَتّٰى يَجْتَمِعُوا عِنْدَهَا، تَقُولُ لَهُمْ قَدْ عَرَفْتُمُ الَّذِي كَانَ مِنْ اَمْرِكُمْ وَقَدْ وَلَدْتُ فَهُوَ اِبْنُكَ يَا فُلَانُ تُسَمِّي مَنْ اَحَبَّتْ بِاسْمِهِ فَيَلْحَقُ بِهِ وَلَدُهَا وَلَا يَسْتَطِيعُ اَنْ يَمْتَنِعَ مِنْهُ الرَّجُلُ وَالنِّكَاحُ الرَّابِعُ يَجْتَمِعُ النَّاسُ الْكَثِيرُ فَيَدْخُلُونَ عَلَى الْمَرْأَةِ لَا تَمْتَنِعُ مِمَّنْ جَاءَهَا وَهُنَّ الْبَغَايَا كُنَّ يَنْصِبْنَ عَلٰى اَبْوَابِهِنَّ رَايَاتٍ

تکون علما فمن اراد هن دخل علیهن فاذا حملت احداهن ووضعت حملها جمعوا لها ودعوا لهم القافة ثم الحقوا ولدها بالذی یرون فالتاط به ودعی ابنه لا یمتنع من ذالک — فلما بعث محمد صلی الله علیه وسلم بالحق هدم نکاح الجاهلیة کله الا نکاح الناس الیوم — رواہ البخاری

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے (انھوں نے بیان فرمایا) کہ زمانۂ جاہلیت میں نکاح (یعنی مرد و عورت کے جوڑ ملاپ اور اس سے پیدا ہونے والی اولاد سے متعلق) چار طریقے رائج تھے۔ ان میں سے ایک طریقہ تو وہ تھا جو (اصولی طور پر) آج بھی رواج میں ہے کہ ایک آدمی کی طرف سے دوسرے آدمی کو اس کی بیٹی یا اس کی زیر ولایت لڑکی کے لیے نکاح کا پیام دیا جاتا ہے پھر وہ مناسب مہر مقرر کر کے اس لڑکی کا نکاح اس آدمی سے کر دیتا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ کسی آدمی کی بیوی جب حیض سے پاک ہوتی (اس وقت عورت میں حاملہ ہونے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے) تو وہ (کسی بڑی شان والے آدمی کے بارے میں) خود اپنی بیوی سے کہہ دیتا کہ تو اس آدمی کو بلا کر اس سے نیوگ کر لے (یعنی اس سے تعلق قائم کر لے، اور اس کی صحبت سے حمل حاصل ہونے کی کوشش کر) اور پھر وہ شوہر اپنی بیوی سے خود اس وقت تک الگ رہتا جب تک کہ اس دوسرے آدمی سے حمل قرار پاتا، پھر جب اس کے حمل کے آثار ظاہر ہو جاتے تو اس کے بعد یہ شوہر حسب خواہش اپنی بیوی سے صحبت کرتا۔ اور یہ سب کچھ اس غرض سے کرتا کہ لڑکا نجیب (بڑی شان والا) پیدا ہو، اور اس طریقہ کو "نکاح استبضاع" کہا جاتا تھا۔[1]

---

[1] یہ شرمناک طریقہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے بعض پست قبیلوں میں رائج تھا۔ اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک پست سطح کا آدمی چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا مثلاً بہادر اور شہسوار ہو یا شکیل و جمیل اور قد آور ہو تو وہ کسی ایسے آدمی کے متعلق جو ان صفات میں ممتاز ہوتا اپنی بیوی سے کہتا کہ تو اس آدمی سے تعلق قائم کرلے تاکہ اس کا حمل قرار پا جائے اور پھر (باقی اگلے صفحہ پر)

اور ایک "اور (تیسرا) طریقہ یہ تھا کہ چند آدمیوں کی ایک ٹولی (روایت میں "رھط" کا لفظ ہے جو دس سے کم کے لیے بولا جاتا ہے) ایک عورت کے پاس پہونچتی اور اُن میں سے ہر ایک اُس سے صحبت کرتا (اور یہ سب باہمی رضامندی سے ہوتا) پھر اگر وہ عورت حاملہ ہوجاتی اور بچہ پیدا ہوتا تو چند روز کے بعد وہ اُن سب آدمیوں کو بلواتی (اور دستور کے مطابق) کسی کے لیے بھی اس کی گنجائش نہ ہوتی کہ وہ نہ آئے۔ اس لیے سب ہی پہونچ جاتے تو وہ کہتی کہ جو کچھ ہوا تھا وہ تمھیں معلوم ہے اور (اُس کے نتیجہ میں) میرے یہ بچہ پیدا ہوا اور پھر وہ ان میں سے جس کو چاہتی نامزد کر کے کہتی کہ اے فلانے یہ تیرا لڑکا ہے ـــ پھر وہ لڑکا اسی کا مان لیا جاتا تھا اور وہ آدمی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ (یہ تیسرا طریقہ تھا)

اور چوتھا طریقہ یہ تھا کہ ایک عورت سے بہت سے لوگوں کا جنسی تعلق ہوتا۔ کسی کے لیے کوئی روک ٹوک نہ ہوتی، یہ پیشہ ور رنڈیاں ہوتی تھیں، ان کے گھروں کے دروازوں پر بطور علامت کے ایک نشان نصب ہوتا تھا جو کوئی بھی چاہتا ان کے پاس پہونچ جاتا، تو جب ان میں سے کسی کو حمل رہ جاتا اور پھر بچہ پیدا ہوتا تو اس سے تعلق رکھنے والے یہ سب لوگ جمع ہوجاتے اور قیافہ شناسی کے ماہرین بلائے جاتے، پھر وہ (اپنی قیافہ شناسی سے) اس بچہ کو جس کے نطفہ سے سمجھتے اسی کا لڑکا قرار دے دیتے اور بس وہ اس سے چپک جاتا اور اسی کا بیٹا کہا جاتا، وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا ـــ (ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے زمانۂ جاہلیت کے یہ سب طریقے بیان کرنے کے بعد فرمایا) پھر جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین حق کے ساتھ مبعوث ہوئے تو آپ نے جاہلیت کے ان سب (شرمناک اور حیا سوز) مروج طریقوں کو یکسر مٹا دیا۔ اور نکاح و شادی کا بس وہی (پاکیزہ) طریقہ رہ گیا جو اب جاری ہے۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بیٹا انہی صفات کا اور اسی طرح کا پیدا ہو" اور خود اس وقت تک بیوی سے الگ رہتا جب تک کہ اس دوسرے آدمی سے حمل قرار پاتا ـــ عربی میں اس کو "استبضاع" کہا جاتا ہے، ہم نے اس کا ترجمہ "نیوگ" کیا ہے۔ ہندو معاشرہ میں نیوگ کا رواج رہا ہے۔ اور اس کو جائز اور درست سمجھا جاتا ہے، اس کی صورت بھی قریب قریب یہی ہوتی ہے۔ اس کی تفصیلات کے لیے بانی آریہ سماج سوامی دیانند سرسوتی کی "ستیارتھ پرکاش" کا مطالعہ کیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب کیسی گندگیوں اور تاریکیوں میں تھے، اور پھر آپ کی ہدایت اور تعلیم و تربیت نے اُن کو آسمانِ ہدایت کا چاند اور سورج بنا دیا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ عبدك ونبیك رسول الرحمہ مخرج الناس من الظلمات الی النور باذنك و بارك وسلم۔

جس عورت سے نکاح کرنے کا ارادہ ہو اس کو ایک نظر دیکھ لینا گناہ نہیں، بلکہ بہتر ہے:۔

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ مَسْلَمَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَلْقَی اللّٰهُ فِی قَلْبِ امْرِءٍ خِطْبَةَ امْرَأَةٍ فَلَا بَأْسَ أَنْ یَّنْظُرَ إِلَیْهَا۔

—— رواہ احمد و ابن ماجہ

حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی آدمی کے دل میں کسی عورت کے لیے نکاح کا پیام دینے کا خیال ڈالے تو اس کے واسطے گناہ نہیں ہے کہ ایک نظر اس کو دیکھ لے۔

(مسند احمد، سنن ابن ماجہ)

عَنِ الْمُغِیْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ خَطَبْتُ امْرَأَةً فَقَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هَلْ نَظَرْتَ إِلَیْهَا؟ قُلْتُ لَا، قَالَ فَانْظُرْ إِلَیْهَا فَإِنَّهُ أَحْرٰی أَنْ یُّؤْدَمَ بَیْنَكُمَا —— رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجہ

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ایک خاتون کے لیے نکاح کا پیام دیا (یا پیام دینے کا ارادہ کیا) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ تم نے اس کو دیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں نے دیکھا تو نہیں ہے تو آپ نے فرمایا، ایک نظر دیکھ لو، یہ اس مقصد کے لیے زیادہ مفید ہوگا کہ تم دونوں میں الفت و محبت اور خوش گواری رہے۔

(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کا مقصد یہی ہے کہ نکاح و شادی کا

مسئلہ بہت اہم ہے ساری عمر کے لیے ایک فیصلہ اور معاہدہ ہے، یہ مناسب نہیں کہ یہ معاملہ ناواقفی و بے خبری کے ساتھ اندھیرے میں ہو، بلکہ واقفیت اور بصیرت کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ قابل اعتماد لوگوں اور خاصکر عورتوں کے ذریعہ بھی صحیح معلومات حاصل ہو سکتے ہیں، جو بھی ذریعہ اختیار کیا جائے اس کا بہرحال لحاظ رکھا جائے کہ عورت کو یا اس کے گھر والوں کو گرانی اور ناگواری نہ ہو، بلکہ اچھا ہے کہ ان کو خبر بھی نہ ہو، سنن ابی داؤد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا یہ بیان مروی ہے کہ میں نے ایک عورت کے لیے نکاح کا پیام دینے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کے مطابق میں چھپ چھپ کر اس کو دیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اس میں کامیاب ہو گیا پھر میں نے اس سے نکاح کر لیا۔

پیام پر دوسرا پیام نہ دیا جائے :۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَخْطِبُ الرَّجُلُ عَلَى خِطْبَةِ أَخِيهِ حَتَّى يَنْكِحَ أَوْ يَتْرُكَ۔

——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص ایسا نہ کرے کہ اپنے دوسرے بھائی کے پیام نکاح کے مقابلہ میں اپنا پیام دے، تاآنکہ وہ نکاح کر لے یا چھوڑ دے اور بات ختم ہو جائے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی عورت سے نکاح کے لیے اپنا پیام دے دیا ہو تو جب تک کہ ادھر کا معاملہ ختم نہ ہو جائے کسی دوسرے آدمی کے لیے درست نہیں کہ وہ اپنا پیام وہیں کے لیے دے، ظاہر ہے کہ یہ بات پہلے پیام دینے والے آدمی کے لیے ایذا اور ناگواری کا باعث ہوگی اور ایسی باتوں سے بڑے فتنے پیدا ہو سکتے ہیں۔

نکاح کے معاملے میں عورت کی مرضی اور ولی کا مقام :۔

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الثَّيِّبُ

اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا وَالْبِكْرُ يُسْتَاذِنُهَا اَبُوْهَا فِیْ نَفْسِهَا وَاِذْنُهَا صُمَاتُهَا۔ ——— رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شوہر دیدہ عورت کا اپنے نفس کے بارے میں اپنے ولی سے زیادہ حق اور اختیار ہے اور باکرہ (کنواری) کے باپ کو بھی چاہیے کہ اُس کے نکاح کے بارے میں اس کی اجازت حاصل کرے اور اس کی خاموشی بھی اجازت ہے۔ (صحیح مسلم)

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُنْكَحُ الْاَيِّمُ حَتّٰى تُسْتَامَرَ وَلَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتّٰى تُسْتَاذَنَ، قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ اِذْنُهَا؟ قَالَ اَنْ تَسْكُتَ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شوہر دیدہ عورت کا اس وقت تک نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اُس سے دریافت نہ کیا جائے۔ اور باکرہ (کنواری) لڑکی کا نکاح بھی اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے ——— صحابہ نے عرض کیا اُس کی اجازت کا طریقہ کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ (دریافت کرنے پر) اُس کا خاموش ہو جانا (اس کی اجازت سمجھا جائے گا)۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) اَیّم کے اصل معنی ہیں بے شوہر والی عورت، لیکن اس حدیث میں اس سے مراد ایسی عورت ہے جو شادی اور شوہر کے ساتھ رہنے کے بعد بے شوہر کی ہو گئی ہو، خواہ شوہر کا انتقال ہو گیا ہو یا اُس نے طلاق دے دی ہو۔ (اسی کو حضرت عبداللہ بن عباس کی اوپر والی حدیث میں "ثیب" کہا گیا ہے ——— ایسی عورت کے بارے میں ان دونوں حدیثوں میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اس کی رائے اور مرضی معلوم کیے بغیر اُس کا نکاح نہ کیا جائے، یعنی یہ ضروری ہے کہ وہ زبان سے یا واضح اشارہ سے اپنی رضامندی ظاہر کرے، اس حدیث کے لفظ "حَتّٰى تُسْتَامَرَ" کا یہی مطلب ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں "بکر" سے مراد وہ کنواری لڑکی ہے جو عاقل بالغ تو ہو لیکن شوہر دیدہ نہ ہو۔ اُس کے بارے میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اس کا نکاح بھی اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے، لیکن ایسی لڑکیوں کو حیا و شرم کی وجہ سے چونکہ زبان یا اشارہ سے اجازت دینا مشکل ہوتا ہو اس لیے

دریافت کرنے اور اجازت مانگنے پر ان کی خاموشی کو بھی اجازت قرار دے دیا گیا ہے۔

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ کسی عاقل بالغ عورت کا نکاح خواہ وہ شوہر دیدہ ہو یا کنواری ہو اُس کی مرضی اور اجازت کے بغیر اس کا ولی نہیں کر سکتا، ہاں اگر کوئی لڑکی صغیر السن ہے ابھی نکاح شادی کے بارے میں سوچنے سمجھنے کے لائق نہیں ہے اور کوئی بہت اچھا رشتہ سامنے ہو اور خود لڑکی کی مصلحت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کا نکاح کر دیا جائے تو ولی (جو خیر خواہی کا ذمہ دار ہے) اپنی خیر خواہانہ صوابدید کے مطابق نکاح کر سکتا ہے ——— صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی حضرت عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا) کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف اپنی صوابدید کے مطابق اس وقت کر دیا تھا جب کہ ان کی عمر ۶-۷ سال کی تھی[ل]۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسیٰ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا نِکَاحَ اِلَّا بِوَلِیٍّ ——— رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجہ والدارمی

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ولی کے بدون نکاح نہیں ——— (مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی)

(تشریح) حدیث کا مقصد و مدعا بظاہر یہ ہے کہ نکاح ولی ہی کے ذریعہ ہونا چاہیے۔ عورت کے لیے یہ ٹھیک نہیں ہے کہ وہ خود اپنا نکاح کرے۔ یہ اُس کے شرف اور مقام حیا کے بھی خلاف ہے اور اس سے خرابیاں پیدا ہونے کا زیادہ اندیشہ ہے۔ ہاں جیسا کہ مندرجہ بالا حدیثوں سے معلوم ہو چکا اپنے بارہ میں اصل اختیار عورت ہی کا ہے۔ ولی اس کی مرضی اور رائے کے خلاف اس کا نکاح نہیں کر سکتا۔

ضروری ہے کہ نکاح چوری چھپے نہ ہو علانیہ ہو:-

عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَعْلِنُوْا

ل اس نکاح میں فریقین کے لیے بڑی مصلحتیں اور برکتیں تھیں، حضرت ابوبکر صدیق حضور پر سب سے پہلے ایمان لائے اور ایسی قربانیاں دیں اور صحبت و رفاقت کا ایسا حق ادا کیا کہ وفات سے کچھ پہلے حضورؐ نے فرمایا کہ میرے ساتھ جس نے جو احسان کیا تھا یا جو خدمت کی تھی میں نے سب کا بدلہ دے دیا۔ لیکن ابوبکر کی خدمات کا بدلہ نہیں دے سکا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کی کم عمری کے باوجود اُن سے نکاح اس لیے بھی کر لیا تھا کہ ابوبکر سے قرابت کا بھی خاص لحاظ تعلق ہو جائے اور ان کا اور اُن کے گھر والوں کا جی خوش ہو۔ اس نکاح میں جو اور مصلحتیں اور برکتیں تھیں اُن پر مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے ۱۲

هٰذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوهُ فِي الْمَسَاجِدِ وَاضْرِبُوا عَلَيْهِ بِالدُّفُوفِ ـــــ
ـــــــــــــــ رواہ الترمذی

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

نکاح بالاعلان کیا کرو اور مسجدوں میں کیا کرو، اور دف بجوایا کرو۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کا مقصد بظاہر یہی ہے کہ نکاح چوری چھپے نہ ہو اس میں بڑے مفاسد کا خطرہ ہے لہٰذا بالاعلان کیا جائے۔ اور اس کے لیے آسان اور بہتر یہ ہو کہ مسجد میں کیا جائے، مسجد کی برکت بھی حاصل ہو گی اور لوگوں کو جمع کرنے جوڑنے کی زحمت بھی نہ ہو گی، گواہوں شاہدوں کی شرط بھی آپ سے آپ پوری ہو جائے گی۔

حضورؐ کے زمانے میں نکاح و شادی کی تقریب کے موقع پر دف بجانے کا رواج تھا۔ اور بلاشبہ اس تقریب کا تقاضہ ہے کہ بالکل خشک نہ ہو، کچھ تفریح کا بھی سامان ہو اس لیے آپ نے دف بجانے کی اجازت بلکہ ایک گونہ ترغیب دی۔

نکاح کے لیے شہادت ضروری:۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْبَغَايَا الَّتِي يُنْكِحْنَ اَنْفُسَهُنَّ بِغَيْرِ بَيِّنَةٍ ـــــــــــ رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عورتیں اپنا نکاح شاہد گواہ کے بغیر (چوری چھپے) کرلیں وہ حرامکار ہیں۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث کو امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عباس سے مرفوعاً بھی روایت کیا ہے، جس طرح کہ یہاں نقل کیا گیا ہے، اور موقوفاً بھی روایت کیا ہے، یعنی یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں بلکہ خود حضرت ابن عباس کا قول اور فتویٰ ہے۔ اور سند کے لحاظ سے اسی کو ترجیح دی ہے۔ لیکن اگر یہ حضرت ابن عباس کا قول بھی ہو تو ظاہر ہے کہ وہ حضورؐ سے سنے بغیر ایسی بات اپنی طرف سے نہیں کہہ سکتے اس لیے فقہا اور محدثین کے مسلمہ اصول پر یہ مرفوع ہی کے

حکم میں ہے۔ اسی وجہ سے اُمت کے قریب قریب تمام ائمہ مجتہدین اس پر متفق ہیں کہ شہادت نکاح کے شرائط میں سے ہو جس کے بغیر نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا۔

خطبۂ نکاح :-

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ عَلَّمَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُطْبَةَ الْحَاجَةِ اَنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا مَنْ يَّهْدِى اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِىَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝ ——— رواہ ابو داؤد واللفظ لہ، واحمد، والترمذی والنسائی وابن ماجہ ——— وروی فی شرح السنۃ عن ابن مسعود فی خطبۃ الحاجۃ من النکاح وغیرہ۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو (نکاح وغیرہ) ہر اہم ضرورت (اور موقع) کے لیے یہ خطبہ تعلیم فرمایا ——— "الحمد للہ نستعینہ ونستغفرہ ...... فقد فاز فوزاً عظیماً" (ساری حمد و ستائش اللہ ہی کے لیے سزاوار ہے، ہم (اپنی سب ضرورتوں اور تمام مقاصد میں) اسی سے مدد کے طالب اور خواستگار ہیں، اور اسی سے (اپنے قصوروں اور گناہوں کی) معافی اور مغفرت کی استدعا کرتے ہیں۔ اور اپنے نفس کی شرارتوں سے اسی اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اللہ جس کو ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا، اور جس کے لیے اللہ ہدایت سے محرومی کا فیصلہ فرما دے اس کو کوئی ہدایت یاب نہیں کر سکتا، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت اور پرستش کے لائق نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور رسول برحق ہیں ——— اے ایمان والو اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ

نے کر تم باہم سوال کرتے ہو اور قرابتوں کی حق تلفی سے ڈرو، اللہ تم پر نگہبان ہے (تمہارے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے) ۔۔۔ اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم اس کے فرمانبردار ہو ۔۔۔ اے ایمان والو اللہ سے ڈرتے رہو اور ہمیشہ سیدھی صحیح بات بولو، وہ تمہارے اعمال درست فرما دے گا اور تمہارے گناہ قصور معاف کر دے گا، اور جو بندہ حکموں پر چلے اللہ اور اس کے رسول کے تو اس نے بڑی کامیابی حاصل کر لی۔ (سنن ابی داؤد، مسند احمد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا روایت کردہ یہ خطبہ جیسا کہ روایت میں تصریح ہے صرف نکاح کے موقع کے ہی لیے نہیں ہے، بلکہ عمومی قسم کا ہے، اس کا مضمون بہت ہی جامع ہے۔ اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ الہامی ہے، اس کی بعض روایات میں ایک دو لفظوں کا اضافہ بھی ہے۔ یہاں جو الفاظ نقل کیے گئے ہیں وہ سنن ابی داؤد کی روایت کے ہیں، ابن ماجہ کی روایت میں شروع میں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے بعد "نَحْمَدُهٗ" کا اضافہ ہے۔ اسی طرح "وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا" کے بعد "وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا" کا بھی اضافہ ہے ۔۔۔ آخر میں قرآن پاک کی تین آیتیں ہیں ۔۔۔ ایک سورہ نساء کی پہلی آیت کا آخری حصہ ہے۔ "وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا" ۔۔۔ اس کے بعد دوسری آیت سورہ آل عمران کی آیت ۱۰۲ ہے۔ "يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ۔ الآیۃ۔ اس کے بعد تیسری آیت سورہ احزاب کی آیت ۷۰ ہے "يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا۔ الآیۃ۔

---

[1] خطبہ میں یہاں حدیث کے کسی راوی سے سہو ہو گیا ہے، اور سورہ نساء کی یہ آیت اس طرح روایت کی گئی ہے۔ "يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا" حالانکہ یہاں شروع میں "يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا" نہیں ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ اس موقع پر صرف یہ ہیں۔ "وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ۔ الآیۃ۔

کسی بھی اہم موقع پر ایک بندہ کو اللہ کے حضور میں اپنی بندگی اور نیازمندی و وفاداری کے اظہار کے لیے بارگاہِ خداوندی میں جو کچھ عرض کرنا چاہیے وہ سب اس خطبہ کے ابتدائی حصہ میں آگیا ہے، اور آخر میں جو تین آیتیں ہیں وہ بندہ کی ہدایت کے لیے بالکل کافی ہیں ـــــ یہ خطبہ عقد نکاح سے پہلے پڑھا جاتا ہے بلکہ اسی مقدس خطبہ سے نکاح کی کارروائی کا آغاز ہوتا ہے ـــــ افسوس یہ خطبہ پڑھنا بھی اب ایک رسم بن کر رہ گیا ہے، ورنہ اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی نصیحت اور یاد دہانی کی نکاح کے فریقین کو اور سب ہی کو ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس خطبہ ہی پر عمل نصیب فرما دے تو دنیا اور آخرت میں اعلیٰ سے اعلیٰ کامیابی کے لیے کافی ہے۔

الفرقان کی ملکیت اور دیگر تفصیلات کے متعلق اعلان

(مطابق فارم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ۸)

۱۔ مقام اشاعت .... کچہری روڈ، لکھنؤ

۲۔ وقفۂ اشاعت .... ماہانہ

۳-۴-۵۔ پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر کا نام .... محمد منظور نعمانی

شہریت .... ہندوستانی

پتہ .... دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ

۶۔ مالکان .... محمد منظور نعمانی

میں محمد منظور نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین میں بالکل صحیح ہیں۔

دستخط

محمد منظور نعمانی

یکم مارچ ۱۹۷۳ء

سعادتِ انسانی

افاداتِ حضرت شاہ ولی اللہؒ

(ترجمانی ——— عتیق الرحمٰن سنبھلی)

۱- سعادت کی حقیقت

سعادت، اُن کمالات تک پہونچنے کا نام ہے جو کسی شے کی فطرت میں ودیعت کیے گئے ہوں۔ لیکن یہ کمالات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک نوعی کمالات، دوسرے جنسی، یعنی ایک وہ جن کا تقاضہ اس شے کی نوعی خصوصیت کرتی ہے، دوسری وہ جنھیں اُس کی جنسی اصلیت چاہتی ہے، عام اس سے کہ وہ جنس بعید سے تعلق رکھنے والی اصلیت ہو یا جنس قریب[1] سے ——— سعادت کا تعلق نوعی کمالات سے ہے، جنسی کمالات سے نہیں۔ اسی لیے انسان کی سعادت بھی انھیں کمالات کے حصول میں ہے جو اس کی نوعی فطرت سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس بات کو اور اچھی طرح سمجھنے کے لیے انسان کے بعض جنسی کمالات پر نظر کرنی چاہیے جن

---

[1] نوع اور جنس اور جنس قریب اور جنس بعید منطقی اصطلاحات ہیں۔ جنس کے معنی سادہ زبان میں کسی شے کی اصلیت کے ہیں یہ اصلیت قریب کی ہو تو جنس قریب کہلاتی ہو۔ دور کی ہو تو جنس بعید۔ جیسے انسان کی قریبی اصلیت اس کا حیوان ہونا ہو لہٰذا حیوان انسان کی جنس قریب ہو۔ اور انسان اس کی ایک نوع (قسم) دور کی اصلیت دیکھئے تو وہ انسان کا ایک نمو پذیر جسم (جسم نامی) ہونا ہے جس میں نباتات بھی انسان کے "ہم جنس" ہو جاتے ہیں۔ اور دور جائیے تو انسان کی اصلیت بس ایک جسم ہونا نکلتی ہے اور اس میں جمادات بھی اس کے شریک ہو جاتے ہیں۔ (مترجم)

میں اُس کی جنس کی دوسری انواع بھی شریک ہیں۔ مثلاً ایک انسان کا قد آور ہونا اُس کے اوصافِ کمال میں شمار کیا جاتا ہے، لیکن اس کی بنیاد پر اگر اسے سعادت مند قرار دیا جائے تو پھر پہاڑوں کو کمالِ سعادت سے بہرہ مند ماننا پڑے گا ـــــ انسان کی خوش رُوئی، اُس کے اعضاء کا تناسب اور صفائے رنگ و روغن بھی محاسن و محامد کے زمرے میں شامل ہے۔ لیکن اسے اگر منجملہ سعادت ٹھہرا دیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ نباتات کا درجۂ سعادت انسان سے کہیں بلند ہے، کیونکہ یہاں حسن و زیبائی کی جیسی جیسی صورتیں رونما ہوتی ہیں، دلربائی اور خوش ادائی کے جو جو مناظر لالہ و گل کی اس دُنیا میں بکھرے نظر آتے ہیں، انسان کا حُسنِ صورت اور حُسنِ قامت اس کی گرد کو بھی نہیں پہونچا۔ تیسری مثال اُن اوصاف کی لیجئے جن میں حیوانات کی بعض دیگر انواع بھی انسان کے ساتھ شریک ہیں جیسے زور دستی، آواز کی بلندی، اکل و شرب کی بھرپور قوت، اور وافر جنسی قوت، یہ چیزیں اگر کسی انسان میں پائی جاتی ہیں تو بعض موقعوں پر کمالات ہی میں گنائی جاتی ہیں۔ لیکن انھیں اگر سعادت شمار کیا جانے لگے تو اور تو اور (بعض باتوں کے لحاظ سے) گدھا بھی انسان سے بڑھ کر سعید ٹھہرے گا ـــــ پس انسان کے جنسی کمالات سے اس کی سعادت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اسی لیے عقلِ سلیم سے بہرہ مند ہونے والے انسان ان کمالات میں سے کسی کے پیچھے نہیں پڑتے ان کی نظر ہمیشہ نوعی کمالات کے حصول پر رہتی ہے۔

لیکن نوعی کمالات کے باب میں بھی ایک نکتہ ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے، ان کمالات میں کچھ ایسے ہیں جو اپنی اصل کے اعتبار سے حیوانوں میں بھی پائے جاتے ہیں، انسان کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ اس کے اندر ان کمالات کا ظہور کچھ مہذب، ترقی یافتہ اور وسیع النفع شکلوں میں ہوتا ہے۔ مثلاً شجاعت ہو، ضروریاتِ زندگی سے عہدہ بر آ ہونے کے مہذب طور طریقے ہیں، صنعت و حرفت کے اعلیٰ پیمانے ہیں، یہ سب نفسی، ذہنی اور عملی کمالات اپنی اصل کے اعتبار سے بہت سے دوسرے حیوانوں میں موجود ہیں، انسان کی انفرادیت بس ان کی تہذیب اور ترقی یافتگی کے اندر محدود ہے۔ شجاعت کی اصل کیا ہے؟ غصہ، انتقام کا جوش، شدائد میں ثابت قدمی اور خطروں میں پیش قدمی، یہ سب باتیں بہائم کے نروں میں خوب خوب پائی جاتی ہیں۔ البتہ انھیں شجاعت کا معزز نام اس لیے نہیں دیا جاتا کہ وہاں یہ تہذیب سے عاری ہیں جو نفسِ ناطقہ[۱] سے ملتی ہے اور جس کے اثر سے یہ نفسی

[۱] تشریح آگے آتی ہے۔

کیفیات اپنی حرکت میں اجتماعی مصلحت اور معقولیت کی پابند ہوتی ہیں۔

انسان کی بلند پایہ صنعتوں کی اصل سے بھی حیوانات محروم نہیں ہیں، چڑیاں آخر گھونسلے بنا کر رہتی ہی ہیں۔ اور بعض حیوانی صنعتیں تو ایسی ہیں کہ حیوانات کے سادہ اور فطری طریقۂ کار کے مقابلے میں پُر تکلف اہتمامات سے کام لے کر بھی انسان ان کے معیار کو نہیں پہونچ پاتا۔ؔ رہ گئے ضروریات زندگی سے عہدہ برآ ہونے کے طور طریقے ان کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ (اسکی اصل میں بلا استثناء تمام ہی حیوانات انسان کے شریک ہیں۔)

تو انسان کے بعض نوعی کمالات کا بھی معاملہ یہ ہے جس کی طرف عام طور سے لوگوں کی نظر نہیں جاتی اور اسی لیے ان کمالات کے حصول کو بھی عین سعادت ٹھہرا لیا جاتا ہے، لیکن اس تنقیح کے بعد ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ سعادت بس بعض اعتبارات سے سعادت ہے، حقیقی سعادت انسان کی یہ ہے کہ اس کا مادۂ بہیمیت نفس ناطقہؔ کا تابع ہو جائے اور عقل خواہش پر غالب ہو۔۔۔۔ کیونکہ یہی تنہا وہ وصف اور وہ کمال ہے جس کا تقاضہ انسان کی خاص نوعی طبیعت کرتی ہو اور جس میں کوئی اور اس کا شریک وسہیم نہیں ہے۔

اس حقیقت کو ذرا زیادہ تفصیل سے یوں سمجھئے کہ انسان کے اوصاف و افعال دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق اس دنیا کی زندگی سے ہے اور جن کا موضوع بس اسی زندگی کے اعتبار سے انسان کی بہبود ہے۔ دوسرے اوصاف و افعال وہ ہیں جن کی غرض و غایت تمام تر اس روحانی کمال اور کیفیت کا حصول اور حیات اُخروی کی شادکامی ہو جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا۔ انسان فطری طور پر اپنے تمام اندرونی اور بیرونی افعال و حرکات و ہیئات میں نفس ناطقہ سے ہدایت و رہنمائی کا فیض پاتا ہے جس کے قبول کر لینے میں اس کی سعادت کا راز پنہاں ہے۔ اس لیے جب وہ اولی الذکر معاملات میں اس فیض کو قبول کرے گا تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ سعادت سے ہمکنار ہو گا۔ لیکن یہ سعادت کامل اور حقیقی سعادت نہ ہوئی بس فی الجملہ اور بالتبع سعادت ہو گی۔ کیونکہ (۱) یہ جو افعال و اوصاف ہیں ان سے کمال مطلوب حاصل ہونے کا کوئی تعلق نہیں، ان کا

ؔ اس کی ایک سامنے کی مثال مکڑی کا جالا ہے۔ (مترجم) ؔ یعنی عنصر یا روح ملکی

موضوع ہی یہ نہیں ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بسا اوقات ان چیزوں میں انہماک اُس اصل مطلوب و مقصود سے دور لے جانے والا ہوتا ہے جو فطرتِ انسانی کا اصل مدعا ہو خاص کر جب کہ یہ انہماک اور مشغولیت اُس کم نظری اور ناعاقبت اندیشی کے ساتھ ہو جو انہی امور میں پڑے رہنے والے (اور اس لیے ناقص الفکر رہ جانے والے) لوگوں کا خاصہ ہے۔ مثلاً شجاعت کا وصف پیدا کرنے اور بڑھانے کے لیے مزاج میں غصہ بڑھانے والی تدابیر اور کشتیاں لڑنے کی ترکیب اختیار کی جائے۔ یا فصاحت کا جوہر حاصل کرنے کے لیے جاہلی شعراء اور خطباء کے کلام سے اشتغال کیا جائے (جس سے جاہلی افکار و اخلاق بھی طبیعت میں جاگزیں ہو سکتے ہیں) (۲) علاوہ ازیں یہ شجاعت اور فصاحت جیسے ملکات بجز اس کے کس مصرف کے ہیں کہ ابنائے نوع کے مقابلے میں کام آئیں۔ اسی طرح ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے طور طریقے اسی وقت تک کارآمد ہیں جب تک ضرورتیں ہیں۔ اور صنعت گری کے فنون محتاج ہیں کہ آلات و اوزار اور خام مال حاصل ہو، جو کہ سب کی سب اس زندگی کے ساتھ ساتھ فنا ہو جانے والی چیزیں ہیں۔ پس اگر ایک شخص بس انہی میں مشغول رہتے ہوئے دنیا سے چلا گیا اور مشغولیت بھی اس کی دلچسپی کے ساتھ تھی، تب تو نہ صرف وہ ناقص مرا بلکہ اپنے ساتھ ماسوائے مطلوب سے دلچسپی کا وبال بھی پال کر لے گیا۔ اور اگر مشغولیت بلا دلی لگاؤ کے تھی تب بھی ناقص اور کمالِ مطلوب سے محروم رہ جانے کا خسارہ ضرور ہوا ــــــ پھر سعادت کہاں؟

اس کے برعکس دوسری قسم کے افعال و اوصاف وہ ہیں جن کی حقیقت ہی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ، انسان کی قوتِ ملکی کے لیے اس کی قوتِ بہیمی کے اس طرح تابع اور مسخر ہو جانے کی، ایک تصویر ہیں کہ قوتِ ملکی کے عین رنگ ہی میں وہ رنگ گئی ہے اور اپنی باگ ڈور کلیۃً اُس کے ہاتھ میں دے چکی ہو جبکہ ملکیت اس کا کوئی بھی اثر اور کوئی بھی رنگ قبول کرنے کی روادار نہیں ــــــ اور سعادت کی اس قسم کا نام ہے عبادات و ریاضات۔ اور یہ اس طرح وجود میں آتے ہیں (یا کہیئے کہ ان کا حاصل یہ ہے) کہ ملکیت اپنی ذات اور فطرت سے جن باتوں کی خواہاں ہے ان کے لیے بہیمیت کو حکم دیتی ہو اور وہ بے چون وچرا اس حکم کی اطاعت کرتی ہے۔ ایک بار نہیں بار بار اور ایک کے بعد دوسرا۔ اور دوسرے کے بعد تیسرا حکم وہ اسی طرح بہیمیت کو دیتی رہتی ہے حتیٰ کہ وہ اس راہ پر چلنے کی عادی ہو جائے۔ اور یہ چیزیں جن کا تقاضہ

ملکیت اپنی ذات اور فطرت سے کرتی ہے اور بہیمیت کو اس کے علی الرغم ان کی بجاآوری پر مجبور کرتی ہے۔ قدرتی طور سے ایسی ہوتی ہیں کہ ملکیت کے لیے ان میں انشراح اور انبساط کا سامان ہے، اور بہیمیت کے لیے انتہائی انقباض کا، جیسے کہ مثال کے طور پر ملائکہ سے مشابہت اختیار کرنا اور بارگاہ اقدس کی طرف محو نظر ہونا۔ اس لیے کہ یہ ملکیت کا تو ماشاءاللہ اور لازمۂ فطرت ہے اور بہیمیت کو اس سے بُعد ہی بُعد ہے۔

اور یا ایک دوسری شکل ان امور کے وجود میں آنے کی یہ ہے کہ انسان ان تمام باتوں کو ترک کرے جن کا بہیمیت کا تقاضہ کرتی ہے، جن سے وہ محظوظ ہوتی ہے اور جن کے شوق میں جان دیتی ہے ــــــ انسان کا کمال مطلوب ہاتھ آنے کا ذریعہ یہی امور ہیں۔

لہٰذا اب یہ حقیقت بالکل بے غبار ہو کر سامنے آتی ہے کہ سعادتِ حقیقی کا حصول عبادات کے بغیر ممکن نہیں۔ اور یہی راز ہے کہ "مصلحتِ کلّی"[۱] انسانوں کو ان کی صورت نوعیہ کے روزن سے پکارتی اور جتاتی ہے کہ جو اوصاف و افعال ثانوی کمال کے درجے میں آتے ہیں ان کی اصلاح و درستی میں بس بقدر ضرورت مصروف ہوں اور اپنی توجہ اور سعی کا اصل ہدف اس بات کو بنائیں کہ نفس میں تزکیہ کی شان اور وہ کیفیات پیدا ہوں جو اسے ملأ اعلیٰ سے مشابہ اور اس قابل کر دیں کہ عالم جبروت و ملکوت کی کیفیات اس پر نزول کریں، بہیمیت سرتاسر ملکیت کی تابع فرمان اور بس اس کے احکام کے ظہور کا ایک محل بن کر رہ جائے ــــــ اور مصلحتِ کلّی کی یہ پکار ایسی برحق پکار ہے کہ نوعِ انسان کے افراد جب نوعی صحت سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور ان کا مادۂ وجود اپنے نوعی احکام کے ظہور کا پوری طرح اہل ہوتا ہے تو وہ ایسے بے پناہ جذبے سے اس سعادت کی طرف کھنچتے ہیں جیسے لوہا مقناطیس کی طرف! اور واقعہ یہ ہے کہ یہی وہ اصل طبیعت اور فطرت ہے جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے، چنانچہ دنیا میں جو بھی معتدل المزاج قوم پائی گئی ہے اس میں ایسے لوگ ضرور ہوئے ہیں جو اس جوہرِ فطرت کو چمکانے ہی میں اپنی اصل سعادت دیکھتے اور پوری ہمت سے اس کے کوشاں رہے ہیں۔ اور دوسری طرف عوام سے لے کر سلاطین و حکماءِ وقت تک سب نے انھیں تعظیم و تکریم کا خراج ادا کرتے ہوئے مانا ہے کہ یہ دنیوی سعادتوں سے بہت بلند تر سعادت کے

---

[۱] وہ چیز جو مجموعی حیثیت اور آخری نتیجے کے اعتبار سے مصلحت ہے۔

وارث، ملائکہ کے ہم پایہ اور ان کے صف نشین ہیں۔ چنانچہ ہر قوم میں انھیں بابرکت جانا گیا اور چھوٹوں سے لے کر بڑوں تک سب نے ان کے ہاتھ پاؤں چومنا اپنی سعادت سمجھا! کیا یہ بات ممکن ہے کہ عرب و عجم اپنے عادات و خصائل کے اختلاف کے باوجود، اپنے ادیان و مذاہب کے فرق کے باوجود اور اپنے ممالک و مساکن کے فاصلوں کے باوجود کسی ایک شے پر، بغیر کسی فطری اشتراک اور مناسبت کے، ایسے متفق ہو جائیں؟ پس لاریب یہ انسان کی اس نوعی فطرت کا حکم ہے جس میں عرب و عجم سب ایک ہیں۔ اور تمھیں معلوم ہے کہ ملکی جوہر انسان کی اصل فطرت میں ودیعت ہے اور اسی کی وجہ سے کسی نہ کسی درجہ میں ہر آدمی کو واجب الاحترام اور بلند مقام روحانی انسانوں کی طرف کشش ہوتی ہے۔

۲— سعادت کے باب میں لوگوں کے مختلف حالات

جس طرح شجاعت و فصاحت وغیرہ تمام اوصاف میں انسانوں کے احوال مختلف ہیں کہ کسی میں سرے سے مثلاً شجاعت کا مادہ ہی نہیں ہوتا جیسے مخنث یا حد سے زیادہ کمزور دل، کہ ایسوں کی اندرونی کیفیت وصف شجاعت کی بالکل ضد ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے پیدا ہونے کا امکان ہی نہیں یا فی الوقت تو ایک انسان میں شجاعت نہیں پائی جاتی لیکن اس کا مادہ موجود ہے، کہ اگر اہل شجاعت کے تذکرے پڑھے اور سنے اور ان کے طور طریقے اور افعال و عادات اپنانے کی مسلسل کوشش کرے تو اس میں بھی فی الجملہ یہ صفت رونما ہو سکتی ہے ورنہ اس سے خالی ہی رہ جائے گا۔ اس سے بھی آگے کے درجے کی حالت یہ ہے کہ صرف مادہ ہی نہیں بلکہ ایک درجے کی شجاعت بھی پیدائشی طور پر ہے اور اس کے مطابق کام کرنے پر اس کی طبیعت اس طرح مجبور ہے کہ اگر اس سے روکا جائے تو سخت گرانی اور ناگواری ہو اور اس کے برعکس ایسے کاموں کو کہا جائے تو بس اشارہ پر طبیعت لپکے ایسے کہ جیسے گندھک کو آگ دکھائیے تو بھڑک اٹھنے میں دیر نہیں لگتی —— اور ایک درجہ اس سے بھی آگے کا ہے کہ بعض آدمیوں میں نہایت کامل درجے کی شجاعت ہی پیدائش اور خلقت سے موجود ہوتی ہے۔ انھیں کسی تربیت اور کسی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس میدان کے

سے اعلیٰ درجے کے کام اُن سے از خود صادر ہوتے ہیں ــــ یہ چوتھا درجہ اس باب میں امامت کا درجہ ہے، ایسا آدمی صرف شجاع اور بہادر ہی نہیں ہے بلکہ میدان شجاعت کا امام اور مقتدا ہو۔ اس میدان کے رہرووں کو اگر کمال مطلوب ہے تو اس کے نقشِ قدم کی اتباع واجب ہو گی۔ اسکے انداز و اطوار کی نقل کرنا ہو گی، اُس کی زندگی کے واقعات کو حرزِ جان بنانا ہو گا۔

تو بس جیسے اور تمام اوصاف و کمالات میں انسانوں کے حالات مختلف ہیں، ایسا ہی معاملہ اُس وصف کا بھی ہے جس پر نوعِ انسانی کی سعادت منحصر ہے۔ یہاں بھی ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جن میں سرے سے اس وصف کا مادہ ہی نہیں ہوتا۔ ارشاد باری "صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْن" اس صنف کے بارے میں ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام کا وہ نوجوان جسے انھوں نے اسکے مومن والدین کی عافیت کے لیے دست قدرت بن کر، قتل کر دیا تھا اسی قبیل سے تھا۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہو جن میں مادہ تو موجود ہوتا ہے مگر وہ سخت ریاضتوں اور متواتر عملی جد و جہد کے بغیر بروئے کار نہیں آتا۔ ان لوگوں کے مادۂ سعادت کو حرکت میں لانے کے لیے انبیاء کی شوق انگیز دعوت بھی درکار ہوتی ہو۔ ان کا صاف واضح اور پرکشش نمونۂ عمل بھی ضروری ہوتا ہے۔ انسانوں کی زیادہ تعداد ایسے ہی لوگوں پر مشتمل ہو اور یہی اولاً اور اصالۃً انبیاء کی بعثت کا نشانہ ہوتے ہیں۔ تیسری قسم کے لوگ بھی ہیں کہ ان میں مادہ بھی ہو اور اس کا اظہار بھی لیکن یہ اظہار بس ایک حد تک ہی ہوتا ہو کیونکہ انھیں اس مادہ کے تفصیلی تقاضوں کا شعور نہیں ہوتا۔ اس شعور اور آگاہی کے لیے وہ محتاج ہوتے ہیں کہ کوئی ان کی رہنمائی کرے۔ اور جب رہنما مل جاتا ہے تو اُن کی طبعی استعداد کا حال یہ سامنے آتا ہو کہ "یَکَادُ زَیْتُهَا یُضِیْءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ" ع۔ چوتھی قسم اس میدان کے ائمہ کی ہے، جو کسی امام و رہنما اور کسی دعوت و تحریک کے بغیر اپنی ذاتی استعداد سے اس وصف کمال تک پہونچتے ہیں اور ان کے نقوشِ قدم سے دوسروں پر یہ راہ روشن ہوتی ہے۔ یہ طبقہ طبقۂ انبیاء ہے، جس کے طرزِ عمل کی پیروی اس راہ کے ہر رہرو پر واجب اور اس کی تعلیمات سے اشتغال ناگزیر ہے۔

ــــ (باقی)

ع سورہ نور (پارہ ۱۸) میں نورِ حق کی تمثیل بیان کی گئی ہے کہ یہ اپنی تابانی میں اُس چراغ کی طرح ہے جو ایسے نفیس تیل سے جلتا ہے کہ آگ بھی نہ دکھاؤ تو شاید آپ ہی سے جل اُٹھے۔

جرح و تعدیل

(۶)

مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی
(استاد شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

(ج) حدیثٌ منکرٌ، منکر الحدیث اور یروی المناکیر میں باہمی فرق

حدیثٌ منکرٌ، منکرُ الحدیث اور یروی المناکیر کے درمیان جو فرق ہے اس کو جس نے نہیں سمجھا وہ خود بھی گمراہ ہوا اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ ائمہ فن کے اس کہنے سے کہ ھذا الحدیثٌ منکرٌ یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ اس کا راوی غیر ثقہ ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ "نکارت" کا لفظ بولتے ہیں اور اس کا مطلب محض تفرد ہوتا ہے، اگرچہ متاخرین نے یہ اصطلاح قرار دی ہے کہ منکر وہ حدیث ہے جس کو ثقہ راوی کے برخلاف ضعیف راوی نے روایت کیا ہو لیکن اگر ثقہ راوی نے دوسرے ثقہ راوی کے برخلاف کوئی حدیث روایت کی ہے تو وہ منکر نہیں ہے بلکہ شاذ ہے۔

اسی طرح ائمہ فن کے اس کہنے سے کہ "فلاں راوی منکر حدیثیں روایت کرتا ہے یا فلاں راوی کی حدیث منکر ہے" یا اسی قسم کے دوسرے جملوں سے بھی یہ نہ گمان کیا جائے کہ راوی ضعیف ہے۔

علامہ عراقی نے "تخریج احادیث احیاء العلوم" میں لکھا ہے "اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی راوی کو منکر الحدیث کہہ دیتے ہیں محض اس لیے کہ اس نے جو حدیث روایت کی ہے اس میں وہ منفرد (تنہا اور اکیلا) ہے"۔

سخاوی نے "فتح المغیث" میں لکھا ہے "کبھی منکر الحدیث اس ثقہ راوی کے بارے میں بھی بولا جاتا ہے جو ضعیف راویوں سے ایسی حدیثیں روایت کرتا ہے جو منکر ہیں، حاکم

کا بیان ہے کہ "میں نے دار قطنی سے کہا "سلیمان بن بنت شرجیل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" انھوں نے جواب دیا کہ وہ ثقہ ہیں۔ میں نے کہا "کیا ان کی روایت کردہ حدیثوں میں منکر حدیثیں نہیں ہیں؟" دار قطنی نے کہا "یہ منکر حدیثیں وہ ضعیف راویوں سے روایت کر دیتے ہیں، جہاں تک خود ان کا سوال ہے وہ ثقہ ہیں۔"

علامہ ذہبی نے "میزان الاعتدال" میں عبداللہ بن معاویۃ الزبیری کے احوال میں لکھا ہے "ائمہ فن کا کہنا کہ "فلاں راوی منکر الحدیث ہے۔" یہ مطلب نہیں رکھتا کہ یہ راوی جو کچھ بھی روایت کرتا ہے وہ سب منکر ہے جب کوئی راوی بہت سی حدیثیں روایت کرتا ہے انمیں بعض منکر بھی ہوتی ہیں تو ائمہ فن اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ "وہ منکر الحدیث ہے"۔

اسی طرح علامہ ذہبی نے احمد بن عتاب المروزی کے احوال میں لکھا ہے "احمد بن سعید بن معدان کا کہنا ہے کہ "احمد بن عتاب شیخ صالح ہیں فضائل اور مناکیر روایت کرتے ہیں، میں (ذہبی) کہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے کہ ہر وہ راوی جو مناکیر روایت کرتا ہو وہ ضعیف ہی ہو۔"

حافظ ابن حجر نے "مقدمۂ فتح الباری" میں محمد بن ابراہیم التیمی کے ذکر کے موقع پر ان کی توثیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "احمد (بن حنبل) نے محمد بن ابراہیم کے بارے میں کہا ہے کہ وہ منکر احادیث روایت کرتے ہیں۔ میں (ابن حجر) کہتا ہوں کہ احمد بن حنبل اور دوسرے حضرات نے منکر کا اطلاق ایسی منفرد حدیث پر کیا ہے جس کا کوئی متابع (مؤید) نہ ہو تو محمد بن ابراہیم کے بارے میں احمد بن حنبل کا منکر الحدیث کہنے سے مطلب بھی یہی ہے (کہ وہ بعض منفرد حدیثوں کے راوی ہیں) محدثین کے ایک گروہ نے محمد بن ابراہیم کو قابل سند مانا ہے۔

اسی طرح علامہ ابن حجر نے بُرید بن عبداللہ کے احوال میں لکھا ہے "احمد (بن حنبل) اور دوسرے حضرات منکر کا اطلاق منفرد احادیث پر کرتے ہیں۔"

سخاوی نے فتح المغیث میں لکھا ہے "ابن دقیق العید نے شرح الامام میں کہا ہے کہ ائمہ فن کا کہنا کہ "فلاں راوی منکر حدیثیں روایت کرتا ہے" اس کا تقاضی نہیں ہے کہ محض اس کہنے سے اس راوی کی روایتیں ترک کر دی جائیں۔ ہاں اگر وہ اکثر و بیشتر منکر حدیثیں ہی روایت کرتا ہو تو لائق ترک ہے' ایسے راوی کے بارے میں جو اکثر و بیشتر منکر حدیثیں روایت کرتا ہے جبکہ کہا جانے لگے کہ وہ

منکر الحدیث ہے، تو اسے ترک کیا جائے گا، اس لیے کہ منکر الحدیث ایسی صفت ہے جو آدمی کی ہے اور اس صفت سے متصف ہونے والا ضرور مستحق ہے کہ اس کی روایت کردہ حدیث قبول نہ کی جائے دوسری عبارتیں (یعنی روی مناکیر، یا یروی المناکیر، یا فی حدیثہ نکارۃ وغیرہ) اس کی متقاضی نہیں ہیں کہ راوی ہمیشہ کے لیے لائق ترک ہو جائے، ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ جب کہ امام احمد ابن حنبل، محمد بن ابراہیم تیمی کے بارے میں کہتے ہیں کہ "وہ منکر حدیثیں روایت کرتا" اور یہی محمد ابن ابراہیم وہ راوی ہے جس کو بخاری اور مسلم دونوں متفقہ طور پر معتبر مانتے ہیں اور اسی راوی پر انما الاعمال بالنیات والی حدیث کا دارومدار ہے۔"

ابو المحاسن شیخ قائم بن صالح سندھی ثم مدنی اپنی تصنیف "فوز الکرام بما ثبت فی وضع الیدین تحت السرۃ او فوقہا تحت الصدر عن التشفیع المظلل بالغمام" میں شاذ اور منکر کی اصطلاحوں کی وضاحت کرنے کے بعد لکھتے ہیں "اس تفصیل سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ یہ کہنا "وہ منکر الحدیث ہے" خالی (مجرد) جرح ہے، اس لیے کہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ راوی ایسا کمزور راوی ہے جو مستند اور ثقہ راویوں کے برخلاف روایتیں کرتا ہے، بلاشبہ کسی راوی کے بارے میں یہ کہنا کہ "وہ ضعیف ہے" محض جرح ہے (جسے غیر مفسّر جرح کہنا چاہیے) عین ممکن ہے کہ جارح نے جس بنا پر راوی کو ضعیف سمجھا ہے، وہ اس مجتہد کے نزدیک جرح ہی نہ ہو جو اس راوی کی روایت پر عمل کر رہا ہو اگر کوئی کہے کہ "راوی کا منکر قرار دیا جانا بھی جرح مفسّر ہے جیسا کہ ائمہ فن کہتے ہیں؟ تو جواب یہ ہوگا کہ منکر الحدیث کے معنی یہ ہیں کہ وہ ضعیف راوی جو مستند اور ثقہ راویوں کے برخلاف روایت کرتا ہے، ائمہ فن جن امور کی بنا پر جرح پر مجبور ہوتے ہیں، وہ درجہ میں متفاوت ہیں، بعض ان میں سے معیوب ہیں اور بعض معیوب نہیں ہیں۔ اسی لیے اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک نے کسی بنا پر کسی راوی کو ضعیف ٹھہرایا دوسرے نے اس کو نہیں تسلیم کیا، بہر حال ان سب باتوں سے قطع نظر، منکر الحدیث ہونا اس وقت تک ضرر رساں نہیں ہوتا جب تک ثقہ راویوں کی مخالفت بہت زیادہ نہ ہونے لگے۔"

اسی تصنیف میں ایک اور جگہ ابو المحاسن شیخ قائم نے لکھا ہے "جن لوگوں نے "وضع الیدین تحت السرۃ" والی حدیث کے راوی عبد الرحمٰن بن واسطی کو ضعیف ٹھہرایا ہے ــــ اور یہ حدیث سنن ابی داؤد کی ہے ــــ انھوں نے اس بنا پر ضعیف ٹھہرایا ہے کہ وہ بعض مواقع پر ثقہ

راویوں کے برخلاف روایت کرتے ہیں اور بعض مقامات پر منفرد روایات کرتے ہیں، اور یہ دونوں باتیں غیر مضر ہیں، مضر اس وقت ہیں جب منکر حدیثوں کی روایت اور ثقات کی مخالفت بکثرت پائی جائے اور عبدالرحمٰن بن واسطی کے بارے میں یہ دونوں باتیں محتاج ثبوت ہیں۔"

حافظ ابن حجرؒ ثابت بن عجلان انصاری کے بارے میں فتح الباری کے مقدمے میں لکھتے ہیں "عُقیلی کا کہنا ہے کہ ثابت بن عجلان کی بیان کردہ حدیثوں کی تائید کرنے والی حدیثیں نہیں ملتی ہیں، عُقیلی کے اس اعتراض کا جواب ابوالحسن بن القطانؒ نے بایں طور دیا ہے کہ ثابت بن عجلان کا یہ رویہ ان کے لیے ضرر رساں نہیں ہے، بے شک اگر وہ ایسی حدیثیں بکثرت روایت کرتے ہوتے جن کا متابع (مؤید) کبھی نہ ہوتا اور ثقہ راویوں کی مخالفت بھی ہوتی تو عقیلی کا اعتراض بجا ہوتا"

علامہ سیوطی نے "تدریب الراوی شرح تقریب النووی" میں لکھا ہے "بعض ائمہ فن کا بعض روایتوں کے بارے میں یہ قول ملتا ہے "میں انکار کرتا ہوں فلاں آدمی کی فلاں روایت سے۔" حالانکہ وہ روایت بجائے خود ضعیف نہیں ہوتی، جیسے ابن عدی کا قول ہے "بُرید ابن عبد اللہ ابن ابی بُردہ نے جو یہ روایت بیان کی ہے "اذا اراد اللّٰہ بأمۃ خیرا قبض نبیھا قبلھا" میں اسے نہیں مانتا" (میں انکار کرتا ہوں) حالانکہ بُرید کا سلسلۂ سند حسن ہے اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور محدثین نے اپنی "صحیح" میں اس حدیث کو داخل کیا ہے، اسی طرح علامہ ذہبی کا قول ہے "ولید بن مسلم نے جو حدیثیں روایت کی ہیں (جیسے حفظ قرآن کی دعا والی حدیث) میں اُسے نہیں مانتا" حالانکہ یہ حدیث ترمذی نے روایت کی ہے اور اُسے حسن قرار دیا ہے اور حاکم نے اس حدیث کو بخاری اور مسلم کی شرطوں کا حامل قرار دیا ہے۔"

میں (مؤلف کتاب مولانا عبدالحئی فرنگی محلی) کہتا ہوں "میزان الاعتدال نیز اسماء الرجال کی دوسری کتابوں کے پڑھنے والو! ناقدین حدیث کی کتابوں میں کہیں کہیں 'انکار' کا لفظ جو پایا جاتا (یعنی میں اس حدیث کا انکار کرتا ہوں) تو اس سے دھوکا نہ کھانا، گرہ میں باندھ لو اور خوب سمجھ لو کہ اگر علامہ بخاری کسی راوی کے بارے میں 'منکر' کا استعمال کریں تو اس راوی سے روایت کرنا جائز نہ ہوگا، لیکن امام احمد بن حنبل یا ان کے نقش قدم پر چلنے والے اگر کسی راوی کو منکر کہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس راوی کی روایت سند نہیں ہے۔

خوب اچھی طرح یہ فرق بھی سمجھ لینا چاہیے کہ "روی المناکیر" یا "یروی المناکیر" یا "فی حدیثہ نکارۃ" وغیرہ کا مطلب اور ہے اور "منکر الحدیث" وغیرہ کا مطلب دوسرا ہے۔ پہلے جملوں سے راوی کی ایسی جرح نہیں ظاہر ہوتی کہ اس کا لحاظ کیا جائے اور آخری جملے (منکر الحدیث) سے راوی خاصا مجروح قرار پاجاتا ہے۔

اسماء الرجال کی کتابوں "الکامل" اور "میزان الاعتدال" وغیرہ میں یہ جو جگہ جگہ ملتا ہے "میں اس راوی کی روایت کا انکار کرتا ہوں" تو محض اس سے اس راوی کو ضعیف قرار دینے میں جلدی نہ کرنا چاہیے، یہ مصنفین حدیث حسن اور حدیث صحیح کے بارے میں بھی "انکار" کا لفظ بول جاتے ہیں، اور ان کا مطلب محض یہ ہوتا ہے کہ یہ حسن یا صحیح حدیث وہ ہے جس کا راوی روایت میں منفرد ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ متقدمین کے "ھذا الحدیث منکر" کہنے میں اور متاخرین کے "ھذا الحدیث منکر" کہنے میں بھی فرق ہے۔ متقدمین تو عموماً اس جملے کا استعمال محض "تفرد" کے سلسلے میں کرتے ہیں خواہ وہ مستند حدیث ہی کیوں نہ ہو، اور متاخرین جب یہ جملہ استعمال کرتے ہیں تو ان کا مطلب ایسی روایت سے ہوتا ہے جس کا راوی ضعیف ہے اور ثقہ راویوں کے برخلاف روایت کرتا ہے۔

یہی دھوکا ان صاحب کو بھی ہوا ہے جنھوں نے حدیث من زار قبری وجبت له شفاعتی کو ضعیف اس بنا پر قرار دیا کہ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں اسی حدیث کے ایک راوی موسیٰ بن ہلال کے احوال میں لکھا ہے "موسیٰ بن ہلال کی اس حدیث کا من زار قبری وجبت له شفاعتی" جس کو انھوں نے نافع کے واسطے سے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے میں انکار کرتا ہوں۔ اس حدیث کو موسیٰ بن ہلال سے محمد بن اسماعیل الاحمسی نے اور ان سے ابن خزیمہ نے روایت کیا ہے۔"

اگر اس اہم بحث کو اور زیادہ تفصیل سے دیکھنا چاہتے ہو تو زیارت قبر نبوی کی بحث پر جو میرے رسائل ہیں ان کو پڑھو جن کے نام ہیں (۱) الکلام المبرم فی نقض القول المحکم (۲) الکلام المبرور فی رد القول المنصور اور (۳) السعی المشکور فی رد المذھب المأثور۔ یہ تینوں رسالے میں نے اُن صاحب کی تردید میں تالیف کیے ہیں جنھوں نے حج تو کیا مگر زیارت قبر نبوی نہیں کی۔

ع۔ یہ تینوں رسالے اردو میں ہیں۔ محمد رضا انصاری

(د) انہ لیس بشیٔ کا مطلب۔ میزان الاعتدال وغیرہ میں امام فن یحییٰ ابن معین کا بعض راوی
کے بارے میں یہ قول نقل ہوا کرتا ہے انہ لیس بشیٔ ــــ (وہ کچھ نہیں ہے) تو اس سے
بھی یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہیے کہ یہ راوی بری طرح مجروح ہے! علامہ ابن حجر نے فتح الباری کے
مقدمے میں عبدالعزیز بن المختار البصری کے حوالے میں لکھا ہے "ابن القطان الفاسی کا کہنا
ہے کہ یحییٰ ابن معین جب کسی راوی کے بارے میں انہ لیس بشیٔ کہتے ہیں تو ان کی مراد ہوتی ہے
کہ اس راوی کی بیان کردہ حدیثیں بہت کم ہیں۔"

علامہ سخاوی نے بھی فتح المغیث میں یہی لکھا ہے کہ "ابن القطان نے کہا ہے کہ یحییٰ
بن معین جب کسی راوی کے بارے میں لیس بشیٔ کہتے ہیں تو ان کا مطلب ہوتا ہے کہ اس راوی
سے زیادہ حدیثیں نہیں مروی ہیں۔"

(ر) لاباس بہ کا مطلب راویوں کے بارے میں ابن معین کا قول لا باس بہ
میزان الاعتدال وغیرہ میں اکثر منقول ہوا ہے۔ شاید اس سے یہ گمان ہوتا ہو کہ یہ راوی ثقہ سے کم
درجے کا ہے۔ متاخرین کا لاباس بہ کہنے سے یہی مقصود ہوا کرتا ہے! مگر ابن معین کا یہ مطلب نہیں ہوتا
ان کے نزدیک لاباس بہ راوی ویسا ہی ہے جیسا ثقہ راوی ہوتا ہے۔ علامہ بدر ابن جماعہ نے اپنی
کتاب میں لکھا ہے کہ "ابن معین کا کہنا ہے کہ جب میں کسی راوی کے بارے میں لاباس بہ کہتا ہوں
تو وہ ثقہ راوی ہوتا ہے۔

مقدمہ ابن صلاح میں ہے۔ ابن ابی خیثمہ نے کہا "میں نے یحییٰ ابن معین سے پوچھا کہ
آپ کسی راوی کے بارے میں لاباس بہ کہتے ہیں کسی راوی کے بارے میں ضعیف کہتے ہیں؟
انھوں نے جواب دیا جب میں تم سے لاباس بہ کہتا ہوں تو وہ راوی ثقہ ہوتا ہے اور جب تم
سے کہوں کہ فلاں ضعیف، تو وہ راوی ثقہ نہیں ہے اس کی روایت کردہ حدیث مت لکھنا۔"

فتح المغیث میں ہے "اور یہی بات ابو زرعہ دمشقی نے بھی کہی ہے ان کا کہنا ہے کہ میں
نے عبدالرحمن بن ابراہیم دحیم سے پوچھا "آپ علی بن حوشب فزاری کے بارے میں کیا رائے
رکھتے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "لا باس بہ" میں نے پھر کہا "آپ یہ کیوں نہیں
کہتے کہ وہ ثقہ ہیں اور آپ نے ان میں کوئی برائی نہیں پائی؟ انھوں نے کہا "تم سے کہہ تو دیا!

کہ وہ ثقہ ہیں (لا بأس بہ کا مطلب ان کے نزدیک بھی یہی ہے جو ابن معین کے نزدیک ہے)

فتح الباری کے مقدمے میں ہے" ابن الجنید نے ابن معین کا قول لیس بہ باس یونس بصری کے بارے میں نقل کیا اور کہا ہے کہ ابن معین نے اس قول سے یونس بصری کی توثیق کی ہے"

(س) کذا وکذا کا مطلب | راوی یونس بن ابی اسحاق عمرو السبیعی کے احوال میں ذھبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے" امام احمد بن حنبل کے بیٹے عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے یونس بن ابی اسحاق کے بارے میں ان کی رائے پوچھی انھوں نے جواب دیا کذا وکذا (ایسے ہیں اور ایسے) میں (ذھبی) کہتا ہوں کہ عبد اللہ ابن احمد بن حنبل ان راویوں کے لیے جن کے بارے میں وہ اپنے والد سے پوچھ چکے ہوتے ہیں، اکثر یہی الفاظ (کذا وکذا) استعمال کرتے ہیں، مختلف موقعوں پر ان الفاظ کے استعمال کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جس راوی میں کچھ ڈھیلا پن ہوتا ہے اس کے بارے میں وہ یہ کنایہ استعمال کرتے ہیں۔"

(ص) یکتب حدیثہ سے ابن معین کی مراد | ابن معین کسی راوی کے بارے میں جب یہ کہیں کہ یکتب حدیثہ (اس کی حدیث لکھی جائے) تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ضعیف راویوں میں سے ایک راوی یہ بھی ہے۔ ابن معین کے اس مطلب کی وضاحت علامہ ذھبی نے ابن عدی کے واسطہ سے ابراہیم بن ہارون صنعانی کے احوال میں کی ہے۔

(ط) مجہول مختلف معنوں میں مستعمل | علامہ ذھبی نے ابان بن حاتم الالموکی کے احوال میں میزان الاعتدال میں لکھا ہے" جس راوی کے بارے میں میں کہوں کہ وہ مجھول ہے اور یہ صراحت نہ کروں کہ کسی نے اس کو مجہول قرار دیا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ میں ابو حاتم کا قول نقل کر رہا ہوں، اگر نام کی صراحت کر دوں مثلاً ابن المدینی یا ابن معین تو بات واضح ہو گئی۔ اگر کسی راوی کے بارے میں اس قسم کے جملے لکھوں فیہ جہالۃٌ یا فیہ نکرۃ یا یجھل یا لایعرف وغیرہ اور یہ صراحت نہ کر دوں کہ یہ جملہ کس کا کہا ہوا ہے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ خود میری رائے ہے اسی طرح جب میں کسی کہنے والے کا نام لیے بغیر ثقۃٌ یا صدوقٌ یا صالحٌ یا لیّنٌ وغیرہ کے الفاظ کسی راوی کے بارے میں کہوں تو وہ میری ذاتی رائے ہو گی۔

اکثر و بیشتر محدثین جب کسی راوی کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ مجہول ہے تو ان کا مطلب

اور ہوتا ہے اور ابو حاتم کا مطلب کسی راوی کو مجہول کہنے سے دوسرا ہوتا ہے۔ محدثین اس سے ذات کی ناواقفیت مراد لیتے ہیں یعنی یہ ایسا راوی ہے کہ اس سے صرف ایک ہی راوی نے روایت کی ہے اور ابو حاتم حالات سے ناواقفیت مراد لیتے ہیں۔

ذات سے ناواقفیت اکثر محدثین کے نزدیک اُس وقت رفع ہو جاتی ہے جب دو راویوں نے اس سے روایت کر دی ہو۔ دار قطنی کے نزدیک حالات کی ناواقفیت بھی اسی طرح رفع ہو جاتی ہے، اسی بنا پر دار قطنی کا موسیٰ بن ھلال العبدی کو (جو حدیث من زار قبری وجبت له شفاعتی کے راویوں میں سے ایک ہیں) 'مجہول' کہہ دینا تسلیم نہیں کیا گیا ہو اس لیے کہ موسیٰ بن ھلال سے ثقہ راویوں کی روایت پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے۔

خطیب بغدادی نے اپنی کتاب 'الکفایہ' میں لکھا ہے "اہل حدیث کے نزدیک 'مجہول' ہر اُس راوی کو کہیں گے جو علم حدیث کی طلب میں نہ خود مشہور ہو نہ علمائے حدیث اسے اس پہلو سے جانتے ہوں اور اس سے صرف ایک ہی راوی نے روایت کی ہو جیسے عمرو ذی مُر، جبار الطائی، عبد اللہ بن اغر الھمدانی اور سعید بن ذی حُدان، یہ سب وہ راوی ہیں جن سے سوائے ابو اسحاق السبیعی کے اور کسی نے روایت نہیں کی ہے، محمد بن یحییٰ الذہلی سے روایت ہے کہ جب کسی محدث سے دو راویوں نے روایت کر دی تو اس کے مجہول ہونے کا قصہ ختم ہو گیا۔

خطیب بغدادی نے دوسری جگہ یہی بات اس طرح لکھی ہے "راوی کے مجہول ہونے کا خاتمہ کم سے کم علم حدیث میں مشہور دو راویوں کی روایت سے ہو جاتا ہے البتہ زیادہ جتنے بڑھتے جائیں، البتہ محض دو راویوں کے روایت کر دینے سے اس راوی کے بارے میں عادل ہونے کا حکم نہیں لگایا جاتا۔"

سخاوی نے فتح المغیث میں لکھا ہے "دار قطنی کا کہنا ہے کہ جس سے دو ثقہ راویوں نے روایت کر دی وہ راوی مجہول نہیں رہا اور اس کا عادل ہونا ثابت ہو گیا۔"

ابن عبد البر نے شرح مؤطا میں جس کا نام الاستذکار ہے لکھا ہے "جس سے تین راویوں نے اور بعض لوگوں کا کہنا ہے دو راویوں نے روایت کی ہے وہ مجہول نہیں ہے۔

علامہ تقی الدین سبکی اپنی کتاب "شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام" میں لکھتے ہیں:
"موسیٰ بن ھلال کے بارے میں ابو حاتم رازی کا یہ کہنا کہ وہ مجہول راوی ہے، کوئی نقصان رساں جملہ نہیں ہے۔ ابو حاتم نے جہالت سے یا تو جہالت ذات مراد لی ہے یا جہالت اوصاف۔ اگر جہالت ذات مراد لی ہے ـــــ اور عام طور پر اس اصطلاح سے یہی مراد بھی لیا جاتا ہے ـــــ تو یہ جہالت موسیٰ بن ھلال کے حق میں ختم ہو چکی ہے، موسیٰ سے امام احمد بن حنبل نے، محمد بن جابر المحاربی نے محمد بن اسماعیل الاحمسی نے ابو امیہ محمد بن ابراہیم طرسوسی نے عبید بن محمد الوراق نے فضل بن سہل نے اور جعفر بن محمد یزدی نے روایت حدیث کی ہے، جب صرف دو راویوں کی روایت سے جہالت ذات کا عیب رفع ہو جاتا ہے تو یہاں تو سات سات راوی ان سے روایت کر رہے ہیں!
اچھا اگر جہالت اوصاف مراد ہے تو امام احمد بن حنبل کی شان اس سے بالا ہے کہ وہ موسیٰ بن ھلال سے روایت کریں جو مجہول الوصف ہو، خصوصاً ایسی صورت میں جب ابن عدی کے ایسے امام فن موسیٰ بن ھلال کے ثقہ ہونے کے بارے میں کہہ چکے ہیں۔"
فتح المغیث میں ہے "مزید براں ابو حاتم رازی کا کسی راوی کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ مجہول ہے اس مطلب کا حامل نہیں ہے کہ اس راوی سے صرف ایک ہی راوی نے روایت کی ہے، کیوں؟ اس لیے کہ ابو حاتم رازی نے داؤد بن یزید ثقفی کے بارے میں کہا ہے کہ وہ مجہول ہے، حالانکہ ان ہی داؤد سے ایک دو نہیں بہت سے لوگوں نے روایت حدیث کی ہے اسی لیے علامہ ذہبی نے ابو حاتم رازی کا داؤد کے بارے میں یہ قول (وہ مجہول ہے) نقل کرنے کے بعد ہی لکھا ہے "اس سے معلوم ہو گیا کہ ابو حاتم کے نزدیک کبھی کبھی وہ راوی بھی مجہول ہوتا ہے جس سے ثقہ راویوں کے ایک گروہ نے روایت کی ہو مطلب یہ ہوا کہ ابو حاتم رازی کے نزدیک ایسا راوی مجہول الحال ہو سکتا ہے۔"
ابو حاتم رازی کا یہ قول (انہ مجہول) متعدد راویوں کے بارے میں میزان الاعتدال اور دوسری اسماء الرجال کی کتابوں میں بہت نقل ہوا ہے، تو اس سے غلط فہمی نہ ہونا چاہیے، ہاں جب دوسرے نقاد ائمہ فن بھی ابو حاتم رازی کی موافقت کریں، تو بات صحیح ہو گی نقادانِ فن

کی نظر میں ابو حاتم رازی کا "انہ مجہول" کہنا بے پناہ ہوا کرتا ہے، اکثر موقعوں پر ان نقاد محدثین نے ابو حاتم کی تردید بھی کی ہے، وہ راوی جو ان نقادانِ فن کے نزدیک معروف ہے اسے ابو حاتم مجہول کہہ جاتے ہیں، علامہ ابن حجر نے فتح الباری کے مقدمے میں لکھا ہے "ابو حاتم رازی کے بیٹے اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حکم ابن عبد اللہ بصری مجہول ہے" میں (ابن حجر) کہتا ہوں کہ ہرگز مجہول نہیں ہے وہ راوی جس سے چار ثقہ راویوں نے روایت حدیث کی ہے اور جسے ذہلی نے ثقہ قرار دیا ہے۔

ابن حجر مزید لکھتے ہیں "عباس قنطری کے بارے میں ابو حاتم رازی کے بیٹے نے اپنے باپ کا یہ قول بیان کیا ہے کہ وہ مجہول راوی ہے، میں (ابن حجر) کہتا ہوں کہ مجہول سے اگر مجہول العین مراد لیا جائے تو صحیح نہ ہوگا اس لیے کہ عباس قنطری سے امام بخاری نے موسیٰ بن ہلال نے اور حسن بن علی العمری نے روایت حدیث کی ہے اور اگر مجہول الحال مراد لیا جائے تب بھی صحیح نہ ہوگا اس لیے کہ امام احمد بن حنبل کے بیٹے عبد اللہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا تو انھوں نے عباس قنطری کا اچھائی کے ساتھ ذکر کیا۔"

علامہ سیوطی نے تدریب الراوی میں لکھا ہے "ماہرین حدیث کی ایک جماعت نے بعض راویوں کو اس لیے مجہول قرار دیا ہے کہ وہ اُن کے حالات سے واقفیت حاصل نہیں کر سکی تھی۔ درانحالیکہ یہ راویان، جن کو عدم علم کی بنا پر مجہول قرار دیدیا گیا ہے، دوسرے محدثین کے نزدیک معروف ہیں، اب میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں سے ایسے بعض راویوں کے نام گناتا ہوں۔

۱۔ احمد بن عاصم البلخی:۔ ابو حاتم نے انھیں مجہول قرار دیا ہے، ابن حبان نے کہا ہے وہ ثقہ ہیں اور ان کے شہر والوں نے ان سے روایت حدیث کی ہے۔

۲۔ ابراہیم بن عبد الرحمٰن مخزومی:۔ ابن القطان نے ان کو "مجہول" قرار دیا ہے، ابن القطان کے علاوہ دوسروں نے ان کو "معروف" مانا ہے اور ابن حبان نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔

۳۔ اسامہ بن حفص المدینی :۔ ابو القاسم اللالکائی نے ان کو مجہول قرار دیا ہے، علامہ ذہبی کا کہنا ہے کہ وہ مجہول نہیں ہیں ان سے چار ثقہ راویوں نے روایت کی ہے۔

۴۔ اسباط ابو الیسع :۔ ابو حاتم نے مجہول قرار دیا ہے۔ امام بخاری نے معروف مانا ہے۔

۵۔ بیان بن عمرو :۔ ابو حاتم نے مجہول کہا ہے۔ ابن المدینی، ابن حبان، ابن عدی اور عبید اللہ بن واصل نے ثقہ قرار دیا ہے۔

۶۔ حسین بن الحسن بن الیسار :۔ ابو حاتم نے مجہول قرار دیا ہے، امام احمد بن حنبل وغیرہ نے ان کو ثقہ مانا ہے۔

۷۔ حکم بن عبد اللہ مصری :۔ ابو حاتم نے مجہول قرار دیا ہے، ذہلی نے توثیق کی ہے اور ان سے چار ثقہ راویوں نے روایت کی ہے۔

۸۔ عباس قنطری :۔ ابو حاتم نے مجہول مانا ہے۔ امام احمد بن حنبل اور ان کے بیٹے نے ثقہ۔

۹۔ محمد بن الحکم المروزی :۔ ابو حاتم نے مجہول اور ابن حبان نے ثقہ قرار دیا ہے۔"

ٹیکس اور زکوٰۃ

ایک تقابلی مطالعہ

(۳)

از استاذ یوسف القرضاوی ——— ترجمہ خلیل الرحمٰن سجاد

ٹیکس اور زکوٰۃ میں عدل کی رعایت

ٹیکس ایک قانونی فریضہ ہے۔ اگر کوئی ادا نہ کرے تو قانون کی طاقت سے اسے مجبور کیا جائے گا۔ اس لیے (یعنی ٹیکس وصول کرنے کے لیے طاقت کے استعمال کے جواز کی وجہ سے) علمائے مالیات نے کچھ بنیادی ضابطے بنائے ہیں جن پر ٹیکس وصول کرتے وقت عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ ٹیکس کی وصولیابی کے کام کو ظلم کے تشدد کی ایک شکل بن جانے سے روکا جائے ——— زیر نظر مضمون میں ان ہی ضوابط پر گفتگو کی جائے گی۔ اور یہ دکھایا جائے گا کہ اسلام کے پیش کردہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے زکوٰۃ کے نظام میں ان تمام باتوں کی رعایت بدرجہ اتم موجود ہے جو اس زمانہ کے "ماہرین مالیات" نے ٹیکس کے سلسلہ میں ملحوظ رکھی ہیں۔

۱۔ عدل و انصاف | اس کا مطلب مشہور ماہر اقتصادیات "آدم اسمتھ" کی تشریح کے مطابق یہ ہے کہ ریاست کے ہر باشندہ پر بلا کسی تفریق کے فرض ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے بقدر ریاست کے اخراجات میں مالی تعاون کرے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، عدل و انصاف تو اس کے بنیادی اصول اور تعلیمات میں

شامل ہے بلکہ دنیا میں عدل و انصاف اور مساوات قائم کرنا اس کے اہم مقاصد میں سے ہے۔ وہ ہر معاملے میں انصاف اور مساوات کا لحاظ ضروری قرار دیتا ہے ــــ خاص زکوٰۃ کے سلسلہ میں اس کی عدل گستری کا اندازہ حسب ذیل احکام پر نظر ڈالنے سے ہو سکتا ہے۔

۱۔ فرضیت زکوٰۃ کا عموم | زکوٰۃ ہر اس مسلمان پر فرض ہے جو کہ نصاب کا مالک ہو۔ رنگ، نسل، طبقہ اور خاندان غرض کسی چیز کے اختلاف سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مرد و عورت، کالے گورے، اعلیٰ و ادنیٰ، حاکم و محکوم، اہل دین اور اہل دنیا سب اس فریضہ کی ادائیگی کے مکلف ہیں۔

۲۔ نصاب سے کم مال پر زکوٰۃ نہیں | اسلام نے مال کی ایک معقول مقدار سے کم پر زکوٰۃ فرض نہیں کی تاکہ کسی کے لیے اس حکم کی ادائیگی مشکل نہ ہو۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: "یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ؟ قُلِ الْعَفْوَ" ــــ (لوگ سوال کرتے ہیں کہ راہ خدا میں کتنا مال خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے جو "عفو" ہے وہ خرچ کریں) عفو کے معنی ضرورت سے زائد کے ہیں۔ (تفسیر از ابن عباسؓ)

۳۔ کسی مال پر سال میں صرف ایک دفعہ زکوٰۃ واجب ہوگی | عدل و انصاف کی رعایت اور ضمانت کا سب سے بڑا مظہر زکوٰۃ کے اصول و احکام میں یہ ہیں کہ ایک سال میں ایک ہی مال پر دو مرتبہ زکوٰۃ واجب نہیں ہو سکتی۔ یہ صراحتہً ایک حدیث کا مفہوم ہے۔ فقہائے اسلام نے زکوٰۃ کے بہت سے مسائل اسی اصول سے اخذ کیے ہیں جن کی مالیات کے باب میں اس سے پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ مثلاً

(۱) اگر کسی شخص کے پاس مویشی ہوں (اونٹ، گائے، بکری) اور وہ ان کی زکوٰۃ نکال چکا ہو اور اس کے پاس اتنا نقد روپیہ بھی ہو کہ مویشیوں کی مالیت ملا کر نقد مال کا نصاب بن جاتا ہو تو اس شخص کے ذمہ اس کی زکوٰۃ ادا کرنا نہیں ہے، کیونکہ اگر ایسا کیا گیا تو ایک آدمی پر ایک سال کے اندر ایک ہی مال میں دو مرتبہ زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ جو شریعت کو مطلوب نہیں ہے۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے۔[1]

(ب) اسی طرح امام ابو حنیفہؒ کا ارشاد ہے کہ ایک شخص کے پاس نقد روپیہ تھا، اس نے اس کی زکوٰۃ ادا کر دی اور پھر اس سے مویشی خرید لیے۔ اس کے پاس اسی جنس کے کچھ مویشی پہلے

---

[1] البحر الرائق ابن نجیم ج ۲ ص ۴۔ ۲۲۹

سے بھی موجود تھے۔ تو اس کے ذمہ یہ نہیں ہوگا کہ ان دونوں مویشیوں کی ملکیت کا سال پورا ہو جائے تو ان کی زکوٰۃ بھی ادا کرے۔ کیونکہ ان میں سے نئے خریدے ہوئے مویشی تو اسی نقد کی جگہ ہیں جس کی زکوٰۃ وہ ادا کر چکا ہے[1]

(ج) ایک شخص نے تجارت کے لیے اتنے مویشی خریدے، جن سے زکوٰۃ کا نصاب بن جاتا ہے تو امام ابوحنیفہ اور امام ثوری اور امام احمد کے نزدیک تجارتی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ امام مالک کا قول اور امام شافعی کا آخری (جدید) قول یہ ہے کہ حیوانی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس اختلاف میں ان دونوں فریقوں کے اپنے اپنے دلائل ہیں۔ مگر ہم جو چیز دکھانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ دوہری زکوٰۃ کسی کے نزدیک بھی واجب نہیں ہے۔ کسی ایک ہی اعتبار سے نصاب مان کر زکوٰۃ لی جائے گی دونوں کا اعتبار بیک وقت نہیں ہوگا[2]

(د) اسی ذیل میں ایک یہ جزئیہ بھی آتا ہے کہ اُن جانوروں پر زکوٰۃ ہے یا نہیں جن سے زراعت میں کام لیا جاتا ہے۔ جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ ایسے جانوروں پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ کیونکہ غلہ پر تو زکوٰۃ واجب ہی ہے جو انہیں کی محنت سے وجود میں آتا ہے۔ یعنی ان کی منفعت بھی غلہ ہے۔ ایسی صورت میں اگر غلہ کی زکوٰۃ کے ساتھ ان کی عینی زکوٰۃ بھی الگ لی جائے گی تو یہ دوہری زکوٰۃ ہو جائے گی[3]

(ہ) شریعت کے اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے علمائے احناف یہ بھی کہتے ہیں کہ خراجی زمین میں سے عشر نہیں لیا جائے گا۔ خراجی زمین سے مراد وہ زمین ہے جس پر حکومت کی طرف سے ایک متعین سالانہ ٹیکس عائد کیا گیا ہو۔ اس پر عشر بھی لیا جائے تو یہ دو زکاتوں کا اجتماع ہو جائے گا[4]

(و) اسی طرح جمہور فقہاء کا جو یہ مسلک ہے کہ زکوٰۃ اسی مال پر واجب ہوگی جو قرضہ وغیرہ حقوق العباد سے فارغ ہو، اس کی بنیاد بھی بعض فقہاء نے اسی اصل پر رکھی ہے۔ اور اس کی تشریح اس طرح کی ہے جب قرض خواہ کے ذمہ اپنے قرضہ میں گئے ہوئے مال کی بھی زکوٰۃ ہے تو پھر قرضدار کے ذمہ بھی اس مال کی زکوٰۃ عائد ہونے سے ایک مال پر دو مرتبہ زکوٰۃ واجب ہو جائے گی جو کہ درست نہیں[5]

---

[1] ایضاً نیز ردالمحتار ج ۲ ص ۲۱ [2] المغنی ج ۳ ص ۳۴-۳۵ [3] الاموال ۳۸۱ [4] بدائع الصنائع ج ۲ ص ۵۷ [5] المجموع ج ۵ ص ۳۲۶

۴۔ انسانی محنت کے تفاوت سے نصاب زکوٰۃ پر اثر پڑتا ہے

عدل و انصاف کا چوتھا مظہر یہ ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ کی مقدار متعین کرنے میں، اس مال کے حصول کے سلسلہ میں انسان کی محنت کا پورا لحاظ کیا ہے۔ محنت کے فرق کے ساتھ کن حد تک، زکوٰۃ کی مقدار میں بھی کمی بیشی کر دی گئی ہے۔ اس کی سب سے واضح مثال یہ ہے کہ وہ زراعت جس کی آبپاشی انسان نے خود کی ہو اس کا صرف بیسواں حصہ زکوٰۃ کے طور پر خرچ کرنا لازم ہے۔ اور وہ زراعت جس کی سنچائی میں انسان کی محنت کو دخل نہ ہو بلکہ آسمانی بارش سے اس کی سنچائی ہوئی ہو اس کا دسواں حصہ (یعنی دوگنا) زکوٰۃ کے طور پر نکالنا لازم ہوگا ___ اسی طرح اگر کسی کے ہاتھ کوئی زمینی خزانہ لگ جائے تو اس کا پانچواں حصہ زکوٰۃ کے طور پر خرچ کرنا لازم ہے، کیونکہ اس سلسلے میں چاہے جتنی محنت آدمی کو کرنی پڑی ہو مگر جو مالیت اس کے ہاتھ لگی ہے وہ بالکل مفت کی ہے۔

جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، ہم نہیں جانتے کہ، شریعت اسلامیہ کے علاوہ، دنیا کے کسی نظام میں محنت کے تفاوت کا لحاظ اس قدر باریک بینی سے کیا گیا ہو اور انصاف کے بنیادی اصول کی اس سختی اور احتیاط سے پابندی کی گئی ہو ___ جدید اقتصادیات میں بھی اس کا کوئی نشان ہمیں نہیں ملتا ہے صرف اصل ذریعۂ آمدنی کو دیکھ کر ٹیکس عائد کر دیا جاتا ہے۔

۵۔ ٹیکس دہندہ کے شخصی حالات کی رعایت

ٹیکس کی بعض قسمیں تو ایسی ہیں جن میں ٹیکس دہندہ کے شخصی احوال سے کوئی بحث ہی نہیں کی جاتی۔ جن میں شخصی احوال مد نظر رکھے جاتے ہیں انہیں ان احوال کی رعایت کا نقشہ حسب ذیل ہے:۔

۱۔ ضروریات کے لیے ناگزیر مال کا استثناء۔

۲۔ ذریعۂ آمدنی کا لحاظ

۳۔ ذریعۂ آمدنی پر آنے والے اخراجات کی منہائی۔

۴۔ آمدنی پر خاندانی ذمہ داریوں کا لحاظ۔

۵۔ قرضہ جات کا لحاظ۔

اسلام نے ان سب باتوں کا لحاظ مع کچھ اضافے ہی کے صدیوں پہلے اس وقت کیا تھا جب ان کا شعور تک حکومتوں کو نہیں تھا۔ ذیل کے سرسری جائزہ سے اس کا اندازہ کیجیے۔

ا۔ ہر مال کی ایک مقدار متعین کی گئی جس سے کم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

ب۔ اس مال پر بھی جو کر نصاب تک پہونچ جائے تب ہی زکوٰۃ واجب ہوگی جبکہ وہ صاحب مال اور اس کے اہل و عیال کی بنیادی ضرورتوں سے فاضل ہو۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔ " یَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ؕ قُلِ الْعَفْوَ " ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے۔

(ج) کوئی شخص نصاب کا مالک تو ہے لیکن وہ مقروض بھی ہے۔ خواہ وہ قرض پورے مال کو محیط ہو، یا اتنا ہو کہ اس کو نکال دینے کے بعد وہ نصاب کا مالک نہیں رہ جاتا تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

(د) آمدنی پر آنے والے اخراجات وغیرہ کی مقدار بھی منہا کرنا سب نہیں تو بعض فقہاء (عطاء ابن ابی رباح) زمینی پیداوار کے معاملے میں ضروری قرار دیتے ہیں۔ بلکہ ان اخراجات کی شکل اگر قرض کی ہے تو یہی حضرت ابن عمر اور ابن عباسؓ کا بھی مذہب ہے۔ امام احمدؒ سے بھی یہی روایت ہے۔ بشکل قرض کی مثال یہ ہے کہ کھیتی کے لیے بیج مثلاً قرض لیا ہو۔

رہے اموال تجارت تو ان میں عملاً یہی ہوتا ہے کیونکہ زکوٰۃ، اصل پونجی اور نفع میں سے سال پورا ہونے پر بچ جانے والی رقم سے لی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد بھی جو اخراجات دین کی شکل میں ہوں جیسے دوکان کا واجب کرایہ تو اسے منہا کیا جائے گا۔

(ہ) اسی طرح ذریعۂ آمدنی کے مختلف حالات بھی ملحوظ رکھے گئے ہیں جو ذریعہ ہائے آمدنی ایک پائیدار وجود رکھتے ہیں۔ جیسے زراعتی زمین، تو اس پر زکوٰۃ پیداوار کا دسواں حصہ یا بیسواں حصہ ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے جہاں کام اور محنت ذریعہ آمدنی ہو وہاں زکوٰۃ کی مقدار ڈھائی فیصد ہے۔

۲۔ یقین اور قطعیت یہ ساری گفتگو علمائے مالیات کے وضع کردہ پہلے ضابطہ "عدل و انصاف" کے متعلق ہوئی۔ ان ماہرین کا وضع کردہ دوسرا ضابطہ "یقین" ہے۔ ان کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ دولت مند شخص کے ذمہ جو ٹیکس ادا کرنا ہو وہ ہر پہلو سے بلا کسی ابہام یا غیر یقینی صورت کے پوری طرح واضح اور متعین ہوں بایں طور کہ اس کی ادائیگی کی مدت، طریقہ اور واجب الادا مقدار وغیرہ قطعی اور یقینی طور پر واضح ہوں۔ بقول آدم اسمتھ ٹیکس کی عدم قطعیت اس نظام کا سب سے خطرناک پہلو ہے۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ ٹیکس کے دوام اور استحکام کا "یقین" سے بہت گہرا تعلق

سے۔ ایک شخص اگر ایک متعین ٹیکس بار بار ادا کر چکا ہو اور اس کے ضوابط جان گیا ہو تو اس پر اپنی ذمہ داری بالکل واضح ہوتی ہے۔ اس بنا پر ایک ماہر مالیات کا قول ہے کہ "ہر قدیم ٹیکس اچھا اور ہر نیا ٹیکس برا ہے"۔

جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے اس میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ زکوٰۃ کا نصاب، اس کی مقدار، مصارف، مدت ادائیگی کا طریقہ غرض کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو بالکل واضح نہ کر دیا گیا ہو — رہا بعض چیزوں میں فقہاء کا اختلاف تو یہ عام آدمی کے اعتبار سے کوئی مسئلہ نہیں۔ اس کو حل کرنے کے لیے کسی ایک رائے کو اختیار کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

بہر حال ٹیکسوں میں جبکہ ہر تبدیلی ممکن ہے، زکوٰۃ میں بڑی حد تک۔ اس کا کوئی سوال نہیں ہے صرف اجتہادی اور فروعی مسائل ہی کی حد تک اس کی گنجائش ہے۔

۳۔ نرمی | یہ ماہرین مالیات کا وضع کردہ تیسرا ضابطہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹیکس دینے والوں کی رعایت بھی ملحوظ رکھی جائے تاکہ وہ کسی ناگواری کے بغیر بطیب خاطر اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو سکیں — اسلام نے اس ضروری ضابطہ کا کس حد تک خیال رکھا ہے اس کا اندازہ ذیل کے چند مسائل سے ہو سکتا ہے۔

(۱) یہ حکم نہیں دیا گیا کہ لوگ اپنے اموال کی زکوٰۃ خود جا کر حکومت کے مرکزوں میں جمع کریں بلکہ یہ حکومت کی ذمہ داری ٹھہرائی گئی کہ وہ اپنے کارندوں کو بھیجے تاکہ وہ گھر گھر یا کم از کم بستیوں اور محلوں میں جا کر زکوٰۃ وصول کریں۔ خاص طور پر مویشیوں کی زکوٰۃ کے سلسلہ میں۔ کیونکہ اس میں بصورت دیگر زکوٰۃ دہندہ کے لیے بڑی دشواری تھی۔

(۲) علاوہ ازیں اوسط درجہ کا مال لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ صرف اعلیٰ درجہ کا مال لینے سے منع کیا گیا ہے اسی کے ساتھ زکوٰۃ دینے والے کو یہ ہدایت الگ ہے کہ وہ صرف گھٹیا درجہ کا مال زکوٰۃ کے طور پر نہ دے۔

(۳) باغات وغیرہ کی زکوٰۃ وصول کرنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اس فن کے ماہر ہوتے ہیں وہ باغ میں موجود پھلوں کی مقدار کا اندازہ کرتے ہیں اور پھر ان ہی کے اندازہ کے مطابق مقررہ نصاب کے بقدر زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔ ان اندازہ لگانے والوں کو (جن کو اصطلاح [illegible]

درسِ قرآن

مرکز والی مسجد - ۱۸ فروری ۱۹۷۳ء

مولانا محمد منظور نعمانی

آخرت میں مجرموں کا حال

اور

خداوندِ قہار کا قہر و جلال

حمد و صلوٰۃ، اعوذ اور بسم اللہ کے بعد

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۙ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ۝ وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۝ لا وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ۝ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ۝ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ وَتَرَى

میں "خراص" کہتے ہیں) یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اندازہ لگانے میں تخفیف سے کام لیں۔ اندازے کا پلڑا فی الجملہ مالک کے حق میں جھکا ہوا رکھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "اندازہ لگانے میں تخفیف سے کام لیا کرو، بہت سے پھل خراب ہو جاتے ہیں، کچھ پرندے کھا لیتے ہیں اور کچھ گر کر ضائع ہو جاتے ہیں۔"

بلکہ ایک حدیث میں تو یہ بھی منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: "جب تم اندازہ لگاؤ تو ایک تہائی چھوڑ دیا کرو، یا اگر تہائی نہیں تو کم از کم چوتھائی تو چھوڑ ہی دیا کرو۔"

(۴) مقررہ وقت سے زکوٰۃ مؤخر بھی کی جا سکتی ہے، اگر صاحب مال کو کوئی مجبوری پیش آ جائے۔

بہر حال ان سب باتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ دینے والوں کی سہولت ان کی بھلائی اور مفاد کا کتنا لحاظ کیا ہے۔

۴۔ میانہ روی | ٹیکس کے چہارگانہ ارکانِ عدل کا چوتھا رکن "میانہ روی" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو حکومت ٹیکسوں کی بس وہ مقدار متعین کرے جس سے اس کے سماجی و اجتماعی مقاصد پورے ہو جائیں۔ فضول خرچیوں کے لیے ٹیکس نہ عائد کیے جائیں۔ دوسری طرف اس کا بھی لحاظ رکھے کہ ٹیکسوں کے سلسلے میں حسابات پیش کرنے، مقدمات سے نپٹنے، عذر داریاں کرنے وغیرہ میں لوگ بہت زیر بار نہ ہونے پائیں۔

بلاشبہ یہ بھی ایک ضروری امر ہے۔ اس معاملے میں لوگوں کا عدم اطمینان انھیں ٹیکس ماری ہی نہیں، بغاوت تک پر آمادہ کر سکتا ہے۔ اسلام کے بارے میں اس معاملے میں صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ جب فرد کو بھی اپنے مال میں سختی اور تاکید کے ساتھ میانہ روی کی ہدایت کرتا ہے تو جماعت کے مال میں تو اس کی ہدایات جو کچھ بھی ہوں کم ہیں۔ زکوٰۃ کی شرحیں اسلام کی میانہ روی کا زندہ ثبوت ہیں۔

الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْأَصْفَادِ ۝ سَرَابِيْلُهُمْ مِنْ قَطِرَانٍ وَتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۝ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ إِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ هٰذَا بَلٰغٌ لِلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْا أَنَّمَا هُوَ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ ۝

سورۂ ابراہیم۔ رکوع ۷

اور تم ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ اللہ ظالموں مجرموں کے اعمال (اور کرتوتوں) سے غافل اور بے خبر ہے، درحقیقت اس نے اُن کو یعنی اُن کی سزا کے معاملہ کو، بس اُس دن (یوم الحساب) تک کے لیے مؤخر کر رکھا ہے، جس دن (حال یہ ہوگا کہ) آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی، یہ لوگ (حواس باختہ اور مبہوت) سر اوپر اٹھائے (میدانِ حساب کی طرف) دوڑے ہوں گے، ان کی نگاہ بھی اپنی طرف نہ لوٹے گی، (سراسیمگی اور دہشت سے) ان کے دل (فہم و شعور سے) خالی ہوں گے، ـــــ اور اے پیغمبر لوگوں کو اُس دن کی آمد سے خبردار کرو جب اُن پر اللہ کا عذاب نمودار ہو جائے گا، تو اُس وقت یہ ظالمین کہیں گے کہ پروردگار ہمیں تھوڑی سی مدت کے لیے اور مہلت دے دے ہم (کفر و شرک اور عصیان و بغاوت سے تائب ہو کر) تیری دعوتِ حق کو قبول کریں گے اور تیرے رسولوں کی پیروی کریں گے (تو ان کو اس وقت جواب دیا جائے گا) کیا تم نے قسمیں کھا کے نہیں کہا تھا کہ ہمیں کبھی زوال نہ ہوگا۔ حالانکہ تم ان لوگوں کی بستیوں میں رہے تھے جنھوں نے (تم سے پہلے دور میں کفر و انکار کر کے) اپنے نفسوں پر ظلم کیا تھا، اور تم پر یہ بھی واضح ہو چکا تھا کہ ہم نے اُن ظالموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا تھا (اور ان کا انجام کیا ہوا تھا) اور ہم نے (تمھاری نصیحت کے لیے) طرح طرح کی مثالیں بھی بیان کی تھیں ـــــ

ـــــ اور ان ظالموں نے (حق اور اس کے داعیوں کے خلاف) بڑی بڑی چالیں چلی تھیں، اور ان کی ان ساری چالوں کا ریکارڈ (اور اُن کا بدلہ اور توڑ) اللہ کے پاس ہے اور بلاشبہ اُن کی یہ چالیں ایسی تھیں کہ ان کے اثر سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں ـــــ تو ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ اللہ نے جو وعدہ اپنے رسولوں سے کیا ہے (کہ

ظالمین و مجرمین ضرور اپنے کیفر کردار تک پہونچیں گے) وہ اُس کے خلاف کرنے والا ہے
والیا ہرگز نہ ہوگا، حق ہے کہ اللہ تعالیٰ غالب و زبردست ہے اور مجرموں کو سزا دینا
اس کی صفت ہے۔ وہ دن جبکہ یہ زمین ایک اور زمین سے بدل دی جائے گی، اور
آسمان بھی بدل جائیں گے، اور سب لوگ نکل کے اللہ واحد قہار کے حضور میں حاضر ہونگے
اور تم اس دن مجرموں کو دیکھو گے کہ وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، اُن کے کرتے
قطران کے ہوں گے (جو ایک نہایت بدبودار اور بدرنگ آتش گیر غلیظ تیل سا ہوتا
ہے، وہ گویا اُن کے پورے جسموں پر لگا ہوا ہوگا اور وہی گویا اُن کا لباس ہوگا) اور آگ
کے شعلوں نے اُن کے چہروں کو ڈھانک رکھا ہوگا، یہ سب اس لیے ہوگا کہ اللہ ہر
شخص کو اُس کے کیے کا بدلہ دیدے ـــــ یقین کرو اللہ جلدی حساب لینے والا ہے
یہ لوگوں کو پہنچائے جانے کے لیے (خداوندی) پیغام ہے اور مقصد یہ ہے کہ
لوگوں کو (آنے والے انجام سے) خبردار کیا جائے، اور لوگ یقین سے جان لیں کہ وہی
اللہ ایک معبود برحق ہے، اور ارباب فہم و دانش نصیحت حاصل کریں۔"

سورۂ ابراہیم آیت ۴۲ تا ۵۲

تفسیر و تشریح) یہ سورۂ ابراہیم کا آخری رکوع ہے۔ آپ حضرات کو یاد ہوگا میں نے
عرض کیا تھا کہ یہ سورت مکی ہے اور اکثر مکی سورتوں کی طرح اس کا روئے سخن (
بھی مکہ کے کفار و مشرکین کی طرف اور خاص طور سے اُن کے لیڈروں اور سرداروں کی طرف ہے
جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے سب سے پہلے مخاطب تھے اور انتہائی مخالف تھے
دوسروں کو بھی حق کے راستہ سے روکتے تھے ـــــ اس آخری رکوع سے ایک ہی رکوع پہلے
ان ہی کے بارہ میں فرمایا گیا تھا ـــــ "بَدَّلُوا نِعْمَةَ اللهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ
دَارَ الْبَوَارِ ۝ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝" ـــــ یعنی اللہ نے ان
پر طرح طرح کے احسانات کیے، نعمتوں سے نوازا، لیکن انھوں نے اس کا بدلہ یہ دیا کہ کفر کی راہ
اختیار کی اور اپنی قوم کو بھی کفر و شرک کے راستہ پر ڈال کے جہنم میں جھونک دیا ـــــ آگے فرمایا
گیا تھا۔ "وَجَعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِهِ" یعنی انھوں نے اپنے الٰہ

معبودوں، بتوں کو اللہ کا شریک بنایا اور لوگوں کو خدا کے راستے سے ہٹا کر شرک کے راستے پر ڈالا ـــــ ان کا یہ جرم بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا گیا تھا "قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ" یعنی انھیں بتا دیا جائے اور جتا دیا جائے کہ دنیا کی اس چند روزہ زندگی میں خوب مزے اڑا لو، آخر میں تمھیں جہنم کا ایندھن بننا ہے ـــــ یہ بات بالکل اس طرح فرمائی گئی جس طرح طبیب کسی سخت بد پرہیز مریض سے کہتا ہے کہ اچھا تم خوب بد پرہیزی کر لو۔ تم اس کا نتیجہ دیکھ لوگے، تمھارا وقت قریب ہی آ گیا ہے۔

اس کے بعد درمیان میں اہل ایمان کو مخاطب کر کے ہدایت فرمائی گئی تھی کہ تم استقامت کے ساتھ بندگی کے راستے پر چلتے رہو اور خصوصیت کے ساتھ یہ دو عمل کرتے رہو۔ ایک نماز قائم کرتے رہو جو روح کے لیے قربِ الٰہی حاصل ہونے کا خاص ذریعہ ہے، اور دوسرے اللہ کی دی ہوئی روزی میں سے اس کی رضا کی راہ میں خرچ کرتے رہو جو تزکیۂ نفس کا خاص وسیلہ ہے (يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً)

میں نے آپ سے اس درس کے سلسلہ میں بار بار عرض کیا ہے کہ یہ دو عمل (نماز اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا) سعادت کی بنیاد ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہر شریعت میں اور ہر پیغمبر کی ہدایت و تعلیم میں ان کا حکم رہا ہے، اور ان دو حکموں پر عمل کرنے سے پورے دین پر چلنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے چند ایسے عظیم احسانات کا ذکر فرمانے کے بعد جن کا تعلق سب انسانوں بلکہ اکثر مخلوقات سے ہے آخر میں ارشاد فرمایا گیا تھا "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ" (آدمی بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے) یعنی بہت سے آدمیوں کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کی ان نعمتوں سے برابر فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اس کی عبادت اور فرمانبرداری کا حق ادا نہیں کرتے بلکہ بہت سے تو ایسے ناشکرے ہیں کہ اس کو بھولے سے بھی یاد نہیں کرتے۔ "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ"۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چند دعاؤں کا ذکر فرمایا گیا تھا، پہلی دعا یہ تھی، "رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ" (اے پروردگار

اس شہر مکہ کو امن کا شہر بنا دے اور مجھے اور میری اولاد کو بُت پرستی کی گندگی سے محفوظ رکھ) اس کے بعد دوسری دُعا یہ تھی "رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي۔ الآیۃ" (خداوندا میں نے تیرے مقدس اور باعظمت گھر (خانۂ کعبہ) کے پاس ایسی وادی میں جہاں کوئی کھیتی اور پیداوار نہیں ہوتی اپنی کچھ نسل کو بسا دیا ہے تاکہ وہ نماز قائم کریں اور تیرا گھر تیری عبادت اور تیرے ذکر سے آباد رہے، خداوندا تو اپنے کچھ بندوں کے دل اُن کی طرف مائل کر دے، وہ ان سے محبت کریں اور اُن کی روزی کے لیے زمین کی پیداوار پھل وغیرہ اپنی قدرت اور رحمت سے ان کو پہونچا تاکہ وہ تیرا شکر کریں۔)

ابراہیم علیہ السلام کی یہ دُعائیں خاص طور سے مکہ کے اُن مشرکوں اور کافروں کو سنائی گئی ہیں جو ابراہیم علیہ السلام کو اپنا مورثِ اعلیٰ کہتے تھے اور اُن کی نسبت پر فخر کرتے تھے۔ ان آیتوں میں اُن کو بتایا جا رہا ہے کہ ابراہیم تو شرک سے بیزار تھے، انھوں نے تو اپنی نسل کو ملک شام کے سرسبز علاقہ سے لا کر اس وادیٔ غیر ذی زرع میں صرف اس لیے آباد کیا تھا کہ ان کے ذریعہ خانۂ کعبہ نماز اور عبادت سے آباد رہے ـــــ سوچو غور کرو تمہارا کیا حال ہے، تم نے اللہ کی عبادت اور نماز کے بجائے بتوں کی پوجا کا طریقہ اپنا لیا ہے اور تم اللہ کے اُس پیغمبر کی مخالفت اور دشمنی پر کمربستہ ہو گئے ہو جو ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر ایک اللہ کی عبادت اور نماز کی طرف بلاتا ہے اور کعبۃ اللہ کو اللہ کی عبادت اور نماز سے آباد کرنا چاہتا ہے جو تم سب کے مورثِ اعلیٰ ابراہیم علیہ السلام کی تمنا اور آرزو تھی۔

آخری دُعا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ نقل کی گئی ہے "رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ۝" (اے پروردگار مجھے نماز کا قائم کرنے والا بنا دے اور میری نسل کو بھی اس کی توفیق دے۔ خداوندا ہماری دُعا قبول فرما لے، خداوندا میری بخشش فرما دے اور میرے ماں باپ اور سب ہی ایمان والوں کو بخش دے اُس دن جبکہ اعمال کا محاسبہ ہو۔

ابراہیم علیہ السلام کی یہ آخری دُعا نقل کر کے کفار و مشرکین کو بتایا گیا ہے کہ تمہارے جدِ اعلیٰ جن کے نام اور نسبت پر تم فخر کرتے ہو انھوں نے تو اللہ سے یہ دُعا کی تھی کہ اُن کو اور

ان کی نسل کو نماز قائم کرنے کی خاص توفیق ملے، اور تمہارا حال یہ ہے کہ اللہ کے جو بندے نماز قائم کرتے ہیں اور اللہ کے گھر کو اس کے ذریعہ آباد کرنا چاہتے ہیں تم اُن کی مخالفت کر رہے ہو ——— اور ابراہیم علیہ السلام کا حال یہ تھا کہ وہ آخرت میں مغفرت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے تھے، اور تمہارا حال یہ ہے کہ آخرت کے محاسبہ سے بالکل بے فکر بلکہ اس کے منکر ہو ———

بلاشبہ مکہ والوں کے لیے دعوت و نصیحت کا یہ بہترین اور نہایت حکیمانہ طریقہ تھا ——— ان کے علاوہ اہلِ ایمان کے لیے بھی اس میں سبق تھا اور ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور آخرت میں مغفرت اس درجہ اہم چیزیں ہیں کہ اللہ کے خلیل ابراہیم علیہ السلام بھی اُن کے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعائیں کرتے تھے، اس لیے ہمیں بھی اس دُعا کو اپنا خاص وظیفہ بنا لینا چاہیے۔ "رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ؀"

یہاں تک میں نے سلسلۂ کلام کے لیے اوپر کی آیتوں کا خلاصہ دُہرا دیا ——— اس کے بعد آخری رکوع کی وہ آیتیں ہیں جن کی میں نے اس وقت تلاوت کی ہے، ان کا رُخ بھی مکہ کے اُن کفار و مشرکین ہی کی طرف ہے ——— ان کا مفہوم اور مطلب سمجھنے کے لیے اُس صورتِ حال کا تصور کیجیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ مکہ کے سامنے توحید اور خدا پرستی اور آخرت کی فکر اور تیاری کی دعوت پیش کر رہے ہیں، مختلف طریقوں اور اسلوبوں سے انتہائی دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ ان کو خدا کا پیغام پہونچاتے ہیں، کبھی خدا کے انعامات و احسانات یاد دلاتے ہیں، کبھی ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات اور اُن کی دُعاؤں کا ذکر فرماتے ہیں، کبھی خدا کے قہر و عذاب سے ڈراتے ہیں، لیکن وہ لوگ جن کے دلوں پر کفر و شرک کی سیاہی چھا گئی ہے کوئی اثر نہیں لیتے بلکہ اور زیادہ بدتمیزیاں اور گستاخیاں کرتے ہیں اور اُن پر آسمان سے کوئی عذاب بھی نہیں آتا ——— تو ایسی حالت میں وہ خود یا دوسرے خدا ناشناس جاہل لوگ یہ سوچ سکتے ہیں کہ ان کو خدا کے قہر و عذاب کی جو وعیدیں اور خبریں سنائی جا رہی ہیں اُن کی کوئی حقیقت نہیں ہے، یا معاذ اللہ خدا اس صورتِ حال سے غافل اور بے خبر ہے ——— تو سورۂ ابراہیم کی ان آخری آیتوں کا تعلق اس صورتِ حال سے ہے ———

حاصل یہ ہے کہ کسی کو یہ خیال یا وسوسہ نہ ہو کہ یہ جفا کار مجرمین جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اُس سے بے خبر ہے، وہ سب کچھ دیکھ رہا سُن رہا ہے، لیکن اس کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ ان ظالموں پر دنیا میں عذاب نہ بھیجے ان کو پوری مہلت دے کہ اگر اپنی اصلاح کرنا چاہیں تو کر لیں، اور اگر اسی کفر و شرک اور ظلم پر قائم رہیں تو آخرت میں ان کا پورا حساب ہو جائے، وہاں ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے گا جس کے یہ مستحق ہوں گے۔ اور جو اللہ "عزیز ذو انتقام" کی شانِ قہر و جلال کے مطابق ہو گا ـــــ اللّٰھُمَّ احفظنا!

ارشاد فرمایا گیا ہے: "وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۝ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَاۗءٌ ۝" مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہرگز یہ گمان نہ کرو، اور ہرگز کسی کو یہ وسوسہ نہ ہو کہ خدا فراموش اور جفا کار لوگ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اُس سے غافل ہے، وہ سب دیکھ رہا ہے سُن رہا ہے لیکن ان کے محاسبہ اور سزا کے معاملے کو اس نے قیامت کے اس دن تک کے لیے مؤخر کر دیا ہے جو ایسا ہیبت ناک ہو گا کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی، اُس دن ان اشرار مجرمین کی یہ حالت ہو گی کہ انتہائی گھبراہٹ اور سراسیمگی کی حالت میں جانوروں کی طرح سر اوپر اٹھائے آنکھیں پھاڑے میدانِ حساب کی طرف دوڑ رہے ہوں گے، ہوش و حواس بجا نہ ہوں گے ـــــ

آگے ارشاد ہے "وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۝" اے پیغمبر تم لوگوں کو اُس روزِ قیامت کی آمد سے خبردار کر دو جب اُن کے سامنے عذابِ الٰہی نمودار ہو گا، تو جنھوں نے دنیا میں ظالمانہ اور مجرمانہ زندگی گزاری تھی اور اللہ کے پیغمبروں کی بات نہیں مانی تھی وہ اس وقت کہیں گے پروردگار! ہمیں تھوڑی سی مدت کے لیے مہلت دے دے یعنی تھوڑے سے وقت کے لیے اگلی والی دنیا میں پھر بھیج دے ہم تیری دعوتِ حق کو جو پیغمبروں کے ذریعہ آئی تھی اور ہم نے اسکو قبول نہیں کیا تھا اب قبول کر لیں گے اور تیرے رسولوں کی پیروی کریں گے۔"

قرآن پاک میں دوسری جگہ سورہ سجدہ میں بھی فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن مجرمین اللہ سے یہی عرض کریں گے "رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا" (خداوندا ہم نے جن حقیقتوں کا انکار کیا تھا، یہاں ہم نے اُن کو خود دیکھ لیا اور سُن لیا، اب ہمیں دنیا میں واپس

بھیجدے اب ہم تیرے اور تیرے رسولوں کے حکموں کے مطابق نیک اعمال کریں گے)۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان مجرمین کو یہ پُرجلال جواب دیا جائے گا۔ "اَوَلَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُمْ مِّن قَبْلُ مَا لَكُم مِّن زَوَالٍ وَسَكَنتُمْ فِي مَسَاكِنِ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْأَمْثَالَ ۝ وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِندَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ وَإِن كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ ۝ ـــــ فرمایا جائے گا کیا تم وہی نہیں ہو جنھوں نے بڑے گھمنڈ کے ساتھ قسمیں کھا کھا کے کہا تھا کہ ہم کو کبھی زوال نہ ہوگا، حالانکہ تم اُن لوگوں کے علاقوں اور بستیوں میں رہے تھے جنھوں نے اپنے زمانوں میں نافرمانی کی مجرمانہ زندگی گزاری تھی اور تمھارے سامنے یہ آچکا تھا کہ ہم نے اُن مجرمین کے ساتھ کیا معاملہ کیا اور تمھارے سامنے ایسی قوموں اور ایسے گروہوں کی بہت سی مثالیں بھی بیان کر دی گئی تھیں ـــــ لیکن تم نے کوئی سبق نہیں لیا، اور قسمیں کھا کھا کے یہی کہا کہ ہم پر کبھی بُرا وقت نہیں آئے گا ـــــ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے ـــــ کہ انھوں نے اپنی شرارتوں اور مکارانہ تدبیروں میں کوئی کسر اٹھا کے نہیں رکھی تھی، حق کی مخالفت میں جو شیطانی تدبیریں وہ کر سکتے تھے وہ سب انھوں نے کیں، اور یہ تدبیریں اور شرارتیں ایسی خطرناک تھیں کہ اُن کے ذریعہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹا دیئے جائیں (وَإِن كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ ۝) ـــــ اور یہ سب تدبیریں اور شرارتیں اللہ کے سامنے اور اسکے علم میں تھیں ـــــ اسلیے وہ اُن کی ان مکارانہ تدبیروں اور شرارتوں کی ان کو بھرپور سزا دے گا۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخْلِفَ وَعْدِهِ رُسُلَهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ ۝" مطلب یہ ہے کہ ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ اللہ نے مجرموں کو سزا دینے اور کیفر کردار کو پہونچانے کے جو وعدے اپنے رسولوں سے کیے ہیں وہ ان کے خلاف کرے گا، ایسا ہرگز نہ ہوگا، "إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ"۔ اللہ غالب اور زبردست ہے اور مجرموں کو سزا دینا اس کی شان اور صفت ہے۔ اس لیے مجرموں کو سزا دینے کے وعدے اپنے وقت پر ضرور پورے ہوں گے۔

آگے جو آیتیں ہیں جن پر یہ سورت ختم ہوتی ہے، اُن میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت انتقام اور شانِ قہر و جلال کا جب قیامت میں ظہور ہوگا تو کسقدر ہیبت ناک اور دہشت ناک منظر ہوگا، اور جن بدبخت مجرموں پر ظہور ہوگا اُن کا کیا حال ہوگا۔ ارشاد فرمایا

گیا ہے۔

"یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ"

مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن زمین و آسمان بدل جائیں گے، اور اللہ واحد قہار کے حضور میں پیشی ہوگی ـــــ اس پیشی کا ذکر یہاں جن الفاظ میں کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پیشی کے وقت اللہ تعالیٰ کی شانِ قہر و جلال کا ظہور ہوگا ـــــ آگے بتایا گیا ہے کہ مجرمین جن کے جرائم ناقابلِ معافی ہوں گے ان کا کیا حال ہوگا۔ "وَتَرَى الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ سَرَابِیْلُھُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰی وُجُوْھَھُمُ النَّارُ لِیَجْزِیَ اللّٰہُ کُلَّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ"

اور قیامت کے اس دن تم مجرمین کو اس حالت میں دیکھو گے کہ وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، اور ان کے جسموں پر قطران اس طرح لگا ہوا ہے کہ گویا وہی ان کا کرتا اور لباس ہے۔ قطران ایک طرح کا بدبودار و بدرنگ تیل ہوتا ہے جس میں کچھ اور تیز قسم کی چیزیں ملا کر اس اونٹ پر ملا جاتا ہے جس کو خارش ہو جاتی ہے، اس سے خارش کا مادہ جل جاتا ہے، اس میں آگ پکڑنے کی بھی خاص صلاحیت ہوتی ہے، آپ مثال کے طور پر تارکول بلکہ اس سے بھی زیادہ بدبودار اور بدرنگ غلیظ قسم کا تیل تصور کر لیں ـــــ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ آخرت میں ان مجرموں کے جسموں پر اوپر سے نیچے تک جسم کے جتنے حصہ پر کرتا پہنا جاتا ہے قطران اور وہ بھی آخرت اور دوزخ والا قطران لیپ دیا جائے گا گویا وہی ان کا کرتا ہوگا۔ جس طرح کسی آدمی کو برہنہ کر کے اس کے جسم پر تارکول پھیر دیا جائے تو یہ تارکول ہی اس کا لباس ہو جائے گا۔ اس سے آپ کچھ تصور کر سکتے ہیں کہ اس وقت ان بدبخت مجرموں کا کیا حال ہوگا اور کیا منظر ہوگا۔ اللّٰھُمَّ احفظنا!

پھر یہ بھی تصور کیجئے کہ ہر طرف آگ کے شعلے ہیں اور یہ قطران خود آتش گیر ہوتا ہے، اسپرٹ کی طرح جلتا ہے ـــــ تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت ان بدنصیبوں کو کیسا عذاب ہوگا ـــــ اللہ کی پناہ!

آگے فرمایا گیا ہے "وَتَغْشٰی وُجُوْھَھُمُ النَّارُ"۔ مطلب یہ ہے کہ آگ کے شعلے ان کے چہروں تک پہونچ رہے ہوں گے۔ اس سے یہ اشارہ مفہوم ہوتا ہے کہ ان کے چہروں پر قطران نہیں

لیپا جائے گا، بلکہ چہروں تک صرف شعلے پہونچیں گے۔ یہ غالباً اس لیے ہو گا کہ وہاں بھی پہچانے جا سکیں کہ یہ فلاں لیڈر صاحب ہیں اور یہ قوم کے فلاں سردار ہیں۔ اگر سب کے چہروں پر بھی قطران مل دیا جاتا تو کوئی نہ پہچانا جاتا۔ اس طرح چہروں پر قطران نہ ملا جانا بھی) ایک عذاب ہو گا ——— بس اللہ اپنی پناہ میں رکھے۔

آگے فرمایا گیا ہے "لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ إِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ"۔ ——— مطلب یہ ہے کہ یہ عذاب جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور جس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں یہ کوئی ظلم نہ ہو گا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا تقاضا ہو گا۔ عدل و انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ نیکو کاروں کو اُن کی نیکی کا اچھا صلہ اور ثواب دیا جائے، اُن پر عنایتیں ہوں اور ظالموں مجرموں کو اُن کے مظالم اور جرائم کی سزائیں دی جائیں، اگر کوئی حاکم ظالموں اور مجرموں کو سزا نہیں دیتا تو وہ حکومت کا اہل نہیں ہے ——— اللہ تعالیٰ کی پاک ذات تمام صفاتِ کمال کی جامع ہے، اس میں رحم بھی ہے اور عدل بھی ہے، وہ اچھے اعمال و اخلاق کا اپنی شانِ عالی کے مطابق صلہ عطا فرمائے گا اور ایسے گنہگار جو توبہ کر چکے ہوں گے، اور اسی طرح ایسے قصور وار جن کے قصور لائق معافی اور درگزر ہوں گے اُن کو اپنے کرم سے معافی دے گا اور رحم فرمائے گا، لیکن جنکے جرائم اور مظالم قطعاً ناقابلِ معافی ہوں گے اُن کو اپنے قانونِ عدل کے مطابق سزائیں دے گا، اور یہ سزائیں بھی اس کی شانِ قہر و جلال کے مطابق ہوں گی۔

"إِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ" سے یہ آگاہی دی گئی ہے کہ کوئی یہ سمجھ کر گناہوں پر جرأت نہ کرے اور آخرت کے محاسبہ سے غافل نہ ہو کہ قیامت اور آخرت کا معاملہ تو بہت دور ہے" یقین کرنا چاہیے کہ حساب کی گھڑی جلدی ہی آ جانے والی ہے ——— سورہ انبیاء کے شروع میں بھی فرمایا گیا ہے "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ" یعنی حساب کی گھڑی قریب ہی ہے اور لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ——— واقعہ یہ ہے کہ کل کا دن جو گزر چکا وہ بہت دور ہو گیا کیونکہ وہ اب کبھی ہاتھ نہیں آئے گا اور قیامت اور آخرت کا حساب کتاب چونکہ یقینی ہے، کوئی شک و شبہ نہیں ہے اس لیے سمجھنا چاہیے کہ وہ قریب ہی ہے ——— "إِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ" اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے اور بیان بھی کیا گیا ہے کہ

جب وقت آئے گا تو سب کا حساب کتاب بہت جلد بس چند لمحے میں ہو جائے گا دنیا کی عدالتوں کی طرح ایک ایک معاملہ میں مہینے اور برس نہیں لگیں گے۔ "اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝"

بالکل آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے: "ھٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِیُنْذَرُوْا بِہٖ وَلِیَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا ھُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ وَّلِیَذَّکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝"

مطلب یہ ہے کہ اس سورہ میں جو کچھ فرمایا گیا ہے یہ لوگوں تک پہونچانے کے لیے ایک اہم پیغام ہے اور اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ اللہ کے بندے اس کے ذریعہ خبردار اور خوابِ غفلت سے بیدار کیے جائیں، اور اس کی آیات اور مضامین میں غور و فکر کر کے اس یقین تک پہونچ جائیں کہ بندگی اور عبادت کا مستحق وہی ایک معبودِ برحق ہے اور عقل و دانش والے اس سے نصیحت و ہدایت حاصل کریں۔

آج کے درس پر سورۂ ابراہیم ختم ہو گئی، میں نے پہلے بھی آپ حضرات سے بار بار عرض کیا ہے کہ قرآن مجید کا اصل موضوع ہدایت اور نصیحت ہے، ہمیں ہر سورت بلکہ ہر رکوع اور ہر آیت سے گزرتے ہوئے یہ سوچنا چاہیے کہ اس میں ہمارے لیے کیا ہدایت اور کیا سبق ہے۔ آج جو آیتیں درس میں تھیں اُن کا خاص سبق ہمارے لیے یہ ہے کہ ہم آخرت کے حساب اور اپنے اعمال کے نتائج سے غافل نہ ہوں، ہمیشہ یہ بات سامنے رہے کہ خدا دیکھ رہا ہے اور وہ مجرموں کو بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔ ہمیشہ گناہوں اور نافرمانیوں سے بچتے رہیں، استغفار کرتے رہیں اور اُس کے عذاب اور قہر و جلال سے پناہ مانگتے رہیں ـــــ توحید پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں اور اعمال میں دو چیزوں کا بہت ہی اہتمام رکھیں ـــــ ایک اقامتِ صلوٰۃ کا یعنی اپنے امکان بھر اچھے طریقہ سے نماز پڑھنے کا، اور دوسرے اللہ جو کچھ نصیب فرمائے اُس میں سے اُس کی راہ میں دوسرے ضرورت مند لوگوں پر خرچ کرنے کا، اور اپنے لیے اور اپنے والدین اور سب اہلِ ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرتے رہیں۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝

اگر ان چند باتوں کا اہتمام نصیب ہو جائے تو انشاء اللہ بیڑا پار ہے اور اللہ کی رحمت میں ہمارا بڑا حصہ ہے۔ اللہ نصیب فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین و سلام علی المرسلین

Regd. No. L-353

Monthly **'ALFURQAN'** Kutchery Road
Lucknow U. P.

VOL 41 NO. 1 MARCH 73 Phone No. 25547

مرتبہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
بنگلہ دیش سے ۸/-
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت
فی کاپی ...... ۷۵ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۴۱ | بابت ماہ صفر المظفر ۱۳۹۳ھ مطابق اپریل ۱۹۷۳ء | شمارہ ۲

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۵ رمئی تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ر تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ر تاریخ تک آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

انقلاب چرخ اسے کہتے ہیں کہ مسز اندرا گاندھی، جو گزشتہ سال مارچ میں اپنے عروج کے شباب پر ہی تھیں، اس مارچ میں آثار کی کافی نچلی سیڑھی پر نظر آرہی ہیں۔ الٰہ آباد جو صرف ان کا وطن ہی نہیں بلکہ کانگریس تحریک اور کانگریسی حکومت کا نیرتھ کہا جاسکتا ہے —— کہ آنند بھون اسی کی سرزمین کا فخر ہے، جواہر لال نہرو کو اسی نے جنم دیا اور پوری پرورش اسی کی گود میں ہوئی، لال بہادر شاستری جو مرکزی کانگریسی حکومت کے دوسرے وزیر اعظم بنے اسی آب و گل کے پروردہ تھے، اور پھر تیسری وزیر اعظم اور کانگریس کو نئی زندگی اور نئی چمک دمک سے سرفراز کرنے والی مسز گاندھی ہے جس کا مادرانہ رشتہ ابھی ایک زندہ رشتہ ہے —— اسی الٰہ آباد کی زمین پر گزشتہ ماہ انھیں ایک ایسے مخالفانہ مظاہرے کا سامنا کرنا پڑا، جس کا تصور بھی اس سے پہلے نہ وہ کرسکتی تھیں نہ ان کے حامی و ہمنوا!

پھر اسی مارچ میں وہ لکھنؤ آئیں تو کوئی خاص مظاہرہ تو ریاستی حکومت کے پیش بندانہ انتظامات اور کچھ لکھنؤ کے خاص مزاج کی وجہ سے، اگرچہ نہیں ہوسکا مگر اور جو کچھ یہاں تھا وہ اُن کی بدمزگی کے لیے کم نہ تھا، جلسۂ عام کی حاضری اتنی کم کہ اسی کو دیکھ کر سرد ہو جائیں۔ خود ان کی پارٹی کے ذمہ داروں کا کہنا ہے کہ ملک کے کسی وزیر اعظم کی اتنی کمزور میٹنگ کبھی نہیں ہوئی! پھر جو مجمع تھا وہ مخالفانہ نقرے بازی اور تمسخر و بیزاری کے موڈ میں بھرا ہوا، جیسے تیسے انھوں نے اپنی تقریر کی اور جے کاروں کی گونج سنے بغیر جلسہ گاہ سے رخصت ہوگئیں۔

اور اس کے بعد سے وہ جس طرف جارہی ہیں اُدھر سے اسی رنگ کی خبریں روزمرہ ہی اخباروں میں آرہی ہیں اس لیے کہ دوروں کا ایک لمبا پروگرام انھوں نے آج کل بنا رکھا ہے۔

گویا جس تیزی سے مسز گاندھی کا سورج چڑھا تھا بالکل اسی تیزی سے آثار کی طرف مائل ہے۔

۱۹۶۹ء کے آخری حصے میں یہ سورج طلوع ہوا۔ ۱۹۷۱ء کے الیکشن میں نصف النہار پر پہونچ گیا۔ اور دسمبر ۷۱ء میں پاکستان پر فوجی فتح نے اس کے رخ کو وہ تابانی بخشی کہ محض سورج سے سورج دیوتا بن گیا۔ یعنی اب جیسے اس کے لیے زوال اور غروب کا سوال نہیں! اور "جیسے" کا کیا سوال؟ کم از کم مسز گاندھی کے انداز تو یہی بتلاتے تھے کہ انھیں قانونِ زوال اور آثار کا اندیشہ ہی اب نہیں۔ وہ تمکنت، وہ بالانشینی، وہ بے نیازی اور خود انحصاری کہ مقربین کے پر جلنے لگے۔ خیر اندیش مہر بلب ہو بیٹھے۔ جو کچھ شان برتری کے شایان نظر آیا وہ عمل میں آگیا خواہ عاقبت اندیشی اور معقولیت پسندی کی نگاہ میں کتنا ہی غلط تھا۔ غرض مندوں کے لیے ایسا وقت بڑا قیمتی ہوتا ہے، ہر طرف سے اس میں ہاں ملانے کے لیے امنڈ پڑے اور اس بے راہ روی کو وہ حوصلہ دیا کہ سال ہی بھر میں چمکتے ہوئے سورج کی جگہ "کالی مائی" کا روپ لوگوں کو نظر آنے لگا۔

نگاہ کی یہ تبدیلی سب سے پہلے مسلمانوں میں آئی جو صرف اچھی امیدوں میں عام اہل ملک کے شریک تھے، پرستاری میں نہیں، (بلکہ جہاں سے لوگوں نے پرستاری شروع کی وہ وہاں سے اچھی امیدوں میں بھی مشکوک ہوگئے تھے) اور جنھیں پرستاری کی پیدا کردہ تمکنت اور بے خودی نے اپنے براہ راست اقدامات کا سب سے پہلا نشانہ بنانے کے لیے چھانٹا! ـــ یہ اقدام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۷۲ء کا اقدام تھا۔ امیدوں کی جوت جگا کر اس بے رحمی کے ساتھ انھیں کفن پوش بنا دینے کا کوئی دوسرا واقعہ شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ ۷۱ء کے پارلیمانی الکشن میں الیکشنی اعلانیہ (مینی فیسٹو) میں بھی کافی قابل اعتماد لفظوں سے اور اس اعلانیہ کے پیچھے کی گفتگوؤں میں، بالکل ہی صاف اور کھلے لفظوں میں یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ علی گڑھ یونیورسٹی کا نیا ایکٹ جو پارلیمنٹ کو بنانا ہے وہ کانگرس کی ضروری اکثریت آجانے کی صورت میں بالکل ان کی دستوری مانگ کے مطابق بنے گا اور جلد از جلد بنے گا ـــ لیکن سال بھر ٹال کر یونیورسٹی کے طلباء میں ہیجان کی شکل برپا ہو جانے پر جب اس ایکٹ کا بل پارلیمنٹ میں لایا گیا تو وہ محض ایک وعدہ فراموش کا لایا ہوا نہیں، کسی ازلی مخالف کا لایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ پھر اس بل کو پاس کرانے میں جلدی اور عدم شنوائی کا انداز بھی یہ بتلانے والا کہ کوئی بھول چوک کا معاملہ نہیں پوری بیداری کے ساتھ ارادے اور تہیّے کا معاملہ ہے، چیخنے والے حیرت اور سراسیگی کے عالم میں چیختے رہ گئے اور بل اسی کانگرسی اکثریت

کے بل پر آناً فاناً پاس ہوگیا جسے بنانے میں مسلمانوں (ہ) نے بھی اپنی بساط بھر حصہ اپنی جائز مرضی کے یونیورسٹی ایکٹ اور ایسے ہی دوسرے مسائل کے لیے لیا تھا۔

وعدوں کی ایک قسط جو اقلیتی تعلیمی اداروں سے متعلق تھی اس شکل میں ادا ہوئی۔

دوسری قسط جو اقلیتوں کے جان و مال اور عزت و حیثیت کے عام تحفظ سے تعلق رکھتی تھی اُس کی شکل کچھ اس سے زیادہ ہی ہوش رُبا تھی اور وہ یوں سامنے آئی کہ

علی گڑھ یونیورسٹی کا یہ نیا ایکٹ پاس ہوجانے پر جب مسلمانوں نے اپنی بے چینی اور ناگواری کا اظہار کرنے کے لیے ایک دن (۱۶ر جون ۷۲ء) متعین کیا کہ اس دن وہ کاروبار بند رکھیں گے، کالے جھنڈے لہرائیں گے، کالی پٹیاں بازوؤں پر باندھیں گے اور حکام کی اجازت ملنے پر احتجاجی جلسے عام جگہوں پر، ورنہ بعد نماز جمعہ مساجد میں کریں گے تو ان "حرکتوں" سے روک تھام میں وہ مار اُن کو یو۔پی کی پولیس اور پی۔اے۔سی نے لگائی کہ اس سے پہلے صرف اس قسم کی "حرکتوں" پر آزاد ہندوستان میں کبھی نہیں لگی تھی۔ فیروز آباد، بنارس اور علیگڈھ میں تو بزبان عوام "بھوسہ ہی بھر دیا گیا"۔ اور اس نیک کام میں اکثریتی فرقہ کو بھی یوپی حکومت کی ان ایجنسیوں نے بدترین ہتھکنڈوں سے جہاں تک بس چلا گھسیٹ کر شریک کیا۔ مسز گاندھی جو اس وقت بیرون ملک کے دورے پر تھیں، چند دن بعد واپس آئیں تو پریس کانفرنس کے ایک سوال پر اُن کے جواب نے بتایا کہ جتنا کچھ ہوگیا تھا اُسے وہ کافی نہیں سمجھتیں۔ اور وزیر اعلیٰ یو۔پی نے بھی اسی موڈ سے شہ پاکر فرمایا کہ "مسلمان ایسا کام کرتے ہی کیوں ہیں جو پی۔اے۔سی کو مار لگانی پڑے"۔

——— پی اے سی کو تربیت ہی اس بات کی دیجاتی ہے۔ اس کا کام ہی یہ ہے:"

یہ الیکشن مینی فیسٹو کے وعدوں کی دوسری قسط تھی، جو مسلمانوں کو ادا ہوئی! اور اس کے بعد ان کی برگشتگی جس حد کو بھی پہونچ جائے کم ہے۔

مسز گاندھی نے جیسی زیرکی، دانائی اور تدبر و فراست کا ثبوت پارٹی کے سنڈیکیٹ سے اپنی پنجہ آزمائی میں دیا تھا اور پھر بنگالی پناہ گزینوں کے مسئلے پر جام و سنداں باختن" کی جو اعلیٰ ترین صلاحیت انھوں نے دکھائی کہ ایک طرف ان کی حمایت میں پاکستان کو چکنا چور کر دینے کا عزم تکمیل کو پہونچا کے

چھوڑا، اور دوسری طرف نو دس مہینے کی ایک لمبی ہیجانی مدت میں کبھی نہ اپنی زبان پر کوئی شائبہ اس واقعہ سے تاثر کا آنے دیا کہ ان پناہ گزینوں کی اکثریت ہندو تھی اور نہ کسی اور ہی کے لیے ملک میں یہ بات ممکن رکھی کہ اس سلسلے میں ہندو مسلمان کی اصطلاحوں میں گفتگو کر سکے، جس سے دنیا کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ ہندوستان جو کچھ کر رہا ہے وہ انسان دوستی اور مظلوم نوازی کے بجائے در اصل ہندو نوازی اور پاکستان دشمنی کا کھیل ہے —— کیسی غیر معمولی اور مثالی قوت برداشت اور ضبط و تحمل کا یہ مظاہرہ تھا! یہ راقم سطور تو بس عش عش کر تا رہ گیا، اور ہاتھ ملا کیا کہ کاش کچھ لکھنے کے لائق طبیعت ہوتی! تو لکھنے کی اور مسلمان لیڈروں سے کہنے کی بات تھی کہ یوں ہوتی ہے سیاست اور قیادت! یہ بھڑ بھڑیا پن کوئی سیاست اور قیادت نہیں ہے کہ حق گوئی اور جوانمردی کا نعرہ لگا کر ان کہنیاں بھی کہنے سے نہ رکو!

اور اس دانشمندانہ ضبط و تحمل کی اُس وقت تو بالکل ہی حد ہو گئی جب مشرقی پاکستان میں ۹۳ ہزار فوج سے ہتھیار رکھوانے اور مغرب میں پاکستانی فوج سے بے بسی منوا لینے کا فخر بھی — جو ہندوستان کی پوری تاریخ کا پہلا فخر تھا —— اس ضبط و تحمل — کی نگہداشت میں اتنا سا فرق بھی نہیں ڈال سکا کہ فتح کی خوشی کے جو جلوس غیر سرکاری طور پر ملک میں نکالے گئے، ان میں بھی کوئی ایسی بات زبان پر لانے کی آزادی لوگوں کو ملتی جو اس سرکاری مصلحت اندیشی کے خلاف تھی! اس جشن و جلوس والے دن ایسے ایسوں نے اس مصلحت اندیشانہ کمال کی داد دی جن سے اعتراف کی بھی توقع مشکل تھی۔

جولائی ۶۹ء سے —— جبکہ کانگریس کی اندرونی جنگ کا آغاز ہوا — دسمبر ۷۱ء کی پاکستان پر فتحیابی تک کی یہ عش عش کرا دینے والی سیاسی دانائی، یہ مدبرانہ روش اور قائدانہ مصلحت شناسی جس شخصیت سے دیکھنے میں آئی تھی، اُسی سے اس کے بالکل برعکس طرز عمل کا اظہار بھی پلک جھپکتے ہی ہو جائے گا! یہ بات تصور میں آنے کی بھی نہیں تھی، مگر خدا کے یہاں جب کسی دماغ کو الٹنے کا ارادہ ہو جائے، تو دیر نہیں لگتی چنانچہ وہی اندرا گاندھی جب پاکستان سے فرصت پانے کے بعد اندرونی مسائل کی طرف رُخ کرتی ہیں اور ایک مسئلہ بہار کے مسلمانوں کی اس شکایت کا سامنے آتا ہے کہ بنگلہ دیش کے بہاری مسلمانوں کی حفاظت کے لیے وہ کچھ نہیں کر رہی ہیں جبکہ ان کا عدم تحفظ خود ہمارے ہی عمل (بنگلہ دیش بنوانے) کا شاخسانہ ہے حتیٰ کہ جو بہاری مسلمان پناہ گزینوں کے طور پر ادھر آ گئے ہیں اُن کے ساتھ بھی انسانی ہمدردی کے بجائے

بے رحمی کا سلوک سرکاری طور پر کیا جا رہا ہے۔ بہار کے نمائندہ مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ جب ان لوگوں کو بنگلہ دیش میں امن نہیں مل سکتا تو انسانی ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں ہندوستان کی شہریت دیدینے پر غور کیا جائے۔ خاص کر اس لیے کہ یہ اصل میں یہیں کے شہری تھے اور عموماً ۱۹۴۷ء کی بے پناہ مارکاٹ سے مجبور ہو کر ترک وطن کر گئے تھے ــــ قابل قبول ہو یا نہ ہو لیکن یہ ایک قابل غور بات ضرور تھی اور قبول نہ ہو سکنے کی صورت میں خوش اسلوبی سے عذر کرنا ہی دانشمندی تھی۔ مگر وہی اندرا گاندھی جو بنگالی پناہ گزینوں کے معاملے میں ہندو مسلمان کے احساس کا شائبہ تک زبان پر نہیں آنے دے رہی تھیں، اس تمام احتیاط اور تحمل سے اب بالا ہو جاتی ہیں۔ اور اپنے غیر ہمدردانہ جوابوں سے مسلمانوں کو یہ سوچنے پر بلا تامل مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ ہندو مسلمان کی تفریق سے بالا نہیں ہیں۔

اس وقت متعدد ریاستوں کا الیکشن سر پر کھڑا تھا جن میں ریاست بہار بھی تھی۔ بہار کے مسلمانوں نے مسز گاندھی کے رویہ سے مشتعل ہو کر فیصلہ کیا کہ وہ اس الیکشن میں مخالف پارٹیوں کی حمایت کر کے حکمراں کانگریس کو سبق سکھائیں گے۔ لیکن اندرا گاندھی جس راہ پر چل پڑی تھیں، اس سے ہٹنے کے بجائے انھوں نے صاف صاف اس چیلنج کو قبول کیا اور اس کی قیمت یہ ادا کی کہ پارٹی مشکل سے چند سیٹوں کی اکثریت حاصل کر سکی جبکہ تمام دوسری ریاستوں میں اُسے بھاری اکثریت ملی۔

اسکے بعد فوراً ہی دوسرا مسئلہ یہ سامنے آیا کہ پارلیمنٹ کا گرمائی اجلاس شروع ہوا تو علی گڑھ اولڈ بوائز کنونشن کونسل نے علی گڑھ یونیورسٹی کا موعودہ بل لانے کی یاددہانی کی جو سال بھر سے ٹالا جا رہا تھا، علی گڑھ کے لڑکے بھی جوش میں آگئے اور اس مطالبے کی حمایت میں اُن کے قافلے دہلی پہونچ کر مظاہرے کرنے لگے۔ مسز گاندھی بہار کے الکشن والی ناگواری ہی کے موڈ میں تھیں۔ وہ یہاں تک کہہ چکی تھیں کہ ہمارے یہاں کے کچھ مسلمان بنگلادیش میں پاکستان کی شکست کو ہضم نہیں کر سکے ہیں۔ بظاہر اسی موڈ میں انھوں نے آناً فاناً علی گڑھ یونیورسٹی کا بل پیش کرا دینے کا فیصلہ کیا جو اسی ناگواری سے بھرا ہوا ایک تھپیڑ تھا جو مسلمانوں کے منھ پر رسید ہوا۔ اور اس پر تلملاہٹ کا علاج کرنے کے لیے، وہ پولیس ایکشن تجویز ہوا جسے فیروز آباد، بنارس اور علی گڑھ میں یوپی کی پولیس اور پی۔ اے۔ سی نے انجام دیا۔

محترمہ اندرا گاندھی کے ذہن سے یہ دوربینی اور عاقبت اندیشی غالباً بالکل ہی رخصت ہو گئی تھی کہ

ہندو عوام کی یہ تائید جو انہیں بہار کے الکشن میں بچا کر لے گئی کوئی دائمی پٹہ نہیں ہو، حالات کا کوئی بھی پلٹا اسے اُلٹا کر سکتا ہو!۔ اور حالات کا یہ پلٹا ملک کی اُن معاشی اور اقتصادی مشکلات کی تہوں میں پرورش پا رہا تھا جو اسٹیٹ کی کمزور معاشی اور اقتصادی حالت کے پس منظر میں بنگلا دیش کی جنگ اور اسکے بعد اس دیش کی سرپرستانہ امداد سے وجود میں آنے کی آہٹ فوراً ہی دینے لگی تھیں۔ چنانچہ اس ستم رانی کے بعد چھ مہینے نہیں گزرے تھے کہ ملک میں اقتصادی بے چینی بڑے پیمانے پر شروع ہو گئی۔ ہڑتالوں اور اسٹرائکوں کا دور دورہ ہوا۔ بجلی کے جیسے اہم محکموں پر یہ دورہ بار بار پڑا، پی۔ ڈبلو۔ ڈی کے انجینیر بھی اس کا شکار ہوئے۔ عوامی اصلاتی خدمتیں بھی ہفتوں ہفتوں جام رہیں۔ معمولی اہلکاروں سے لے کر وزیروں تک میں من مانی، بدعنوانی اور رشوت خوری الگ، اس اندرائی دور میں اتنی بڑھتی رہی تھی جس کی مثال نہیں ملتی۔ ان دونوں باتوں نے مل کر ملک کو "اندھیر نگری چوپٹ راج" اور ایک کنگال ملک کا مصداق بنا دیا۔ نہ دانہ نہ پانی، نہ قاعدہ اور قانون۔ جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ بھی ندارد، اور بنیادی ضرورت کی چیزیں بھی عنقا۔ وہ ساری مقبولیت اور تائید دیکھتے دیکھتے ہوا ہو گئی جس کے ناز میں مسلمانوں سے بے نیازی ہی نہیں بے رحمی برتی گئی تھی۔ اور وہ وقت بڑی جلد تک آگیا کہ کہنے والے کہہ سکیں ؎

اسی باعث تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر!

حد یہ ہو کہ پارٹی سے باہر جو تھوڑے بہت وفادار اور جاں نثار اب رہ گئے ہیں، وہ بھی حمایت میں کوئی مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں تو بظاہر مخالفت اور آگاہی اور چھاونی کا عنوان لے کر جاتے ہیں۔ جیسا کہ ابھی ہفتہ بھر پہلے ایک کمیونسٹ مظاہرہ پارلیمنٹ پر ہوا ہے۔

تو یہ ہے آدمی کی عظمتوں اور رفعتوں کی کل کائنات! جسے اگلے اہل نظر ان لفظوں میں جتا گئے ہیں کہ ؎

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

خدا نے اندرا کا فیصلہ کیا تو حکمت و تدبر کے دروازے دل و دماغ پر کھل گئے اور پھر گرنے کا — چاہے وہ عارضی ہو یا دائمی — فیصلہ کرایا تو یہ سب دروازے اُن کی اُن میں بند اور بد عقلی کا دور دورہ! —

ورنہ، اگر عقل ساتھ نہ چھوڑ گئی ہوتی، تو مسلمانوں کو بنگلا دیش کے غیر بنگالی مسلمانوں کے سوال پر — یا بقول اندراجی 'ہندوستان کے ہاتھوں پاکستان کی شکست ہضم نہ کر سکنے' کی بنا پر — جو جذباتی دوری اُن سے اور

ان کی پارٹی سے ہو گئی تھی اُسے وہ علی گڑھ یونیورسٹی بل پر اپنا وعدہ پورا کر کے دور کر سکتی تھیں۔ اور یہ چونکہ محض ایک وعدے کا ایفا ہوتا اسلئے ان کے وقار کو ٹھیس لگنے اور ایک خوشامدانہ منہ بھرائی کہلانے کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔ مگر یہ سنہرا اور خداداد موقع الٹا اِس خلیج کو بحر الکاہل بنا ڈالنے کے ڈھنگ سے استعمال کیا گیا۔

اندراجی کا یہ رویہ مسلمانوں کیلئے بڑا سانحہ ہو۔ کم از کم ہمارے نزدیک آزادی ہند کے پچیس برس میں کسی قومی لیڈر سے اتنے بھروسے کے ساتھ امیدیں مسلمانوں نے قائم نہیں کی تھیں اور نہ ایسی جذباتی حمایت کسی کی کی تھی جیسی اندراجی کی۔ پس اب اگر اس کا ردعمل ہوتا ہے اور مسلمان ان بے رحمانہ بے وفائیوں کا حساب چکانے کے لیے اسوقت کے حالات سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں تو یہ بالکل قدرتی اور قابل فہم بات ہو۔ اور اسکے جواز کو کوئی بھی چیلنج نہیں کر سکتا کہ جن لوگوں نے زخم کھایا ہو وہ اس کا بدلہ لینے کا وقت آنے پر ہاتھ بڑھائیں۔ لیکن یاد رہے کہ ردعمل کا وقت بڑا نازک اور بیحد ہوش طلب ہوتا ہو۔ یہ اندرا گاندھی جیسی گہری اور ہوشمند لیڈر ردعمل ہی کے سیلاب میں بہہ کر اس حال کو پہنچی ہیں۔ اور ایسا کوئی قانون قدرت اس دنیا میں نہیں ہو کہ ایک چیز اندرا گاندھی کے لیے تو زہر مگر آپ کیلئے امرت بنجائے!۔ موقع بلاشبہ نہایت اچھا ہو اور اس کو ہاتھ سے جانا نہیں چاہیئے مگر اسکے لیے وہ ہاتھ ہونے چاہیئں جو بہت آگے تک کی دیکھ کر بڑھیں، نہ کہ وہ جنھیں ایک ہاتھ بھی آگے نظر نہیں آتا اور اپنی فریب کا خود ہی شکار رہتے ہیں۔

جو لوگ علی گڑھ یونیورسٹی کی مہم ابتک چلاتے رہے ہیں اُن میں سے بیشتر ذاتی تعلق اور باقی کے لیے عزت اور نیک گمانی کے باوجود کہنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے اقدام و عمل کے ممکن مخالف اثرات یا حالات کی تبدیلی سے توقعات کی بساط اُلٹ جانے اور جدوجہد بیکار جانے کے امکانات پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔ یہی اور صرف یہی سبب ہو کہ ہر کوشش کے آخری نتیجے میں وہ ابتک منزل سے اور زیادہ دور ہی ہوئے ہیں۔ وہ موافق نظر آنے والے ہر وقت اور ہر موقع کے بس موافق رُخ پر ساری پونجی لگا دیتے ہیں، احتیاط کی مد میں کچھ بھی بچا کر نہیں رکھتے۔ بُرا ماننے کی بات نہیں ہو، انہی میں سے زیادہ نمایاں لوگ تھے جنھوں نے ۱۹۶۷ء میں ساری پونجی توقعات کے نشہ میں چور ہو کر اپوزیشن کے گھوڑوں پر لگا ڈالی اور نتیجہ وہ ہاتھ آیا جس سے آجتک منہ کڑوا ہو! پھر انہی میں کچھ اور ان کے جیسے ہی کچھ دوسرے لوگ، ہمیں معاف کیا جائے، تھے جنھوں نے "ہماری" مسلمانوں کے مسئلے پر اپوزیشن کی خالص موقع پرستانہ حمایت سے بہک کر بہار میں اندرا گاندھی کو وہ چیلنج دیا جس کی جرأت تو لاریب قابل داد مگر عقل و خرد سے دوری بھی سورج کی طرح روشن ہو اور روشن تھی! بہاری مسلمانوں کے مسئلے کا کچھ نہ بنا کر علی گڑھ کے مسئلے کو بدترین حالت میں پہونچانے کی جو چیز سب سے زیادہ ذمہ دار ہو، لوگوں کو شاید احساس نہیں وہ یہی واقعہ ہے!۔ اور کس طرح دل کا درد ظاہر کیا جائے کہ اب جو موافق حالات سامنے آئے ہیں اور اس قافلے نے رخت سفر باندھا ہو تو ہو بہو پرانے ہی نقش قدم ہیں جن پر نئے قدم پڑ رہے ہیں۔ اگر یہی انداز عمل ہو اور قوم بھی اس کا ساتھ دیتی ہو تو یقین کر لینا چاہیے کہ قوم کے مقدر پر تالا پڑ گیا ہے!۔

کتاب المعاشرۃ والمعاملات

معارف الحدیث

(مسلسل)

نکاح و ازدواج اور اُس کے متعلقات (۲)

مہر کی اہمیت اور اُس کا لزوم :-

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مندرجہ بالا روایت سے معلوم ہو چکا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے زمانہ جاہلیت میں نکاح کا جو شریفانہ طریقہ عربوں میں رائج تھا اُس میں بھی مہر مقرر کیا جاتا تھا، یعنی نکاح کرنے والے مرد کے لیے ضروری ہوتا تھا کہ وہ بیوی کو ایک معین رقم ادا کرنا اپنے ذمہ لے، اسلام میں اس طریقہ کو برقرار رکھا گیا۔ یہ مہر اس بات کی علامت ہو کہ کسی عورت سے نکاح کرنے والا مرد اس کا طالب اور خواستگار ہے اور وہ اپنی حیثیت اور استطاعت کے مطابق اس کو مہر کا نذرانہ پیش کرتا ہے یا اس کی ادائیگی اپنے ذمہ لیتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہر کی کوئی خاص مقدار معین نہیں فرمائی کیونکہ نکاح کرنے والوں کے حالات اور اُن کی وسعت و استطاعت مختلف ہو سکتی ہے ——— البتہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی صاحبزادیوں کا مہر پانچسو درہم مقرر فرمایا اور آپ کی اکثر ازواج مطہرات کا مہر بھی یہی تھا ——— لیکن حضورؐ کے زمانہ میں اور آپ کے سامنے اس سے بہت کم اور بہت

زیادہ بھی مہر باندھے جاتے تھے، حضور کی صاحبزادیوں اور ازواج مطہرات والے مہر کی پابندی ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی ۔

مہر کے بارہ میں قرآن وحدیث کی ہدایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض فرضی اور رسمی بات اور زبانی جمع خرچ کے قسم کی چیز نہیں ہے بلکہ شوہر کے ذمہ اس کی ادائیگی لازم ہے، الا یہ کہ بیوی خود ہی وصول کرنا نہ چاہے ـــــ قرآن پاک میں صراحتہً ارشاد ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَاءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ـــــ یعنی اپنی بیویوں کے مہر خوشدلی سے ان کو ادا کر دو (النساء ع ۱) ـــــ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارہ میں جو تاکید وتشدید فرمائی ہے وہ آگے درج ہونے والی بعض حدیثوں سے معلوم ہوگی۔

عَنْ مَيْمُوْنَ الْكُرْدِيِّ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا رَجُلٍ تَزَوَّجَ اِمْرَأَةً عَلٰى مَا قَلَّ مِنَ الْمَهْرِ اَوْ كَثُرَ لَيْسَ فِيْ نَفْسِهٖ اَنْ يُّؤَدِّيَ اِلَيْهَا حَقَّهَا لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَهُوَ زَانٍ ـــــ رواہ الطبرانی فی الاوسط والصغیر

میمون کردی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے کسی عورت سے کم یا زیادہ مہر پر نکاح کیا اور اس کے دل میں اس حق مہر کی ادائیگی کا ارادہ ہی نہیں ہے تو وہ قیامت میں اللہ کے حضور میں زناکار کی حیثیت سے پیش ہوگا۔ (معجم اوسط ومعجم صغیر للطبرانی)

(**تشریح**) مطلب یہ ہے کہ جو شخص ادائے مہر کے بارے میں شروع ہی سے بدنیت ہے، اس نے مہر کا اقرار تو کر لیا ہے لیکن دل میں یہ ہے کہ یہ بس زبانی بات ہے، دینا دلانا کچھ نہیں ہے تو اس کے نکاح میں اتنا بڑا نقص اور وہ اس درجہ کا گنہگار ہے کہ قیامت میں وہ زنا کا مجرم قرار دیا جائے گا ـــــ قریب قریب اسی مضمون کی اس کے علاوہ بھی متعدد حدیثیں مختلف کتب حدیث کے حوالے سے کنز العمال میں نقل کی گئی ہیں ـــــ ان حدیثوں میں ایسے لوگوں کے لیے بڑی سخت وعید اور آگاہی ہے جو مہر کو صرف زبانی اور رسمی بات سمجھتے ہوئے اتنی بڑی رقم مہر مقرر کر لیتے ہیں جن کی ادائیگی کا کوئی امکان ہی نہیں ہوتا۔

عَنْ اَبِي سَلَمَةَ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ كَمْ كَانَ صِدَاقُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَتْ كَانَ صِدَاقُهُ لِاَزْوَاجِهِ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ اُوْقِيَةً وَنَشٌّ ——— رواہ مسلم

ابو سلمہ سے روایت ہے کہ میں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مہر کتنا تھا؟ تو انھوں نے بتایا کہ آپ نے اپنی بیویوں کے لیے جو مہر مقرر فرمایا تھا وہ ساڑھے بارہ اوقیہ تھا۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہوتا تھا اس حساب سے ساڑھے بارہ اوقیہ کے پورے پانچ سو درہم ہوتے تھے۔ یہ حساب اور تشریح خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے ——— یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اُس زمانہ میں پانچ سو درہم کی رقم اچھی خاصی ہوتی تھی، اس سے کم و بیش دو ڈھائی سو بکریاں خریدی جاسکتی تھیں۔

عَنْ اُمِّ حَبِيبَةَ اَنَّهَا كَانَتْ تَحْتَ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ جَحْشٍ فَمَاتَ بِاَرْضِ الْحَبَشَةِ فَزَوَّجَهَا النَّجَاشِيُّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَمْهَرَهَا عَنْهُ اَرْبَعَةَ آلَافِ دِرْهَمٍ وَبَعَثَ بِهَا اِلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَ شُرَحْبِيلَ بْنِ حَسَنَةَ۔

——— رواہ ابو داؤد والنسائی

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انھوں نے بیان کیا کہ وہ عبید اللہ بن جحش کے نکاح میں تھیں (اور اپنے شوہر کے ساتھ انھوں نے مکہ سے ملک حبشہ کو ہجرت کی تھی وہیں حبشہ میں) اُن کے شوہر عبید اللہ بن جحش کا انتقال ہو گیا تو حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے ان کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا اور حضور کی طرف سے چار ہزار درہم مہر باندھ کے خود ہی اُن کو ادا کر دیا اور شرحبیل بن حسنہ صحابی کے ساتھ ان کو حضور کے پاس بھیج دیا۔ (سنن ابی داؤد، سنن نسائی)

(تشریح) یہ اُم حبیبہ رضؓ ابو سفیان کی بیٹی تھیں جو فتح مکہ تک کفار مکہ کے لیڈر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین دشمن رہے، پھر ہجرت کے آٹھویں سال فتح مکہ کے موقع پر اُن کو

قبول اسلام کی توفیق ہوئی۔ لیکن ان کی یہ بیٹی بہت پہلے دعوتِ اسلام کے ابتدائی دور ہی میں اسلام قبول کر چکی تھیں، انکے شوہر عبید اللہ بن جحش نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، پھر جب مکہ میں اسلام قبول کرنے والوں کو حد سے زیادہ ستایا گیا تو حضورؐ کی اجازت اور ایماء سے بہت سے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ام حبیبہ اور اُن کے شوہر نے بھی ہجرت کی ــــ پھر اللہ کی شان کچھ مدت کے بعد شوہر عبید اللہ بن جحش نے اسلام چھوڑ کر نصرانی مذہب اختیار کر لیا جو عام اہل حبشہ کا مذہب تھا۔ اور شراب وغیرہ کثرت سے پینے لگے، پھر اسی حالت میں ان کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اُم حبیبہ استقامت کے ساتھ برابر اسلام پر قائم رہیں ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب عبید اللہ بن جحش کے انتقال کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اُم حبیبہ کی قدر دانی و دلداری اور دوسرے اہم مصالح کے پیش نظر اُن کو اپنے نکاح میں لے لینے کا ارادہ کیا اور شاہ حبشہ نجاشی کے پاس قاصد بھیجا کہ ام حبیبہ کو میری طرف سے نکاح کا پیام دیا جائے، نجاشی نے اَبرَھہ نامی اپنی باندی کے ذریعہ ام حبیبہ کو پیام دیا، انھوں نے بہت ہی مسرت اور ممنونیت کے ساتھ اس کو منظور کر لیا، اور مہاجر مسلمانوں میں سے اپنے ایک قریبی عزیز خالد بن سعید بن العاص کو اپنا وکیل بنا دیا، اور جیسا کہ ابوداؤد اور نسائی کی اس زیر تشریح روایت میں ہے نجاشی نے حبشہ ہی میں ان کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔ اور خود ہی آپ کی طرف سے مہر بھی نقد ادا کر دیا ــــ ابوداؤد کی اس روایت میں مہر کی مقدار چار ہزار درہم بتائی گئی ہے۔ لیکن مستدرک حاکم وغیرہ کی روایت میں چار ہزار دینار ذکر کی گئی ہے، اور اصحاب نقل و روایت نے اسی کو ترجیح دی ہے ــــ بہر حال ازواج مطہرات میں سے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا مہر دوسری اُمہات المومنین کی بہ نسبت بہت زیادہ تھا، لیکن یہ حضورؐ نے نہیں بلکہ نجاشی نے مقرر کیا تھا جو ایک بادشاہ تھا اور یہی اسکی شان اور حیثیت کے لائق تھا، اور جیسا کہ حدیث میں ہے اس نے خود ہی ادا بھی کیا، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت کے چھٹے یا ساتویں سال کا ہے ــــ

نجاشی حبشہ کے بادشاہوں کا لقب تھا، اس نجاشی کا اصل نام اَصحمہ تھا وہ مسلمان مہاجرین کے ذریعہ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تعلیم سے واقف ہوا تھا، اور اس نے اسلام قبول کر لیا تھا، ۸ھ یا ۹ھ ہجری میں اس کا انتقال ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو وحی سے اس کی اطلاع ہوئی آپ نے صحابہ کرام کو اس کی اطلاع دی اور مدینہ طیبہ میں اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ —— رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ

نکاح کے بعد مبارکباد اور دعا:۔

دنیا کی مختلف قوموں اور گروہوں میں شادی اور نکاح کے موقع پر مبارکبادی کے مختلف طریقے رائج ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع کے لیے اپنی تعلیم اور عمل سے یہ طریقہ مقرر فرمایا کہ دونوں کے لیے اللہ سے برکت کی دعا کی جائے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو بھرپور خیر اور بھلائی نصیب فرمائے اور اپنے کرم کے بادل برسائے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا رَفَّأَ الْاِنْسَانَ اِذَا تَزَوَّجَ قَالَ بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ وَبَارَكَ عَلَیْكُمَا وَجَمَعَ بَیْنَكُمَا فِیْ خَیْرٍ —— رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی ایسے آدمی کو جس نے شادی کی ہوتی مبارکباد دیتے تو یوں فرماتے، اللہ تم کو مبارک کرے تم دونوں پر برکت نازل فرمائے اور خیر اور بھلائی میں تم دونوں کو ہمیشہ متفق اور مجتمع رکھے۔ (مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا تَزَوَّجَ اَحَدُكُمْ اِمْرَأَةً اَوِ اشْتَرٰی خَادِمًا فَلْیَقُلْ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ خَیْرَهَا وَخَیْرَ مَا جَبَلْتَهَا عَلَیْهِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا جَبَلْتَهَا عَلَیْهِ —— رواہ ابوداؤد

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرے یا خدمت کرنے والا غلام یا باندی خریدے تو یہ دعا کرے۔ اے اللہ اس میں جو خیر اور بھلائی ہے اور تو نے اس کی فطرت میں جو خیر اور بھلائی رکھی ہو میں تجھ سے اس کا سائل ہوں

وہ مجھے نصیب فرما۔ اور اس کے شر سے اور اس کی فطرت کے شر سے میں تیری پناہ مانگتا ہوں تو اس سے میری حفاظت فرما۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) شادی اور نکاح انسان کی نفسانی شہوت کی تسکین کا ذریعہ ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دُعائیں تعلیم فرما کر اس کو بھی قرب الٰہی کا وسیلہ اور ایک نورانی عمل بنا دیا ——— (یہ دونوں دُعائیں اسی سلسلۂ معارف الحدیث کی "کتاب الدعوات" میں بھی گزر چکی ہیں)

شادی جتنی ہلکی پھلکی اور آسان ہو اتنی ہی بابرکت ہے:۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْظَمُ النِّكَاحِ بَرَكَةً اَيْسَرُهُ مُؤْنَةً ——— رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ نکاح بہت بابرکت ہے جس کا بار کم سے کم پڑے۔ (شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) ظاہر ہے کہ اس حدیث کا مقصد صرف ایک حقیقت بیان کر دینا نہیں ہے، بلکہ اس میں اُمت کو ہدایت اور رہنمائی دی گئی ہے کہ شادیاں ہلکی پھلکی اور کم خرچ ہوا کریں، اور بشارت سنائی گئی ہو کہ اگر ہم ایسا کرینگے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری شادیوں اور اُسکے نتیجوں میں بڑی برکتیں ہوں گی ——— آج ہم جن پریشانیوں میں مبتلا ہیں اور خاصکر خانگی زندگی میں جو اُلجھنیں ہیں اُن کا بہت بڑا سبب یہی ہے کہ نکاح و شادی کے بارہ میں حضور کی ان ہدایات سے انحراف کر گئے ہیں۔ ہم آسمانی برکات اور خداوندی عنایات سے محروم ہو گئے ہیں۔

فاطمی جہیز:۔

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ جَهَّزَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ فِيْ خَمِيْلٍ وَّقِرْبَةٍ وَّوِسَادَةٍ حَشْوُهَا اِذْخِرٌ ——— رواہ النسائی

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی

فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کو جہیز کے طور پر یہ چیزیں دی تھیں، ایک پھُودار چادر، ایک مشکیزہ، ایک تکیہ جس میں اذخر گھاس بھری ہوئی تھی۔ (سنن نسائی)

(تشریح) بس یہ تھا وہ سارا جہیز جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی سیدہ فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کو دیا تھا۔ افسوس ہے کہ خاصکر ہم ہندوستانی مسلمانوں نے جہیز کو ایک عذاب اور لعنت بنا لیا ہے۔

شادی کے بعد ولیمہ :-

اپنی حسب خواہش کسی عورت سے نکاح ہو جانا بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت اور دلی خوشی اور مسرت کی بات ہے اور اس کا حق ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر اور اپنی دلی مسرت وشادمانی کا اظہار ہو، ولیمہ اسی کی عملی شکل ہے۔ اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ اس کے ذریعہ شادی کرنے والے مرد اور اس کے گھرانے کی طرف سے خوبصورتی کے ساتھ اس کا اعلان و اظہار ہو جاتا ہے کہ شادی کے اس رشتہ سے ہم کو اطمینان اور خوشی ہے اور ہم اس کو اللہ تعالیٰ کی قابل شکر نعمت سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز منکوحہ عورت اور اس کے گھر والوں کے لیے بڑی خوشی اور اطمینان کا باعث ہوگی اور اس سے باہمی تعلق و مودت میں اور اضافہ ہوگا ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات اور عمل دونوں سے اس کی رہنمائی فرمائی۔

عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَاٰی عَلٰی عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ اَثَرَ صُفْرَةٍ فَقَالَ مَا هٰذَا؟ قَالَ تَزَوَّجْتُ اِمْرَأَةً عَلٰی وَزْنِ نَوَاةٍ مِنْ ذَهَبٍ قَالَ بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ۔

ـــــــــــ (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد الرحمن بن عوف پر (یعنی ان کے کپڑوں پر یا جسم پر) زردی کا کچھ اثر دیکھا تو ان سے پوچھا یہ کیا ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ میں نے ایک عورت سے شادی کی ہے کھجور کی گٹھلی کے وزن برابر سونے پر (یعنی اس کا مہر اتنا مقرر کیا ہے) آپ نے فرمایا اللہ تمھیں مبارک کرے! ولیمہ کی دعوت کرو اگرچہ پوری

ایک بکری کر ڈالو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) حضور کے ارشاد "اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاۃٍ" کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ دل کھول کے ولیمہ کرو، چاہو تو اس ولیمہ کے لیے ایک بکری مستقل ذبح کر ڈالو ۔۔۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب اور رفقاء کی تطییب خاطر کے لیے کبھی ایسی بے تکلفی اور خوش طبعی کی باتیں بھی فرمایا کرتے تھے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے آپ کا یہ ارشاد بھی اسی قبیل سے تھا۔

ایک بات اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت نے صحابۂ کرام کو ایسا بنا دیا تھا کہ وہ اپنی شادی نکاح کی تقریبات میں بھی حضور کو شرکت کی زحمت نہیں دیتے تھے بلکہ اطلاع کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ عبدالرحمٰن بن عوف جو خواص اصحاب اور عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں اُنھوں نے خود اپنی شادی کی اور حضور کو خبر بھی نہیں ہوئی۔۔

حدیث میں عبدالرحمٰن بن عوف پر زردی کے اثر کا جو ذکر ہے، اُس کی حقیقت یہ سمجھنی چاہیئے کہ نئی دُلہنیں زعفران وغیرہ سے رنگے ہوئے کپڑے پہنتی تھیں، اُس کا اثر مرد کے کپڑوں یا جسم پر بھی آجاتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کا اثر عبدالرحمٰن بن عوف پر محسوس کیا تھا۔ واللہ اعلم۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ مَا اَوْلَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی اَحَدٍ مِنْ نِسَائِہٖ مَا اَوْلَمَ عَلٰی زَیْنَبَ اَوْلَمَ بِشَاۃٍ۔

رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی بیوی کے نکاح پر ایسا ولیمہ نہیں کیا جیسا کہ زینب بنت جحش کے نکاح کے موقع پر کیا۔ پوری ایک بکری پر ولیمہ کیا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اور سب بیویوں کے نکاح پر آپ نے جو ولیمہ کی دعوت کی وہ اس سے مختصر اور ہلکے پیمانہ پر کی تھی، چنانچہ صحیح بخاری میں صفیہ بنت شیبہ کی روایت سے یہ حدیث مروی ہے کہ آپ نے بعض بیویوں کے نکاح پر جو ولیمہ کی دعوت کی تو صرف دو سیر جَو کام میں آئے۔ اور اسی صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ بیان مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے جب حضرت صفیہ کو اپنے نکاح میں لیا اور لوگوں کو ولیمہ کی دعوت دی، تو دسترخوان پر گوشت روٹی کچھ نہیں تھا، کچھ کھجوریں تھیں اور کچھ پنیر اور مکھن تھا ـــــ اس سے معلوم ہوا کہ ولیمہ کے لیے باقاعدہ کھانے کی دعوت بھی ضروری نہیں، کھانے پینے کی جو بھی مناسب اور مرغوب چیز میسر ہو رکھ دی جائے ـــــ لیکن بدقسمتی کی انتہا ہے کہ ہم مسلمانوں نے جہیز کی طرح ولیمہ کو بھی ایک مصیبت بنا لیا ہے۔

ولیمہ کی دعوت قبول کرنی چاہیے :۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا دُعِیَ اَحَدُکُمْ اِلَی الْوَلِیْمَۃِ فَلْیَاْتِھَا ـــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کسی کو ولیمہ کی دعوت دی جائے تو اس کو چاہیے کہ دعوت قبول کرے اور آئے۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ حکم دیا تھا اُس وقت ولیمے صحیح قسم کے ہی ہوتے تھے اور ایسے ولیمے جب بھی اور جہاں بھی ہوں اُن کے لیے یہی حکم ہے۔ ایسی مخلصانہ دعوتیں بابرکت ہیں۔ لیکن جن ولیموں میں کھلا اسراف اور نمائش و تفاخر ہو یا دوسری قسم کے منکرات ہوں اُن کے لیے ہرگز یہ حکم نہیں ہے۔ بلکہ ایسے لوگوں کے ہاں کھانے سے حضور نے منع فرمایا ہے۔

کیسے لوگوں کا کھانا نہ کھایا جائے :۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَہٰی عَنْ طَعَامِ الْمُتَبَارِیَیْنِ اَنْ یُّؤْکَلَ ـــــ رواہ ابوداؤد

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باہم مقابلہ کرنے والوں کا کھانا کھانے سے منع فرمایا۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں اپنی شان اونچی دکھانے کے لیے

شاندار دعوتیں کریں ان کے کھانے میں شرکت کرنے سے حضور نے منع فرمایا۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ شَرُّ الطَّعَامِ طَعَامُ الْوَلِیْمَةِ یُدْعٰی لَهَا الْاَغْنِیَاءُ وَیُتْرَكُ الْفُقَرَاءُ وَمَنْ تَرَكَ الدَّعْوَةَ فَقَدْ عَصَی اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُس ولیمہ کا کھانا برا کھانا ہے جس میں صرف امیروں کو بلایا جائے اور حاجتمندوں غریبوں کو چھوڑ دیا جائے ——— اور جس نے دعوت کو (بلا وجہ شرعی) قبول نہ کیا تو اس نے اللہ اور اُس کے رسول کے حکم کے خلاف کیا۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) حدیث کے پہلے جزء کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ جب کوئی ولیمہ کرے تو غریبوں حاجتمندوں کو نظر انداز نہ کرے اُن کو ضرور دعوت دے۔ جس ولیمہ میں اُن کو نہ بلایا جائے صرف امیروں اور بڑے لوگوں کو مدعو کیا جائے اُس کا کھانا اس لائق نہیں ہے کہ کھایا جائے۔ ظاہر ہے کہ ولیمہ کے علاوہ دوسری قسم کی دعوتوں کا حکم بھی یہی ہے۔ ——— حدیث کے دوسرے جز کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ اگر کوئی شرعی مانع یا مجبوری نہ ہو تو مسلمان بھائی کی دعوت کو قبول کرنا چاہیئے۔ اس سے دلوں میں جوڑ پیدا ہوتا ہے، اور قبول نہ کرنے سے دلوں میں دوری اور بدگمانیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اسلئے بلا وجہ دعوت کا قبول نہ کرنا اللہ ورسول کی مرضی اور حکم کے خلاف ہے۔

مُبَاشرت سے متعلق ہدایات اور احکام

دُعا:-

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اَنَّ اَحَدَکُمْ اِذَا اَرَادَ اَنْ یَّاْتِیَ اَهْلَهٗ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّیْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا فَاِنَّهٗ اِنْ یُّقَدَّرْ بَیْنَهُمَا وَلَدٌ فِیْ ذَالِكَ لَمْ یَضُرَّهٗ شَیْطَانٌ اَبَدًا ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
جب تم میں سے کوئی بیوی کے پاس جاتے وقت، اللہ کے حضور میں یہ عرض کرے بسم اللہ
اللّٰھم جنبنا الشیطان وجنّب الشیطان ما رزقتنا" (بسم اللہ۔ اے اللہ تو
شیطان کے شر سے ہم کو بچا اور ہم کو جو اولاد دے اس کو بھی بچا) تو اگر اس مباشرت کے
نتیجہ میں ان کے لیے بچہ مقدر ہوگا تو شیطان کبھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا اور وہ ہمیشہ شر
شیطان سے محفوظ رہے گا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) یہ حدیث معارف الحدیث "کتاب الدعوات" میں بھی ذکر کی جا چکی ہے اور وہاں
تشریح میں حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رح کی "اشعۃ اللمعات" کے حوالہ سے ان کا یہ عارفانہ
نکتہ بھی نقل کیا جا چکا ہے کہ اس حدیث سے مفہوم ہوتا ہے کہ اگر مباشرت کے وقت اللہ تعالیٰ
سے اس طرح کی دعا نہ کی اور خدا سے غافل رہ کر جانوروں کی طرح شہوت نفس کا تقاضا پورا
کرلیا تو ایسی مباشرت سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ شیطان کے شر سے محفوظ نہیں رہے گی ——
اس کے آگے شیخ رح نے فرمایا ہے کہ "اس زمانہ میں پیدا ہونے والی نسل کے احوال، اخلاق،
عادات جو عام طور سے خراب و برباد ہیں اُس کی خاص بنیاد یہی ہے"۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حضور
کی ان ہدایات کی قدر شناسی اور اُن سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔

مُباشرت ایک راز ہے اس کا افشا بدترین گناہ :-

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ
مِنْ اَشَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰہِ مَنْزِلَۃً یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ الرَّجُلُ یُفْضِیْ اِلٰی
اِمْرَأَتِہٖ وَتُفْضِیْ اِلَیْہِ ثُمَّ یَنْشُرُ سِرَّھَا —— رواہ مسلم

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ کے ہاں وہ آدمی بدترین درجہ میں ہوگا جو بیوی
سے ہم بستری کے بعد اس کا راز فاش کرے۔

(صحیح مسلم)

خلافِ وضعِ فطری عمل پر خدا کی لعنت ہے:-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَلْعُوْنٌ مَنْ اَتَی اِمْرَاَةً فِیْ دُبُرِهَا ——— رواہ احمد و ابوداؤد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص بیوی کے ساتھ خلافِ فطرت عمل کرے وہ ملعون ہے۔

(مسند احمد، سنن ابی داؤد)

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَنْظُرُ اللّٰهُ اِلٰی رَجُلٍ اَتٰی رَجُلًا اَوْ اِمْرَاَةً فِی الدُّبُرِ۔

——— رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی مرد یا عورت کے ساتھ خلافِ وضعِ فطرت حرکت کرے اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر بھی نہ فرمائے گا (جامع ترمذی)

(تشریح) بیچارے حیوانات بھی جو عقل و تمیز سے بھی محروم ہیں وہ بھی شہوت کا تقاضا خلافِ فطرت طریقے سے پورا نہیں کرتے، پس جو انسان ایسا کرتے ہیں وہ حیوانوں سے بھی بدتر اور "ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ" کے مصداق ہیں۔ یہ بات قیامت اور آخرت ہی میں معلوم ہوگی کہ اللہ کی نظرِ کرم سے محروم ہو جانا کتنی بڑی بدبختی ہے۔

عزل:-

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کسی خاص وجہ سے (مثلاً بیوی کی صحت یا پہلے بچہ کی صحت کے تحفظ کے خیال سے) یہ نہیں چاہتا کہ اس وقت اس کی بیوی کو حمل قرار پائے، وہ اس غرض سے ایسا کرتا ہے کہ انزال کا وقت قریب آنے پر اپنے کو بیوی سے الگ کر لیتا ہے تاکہ مادۂ منویہ باہر خارج ہو جائے، اسی کو عزل کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

زمانہ میں بھی بعض لوگ ایسا کرتے تھے، اس کے بارے میں حضورؐ سے پوچھا گیا تو آپ نے وہ جواب دیا جس کا ذکر آگے حدیث میں آرہا ہے اور بظاہر جس کا مفاد یہ ہے کہ یہ ممنوع اور ناجائز تو نہیں ہے لیکن اچھا بھی نہیں ہے — اُمّت کے اکثر فقہاء نے اس باب کی حدیثوں سے یہی سمجھا ہے اور ان کے نزدیک مسئلہ یہی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے خاص حالات اور مصالح کی وجہ سے عزل کرے تو گنجائش ہے گناہ نہیں ہے — لیکن فی زماننا مغربی اقوام و ممالک کی تقلید و پیروی میں بعض ملکوں میں ملکی اور قومی پیمانے پر تحدید نسل کی مہمیں جس طرح چلائی جارہی ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ انسانی نسل بڑھنے نہ پائے، اگر بڑھتی رہی تو روٹی نہ ملے گی، اس کی اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں ہے، یہ وہی گمراہانہ نقطۂ نظر ہے جس کی بناء پر زمانۂ جاہلیت کے بعض عرب اپنے نومولود بچوں کو ختم کر دیتے تھے — قرآن پاک میں انہی سے فرمایا گیا ہے

لَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (الانعام ع ۱۹)

اپنے بچوں کو مفلسی اور ناداری کی وجہ سے ختم نہ کرو، ہم تمھیں بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔

اس تمہید کے بعد عزل سے متعلق مندرجہ ذیل حدیثیں پڑھیے!

عَنْ جَابِرٍ قَالَ كُنَّا نَعْزِلُ وَالْقُرْآنُ يَنْزِلُ — رواہ البخاری و مسلم
وَزَادَ مُسْلِمٌ فَبَلَغَ ذَالِكَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يَنْهَنَا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں جبکہ نزول قرآن کا سلسلہ جاری تھا، ہم لوگ (یعنی بعض اصحاب) عزل کرتے تھے (اور اس کی ممانعت میں کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تھی) اور صحیح مسلم کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ حضور کو اس کی اطلاع بھی ہوئی مگر آپ نے منع نہیں فرمایا۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ اَبِي سَعِيْدٍ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْعَزْلِ فَقَالَ مَا مِنْ كُلِّ الْمَاءِ يَكُوْنُ الْوَلَدُ وَاِذَا اَرَادَ اللهُ

خَلَقَ شَيْئٍ لَمْ يَمْنَعْهُ شَيْئٌ۔ ——— رواہ مسلم

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عزل کے بارے میں دریافت کیا گیا، تو آپ نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے کہ ہر دفعہ کے مادۂ منویہ سے بچہ ہو ——— (یعنی جب ارادۂ الٰہیہ ہوتا ہے تب ہی حمل قرار پاتا اور بچہ ہوتا ہے) اور جب کسی چیز کی تخلیق کے لیے اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہو جائے تو پھر کوئی چیز اس کو روک نہیں سکتی۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ عزل کیا جائے گا تو بچہ نہیں ہوگا، اگر اللہ کی مشیت ہوگی تو بچہ بہر حال پیدا ہوگا۔ یہ مضمون آگے درج ہونے والی حدیث سے اور زیادہ واضح ہو جائے گا۔

عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَجُلًا اَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ لِيْ جَارِيَةً هِيَ خَادِمَتُنَا وَاَنَا اَطُوْفُ عَلَيْهَا وَاَكْرَهُ اَنْ تَحْمِلَ فَقَالَ اِعْزِلْ عَنْهَا اِنْ شِئْتَ فَاِنَّهُ سَيَاْتِيْهَا مَا قُدِّرَ لَهَا فَلَبِثَ الرَّجُلُ ثُمَّ اَتَاهُ فَقَالَ اِنَّ الْجَارِيَةَ قَدْ حَبِلَتْ فَقَالَ قَدْ اَخْبَرْتُكَ اِنَّهُ سَيَاْتِيْهَا مَا قُدِّرَ لَهَا۔ ——— رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری ایک باندی ہے اور وہی ہمارے گھر کا کام کاج کرتی ہے، اور میں اس سے صحبت بھی کرتا ہوں اور میں یہ نہیں چاہتا کہ اس کے حمل قرار پا جائے (غالباً مطلب یہ تھا کہ کیا میں عزل کر سکتا ہوں) آپ نے فرمایا اگر چاہو تو عزل کرو لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس باندی کے لیے جو مقدر ہو چکا ہے وہ ضرور ہوگا ——— کچھ دنوں کے بعد وہی آدمی آیا اور عرض کیا کہ اس باندی کے تو حمل قرار پا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے تو تم کو بتایا تھا کہ جو اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے وہ ہو کے رہے گا۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں اور اس سے پہلے والی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد نقل کیا گیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کے وجود کا فیصلہ

ہو چکا ہے تو اس کو روکنے کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوگی اللہ تعالیٰ کا فیصلہ نافذ ہو کے رہے گا۔ مثلاً ایک آدمی اس مقصد سے کہ بیوی کے حمل قرار نہ پائے عزل کرتا ہے تو اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت کسی وقت بچہ پیدا ہونے کی ہوگی، تو ایسا ہوگا کہ وہ بروقت عزل نہ کر سکے گا اور مادہ منویہ اندر ہی خارج ہو جائے گا یا وہ عزل کرے گا لیکن مادہ کا کوئی جزء پہلے ہی خارج ہو جائے گا اور اس کو شعور بھی نہ ہوگا۔

الغرض انسانی تدبیر فیل ہوگی اور ارادۂ الٰہیہ پورا ہو کے رہے گا ——— واللہ اعلم

چار بیویوں تک کی اجازت

جو لوگ انسانوں کی فطرت اور ان کے مختلف طبقات کے حالات سے واقف ہیں وہ یقین کے ساتھ جانتے ہوں گے کہ بہت سے آدمی اپنی طبیعت اور مزاج کی لحاظ سے، اور بہت سے اپنے یا اپنی بیوی کے مخصوص حالات کی وجہ سے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کو ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی اجازت نہ ہو تو اس کا بڑا خطرہ ہوگا کہ وہ حرام میں مبتلا ہو جائیں، اسی لیے آسمانی شریعتوں میں، جن میں زنا اشد حرام قرار دیا گیا ہے عام طور سے اس کی اجازت رہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت میں خاصکر شادی شدہ آدمی کے لیے زنا اتنا شدید گناہ ہے کہ اس کی سزا سنگساری ہے، ایسی شریعت میں اگر کسی حال میں بھی تعدد ازدواج کی اجازت نہ ہو تو انسانوں پر قانون کی یہ بہت زیادتی ہوگی ——— جن مغربی ملکوں اور قوموں کے قانون میں تعدد ازدواج کی بالکل گنجائش نہیں ہے اُن میں زنا کو قانونی جواز حاصل ہے اور عملاً بھی وہاں زنا کی جتنی کثرت ہے وہ کوئی پوشیدہ راز نہیں ہے ——— اسلامی شریعت نے زنا کو ختم کرنے کے لیے ایک طرف تو اس کے لیے سخت سے سخت سزا مقرر کی، اور دوسری طرف مناسب شرائط کے ساتھ چار بیویوں تک کی اجازت دی ——— ان کے علاوہ بھی بہت سے وجوہ و اسباب ہیں جن کا یہی تقاضا ہے، لیکن اُن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دُنیا کی بہت سی دوسری قوموں کی طرح عربوں میں بھی بیویوں کی تعداد کا کوئی تحدیدی ضابطہ نہ تھا، بعض لوگ دس دس اور اس سے بھی زیادہ بیویاں رکھتے تھے، اسلامی شریعت میں انسانوں کی مختلف حالتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے

اس کی آخری حد چار مقرر فرما دی گئی

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ اِنَّ غَيْلَانَ بْنَ سَلَمَةَ الثَّقَفِيَّ اَسْلَمَ وَلَهُ عَشْرُ نِسْوَةٍ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَاَسْلَمْنَ مَعَهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمْسِكْ اَرْبَعًا وَّفَارِقْ سَائِرَهُنَّ ——— رواہ احمد

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غیلان بن سلمہ ثقفی نے اسلام قبول کیا اور اس وقت اُن کی دس بیویاں تھیں، اُن سب نے بھی ان کے ساتھ اسلام قبول کرلیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو ہدایت فرمائی کہ چار بیویاں تو رکھو اور باقیوں کو جدا کردو۔ (مسند احمد)

بیویوں کے ساتھ برتاؤ میں عدل ومساوات

اگر کسی شخص کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو اُس کے لیے بطور فریضے کے لازم کیا گیا ہے کہ وہ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے کسی کے ساتھ ادنیٰ بے انصافی نہ ہو۔ قرآن مجید میں سورۂ نساء کی جس آیت میں چار تک کی اجازت دی گئی ہے اُس میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً "یعنی اگر تم ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح کرنے کی صورت میں عدل پر قائم نہ رہ سکو اور ہر ایک کے ساتھ یکساں برتاؤ نہ کرسکو تو بس ایک ہی بیوی پر قناعت کرو، ایک سے زیادہ نکاح مت کرو۔

بیویوں کے ساتھ عدل نہ کرنے والے شوہروں کو آخرت میں جو خاص رسوا کن عذاب ہوگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا بھی ذکر فرمایا تاکہ لوگ اس معاملے میں ڈرتے رہیں۔ ہاں دل کے میلان پر انسان کا اختیار نہیں اس میں بندہ معذور ہے لیکن معاملہ اور برتاؤ میں فرق نہ ہونا چاہیے۔

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا كَانَتْ عِنْدَ الرَّجُلِ اِمْرَأَتَانِ فَلَمْ يَعْدِلْ بَيْنَهُمَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَشِقُّهٗ سَاقِطٌ ——— رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجہ والدارمی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کسی آدمی کی دو (یا زیادہ) بیویاں ہوں اور وہ اُن کے ساتھ عدل و مساوات کا برتاؤ نہ کرے تو قیامت کے دن وہ اس حالت میں آئے گا کہ اُس کا ایک دھڑ گرا ہوا ہوگا۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی)

(تشریح) دنیا کے گناہوں اور آخرت کی سزاؤں میں جو مناسبت اور شاہبت ہوگی یہ بھی اس کی ایک مثال ہے، وہ معاملہ اور برتاؤ میں ایک بیوی کی طرف جھکتا تھا، قیامت کے دن وہ اس حال میں ہوگا کہ اس کا ایک دھڑ گرا ہوا ہوگا اور سب اس کو اس حال میں دیکھیں گے۔ اللہ کی پناہ کیسا منظر ہوگا اور کیسی رسوائی ہوگی۔

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَقْسِمُ بَیْنَ نِسَائِہٖ فَیَعْدِلُ وَیَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ ھٰذَا قِسْمِیْ فِیْمَا اَمْلِکُ فَلَا تَلُمْنِیْ فِیْمَا تَمْلِکُ وَلَا اَمْلِکُ۔

——— رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ والدارمی

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سب بیویوں کے ہاں باری باری رہتے تھے اور پورے عدل کا برتاؤ فرماتے تھے اور اسکے ساتھ اللہ سے عرض کرتے تھے کہ اے میرے اللہ یہ میری تقسیم ہے اُن معاملات میں اور اس عملی برتاؤ میں جو میرے اختیار میں ہے۔ پس میری سرزنش اور محاسبہ نہ فرمائیو ان (دل کے) اس معاملے میں جو تیرے اختیار میں ہے میرے اختیار میں نہیں۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ جہاں تک رہن سہن اور عملی برتاؤ کا تعلق ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ مثالی اور کامل عدل فرماتے تھے، جو معاملہ اور برتاؤ کسی ایک کے ساتھ تھا وہ سب کے ساتھ تھا، لیکن قلبی محبت اور دل کا میلان ایسی چیز ہے جس پر کسی بشر کا قابو نہیں آپ کا بھی قابو نہیں تھا، اس کا حال یکساں نہیں تھا، اس کے لیے آپ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس طرح معذرت فرماتے تھے کہ "اے اللہ یہ چیز میرے اختیار میں نہیں ہے آپ کے اختیار میں ہے" اس پر مواخذہ اور محاسبہ نہ ہو۔ یہ آپ کا کمالِ عبدیت تھا ورنہ قرآن مجید میں فرمادیا گیا ہے۔۔۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔

بوئے گُل در برگِ گُل

حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلوی رح اپنے مکتوبات کے آئینے میں

تلخیص و ترجمہ ——— از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

(یہ سلسلۂ مضمون مولانا فریدی کی علالت کے باعث ربیع الثانی ۹۲ھ سے منقطع ہو گیا تھا۔ الحمد للہ کہ اس کے دوبارہ شروع ہونے کی نوبت آ رہی ہے۔ مولانا اس علالت سے تو شفایاب ہو گئے، مگر نظر کی کمزوری جو پہلے سے تھی بڑھتی جا رہی ہے۔ ناظرین سے مولانا کے لیے خصوصی طور پر دعا کی درخواست ہے — مرتب)

شاہ ابو سعید مجددی کے نام ———

فقیر غلام علی عفی عنہٗ بعد سلام لکھتا ہے کہ رقیمۂ کریمہ نے اپنے ورودِ مسعود سے فرحت فراواں پہونچائی ——— مجھے کثرت کے ساتھ الفاظِ اشتیاق تحریر کرنے کی ضرورت نہیں ہے ——— بس یہ عبارت کافی ہے کہ یہاں خیریت ہے ——— اللہ تعالےٰ ملاقات میسر کرے۔ جب سے آپ لکھنؤ گئے ہیں ایک ہی خط لکھ کر بھیجا ہے چاہیے کہ ہر ماہ خیریت نامہ لکھتے رہیں۔ تین دن ہوئے کہ یہاں سے ایک خط بدستِ برادرم اُمید علی بھیجا گیا ہے خدا کرے کہ پہونچ جائے ——— طریقۂ شریفہ پر ظاہراً و باطناً کوشش سے قائم رہیں ——— ماہ ذی الحجہ میں دو[۲] خط مولوی بشارت اللہ صاحب کے پہونچے۔ اُن سے وہاں ملاقات ہو تو بعد سلام کے (میری طرف سے) کہدیں کہ میاں نقش علی کا مکان مولوی نعیم اللہ صاحب کے اصحاب سے معلوم ہو جائے گا۔ اُن کا کوئی خط سالہا سال سے نہیں آیا۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ خود نقش علی صاحب کو وجہ معلوم ہو گی۔ مولوی مرزا حسن علی صاحب (محدث) مولوی بشارت اللہ کے یہاں سے چلے جانے کی وجہ سے بہت ناخوش ہوئے۔ مجھ کو ملامت کی کہ تم نے اُن کو کیوں رخصت کر دیا؟ ___ جلدی اُن کو بلانا چاہیے۔ حضرت مولوی رفیع الدین صاحب (ابن حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) نے فرمایا کہ تم دونوں (یعنی شاہ ابوسعید اور مولانا بشارت اللہ) میں سے ایک کا یہاں (خانقاہ دہلی میں) رہنا ضروری ہے۔

شیخ فضل امام جیو (خیر آبادی) سے سلام کہیں ....

شاہ پیر محمدؒ کے نام ___

والا مناقب، مقبول بارگاہِ الٰہ سلمہ اللہ تعالےٰ وجعلہ للمتقین اماماً

فقیر عبد اللہ معروف بہ غلام علی عفی عنہ، کی جانب سے بعد سلام واضح ہو کہ الحمد للہ یہاں خیریت ہے اور وہاں کی خیر و عافیت مطلوب ہے۔ خداوندِ کریم نے محض اپنے فضل عمیم سے جس (مبارک) کام سے سرفراز و ممتاز فرمایا ہے اُس کا شکر ادا کرنا اِس خاکسار و ناچیز کی طاقت سے باہر ہے ___ اللہ تعالےٰ اِس کام پر استقامت و استقامت نصیب فرمائے ___ آپ کا صحیفہ شریفہ پہونچا۔ مسرتیں پہونچائیں۔ مضمون سے آگاہی ہوئی۔ راہِ خدا میں کمر ہمت خوب اچھی طرح باندھ کر اپنے اوقات کو یادِ حق اور اتباع حبیب خدا میں بسر کریں ___

مستفدین و مریدین کی جانب توجہات بلیغہ مبذول رکھیں۔ صبر و توکل، قناعت و رضا، تسلیم و دوامِ التجاء بجناب کبریا اور خود اپنے سے اور ماسوی سے مایوس ہو جانا ___ طریقۂ درویشانِ خدا ہے۔

احقر کو دعا میں یاد رکھیں ___ والسلام۔

شاہ ابو سعید مجددی کے نام ___

حضرت سلامت۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

صحیفۂ شریفہ پہونچا۔ مضمون واضح ہوا ___ اگرچہ صحاح ستہ اور موطا نیز ایک کتاب لغت کی مجھے ضرورت ہے لیکن اللہ تعالےٰ ... جب اُن کتابوں کی قیمت بھیجے گا اُس وقت یہ کتابیں نیز دیگر کتب خریدی جائیں گی۔

احمد سعید سلمہ اللہ تعالےٰ اور دیگر احباب کو سلام اور اُن سے طلبِ دُعا ـــ تمام احباب فکرِ آخرت، پرداخت نسبتِ باطن، دوامِ ذکر اور ترکِ لایعنی پر مواظبت کریں تاکہ (کوتاہی کے باعث) کل کو (بروز قیامت) حسرت و ندامت نہ ہو۔ بخدمت شیخ فضل امام جیو (خیرآبادی) سلام پہونچے۔ وہ برابر یادِ حق میں مشغول رہیں۔ اور لغو و لایعنی اُمور میں اپنی عمر ضائع نہ کریں ـــ روزِ حساب درپیش ہے ـــ وہ بے ضرورت 'حضرتِ دہلی' کا قصد نہ کریں۔

مغل[عہ] بادشاہ اکبر شاہ ثانی کے نام۔ (تنبیہ و نصیحت)

حضرت سلامت، السلام علیکم و رحمۃ اللہ

سبحان اللہ ـــ عجائب حضرت حق سبحانہ کو کیا تحریر کیا جائے ـــ سید محمد اسمٰعیل مدنی جو مدینہ منورہ سے محض نسبت مجددیہ کو حاصل کرنے کے لیے اس حقیر کے پاس تشریف لائے ہیں وہ آج کی رات جو جمعہ کی رات ہے جامع مسجد دہلی میں اس جگہ تشریف لے گئے جہاں "آثار شریف" رکھے تھے۔ اُنھوں نے وہاں پہونچ کر یوں کہا کہ یہاں ظلمتِ اصنام محسوس ہو رہی ہے۔ اُن کا یہ کہنا محض نورِ ایمانی کی بنا پر تھا ورنہ اُن کو کیا معلوم تھا کہ اِن آثار و تبرکات میں کیا کیا چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہاں بزرگوں کی تصویریں بلکہ نعوذ باللہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر بھی رکھی ہوئی ہے۔ نیز ائمہ اہلِ بیت اور اولیاء کرام کی تصاویر رکھی ہوئی ہیں۔

ان تصویروں کا بنانا اور اپنے پاس رکھنا شرعِ محمدی میں جائز نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصویر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (فتح مکہ کے موقع پر) اپنے دستِ مبارک سے توڑا ہے۔

اپنے پیر کی تصویر ہو یا پیغمبر کی یا امیر المومنین حضرت علیؓ کی تصویر ہو، دراصل اصنام

عہ ان الفاظ سے صاحب مرقاۃِ منطق مولانا فضل امام خیرآبادی مرحوم کے حضرت شاہ غلام علیؒ سے روحانی تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ نیز اُن کے قیام لکھنؤ کا بھی علم ہوتا ہے۔

عہ اس مکتوب گرامی سے اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز میں دہلی کے مسلم باشندوں اور خود بادشاہ کی ذہنی کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ تقویۃ الایمان میں اس ذہنیت کیخلاف جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایک مرد مجاہد کے ایمان کا ایک بروقت تقاضہ تھا

ہیں اُن کی تعظیم نہ کریں کیونکہ اُن کی تعظیم صنم پرستی کے مُرادف ہے۔
ایک پتھر پر مصنوعی نقشِ قدم بنا کر کہتے ہیں کہ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا نقشِ قدم ہے یہ بھی (ایک قسم کی) باطل پرستی ہے۔ ہائے مسلمانی اور توحید کہاں گئی؟ اور بادشاہت کے ساتھ ساتھ پیروی اسلام کدھر رخصت ہو گئی؟ کوئی تدبیر کریں اور یہ بُت پرستی موقوف کرائیں ــــ مسلمانوں کی تباہی اور مسلمانوں کی مداہنت اور سستی پر کیا نالہ و گریہ کروں ــــ غلبۂ کفر اسی سستی اور غفلت کی بنا پر ہے (بتوں سے مسلمانوں کو کیا واسطہ) بتوں کے تو کافر محتاج ہیں۔ مسجد جامع اور قلعہ معلیٰ دونوں "جائے مسلمانان" ہیں۔ ان میں بُت رکھنے کے کیا معنی؟ خدا کی قسم اگر میرے اندر قوت لوٹ آئی تو میں اِس شہر بت پرستان سے ہجرت کر جاؤں گا۔

خواجہ حسن مودودی لکھنوئیؒ کو ایک طویل مکتوب تحریر فرماتے ہوئے ایک مقام پر ارقام فرماتے ہیں .... انا احمد بلا میم و عرب بلا عین (یعنی میں بے میم کا احمد اور بغیر عین کا عرب ہوں) ــــ

یہ حدیث نہیں ہے ــــ بلکہ اہلِ توحید وجودی کے تابعین نے اپنے مقصود کے مطابق یہ حدیث گھڑ لی ہے۔ اللہ تعالےٰ اُن کو معاف فرمائے کتاب نہج البلاغہ کے خطبات درجۂ صحت و اعتبار سے ساقط ہیں .....

خواجہ حسن مودودی لکھنوئیؒ کے نام ــــ (آخری حصہ)

...... ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اپنے طریقے سے بہرہ مند ہو ورنہ محض انتساب سے کیا فائدہ؟ بس اقرارِ توحید اور تصدیقِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کافی ہے ــــ اللہ تعالےٰ عاقبت بخیر فرمائے

منگر کہ دلِ ابنِ یمین پُر خوں شد
بنگر کہ ازیں سرائے فانی چوں شد
مُصحف بکف و پا بہ رہ و دیدہ بدوست
با پیکِ اجل خندہ زناں بیروں شد

غ ۔ یہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

اللہ تعالیٰ یہ حالت، آپ کی دعا سے مجھے نصیب فرمائے۔ والسلام۔

شاہ ابوسعید مجددیؒ کے نام (آخری حصہ)

...... ضعفِ قلب اور ضعفِ پیری، اس نقیر پر غالب و مستولی ہو گیا ہے۔ خارش کی بھی بہت شدت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مرض، مرض موت ہو ــــ دعا و ہمت اور ثواب ختمہائے قرآن سے نصرت و مدد فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ سلامتی ایمان، حسنِ خاتمہ، دوامِ عفو و عافیت اور اشتیاق لقائے جانفزا اس فقیر کو اور سب کو نصیب فرمائے۔ آمین آمین۔ اپنے باطن اور اپنے مستفیدین کے باطن کے جو کچھ احوال لکھے ہیں اُن احوال نے بہت بہت مسرور و شاد کیا ــــ اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ طریقے کو رائج فرمائے اور آپ کی جناب سے طریقے کو باقی رکھے۔ آمین۔ احمد سعید کو دعا و سلام۔

شاہ پیر محمد کشمیریؒ[2] کے نام (نصائح)

...... دو تین خطوط ایک ہی مضمون کے پہونچے۔ بعنایت الٰہی آپ کی توجہ میں تاثیر قوی پیدا ہو گئی ہے اور طالبین جمع ہو گئے ہیں۔ کچھ کو اجازت و خلافت بھی دے چکے ہیں الحمد للہ ــــ اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ ترقیات نصیب فرمائے۔ یہ تاثیر کسی اور جانب سے ہے (اس سلسلے میں) پیرانِ کبار رحمہم اللہ کا شکریہ لازم سمجھیں۔ اور اس اجتماعِ مریدین سے مغرور نہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ استدراج اور ڈھیل ہو۔ معاذ اللہ ــــ ہمیشہ خائف و ترساں

(گزشتہ صفحہ کا حاشیہ) عہ یعنی یہ مت دیکھ کر ابن یمین کا دل پُر خوں اور زخمی ہو گیا۔ یہ دیکھ کہ وہ اس سرائے فانی سے کس حال میں رخصت ہوا۔ وہ اس طرح رخصت ہوا کہ اس کے ہاتھ میں قرآن مجید تھا، راہ حق پر اس کے قدم تھے اور محبوب حقیقی کی طرف اس کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں اسی حالت میں وہ قاصد اجل کے ساتھ ہنستا ہوا دنیا سے باہر چلا گیا۔

عہ[2] آپ نے حضرت شاہ غلام علی صاحب سے سلوک طے کیا، بالآخر خلیفہ و مجاز ہوئے۔ آپ کو استغراق بہت زیادہ تھا ــــ کشمیر کے علاقے میں انتہائی شہرت پائی۔ ماخوذ از ضمیمہ مقامات و معمولات مظہری مولفہ شاہ عبدالغنی مجددی مہاجرؒ

رہیں ۔ ذکر و مراقبہ اور پرداخت نسبت باطن میں وظائف اعمالِ حسنہ کے ذریعہ اپنے اوقات کو معمور رکھیں۔ ماسوی سے نا امیدی اور فضلِ خدا سے توقع رکھیں نیز خلوت کو اپنا شعار اور سرمایۂ عزت و آبرو سمجھیں۔ لوگوں کے انکار و اقرار کی (کچھ زیادہ) پرواہ نہ کریں۔ اقرار انعمتہلے الٰہی میں سے ہے اور انکار ہمارے اعمال کی شامت ہے۔ استغفار کرتے رہیں اور ندامت و شرمندگی بھی ہو۔ دل شکستہ سے اس کام کی درستی ہے۔ ؎

ایں فتح جز شکست میسر نمی شود

(یعنی یہ فتحمندی شکستگی کے بغیر میسر نہیں ہوتی)

اجازت دینے میں بہت غور و تامل کرنا چاہیے۔ دوام حضور، جمعیت، ترک احوال، کثرتِ اعمال اور تاثیر ضروری امور ہیں۔ جو کچھ غیب سے پہونچے حصۂ فقراء اس میں مقرر کریں جتا کین آپ کی صحبت میں جمع رہیں۔ خوش خوارگی (اچھا کھانے) کی عادت نہ ڈالیں جو میسر ہو اس سے زندگی گزاریں۔ تفسیر و حدیث، علوم صوفیہ کی کتابیں اور مکتوبات مجدد الف ثانی آپ کی مجلس میں ضرور رہنا چاہئیں ۔ خاتمے کی جانب سے خائف رہیں۔ متواضع، متذلل اور مسکین و فقیر بن کر اوہام سے اپنے کو یکسو رکھیں۔ مجھ کو بھی دعا میں یاد رکھیں ..... اپنے کمالات کو منسوب بحق سبحانہ دیکھنا اور اپنے کو عدم محض سمجھنا، روزانہ کے واقعات کو تقدیر الٰہی سے ناشی و حادث قرار دینا بلکہ یقین رکھنا یعنی یہ سمجھنا کہ نافع و ضار بس اللہ ہی ہے اور رنجشوں کو ترک کرنا شعارِ دوستانِ خدا ہے ؎ تو مباش اصلا کمال اینست و بس

نسبتِ فعل و صفت کی اپنے سے نفی ہو۔ ؎

رَو در و گم شو وصال اینست و بس

شروع میں انوار نسبت، باطن کے اندر استغراق و سکر کے ساتھ ہوں گے۔ آخر میں سکر باقی نہیں رہتا۔ حضرت حق سبحانہ کی طرف توجہ بسیط، اتباعِ حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہی حاصل زندگی ہے۔

ایک مکتوب گرامی میں جس کے مکتوب الیہ کا نام لکھا ہوا نہیں ہے، نماز کو خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھنے کی تاکید کے بعد ارقام فرماتے ہیں۔

.... واقعاتِ روزمرّہ کو تقدیرِ الٰہی سے جان کر چوں و چرا نہ کرنا، اپنے کاموں کو وکیل کارساز سبحانہٗ کے سپرد کرکے ادائیگیِ وظائف و اعمال اور دوامِ ذکر میں دل و زباں سے سعی کرنا، ہر وقت دل کی طرف متوجہ رہنا اور دل کی توجہ حضرت حق کی طرف رکھنا، دل کو گزشتہ و آئندہ سے متعلق وساوس سے محفوظ رکھنا، ذکر اسم ذات یا نفی و اثبات میں کامل احتیاج و افتقار کے جذبے کے ساتھ مشغول رہنا، کوئی مقصود دل میں نہ رکھنا، اپنے کو ذکرِ حضرتِ حق سبحانہ کے لائق نہ سمجھنا، یقین کے ساتھ اور اپنے اوپر حضرت کریم مطلق سبحانہٗ کا احسان جان کر ان اعمال و اذکار سے عوض و بدلہ نہ چاہنا (اور یہ بات ملحوظ رکھنا کہ) توفیقِ ذکر اور توفیق اعمالِ خیر ایک ایسی نعمت ہے کہ اُس کا شکر ادا کرنا محال ہے، گفتگو میں (بیجا طور پر) بحث و مباحثہ نہ کرنا ـــ یہ ہے طریقۂ اہلِ معرفت

اللہ تعالےٰ سب مخلصوں کو اور اس فقیر و حقیر عمر ضائع کردہ کو اس سعادت سے مشرّف رکھے (آمین) .....

میر فرّخ حسین کو تحریر فرماتے ہیں

بعد سلام لکھتا ہوں کہ آپ کا خط آیا۔ مسرت ہو پہنچائی۔ آپ نے اُس طرف تشریف لے جانے کے وجوہ لکھے ہیں ـــ وہ تمام وجوہ خواہ مخواہ کے ہیں جو آپ کے دل میں آتا ہے اس کو قابلِ توجیہ (اور لائقِ ترجیح) قرار دیتے ہیں۔ آپ کبھی منشی بنتے ہیں کبھی محدّث، کبھی خوشنویس کبھی حافظ اور کبھی طبیب ـــ اصل میں آپ کی طبیعت کا میلان دنیا کی طرف ہے۔ فنِ طبابت نافع ضرور ہے مگر بعض وجوہ کی بنا پر خود میں نے مشغلۂ طب کو اختیار نہیں کیا، اسی طرح علوم فلسفہ اگر زیادتی کے ساتھ ہوں گے تو خدا سے غافل کرنے والے بن جائیں گے اسی لیے میں نے ان سے بھی اعراض کیا ـــ ... میں چاہتا تھا کہ وہ علم جو کہ حضرت امیر المومنین علی اور اہل بیت عظام رضی اللہ تعالےٰ عنہم کی وراثت سے اہل صفا کے دلوں میں پہونچا ہے اُس علم کو آپ تک پہونچا دوں۔ ـ وہ علم، علم احوالی ہے۔ اس علم کو دوامِ ذکر، توجہ، تلاوت اور درود و استغفار وغیرہ کے ذریعہ عنایت فرماتے ہیں ـــ اسرارِ توحید و تفرید، محتاجوں یعنی مخلوق سے ناامید ہو جانا اور امید کو حضرت غنی سبحانہٗ سے وابستہ کرنا، جو رزق مقدر ہے اُس پر راضی رہنا

اور مشہودِ حضرت حق سبحانہٗ میں استغراق رکھنا، وھو معکم اینما کنتم۔ اپنا مطمحِ دل بنانا اور کتب صوفیہ میں جو کچھ لکھا ہے ــــــ اگرچہ اس وقت جو کہ کفر و فسق اور بدعت کے غلبے کا وقت ہے۔ کتب صوفیہ میں لکھے ہوئے امور بہت کم پائے جاتے ہیں پھر بھی (یہ تصوف) ایک ایسی چیز ہے جو "نقدِ دلہا" ہوتی ہے اور جس کے ذریعہ اشخاص ممتاز ہو جاتے ہیں جو پرندہ آسمان کی طرف اڑنے کا قصد کرتا ہے۔ اگرچہ وہ آسمان تک نہ بھی پہونچے مگر سرفراز (اونچا) اور بلیوں کے شر سے آزاد ضرور ہو جاتا ہے ــــــ یہ سب (احسان و تصوف) اہل بیت عظام اور اصحاب خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم اور صوفیاء کے سینوں سے پہونچا ہے۔ آپ کو اس سے وحشت ہے

شب سمور گزشت و شب تنور گزشت

(یعنی سمور کی کھال پہننے والے کی بھی سردی کی رات گزر گئی اور تنور کے آگے ہاتھ تاپنے والے کی بھی رات گزر گئی)

مگر گرمیٔ سمور محاسبہ سے نزدیک تر ہے اور گرمیٔ تنور مواخذہ سے دور ہے ــــــ فقراء کی آستان نشینی، اغنیاء کی صدارت سے بہتر ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور مجھ کو اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائے ...... میری عمر اختتام کو پہونچ گئی۔ اب داد و دارو کا وقت نہیں رہا۔ "اندیشۂ گناہاں" اور ہول قبر و قیامت لگا ہوا ہے۔ آخر میں یہ بات آپ سے اور کہتا ہوں، نجاران و آہنگراں نیز دیگر پیشہ ور اپنے باپ دادا کے پیشے کو چاہا کرتے ہیں اور اسی پر استقامت رکھتے ہیں مگر آج کل کے لوگ اپنے آباء کی میراث علمی سے اجتناب کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے جہالت پھیل رہی ہے۔

سعادتِ انسانی

افاداتِ حضرت شاہ ولی اللہؒ

ترجمانی — عتیق الرحمٰن سنبھلی

(۲)

۳- حصولِ سعادت کی دو شکلیں

زیرِ بحث سعادت کہ انسان کا بہیمی عنصر بھی ملکیت کے ہم رنگ ہو جائے، اس کے حصول کی
شکلیں ہیں، ایک یہ کہ آدمی ایسا بن جائے جیسے کہ بہیمی طبیعت اس کے اندر پائی ہی نہیں جاتی۔ اس
راستہ یہ ہے کہ وہ طریقے اختیار کیے جائیں جن سے طبیعت کے تقاضے ساکت اس کی شورش سرد
اس کے مدرکات و کیفیات کا چشمہ خشک ہو جائے۔ اسی کے ساتھ ہمہ تن عالم بالا کی طرف متوجہ ہو
کی کوشش ہو جس کے اثر سے نفس وہ علوم قبول کرنے لگے جو زمان و مکان سے بالکلیہ ماوراء ہیں ا
ان لذتوں کا خوگر ہو جائے جو عام طبعی لذتوں سے یکسر جدا ہیں — اس کیفیت کا آدمی عام آدمیوں
کنارہ کش ہو جاتا ہے، نہ ان کی مرغوبات میں اسے کوئی رغبت رہتی ہے نہ ان کے خوف و خطر
پیمانے اس پر اثر کرتے ہیں۔ اس کی اپنی دنیا الگ اور اس کے پیمانے بالکل جدا ہوتے ہیں۔

یہ حکمائے اشراقیین اور صوفیائے مجذوبین کا طریقہ ہے جس میں بس اقل قلیل افر
کامیابی کی منزل تک پہونچ پاتے ہیں، باقی زیادہ تر اندرونی حقیقت سے خالی رہتے ہوئے

اس کی ظاہری ہیئت کی نقل میں زندگی گزار دیتے ہیں۔

دوسری شکل یہ ہے کہ بہیمیت اپنا وجود برقرار رکھتے ہوئے اصلاح یافتہ ہو جائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جو باتیں انسان کے روحانی عنصر (یا نفس ناطقہ) کی فطرت میں ودیعت ہیں اور بہیمی عنصر از روئے فطرت ان سے عاری ہے انہی باتوں کا اظہار اس بہیمی عنصر سے بھی مختلف افعال، اذکار اور ہیئات کی شکل میں کرایا جائے۔ ایک گونگا آدمی جو بول نہیں سکتا ہے وہ کچھ مخصوص اشارات کے ذریعے بول چال کا بدل فراہم کر لیتا ہے، ایک مصوّر اُن ظاہری ہیئتوں کی منظر کشی کر کے جو کسی خاص اندرونی کیفیت (مثلاً خوف یا ندامت) کے وقت لوگوں پر طاری ہوا کرتی ہیں گویا ان کیفیتوں ہی کو سامنے لے آتا ہے۔ اپنے بچے کی موت کا صدمہ اٹھانے والی ماں جب درد و غم کے کلمات منہ سے نکالتی ہے تو سننے والا صرف وہ کلمات نہیں سنتا بلکہ اس ماں کا دلی درد و کرب بھی اس کی آنکھوں کے سامنے متشکل ہو کر آ جاتا ہے۔ بس اسی طریقے سے نفس بہیمی کے لیے بھی ممکن ہے کہ نفس ناطقہ کی خشوع و خضوع اور توجہ الی اللہ جیسی کیفیتوں کا اظہار اپنی اہلیت کے مطابق کرے۔

بہر حال یہ دو امکانی شکلیں حقیقی سعادت کے حصول کی ہیں۔ لیکن پہلی نہایت مشکل اور صرف خال خال افراد کے بس کی ہے۔ علاوہ ازیں یہ اس عالم کے مزاج کے خلاف اور اس کی مجموعی مصلحت سے متصادم ہے، جبکہ حکمت الٰہی کی نظر اس عالم کی مجموعی مصلحت اور اس کے مزاج کی رعایت نیز نوع انسانی کی بحیثیت مجموعی صلاح و فلاح اور اُن کی سہولت پر ہے۔ اس لیے نبیوں اور رسولوں کو جس طریقے کی طرف دعوت دینے کے لیے بھیجا گیا ہے اور جس کی مکمل رہنمائی انھوں نے انسانوں کو بہم پہونچائی وہ ان میں سے دوسرا طریقہ اور دوسری شکل ہے۔

پہلی شکل بھی کوئی شکل ہے، اور اس کے ذریعہ بھی منزل سعادت تک پہونچا جا سکتا ہے۔ اس کا پتہ بس اسی طریقۂ ثانیہ کے سلسلے کی کچھ ہدایات و تعلیمات میں لپٹے ہوئے اشاروں اور التزامی دلالتوں سے چلتا ہے، اس سے زیادہ اس کی کوئی سند نہیں، یہ راستہ کچھ ایسا ہے کہ اگر اکثر لوگ اسے اختیار کر لیں تو دنیا ویرانہ بن کر رہ جائے گی۔ اور اگر خدا کی طرف سے اس کا مکلف قرار دے دیا جائے تو تکلیف بالمحال جیسی بات ہو گی، کیونکہ کاروبار دنیا انسانی جبلّت ہے۔ اسی لیے اس راستے کے

داعیوں کی دعوت کو کبھی بھی دنیا میں قبول عام حاصل نہیں ہوا۔ اس کے برعکس دوسری شکل انسانوں کی اکثریت کی صلاح و فلاح کی ضامن اور دنیا و آخرت دونوں کی سعادتوں کی جامع ہے۔ یہ ایک ذکی کے بھی بس کی ہے اور ایک غبی کے بھی، ایک مشغول آدمی بھی اسے اختیار کر سکتا ہے اور فارغ الوقت بھی۔ اس کے داعی اور امام، پہلے کے برعکس ہمیشہ وہ ہوئے ہیں جو دین و دنیا دونوں کے بیک وقت امام تھے۔ انھیں کی دعوت کا سکہ دنیا میں چلا ہے۔ اور انھی کا نقش قدم پیروی کے لائق قرار پایا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ خیر و سعادت کی تمام امکانی صورتوں (اور روحانی ترقیوں) کا احاطہ اس شکل میں نہیں ہو سکتا، بہت سے ابواب بہت سے آدمیوں پر کھلنے ہی نہ پائیں گے۔ لیکن بحیثیت مجموعی سب انسانوں کی فلاح کا سوال سامنے رکھا جائے تو اولاً تو یہ احاطۂ کلی سب کے بس کی بات نہیں، اور دوسرے جو ابواب و درجات عام آدمی کی گرفت سے باہر رہ جائیں گے ان سے کوئی نقصان نہیں۔ جتنا کچھ بھی اس دوسری شکل والے راستے سے ایک عام آدمی کو حاصل ہو جاتا ہے وہ دنیا میں اس کے نفس کو درست اور مستقیم رکھنے کے لیے کافی ہو اور آخرت میں عذاب سے بچا لینے کے لیے۔

۴۔ وہ بنیادی باتیں جن پر حصول سعادت کی دوسری شکل کے تمام طریقے منتہی ہیں

سعادت کے حصول کی وہ دوسری شکل جس کا خدا نے انسان کو مکلف کیا ہے، اسے پانے کے طریقے اگرچہ بہت سے ہیں، مگر ان سب کی اصل اساس — میری دانست میں — چار خصلتیں ہیں جو نفس ناطقہ کے غلبہ سے بہیمیت میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ چار خصلتیں وہ ہیں جو انسان کو ملاء اعلیٰ (فرشتگان مقرب) کا ہم رنگ و ہم پایہ بناتی ہیں۔ اور جیسا کہ خدا نے مجھ پر روشن کیا ہے، یہی وہ بنیادی خصلتیں ہیں جن کی دعوت اور ترغیب کے لیے انبیاء مبعوث کیے گئے۔ شریعتیں انھی چار خصلتوں کی تفصیل تھیں اور ان کے تمام احکام انھی چار باتوں کے گرد گھومتے ہیں — وہ چار خصلتیں کیا ہیں؟

۱۔ طہارت۔ طہارت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر سلیم الفطرت اور صحیح المزاج ہے تو نجاستوں سے آلودگی اس پر گرانی کی کیفیت طاری کرتی ہے۔ مثلاً بول و براز کے تقاضے کے وقت یا

جنسی خواہش کی تکمیل پر طبعی نفاست کے اثر سے آدمی بہت ہی الجھن اور گھٹن محسوس کرتا ہے، ایک تاریکی سی اُسے اپنے اندر چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے، لیکن جب ان تقاضوں سے فراغت پالیتا ہے یا تکمیل خواہش کے بعد جسم کو مل مل کر نہالیتا، اچھا لباس پہن لیتا، اور خوشبو لگالیتا ہے تو اس انقباضی کیفیت کے بجائے انشراح وانبساط کی کیفیت نصیب ہوتی ہے۔ ان دو حالتوں میں سے پہلی حالت کا نام حَدَث ہے اور دوسری کا طہارت ـــــ ایک نفیس الطبع اور ذکی الحس انسان ان دونوں حالتوں کے فرق کو بہت اچھی طرح محسوس کرتا اور ایک کو پسند اور دوسری کو ناپسند کرتا ہے۔ ضعیف الحس اور غبی بھی اگر بہیمیتُ (حیوانیت) کی سخت گرفت میں نہ ہو اور طہارت اور یادِ خدا کی کچھ توفیق پائے تو وہ بھی ان دونوں حالتوں کا فرق سمجھ لیتا ہے۔

الغرض یہ طہارت انسان کے ان اوصاف میں سے ہے جن میں ملاءِ اعلیٰ (مقرب ترین فرشتوں کی جماعت کے احوال کا پرتو ہے، بایں معنیٰ کہ وہ ہر قسم کی گندگیوں سے پاک ہیں، اور اپنی نورانی کیفیات سے سرور رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ نفس کو، عملی اعتبار سے اس کی بہتر اور مطلوب حالت (کمال) سے قریب ہونے میں مدد دیتی ہے۔ اس کا اہتمام کیا جانے لگے اور طبیعت کو اس کی طرف پورا میلان ہو جائے تو ملکی الہامات کو اخذ کرنے کی استعداد آتی ہے، ملائکہ کی زیارت تک ہونے لگتی ہے، رویائے صالحہ اور انوار و تجلّیات کی دید نصیب ہوتی ہے۔ اور اس کے برعکس، حَدَث کی حالت میں انسان رہنے لگے، تو شیطانی وسوسے قبول کرنے کی استعداد ہوتی ہے، حسِ مشترک سے اُن کی رویت بھی ہونے لگتی ہے، وحشت اثر خواب دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور ـــــ قصہ مختصر ـــــ نفس ناطقہ کے ارد گرد ظلمتوں کا ہالہ بن جاتا ہے۔

۲۔ اخبات للہ ـــــ یہ چار خصلتوں میں سے دوسری خصلت ہے، جس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک سلیم الفطرت آدمی کو جب اس کی پوری توجہ کی حالت میں خداوند قدوس کی نشانیوں اور اس کی صفات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تو اس کے نفس ناطقہ پر سراپا ادب بن جانے کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور جسم کے اعضاء و جوارح نیازمندی میں ڈوب کر عجز و بیخودی کی تصویر بن جاتے

ہیں۔ دل غایت ادب کے ساتھ بارگاہ قدس کی طرف کھنچتا اور کچھ ایسی حالت مجموعی طور پر رونما ہوتی ہے جیسی بادشاہوں کے دربار میں حاضری پر گرے پڑوں کی، کہ وہ اپنی کم مائیگی دیکھتے ہیں اور اُس کے مقابلے میں ان بادشاہوں کی فرمانروائی کہ جس کو چاہیں محروم کردیں جس کو چاہیں بخشدیں، یہ حال بھی بعینہٖ ملاءِ اعلیٰ کے حال سے مشابہ ہے، اور اسی لیے نفسِ انسانی کو اس کے علمی و نظری کمال سے ہم کنار ہونے کے قابل بناتا ہے، یعنی معرفتِ الٰہیہ کے نقوش ذہن پر ثبت ہوتے ہیں اور اس عتبۂ عالی سے کسی نہ کسی قسم کا قرب و اتصال نصیب ہوتا ہے، گو کہ الفاظ میں لے بیان نہیں کیا جاسکتا۔

۴۔ سماحت ـــــ یہ ایک انسان کی طبیعت کا وہ وصف ہے جو اُس کے علمی اور عملی کمالات سے مختلف اور متضاد باتوں کو طبیعت میں جاگزیں ہونے سے روکتا ہے، یعنی بہیمی قوت کے تقاضے اس پر غالب نہیں ہو پاتے، ان تقاضوں کے نقش اُس کے اندر مستقل جگہ نہیں بناتے اور ان کے اثرات کی آلائشیں اس کی پاکیزگی کو مکدر نہیں کر پاتیں۔ زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں سمجھئے کہ انسان کا نفس معاشی، اور شہوانی نیز غضبانی تقاضوں کی انجام دہی پر متوجہ ہونے کے لیے تو مجبور ہے۔ لیکن یہ مجبوری کا مرحلہ جب طے ہو جاتا ہے تو اس کے بعد نفس میں اگر سماحت ہے، تو وہ اس طرح اس توجہ سے دور ہو جائے گا جیسا کہ کبھی مشغول اور متوجہ تھا ہی نہیں۔ ورنہ وہ ان تقاضوں کی انجام دہی سے عملاً نکل آنے کے باوجود بھی ذہنی اور قلبی طور سے انھی میں پھنسا رہے گا۔ اور جیسے انگوٹھی یا کسی مُہر کو موم یا لاکھ پر دبا کر ہٹا بھی لیا جاتا ہے تب بھی اس کے نقوش اس موم یا لاکھ سے نہیں ہٹتے، اسی طرح نفس میں اس توجہ اور مشغولیت کا ایک غیر منفک نقش قائم ہو رہے گا۔ اور یہی مستقل نقش اگلی زندگی میں وبال بنے گا۔ اس کے برعکس جب نفس نے اس وقتی مشغولیت اور توجہ کا کوئی مابعدی نقش اور اثر قبول نہیں کیا ہوگا وہ جسم کی قید سے آزاد ہوتے ہی اس کے وقتی اثرات سے بھی پاک ہوگا اور اُن کے کسی آزار کا سوال اس کے لیے وہاں نہیں ہوگا۔

نفس کی ان دو حالتوں کی بالکل سامنے کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ کسی شخص کا مال چوری ہو جائے تو وہ اگر غنی طبیعت اور شاہ دل ہے تو کوئی اثر ہی نہ لے گا۔ لیکن چھوٹے دل اور

ہلکی طبیعت کا ہے تو غم سے پاگل ہو جائے گا، ہمہ وقت یہ گیا ہوا مال ہی اُس کے دل و دماغ میں
گھوما کرے گا۔ بس یہی سماحت اور اس کی برعکس حالت کا مفہوم ہے۔ یہی دونوں حالتیں ہیں جو
مختلف معاملات میں مختلف ناموں سے یاد کی جاتی ہیں۔ مال کا معاملہ ہو تو سخاوت اور بخل ان کا
نام ہے۔ شہوتِ فرج و بطن کا قصہ ہو تو انھیں ضبطِ نفس اور بے مہاری بوالہوسی (عفت و شرہ)
کا نام دیتے ہیں۔ آرام پسندی اور سہل انگاری کے تقاضوں کو قبول کرنے نہ کرنے کی بات ہو تو صبر اور
ناصبوری ان کا نام ہے، علیٰ ہذا شرعی ممنوعات کے سلسلے میں سماحت کا رویہ اختیار کیا جائے تو اس کا
مخصوص نام تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔ اور عدم سماحت کا نام فجور و بدکاری[1]۔ یہ سماحت وہ جوہر ہے
کہ جس انسان کی طبیعت میں بھی جاگزیں ہو جائے اس کا نفس دُنیاوی لذتوں سے بلند ہو کر خالص
معنوی اور بلند تر لذتوں کا اہل ہو جاتا ہے۔

۴۔ **عدالت** —— یہ چوتھی خصلت نفس انسانی کی اس حالت کا نام ہے جس پر تمدنی اور
جماعتی زندگی سہولت اور ہمواری کے ساتھ چلنے کا دار و مدار ہے۔ نفس کی اس حالت میں انسان سے
وہی افعال صادر ہوتے ہیں جن سے مدنیت و اجتماعیت کے صالح نظام کو قیام اور قرار نصیب ہو۔
نفسِ انسانی کی اپنی فطری اور طبعی حالت دراصل یہی ہے۔ کیونکہ خداوندِ عالم اس عالم میں جیسا صالح
نظام چاہتا ہے وہ اس کے فرشتوں اور ارواح مجرّدہ کے شعور میں مرتسم ہو جاتا ہے اور پھر ان کا رجحان
پوری قوت کے ساتھ اسی کی طرف ہوتا ہے۔ البتہ جسم کی قید میں آنے کے بعد ان روحوں کا معاملہ
مختلف ہو جاتا ہے۔ کوئی اپنے اسی رجحان پر باقی رہتی ہے اور کوئی اس جسم کے مادی اور سفلی
میلانات سے مغلوب ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور پھر اسی اختلافِ حال کے مختلف اثرات ان پر موت
کے بعد مرتب ہوتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام جن کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ
لوگوں کو عدل پر قائم کریں ان کی نصرت و اعانت جو لوگ کرتے ہیں وہ اسی بنیاد پر خدا کے بھرد
کرم کے مستحق قرار پاتے ہیں اور مزاحمت کرنے والے ملعون و مردود!

الغرض جب آدمی عدالت کی صفت سے بہرہ ور ہوتا ہے تو اس کا مقام یہ ہے، کہ اُس کے

---

[1] اس تفصیل کے سامنے آنے کے بعد سماحت کا جامع ترجمہ علوِّ نفس اور بلند نظری سے کیا جا سکتا ہے۔ (مترجم)

اور حاملینِ عرش اور مقربین بارگاہ فرشتوں کے درمیان میں ایک سلسلۂ اشتراک پیدا ہو جاتا ہے، ایک دروازہ کھل جاتا ہے جس سے ان عالی مرتبہ فرشتوں کے الہامات نفس پر نزول کرتے ہیں اور نفس کو پوری آمادگی کے ساتھ ان الہامات سے ہم آہنگی کی توفیق ملتی ہے۔

تو یہ وہ چار خصلتیں ہیں کہ تم اگر ان کی حقیقت کو پا جاؤ، ان میں آدمی کو اس کے تمام علمی اور عملی کمالات سے بہرہ ور کرنے کی اور فرشتوں کے سلسلے میں منسلک کر دینے کی جو صلاحیت ہے اُسے سمجھ جاؤ، نیز یہ بھی تم پر کھل جائے کہ ہر زمانے میں شرائع الٰہیہ کیسے انھی چار خصلتوں پر مبنی اور منتہی ہوتی رہی ہے تو سمجھ لو کہ تم (قرآن کی زبان میں) خیر کثیر پا گئے اور تفقہ فی الدین (دین کی رمز شناسی) کا وہ مقام تمھیں مل گیا جو کسی بندے پر خدا کے کرمِ خاص کا مظہر ہے ـــــ ان چاروں خصلتوں کے اجتماع سے جو نفسی حالت وجود میں آتی ہے اسی کا نام فطرت ہے۔ یہ فطرت صحیحہ کچھ اسباب سے وجود میں آتی ہے، جن میں سے بعض علمی ہیں اور بعض عملی۔ ان اسباب کے پہلو بہ پہلو کچھ مخالف اسباب کا بھی سلسلہ ہے جو اس فطری حالت کی پیدائش کو روکتے ہیں اور پھر ان رکاوٹوں کو توڑنے کی بھی کچھ تدبیریں ہیں۔ اب ہم آگے انھی تینوں چیزوں کو بیان کریں گے۔

زکوٰۃ اور ٹیکس

از استاذ یوسف القرضاوی ——— ترجمہ خلیل الرحمٰن سجاد

(۴)

کیا زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس بھی اسلامی حکومت لگا سکتی ہے؟

اسلامی اقتصادیات میں زکوٰۃ ایک قطعی اور دائمی فریضہ ہے، جس کی مقدار اور شرح میں کسی رد و بدل کے بغیر حکومت اس کے وصول اور صرف کی ذمہ دار ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا اسلامی حکومت عوام کی ضرورتوں اور اپنے عام مصارف کے لیے زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس بھی مالدار مسلمانوں پر عائد کر سکتی ہے؟ یا نہیں؟

علماء و فقہاء کی رائیں اس مسئلہ میں مختلف ہیں، بعض علماء کی رائے ہے کہ حکومت کو اس کا حق ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ——— پہلی رائے کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

۱۔ فریضۂ امداد باہمی: جو لوگ زکوٰۃ کے علاوہ کوئی اور مالی حق از روئے شرع ایک مسلمان کے ذمہ نہیں سمجھتے، وہ بھی اس کے قائل ہیں کہ اگر ہنگامی طور سے کوئی آفت سوسائٹی پر ایسی آپڑے، جس کے مقابلے کے لیے ریاست کا خزانہ کافی نہیں ہے تو اہل دولت پر کتنا ہی مالی بار کیوں نہ پڑ جائے، اس ہنگامی ضرورت کا مطالبہ ان سے پورا کرانا حکومت کا حق ہوگا ——— اسی طرح گزشتہ بحث (زکوٰۃ کی نظری اور قانونی اساس) کے ذیل میں نظریۂ کفالت اور نظریۂ اخوت کی تشریح میں جو کچھ پیش کیا جا چکا ہے اس سے بھی اس نقطۂ نظر کی تائید نکلتی ہے کہ زکوٰۃ پر مالی حق، بہرحال ختم نہیں ہو جاتا۔

۲۔ زکوٰۃ کے مصارف محدود ہیں اور ضرورتیں بہت وسیع: یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ گزر چکی ہے کہ زکوٰۃ کے کچھ خاص روحانی، اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی مقاصد ہیں، محض مالیاتی اور اقتصادی نقطۂ نظر اس میں کام نہیں کر رہا ہے لہٰذا اس کے مصارف بھی محدود اور مخصوص رکھے

کے ہیں۔ ایک قول ضرور ایسا ہے جس کی رو سے "سبیل اللہ" کا مصرف ہر کار خیر کو حاوی ہے لیکن جمہور کی رائے نے اسے قبول نہیں کیا ہے۔ اور آیت کا ڈھانچہ اور اس کی حدیثی تشریح بھی اسے قبول نہیں کرتی۔

بہر حال زکوٰۃ کے مصارف تو محدود ہیں اور ضرورتوں کا میدان وسیع ہے۔ پھر ان باقی ضرورتوں کا کیا ہوگا؟

اس سوال کا جواب پانے کے لیے جب ہم اسلام کے گزشتہ دور کی طرف دیکھتے ہیں تو اموالِ غنیمت کا پانچواں حصہ (خمس)، اور فے (بلا جنگ فتح کا مالِ غنیمت) ان باقی ضرورتوں میں خرچ ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن آمدنی کی یہ دونوں مدیں اب بند ہیں تو بقدر ضرورت ٹیکس عائد کیے بغیر چارہ نہیں۔

شریعت اسلامی کا اصولی قاعدہ ہے کہ جس چیز پر کسی واجب کی تکمیل موقوف ہو اس کا عمل میں لانا واجب ہے۔

فقہ شافعی میں ایک جزئیہ اس سلسلے میں ہماری مزید تائید بھی کرتا ہے۔ اس فقہ کا ایک مسئلہ تھا کہ باقاعدہ اور مستقل فوجی ملازمت کرنے والے سپاہی صرف خزانۂ عام سے تنخواہ پا سکتے ہیں: بخلاف رضاکار سپاہیوں کے کہ انھیں خزانۂ زکوٰۃ سے بمد "سبیل اللہ" بھی دیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب خزانۂ عام خالی ہو تو مستقل سپاہیوں کی تنخواہ کہاں سے ادا ہوگی؟ امام نووی اور دوسرے شافعی فقہاء ایسی صورت میں مملکت کے دولتمندوں سے علاوہ زکوٰۃ کے بقدر ضرورت وصول کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

۷۔ شریعت کے چند اصولی قاعدے

"واجب کا موقوف علیہ واجب" ہی تنہا وہ فقہ اسلامی کا اصول نہیں ہے جس سے ٹیکس عائد کرنے کا جواز ملتا ہو، بلکہ اور بھی چند عمومی اور اصولی قاعدے ہیں جو فقہاء نے نصوصِ شریعت اور جزئیات کے مطالعے سے دوسرے قواعد کی طرح اخذ کیے ہیں اور وہ اسلامی قانون سازی، فتوی اور قضاء کا مدار بن چکے ہیں۔ — یہ اصول و قواعد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ "مصالح کا لحاظ" — یعنی اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت (جسے شریعت بھی مصلحت تسلیم کرتی ہو) کا جو تقاضا ہو، اسی پر عمل کیا جائے۔

۲۔ دفع ضرر کو حصولِ نفع پر مقدم رکھنا۔

۳۔ جہاں دو ایسی مصلحتیں باہم متصادم ہو جائیں جن میں ایک کمتر اور دوسری برتر ہو وہاں برتر کو ترجیح دینا۔

۴۔ اجتماعی ضرر کو دور کرنے میں انفرادی ضرر کو برداشت کیا جانا۔

ان چاروں ہی اصولوں سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ جہاں ریاست کی آمدنی کا کوئی خاص قدرتی ذریعہ ۔ مثلاً تیل کے چشمے یا پیداواری اجناس وغیرہ ۔ اس کی ضرورتوں کی کفالت کرنے والا نہ ہو وہاں ٹیکس عائد کرنا جائز ہی نہیں واجب ہوگا کیونکہ آج اسلامی حکومت کو اگر ٹیکس عائد کرنے کا حق دینے سے انکار کیا جائے تو بغیر کسی دشمن کے حملے کے از خود ہی چند دن میں ختم ہو جائے گی اور ایسا ہونے دینا شریعت کے ان چاروں بلکہ پانچوں اصولوں کی خلاف ورزی ہے جو ہم نے ذکر کیے۔

ان ہی اصولوں کی بنا پر امام غزالی جیسا فقہ شافعی کا امام جو مصالح مرسلہ کی رعایت کرنے میں بہت تنگ ذہن کی شہرت رکھتے ہیں، ان کا بھی کہنا ہے کہ اگر ریاستی خزانہ لشکر کے اخراجات برداشت کرنے پر اٹھانے سے قاصر ہے اور اس کی وجہ سے بیرونی حملے یا اندرونی شورش کے امکانات پیدا ہوتے ہیں تو امام کو یہ حق ہوگا کہ لشکر کی ضرورت کے مطابق مالی فریضہ (بالفاظ دیگر ٹیکس) دولتمندوں پر عائد کرے۔ اس لیے کہ دو برائیوں یا دو نقصانوں میں سے اگر ایک سے مفر نہ ہو تو شریعت بڑی برائی یا بڑے نقصان سے بچنا مقدم قرار دیتی ہے۔[1]

فقہ مالکی کے امام شاطبی یہی رائے اس تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے کہ آمدنی اور پیداوار پر بھی ٹیکس ایسی صورت میں لگایا جا سکتا ہے، لکھتے ہیں کہ:۔

> یہ بات اگر اگلوں سے منقول نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں ایسی صورت حال سے سابقہ نہیں ہوا۔ بخلاف ہمارے زمانہ کے اگر امام ایسا قدم نہ اٹھائے تو اسلام کی قوت اور شوکت تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ اور جن لوگوں پر نیا مالی بار گراں ہوتا ہے وہ اسلام کی طاقت ٹوٹ جانے کی صورت میں اس سے کہیں زیادہ ناگوار صورتحال سے دوچار ہوں گے۔ اور اس طرح کے تعارض میں کوئی شبہ نہیں کہ شریعت دوسری بات کو زیادہ قابل لحاظ قرار دیتی ہے۔[2]

چوتھی دلیل ۔ جہاد بالمال کی فرضیت | اسلام نے مسلمانوں پر جہاد بالنفس کے ساتھ جہاد بالمال بھی فرض کیا ہے۔

وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (توبہ ۴۱)	اور جہاد کرو اللہ کے راستہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے۔

[1] المستصفیٰ ج ۱ ص ۳۰۳ [2] الاعتصام ج ۲ ص ۱۰۴۔ کچھ تصرف کے ساتھ!

اور یہ جہاد بالمال قطعی طور پر زکوٰۃ کے علاوہ ایک مالی فریضہ ہے۔ اور یہ ان تمام ہی مالی ضرورتوں پر صادق آتا ہے جن کی تکمیل کے بغیر ایک ریاست جہاد کے قابل طاقتور بن کر نہیں رہ سکتی، چاہے براہ راست ان کا تعلق جنگ اور جہاد سے نہ ہو۔

ٹیکس کے جواز کی شرطیں

یہاں تک ہم نے زکوٰۃ کے ساتھ مزید ٹیکس کے جواز کی دلیلیں پیش کی ہیں۔ لیکن یہ جواز مطلق نہیں بلکہ کئی شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ اور وہ یہ ہیں:۔

۱. مال کی واقعی ضرورت ہو اور اس کے حصول کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ ہو

یہ شرط اوپر کی گفتگو سے بھی ظاہر ہے۔ اور وجہ بھی صاف ہی ہے کہ اسلام[1] فرد کی ملکیت کا احترام کرتا اور معاشرے سے کرواتا ہے۔ [2] یہ کہ اسلامی اصول سے کسی کے ذمے ازخود مخلوق کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، حالات کے تقاضے سے عائد ہوتی ہے پس جب تک ایسے حالات نہ ہوں اس پر کوئی بوجھ ڈالنا بلا جواز کے بھی ہوگا اور اس کے حق ملکیت کی بے حرمتی بھی۔

اس شرط کے معاملے میں ہمارے علماء اور اہل فتویٰ کی روش آخری حد تک محتاط اور سخت گیرانہ رہی ہے۔ حتیٰ کہ بعض علماء نے تو یہاں تک کہا ہے کہ جب تک حکومت کا خزانہ بالکل خالی نہ ہو جائے اس وقت تک اسے ٹیکس عائد کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ اتنی سختی انھوں نے صرف اسی لیے کی کہ ایسا نہ ہو کہ سلاطین و حکام اس گنجائش سے فائدہ اٹھا کر ضرورت، بے ضرورت عوام سے ٹیکس وصول کرنے لگیں اور عوامی مصلحت کا یہ ذریعہ ان لوگوں کی عیش پرستی کا وسیلہ بن جائے۔ شیخ عزالدین بن عبدالسلام، قاضی بدرالدین سنجاری اور امام نووی کے نام اس معاملے میں اسلامی تاریخ کے خاص طور پر بہت ہی روشن اور قابل فخر نام ہیں خلفاء وقت کے مقابلہ میں ان ائمہ نے اس شرط کی حرمت کے لیے جو جرأت و عزیمت دکھائی اس کی تفصیل کے لیے "النجوم الزاہرۃ ج ۷"، "السلوک لمعرفۃ دول الملوک ج ۱"، حافظ سخاوی کا ترجمہ امام نووی اور عہد حاضر کے مصنف محمد الغزالی کی "الاسلام المفتریٰ علیہ" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

۲. ٹیکس کے بوجھ کی تقسیم عادلانہ ہو

ایسا نہ ہو کہ آبادی کا ایک طبقہ دوسرے کی خاطر پس دیا جائے۔ ایک پر اس کی حیثیت سے کم اور دوسرے پر دوچند ٹیکس عائد کیا جائے ___ یہ بھی نہیں کہ ہر ایک پر ایک ہی

(مساوی) شرح سے ٹیکس لگایا جائے، کیونکہ آبادی میں اگر مختلف حیثیت کے افراد اور طبقات ہیں تو ایسی مساوات عدل نہیں ظلم ہے۔ یہ بھی لازم ہے کہ ٹیکس کے جو اقتصادی اثرات عام زندگی پر پڑ سکتے ہیں انھیں نظر میں رکھکر اور مفاد عامہ کی رعایت رکھ کر ٹیکس اسکیم بنائی جائے۔ ورنہ یہ چیز بھی ٹیکس کو غیر عادلانہ بنادے گی۔

اس کی رہنمائی ہمیں عمر فاروقؓ کے طرز عمل میں ملتی ہے۔ ابو عبید اپنی کتاب "الاموال" میں حضرت عمر کا طرز عمل بتاتے ہیں کہ ان کے ابتدائی دور میں نبط — ایک غیر اسلامی ریاست — کے تاجروں سے دس فیصدی تجارتی ٹیکس وصول کیا جاتا تھا، جیسا کہ نبط میں مسلم تاجروں سے لیا جاتا تھا، مگر حضرت عمر نے دیکھا کہ مدینہ کو ان لوگوں کے تجارتی مال میں سے گیہوں اور روغن زیتون کی زیادہ ضرورت ہے تو ان اجناس کی زیادہ درآمد کی ہمت افزائی کے لیے آپ نے ٹیکس کی شرح دس فیصدی سے گھٹا کر پانچ فیصدی کردی۔ باقی مال جو یہ لاتے تھے اس پر وہی ۱۰ ار کی شرح برقرار رکھی گئی۔

۳۔ اہل شوریٰ اور اصحاب رائے کی تائید حاصل ہونی چاہئے — امام کو نہ تنہا اپنی رائے سے ٹیکس لگانے کا حق ہے اور نہ صرف اپنے نائبین کی تائید سے بلکہ امت کے ارباب علم و بصیرت اور اہل رائے کی تائید بھی ضروری ہے — ہم بتا چکے ہیں کہ افراد کی ملکیت شریعت کی نظر میں قابل احترام ہے۔ اور انسان کے ذمہ بالذات کسی مخلوق کی کوئی ذمہ داری نہیں عائد ہوتی۔ پس جب حالات اور مصلحت کا تقاضا یہ معلوم ہو کہ یہ دونوں قابل احترام اصلیں کسی درجے میں نظر انداز کردی جائیں، تو یہ اقدام ایک غیر معمولی قسم کا اقدام ہوگا اور اس بات کی ہر ممکن احتیاط کے بعد ہی صحیح ہوگا کہ واقعی ضرورت ہو اور ضرورت کی حد سے تجاوز بھی نہ کیا جارہا ہو، جس کی شکل یہی ہے کہ اہل شوریٰ اور اصحاب رائے کی بھی پوری تائید حاصل ہو۔ صرف امام اور حکام ہی اپنی رائے سے نہ کر گزریں۔

ٹیکس کو ناجائز قرار دینے والوں کے دلائل

جو لوگ اسلامی حکومت میں ٹیکس کو جائز نہیں سمجھتے ان کے خیال کی بنیاد حسب ذیل امور ہیں جو دراصل شبہات ہیں۔

۱۔ زکوٰۃ کے علاوہ کوئی دوسرا حق مال پر عائد نہیں — یہ فقہاء کا مشہور قول ہے اور اس کی رو سے ٹیکس وغیرہ کسی بھی نام سے کوئی مالی حق عائد کرنا جائز نہیں ہو سکتا۔

۲۔ شخصی ملکیت کا احترام | اسلام شخصی ملکیت کا احترام کرتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی خوشدلی کے بغیر اس کا مال لینا جائز نہیں ـــ اور ٹیکس کی کیسی بھی وکالت کی جائے مگر یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ یہ جبراً اور قہراً وصول یابی ہے۔

۳۔ احادیث میں "مکس" کی مذمت | مکس کے لفظی معنی ٹیکس، محصول، چنگی کے ہیں۔ متعدد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکس لینے سے منع فرمایا اور لینے والوں کو دوزخ کی اور جنت سے محرومی کی وعید سنائی ہے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زناکاری سے بھی بڑھ کر گناہ ہے۔ شارح حدیث طیبیؒ اور علامہ ذہبیؒ سے اس کو "کبائر" میں شمار کرنا منقول ہے۔ مناویؒ اسے رہزنی سے مشابہ قرار دیتے ہیں (فیض القدیر ج ۶ ص ۴۴۹)

ان دلائل یا شبہات کا رد

۱۔ پہلی دلیل کہ مالِ مسلم میں زکوٰۃ کے علاوہ کوئی اور حق نہیں ہے، اس کی حقیقت ہم بہت تفصیل سے پچھلے باب میں بتا چکے ہیں جو اسی مسئلے پر قلمبند کیا گیا ہے[۱]۔ وہاں ہم نے نہایت روشن دلائل سے ثابت کیا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ ایک نہیں کئی ایک حقوق اسلامی شریعت میں مالِ مسلم پر مانے گئے ہیں ـــ اور بظاہر اختلافی مسئلہ ہونے کے باوجود حقیقت میں یہ ایک اجماعی مسئلہ ہے۔

۲۔ دوسری دلیل۔ بلکہ محض ایک اشکال و شبہ کہ ٹیکس احترامِ ملکیت کے خلاف ہے، یہ بھی بالکل سطحی بات ہے۔ کیونکہ احترامِ ملکیت کے بنیادی اصول میں اور کسی اور واجبی حق کے تحت مال کے مطالبے میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ احترامِ ملکیت کا اصول وہاں روک لگاتا ہے جہاں کوئی ناواجب مطالبہ ہو ورنہ جب یہ مسلّم ہے کہ مال کی حقیقی ملکیت اللہ کے لیے ہے۔ انسان صرف اس کا نائب اور امین ہے تو جو مطالبے زکوٰۃ کے علاوہ بھی اس کے دین کی تعلیمات سے نکلیں ان کا پورا کرنا بھی مال میں سے انسان کی زکوٰۃ جیسی ہی ذمہ داری ہے۔ اور ان مطالبات کی تعمیل کرانا حکومت کے ذمہ رکھا گیا ہے تو پھر یہ حکومت کی منجانب اللہ ذمہ داری ہے کہ ان مطالبات کے سلسلے میں مال حاصل کرے۔

[۱] کتاب کا یہ باب ترجمہ میں نہیں آیا ہے (مترجم)

۳۔ تیسری دلیل ان لوگوں کی، وہ احادیث ہیں جن میں "مکس" کی ممانعت کی گئی ہے، لیکن ان میں سے اکثر کی تو صحت ثابت نہیں ہے۱؎ اور جن کی ثابت ہے، ان کے بارے میں بحث طلب یہ بات ہے کہ کیا یہ ہر قسم کے ٹیکس کی ممانعت پر 'نص' ہیں؟ ہمارا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ مکس کا لفظ لغت اور شریعت دونوں کے استعمالات میں کوئی ایسا متعین مفہوم نہیں رکھتا جس سے اس ممانعت کا حکم لگایا جا سکے۔ قدرے تفصیل ملاحظہ ہو۔

لسان العرب میں ہے کہ 'مکس' ان درہموں کو کہا جاتا تھا جو زمانۂ جاہلیت کے بازاروں میں سوداگروں سے وصول کیے جاتے تھے (جسے ہماری زبان میں تہ بازاری کہتے ہیں۔ مترجم) ..... ابن الاعرابی نے کہا ہے ــــ لسان العرب ہی کی عبارت چل رہی ہے ــــ کہ "مکس" وہ درہم (وہ رقم) ہے جو محصلِ زکوٰۃ زکوٰۃ کے علاوہ وصول کر لیتا تھا۔ ابن الاعرابی نے اس موقع پر یہ حدیث بھی درج کی ہے کہ "مکس وصول کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔" اسی لسان العرب میں ہے کہ "مکس" کے معنی کمی اور سودے میں قیمت گھٹ جانے کے ہیں".... الخ

امام بیہقی کا قول ہے کہ مکس کمی کو کہتے ہیں، عامل زکوٰۃ جب اہل زکوٰۃ کے حق میں کمی کرے تو وہ صاحب 'مکس' ہے۲؎ جس کے بارے میں وعید آئی ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ احادیث میں "صاحب مکس" کے بارے میں جو وعید آئی ہے اس کا تعلق اس عامل زکوٰۃ سے ہے جو اہل مال سے کچھ زیادہ وصول کرتا ہے یا اہل زکوٰۃ کے حق میں سے مار لیتا ہے۔ اور اس کی دلیل بعض راویوں کی لفظ عاشر ــ جو "صاحب مکس" کے مترادف کے طور پر حدیث میں آتا ہے، کی یہ تفسیر ہے کہ یہ وہ شخص ہے جو تحصیلِ زکوٰۃ میں بدعنوانی کرے، ابوداؤد کا اس حدیث کو "باب فی السعایۃ علی الصدقۃ" میں لانا بھی اسی کی دلیل ہے۔

اسی طرح لفظ مکس کا ایک محمل یہ بھی ہو سکتا ہے اور وہی زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس سے مراد وہ ظالمانہ ٹیکس ہیں جو ظہور اسلام کے وقت ساری دنیا میں رائج تھے، کہ بلا حق وجواز لیے جاتے تھے اور اسی طرح

۱؎ مصنف نے یہ حدیثیں اس تیسری دلیل کے بیان میں درج کی ہیں اور حاشیہ میں ان کی صحت اور درجہ استناد سے بحث کی ہے ہم نے کچھ خاص ضرورت نہ سمجھتے ہوئے اس حصے کو ترجمے میں حذف کر دیا ہے (مترجم)۔ ۲؎ فیض القدیر ج ۶ ص ۴۴۹۔

صرف کیے جاتے تھے، بجائے رعایا کی فلاح وبہبود کے ان کا محرک حاکموں کی فضول خرچی اور عیش پرستی ہوتی تھی۔ ہمارے بعض علماء نے یہی مفہوم لیا بھی ہے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب البحر الرائق میں بعض کتب حنفیہ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ "احادیث و آثار میں ٹیکس لینے والوں کی جو مذمت آئی ہے اس کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جو جماعت کے لیے نہیں بلکہ اپنے ذاتی فائدے کے لیے ٹیکس وصول کریں۔ درمختار میں بھی یہی تشریح کی گئی ہے۔ (ج ۲ ص ۲۴۴)

عادلانہ ٹیکس اور مذاہب اربعہ

اب آئیے ذرا یہ بھی دیکھ لیں کہ مذاہب اربعہ کے حلقوں میں اس مسئلے پر کیا رائے پائی جاتی ہے؟ اس جائزے سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ فقہ اسلامی کے لیے ٹیکس کوئی نامعروف شئی نہیں ہے۔ اس فقہ میں ہمیں عادلانہ اور غیر عادلانہ ٹیکس کی تقسیم ملتی ہے۔ اس تقسیم پر احکام مرتب ہوئے ہیں اور ان احکام میں عادلانہ ٹیکس پر جواز کا حکم لگانے والے فقہاء کی ایک جماعت، چاروں مذاہب سے تعلق رکھنے والی موجود ہے ـــــ یہ اور بات ہے کہ ٹیکس (ضرائب) کا لفظ ان فقہاء کی گفتگو میں نہیں پایا جاتا۔ بلکہ فقہاء مالکیہ کے یہاں اس کی تعبیر وظائف اور خراج سے ملتی ہے۔ حنفیہ میں بعض لوگ اسے "نوائب" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حنابلہ نے اسے "الکلف السلطانیہ" کا نام دیا ہے۔

فقہ حنفی

فقہائے حنفیہ میں متقدمین اور متأخرین دونوں کے یہاں ٹیکس کے مسائل ملتے ہیں اور عادلانہ ٹیکسوں پر مہر تصدیق ثبت کی گئی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن عابدین (شامی) کا ارشاد ہے کہ

> ٹیکسوں میں کچھ جائز ٹیکس بھی ہیں۔ مثلاً پبلک نہر۔ جو حکومت نے تیار کرائی ہو، اس سے آبپاشی پر آبیانہ۔ محلے کے چوکیدار کی تنخواہ یا خزانہ خالی ہونے کی صورت میں لشکر کی تیاری کا ٹیکس، اپنے جنگی قیدیوں کے زرِ فدیہ کا ٹیکس۔[1]

فقہ حنفی کی کتاب قنیہ میں امام ابو جعفر بلخی سے منقول ہے کہ

---

[1] ج ۲ ص ۲۴۹ [2] حاشیہ ردالمحتار ج ۲ ص ۵۰

سلطان اگر مفادِ عامہ کے لیے کوئی ٹیکس عائد کرے تو وہ لوگوں کے ذمہ دَین واجب ہے او
ہمارے مشائخ کا ارشاد ہے کہ رعایا کی مصلحت میں جو ٹیکس بھی سلطان کی طرف سے عاید کیا جائے اُس کا حکم
یہی ہے۔ حتیٰ کہ راستوں کی حفاظت کے لیے چوکی پہرے کا ٹیکس بھی اس حکم میں ہے لیکن یہ بات عام
کرنے کی نہیں ہے کہ مبادا حکومت کے کسی ظالمانہ رجحان کو بھی اس سے شہ ملے۔"

اس کے بعد ابو جعفر بلخی فرماتے ہیں کہ

"مذکورہ بالا بنیاد پر یہ ٹیکس جو سلطان خوارزم نے دریائے جیحون کا پشتہ درست کرنے کے مصارف
کے لیے یا شہر پناہ کی درستی کے لیے 'یعنی عوامی بہبود کی خاطر' لگا رکھے ہیں۔ یہ بالکل جائز ہیں اور ایسا
واجب الادا دَین ہیں جس سے بچنے کی کوشش جائز نہیں۔ لیکن یہ بات صرف اس لیے بتائی جا رہی ہے
کہ علماء اس معاملے میں سلطان پر نکتہ چینی نہ کریں، نہ اس لیے کہ اس کی تشہیر اور عام اعلان کیا جائے۔
کیونکہ اس سے خدانخواستہ سلطان کو غلط روی کا بھی حوصلہ مل سکتا ہے۔"[1]

دیگر مذاہب

فقہ حنفی کی اس تصریح سے ٹیکس کے معاملے میں ہمارے موقف کی جیسی کھلی تائید ہوتی ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔
اب باقی تین مذاہب کے فقہاء کو دیکھیے ــــــ مالکیہ میں سے شیخ مالکی کا ارشاد ہے کہ

"مسلمانوں پر عادلانہ ٹیکس لگائے جانے کا تعلق مصالح مرسلہ سے ہے اور اس بنا پر ہمارے
مذہب میں اس کا جواز بالکل صاف ہے۔"[2]

شوافع میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام ہم پچھلے صفحات میں نقل کر چکے ہیں جو جواز ہی کے حق
میں ہے۔

حنابلہ میں اس مسئلے پر ہمیں کوئی صریح کلام نہیں ملتا۔ البتہ امام ابن تیمیہؒ نے ظالمانہ ٹیکسوں
کی ادائیگی کے سلسلے میں جو ایک فقہی بحث "المظالم المشترکہ" کے عنوان سے کی ہے[3] اس سے ضمناً یہی
مستفاد ہوتا ہے کہ کچھ ٹیکس جائز بھی ہوتے ہیں۔

بہرحال ٹیکس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ زکوٰۃ کے علاوہ ایک فرد
مسلم پر کوئی اور مالی ذمہ داری سوسائٹی کے لیے عائد نہیں ہوتی۔

---

[1] رد المحتار ج ۲ ص ۵۹ [2] تہذیب الفروق والقواعد السنیہ۔ للشیخ محمد علی بن الشیخ حسین مفتی المالکیہ
[3] یہ بحث اسی نام سے ایک مستقل رسالہ کی شکل میں طبع ہو گئی ہے۔

نئی مطبوعات

دُنیا اسلام سے پہلے / اسلام کے بعد از مولانا عبد السلام قدوائی ندوی
صفحات۔ ۱۲۸۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ عمدہ۔ قیمت ۲/۷۵
ناشر:۔ مکتبہ جامعہ لیمٹیڈ۔ نئی دہلی۔

یہ مولانائے محترم کے چند گرانقدر مقالات کا مجموعہ ہے۔ دُنیا ڈیڑھ ہزار سال پہلے ــ مُصلحِ اعظم ــ بنیادی عقیدہ ــ انسانیت کی فصلِ بہار ــ ان مقالوں کے عنوانات ہیں۔ ان میں سے خود الفرقان میں شائع ہوئے ہیں۔ باقی ایک دوسری جگہ۔ پہلے مقالے میں دنیا کی مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور سماجی حالت کا وہ نقشہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے (یعنی اب سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے) پایا جاتا تھا۔ اس مقالے کو ہم حاصل کتاب کہہ سکتے ہیں۔ علمی اندازِ نظر اور اندازِ بیان کا ایک یادگار نمونہ اور دھیمے قلم کی ہمہ کاری کا ایک نقشِ جمیل! دوسرے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن تعلیمات کا نچوڑ ہے جن سے آپ نے اس جاں بلب دُنیا کی مسیحائی کی۔ تیسرا اسلام کے عقیدۂ توحید کی استدلالی تشریح ہے اور چوتھے میں آنحضرت کی سیرت پاک اور حالات کا ایک سرسرا خاکہ ہے۔

دل میں آتا ہے کہ چوتھے نمبر پر اگر مولانا نے وہ نیا نقشہ کھینچ دیا ہوتا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد سے دُنیا میں قائم ہوا تو کتاب بالکل مکمل ہو جاتی ہے۔ فصلِ بہار کا عنوان بھی اسی مضمون کے لیے موزوں تر تھا، بلکہ تبصرہ نگار کو عنوان دیکھ کر لگا بھی یہ کہ اس کے ماتحت مضمون یہ ہوگا۔ کیونکہ کتاب کے نام سے بھی اسی کی توقع ہوتی ہے۔ ــــ لیکن مولانا اپنے

متفرق مقالات کو مرتب فرما رہے تھے۔ کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھ رہے تھے۔ بہرحال بہت قیمتی مجموعہ ہے اور قیمت واجبی سے بھی کم۔

کتاب و سنت کے جواہر پارے مولانا جمال الدین اعظمی استاد اسلامیات جامعہ ملیہ اسلامیہ صفحات ۱۱۲۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت ۲/۲۵

ناشر:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ثانوی درجات کے نصاب میں اسلامی تعلیمات کی ایک کتاب "قرآن و حدیث کے اقتباسات پر مشتمل" پڑھائی جاتی ہے۔ زیر نظر کتاب اسی کا اردو ترجمہ ہے۔ دو حصوں میں منقسم ہے۔ ہر حصے میں پہلے "دروس القرآن" کے عنوان سے منتخب آیات قرآنی کا ترجمہ پھر اسی طرح "دروس الحدیث"

انتخاب بہت اچھا ہے۔ مگر بلا تشریح و تفہیم اس کا اردو ترجمہ کس حد تک مفید رہے گا؟ یہ ایک قابل غور بات ہے۔ خاص طور پر آیات قرآنی کے سلسلے میں! کیونکہ ایسی آیتیں انہیں بہت سی آئی ہیں، جن کی تشریح و تفہیم محض ایک اردو داں کے بس کی نہیں، عربی کا اچھا فاضل اور عالم قرآن ہی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

اسلام ایک مکمل دین مستقل تہذیب
۲۔ ایک بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل میں اسلام کیا حصہ لے سکتا ہے
۳۔ لسانی اور تہذیب جاہلیت کا المیہ اور اس کے سبق

مصنف:۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
ناشر:۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

"اسلام ایک مکمل دین ....." سائز ۲۰×۳۰/۱۶۔ ۳۰ صفحات۔ عمدہ کتابت و طباعت قیمت ۵۰ پیسے

اس رسالے میں مولانا کی تین مختلف اور کافی پرانی تقریروں کو ایک مضمون کی شکل میں مرتب کر دیا گیا ہے۔ ملت ابراہیمی پر استقامت اس کی جوہری دعوت ہے۔ ملت ابراہیمی جن عناصر سے مرکب ہے، اس کی جو روح ہے اور جس لیے یہ سینے سے لگائے رکھنے کے قابل ہے، یہ سب باتیں مولانا کے خاص خطابی انداز سے اس میں آگئی ہے۔

"بہتر ہندوستانی سماج ..." یہ بھی مولانا کی ایک تقریر ہے جو اپریل ۷۲ء کے ایک چیدہ اجتماع میں کی گئی تھی۔ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی اس اجتماع کی صدارت فرما رہے تھے۔ ارکان دار المصنفین اعظم گڑھ کی پوری بزم شریک سماعت تھی۔ بمبئی کے مسلم اہل علم و دانش کے علاوہ غیر مسلم اہل ذوق کی بھی ایک تعداد اس جلسے میں تھی۔

قوموں کی زندگی میں سماج اور سوسائٹی کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا نے موجودہ ہندوستانی سماج کے بعض خراب اور خطرناک پہلوؤں کو لیا ہے کہ ان سے کس کس نوعیت کے خطرات ملک اور قوم کو لاحق ہیں ___ بجائے ایک مجموعی جائزے کے ایک ایک پہلو کو مولانا لیتے گئے اور اس کی اصلاح میں اسلام کی جو تعلیمات مددگار ہو سکتی ہیں ان کی نشاندہی ایک مؤمن تانت کے انداز میں فرماتے گئے ہیں۔

مولانا کی یہ گفتگو موضوع کے صرف علمی رُخ اور کمزوریوں کے محض جائزے اور اسلام میں اُن کی چارہ گری کی صلاحیت کے اظہار تک محدود نہیں رہی ہے، بلکہ وہ ہمیشہ کی طرح یہاں بھی داعی ہیں۔ مسلمانوں کو اس بات کے کہ وہ اسلام کی اس صلاحیت کا فائدہ ملک کو پہونچانے کی جدوجہد کریں ___ اور غیر مسلموں کو اس بات کے کہ وہ اسلام سے فائدہ اٹھانے میں کسی شرم اور تعصب کو راہ نہ دیں۔

مولانا کا ممتاز مقام علم و نظر، ان کی داعیانہ اور مصلحانہ زندگی کا طویل تجربہ اور ذوقِ دعوت کی خود اپنی خطری روشنی، ان سہ گونہ روشنیوں کے ساتھ مولانا کا اندازِ دعوت ہی صحیح تر اور مستند ہونا ہی ہے! اور پھر یہ مولانا کی داعیانہ زندگی ہی ہے جس نے مبصرہ نگار کو ان کی ذات گرامی کا عقیدتمند بھی آغازِ شعور ہی سے بنا رکھا ہے ___ مگر ایک طالبعلمانہ ذوق کو، بزرگوں کی بارگاہ میں لب کشائی کی جسارت، ہمیشہ معاف رہی ہے۔ اور تبصرہ کی فرمائش تو گویا اس جسارت کے لیے اذن و اجازت ہے۔ تبصرے کی دیانت بھی یہی چاہتی ہے اس لیے یہ عرض کرنا ہے کہ

ہندوستانی سماج ___ یا کسی بھی سماج ___ کی خرابیاں دور کرنے میں اسلام کی صلاحیت پر تو کسی شک کا سوال ہی نہیں۔ کم از کم ہم جیسوں کے لیے نہیں، مگر اس صلاحیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے جس طور پر غیر مسلم مفکروں اور رہنماؤں کو اس تقریر میں دعوت دی گئی ہے اور جس طور پر مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اس سماج کی اصلاح کے لیے کمربستہ ہوں۔ ہماری ناقص نظر

میں ان دونوں ہی دعوتوں کا انداز اُس مزاجِ دعوت اور حکمتِ دعوت سے میل نہیں کھاتا جس کی رعایت ایک داعی اور مصلح کے لیے لازم ہونا ہم نے مولانا ہی کے قدموں میں بیٹھ کر جانا ہے۔

آج کے ہندوستانی غیر مسلموں (یعنی ہندوؤں) کی نفسیات اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو کچھ ہیں، وہ ان دونوں کے ساتھ اُن کے طرزِ عمل سے بالکل ہی ظاہر ہیں، اس فرق کے ساتھ اسلام کے ساتھ اُن کے معاملے کا جو انداز ہے، وہ زیادہ تر اور عام طور پر مسلمانوں سے کد کے نتیجہ میں ہے۔ اس کے لیے اُن کے دل کھل سکتے ہیں۔ مگر جب تک اس کے لیے کھل نہ جائیں، مسلمانوں کے لیے کوئی کلمۂ خیر، اُن کے تفوق کی کوئی بات، اُن سے استفادے کی کسی معاملے میں نصیحت، اس وقت کے ہندو ذہن کے لیے قابلِ غور کیا، قابلِ برداشت بھی نہیں ہے۔ کسی شائستہ اور تعلیم یافتہ آدمی کا کسی شائستہ ماحول میں خاموشی کے ساتھ سُن لینا، بلکہ کچھ اچھے تأثر کا اظہار بھی کر دینا، عام طور پر محض ایک رسمِ تہذیب و اخلاق کی بات ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

یہ مطالعہ اگر صحیح ہے تو پھر مولانا کی، غیر مسلموں کو اسلام سے استفادے کی یہ دعوت جس میں مختلف طریقوں سے مسلمانوں کے (ہندوستانی مسلمانوں کے) سماجی تفوق کا اظہار بھی ہوا ہے، اُن سے استفادے اور اُنھیں نمونۂ عمل بنانے کی دعوت بھی ہے، کیونکر اُنھیں لبیک کہنے پر آمادہ کر سکتی ہے؟

اور اس سے بھی زیادہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ہندوستانی سماج کی جن (تین) برائیوں اور بیماریوں کی نشاندہی، مولانا نے اس تقریر میں فرمائی ہے، اولاً تو ان میں سے ایک — دولت پرستی کے بہت تھوڑے سے اور ناقابلِ لحاظ استثناء کے ساتھ، سب وہ ہیں جن میں یہاں کے صرف غیر مسلم مبتلا ہیں! علاوہ ازیں، ان تین میں سے پوری ڈیڑھ برائی وہ ہے جس سے ابھی تک ان غیر مسلموں کو کوئی نقصان نہیں بلکہ یہ صرف یہاں کے مسلمانوں کے لیے مصیبت بنی ہوئی ہے۔ یعنی انسانی جان کی بے قیمتی اور قتل و غارت کی گرم بازاری — پوری کی پوری — اور لسانی و تہذیبی تنگ نظری اور علاقائی عصبیت میں سے نصف! پھر ایک تیسری بات یہ کہ تقریر میں اولیت بھی اسی ڈیڑھ کو ملی ہے!

موجودہ ہندوستانی سماج کی برائیوں اور بیماریوں میں جو چیز سب سے زیادہ افراد کو اپنی

گرفت میں لیے ہوئے ہے، ہر وقت اور ہر قدم پر نظر آنے والی شدت سے ترقی پذیر اور کسی قوم کے لیے سب سے بڑھ کر سم قاتل بھی اور اسلامی نقطۂ نظر سے بھی جس سے زیادہ بڑی کوئی دوسری سماجی برائی شاید نہیں قرار دی جا سکتی، وہ بے حیائی، عریانی، فحاشی اور جنسی زدگی ہے۔ مولانا کی اس تقریر میں اس کا کوئی ذکر کہیں بھی نہیں ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سی قابل ذکر سماجی برائیاں بیان پائی جاتی ہیں جن کا کوئی ذکر نہیں آیا! جبکہ جن برائیوں کا ذکر آیا ہے اُن کی نوعیت وہ ہے جو اوپر ہم نے ظاہر کی! اور اسی کے ساتھ اس بات کا ترشح بھی ہونے سے نہیں رہا ہے کہ مولانا کے ذہن میں مسلمانوں کا مسئلہ بھی اس تقریر کے دوران کسی نہ کسی درجہ میں موجود ہے۔ — تو کیا ایسی شکل میں ایک ہندو ذہن کا یہ سوچنا کچھ بعید ہو گا کہ ہندوستانی سماج کی اصلاح اور خیر خواہی کی بات محض ایک خوبصورت عنوان ہے ورنہ اصل جو فکر مولانا پر طاری ہے وہ اپنے مذہبوں کو جان و مال اور تہذیب و زبان کا تحفظ دلوانے کی ہے۔ اور لگے ہاتھوں غیروں کو خود ان کی نظر میں ذلیل اور کمتر و کم مایہ کر دینے کی کوشش کا کوئی موقع بھی مولانا نے نکل کے جانے نہ دیا ہے!

اس طرح کی بدگمانی کا موقع دیدینے پر ایک طرف تو مسلمان کو کچھ برتر اور قابل استفادہ دکھانے کی بات اور زیادہ آتشیں بن جاتی ہے اور اُس کا جو اثر از خود ہی ہونا تھا — یعنی دعوت و نصیحت کی بے اثری — اس میں اور شدت پیدا ہو جانی قطعی ہے۔ دوسری طرف جو اس سے زیادہ تشویش کی بات ہے۔ اور اسی کی طرف یہاں توجہ دلانی ہے وہ یہ ہے کہ ایسی بدگمانی کا موقع اگر مولانا جیسی قد آور و معتبر اسلامی شخصیت کے بارے میں بھی ہمارے ہم وطنوں کو ملنے لگا تو یہاں اسلامی دعوت یا اسلامی رنگ کی اصلاحی جدوجہد کا مستقبل کیا ہو گا؟ کس آدمی کا اعتبار پڑھے لکھے غیر مسلموں کو آئے گا؟ اور کس دعوتِ اسلام کو اس شبہے کے بغیر دیکھا جائے گا؟ کہ مسلم فرقے کے لیے بہتر حالات پیدا کرنا اس کا مقصود ہے۔

(۲) مسلمانوں کو دی گئی دعوتِ جدوجہد کے سلسلے میں بھی ہمارا یہ عرض کرنا کہ حکمت دعوت اور مزاج دعوت کے اعتبار سے یہاں بھی کچھ اشکال ہوتا ہے۔ تو اُس کی بنیاد بھی ہندوستان کی سماجی برائیوں کا یہ انتخاب ہی ہے کہ ایک "دولت پرستی" کی برائی تو ضرور ایسی ہے جس میں مسلمانوں کی شرکت بھی بتائی جا سکتی ہے — اگرچہ مجموعی تصویر میں اس شرکت کی دریافت بلا خورد بین

کے نہ ہو سکتی ہو! — باقی دو برائیاں جو اس سے پہلے آتی ہیں ان میں اولاً تو مسلمان کی شرکت کا کہیں وجود نہیں۔ ثانیاً، ایک آدھی کو چھوڑ کر باقی ڈیڑھ وہ ہے جس سے مسلمانوں کی زندگی تلخ ہو رہی ہے! ایسی برائیوں کے خلاف، ان مسلمانوں کو اصلاحی جدوجہد کی دعوت، ایک تو یونہی انھیں ایک مقدس نام سے خود غرضانہ جدوجہد کی پستی میں گرا دینے کا پورا خطرہ اپنے اندر رکھتی ہے۔ مزید برآں ان کے نفس کی فربہی کا جو سامان، اُن کے تزکیہ اور قابل استفادہ ہونے کی مسلسل شہادت سے اس تقریر میں فراہم ہو گیا ہے، وہ جس قدر بھی انھیں داعیانہ و مصلحانہ مزاج، انداز اور جذبہ و اطوار سے دور نہ کرے کم ہی ہے!

کم از کم ایسی چند برائیوں ہی کا ذکر بھی مولانا نے فرما دیا ہوتا جن میں ہندوستانی سماج کی مسلم اکائی بھی مبتلا ہے، تو کچھ تو تدارک، مسلموں اور غیر مسلموں سے متعلق، اُن دونوں ہی خطروں کا ہو جاتا جن کا موجودہ شکل میں پیش آنا ہماری نظر میں تو بدیہی ہے — ویسے ہم کیا اور ہماری نظر کیا؟

لسانی اور تہذیبی جاہلیت ... "صفحات ۳۲. سائز ۲۰×۳۰/۱۶ . قیمت ۵۰/- پیسے

یہ بھی مولانا علی میاں مدظلہٗ کی ایک تقریر ہے جو مئی ۷۱ء میں مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کلکتہ کے ایک جلسے میں کی گئی تھی۔ البتہ یہ تقریر بعینہٖ شکل میں نہیں ہے بلکہ اس کے ٹیپ ریکارڈ کو سامنے رکھ کر از سرِ نو ایک مضمون مع کچھ اضافے کے مرتب کیا گیا ہے۔

زبان اور تہذیب کے مسائل قوموں کی زندگی میں آج جو رول ادا کر رہے ہیں، مولانا نے اسے جاہلیت کا رول قرار دیا ہے اور مسلمان قوموں کے بھی اس فتنے میں مبتلا ہو جانے کے پیش نظر دل کے پورے درد اور زبان کی پوری طاقت کے ساتھ انھیں سمجھایا ہے کہ یہ اسلام اور اسلامی مزاج کی بالکل ضد ہے۔ مولانا نے نام تو نہیں لیا لیکن اشارے پہ اشارے بہت آئے ہیں کہ خاص طور پر مشرقی اور مغربی پاکستان کی وہ کشمکش سامنے ہے جو بہت ہی المناک انداز میں ان دونوں کا رشتہ ٹوٹنے پر ختم ہوئی۔

اصولی حد تک مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے اُس سے کسی بھی مومن کا اختلاف مشکل ہے اور طرز تو ایسا ایمان پرور، ایسا کفر شکن، ایسا نظر افروز، ایسا بصر آفریں، ایسا بے پناہ اور "از دل خیزد بر دل ریزد" کا ایسا نمونہ ہے کہ بے اختیار اس زبان و قلم کے بوسے لینے کو جی چاہتا ہے!

ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"مسلمان کو اسلام کے خلاف کرنے اور دشمنوں کا آلۂ کار بننے سے ایسی وحشت ہونی چاہیے کہ اگر خواب میں بھی کوئی ایسا واقعہ دیکھے تو اس کے منہ سے چیخ نکل جائے .... جاہلیت سے صرف جذباتی نفرت ہی کافی نہیں۔ مسلمان کے لیے جاہلیت کی صحیح معرفت ضروری ہے، وہ کبھی اس کے بارے میں دھوکہ نہ کھائے۔ اگر جاہلیت غلاف کعبہ اوڑھ کر، اور قرآن مجید ہاتھ میں لے کر آئے جب بھی وہ لاحول پڑھے اور اس سے پناہ مانگے۔" (ص ۱۸)

ایک دوسری جگہ زبان کے معاملے میں قرآنی نقطۂ نظر ــ بلکہ صحیح انسانی اور عقلی نقطۂ نظر بھی ــ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"زبان اس لیے ہے کہ وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑے .... محبت کے پھول برسائے، بیگانوں کو یگانہ، دور کو نزدیک اور دشمن کو دوست بنائے۔ اس کا کام نفرت پیدا کرنا، انگارے برسانا، بھائی کو بھائی سے جدا کرنا، نفرت کا زہر پھیلانا نہیں۔ اگر زبان سے یہی کام لیا جانے لگے تو اس سے گونگے اور بے زبان ہونا ہزار درجہ بہتر ہے ...." (ص ۲۳)

غرض مسئلے کا اصولی بیان بہزار جان خریدنے کا ہے۔ مگر لسانی اور تہذیبی جاہلیت کا یہ کردار جس کی تصویر اس بیان میں کھینچی گئی ہے، اس کا مشرقی پاکستان (بنگلا دیش) کے لوگوں پر ایسا واقعاتی انطباق، جیسا مولانا نے (ایک مسلّم حقیقت کے سے انداز میں) اپنے اشاروں کی زبان سے کیا ہے، بہت کچھ گفتگو کی گنجائش رکھتا ہے اور یہ کہ اگر یہ بنگلا دیش والے بھی مسلمان ہو سکتے ہیں، کشتۂ جاہلیت سہی! اور ان کی اصلاح بھی مولانا کا مدعا ہو سکتی ہے؟ تو ان کو اتنی شکایت تو مولانا سے ہو ہی سکتی ہے کہ مغربی پاکستان کے تصور پر ایک نام کی نگاہ بھی نہیں ڈالی گئی، بلکہ ان کی برادرکُشی بھی جیسے کہ سب ان (بنگالی والوں) ہی کے حساب میں ڈال دی گئی۔

بنگلا دیش کے مسلمان اپنی لسانی حساسیت کے ضرور گنہگار ہیں ــ اور ہم میں سے کہاں کے ہیں کسی بات کے گنہگار نہیں؟ ــ مگر اسکے معاملے میں ہندوستان کے مسلمانوں، بلکہ کل عالم اسلام ہی کے مسلمانوں نے جیسی یکطرفہ ڈگری کی روش اختیار کی ہو ــ اس کا بھی ایک سبب جو نہ ہو یہی ہو کہ ادھر کی جاہلیت نے کوئی لبادہ نہیں اوڑھا جبکہ دوسری طرف کی یہی چیز غلاف کعبہ میں ملبوس اور ہاتھ میں "قرآن" لیے تھی۔ فالی اللہ المشتکیٰ!

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Kutchery Road, Lucknow U.P.

VOL. 41 NO. 2 APRIL, 73 Phone No. 25547

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow-1

مرتبہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مولانا محمد منظور نعمانی کی ایمان افروز
اصلاحی و تبلیغی تقاریر کا مجموعہ

مرتبہ
محمد حسان نعمانی

Rs. 5

کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
بنگلادیش سے ۸/-
ضخامت ۶۵ صفحات
قیمت
فی کاپی ۵۰ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۴۱ | بابت ماہ ربیع الاول ۱۳۹۳ھ مطابق مئی ۱۹۷۳ء | شمارہ ۳

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع، ۲۰ تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی۔ پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

پچھلے مہینے ان صفحات میں ہم نے مسلمانوں کے معاملات میں مسز اندرا گاندھی اور ان کی پارٹی کے تکلیف دہ طرزِ عمل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا، کہ مسلمانوں کو حق ہے کہ اگر کوئی موقع حساب برابر کرنے کا اُن کے سامنے آئے تو اسے ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ البتہ اس کام کے لیے ہاتھ وہ بڑھنے چاہئیں جو بہت دور تک کی دیکھکر بڑھیں، نہ کہ وہ کہ جنھیں ایک ہاتھ آگے کا بھی نظر نہیں آتا اور اپنی ضرب کا شکار خود آپ ہی ہو رہتے ہیں۔

یہ بات "حق" کے لحاظ سے تھی، جس کے بارے میں ہم نے لکھا تھا کہ "اس کے جواز کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا"۔ لیکن کیا مسلمانوں کی اور ان کے مسائل کی مصلحت بھی اس میں ہے کہ حساب چکانے اور انتقام لینے کے عنوان یا انداز سے اس موقع کو استعمال کیا جائے؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں اور بالکل نہیں! جو لوگ آج مسلم قیادت اور مسلم رہنما کہلاتے ہیں، معاملات کو سمجھنے سے وہ سب کے سب تو اتنے دور یقیناً نہیں ہو سکتے کہ اس عنوان اور انداز کی خرابی نہ سمجھ سکیں اور کہیں کہ اس میں کیا مضائقہ ہے؟ لیکن صرف ایک اُن لوگوں کے زیادہ ذمہ دار طبقے کو چھوڑ کر جو "اسلامی دعوت" کے ساتھ "مسلم قیادت" کا منصب سنبھالنے کی بھی فکر میں لگ گئے ہیں، اس "مسلم قیادت" کا کوئی ایک فرد بھی ایسا نظر نہیں آتا جو عملاً اس عنوان یا انداز سے ہٹکر چل رہا ہو۔

یہی مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ جس کا خاص طور پر ذکر مسز گاندھی کے طرزِ عمل کی گفتگو میں آیا تھا اور جو اس وقت مسلم مسائل میں سب سے بڑھ کر اور وقت کا تقریباً واحد مسئلہ بنا ہوا ہے، اس میں جو طرزِ عمل اس مسلم قیادت کا ہے اُسے دینے کے لیے کوئی نام انتقامی ہیجان اور حساب چکانے کے جنون کے

سو نہیں ملتا! اس کی ایک گزری ہوئی قریبی مثال "بہاری مسلمانوں" کے مسئلہ پر بہار اسمبلی کے سال گزشتہ کے الیکشن میں، اس قیادت کا وہ رویہ تھا جس کا ذکر گزشتہ ماہ کی صحبت میں بھی آچکا ہے، کہ مسز گاندھی کی پارٹی کو ہرانے کا نعرہ بلند کیا گیا اور جو کچھ بھی بن پڑا اس قیادت کا بہاری عنصر اس معاملے میں کر گزرا ___ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف تو بنگلہ دیش کے ان "بہاری مسلمانوں" کے مسئلے میں حکومت کے رویہ کو نرم کرنے کا کوئی امکان اگر ہو سکتا تھا تو وہ قطعی طور پر ختم ہو گیا، دوسری طرف مسلم یونیورسٹی کا جو سوال بھی گرماگرمی کے عالم میں حکومت کے سامنے آیا تو اسمیں بھی ترمیمی ایکٹ کی وہ گرہ اسی گرماگرمی کی بدولت پڑی جس نے ہوش اڑا دیے، اور ہر آنے والے دن میں سخت سے سخت اور موٹی ہی یہ گرہ ہوتی جا رہی ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ زہر کے نتائج کا علاج کرنے کے لیے اسی زہر کو لوٹ لوٹ کر پینے اور پلانے کا یہ چکر کہاں ختم ہوگا! ایک بار پھر نعرہ بلند ہوا ہے کہ الیکشن آئے تو کانگریس کو ہرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دو۔ اس زور لگانے کی ٹیکنک بھی وہی ہے جو گزشتہ سال بہار میں اور چھ سال قبل قریب قریب سارے ہندوستان میں آزمائی جا چکی ہے ___ اور مسلمانوں کی محدود عددی قوت کے باعث اس کے سوا کوئی اور ٹیکنک ہو بھی نہیں سکتی ___ کہ دوسری مخالف پارٹیوں کی گاڑی کے قلی بنو۔

جہاں تک گزشتہ سال کے تجربے کا تعلق ہے، اس کی عقل دشمن جذباتیت کو تو کسی شرح و بیان کی اس لیے حاجت نہیں کہ اولاً جن مخالف پارٹیوں کو کانگریس کے مقابلے میں جتانے کا بیڑا اٹھایا گیا تھا ان میں سے بمشکل ہی کوئی ایسی ہوگی جو الیکشن کا اعلان ہونے سے قبل "بہاری مسلمانوں" کے ساتھ سنگدلی یا سرد مہری کا مظاہرہ نہ کر چکی ہو۔ دوسرے یہ بات تصور کے قابل بھی نہیں تھی کہ وہ عام ہندو ووٹر جو کسی پارٹی سے مضبوط وابستگی نہیں رکھتا وہ ان پارٹیوں کے حق میں اپنا ووٹ دے گا جو سابق پاکستانی مسلمانوں کی حمایت کا جھنڈا اٹھا کر کانگریس سے لڑ رہی ہوں۔ رہا یہ سوال کہ شاید کانگریس پر دباؤ ڈال کر اپنی بات منوانے کے لیے یہ پالیسی اختیار کی گئی ہو، تو اس سے بھی یہ پالیسی کچھ مدبرانہ نہیں بن جاتی۔ کیونکہ اندرا گاندھی جب ۶۷ء میں انتہائی کمزور اور ناموافق حالات میں ہوتے ہوئے بھی "مسلم قیادت" کی ایسی دباؤ والی پالیسی کے آگے جھکنے پر آمادہ نہیں ہو سکیں، تو مارچ ۷۲ء کی انتہائی مضبوط پوزیشن میں بجز دیوانوں کے کون یہ خواب دیکھ سکتا تھا کہ وہ اس پالیسی کے آگے سرنگوں ہو جائیں گی؟ ___ البتہ اس تجربہ میں جرأت و ہمت کی داد ہم نے

پہلے بھی دی تھی، ورنہ وہ ہمیشہ قابلِ داد رہے گی۔

چھ سال قبل یعنی ۶۷ء کا تجربہ اس معنی میں ذرا مختلف تھا کہ اُس وقت کے حالات میں کانگریس کو ہرا دینے کا خواب دیکھا جا سکتا تھا، اُس کے خلاف عام بیزاری پورے ملک میں نظر آ رہی تھی۔ مگر ہرانے کا جو مقصد تھا کہ کام بن جائے اور مسلمانوں کے مسائل حل ہوں تو یہ بات ایک تو یوں بھی اُس انتخابی سیاست سے کسی طرح حاصل ہونے والی نہیں تھی جو مسلم مسائل پر مبنی ہو پھر جو ڈھنگ اس انتخابی سیاست کا اختیار کیا گیا اس میں تو بالکل عیاں تھا کہ ہمارے حصے میں صرف ہرا لینے کی خوشی آ سکتی ہے باقی جو کچھ ملے گا وہ اپوزیشن پارٹیوں کو ملے گا اور ہم اسی طرح اُن کے رحم و کرم پر رہیں گے جیسے کانگریس کے رہا کرتے تھے ـــ یہ وہی ڈھنگ تھا جسے گزشتہ سال بہار میں دہرایا گیا اور اب ایک بار پھر پورے ہندوستان میں اسے دہرانے کا کاروبار شروع ہو رہا ہے۔ یعنی جتنی بھی اپوزیشن پارٹیاں ہاں میں ہاں ملا دیں اُن میں سے جس کا چانس جس حلقۂ انتخاب میں زیادہ ہو یا کوئی دوسری وجہ ترجیح ہو، وہاں اسے سپورٹ کرنے کی خدمت انجام دی جائے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ بہار میں جو پارٹیاں "بہاری مسلمانوں" کی حمایت کے عہد پر الیکشن کے آخر تک قائم رہ گئی تھیں، جن سنگھ کی طرح بیچ ہی میں اس سے نکل نہیں بھاگی تھیں، اُن کا رویہ اب ان بدنصیب بہاری مسلمانوں کے سلسلے میں کیا ہے۔ لیکن ۶۷ء کے عہد و میثاق کا انجام ہمارے سامنے اور سب کے سامنے پوری طرح کھلا ہوا ہے کہ ٹھیک وہی ہوا جو الیکشنی قول و قرار کی اولاً اصل فطرت ہے، اور ایسے دو فریقوں کے معاملے میں تو اسے نوشتۂ تقدیر کہیے جن میں سے ایک کے پاس دوسرے کو پابند رکھنے کی کوئی طاقت نہ ہو کہ سب وعدے طاقِ نسیاں میں جا سجے، یاروں نے نگاہیں بدل لیں، طرزِ خطاب بھی کتنوں ہی کا بدل گیا۔ جو بہت شریف نکلے وہ عذرِ معذرت یا وعدۂ فردا پہ ٹالنے لگے۔ اور امیدیں خون رو کر ایسی ایسی بدمزگی میں بدل لیں کہ یہ سیاست مذاق کا ایک مضمون بن گئی۔

یہی کورچشم، سرتاپا جذباتی اور حرماں نصیب سیاست ہے جس سے علی گڑھ کی بگڑی کو اس بار بنانے کی کوشش مسلم قوم کے قائدوں نے شروع کر دی ہے۔ انھیں سمجھانے کی کوشش وقت کا ضیاع کرنا ہے۔ ۶۷ء کا تلخ تجربہ جنھیں نہیں سمجھا سکا انھیں کون سمجھا سکتا ہے؟ یہ اپنی کیفیت میں ہو بہو مرزا غالب کا مثنیٰ بن گئے ہیں کہ ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

دہلی کے حالیہ مسلم یونیورسٹی کنونشن (۹ و ۱۰ مارچ) کے بعد کی پریس کانفرنس میں ان میں کے ایک بہت نمایاں فرد سے ایک نمائندے نے کنونشن کی تجویز پر اس مضمون کا سوال کیا کہ یہ جو آپ اپوزیشن کو ساتھ لے کر کانگریس کو آنے والے الیکشنوں میں ہرانے کا نعرہ دے رہے ہیں تو اپوزیشن نے اگر ۶۷ء کی طرح پھر آپ کو دھوکا دیا تو کیا کیجئے گا؟ جواب اخبار کی رپورٹ کے مطابق یہ تھا کہ میں اعتبار کرنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتا ہوں!

اپنی ذات سے یہ جواب دینے والے رہنما کیسے نفیس آدمی اور کیسی کیسی خوبیوں کے مالک ہیں کہ تنقید کرتے ہوئے دکھ ہوتا ہے مگر ملت کے معاملے میں اپنی ذمہ داری کو ایک آدمی آخر کہاں دفن کر آئے کہ ایسی ایسی باتیں دیکھکر بھی کچھ کہنا گناہ سمجھے! اس جواب میں آخر کوئی بھی ذمہ داری کا احساس ہے؟ خالی ایک جواب کی بات ہوتی تو دل کو سمجھا لیا جاتا کہ رپورٹ شاید صحیح نہ ہو مگر یہاں تو مسلسل عمل گواہی دے رہا ہے کہ رپورٹ سو فیصدی صحیح ہے۔ عشاق تو سنا تھا کہ فریب اعتبار میں زندگی بسر کر دیتے ہیں مگر کسی قوم کے قائدوں کی تاریخ میں یقیناً یہ پہلا تجربہ ہے کہ فریب اعتبار نے ایسا پیار ہو اور شیوۂ اعتبار ایسی مجبوری اور ایسی کمزوری بن جائے!

یہ قیادت نہیں، اپنے ساتھ اور بڑے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اپنی قوم کے ساتھ تمسخر ہے۔ اولاً اس لیے کہ جن لوگوں کی وعدہ فراموشی کا تجربہ بھی ہو چکا ہے، ان ہی کا اعتبار ایک ایسے معاملہ میں کیا جا رہا ہے جن میں اگر سب نہیں تو ہماری اکثریت بلاشبہ ایسی ہے جس کا اب تک کا ریکارڈ مسلم یونیورسٹی کے "اقلیتی کردار" والے مطالبے سے ہم آہنگی نہیں دکھاتا جبکہ ساری مہم کی جان یہی ایک مطالبہ ہے۔ اس کھلی حقیقت سے آنکھیں بند کر کے (جسے زیادہ کھولا جائے تو اور کہیں تلخ تر نکلے گی) ان مخالف پارٹیوں پر اعتبار، اپنے ساتھ اور اپنی قوم کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟ دوسرے اس لیے کہ علیگڈھ یونیورسٹی کا معاملہ مرکزی حکومت سے متعلق ہے اور ان مخالف پارٹیوں میں سے کوئی ایک کیا، سب مل کر بھی ایسی

پوزیشن نہیں دکھاتی ہیں کہ مرکز میں ان کی حکومت کے قیام کی امید کی جاسکے! پھر ان کی حمایت حاصل کرنے اور وعدے کرا لینے کی حیثیت کیا ہے؟ اور کتنی سنجیدہ یہ ایسے وعدوں میں ہو سکتی ہیں جن کے بارے میں خود بھی اچھی طرح جانتی ہیں کہ وفا کرنے کی ذمہ داری ہی ان تک نہ آئے گی؟

اگر ارشاد ہو کہ مقصد صرف حکمراں پارٹی پر دباؤ ڈالنا ہے تو یہ بھی ایسا تجربہ نہیں ہے جو کر لیا گیا ہو اور نتیجے کے بارے میں پُر امید ہونے کی گنجائش ہو، مقصد تھا یا نہیں تھا لیکن حکمت عملی بہار کے گزشتہ الیکشن میں بھی یہی تھی اور کچھ منوا لینے کا ادنیٰ اثر بھی نہ دکھا سکی، بلکہ الٹی جا پڑی۔ ۶۷ء میں حالات بھی نہایت سازگار تھے مگر اس حکمت عملی سے وہ "شاخ نازک" پھر بھی نہ جھکا[ئی] جا سکی۔ اور حکمت عملی کی اپنی خرابی کے علاوہ "ترایاہٹ" نام کی بھی ایک مزید شئی سمجھنے والوں کے لیے یہ کھتی ہوئی سامنے آئی کہ حکمت عملی درست ہو تب بھی اس شاخ کے ٹوٹنے کی امید تو کی جا سکتی ہے لچکنے کی نہیں! ــــ اس کے بعد بھی اُسی غلط حکمت عملی سے اُسے جھکانے اور لچکانے کی کوشش یا تو "اک گونہ بیخودی" جیسی کوئی لت ہی کہلا سکتی ہے جس میں حاصل اور نتیجے سے کوئی بحث نہیں ہوتی! یا پھر ایک ایسی بے رحمانہ خود غرضی اسے ماننا پڑے جس میں قوم کی مصلحت سے کوئی سروکار نہیں صرف اپنی جماعتوں کے لیے اس حد تک الیکشنی زمین ہموار کرنے کی نیت ہے کہ وہ سیاسی زندگی اور موجودگی کا ثبوت دینے کے اس موقع پر اپنی زندگی اور موجودگی درج کرا سکیں! ــــ یہ دوسری صورت یقیناً ایک بامعنی اور با مقصد صورت ہے۔ مگر اتنی بری اور قابل نفرت ہے کہ ہم اسے فرض کرنے کے بجائے پہلی ہی صورت فرض کرنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔

یونیورسٹی کا مسئلہ جس الجھن میں اب پھنس گیا ہے، اس سے گلو خلاصی کی کوئی کوشش بظاہر اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کوشش میں ان واقعات کو بھی ملحوظ نہ رکھا جائے جو اس الجھاؤ کو پیدا کرنے کا باعث بنے ہیں۔ ایک واقعہ تو اس سلسلے میں وہی "بہاری مسلمانوں" کے مسئلہ پر انتخابی جنگ کا ہے، جس کا ذکر اوپر بھی آیا اور گزشتہ ماہ کی گفتگو میں ذرا زیادہ واضح .. طور پر آچکا ہے۔ لیکن یہ اس سلسلے کی تکمیل کرنے والا واقعہ ہے، اس سے پہلے کے واقعات کچھ اور بھی ہیں وہ وہ یہ ہیں:

(۱) وزیر اعظم اندرا گاندھی سے کمیونسٹوں کی قربت :-

یہ بات کوئی راز نہیں ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار یعنی نظم و نسق پر مسلمانوں کے منتخب نمائندوں کی گرفت اور مسلم روایات کو ختم کرا دینے سے سب سے زیادہ دلچسپی یونیورسٹی کے کمیونسٹ گروپ کو رہی ہے اور کوئی بھی موقع اس مقصد کے لیے استعمال کرنے سے انھوں نے کبھی نہیں چھوڑا ہے — ایک معلوم بات کی تفصیلات میں جانے سے کوئی فائدہ نہیں اس لیے اور سب چھوڑ کر ہمیں اس موقع پر آجانا چاہیے جو ان لوگوں کو کانگریس کی تقسیم کے وقت (۱۹۶۹ء) سے شروع ہونے والی مسز گاندھی اور دائیں کمیونسٹ پارٹی کی قربت سے حاصل ہوا۔

یہ قربت ۱۹۷۱ء کے الیکشن میں ایک باقاعدہ اور مضبوط شکل اختیار کر گئی اور اسی وقت میں یونیورسٹی کی بازیابی کی جدوجہد کرنے والوں کے نمائندہ ڈاکٹر فریدی صاحب (صدر مسلم مجلس) بھی یونیورسٹی کے بارے میں مسز اندرا گاندھی اور ان کی پارٹی سے کچھ علانیہ اور کچھ خفیہ وعدے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ کامیابی وہ چیز تھی جو یونیورسٹی کے کمیونسٹوں کو ان کے مقابلے میں بہت تیزی اور مستعدی کے ساتھ مسز گاندھی سے اپنی قربت کا فائدہ اٹھانے کے لیے متحرک کرے، اور دوسری طرف اس اندرونی حرکت میں کامیابی کی راہ اس بات سے بہت ہی آسان ان کے لیے ہو گئی کہ ڈاکٹر صاحب کی پارٹی نے کانگریس کی چھوڑی ہوئی کل چار چھ ہی سیٹیں لڑ کر بھی وہ شکست کھائی کہ کوئی بھرم ہی باقی نہ رہا۔

مسز گاندھی نے جو وعدے مسلم یونیورسٹی کے معاملے میں کیے تھے ان کے بارے میں کوئی بڑی خوش فہمی ڈاکٹر فریدی صاحب کو ان کے ساتھیوں کو اور اندرا جی کے کچھ پرستاروں کو رہی ہو تو رہی ہو، ورنہ جن مطالبوں پر یہ وعدے لیے گئے تھے اولاً تو ان سے وحشت کے پورے آثار موصوفہ میں پہلے سے موجود تھے۔ اور یہ ان کی وزارت عظمیٰ کے آغاز (۱۹۶۶ء) سے اس وقت تک کے طرز عمل میں برابر دیکھے جاتے رہے تھے۔ پھر ان تازہ وعدوں کا انداز بھی کوئی بڑا اعتماد افزا نہ تھا۔ اسی لیے مینی فیسٹو سے باہر کچھ زیادہ کھلی ہوئی یقین دہانی حاصل کرنے کی بھی ضرورت سمجھی گئی۔ وقت بھی الیکشن کا تھا، جس میں کیے گئے وعدوں کی حقیقت اب عوام بھی جانتے ہیں، خصوصاً وہ وعدے جو کرائے گئے ہوں، نہ کہ خود سے کیے گئے ہوں۔ الغرض مسز گاندھی کا ذہن ان..

مطالبوں سے قطعاً ہم آہنگ نہیں تھا جنھیں پورا کرنے کا وعدہ انھوں نے الیکشن کے موقع پر جلسے
تیسے کر لیا تھا، اور نہ کوئی معقول وجہ انھیں ان وعدوں میں مخلص سمجھنے کی تھی! اس لیے یونیورسٹی کے
مسئلے سے دلچسپی بلکہ اس کے لیے سرگرمی رکھنے والے کمیونسٹ گروپ کے لیے مذکورہ بالا مواقع اور سہولتوں کی
بنا پر یہ بات کافی آسان ہوگئی کہ وہ مسز گاندھی کے ذہن کو اس مسئلے پر اپنے سانچے میں ڈھالنے اور اپنی سمت
میں موڑنے کی کوشش کرے! اور ماضی کے تجربات کی روشنی میں یہ بات ناقابل تصور ہے کہ ایسے
اچھے موقع کو ان لوگوں نے کانگریس میں فیسٹو میں درج ان وعدوں کے باوجود یونہی جانے دیا ہو،
بہرحال پریشانی پیدا کرتے تھے۔

موقعوں سے فائدہ اٹھانے اور قربت پا کر شیشے میں اتار لینے کے فن میں کمیونسٹوں کی مشاقی کے
باوجود، دوسرے بہت سے پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے یہ بات آسان نہ تھی کہ یہ کوشش جسے کچھ حالات نے
آسان کر دیا تھا، پوری طرح کامیاب بھی ہو جاتی، یا اتنی جلدی کامیاب ہو جاتی۔ مسز گاندھی کا ذہن ان مطالبوں
سے ہم آہنگی کا تو یقیناً نہیں تھا جنھیں پورا کرنے کے الیکشنی وعدے انھوں نے کر لیے تھے لیکن
مثبت ذہن جو یونیورسٹی کے قانونی اور آئینی ڈھانچے کے بارے میں نئے ایکٹ سے سامنے آیا
یہ بھی ان کا پہلے سے بنا بنایا ذہن رہا ہو، ایسا سمجھنے کی گنجائش نظر نہیں آتی کیونکہ نہ تو اس کی کوئی
ہی کبھی سامنے آئی تھی اور نہ اسمیں ان کا یا ان کی پارٹی کا یا ملک کا کوئی مفاد ہو سکتا تھا۔ بلکہ یہ بیجا
اقدام ان میں سے ہر ایک کے مفاد کے خلاف جانے والا تھا جیسا کہ کھل کر سامنے آگیا ہے — پس بہت
اور شاید بڑی دیر میں ممکن تھا کہ مسز گاندھی اپنے کمیونسٹ دوستوں کو اس حد تک مشکور کرنے پر آمادہ ہو جاتیں
دوستوں کی خوش نصیبی کہ حالات نے یکایک ایک ایسی کروٹ لی جس نے ان کی یہ مشکل بہت ہی جلدی آسان کر دی
کی یہ کروٹ کیا تھی؟

(۲) بنگلہ دیش کی تحریک آزادی، ہندوستان کی اسمیں شمولیت اور مسلم یونیورسٹی کے لیے لڑنے والوں کا اسمیں بزدلانہ بیزاری کا رد عمل

ملک کا پارلیمانی الیکشن ختم ہوئے مشکل سے ڈھائی مہینے گزرے ہوں گے کہ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں
آزادی کا علم بلند ہو گیا جسمیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہماری حکومت کی ہمدردی کھلے طور پر بنگالیوں کے ساتھ
تھی۔ اسی طرح یہ بھی کہ مغربی پاکستان کی فوج سے ڈرے ہوئے یا کھدیڑے ہوئے جن بنگالیوں نے ہمارے ملک

چاہا اُن کے لیے یہاں پناہ کی آغوش کھلی ہوئی تھی جس سے بالآخر نوبت نو مہینے کی لاگ ڈانٹ کے بعد بھی ہند۔پاک جنگ تک پہنچی، اور پاکستان کو وہ شکست حالات کی ناسازگاری سے اٹھانا پڑی جس کی جیتی جاگتی یادگار ایک لاکھ کے قریب قیدی ہندوستان کی قید میں آج تک موجود ہیں۔

واقعات کا یہ سلسلہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک سخت آزمائش اور اُن کے رہنماؤں کے فہم و فکر کا ایک کڑا امتحان تھا۔ ایک طرف جذبات کا یہ تقاضا تھا کہ بنگلہ دیش تحریک اور اُس کی ہر حمایت سے بیزاری ہو کیونکہ یہاں کے ہزاروں مسلمانوں کے لاکھوں عزیز و اقارب جو مشرقی پاکستان میں تھے ان کے ساتھ بنگلہ دیش حامی بنگالیوں کے جس سلوک کی خبریں انھیں مل رہی تھیں وہ بجائے خود بھی بڑی دردانگیز تھیں اور یہ تو طے ہی تھا کہ بنگلہ دیش اگر وجود میں آگیا تو اُن سب کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ دوسری طرف حق و انصاف کی مانگ تھی کہ تحریک کے حامی بنگالیوں کے اس جارحانہ اور انتہا پسندانہ رُخ کے اسباب بھی دیکھے جائیں کہ کس حد تک اُن کا اپنا طبعی رجحان اس کا ذمہ دار ہے اور کس حد تک اُن کے حریفوں (پاکستان حکومت اور مہاجر مسلمان) کا رویہ؟ بالخصوص یہ بات کہ سامنے آنے والے واقعات کی جس ترتیب سے ان دونوں فریقوں کے مقدمے کی مسل تیار ہوئی ہے اس کی روشنی میں ذمہ داری کس پر جاتی ہے؟ اور قصوروار کون ہے؟ — اس غیر جذباتی اور خالص قانونی نقطۂ نظر سے بنگالیوں کی بہیمانہ سفاکیوں اور پاکستان سے علیحدگی کی جدوجہد کی کم از کم پہلی ذمہ داری قطعی طور سے فریق ثانی پر نظر آتی تھی، اور اس لیے بنگالیوں کو کچھ کہنے سے پہلے اُن کے حریفوں کو کہنا حق و انصاف کا تقاضا تھا۔ معاملے کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ ہماری حکومت نے صرف بنگالی پناہ گزینوں کو پناہ ہی نہیں دی بلکہ آزاد بنگلہ دیش کی تحریک کو بھی اپنا لیا اور اس طرح اپنایا کہ یہ اس کے بین اقوامی وقار کا سوال بن گیا — ایسی حالت میں اس تحریک اور تحریک کے لوگوں کی مخالفت اور مذمت کا کھلا مطلب حکومت کے رُخ سے ٹکرانا تھا اور وہ بھی ایسے معاملے میں جو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان صف آرائی کا معاملہ تھا!

اس پیچیدہ صورت حال سے عہدہ برآئی یا مکمل حق پسندی کے ذریعہ ممکن تھی یا مکمل منافقت کے ذریعے! حق پسندی یہ تھی کہ مہاجروں کے ساتھ بنگالیوں کی بہیمانہ سفاکیوں سے تمام دردمندیوں کے باوجود کہا جاتا کہ معاملے کی ابتدائی ذمہ داری پاکستانی حکومت اور مہاجروں ہی پر ہے اور مقدمہ کی مسل کی رو سے آزادی کے نعرے میں بنگالی قیادت قابلِ الزام نہیں، اسی کے ساتھ اپنی حکومت کے معاملے میں بھی تفریق سے کام لیکر کہنا لازم تھا کہ پناہ گزینوں سے ہمدردی تو بہرحال مناسب اور ناقابلِ اعتراض، لیکن تحریک کی حمایت قطعی بے جواز خاص کر اس بنا پر کہ پاکستان کے صدر جنرل یحییٰ خاں کی اس بار بار کی پیشکش کو کہ وہ پناہ گزینوں کے مسئلے میں ہندوستان کی شکایات پر گفتگو کرنے کے لیے ہر وقت تیار اور خواہاں ہیں، ہماری حکومت کی طرف سے یہ کہہ کر مسلسل ہی رد کیا گیا کہ ہم فریق نہیں ہیں، فریق بنگلہ دیش کی قیادت ہے، اس سے گفتگو کر کے مسئلہ کا حل نکالنا چاہیے۔ — تو اس پوزیشن کے ساتھ اس بات کا جواز کہاں سے نکل سکتا ہے کہ ہم فریق جنگ بننے کے راستے پر چلیں اور انجام کار یہ مان لینے پر بھی عملاً راضی ہو جائیں کہ فریق ہم ہی ہیں بنگلہ دیش کچھ نہیں ——— جیسا کہ اب،

جنگ کے بعد ہو رہا ہے!

مرحلہ تو بہت ہی سخت تھا۔ مگر جو لوگ حکومت پاکستان اور اسکے باغیوں کے قضیے میں، اپنے خوں چکاں دل پر پتھر رکھ کر، اس حق پسندی کا دل گردہ دکھا سکتے تھے کہ حکومت پاکستان اور اسکے حامی مہاجروں کو غلط اور باغیوں کو صحیح کہیں۔ اور ان پناہ گزینوں کے ساتھ اپنی حکومت کی ہمدردی اور پذیرائی کو مناسب ٹھہرائیں جن میں سے ہر ایک کو وہ اپنے اعزہ کا قاتل و دشمن گمان کر سکتے تھے، تو ایسے حق نواؤں کے اس نعرے کی کڑواہٹ دوسرے بھی پی لینے پر مجبور نہ ہو جائیں، یہ نہیں ہو سکتا تھا!

مگر یہ اس حق پسندی کا اصل ثمرہ اور اصل نتیجہ نہیں تھا۔ اصل اور مطلوب نتیجہ تو یہ ہوتا کہ بالفرض اس نعرۂ حق کی سزا بھی مسلم قیادت کو بھگتنا پڑتی، تب بھی انھیں سزا دینے والی طاقت نہ اپنی غلطی کے احساس سے اپنے آپ کو بچا سکتی تھی، نہ ان کی عظمت اور ناقابلِ شکست ہونے کے احساس سے! ——— اسی کے ساتھ نہ کسی کے لیے گنجائش تھی کہ انھیں پاکستان نوازی کا مجرم سمجھے، نہ اسکی کہ ایسا الزام دینے کی ہمت کرے ——— اور اس سے بڑھ کر ایک مزید مثبت فائدہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بنگلادیش کے لیڈر وہاں کے مہاجروں کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کی بات سننے کے لیے تیار ہو جائیں۔

حق پرستی کی اس راہ کا دل گردہ نصیب نہیں تھا یا اس میں پہلی بات حق پرستی ہی نظر نہیں آتی تھی، تو دوسری راہ مکمل منافقت کی تھی کہ جس طرح دوسری بات یعنی حکومت ہند کے موقف کو غلط سمجھتے ہوئے بھی اور اپنے لیے انتہائی تکلیف دہ پاتے ہوئے بھی اسکے سب سے زیادہ تکلیف دہ اور قابلِ اختلاف مرحلے (یعنی جنگ) کے وقت سو فیصدی حمایت اور تائید کے نعرے بلند کیے گئے، پہلے ہی دن سے یہی روش نہ صرف اپنی حکومت کے معاملے میں رکھی گئی ہوتی بلکہ بنگلادیش تحریک کے معاملے میں بھی یہی روش رہتی، جسکے بعد نہ حکومت اور حکمرانوں کو چڑھنے کا کوئی موقع ہوتا نہ رقیبوں کو اس چڑھ سے فائدہ اٹھانے کا۔

لیکن ہماری اس مسلم قیادت سے نہ یہ ہوا نہ وہ۔ اس نے (اور خاص کر اسکے صحافتی بازو نے) اپنے جذباتی فریبِ نفس میں بنگالیوں کی اول سے آخر تک مخالفت اور مذمت کو حق پرستی ٹھہرا لیا، لیکن اول تو اسی میں حق نوائی کا حق ادا کرنے کی جرأت نہ ہو سکی، جو کچھ کہا اور لکھا "اگر مگر" اور "نیمے دروں نیمے بروں" کے انداز میں کہا اور لکھا۔ اور پھر اس موقف کا جو منطقی تقاضہ تھا کہ اپنی حکومت کی طرف سے بنگالیوں کی علی الاعلان اور بھرپور حمایت کی اس سے بھی زیادہ مخالفت اور مذمت کی جائے، اس تقاضے کو تو اس شان سے پورا کیا گیا کہ روحِ حق مدتوں بارِ شرم سے سر نہ اٹھا سکے گی۔ — یعنی جو وقت سب سے زیادہ مخالفت و مذمت کا تھا (بنگلادیش کی حمایت میں کھلی جنگ کا وقت) اسوقت صاف صاف اعلان ہونے لگے کہ ہم اپنی حکومت کے ساتھ ہیں ——— نہ حق پرستی ہی انھیں کرنا آئی نہ منافقت کا وقت ہی انھوں نے پہچانا۔ آٹھ نو مہینے تک بنگالیوں اور ان کی تحریک سے بیزاری کا اظہار کرتے رہتے، اور اپنی حکومت سے ناراضگی کے بھی مبہم ثبوت دیتے رہتے، یکایک اسوقت حکومت کی مکمل حمایت کرنے لگنا جب وہ اپنی روش کا سب سے تلخ مرحلہ طے کرنے لگی ہو، منافقت کا وہ بھونڈا انداز ہے جسے صرف حماقت کہا جا سکتا ہے۔

بات سے بات نکل آتی ہو، اس پھوہڑ منافقت کا وہ خون رُلانے اور دل ہلانے والا روپ بھی ان بدنصیب آنکھوں نے دیکھا کہ ایک صاحب جو اس قیادت کے اساطین میں ہیں، اس جنگ میں اپنے ملک کی فتح کے اس جشن پر اپنا غمکدہ رنگین قمقموں سے جگمگ کیے ہوئے ہیں جس کی اپیل حکومت نے نہیں صرف سیاسی پارٹیوں نے اپنے طور پر کی تھی۔ اور جس پر لبیک کہنے والے کم از کم ہمارے شہر میں تو بہت ہی کم نظر آ رہے تھے۔

بہر حال بنگلا دیش تحریک کے اس نازک اور صبر و بصیرت آزما وقت میں ہندوستان کی "مسلم قیادت" کی یہ غیر مدبرانہ اور غیر حق پرستانہ روش نہ صرف ان امکانات کو تاریک کر گئی جو حق پرستی یا مدبرانہ منافقت کے ذریعے کم از کم بنگلا دیش کی حکومت کے درو نہ اپنی حکومت کے حلقوں میں بھی بنگلا دیش کے "بہاری مسلمانوں" کا مستقبل سنبھالنے کے سلسلے میں پیدا کیے جا سکتے تھے۔ (نہ صرف یہ ہوا) بلکہ اسی وقت گویا یہ بھی طے ہو گیا کہ اس مسلم قیادت کو پہنچنے کی کوئی راہ وہاں تک نہیں چھوڑی جائے گی جہاں تک اندرا حکومت کا ہاتھ جاتا ہو۔ اپنی غلطی کوئی نہیں دیکھتا۔ پھر وہ حکومت؟ جو اپنے لیے ایک "تاریخی فتح" کی جستجو سے سرشار ہو۔ اور دوسری طرف کی غلط پوزیشن کچھ زیادہ کھلی ہونے کے ساتھ ساتھ وہاں بزدلی بھی بے حساب ہی ہو! مسز گاندھی اگر اپنے رویہ کے غلط پہلوؤں پر صاف صاف ٹوکی گئی ہوتیں اور دونوں طرف کے دلائل کو آمنے سامنے ہونے کا موقع ملا ہوتا، نیز بنگلا دیشی حامی بنگالیوں اور حکومت پاکستان کے قضیے میں کھلی حقائق کشی کے بجائے ایمانداری سے گفتگو کا طریقہ اختیار کیا گیا ہوتا تو کچھ بھی ہوتا، اندھی اور بزدلانہ پاکستان نوازی کا تصور ان لوگوں کے بارے میں بہر حال نہ قائم ہوتا۔ بغیر ثبوت کے صرف اس کی بنا پر اگر کسی خاص ذہن کے بارے میں کوئی بات کہی جا سکتی ہو، تو یہ کہنا گویا بالکل ایک مشاہدے کا بیان ہو کہ یہ تصور قائم ہوا اور اس نے اس ذہن کو ایک بے پناہ نفرت، چڑھ اور کد سے بھر دیا۔ جو ایک ایسی ذہنی حالت ہو جس میں حق اور ناحق تو کیا اپنے بھلے اور برے کی تمیز نہیں رہتی۔

مسلم یونیورسٹی ایک بڑی طاقت کا سرچشمہ ہو۔ اسکے در و بست پر قبضہ ہی کسی گروہ کو حاصل ہو جائے تو وہ بجائے خود ایک طاقت اور وقار و اعتبار کا ذریعہ ہو۔ یہ گروہ اگر سیاست قیادت کے حوصلے بھی رکھتا ہو تو، یونیورسٹی کے طلباء اور عامۃ المسلمین کا اعتماد حاصل کرنے کی شرط کے ساتھ، ملک کی واحد مسلم طاقت بننے سے بھی اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس یونیورسٹی کیلئے جس طرح کے ایکٹ کا مطالبہ کیا جا رہا تھا اور جس کا وعدہ مسز گاندھی نے ۷۱ء کے الکشن میں کر لیا تھا، ایسا ایکٹ بنا دینے کا مطلب عملاً یہ تھا کہ مسلمانوں کے اس گروہ کو یونیورسٹی پر قبضہ دے دیا جائے جس نے مسز گاندھی سے یہ وعدہ حاصل کیا تھا۔ اور پھر یہ اس گروہ کی اس نوعیت کی سیاسی کامیابی تھی جس کے بعد بالکل قطعی اور قدرتی طور سے اس کو مسلمانوں میں بھی اور یونیورسٹی کے طلباء میں بھی اعلیٰ درجہ کا اعتماد اور وقار حاصل ہو جانا لازمی تھا۔ جبکہ یہ گروہ اس "مسلم قیادت" کا سب سے نمایاں اور پیش پیش یونٹ تھا جسے پنپنے نہ دینے کا تہیہ مسز گاندھی کے دل و دماغ میں ہو چکا تھا۔ اس لیے یہ بھی لازم ہو گیا کہ وعدے کو کھلم

فراموش کر کے ایک ایسا ایجٹ لانے کا منصوبہ بنایا جائے جس میں اس گروہ کی کامیابی اور سرخروئی کا کوئی امکان ہی نہ ہو! ــــ یہ واقعات کا وہ دوسرا مرحلہ تھا جس میں کمیونسٹوں کے خواب کی تعبیر ان کی کسی کوشش کے بغیر بہت ہی قریب آ کھڑی ہوئی۔

(۳) بہار ریاستی اسمبلی کا الیکشن اور "بہاری مسلمانوں" کے لیے مسلم قیادت کی الیکشنی مہم

کوئی کسر اگر مسز گاندھی کا دماغ "مسلم قیادت" کے خلاف پُر طیش ہو جانے میں رہ گئی تھی تو اسے پورا کرنے کا انتظام اس قیادت نے اس طرح کیا کہ بنگلہ دیش کے "بہاری مسلمانوں" سے نرمی اور ہمدردی کا مطالبہ منظور نہ کیے جانے پر ریاستی اسمبلیوں کے ان انتخابات میں حکمراں کانگریس کو سبق سکھانے کی سوچی گئی جو ۷۲ء کے شروع میں (غالباً مارچ میں) ہونے جا رہے تھے۔ اور تو کہیں نہیں البتہ بہار میں، جو اس مسلم قیادت کا ایک پرجوش اور زندہ مرکز ہے اور "بہاری مسلمانوں" کے مسائل سے سب سے زیادہ متاثر ہونے کی بنا پر اس تجویز کا سرچشمہ بھی وہی تھا، یہ سبق سکھانے کی جنگ بڑے زور شور سے لڑی گئی اور غم و غصہ اور طیش زدہ ذہن کو اس حد تک وہ پہنچا گئی جہاں اُن کی زبان سے علی الاعلان اور صاف صاف نکلا کہ "ہمیں مسلمانوں کے ووٹوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

(۴) ۷۲ء کا گرمائی پارلیمنٹ سیشن اور یونیورسٹی بل کی بے وقت مانگ ..... !

وعدے سے ہٹ کر یونیورسٹی کا ایجٹ بنائے جانے کا ذہن بروئے کار آنے میں ابھی یقیناً کچھ وقت لگتا۔ کچھ خاص جلدی کی ضرورت بھی حکومت کو نہیں تھی! اور مسلم مفاد کے نقطۂ نظر سے تو بدیہی طور پر ضروری تھا کہ اس دور آشفتہ "گرمی" کے عالم میں یہ مسئلہ نہ چھیڑا جائے، لیکن اپنی گرمی اور جھلاہٹ کے مارے ہوئے ذہنوں کو یہ سامنے کی بات بھی "بہاڑ اوٹ" ہو گئی اور اس الیکشن کے بعد پارلیمنٹ کا جو اجلاس شروع ہوا تو بس اسی میں یونیورسٹی کا بل پیش کیے جانے کا مطالبہ اس مطالبے کے پیروکاروں کی طرف سے شروع ہو گیا۔

بڑوں کے اس اقدام نے چھوٹوں کو ایک قدم اور آگے جانے کے لیے آکسایا! یعنی پارلیمنٹ سیشن کا خاتمہ قریب آتے دیکھ کر یونیورسٹی کے طلباء "سر سے کفن باندھ کر" اس مطالبے میں جان ڈالنے کے لیے نئی دہلی کی دیواروں سے سر ٹکرانے کے لیے جا پہنچے اور وہ قیامت جو آنے کے لیے ابھی خود سے تیار نہ تھی ان سرفروشوں کی ضد سے ان کے اور پوری ملت کے سر پر اپنی پوری غضبناکیوں کے ساتھ آ ہی پڑی اور اب فریاد ہے کہ ایسی جلدی کب مانگی تھی؟ جس میں عام پارلیمانی طور طریقے بھی اُٹھا کر رکھ دیے جائیں!

صاف اور سچی بات یہ ہے کہ "اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست" ــــ اور اسی لیے یونی ورسٹی کے معاملے میں اگر کوئی بہتری مطلوب ہے تو اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ ایسی بدعقل قیادت کو اُٹھا کر ایک طرف کر دیا جائے۔ اسکے بغیر کوئی صورت نہیں کہ معاملہ سلجھ پائے۔ (باقی)

کتاب المعاشرۃ والمعاملات

معارف الحدیث

(مسلسل)

طلاق اور عدت

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے، نکاح و شادی کا مقصد یہ ہے کہ مرد و عورت یہ رشتہ قائم کر کے اور باہم وابستہ ہو کے عفت و پاکبازی کے ساتھ مسرت و شادمانی کی زندگی گزار سکیں اور جس طرح وہ خود کسی کی اولاد ہیں، اسی طرح ان سے بھی اولاد کا سلسلہ چلے، اور وہ اولاد اُن کیلئے دل اور آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان، اور آخرت میں حصولِ جنت کا وسیلہ بنے ــــ اور ان مقاصد کے لیے ضروری ہے کہ دونوں میں محبت اور خوشگواری کا تعلق رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شوہروں اور بیویوں کو باہم برتاؤ کے بارے میں جو ہدایات دی ہیں اُن کا محور اور مرکزی نقطہ یہی ہے ــــ اسکے باوجود کبھی ایسے حالات ہو جاتے ہیں کہ شوہر اور بیوی کے درمیان سخت تلخی اور ناگواری پیدا ہو جاتی ہے اور ساتھ رہنا بجائے راحت و مسرت کے مصیبت بن جاتا ہے۔ ایسے وقت کے لیے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ترغیب یہی ہے کہ حتی الوسع دونوں ناگواریوں کو جھیلیں، نباہنے اور تعلقات کو خوشگوار بنانے کی کوشش کریں ــــ لیکن آخری چارۂ کار کے طور پر "طلاق" کی بھی اجازت دی گئی ہے ــــ اگر کسی حالت میں بھی طلاق اور علیحدگی کی اجازت نہ ہو تو پھر یہ تعلق اور رشتہ دونوں کے لیے عذاب بن سکتا ہے ــــ پھر طلاق کے سلسلے میں تفصیلی ہدایات بھی دی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی اصولی ہدایت یہ دی گئی ہے کہ طلاق اور اُس کے ذریعے شوہر و

بیوی کے تعلقات کا ٹوٹنا اللہ تعالیٰ کو بے حد ناپسند ہے، لہٰذا جہاں تک ممکن ہو، اس سے بچنا چاہیے، نہ مرد خود یہ اقدام کرے نہ عورت اس کا مطالبہ کرے۔ بس انتہائی مجبوری کی صورت میں ایسا کیا جائے جس طرح کسی عضو میں بڑا فساد پیدا ہو جانے کی صورت میں آپریشن گوارا کیا جاتا ہے۔

پھر اس طلاق اور علاحدگی کا طریقہ یہ تبلایا گیا ہے کہ شوہر طہر کی حالت میں (یعنی جن دنوں میں عورت کی ناپاکی کی خاص حالت نہ ہو) صرف ایک رجعی طلاق دے، تاکہ زمانۂ عدت میں رجعت یعنی رجوع کر لینے کی گنجائش رہے ــــــ پھر اگر شوہر رجوع کرنے کا فیصلہ نہ کر سکے تو عدت کو گزر جانے دے، اس کے بعد رجعت کی گنجائش تو نہ رہے گی، لیکن دونوں کی رضامندی سے نکاح کا رشتہ قائم ہو سکے گا۔

بیک وقت تین طلاقیں دینے کو تو ناجائز اور سخت گناہ قرار دیا گیا ہے جیسا کہ آگے ہونے والی بعض احادیث سے معلوم ہو گا، لیکن متفرق اوقات میں تین طلاقیں دینے کو بھی ناپسند کیا گیا ہے۔ اور اس کی یہ سزا اس دنیا ہی میں مقرر کی گئی ہے کہ اگر وہ شوہر اپنی اس بیوی سے پھر نکاح کرنا چاہے تو نہیں کر سکے گا، جب تک کہ وہ کسی دوسرے مرد کے نکاح میں آکر اس کے زیرِ صحبت نہ رہی ہو، پھر یا تو اس کے انتقال کر جانے سے بیوہ ہو گئی ہو یا اس نے طلاق دے دی ہو ــــــ الغرض صرف اسی صورت میں عدت گزر جانے کے بعد ان دونوں کا دوبارہ نکاح ہو سکے گا ــــــ یہ سخت پابندی دراصل شوہر کو تین طلاقیں دینے ہی کی سزا ہے۔

اس تمہید کے بعد اس سلسلے کی چند احادیث ذیل میں پڑھئے :-

طلاق سخت ناپسندیدہ فعل :-

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ ـــــــــــ رواہ ابوداؤد

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حلال اور جائز چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ مبغوض اور

اور ناپسند "طلاق" ہے۔ (سنن ابی داؤد)

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ لِي رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا مُعَاذُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ شَيْئًا عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنَ الْعِتَاقِ وَلَا خَلَقَ اللّٰهُ شَيْئًا عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ أَبْغَضَ إِلَيْهِ مِنَ الطَّلَاقِ ——— ——— رواہ الدار قطنی

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اے معاذ! اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر کوئی چیز ایسی پیدا نہیں کی جو غلاموں اور باندیوں کو، آزاد کرنے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو محبوب اور پسندیدہ ہو ——— اور روئے زمین پر کوئی چیز ایسی پیدا نہیں کی جو طلاق دینے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو مبغوض اور ناپسندیدہ ہو" ——— سنن دار قطنی

عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّمَا امْرَأَةٍ سَأَلَتْ زَوْجَهَا طَلَاقًا فِي غَيْرِ مَا بَأْسٍ فَحَرَامٌ عَلَيْهِ رَائِحَةُ الْجَنَّةِ ——— رواہ احمد و الترمذی و ابوداؤد و ابن ماجہ والدارمی

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عورت اپنے شوہر سے کسی سخت تکلیف کے بغیر طلاق کا مطالبہ کرے اس پر جنّت کی خوشبو حرام ہے۔ (مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی عورت کو کسی مرد کے ساتھ رہنے میں واقعی زیادہ تکلیف ہو اور وہ طلاق طلب کرے تو اس کے لیے یہ وعید نہیں ہے۔ ہاں اگر بغیر کسی بڑی تکلیف اور مجبوری کے طلاق چاہے گی تو یہ اس کے لیے سخت محرومی اور گناہ کی بات ہو گی۔

عَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُطَلِّقُوا النِّسَاءَ إِلَّا مِنْ رِيبَةٍ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى لَا يُحِبُّ الذَّوَّاقِينَ وَالذَّوَّاقَاتِ ——— رواہ البزار و الطبرانی فی الکبیر والاوسط

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ عورتوں کو طلاق نہیں دینی چاہیئے الا یہ کہ ان کا چال چلن مشتبہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ان مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو ذائقہ چکھنے کے شوقین اور خوگر ہوں۔

(مسند بزار، معجم کبیر و معجم اوسط للطبرانی)

(تشریح) حدیث کے آخری جزو کا مطلب یہ ہے کہ وہ مرد اللہ کی محبت اور پسندیدگی سے محروم ہیں جو بیوی کو اس لیے طلاق دیں کہ اس کی جگہ دوسری بیوی لاکر نیا ذائقہ چکھیں، اسی طرح وہ عورتیں بھی محروم ہیں جو اس غرض سے شوہروں سے طلاق لیں کہ کسی دوسرے مرد کی بیوی بن کر نیا مزا چکھیں

طلاق کا وقت اور طریقہ:-

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ طَلَّقَ اِمْرَأَةً لَهٗ وَهِيَ حَائِضٌ فَذَكَرَ عُمَرُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَغَيَّظَ فِيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ لِيُرَاجِعْهَا ثُمَّ يُمْسِكْهَا حَتّٰى تَطْهُرَ ثُمَّ تَحِيْضَ فَاِنْ بَدَا لَهٗ اَنْ يُطَلِّقَهَا فَلْيُطَلِّقْهَا طَاهِرًا قَبْلَ اَنْ يَمَسَّهَا فَتِلْكَ الْعِدَّةُ الَّتِيْ اَمَرَ اللّٰهُ اَنْ تُطَلَّقَ لَهَا النِّسَاءُ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خود انھوں نے اپنی بیوی کو ایسی حالت میں کہ اس کی ناپاکی کے ایام جاری تھے، طلاق دے دی تو ان کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا، آپ نے اس پر بہت سخت برہمی اور ناراضی کا اظہار فرمایا، اور حکم دیا کہ عبداللہ بن عمر کو چاہیے کہ وہ اس طلاق سے رجعت کرے اور بیوی کو اپنے پاس اپنے نکاح میں رکھے، یہاں تک کہ ناپاکی کے ایام ختم ہو کر طہر (یعنی پاکی کے ایام) آجائیں، اور پھر اس طہر کی مدت ختم ہو کر دوبارہ ناپاکی کے ایام آجائیں اور اس کے بعد وہ پھر طہر کی حالت میں آجائے — تو اس حالت میں اگر وہ طلاق ہی دینا مناسب سمجھے تو اس طہر میں اس سے صحبت کیے بغیر اس کو طلاق دے دے —— آپ نے ارشاد فرمایا —— یہی وہ عدت ہے جس کے بارے میں قرآن مجید میں حکم دیا گیا ہے (فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت کو حالتِ حیض میں طلاق دینا ناجائز اور سخت گناہ کی بات ہے، اور اگر غلطی سے کوئی ایسا کرے تو اس کو رجعت کر لینی چاہیے ـــــ پھر اگر طلاق ہی دینے کی رائے قائم ہو تو اس طہر میں طلاق دینی چاہیے جس میں صحبت کی نوبت نہ آئی ہو ـــ اس کی حکمت ظاہر ہے کہ ناپاکی کی حالت میں عورت قابلِ رغبت نہیں ہوتی۔ طہر کی حالت میں اس کا کافی امکان ہے کہ شوہر کے دل میں رغبت پیدا ہو جائے اور طلاق دینے کا خیال ہی ختم ہو جائے ـــ اور اللہ و رسول کی زیادہ خوشی اسی میں ہے۔

اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر کو حکم دیا کہ جو طلاق انھوں نے حیض کی حالت میں دے دی تھی وہ اس سے رجعت کر لیں، اور ایک طہر گزر جانے دیں، اور اگر طلاق دینی ہی ہو تو پھر دوسرے طہر میں دیں۔ اس کا مقصد بھی بظاہر یہی تھا کہ درمیان کے طہر کی پوری مدت میں جب دونوں ساتھ رہیں گے تو اس کا امکان ہے کہ تعلقات میں پھر خوشگواری آ جائے۔ اور طلاق کی نوبت ہی نہ آئے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو اور طلاق دینے ہی کا فیصلہ ہو تو آپ نے اجازت دی کہ دوسرے طہر میں قبل از صحبت طلاق دی جائے ـــــ "قبل از صحبت" کی پابندی لگانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ جب ناپاکی کے ایام ختم ہوتے ہیں تو فطری طور پر صحبت کی رغبت ہوتی ہے۔ اس طرح یہ پابندی بھی طلاق دینے میں رکاوٹ کا سبب بن سکتی ہے۔

اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر کو رجعت کرنے کا جو حکم دیا اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو حیض کے ایام میں طلاق دینا اگرچہ ناجائز اور سخت گناہ کی بات ہے لیکن یہ طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ اگر طلاق واقع نہ ہوئی ہوتی تو رجعت کی ضرورت ہی نہ ہوتی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رجعت کا حکم دینے کے بجائے یہ فرماتے کہ طلاق واقع ہی نہیں ہوئی۔

بیک وقت تین طلاقیں دینا سخت گناہ :-

عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لَبِيْدٍ قَالَ أُخْبِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ رَجُلٍ طَلَّقَ اِمْرَأَتَهٗ ثَلَاثَ تَطْلِيْقَاتٍ جَمِيْعًا فَقَامَ غَضْبَانَ

ثُمَّ قَالَ اَیُلْعَبُ بِکِتَابِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ وَاَنَا بَیْنَ اَظْہُرِکُمْ حَتّٰی قَامَ رَجُلٌ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَلَا اَقْتُلُہٗ ــــــ رواہ النسائی

محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شخص کے متعلق اطلاع ملی کہ اس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے دی ہیں، تو آپ سخت غصہ کی حالت میں کھڑے ہو گئے اور ارشاد فرمایا کہ ابھی جبکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں کیا کتاب اللہ سے کھیلا جائے گا ؟ (یعنی ایک ساتھ تین طلاقیں دینا اس کتاب اللہ کے ساتھ گستاخانہ کھیل اور مذاق ہے جس میں طلاق کا طریقہ اور قانون پوری وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے. تو کیا میری موجودگی اور میری زندگی ہی میں کتاب اللہ اور اس کی تعلیم سے مذاق کیا جائے گا　　حضور نے سخت غصہ کی حالت میں یہ بات ارشاد فرمائی) تو ایک صحابی کھڑے ہو گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں اس آدمی کو قتل ہی نہ کر دوں جس نے یہ حرکت کی ہے ؟

(سنن نسائی)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا سخت گناہ اور قرآن مجید کے بتلائے ہوئے طریق طلاق سے انحراف اور اس کے ساتھ ایک طرح کا کھیل اور مذاق ہے، لیکن جس طرح حالت حیض میں دی ہوئی طلاق سخت گناہ اور معصیت ہونے کے باوجود پڑ جاتی ہے اور اس کی وجہ سے عورت "مُطَلَّقہ" ہو جاتی ہے، اسی طرح ایک دفعہ کی دی ہوئی تین طلاقیں بھی جمہور ائمہ اُمّت کے نزدیک پڑ جاتی ہیں۔

بیک وقت تین طلاقیں دینے کو کتاب اللہ کے ساتھ کھیل اور مذاق" غالباً اس بنا پر فرمایا گیا کہ قرآن مجید کی آیت "اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ..... الی قولہ تعالیٰ: فَاِنْ طَلَّقَھَا فَلَا تَحِلُّ لَہٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ" سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک سے زیادہ طلاقیں دینی ہوں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک دفعہ میں نہیں، بلکہ مختلف دفعات میں، درمیان میں مناسب وقفوں کے ساتھ دی جائیں، جس کی شرح اور تفصیل حدیث سے یہ معلوم ہوئی کہ ایک طہر میں ایک طلاق دی جائے۔

حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ جن صحابی نے اس غلط کار آدمی کو قتل کر دینے کے بارے میں حضورؐ سے عرض کیا تھا ان کو آپ نے کیا جواب دیا؟ ظاہر یہ ہے کہ آپ نے خاموشی اختیار فرمائی، اور خاموشی ہی سے یہ بتلا دیا کہ اگرچہ اس آدمی نے سخت گمراہانہ کام کیا ہے، لیکن یہ ایسا گناہ نہیں ہے جس کی سزا قتل ہو، واللہ اعلم۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہمارے زمانہ میں اور خاصکر ہمارے ملک میں طلاق کے جو واقعات سامنے آتے ہیں ان میں قریباً نوے فیصد وہ ہوتے ہیں جن میں جاہل شوہر ایک ساتھ تین طلاقیں دیتے ہیں اور وہ بالکل نہیں جانتے کہ یہ سخت گناہ بھی ہے۔ اور اس کے بعد دوبارہ نکاح کا مسئلہ بھی سخت مشکل ہو جاتا ہے۔

تین طلاقیں دینے کا نتیجہ اور شرعی حکم :-

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَاءَتْ اِمْرَأَةُ رِفَاعَةَ الْقُرَظِيِّ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ كُنْتُ عِنْدَ رِفَاعَةَ فَطَلَّقَنِيْ فَبَتَّ طَلَاقِيْ فَتَزَوَّجْتُ بَعْدَهٗ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ الزُّبَيْرِ وَمَا مَعَهٗ اِلَّا مِثْلُ هُدْبَةِ الثَّوْبِ، فَقَالَ اَتُرِيْدِيْنَ اَنْ تَرْجِعِيْ اِلٰى رِفَاعَةَ؟ قَالَتْ نَعَمْ قَالَ لَا حَتّٰى تَذُوْقِيْ عُسَيْلَتَهٗ وَيَذُوْقَ عُسَيْلَتَكِ۔

(رواہ البخاری ومسلم)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رفاعہ قرظی کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے بتایا کہ میں رفاعہ قرظی کے نکاح میں تھی اس نے مجھے طلاق دے دی اور طلاق کا پورا کورس ختم کر دیا (یعنی اس نے مجھے تین طلاقیں دے دیں) تو اس کے بعد میں نے عبد الرحمن بن الزبیر سے نکاح کر لیا۔ لیکن وہ بالکل از کار رفتہ ہے (یعنی نکاح سے جو خاص مقصد ہوتا ہے وہ اس کے قابل نہیں ہے)، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ تو کیا یہ چاہتی ہے کہ پھر رفاعہ کے نکاح میں چلی جائے؟ اس نے کہا ہاں یہی چاہتی ہوں، آپ نے فرمایا یہ

اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم دونوں میں باہم صحبت کا عمل نہ ہو جائے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) شریعت کا یہ حکم قرآن مجید میں بھی بیان فرمایا گیا ہے، سورہ بقرہ میں ارشاد ہے "فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیره" ــــ (مطلب یہ ہے کہ اگر شوہر نے بیوی کو دو طلاقیں دینے کے بعد تیسری طلاق بھی دے دی تو وہ عورت اس شوہر کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہوگی جب تک کہ کسی دوسرے شوہر کے نکاح میں نہ رہی ہو۔) اس کے بعد وہ دوسرا شوہر اگر انتقال کر جائے یا طلاق دے دے تو عدت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح ہو سکے گا۔

ــــ پھر اس حدیث سے اور اس کے علاوہ بھی متعدد حدیثوں سے اس آیت کی تفسیر و تشریح یہ معلوم ہوئی کہ دوسرے شوہر کے ساتھ صرف عقد نکاح ہو جانا کافی نہیں، بلکہ وہ عمل بھی ضروری ہے جو نکاح سے خاص طور پر مقصود ہوتا ہے ــــ جمہور ائمہ اُمت کا مسلک اس مسئلہ میں یہی ہے ــــ واقعہ یہ ہے کہ اگر دوسرے شوہر کے ساتھ زناشوئی کی پابندی نہ ہو تو نکاح ثانی کی شرط بالکل لغو اور بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔

ہنسی مذاق کی طلاق بھی طلاق ہے:-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ اَلنِّکَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ۔

ــــ رواہ الترمذی و ابو داؤد

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن میں دل کے ارادہ اور سنجیدگی کے ساتھ بات کرنا بھی حقیقت ہے اور ہنسی مذاق کے طور پر کہنا بھی حقیقت ہی کے حکم میں ہے نکاح، طلاق، رجعت۔ (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے ہنسی مذاق میں نکاح کیا، یا اسی طرح ہنسی مذاق میں بیوی کو طلاق دی یا مطلقہ بیوی سے ہنسی مذاق میں رجعت کی، تو شریعت میں یہ سب چیزیں

واقع اور معتبر ہوں گی. یعنی نکاح منعقد ہو جائے گا، طلاق پڑ جائے گی اور رجعت ہو جائے گی. اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تینوں چیزیں اسلامی شریعت میں اتنی نازک اور غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں کہ ان کے بارے میں ہنسی مذاق کی گنجائش ہی نہیں رکھی گئی ہے. ان کے بارے میں جو کچھ آدمی کی زبان سے نکلے گا اس کو حقیقت اور سنجیدہ بات ہی سمجھا جائے گا. دوسرے لفظوں میں یہ سمجھنا چاہیے کہ اسلامی شریعت میں یہ میدان ہی ہنسی مذاق کا نہیں ہے.

مغلوب العقل کی طلاق :-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ طَلَاقٍ جَائِزٌ اِلَّا طَلَاقُ الْمَعْتُوْهِ وَالْمَغْلُوْبِ عَلٰی عَقْلِهٖ۔

رواہ الترمذی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر طلاق درست و نافذ ہے سوائے اس آدمی کی طلاق کے جس کی عقل و فہم مغلوب ہو گئی ہو. (جامع ترمذی)

(تشریح) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی مرض یا صدمہ کی وجہ سے آدمی کی عقل و دانش غیر متوازن اور مغلوب ہو جاتی ہے اور وہ ایسی باتیں کرنے لگتا ہے جو عقل و فہم کی سلامتی کی حالت میں نہ کرتا، اور اسے اپنی باتوں کا پورا شعور بھی نہیں ہوتا. ایسے آدمی کو "معتوہ" اور "مغلوب العقل" کہا جائے گا. پس اگر ایسا شخص اس حالت میں بیوی کو طلاق دے تو وہ واقع نہ ہو گی. جس طرح دیوانے اور پاگل کی طلاق واقع نہیں مانی جاتی.

ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تین آدمی شریعت میں "مرفوع القلم" ہیں یعنی ان کے کسی قول و فعل کا اعتبار نہیں کیا جائے گا اور اس پر شرعی حکم مرتب نہیں ہوگا. ایک وہ جو نیند کی حالت میں ہو، دوسرے نابالغ بچہ، اور تیسرے مغلوب العقل آدمی — اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی سونے کی حالت میں بڑبڑائے اور اس میں بیوی کو طلاق دے دے تو یہ طلاق واقع نہ ہو گی، اسی طرح چھوٹے بچے کی، اور مغلوب العقل کی طلاق بھی واقع نہ ہو گی.

زبردستی کی طلاق :-

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ
لَا طَلَاقَ وَلَا عِتَاقَ فِي إِغْلَاقٍ ——— رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے کہ زبردستی کی طلاق اور زبردستی کے "عتاق" کا اعتبار نہیں۔

(سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) یعنی اگر کسی آدمی کو مجبور اور بالکل بے بس کر کے اس سے بیوی کو طلاق دلوا دی گئی یا اس کے غلام کو آزاد کرا دیا گیا (یعنی اس کی زبان سے زبردستی طلاق یا عتاق کی بات کہلوا دی گئی) تو شریعت میں اس کا اعتبار نہ ہوگا۔ اکثر ائمہ مجتہدین کا مسلک یہی ہے کہ جو طلاق زبردستی لی گئی (جس کو اصطلاح میں "طلاق مکرہ" کہتے ہیں اس کا اعتبار نہیں۔ لیکن امام ابو حنیفہ ہنسی مذاق کی طرح زبردستی والی طلاق کو بھی نافذ مانتے ہیں۔ اور مصنفین احناف اس حدیث کی تاویل توجیہہ دوسری طرح کرتے ہیں۔ ملحوظ رہے کہ اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہ منفرد نہیں ہیں بلکہ میں سعید بن المسیبؒ، ابراہیم نخعیؒ، اور سفیان ثوری کا مذہب بھی شروح حدیث میں یہی نقل کیا گیا ہے۔

عدّت

اسلامی شریعت میں طلاق یافتہ عورت کے لیے عدّت کا قانون بھی مقرر کیا گیا ہے، یعنی حکم ہے کہ جب بیوی کو اس کا شوہر طلاق دے دے وہ ایک مقررہ مدت تک عدت گزارے جس کی مختصر تفصیل (جو خود قرآن مجید میں بیان فرما دی گئی ہے) یہ ہے کہ اگر اس عورت کو حیض کے ایام ہوتے ہوں تو ان کے پورے تین دور گزر جائیں۔ اور اگر عمر کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے ایام نہ ہوتے ہوں اور حمل بھی نہ ہو تو تین مہینے۔ اور اگر حمل کی حالت ہو تو پھر عدت کی مدت وضع حمل تک ہے، کم ہو یا زیادہ۔

عدت کے اس قانون میں بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔ ایک اہم مصلحت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ رشتۂ نکاح کی عظمت اور تقدس کا اظہار ہوتا ہے، اگر عدت کا قانون نہ ہو اور عورت کو اجازت ہو کہ شوہر کی طرف سے طلاق کے بعد وہ اپنے حسب خواہش فوراً ہی دوسرا نکاح کرلے تو یقیناً یہ بات نکاح کی عظمتِ شان کے خلاف ہوگی اور نکاح بچوں کا ایک کھیل سا ہو جائے گا ——

ایک دوسری مصلحت خاصکر طلاق رجعی کی صورت میں یہ بھی ہے کہ عدت کی اس مدت میں مرد کے لیے امکان ہوگا کہ وہ معاملہ پر اچھی طرح غور کرکے رجعت کرلے اور پھر دونوں میاں بیوی بن کے زندگی گزارنے لگیں۔ یہی بات اللہ و رسول کو زیادہ پسند ہے۔ اسی لیے طلاق رجعی کی عدت میں عورت کے لیے بہتر ہے کہ وہ اپنے کو بنانے سنوارنے کا ایسا اہتمام کرے اور اپنا رویہ ایسا رکھے کہ شوہر کی طبیعت پھر اس کی طرف مائل ہو جائے اور وہ رجعت کرلے۔ ——

اور طلاق بائنہ کی صورت میں اگرچہ رجعت کا امکان تو نہیں رہتا لیکن زمانۂ عدت میں دوسرا نکاح نہ کرسکنے کی وجہ سے اس کی زیادہ گنجائش رہتی ہے کہ دونوں باہم راضی ہوکر دوبارہ نکاح کے ذریعہ اپنا ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے جوڑلیں۔

ایک تیسری مصلحت یہ بھی ہے کہ عدت کے اس قانون کی وجہ سے عورت سے آئندہ پیدا ہونے والے بچے کے نسب میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں رہتی —— بہرحال قانون عدت کی یہ چند کھلی ہوئی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں —— غالباً اسی وجہ سے اکثر متمدن قوموں کے قوانین میں میاں بیوی کی علیحدگی کی صورت میں کسی نہ کسی شکل میں عدت کا ضابطہ ہے لیکن بعض قوموں کے قانون میں یہ عدت بہت طویل رکھی گئی ہے جو بیچاری عورت کے لیے تکلیف مالا یطاق ہے۔ —— شریعت اسلام نے جو مدت مقرر کی ہے وہ یقیناً معتدل اور متوسط ہے۔ ——

آگے درج ہونے والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عدت کا قانون اُس وقت نازل ہوا تھا جب ایک صحابیہ اسماء بنت یزید بن السکن انصاریہ کو اُن کے شوہر نے طلاق دیدی تھی

عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ بْنِ السَّكَنِ الْاَنْصَارِيَّةِ قَالَتْ اَنَّهَا طُلِّقَتْ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَمْ يَكُنْ لِلْمُطَلَّقَةِ عِدَّةٌ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ الْعِدَّةَ لِلطَّلَاقِ فَكَانَتْ اَوَّلَ مَنْ نَزَلَ فِيْهَا الْعِدَّةُ

لِلطَّلَاقِ ________ رواہ ابوداؤد

حضرت اسماء بنت یزید بن السکن انصاریہ سے روایت ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اُن کو طلاق ہوگئی تھی۔ اور اُس وقت تک مطلقہ عورت کیلیے عدت کوئی حکم نہیں آیا تھا، تو اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید کی وہ آیات نازل فرمائیں جن میں طلاق والی عدت کا بیان ہے، تو یہ اسماء بنت یزید وہ پہلی طلاق یافتہ خاتون ہیں جن کے بارے میں طلاق کی عدت کا حکم نازل ہوا۔

(سنن ابی داؤد)

تشریح) اس آیت میں عدت سے متعلق جس آیت کے نازل ہونے کا ذکر ہے وہ بظاہر سورۂ بقرہ کی یہ آیت ہے "وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ____ الآية"۔ اس آیت میں اُن مطلقہ عورتوں کی عدت کا حکم بیان کیا گیا ہے جن کو ایام ہوتے ہیں ____ اور جن کو صغرسنی یا کبرسنی کی وجہ سے ایام نہ ہوتے ہوں یا انکو حمل ہو تو ان کی عدت سورۂ طلاق کی آیات میں بیان فرمائی گئی ہے۔

عدّتِ وفات اور سوگ

شریعت اسلام میں جس طرح مطلقہ عورت کے لیے عدت کا حکم ہے اسی طرح اس بیوہ عورت کے لیے بھی عدت کا حکم ہے جس کا شوہر انتقال کرگیا ہو، اس عدت کا حکم بھی قرآن مجید میں صراحۃً بیان فرمایا گیا ہے ارشاد ہے "وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا" (تم میں سے جن لوگوں کا انتقال ہوجائے اور وہ بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں اپنے کو روکے رکھیں گی چار مہینے دس دن) یہ عدت اُن بیوہ عورتوں کے لیے ہے جو حاملہ نہ ہوں اور جو حمل کی حالت میں ہوں اُن کی عدت دوسری آیت میں وضع حمل تک کی مدت قرار دی گئی ہے خواہ کم ہو زیادہ ____ اور اس عدّت وفات میں سوگ کا بھی حکم ہے یعنی بیوہ ہوجانے والی عورت کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ عدّت کی پوری مدت میں سوگ منائے جو چیزیں زینت اور سنگھار کے لیے استعمال ہوتی رہیں وہ اس مدت میں بالکل استعمال

نہ کرے۔ الغرض اس پوری مدت میں اس طرح رہے کہ اس کی شکل صورت اور لباس و ہیئت سے اس کی بیوگی اور غمزدگی ظاہر ہو، اور دوسروں کو بھی اس کی ظاہری حالت سے محسوس ہو کہ شوہر کے انتقال کا اس کو ویسا ہی رنج و صدمہ ہے، جیسا کہ ایک شریف وفا کیش بیوی کو ہونا چاہیے ــــ لیکن یہ حکم صرف مدتِ عدت کے لیے ہے، عدت کے ایام ختم ہو جانے کے بعد اس کو ختم ہو جانا چاہیے ــــ شریعت میں اس کی اجازت نہیں ہے کہ کوئی عورت بیوہ ہو جانے کے بعد ہمیشہ کے لیے سوگ کا طریقہ اختیار کرلے۔

شوہر کے علاوہ کسی دوسرے اپنے عزیز قریب مثلاً باپ، بھائی وغیرہ کے انتقال پر اگر کوئی عورت اپنا دلی صدمہ اور تاثر، سوگ کی شکل میں ظاہر کرے تو صرف تین دن تک کی اجازت ہے اس سے زیادہ منع ہے۔

عَنْ اُمِّ حَبِيْبَةَ وَزَيْنَبَ بِنْتِ جَحْشٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ تُحِدَّ عَلٰى مَيِّتٍ فَوْقَ ثَلٰثِ لَيَالٍ اِلَّا عَلٰى زَوْجٍ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ــــ رواہ البخاری و مسلم

ام المومنین حضرت ام حبیبہ اور حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی ایمان والی عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مرنے والے عزیز قریب کی موت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے سوائے شوہر کے، اس کے انتقال پر چار مہینے دس دن سوگ کا حکم ہے۔
(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُتَوَفّٰى عَنْهَا زَوْجُهَا لَا تَلْبَسُ الْمُعَصْفَرَ مِنَ الثِّيَابِ وَلَا الْمُمَشَّقَةَ وَلَا الْحُلِيَّ وَلَا تَخْتَضِبُ وَلَا تَكْتَحِلُ۔

ــــ رواہ ابوداؤد والنسائی

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا جس عورت کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہو وہ کُسم کے رنگے ہوئے اور اسی طرح سرخ گیرو سے رنگے ہوئے کپڑے نہ پہنے، نہ زیورات پہنے، نہ خضاب کا استعمال کرے نہ سرمہ لگائے۔

(سنن ابی داؤد، سنن نسائی)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو خواتین زیب و زینت کے لیے کپڑے رنگتی تھیں وہ زیادہ تر یہی دو چیزیں استعمال کرتی تھیں کُسم یا خاص قسم کا لال گیرو، اس لیے آپ نے ان کا خاص طور سے ذکر فرمایا، ورنہ ان دو چیزوں کی کوئی خصوصیت نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ ایسے رنگین اور شوخ کپڑے استعمال نہ کیے جائیں جو زیب و زینت کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح زیورات اور سرمہ مہندی جیسی چیزیں بھی استعمال نہ کی جائیں جو زینت اور سنگھار کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ زمانہ عدت میں سوگ کے ان احکام کا مقصد یہی ہے کہ شوہر کے انتقال کا بیوی کو جو رنج و صدمہ ہو اس کا اثر دل اور باطن کی طرح ظاہر یعنی جسم اور لباس میں بھی ہو یہ جوہر نسوانیت کا فطری تقاضا ہے اور اسی میں نسوانیت کا شرف ہے۔

بوئے گل در برگِ گل

حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلویؒ اپنے مکتوبات کے آئینے میں

تلخیص و ترجمہ از —— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

خواجہ حسن مودودی لکھنوی کو ارقام فرماتے ہیں :-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم —— حضرت سلامت! بعد سلام مسنون تحریر کرتا ہوں،

" یہ کمترین درویشاں " بلکہ " ننگِ عارفاں " سلسلۂ قادریہ کے خاندان میں پیدا ہوا ہے —— میرے بزرگ قادری تھے —— میرے والد ماجد ولایت قادریہ سے مشرف تھے..

.... مجھ نا فہم پر بھی ان مشہور اعتراضات کا اثر تھا جو سلسلۂ مجددیہ پر کیے جاتے تھے۔ ارادۂ الٰہی اور تقدیر الٰہی نے مجھ کو اس خاندانِ عالیشان یعنی سلسلۂ مجددیہ سے سعادت اندوز کر دیا لیکن دل میں (ایک قسم کی) گرفتگی اور خلش تھی پھر مطالعہ کلام و مقالات حضرت مجددؒ سے مشرف ہوا اور آپ کے فیوض سے جو مناسبت بہم پہونچی اس سے وہ تمام اوہام و شکوک زائل ہو گئے۔ میں نے ایک رسالہ بھی حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے ان اعتراضات کے جواب میں لکھا جو انھوں نے کلام حضرت مجددؒ پر کیے ہیں —— سبحان اللہ کہاں میں جاہل اور کہاں مقابلہ حضرت شیخ عبدالحقؒ! اسی بات سے اعتراضات شیخ دہلویؒ کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ جب مجھ جیسا جاہل ان اعتراضات کو دفع کر سکتا ہے تو وہ اعتراضات کوئی وزن نہیں رکھتے —— حکیم ذکاء اللہ خاں نے میرے رسالے کو مطالعہ کر کے فرمایا کہ " یہ رسالہ دفع اعتراضات میں کافی ہے "

(۱) حضرت شیخ عبدالحقؒ، مرزا حسام الدین خلیفہ حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ کو اپنے

ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے کہ دل میں غیب سے ایک بات واقع ہوئی جس سے وہ اعتراضات ختم ہو گئے وہ یہ تھی کہ اس قسم کے درویشوں سے بدظن نہیں ہونا چاہیے۔ پھر تو وہ پردہ اٹھ گیا جو بمقتضائے بشریت تھا۔"

میں نے کہا سبحان اللہ وہ اعتراضات بشریت کی بنا پر تھے تائید حقانیت کے طور پر نہ تھے جیسا کہ خود اقرار کیا ...... اے اللہ ان کو معاف فرما! ــــ مخلصوں کے ایک جم غفیر نے ان اعتراضات کے جوابات لکھے ہیں ــ حضرت مجددؒ نے تو سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی الانبیاء لکھا ہے ــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمسری اور برابری کو کفر قرار دیا ہے ــ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالے نے مجھ کو جو قرب وکمال عطا فرمایا ہے وہ بواسطہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہے ــ .... اور کوئی ولی ادنیٰ نبی کے درجے کو بلکہ اصحاب کرامؓ میں سے کسی صحابی کے مرتبے کو نہیں پہونچ سکتا۔ چاہے وہ حضرت اویس قرنیؒ ہوں یا حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ...

ایک مکتوب گرامی میں خواجہ حسن مودودی لکھنویؒ کو تحریر فرماتے ہیں۔

..... سلامتی ایمان کا غم اور فکر نیز ستر سال کے معاصی کی شرمندگی اور استغناء کبریا کے شہود وتصور نے اس ناچیز کو گھیر لیا ہے ــ اس "ننگ درویشاں" کے بارے میں سلامتی ایمان اور مغفرت ورضوان کی دعا سے نصرت فرماتے رہیں۔ .... اور یہ بھی دعا فرمائیں کہ موت اس طرح آئے جس طرح ابن یمین نے اپنے قطعے میں لکھا ہے۔

منگر کہ دل ابن یمین پر خوں شد

بنگر کہ ازیں جہانِ فانی چوں شد

مصحف بکف وپا بہ رہ و دیدہ بدوست

با پیک اجل خندہ زناں بیروں شد

انھیں خواجہ حسن مودودی لکھنویؒ کو ایک طویل مکتوب میں ایک مقام پر رقم طراز ہیں۔

اندکے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم ؏

کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

؏ میں نے اس خوف سے کہ آزردہ خاطر ہو جاؤ گے اپنا غم دل تو تھوڑا سا بیان کیا ہے ورنہ بہت کچھ کہنا ہے۔ باقی نیہا

روم کے ایک فاضل استفادے کی غرض سے اس شہر (دہلی) میں آئے تھے وہ بوجہ مجبوری اس جگہ لے۔ اطوار اہل ہند کو دیکھ کر کہ ان میں فسق و بدعت رواج پذیر ہے ۔ مضطرب ہو کر بہت جلد واپس چلے گئے ۔ (وہ کہتے تھے) کہ اس ملک کے اہل اسلام بھی عجیب ہیں ۔ حدیث صحیح کی رو سے منکر اور خلاف شرع امور کو ہاتھ سے یا زبان سے دفع و منع کرنا چاہیے یا (کم از کم) دل سے منکر کو برا جاننا چاہیے۔ منکر کو اگر دل میں برا جانتے تو خلاف شرع کاموں میں حاضر نہ ہوتے ۔ اور فاسقین و مبتدعین کو اپنے سامنے راستہ نہ دیتے۔ ایسی جگہ کوئی دیندار آدمی رہ سکتا ہے؟ (مجھ سے کہا) آپ کو چاہیے کہ اس مقام سے باہر چلے جائیں ۔ ..... حضرت! میری عمر اختتام کو پہونچ گئی۔ میرے نامۂ اعمال میں سوائے انفعال و ندامت کے اور کچھ بھی نہیں وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ۔ جتنا غور و فکر کرتا ہوں سوائے تقصیر و ندامت کے کوئی چیز کل کے لیے نہیں بھیجی ۔ ہاں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے ڈھانپ لے تو دوسری بات ہے۔ امید ہے کہ بزرگوں کی برکت و شفاعت کا توسل وسیلۂ نجات بن جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ ابن یمینؒ کے اس قطعہ کے مطابق اس جہان سے رخصت ہوں ؎

منگر کہ دل ابن یمین پر خوں شد — بنگر کہ ازیں جہان فانی چوں شد
مصحف بکف و پا بره و دیده بدوست — با پیک اجل خنده زنان بیرون شد

اس مقصد مذکور کے لیے دعا فرماتے رہیں کہ میں باوجود اس بات کے کہ نہ تو حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی اولاد سے ہوں اور نہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پوتوں میں سے ہوں نہ ایسا علم رکھتا ہوں جو قبولیت کے مقام پر پہونچائے اور نہ ایسا عمل رکھتا ہوں جو در معرفت کو کشادہ کرے ۔ اس طریقے پر زندگی بسر کر کے اور اسی طرح پابندی اوقات کے ساتھ خوش رہوں، خوش جیوں اور خوش مروں قطعہ مرقومہ کے مضمون کے مطابق۔ والسلام۔

مولوی ولی اللہ سنبھلیؒ کو تحریر فرماتے ہیں:۔

حضرت سلامت ۔ (بعد سلام مسنون) جس قدر نسبت باطن بلند تر ہوتی ہے۔ ذوق و شوق اور کیفیات میں کمی ہو جاتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ۔ جو کہ نسبت باطن میں اولیاء عظامؒ سے اونچے تھے ۔ یہ کیفیات اور استغراق و بیخودی منقول نہیں ہے کیونکہ صحابہؓ مرتبۂ احسان جو ایمان کا جزو سوم ہے اولیاء سے زیادہ رکھتے تھے ان و اکابر صحابہ کا مرتبہ احسان گویا شہود و عینی تھا اور اولیاء کیلئے وہ وجہ کہ جسکو شہود و مشاہدہ حضور و یادداشت،

اور "آگاہی" کہتے ہیں۔ خیال ہی خیال ہے ـــ یہ فرق اس لیے ہے تاکہ فضیلت اصحاب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ثابت ہو جائے۔ بلکہ (در حقیقت) نسبت فوقانی میں "توجہ حضور" کم ہو جاتی ہے اور "حضور" مثل اپنی ذات و نفس کے حضور کے ہو جاتا ہے۔ انوار بے کیف کی دکشادگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو شریعت لائے ہیں اُس کی اتباع نقد وقت ہو جاتی ہے ـــ یہ ہے حضرتِ مجددؒ کا مختار مسلک ورنہ انھوں نے فرمایا ہے کہ آخر کار انتظار ہے اور حاصل کار انتظار ہے ـــ ......

مولوی بشارت اللہ بہرائچی کو ایک طویل مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔ (آخری حصہ)

شائخ رحمۃ اللہ علیہم کو مثل عینک تصور کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت حق سبحانہ کی جانب متوجہ رہیں۔ ہر امر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی نیت ضروری ہے ـــ ہر اس امر اور ہر اس عمل میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اُمت کو پہونچا ہے چاہے وہ فرض ہو یا نفل، اُس کی ادائیگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب توجہ کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "مبدء الفعل" ہیں۔ خوراک کے اندر گوشت، سرکہ، کدو، شیرینی، خرما اور تربوز کے استعمال کرتے وقت بھی جناب مبارک کی جانب توجہ رکھنی چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا اور عمل فرمایا ہے تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب مبارک سے عنایت (عمل کرنے والے کی) پہونچے اور انوار اتباع سے منور کر دے۔

مرید کے لطائف کی تہذیب میں توجہات بلیغہ کرنی چاہئیں جب تک ہر لطیفے کی یاد داشت اور اس کی کیفیات قوی نہ ہو جائیں اور جب تک دنیا اور دنیا والوں سے انقطاع و اعراض صبر و توکل، رضا و تسلیم تہذیب اخلاق اور تبدیل رذائل یہ تمام اوصاف حاصل نہ ہو جائیں اور معیت حق تعالےٰ اور اس کی اقربیت کا بھید ظاہر نہ ہو اور غلبۂ حال طاری نہ ہو جائے اس وقت تک کسی کو اجازت و خلافت نہیں دینی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ یاد داشت کے حصول کے بغیر اور تہذیب رذائل نیز "شستگی اور مسکنت و نیستی" کے بغیر کسی کو اجازت دیدیں۔ یہ احتیاط اس لیے ہے، تاکہ طریقہ بدنام نہ ہو اس لیے کہ اس طریقے میں

معاذ اللہ بے معنی الفاظ مستعمل نہیں ہیں۔

غلبۂ احوال محبت اور شہود حق سبحانہ تعالےٰ نیز کمال معرفت و توحید پیدا کرنا چاہیے ــــ افعال کو واحد حقیقی سے منسوب سمجھنا اور صفات کو صفات الٰہیہ کا پرتو جاننا نیز اپنی ذات کا نشان نہ پانا یہ تمام اقسام معرفت ہیں۔ اپنی طبیعت کے خلاف کسی بات کے ظاہر ہونے پر چیں بجبیں نہ ہونا اور اگر ناگواری چہرے پر ظاہر ہو تو بہت جلد مستغفر و تائب ہو جانا یہ ہے راہ تصوف۔ علم تفسیر و حدیث اور قدماء صوفیہ کے علوم کا شغل رکھنا۔ مثلاً رسالۂ قشیری، عوارف، تعرف اور احیاء العلوم کا مطالعہ بھی ضرور کرنا چاہیے ــــ علم منطق وغیرہ کی کثرت اچھی نہیں ہے۔ والسلام۔

جامعہ مکاتیب شاہ رؤف احمد رافت رامپوری کے نام ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت سلامت السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

مولوی حبیب اللہ آپ کے پاس پہونچ رہے ہیں۔ ان کے حال پر توجہات فرمائیں تاکہ انکو "حضور و جمعیت" "جذبات و واردات" "تہذیب لطائف" اور "تبدیل رذائل بحمائد" اور تفویض تسلیم و رضا نیز مقامات عشرۂ صوفیہ حاصل ہو جائیں۔ اپنے حالات اور مستفدین کے حالات لکھیں واہب العطیات (حق تعالےٰ) کے آستانے سے سر نیاز و التجا اٹھنے نہ پائے ـــ اَنْتَ حَسْبِیْ فَلَا تَکِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَۃَ عَیْنٍ (اے اللہ تو میرے لیے کافی ہے تو مجھے ایک لمحہ بھی میرے نفس کے سپرد نہ کر) موطا امام محمد، سنن ابو داؤد، ابن ماجہ، ترجمہ حضرت شیخ عبدالحق اور جو کچھ بھی کتب تحصیلی مل سکیں، مجھے درکار ہیں ـــ اس وقت پیری میں توجہ اور دعا ہمت سے مدد فرماتے رہیں۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء۔

ایک طویل مکتوب گرامی میں جس کے مکتوب الیہ کا نام مکاتیب میں درج نہیں ہے، ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں۔ (درمیانی حصہ)

..... پیر وہ ہے کہ ظاہراً و باطناً متبع سنت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہو نیز تارک بدعت ہو اور پیرگان سلف مثل غوث الثقلین حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور شیخ الاسلام حضرت فرید الدین گنجشکرؒ کے عقیدے پر مستقیم ہو اور تصوف کے ضروری و بنیادی علم سے بہرہ ور ہو۔ اگر

مشکوٰۃ شریف اور تفسیر قرآن مجید کا مطالعہ کرتا رہے نیز کتب اخلاق صوفیہ، منہاج العابدین، کیمیائے سعادت حضرت امام غزالیؒ وغیرہا پر اور "کتب احوال بزرگان" اور اُن کے ملفوظات پر مزاولت و مداومت رکھے تو یہ بات تصفیہ اور تزکیہ کے لیے بہت مفید ہے (اس کو لازم ہے کہ) دنیا اور اہل دنیا سے احتراز کرے اور "وظائف نیک" کے ساتھ تعمیر اوقات نیز خلوت و عزلت کا اہتمام کرے۔

اللہ تعالیٰ سے اُمیدوار رہنے اور مخلوق سے نا اُمید رہنے کو لازم سمجھے۔ قرآن مجید کا حفظ کرنا اگر دشوار ہو تو اس کے چند پارے (روزانہ) تلاوت کرتا رہے۔ کثرتِ ذکر کے ذریعے کیفیات باطن سے بہرہ مند ہو۔ توبہ و انابت، زہد و ورع، صبر و تقویٰ، توکل، اور تسلیم و رضا اپنا طریقہ بنائے۔ اُس کے دیکھنے سے خدا یاد آئے، اور دل کو وسواس سے نجات اور صفائی حاصل ہو۔۔۔۔

سعادتِ انسانی

افاداتِ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

ترجمانی ———— عتیق الرحمٰن سنبھلی

(۳)

۵- ان خصلتوں کے حصول اور ان کے نقص کی تکمیل کا طریقہ

مذکورہ چار خصلتوں کا حصول دو قسم کی تدبیروں سے ہوتا ہے۔ ایک علمی اور نظری تدبیر، دوسری عملی۔

علمی اور نظری تدبیر، اس بات کو ذہن میں راسخ کرنا اور مضبوطی سے یہ اعتقاد قائم کرنا ہے کہ ہمارا ایک مالک و آقا ہے جو بشری عیوب سے پاک اور زمین و آسمان کے ذرے ذرے پر نگاہ رکھنے والا ہے۔ کوئی شے اور کوئی عمل اس سے پوشیدہ نہیں۔ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ کسی کو اس کا فیصلہ پلٹ دینے اور اس کے حکم کو روک دینے کی طاقت نہیں۔ ہمارا نفسی وجود اسی کا عطا کردہ ہے۔ اور اس پر مزید جسمانی اور نفسانی نعمتیں بھی اسی کا عطیہ۔ وہ انسان کو اس کے اچھے اور برے اعمال پر جزا اور سزا دیتا ہے ——— الغرض ان باتوں کا ایسا اعتقاد ہو جس سے دل پر اس آقا کی ہیبت و عظمت طاری ہو اور اس کے ماسوا کسی کے لیے خوف و سرافگندگی کا خیال دل میں نہ آنے پائے۔

علاوہ ازیں یہ بھی اعتقاد ہو کہ انسان اور انسانیت کا کمال اپنے رب کی طرف دھیان اور اس کی پرستش میں ہے۔ بالفاظ دیگر یہ اعتقاد ہو کہ انسان کے حالات میں سب سے بہتر حال یہ ہے کہ وہ ملائکہ سے مشابہ ہو، اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ یہ چار خصلتیں (۱) ان کو خدا کے قریب کرنے

والی ہیں یہ وہ خصلتیں ہیں جنھیں پروردگار اپنے بندوں میں دیکھنا چاہتا ہے اور اسی کا حق ہے کہ بندے ہر قیمت پر اپنی زندگی ان خصلتوں سے مزین کریں۔

یہ علمی اور نظری تدبیر عین انسانی فطرت کے مطابق ہے، روزمرہ کی زندگی کا تجربہ ہے کہ انسان کے سخت سے سخت طبعی تقاضے اس وقت سرد ہو کر رہ جاتے ہیں جب کوئی خیال اس کے دل میں خوف یا حیا کی کیفیت پیدا کر جائے۔ پس جب اس کا ظرف علم و فکر ایسے خیالات اور اعتقادات سے بھرا ہوا ہوگا جو فطرت صحیحہ سے ہم آہنگ ہیں تو لازماً یہ فطرت (جو ان خصائل اربعہ ہی کا نام ہے) مضبوط اور نمایاں ہوگی۔

بہرحال ان خصلتوں کے حصول کی پہلی تدبیر اس یقین و اعتقاد کی کیفیت حاصل کرنا ہے کہ ان باتوں کا حصول انسان کی سعادت اور ان سے محرومی اس کی شقاوت ہے۔ لیکن (یہ کیفیت پیدا ہونا جو ملکیت سے تعلق رکھنے والی چیز ہے، بہیمیت کی اغواکاریوں کی وجہ سے آسان نہیں ہے) اس کے لیے بہیمیت کو ہوش میں اور قابو میں رکھنے والا ایک کوڑا درکار ہے۔ یعنی ایک تذکیری تدبیر۔ جس میں حضرات انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے (اپنی اپنی قوموں کے حالات کے لحاظ سے مختلف طریقوں کی رہنمائی رہی ہے۔ بنیادی طور پر یہ سب طریقے تذکیر اور یاددہانی کے طریقے تھے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو تذکیر بآیات اللہ وصفاتہ ونعمائہ کے مضامین عطا ہوئے۔ یعنی کائنات میں اللہ کی نشانیوں، اس کی داخلی و خارجی (انفسی اور آفاقی) نعمتوں اور اس کی صفاتِ عالیہ کے بیان سے اس کی ایسی یاددہانی کرائی جائے جس سے انسانوں پر یہ بات آخری درجے میں روشن ہو جائے کہ وہ سب سے زیادہ محبت کا، سب سے زیادہ ذکر و فکر کا، ہر لذت و خواہش پر ترجیح کا اور آخری درجے کی پرستش اور فرمانبرداری کا حقدار ہے! حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان مضامین کے ساتھ تذکیر بایام اللہ کے مضامین بھی عطا کیے گئے، یعنی ان تاریخی واقعات کا بیان جن میں اللہ تعالیٰ نے فرمانبرداروں کو نعمت و نصرت سے نوازا اور نافرمانوں پر زندگی تنگ کردی۔ اس بیان کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں معاصی سے خوف اور طاعتوں سے رغبت پیدا ہو۔ آخر میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان دو مضامین کے ساتھ مابعد موت کے حالات سے متعلق انذار و تبشیر (ڈراوا اور خوشخبری)، اور نیکی اور بدی کے خواص کے بیان کا

اضافہ کیا گیا۔

یہ مضامین، جیسا کہ تذکیر کے لفظ سے ظاہر ہے محض تعلیمی نہیں ہیں کہ ایک دفعہ اچھی طرح بتا کر اور سمجھا کر چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ بار بار دہرانے اور دہراتے رہنے کے اور دل و دماغ پر اس طرح حاوی کر لینے کے ہیں کہ اعضاء و جوارح بے اختیار ان کے منشاء پر چلنے لگیں۔

فائدہ:۔ یہ تین مضمون (تذکیر بآیات اللہ، تذکیر بایام اللہ اور انذار و تبشیر) قرآنِ عظیم کے اُن پانچ مضامین میں کے تین ہیں جو اس کے بنیادی مضمون ہیں۔ باقی دو ہیں بیانِ احکام یعنی واجب و حرام وغیرہ کا بیان اور کفار سے مخاصمہ و مباحثہ کا مضمون۔

یہ بیان خصائلِ مطلوبہ کے حصول کی پہلی (علمی و نظری) تدبیر کا تھا۔ دوسری تدبیر جو ناگزیر ہے، عملی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی ہیئتیں اور ایسے افعال و اعمال اختیار کیے جائیں جو نفس کو مطلوبہ خصلت کی یاد دلائیں اور اس کی طرف راغب کرنے کی تاثیر اُن میں ہو۔ یہ تاثیر اور تذکیر دو وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ اس ہیئت یا عمل سے یہ تاثیر و تذکیر عادۃً وابستہ ہو گئی ہو۔ یا اس ہیئت اور عمل کو بدون عادت بھی ایک فطری اور جبلی ربط اس تاثیر اور تذکیر سے ہو۔ ان امور کی معرفت اور ادراک میں فیصلہ کن معیار ذوقِ سلیم ہے۔ اور اس کی رو سے مثلاً حدث کے اسباب، جو کہ طہارت کی ضد ہے، یہ ہیں کہ قلب پر کسی سفلی حالت کے اثرات طاری ہوں، جیسے کہ قضاء شہوت کی حالت ہو۔ یا حق کی مخالفت کے جذبے سے دل بھرا ہوا ہو اور اس کی وجہ سے اسے ملاءِ اعلیٰ کی لعنتوں نے گھیر رکھا ہو۔ یا بول و براز کے تقاضے کی حالت ہو۔ یا اُن نجاستوں کا یا ریاح کا اخراج ہوا ہو۔ یا بدن پر میل اور ناک اور منہ میں گندگی ہو۔ زیرِ ناف اور بغل کے بال بڑھ گئے ہوں۔ کپڑوں یا جسم پر نجاست لگی ہوئی ہو۔ یا حواس پر کوئی ایسا نقشہ یا کیفیت طاری ہو جو نفس کو حالتِ سفلی کی طرف مائل کرتی ہے جیسے شرمگاہ کا مشاہدہ۔ یا حیوانوں کی مباشرت پر نظر۔ ملائکہ اور صالحین کی شان میں گستاخی یا لوگوں کو ایذا رسانی ــــ اس کے مقابلے میں طہارت کے ذرائع یہ ہیں کہ ان اسبابِ حدث کو زائل کر کے ان کے اضداد کو حاصل کیا جائے اور وہ کام کیے جائیں جن کے بارے میں عادۃً اور عرفاً یہ طے ہے کہ وہ نظافت کے کام ہیں۔ مثلاً غسل، وضو، اچھے کپڑوں کا استعمال اور اُن پر خوشبو کا استعمال۔ یہ چیزیں وہ ہیں جو نفس کو صفتِ طہارت کی طرف مائل کرتی ہے۔

غ ہو رہنیں بیان کرنے کی ضرورت اسبابِ طہارت کو سمجھانے کے لیے ہے جیسے کہ طہارت کی حقیقت کو سمجھانے کے لیے حدث کی حقیقت بتانا ضروری تھا۔ مترجم۔

علیٰ ہذا اخبات کے ذرائع یہ ہیں کہ نفس کو اللہ کے لیے ان افعال و ہیئات کا پابند اور عادی کیا جائے جو کسی کی اعلیٰ تر تعظیم کا طریقہ ہو سکتے ہیں جیسے کہ سرنگوں کھڑا ہونا، رکوع اور سجود کرنا۔ ایسے الفاظ زبان سے ادا کرنا جن میں عاجزی کا اظہار ہو، مناجات اور اپنی ضرورتوں کا سوال ہو۔ ان باتوں سے نفس کو خضوع اور رجوع الی اللہ کی طرف توجہ ہوتی ہے۔

اسی طرح سماحت پیدا کرنے کے ذرائع یہ ہیں کہ سخاوت اور داد و دہش کی عادت اختیار کی جائے۔ درگزر کی عادت کو اپنایا جائے اور سختیوں میں صبر و استقامت کا خوگر ہوا جائے۔

صفت عدالت کی طلب ہو تو اس کا ذریعہ سنت راشدہ پر کاربند ہونا ہے جو اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ محفوظ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۶۔ وہ حجابات جو ظہور فطرت سے مانع ہوتے ہیں

یہ حجابات تین قسم کے ہیں۔

طبیعت کا حجاب — رسم دنیا کا حجاب — بدفہمی کا حجاب

حجاب طبیعت انسان میں کھانے پینے اور جنسی قربت کے تقاضے طبعی ہیں۔ علیٰ ہذا اس کا دل حزن و سرور اور خوف و غضب کے طبعی حالات کی آماجگاہ ہے۔ پس ان باتوں میں اس کی توجہ کا مشغول ہونا اور اس سے غافل ہو جانا ایک طبعی بات ہے۔ چنانچہ یہ بیں گزر جاتی ہیں اور آدمی کو ان باتوں سے ہٹ کر کسی دوسری طرف توجہ کی توفیق ہی نہیں ملتی۔ بعض کی تو ساری عمر اسی حالت میں گزر جاتی ہے اور بعض پر طبیعت کا یہ غلبہ یہاں تک ہوتا ہے کہ رسم دنیا اور عقل عام کے تقاضوں کی بھی انہیں پرواہ نہیں ہوتی۔ اور اس بے پرواہی پر ملامت کرنے والے ملامت کریں تو اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا — یہ حجاب طبیعت یا حجاب نفس ہے۔

رسم دنیا کچھ لوگوں پر طبیعت کی گرفت اتنی سخت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ ان کا عقلی اور شعوری حال بہتر ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں پر بار بار ایسے اوقات آتے ہیں کہ نفس کو ان طبعی تقاضوں کے علاوہ دوسرے تقاضوں کی طرف بھی التفات ہوتا ہے۔ یہ دوسرے تقاضے کیا ہیں؟ وہی کمالات نوعی کی طلب، جس کا ذکر اس بحث کی پہلی فصل میں آچکا ہے۔ اس طلب میں پہلی توجہ آدمی کو

ان تمدنی اور تہذیبی طریقوں اور معیاروں کی طرف ہوتی ہے جو اس کی قوم اور اس کے سماج میں رائج ہوں۔ یعنی ضروریات کی انجام دہی کے معیاری طریقے، لباس کا فیشن، خود نمائی اور تفرد و مباہات کے انداز اور علم و فن کے کمالات، طبیعت کے حجاب سے گزر کر آگے بڑھنے والا یہ آدمی عام طور پر اسی میں گم ہوجاتا ہے اور اس رسم دنیا سے آگے کا کوئی کمال اس کی نظر میں نہیں آتا۔ حتیٰ کہ اسی میں مست رہ کر دنیا سے گزر جاتا ہے۔

بدفہمی کا حجاب بعض لوگوں کی نظر اس سے آگے بھی چلی جاتی ہے۔ یہ وہ زیادہ ذکی و ذہین اور لطیف الحس لوگ ہوتے ہیں، جنھیں عقل و وجدان کی شہادت یا کسی مذہبی تعلیم کا اعتماد اس یقین سے بہرہ ور کر دیتا ہے کہ اس دنیا سے اوپر ان کا کوئی رب ہے جو مدبر کائنات اور منعم حقیقی ہے۔ یہ یقین و اعتقاد ان کے دلوں کو اس ہستی کی طرف مائل اور اس کی محبت سے لبریز کرتا ہے وہ اس کا تقرب چاہنے لگتے ہیں، اپنا ماویٰ و ملجا اسے بناتے ہیں اور اپنے کو پوری طرح اس کے حضور میں جھکا دینا چاہتے ہیں مگر یہ بڑا نازک اور باریک مقام ہے۔ کچھ لوگ یہاں نیک نیتی کے باوجود پھسل بھی جاتے ہیں اور یہ پھسلنا دو باتوں سے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اس ہستی کے متعلق تصورات میں کچھ ایسی چیزیں شامل ہو جائیں جو مخلوق کے لیے زیبا ہیں، اس کے لیے زیبا نہیں، اور دوسری اس کا عکس کہ اس کی کچھ صفات کا کسی مخلوق میں ہونا گمان کر لیا جائے! پہلی چیز کا اصطلاحی نام تشبیہ ہے، دوسری کا شرک۔

غلطی کا سرچشمہ پہلی غلطی اور پہلی ٹھوکر کا باعث انسان کی یہ عمومی کمزوری ہے کہ وہ غائب کو شاہد پر قیاس کرتا ہے۔ کتنی ہی احتیاط کیوں نہ کرے مگر کہیں نہ کہیں چوک ہو ہی جاتی ہے دوسری ٹھوکر اس بات سے لگتی ہے کہ بعض مخلوق میں کچھ خارق عادت (یا فوق الفطرت) باتیں کسی وقت دیکھنے میں آجاتی ہیں تو انسان اس سے خدائی صفت اس مخلوق میں مان بیٹھتا ہے۔

تم اچھی طرح جائزہ لے کر دیکھو نوع انسانی کے تمام افراد (ان سے قطع نظر کہ جو وحی الٰہی کی روشنی سے فیضیاب ہیں)، تمہیں ان تین میں سے کسی نہ کسی حجاب میں گرفتار اور اسی کے بقدر فطرت سے دور نظر آئیں گے۔

۷۔ ان حجابوں کو دور کرنے کی تدبیریں

حجاب طبیعت کی تدبیر حجاب طبیعت اور حجاب نفس کو دور کرنے کے لیے دو باتوں کی ضرورت ہے:

ایک یہ کہ کچھ ریاضتیں آدمی پر عائد کی جائیں، جیسے کہ روزہ اور شب بیداری، اور ان کی طرف
ترغیب وتشویق کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ طبیعت کی فرمانبرداری کرکے
راہِ راست سے منحرف ہوتے ہوں ان کیلیے زجر وملامت کا نظام قائم ہو اور ساتھ ہی راست روی
کا عملی نمونہ بھی اُن کے لیے قائم کیا جائے۔

ان دونوں ہی باتوں میں اعتدال شرط لازم ہے کہ اولاً تو صوم وشب بیداری جیسی ہی ریاضتیں
ہوں، آلاتِ تناسل کو قطع کر دینا یا ہاتھ پاؤں جیسے اعضاء کو سکھا لینا یہ نہایت جاہلانہ اور
حد سے گزری ہوئی باتیں ہیں اور انھیں اختیار کر لینا ایک دوسری بُری حد پر جا کھڑا ہونا ہے
پھر صوم وشب بیداری میں بھی قدرِ ضرورت سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے اس لیے کہ ان
کی حیثیت زہریلی دواؤں جیسی ہے کہ نہایت جنچی تلی مقدار میں استعمال کرکے ان سے فائدہ اٹھایا
جا سکتا ہے۔۔ علیٰ ہٰذا زجر وملامت والی تدبیر میں بھی نہ تو یہ ہونا چاہیے کہ کجرو اور خطاکار لوگوں پر زندگی
ہی تنگ کر دی جائے (کیونکہ انسان کی وہ ایک طبعی کمزوری کا معاملہ ہے) اور نہ یہ ہونا چاہیے کہ
ہر موقع پر صرف زبانی زجر وملامت کو کافی سمجھ لیا جائے۔ بلکہ طبعی کجروی کے جو معاملات اپنے
ضرر اور اثر دوسروں تک پہونچانے والے ہوں جیسے کہ زنا اور قتل ہے، تو ان میں زجر وملامت
کی شکل عملی اور شدید سے شدید ہونی چاہیے یعنی جسمانی تعزیر یا مالی تعزیر۔

حجابِ رسم کی تدبیر رسم دنیا کا حجاب توڑنے کے لیے بھی دو ہی باتوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ
دنیا کے ہر کام کے ساتھ ذکر الٰہی وابستہ کر دیا جائے۔ یہ ذکر (یعنی یاد) کہیں الفاظ کی شکل میں
ہوگا اور کہیں (اسی کے ساتھ) حدودِ الٰہی کے لحاظ کی شکل میں بھی۔ (یعنی جن امور میں ایسی
مختلف حدیں اور شکلیں قائم ہوتی ہیں جن میں سے بعض سنت راشدہ کے دائرے میں آتی
ہیں اور بعض اس سے باہر جاتی ہیں۔ ایسے امور میں سنت راشدہ کے دائرے کی حدوں
اور شکلوں میں محدود رہنا بھی یادِ الٰہی کی ایک لازمی شکل ہے اور زبان سے یاد کے ساتھ ع
سے یاد کا بھی یہ طریقہ لازم کیا جانا چاہیے۔ بخلاف ان امور کے کہ جن میں اس طرح کی حد بندی
کا سوال نہیں پیدا ہوتا وہاں مجرد الفاظ اور کلمات ہی سے یاد الٰہی کی شکل پیدا کی جائے
دوسری چیز یہ ہے کہ طاعت وبندگی کے کچھ مظاہروں کو رسم عام بنا دیا جائے (یعنی رسم

کے دائرے میں ایک نیا عنصر شامل کیا جائے، اور اس کی بجا آوری کو اختیاری نہیں لازمی قرار دیا جائے۔ ایسا لازمی کہ اُس کے ترک پر جاہ و منزلت کے نقصان تک کی سزا آدمی کو ملے!

یہ دو تدبیریں وہ ہیں کہ جن سے رسوم و اعمالِ دنیا کی برائیاں ہی نہیں نکل جاتیں بلکہ اور اُلٹی یہ رسوم طاعت و عبدیت میں مددگار اور حق کی طرف سراپا دعوت و پکار بن جاتی ہیں۔ عظمت

بدفہمی سے بچاؤ بدفہمی (سوءِ معرفت) کی جو دو قسمیں اوپر مذکور ہوئی ہیں اُن دونوں کے سبب بھی ہم نے بتائے ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ یا تو آدمی اپنے رب کی بلند تر شان اور اُس کی بے مثالی کی وجہ سے کما حقہٗ اُسے جان نہیں سکتا۔ اور یا دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ محسوسات میں جو لذت و کشش خدا نے انسانوں کے لیے رکھ دی ہے اس کے نتیجے میں بعض لوگ اس بری طرح ان چیزوں میں اپنے فکر و نظر سے گرفتار ہو جاتے ہیں کہ خالصۃً توجہ الی الحق کی راہ نہیں پاتے۔

اب ان میں سے پہلی کمزوری اور نارسائی کا علاج یہ ہے کہ خدا کی شان کے بارے میں کلام انسانوں کی ذہنی اہلیت اور سطح کے مطابق کیا جائے۔ مثلاً انھیں بتایا جائے کہ اللہ موجود ہے مگر اس کا وجود ہمارے جیسا وجود نہیں ہے۔ وہ حی ہے مگر ہماری جیسی اُس کی شانِ حیات نہیں وراء الوراء ہے۔ الغرض خدا کی ذات و صفات سے متعلق باریک سوالوں میں نہ جایا جائے (جیسا کہ اہلِ منطق کا طریقہ ہے) بلکہ ایسی صفات کے بیان سے اس غیبی ہستی کی معرفت پیدا کرائی جائے جو مشہود ذات کے حق میں بہرحال قابلِ تعریف مانی جاتی ہیں۔ صفات کا اطلاق ہم جس کسی چیز کے متعلق بھی کرتے ہیں اُن صفات کے آثار کی بنا پر کرتے ہیں جو ہمیں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ یہی آثار جب ہم خدا کی ہستی سے متعلق دنیا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہمیں ان آثار والی صفات کے اطلاق اور اثبات کا حق ہو جاتا ہے۔ البتہ مخلوقات اور خالق کی صفات میں لفظوں کے اشتراک کی وجہ سے جو تشبیہ کی خرابی پیدا ہوتی ہے اس کا تدارک کرنے کے لیے (لیس کمثلہ) (ہمارے وجود اور ہماری حیات کی طرح نہیں) سے جیسے الفاظ بھی بڑھانا ضروری ہوتے ہیں اور یہی تدارک کی ممکن شکل ہے۔

دوسری کمزوری کا علاج یہ ہے کہ ایسی ریاضتیں اور ایسے اعمال کرائے جائیں جن سے تجلیاتِ عالیہ اور حقائق کو واشگاف دیکھنے اور ان سے محظوظ ہونے کی استعداد آدمی

میں پیدا ہو جائے ۔ گو کہ ان تجلیوں کا کامل مشاہدہ یہاں ممکن نہیں آخرت ہی میں ممکن ہے ۔ مزید برآں انسانی توجہ اور اس کی نگرو نظر کو گھیر لینے والی چیزوں کے ممکن حد تک ازالے کا بندوبست کیا جائے جیسے مثال کے طور پر حضور نے باتصویر پردے کو ایک موقع پر اسی مصلحت سے پھاڑ دیا تھا اور وہ چادر اپنے جسم مبارک سے اتار دی تھی جس میں بیل بوٹے اور نقش و نگار بنے تھے ۔ (ختم)

تحدیثِ نعمت

کیا کیا پایا اور کن کو پایا

محمد منظور نعمانی

اس عاجز کی عمر کا سترواں سال چل رہا ہے۔ گزری ہوئی اس طویل زندگی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ ربِ کریم کے انعامات و احسانات اور اپنی تقصیرات و معصیات کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ سورۂ ابراہیم میں گویا مجھ جیسوں ہی کے لیے فرمایا گیا ہے۔

وَإِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا	اور تم اگر اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو
إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ	کر نہیں سکتے، یقیناً انسان بڑا مجرم اور
سورۂ ابراہیم آیت ۳۴	ناشکرا ہے۔

جب اپنی بداعمالیوں اور خطاکاریوں کو نظر کے سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ کے بے حساب الطاف و عنایات پر غور کرتا ہوں تو شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ استدراج نہ ہو، لیکن پھر دل کو سمجھاتا ہوں کہ اپنے اُس رحیم و کریم پروردگار کے ساتھ جس نے محض اپنے کرم سے وجود بخشا، ایک مسلمان و دیندار گھرانے میں پیدا فرما کر پیدائشی مسلمان بنایا اور کسی درجہ میں دین سے تعلق اور اس کا کچھ علم اور ٹوٹا پھوٹا عمل بھی نصیب فرمایا، ایسے کریم پروردگار کے ساتھ کیوں بدگمانی کی جائے، کیوں نہ سمجھا جائے کہ یہ جو کچھ ہے اُس کی وہ رحمت و بخشش ہے جس سے گنہگار اور خطاکار بندے بھی محروم نہیں کیے جاتے!

سورۂ نحل میں فرمایا گیا ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

سورۂ نحل آیت نمبر

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشش کرنے والا اور بڑا مہربان ہے اس کی نعمتیں اس صفت مغفرت و رحمت کا ظہور ہیں۔

اللہ تعالیٰ تقصیرات و معصیات سے سچی توبہ و استغفار کی اور خداوندی انعامات و احسانات پر روح و قلب اور قول و عمل سے شکر کی توفیق دے۔

شکر نعمتہائے تو چنداں کہ نعمتہائے تو

عذر تقصیرات ما چنداں کہ تقصیرات ما

کچھ دن پہلے ایک ضرورت سے شیخ عبدالوہاب شعرانی کی کتاب "المنن" کا مطالعہ کرنا پڑا، شیخ موصوف نے اپنی اس کتاب میں بڑی تفصیل اور استیعاب کے ساتھ اپنے پر ہونے والے اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات کا ذکر فرمایا ہے، یہی کتاب کا خاص موضوع ہے، جن اہل علم کو ان عارفین کے علوم و معارف سے مناسبت ہو۔ بلاشبہ ان کے لیے بڑی ہی مفید تصنیف ہے ــــ بڑے کتابی سائز پر پرانے طرز کے ایک بار یک مصری ٹائپ سے چھپے ہوئے قریباً چھ سو صفحات کی ضخیم کتاب ہے۔

اس کے مقدمہ میں امام شعرانی نے پہلے وہ آیات و احادیث اور اس کے بعد ائمۂ ہدیٰ کے وہ ارشادات درج کیے ہیں جنھوں نے ان کو اس کتاب کی تالیف اور بڑے استیعاب و استقصا کے ساتھ نعمائے الٰہیہ کے اظہار و بیان پر آمادہ کیا ـــــ سب سے پہلے قرآن مجید کی وہ آیات درج کی گئی ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ کے الطاف و عنایات پر انبیاء علیہم السلام کے تشکر و احسان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کتب حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی طرح کے بعض ارشادات نقل کیے ہیں ـــ اس کے بعد لکھتے ہیں۔

قد امرنا الله تعالى بالتاسى برسول الله صلى الله عليه وسلم فى كل امر لم يكن خاصًا

اللہ تعالیٰ نے ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا ہے ان سب چیزوں میں جو آپ کے خصائص میں سے

به ومن التاسی به ان نتحدث بکل نعمة انعمها علینا ولا نکتمها ولا نتحدث فی سرائرنا بها بل نعلن بها علی رؤس الاشهاد۔

نہیں ہیں اور آپ کی پیروی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والی ہر نعمت وعنایت کو ہم بیان کریں اور اس کو چھپائیں نہیں، اور صرف اپنی خاص مجالس ہی میں بیان نہ کریں بلکہ بالاعلان سب کے سامنے اظہار کریں۔

اس کے بعد طبرانی اور بیہقی کی تخریج سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے

التحدث بالنعمة شکر و ترکه کفر۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اس کے بندوں کے سامنے ذکر کرنا شکر نعمت ہے اور ذکر نہ کرنا کفران نعمت ہے۔

پھر اسی سلسلہ میں ائمہ اور اکابر امت کے ارشادات ذکر کرتے ہوئے حضرت سفیان ثوری سے نقل فرمایا ہے کہ وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

من لم یتحدث بالنعمة فقد عرضها للزوال۔

جس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی نعمتوں کا چرچا نہیں کیا اس نے زوالِ نعمت کا سامان فراہم کر دیا۔

پھر عارف ربانی شیخ ابو المواہب شاذلیؒ سے نقل فرمایا ہے۔

لا یکفی الانسان ان یشکر ربه فی نفسه من غیر لفظ وانما علیه ان یشیع ذالك بین العباد حتی یعلم به الخاص والعام فانه تعالی یحب من عباده ان یشکروه ویذکروا فضله

آدمی کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اپنے جی میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے اور زبان سے کچھ نہ بولے بلکہ ادائے شکر کے لیے لازم ہے کہ اللہ کے بندوں میں اس کی نعمتوں کا خوب چرچا کرے تاکہ عوام وخواص سب کے علم میں آجائے، اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے اس

واحسانہ علیھم بین عبادہ ویصفون بالجود والکرم و الفضل۔

کی نعمتوں پر علانیہ اس کا شکر کریں اور اسکے فضل وکرم، احسان وعنایت اور کرم وبخشش کا دوسروں کے سامنے چرچا کریں۔

پھر سب سے آخر میں اپنے مرشد کامل سید علی خواصؒ کا یہ ارشاد درج کیا ہے۔

علیکم بالاعلان بما تفضل اللہ بہ علیکم فان اللہ تعالیٰ یستحی من عبدہ اذا قال اعطانی اللہ کذا وکذا ان یسلب منہ ذالک لئلا یخجلہٗ بین عبادہ۔

کتاب المنن ص۲۸و۲۹

تم پر اللہ تعالےٰ نے جو فضل و احسان فرمائے تمہیں چاہیے کہ اس کو خوب بیان کرو، اللہ کا بندہ جب دوسرے لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے کہ میرے رب کریم نے مجھے یہ عطا فرمایا تو اب اللہ کی طرف سے ہرگز یہ نہ ہوگا کہ اس بندہ سے وہ نعمت سلب کرکے مخلوق کے سامنے اس کو شرمندہ اور رسوا کیا جائے۔

اس کے ساتھ یہ حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ بندہ کو اس کا وہم بھی نہ ہونا چاہیے کہ میں اللہ تعالیٰ کے اس لطف وکرم کے لائق ہوں اور یہ میرے کسی حسن عمل کا ثمرہ ہے بلکہ اپنے کو قطعاً غیر مستحق سمجھتے ہوئے یقین کرے کہ یہ صرف مالک کا فضل اور اس کی بخشش ہے ـــــ چنانچہ اسی سلسلۂ کلام میں شیخ شعرانیؒ نے سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے۔

لایکمل احد فی مقام الشکر للہ تعالیٰ حتی یری نفسہ انہ لیس باھل ان تنالہ رحمۃ اللہ عزوجل وانما رحمۃ اللہ من باب المنۃ والفضل ص۲۹

کوئی بندہ مقام شکر میں کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ اپنے بارہ میں یقین کے ساتھ نہ سمجھے کہ میں قطعاً اس لائق نہیں ہوں کہ میرے ساتھ رحمت کا معاملہ ہو، میرے پروردگار کا رحمت وعنایت کا جو کچھ معاملہ میرے ساتھ ہے وہ صرف اس کی بخشش اور خالص احسان ہے۔

"کتاب المنن" کے اس مقدمہ کے مطالعہ کے بعد دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ اس گنہگار

و سیہ کار بندہ پر اللہ تعالیٰ کے جو خاص خاص الطاف و عنایات ہیں، میں نے ان کو سپرد قرطاس قلم کردں اور اس طرح اپنی وسعت کے مطابق علیٰ رؤس الاشہاد اس کی کریمی کی شہادت دوں اور اس کو تحریر میں بھی محفوظ کردوں۔ کیا عجب کہ یہی میرے شکر کی دستاویز بن جائے اور آخرت میں میرے کام آئے۔ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ شَکُوْرٌ ہ

اس وقت میں نے بالخصوص دو قسم کے انعامات خداوندی قلم بند کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ ایک وہ دینی و ایمانی نعمتیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اس گنہگار بندہ کو نوازا، اور دوسرے اُس کے ان مقبول بندوں کی عنایتیں اور شفقتیں جن کو اس سیہ کار نے پایا۔

سب سے پہلے خدا کو گواہ بنا کے قسم شرعی کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اگرچہ اپنی ظاہری زندگی کے لحاظ سے میں دینداروں میں سمجھا جاتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نماز روزہ جیسے فرائض کی ادائیگی اور معصیات سے اجتناب کا ایک گونہ اہتمام بھی نصیب ہے لیکن ارشاد خداوندی "بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ" (انسان اپنے کو خود ہی خوب جانتا ہے) کے مطابق سچی بات یہ ہے کہ میرے اندر ایسے ایسے رذائل اور اللہ تعالیٰ کے اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں اتنی بڑی بڑی کوتاہیاں ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ اُس کی پاداش میں اس دنیا میں پینے کے پانی سے بھی محروم کر دے یا العیاذ باللہ خسف یا مسخ کا فیصلہ فرمادے تو عدل و انصاف کے خلاف نہ ہوگا، لیکن وہ رب کریم ابتداء زندگی سے آج تک انعامات و احسانات کی بارش فرمارہا ہے اور اب تک کے قریباً ستر سالہ تجربہ کی بنا پر امید کا پورا حق ہے کہ انشاء اللہ زندگی کے باقی دنوں میں اور اس کے آگے کی منزلوں میں بھی اُس کا یہی لطف و کرم رہے گا۔ اَللّٰھُمَّ صَدِّقْ فِیْکَ ظَنِّیْ !

اس کے بعد میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے جس احسان عظیم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اُس نے مجھے ایک ایسے گھرانے میں پیدا فرمادیا جس میں دنیوی معیشت کے لحاظ سے خوشحالی کے ساتھ اس کی توفیق سے دینداری اور خدا ترسی بھی تھی۔۔۔ میرے والد ماجد

مرحوم ایک متوسط درجہ کے دولتمند تھے، زمینداری بھی اچھی خاصی تھی اور تجارتی کاروبار بھی خاصا وسیع تھا اور اس میں اچھے کامیاب تھے، اسی کے ساتھ ان کی آخرت کی فکر دنیا کی فکر پر غالب تھی اور وہ کاروبار میں پوری مشغولی کے ساتھ "اَلذَّاکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْراً" (اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے بندوں) میں سے تھے[1]۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ میرے لیے دنیوی تعلیم کے خاص امکانات بلکہ بعض غیر معمولی قسم کی ترغیبات کے باوجود انھوں نے مجھے دینی تعلیم دلانے اور دین کا خادم بنانے کا فیصلہ فرمایا۔

پھر اگرچہ بچپن کی نادانی کی وجہ سے میں خود اس وقت دینی تعلیم کی طرف راغب نہیں تھا اور اس کی وجہ سے پڑھنے کے نام پر برسوں تک صرف وقت ضائع کرتا رہا لیکن پھر اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا، اور میں ایک اچھے محنتی طالب علم کی طرح پڑھنے لگا۔ ذہن اور حافظہ بھی اللہ تعالیٰ نے بہت اچھا دیا تھا، اس لیے طالب علمی کے سفر کا بہت بڑا حصہ تیزی سے طے کر لیا۔ اس زمانہ میں ہمارے دینی مدارس میں تو یہ منطق و فلسفہ اور کلام کا بڑا زور تھا۔ میں نے اس وقت ان فنون کو بھی شغف اور محنت سے پڑھا۔ بہت سی وہ کتابیں بھی ان فنون کی پڑھیں جو کہیں بھی مدارس میں پڑھی پڑھائی نہیں جاتی تھیں اور اب پورے یقین اور بصیرت کے ساتھ یہ رائے ہے کہ ان فنون پر زیادہ وقت صرف کرنا بالکل فضول اور وقت کی صرف اضاعت ہے — یہ بات تو جملۂ معترضہ کے طور پر زبانِ قلم پر آگئی، ورنہ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ میں نے طالبعلمی کا سفر تیزی سے طے کیا، اور جلدی ہی وہ منزل آگئی کہ توفیق الٰہی نے اب سے ٹھیک پچاس[۵۰] سال پہلے ۱۳۴۲ھ

---

[1] مختلف اوقات میں جو اذکار ان کے مستقل معمولات میں داخل تھے ان کی مجموعی تعداد بیس[۲۰] ہزار کے قریب تھی۔ ایک زمانہ میں رات کو بعد نماز عشا کھڑے ہو کر چار ہزار بار درود شریف کا معمول تھا۔ تہجد کے ایسے پابند تھے کہ میں نے ان کے انتقال کے بعد والدہ ماجدہ مرحومہ سے پوچھا کہ کیا ابا جی کا تہجد قضا ہونا آپ کے علم میں ہے تو انھوں نے فرمایا کہ جب میں شروع میں آئی تھی تو کبھی تہجد قضا ہو جاتا تھا لیکن اس دن لازماً روزہ رکھتے تھے مگر ادھر ۳۰-۴۰ سال سے غالباً کبھی قضا نہیں ہوا — والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے [illegible] ھ کو ایسے حال میں انتقال فرمایا کہ ہاتھ میں تسبیح تھی اور ذکر جاری تھا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین۔

میں) علوم دین فقہ اور حدیث و تفسیر کی آخری اور تکمیلی تعلیم کے لیے مجھے دار العلوم دیوبند پہنچا دیا گیا، جو اُس وقت ہندوستان ہی نہیں پورے عالم اسلام میں ان علوم کی تدریس و تعلیم کا عظیم ترین مرکز تھا اور جہاں ان علوم کے وہ ماہر اساتذہ جمع تھے جو اپنے فن میں امتیاز و کمال رکھتے تھے اور ساتھ ہی صلاح و تقویٰ میں اسلاف کا نمونہ تھے ۔۔ یہ امام العصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ کی صدارتِ تدریس کا آخری دور تھا۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے خاص کرم سے اساتذہ کی قدر اور استفادہ کی توفیق بھی بخشی ۔۔ حضرت استاذ کشمیری قدس سرہٗ نے ایک دن درس میں بڑی خوشی کے ساتھ فرمایا تھا کہ ۷ سال کے بعد دورۂ حدیث کی جماعت میں اتنے اچھے طلبہ اس سال جمع ہوئے ہیں۔

تعلیمی سال کے خاتمہ پر جب معمول کے مطابق سالانہ امتحان ہوا تو اس عاجز نے بخاری شریف اور ترمذی شریف سے متعلق سوالات کے جوابات اس طرح لکھے کہ ہر سوال کے جواب میں ایک رسالہ لکھا اور اس کا نام بھی رکھ دیا۔ نتیجہ میں بھی امتیاز حاصل رہا۔

دورۂ حدیث کا یہ پورا سال اس طرح گزرا تھا کہ دن رات کے اکثر اوقات میں حدیث کی کتابوں ہی سے اشتغال رہتا تھا۔

علم حدیث سے جو مناسبت اُس زمانہ میں حاصل ہوئی تھی وہ اللہ تعالےٰ کی بہت ہی بڑی نعمت تھی پھر اُس وقت سے اب تک حدیث پاک سے اشتغال اور اُس کی خدمت کا شغل، کسی نہ کسی شکل میں اللہ تعالےٰ کی توفیق سے برابر نصیب ہے۔ معارف الحدیث کی تالیف بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اللہ تعالےٰ زندگی کے آخری دن تک یہ اشتغال جاری رکھے۔

پھر رب کریم کا یہ بھی خاص فضل و احسان ہے کہ اس دولت عظمیٰ کی قدر و قیمت کا احساس بھی ہے انشاء اللہ ناظرین کے لیے بھی اس کا اظہار مفید ہی ہوگا کہ کبھی کبھی قرآنِ عزیز کی تلاوت اور اس میں تفکر کے وقت یا حدیث پاک میں مشغولیت کے وقت یا نماز یا ذکر یا دعا کی حالت میں جو کچھ نصیب ہو جاتا ہے اس کے سامنے دنیا کے خزانے اور دنیا بھر کی نعمتیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ پھر اللہ کی اس بے نہایت عنایت کے احساس سے دل شکر کے جذبہ سے بھر جاتا ہے اور اس حالت میں اکثر مرحوم والدین کے لیے دعا کی توفیق بھی ملتی ہے کہ انھوں نے میرے حق میں دینی تعلیم

کا فیصلہ فرمایا اور مجھے یہ دولت نصیب ہو گئی ــــ بعض بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی طالب علمی کے زمانہ میں ان کے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ نے تفسیر مظہری کے مصنف (بیہقی وقت حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ) کے سپرد فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ اس کو قرآن سکھا دیجئے ــ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شعر پڑھا کرتے تھے ؎

روح پدرم شاد کہ باستاد مرا گفت
کہ فرزند مرا عشق بیاموز دگر ہیچ

(جاری)

معذرت :- یہ شمارہ بعض غیر اختیاری حالات کی بنا پر ایک ہفتہ لیٹ جا رہا ہے۔ ۸ صفحے بھی کم ہیں انشاء اللہ آئندہ تلافی کر دی جائے گی۔ ــــــــــــ منیجر

شربت رُوح افزا
آپ کے جسم کے اندر ٹھنڈک پہنچاتا
پیاس بُجھاتا ہے، گرمی سے پیدا
تھکن کو دُور کرتا ہے اور آپ کو ا
تازگی دیتا ہے جو دوسرے عام
سے نہیں مل
تازہ پھلوں کے
رس اور سولہ ٹھنڈک
دینے والی جڑی بوٹیوں
سے مرکب
صرف رُوح افزا
گرمی کے مقابلہ کے لیے

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Kutchery Road, Lucknow U. P.

VOL. 41 NO. 3 ~~APRIL, 73~~ Phone No. 25547

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow 1

الفرقان
لکھنؤ
زیرِ ترتیب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

مولانا محمد منظور نعمانی کی ایمان افروز
اصلاحی و تبلیغی تقاریر کا مجموعہ

مرتبہ
محمد حسان نعمانی

Rs. 5

کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
بنگلادیش سے ۸/-
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت فی کاپی ۷۵ پیسے

جلد ۴۱ | بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ مطابق جون ۱۹۷۳ء | شمارہ (۴)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہو، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں۔ یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۰ر جولائی تک آجائے، ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہو گا۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے، جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو۔ اگر ۱۵ر تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اسکی اطلاع ۲۰ر تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہو گی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ——— عتیق الرحمٰن سنبھلی

(گزشتہ سے پیوستہ)

ہمارے مسئلوں کے ساتھ، چاہے وہ مسلم یونیورسٹی کا ہو یا کوئی دوسرا ایسی ایک بنیادی پیچیدگی لگی ہوئی ہے کہ کسی قیادت سے بھی دیکھتے دیکھتے حل کر دینے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ لیکن قدم تو صحیح سمت میں ہو۔ یہ تو نہ ہو کہ سال پہ سال گزر رہے ہیں اور معاملات سب کے سب اپنی جگہ ٹکے ہوئے ہیں، بلکہ جس مسئلہ پر زیادہ زور لگا دیا وہ اتنا ہی اور بگڑ گیا۔ علی گڑھ کا مسئلہ ایک ایسا ہی مسئلہ ہے۔ سنہ ۶۵ء میں جب سے یہ مسئلہ بنا بیچ میں ایک پرسنل لا کا مسئلہ تو ضرور کسی وقت ابھر کر اس کے برابر آگیا ہے ورنہ جب سے اب تک یہی مسئلہ سب سے اوپر اور اس قیادت کی تگ و دو کا خاص محور رہا ہے اور حشر دیکھتے دیکھتے وہ ہو گیا کہ اقلیتی کردار تو رہا الگ جمہوری کردار بھی سلب ہو گیا۔ یعنی یونیورسٹی کے اندرونی نظام کا وہ جمہوری ڈھانچہ بھی ۷۲ء کے ایکٹ میں غائب ہو گیا جو یونیورسٹیوں کا ایک مسلّمہ حق بنا ہوا ہے۔ اور حد یہ ہے کہ عین اُس وقت جبکہ آل انڈیا کنونشن دلّی میں کر کے، اپوزیشن پارٹیوں کی معیّت میں ایک نئی صف آرائی اور نئے نقشِ جنگ کے ساتھ میدان کارگرم کیا جا چکا تھا، جلسوں کے دھاوے خود علیگڈھ تک جا پہونچے تھے کامیابی کا کوئی راستہ کھلنے کے بجائے، یونیورسٹی عین سالانہ امتحان کے موقع پر بند کر دیے جانے کا ایک قصہ اور پیش آگیا۔ اور وہ جنگ جو اقلیتی کردار سے پیچھے ہٹ کر جمہوری کردار پر آگئی تھی اب سر دست صرف اس جگہ ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کھولیے۔

اب ایک راستہ تو یہ ہے کہ حکومت کو کچھ نام رکھیے کہ زیادتیوں پر زیادتیاں کر رہی ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ اپنی قیادت کے طریقِ جنگ پر غور کیجیے کہ آخر ایک سی پسپائی روز کیوں سامنے آ رہی ہے۔ پہلا طریقہ تقدیر کو کوسنے والوں کا طریقہ ہے۔ دوسرا اُن کا ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

یہ دوسرا طریقہ اگر پسند ہو تو بات صاف نظر آنے والی ہے اور وہی ایک ہے کہ اپنے اور مقابل طاقت کے حالات کے فرق کا کوئی لحاظ ہماری قیادت کے اقدامات میں نہیں ہے۔ یہ اپنی طاقت کو تولے بغیر اور کسی قدم کے نتائج کو سوچے بغیر جذبات اور خام خیالیوں کی اس رو میں بہتی ہے جس کے لیے عوام بیچارے بدنام ہیں۔ اس قیادت نے کنونشن کے وقت یہ دیکھ کر کہ حالات مسز اندرا گاندھی اور اُن کی پارٹی کے لیے ناسازگار ہونا شروع ہو گئے ہیں بس ایکدم سے نعرہ لگا دیا کہ اب "جنگ پانی پت" ہوگی۔ ہم اس زیادتی کا بدلہ جو علیگڈھ کے سلسلے میں ہوئی ہے آج کے بعد ہونے والے ہر الیکشن میں کانگریس کے خلاف صف آرا ہو کر لیں گے۔ اور پھر اس صف آرائی کی فضا بنانے کے لیے تقریریں اور جلسے شروع ہو گئے۔

اب تک کے تمام تجربات کو بھلا کر یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ بگڑتے ہوئے وقت میں یہ دھمکی قیامت ڈھا دے گی۔ ادھر حکومت اور پارٹی (کانگریس) کی طرف سے کچھ اشارے بھی یونیورسٹی کے سلسلے میں نیچے اترنے کے، کنونشن سے چند روز پہلے ہی شروع ہو گئے تھے۔ بجائے اس کے کہ ان اشاروں کو سیاست کا ایک کھیل سمجھا جاتا جو ایسے موقع پر مخالف محاذ میں انتشار فکر پیدا کرنے کے لیے کھیلا جاتا ہے، کہا اگرچہ یہی گیا کہ یہ ایک داؤں ہے مگر اندر سے خیال کر لیا گیا کہ کمزوری کی علامت ہے۔ اور پھر چیلنج کا یہ جذبہ اتنا برخود غلط ہوا کہ اب تک کی احتیاط توڑ کر لوگ یونیورسٹی کی یونین میں صدائے جنگ بلند کرنے کے لیے جا پہنچے۔ جیسے اب مستقل آمد و رفت کا دور شروع ہی ہونے والا ہے۔

کنونشن شاید ہو ہی رہا تھا کہ صدر کانگریس یا ایسے ہی کسی بڑے کانگریسی لیڈر کا بہت مصالحانہ سا بیان اخبارات میں آیا۔ روزمرہ کی دید شنید کے ایک صاحب نے جو اس قیادت کے حلقہ بگوش بھی نہیں ہیں اس کا تذکرہ کچھ آس انگیز الفاظ میں ایسے انداز سے کیا جیسے وہ سمجھ رہے ہوں کہ میرا تأثر بھی یہی ہوگا کہ کنونشن سے کچھ دباؤ پڑ گیا۔ میں نے عرض کیا جی تو یہی چاہتا ہے مگر سامنے آندھرا تحریک کا معاملہ موجود ہے۔ لوگوں نے سمجھا تھا کہ اندرا گاندھی جھک گئیں مگر چند ہی دن میں یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ لہٰذا ابھی دیکھیے کوئی امید مت قائم کیجیے۔

واقعہ یہ ہے کہ کچھ پیچھے کے تجربے، جن کا ذکر پچھلی صحبت میں ہم نے کیا تھا، نہ بھی یاد ہے
ہوتے تو آندھرا تحریک کا تجربہ تو ابھی آنکھوں کے سامنے ہی گزر رہا تھا۔ کیا قیامت کی تحریک تھی تحریک
کے قائد آندھرا علاقے کے حکمراں بنے ہوئے تھے۔ عوام تو عوام سرکاری ملازمین تک اُن کے
اشاروں پر چل رہے تھے۔ صوبے کی حکومت تو الگ رہی مرکزی حکومت تک کو کھلی لاقانونیت اور
اس غیر قانونی "حکومت" کے خلاف ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ اور آخر تک نہیں ہو سکی
لیکن قوت برداشت اور اعصابی مقاومت کے مقابلے میں بالآخر تحریک کے قائدوں کو ہار ماننی
حکومت کے لیے حالات یقیناً ناسازگار ہونے لگے تھے۔ یہ بھی ظاہر تھا کہ ایسے حالات میں
اگلے ہی سال آنے والے اتر پردیش کے عام انتخابات کے پیش نظر حکومت اس یونیورسٹی ایکٹ
سے بھی پریشانی محسوس کرے گی جو اُس وقت بے پناہ مضبوطی کے زعم اور جھلاہٹ میں بنا دیا گیا
تھا۔ لیکن چیلنج کر دینے کا اثر تو لازماً یہ ہوتا ہے کہ فریق مقابل اپنی ساکھ کے مسئلے کو جہاں تک ہو سکے
دوسری ضرورتوں پر مقدم کرے۔ اس لیے چیلنج وہی دانشمندانہ ہو سکتا ہے جس کے پیچھے اتنی طاقت
ہو کہ اس جی جان کی لڑائی میں بھی وہ غالب ہو سکے۔ ورنہ بہتری اسی میں ہے کہ معاملہ کو فریق ثانی
کی ساکھ کا معاملہ نہ بننے دیا جائے، اور پھر چیلنج بھی کیا؟ کہ ایک سال بعد جو الیکشن ہونے والا ہے
اس میں کانگریس کو ہرایا جائے گا۔ یعنی حکومت اگر اپنی غلطی کی تلافی کے راستے پر بڑھنا شروع
کرے تو گویا اپنی کمزوری کے احساس کا ثبوت دے کہ ایک سال بعد ہونے والے الیکشن سے متعلق
چیلنج نے بھی اُسے خوفزدہ کر دیا! نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو اگر کچھ تلافی کرنا بھی تھی تو پہلے یہ ضروری
ہو گیا کہ وہ اپنے بارے میں کسی کمزوری کے تأثر کا سدباب کرے۔ یونیورسٹی جس کی یونین کی
کھڑے ہو کر اپنی طاقت کا ایک نیا مظاہرہ اس قیادت کی طرف سے ہوا تھا، اسی آمرانہ انداز
میں بند کرا دی جاتی ہے جو ایکٹ پاس کرنے میں دکھایا گیا تھا۔ تمام طلباء بیک بینی و دو گوش
یونیورسٹی سے باہر۔ یونین معطل۔ ایک درجن لیڈر طلباء خارج۔ کر لیجیے آپ سے کچھ کیا جائے
اب اس قیادت کو معلوم ہوا کہ اس کی طاقت کیا تھی؟ جس پر یہ چیلنج کی زبان بولنے
ہو گئی تھی۔ حکومت (بذریعہ وائس چانسلر) کی اس کارروائی کے درمیان پتہ نہیں کھڑکا، دور
احتجاجی جلسے کیے گئے تو وہ دیکھنے کے لائق تھے۔ ایک جلسہ ہم نے خود لکھنؤ میں دیکھا۔ قیادت

کے سب سے سرگرم اور نمایاں رکن جناب ڈاکٹر عبد الجلیل صاحب فریدی بھی اگلی صف میں تھے۔ حیدرآباد کے صلاح الدین صاحب اویسی (صدر اتحاد المسلمین) بھی تشریف لائے تھے۔ غیر مسلم لیڈروں میں سوتنتر پارٹی کے چیرمین پیلو مودی تھے۔ سوشلسٹ لیڈر راج نرائن تھے "تنظیم کانگریس" کے بنارسی داس تھے وغیرہ وغیرہ۔ مگر مجمع کیا؟ چار پانچ سو! ___ اسی جلسہ میں اعلان ہوا کہ اگر ۳۰ اپریل تک یونیورسٹی نہ کھول دی گئی تو ستیہ گرہ شروع کی جائے گی۔ یہ ستیہ گرہ ملک بھر میں نہیں، صوبہ بھر میں نہیں، صرف ایک شہر لکھنؤ میں، ۱ مئی سے شروع ہوئی۔ بس ایک ہفتہ کے لیے۔ اور گرفتاری دینے والوں کی تعداد جو ایک لکھنؤ کے نہیں، بہت سے ضلعوں کے تھے صرف مسلمان نہیں، اپوزیشن پارٹیوں کے بہت سے غیر مسلم بھی ان میں تھے، کیا تھی؟ ۳۲۳ ___ اور اس کے آگے جو کچھ ہوا اُس کا نہ کہنا ہی بہتر ہے ___ یہ ہے اُس قیادت کی طاقت کا حال جو چیلنج دینے کا شوق کرتی ہے! یہ تین سو تئیس گئے۔ دس بارہ تو جرمانے دیکر آ گئے۔[عہ] باقی کو حکومت نے سزا کی مدت پوری ہونے سے قبل ہی چھوڑ دیا تو وہ چھوٹ کے گھر آ بیٹھے ___ خیریت ہے کہ ۳۱۳ کا مقدس ہندسہ رسوا ہونے سے بچ گیا۔

یہ افسوسناک ستیہ گرہ کیوں کرنا پڑی اس لیے کہ چیلنج دیا جا چکا تھا اور اُس کے بعد یونیورسٹی بند کر دیئے جانے پر ایسا کوئی نہ کوئی کام کرنا ناگزیر تھا! یونیورسٹی تو گئی ہوئی تھی ہی طلباء کا سال بھی گیا اور اپنی آبرو بھی۔

جی کس کا نہیں چاہتا کہ موجودہ حکومت نے امیدیں دلانے کے بعد جیسے جیسے چرکے لگائے ہیں اُن کا بدلہ اسے نیچا دکھا کر لیا جائے۔ لیکن ایسے حالات تو ہر جگہ نہیں ہوتے کہ جتا کر ہی بدلہ لیا جائے۔ بدلہ لینے ہی کا شوق ہے تو اتنا صبر و ضبط اور اتنی گہرائی اپنے اندر پیدا کیجئے کہ مقابل کا فریق، لوگوں کو یقین بھی دلانا چاہے کہ آپ بدلہ لینا چاہتے ہیں تو اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بھول جائیے مسلم یونیورسٹی کا نام لینا اور ایسے تمام مسئلے زبان پر لانا جن کا تعلق خاص آپ کے ساتھ زیادتی سے ہے۔ اُن مسئلوں کے پیرو کار بنئے، جن سے ہندوستان کا عام آدمی بلا تفریق مذہب و ملت پریشان ہے۔ تب ایک مدت کے ریاض کے بعد، "دیوانہ وار ...

عہ سرکاری ترجمان کا بیان قومی آواز ۳۰ جون ۱۹۷۳ء۔

جلد جلد کے بعد وہ دن آسکتا ہے کہ آپ کو نیچا دکھانے کی یہ خوشی حاصل ہو۔ مگر ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم اپنا مسئلہ لے کر اپوزیشن پارٹیوں کے پاس اور اُن کے سہارے سے غیر مسلم عوام کے پاس جاتے ہیں کہ جمہوریت کے ناطے اس کی حمایت کیجیے۔ بہت کرتے ہیں تو اتنا کرتے ہیں کہ کچھ عمومی مسئلے بھی ان لوگوں کی خاطر اپنے ..... مسئلے کے ساتھ لگا لیتے ہیں۔ جیسے کہ اسی یونیورسٹی کی جد و جہد میں جمہوریت بچاؤ کا مسئلہ۔ آمریت اور کلیت ردکو کا مسئلہ اور اشیاء ضرورت کی گرانی اور نایابی کا مسئلہ۔ لیکن اس طریقے سے کہیں بات بنتی ہے؟

یہ تو ہوئی بدلہ لینے کے شوق کی بات۔ لیکن اگر دلچسپی اس کے بجائے مسلم یونیورسٹی کی بازیابی اور ایسے ہی دوسرے حقوق کی یافت سے ہے تو اس کا راستہ ہمارے حالات میں چیلنج ہرگز نہیں ہے۔ گزشتہ سال (مئی کے الفرقان میں) ہم نے اپنے اس مسئلہ پر توجہ دلانے کے لیے مسٹر بھٹو کی اور اُن کے ہم وطن مسلمانوں کی مثال سامنے رکھی تھی کہ ہندوستان کے بارے میں جذبات اُن کے جو کچھ ہوں گے وہ ظاہر ہے، اس کے باوجود حالات کے تقاضے سے جیسا غیر جذباتی رویہ مسٹر بھٹو نے اپنایا ہے اور اُن کے ہم وطن اسے انگیز کر رہے ہیں، وہ سبق لینے کی چیز ہے۔ یہ ہم نے اُس وقت لکھا تھا اور آج مزید یہ لکھنے کا موقع ہے کہ اُس رویہ سے جو فائدہ اُنھیں مل گیا ہے وہ ساری دنیا کے سامنے کھلی ہوئی ٹھوس حقیقت ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے سلسلے میں جو جذباتی رویہ ہمارے پیروکاروں نے اپنے ناموافق حالات کے باوجود اختیار کر رکھا ہے، اُس نے اب تک تو جو نقصان پہنچایا سو پہنچایا، ہمیں ڈر ہے اگر حکومت اپنی موجودہ مشکلات اور ناموافق حالات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی اور اس حالت میں آئندہ سال کا الیکشن آیا، تو ہمارے قائدین کے اس رویہ کی بنا پر یہ عین ممکن ہے کہ اندرا گاندھی اُس طرح کا رویہ اختیار کر لیں جیسا گزشتہ سال بہار کے الیکشن میں بہاری مسلمانوں کے مسئلہ پر انھوں نے اختیار کیا تھا۔ اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہوگا اور اس کی ذمہ داری ہمارے ناخداؤں پر ہوگی۔

اعتذار:- مجھے دلی افسوس ہو کہ اس مضمون کی پچھلی قسط کی آخری سطر میں ایک سخت لفظ بلا ضرورت قلم سے نکل گیا اور احساس چھپنے کے بعد ہوا۔ میں شکر گزار ہوں گا اگر متعلقہ حضرات اسے معاف فرما دیں — عتیق۔

قرآن پر ایمان اور اس کے کچھ تقاضے

مولانا امین احسن اصلاحی

ایک قرآنی تربیت گاہ کے طلباء اور شرکاء سے خطاب

بھائیو! .... اس زمانے میں ایسے انسانوں کی تو کمی نہیں ہے جو ارسطو کی تعریف کے مطابق 'انسان' ہیں اس لیے کہ بہر حال وہ "حیوان ناطق" ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بس حیوان ناطق ہی ہیں، قرآن کی تعریف کے مطابق انسان نہیں ہیں۔ اس لیے کہ وہ بصیرت اور بصارت دونوں سے محروم ہیں۔ فی زمانہ ایسے انسان بہت ہی تھوڑے ہیں۔ جو اصل حقیقت کو سمجھنے کے لیے جد وجہد کریں، اس کے لیے گھر سے نکلیں، اس کے لیے تکلیفیں اٹھائیں، اس کے لیے ان کے اندر ذوق وشوق ہو۔ میں آپ لوگوں کو انھیں میں شمار کرتا ہوں جو ایک نہایت ہی محبوب اور عظیم مقصد کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس ارادے میں خیر و برکت عطا فرمائے اور آپ کو زیادہ سے زیادہ مستفید اور مستفیض ہونے کا موقع دے۔

حضرات! .... میں جو کچھ عرض کروں گا اس کی نوعیت ہرگز تقریر کی نہیں ہوگی بلکہ چند نہایت ہی واضح اور بدیہی حقیقتوں کی تذکیر ہی کی ہوگی یعنی صرف یاد دہانی۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض حقیقتیں اپنی جگہ انتہائی واضح ہوتی ہیں لیکن شاید اپنی شدت وضاحت ہی کی وجہ سے بہت مجہول ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ان کی وقتاً فوقتاً تذکیر ہوتی رہنی چاہیے۔ میری اپنی زندگی کی رہنمائی میں ان حقائق نے بہت مدد کی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر آپ کو بھی انکی یاد دہانی

کرادوں تاکہ آپ حضرات بھی اس سے فائدہ اٹھائیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا ہے اور ضرور ہے اور خدا کے ماننے پر ہر انسان مجبور ہے
جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں وہ ایک بدیہی حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔ میں اس معاملے میں اپنا ا
ذاتی احساس عرض کر دیتا ہوں کہ جب اول اول مجھے اس حقیقت کا شعور ہوا کہ خدا ہے اور ضرور ہے
نیز یہ کہ انسان اس کا انکار نہیں کر سکتا اور اس سے مفر نہیں ہے تو اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی اد
ہوا کہ اس 'ماننے' سے بہت بھاری ذمہ داریاں انسان پر عائد ہو جاتی ہیں۔ جب کبھی میں ان ذمہ داری
کے متعلق سوچتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کا بوجھ میری کمر توڑ دے گا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ کچھ فلسفی
ایسے بھی ہیں جو خدا کا انکار کرتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ مجھے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان کی چیزوں کا
مطالعہ کروں اور صاف طور پر عرض کیے دیتا ہوں کہ بغیر کسی تعصب کے میں نے ان چیزوں کا مطا
کرنا چاہا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر یہ چھپی ہوئی خواہش بھی موجود تھی کہ اگر یہ فلسفی یہ ثابت کر
کہ خدا نہیں ہے تو میں اس کا خیر مقدم کروں گا۔ اس لیے کہ اس طرح بہت بڑے بوجھ سے نجات
مل جائے گی۔ یہ ایک مخفی راز ہے جو میں آپ پر ظاہر کر رہا ہوں، ویسے الحمد للہ مجھ پر الحاد کا کوئی
نہیں گزرا ہے۔ لیکن مجھ پر ایک ایسا دور ضرور گزرا ہے کہ جب میرے اندر یہ خواہش تھی کہ اگر یہ فلس
حضرات خدا کا انکار ثابت کردیں اور مجھے مطمئن کردیں کہ خدا نہیں ہے تو بہرحال ایک اطمینان کا
لینے کا موقع ملے گا۔ اور ایک بھاری بوجھ اتر جائے گا۔ اس خواہش کے تحت میں نے متکلمین کی
کی، منکرین کی، ڈاروِن کی، مارکس کی، فرائڈ کی، غرضکہ ان سب لوگوں کی کتابیں بڑی دلچسپی سے
اور بغیر کسی تعصب کے پڑھیں۔ لیکن میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ ساری چیزیں پڑھنے کے بعد
حقیقت واضح ہوئی کہ — یہ سب خرافات ہیں۔ ایک بدیہی حقیقت سے انکار کی خواہش ان
کام کرا رہی ہے۔ باقی رہ گیا یہ کہ خدا کے انکار کے لیے ان لوگوں کے پاس واقعی کوئی دلیل ہے
کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں۔ جو بات یہ پیش کرتے ہیں، اس سے ہزار گنا مضبوط اور بدیہی
وہ ہے جو قرآن پیش کرتا ہے۔ کہ ایک خدا کو، ایک رب کو، ایک رحمٰن کو، ایک رحیم کو، ایک علیم
ایک خبیر کو، ایک سمیع کو اور ایک بصیر کو مانو۔ اس بات پر عقل بھی گواہی دیتی ہے اور فطرت بھی
دیتی ہے۔ ظاہر بھی گواہی دیتا ہے اور باطن بھی گواہی دیتا ہے۔ آفاق بھی گواہی دیتے ہیں

انفس بھی گواہی دیتے ہیں۔ غرض کہ ایک ایک چیز گواہی دیتی ہے۔ ہمارے متکلم اور ہمارے فلسفی لوگ خدا کے وجود پر اگر کوئی دلیل قائم نہیں کر پاتے تو جانتے ہو کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ دلیل وہاں کام دیتی ہے جہاں دلیل دعوے سے زیادہ واضح ہو۔ لیکن اگر دعویٰ دلیل سے زیادہ واضح ہو تو وہاں دلیل بے کار ہے۔ وہاں دلیل کیا کام کرے گی؟ وہاں ارسطو کی منطق کیا کام کر سکتی ہے؟ وہاں متکلمین کا علم کلام کیا کام کر سکتا ہے؟ سورج کے وجود پر آپ کیا دلیل لا سکتے ہیں؟ چاند کے لیے آپ کیا دلیل لا سکتے ہیں؟ اسی طرح آسمان اور زمین کے وجود پر آپ کیا دلیل لا سکتے ہیں۔ ان چیزوں پر دلیل لانے کی کوشش کرنا درحقیقت حماقت ہے۔ یہ بدیہیات ہیں۔ فطرت کی، آفاق کی، انفس کی، عقل کی سب کی بدیہیات! اس مطالعہ سے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں، وہ محض انکار کرنے کی خواہش کے زیر اثر اندھے اور بہرے ہو گئے ہیں اس لیے کہ وہ جس علت العلل کو، جس محرک اول کو، جس مادہ کو، جس خلیہ کو اس عظیم کائنات کا سبب قرار دیتے ہیں، اس سے زیادہ اور اس سے لاکھ درجہ آسان اور عقل اور دل کے لیے قابلِ قبول بات وہ ہے جو قرآن کہتا ہے۔ میں اس کائنات کو کسی محرک اول کی حرکت کا نتیجہ مان لوں! اس حماقت میں مبتلا ہونے سے زیادہ بہتر یہی ہے کہ میں یہ مان لوں کہ بیشک خدا ہے اور ان ہی صفات کے ساتھ ہے جو قرآن کہتا ہے۔

تو غور کرنے سے معلوم ہوا کہ جو لوگ کا انکار کرتے ہیں، وہ درحقیقت خدا کو ماننے کی جو عظیم ذمہ داریاں انسان کے اوپر عائد ہوتی ہیں اُن سے فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی اور وجہ نہیں ہے۔ اور اس میں واقعۃً کوئی شک نہیں ہے کہ خدا کو ماننے کے بعد جو عظیم ذمہ داریاں انسان پر عائد ہوتی ہیں۔ وہ بڑی اہم ہیں۔ بڑی مشکل ہیں، بڑی کٹھن ہیں اور بڑی دشوار ہیں۔ اس راہ میں آگے بڑھنا صرف اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب کہ آدمی سر ہتھیلی پر رکھ کر آگے بڑھے۔ اس میں حضرت یحییٰؑ کی طرح سر کٹوانا پڑتا ہے، حضرت مسیحؑ کی طرح سولی پر چڑھنا پڑتا ہے، حضرت ابراہیمؑ کی طرح آگ میں کودنے کے لیے تیار ہونا پڑتا ہے اور ان تمام مراحل اور مقامات سے گزرنا پڑتا ہے جن مراحل اور مقامات سے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ گزرے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے ہر شخص ہمت نہیں رکھتا اور اسی لیے لوگ

گریز اختیار کرنا چاہتے ہیں .... لہٰذا وہ صاف صاف انکار کر دیتے ہیں کہ ہم ان جھگڑوں
ہی میں نہیں پڑتے۔ وہ ان بدیہی حقیقتوں کو "موہوم" کہہ کر گویا ذمہ داریوں سے بچنے کا آسان
راستہ نکال لیتے ہیں۔ اور جو لوگ مانتے ہیں جیسے کہ ہم اور آپ۔ ہماری قوم۔ وہ درحقیقت اقرار مع
انکار کی پالیسی اختیار کر لیتے ہیں۔ خدا کو مانتے ہیں، لیکن خدا کو ماننے کے جو تقاضے ہیں، اُن میں سے
کسی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ پھر اس کے بعد تقاضوں سے فرار کے لیے طرح
طرح کے حیلے اور بہانے اختیار کر لیتے ہیں۔ بڑے فخر اور تعلّی کے ساتھ خدا کا اقرار بھی کرتے ہیں
لیکن زندگی کے کسی مرحلے میں خدا کے اقرار کے تقاضوں کو پورا کرنے اور خدا کے احکام پر بے چون و چ
عمل کرنے پر تیار نہیں ہوتے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر دوسرے صریح اور کامل انکار
میں مبتلا ہیں تو یقیناً ہم بھی اقرار مع الانکار میں مبتلا ہیں۔ اور ہماری پوری قوم مبتلا ہے۔

اصل چیز یہ ہے کہ خدا کو مانئے تو خدا کو ماننے کے جو مطالبے ہیں، جو تقاضے ہیں جو تضمنات
ہیں، جو مضمرات ہیں، جو لوازمات ہیں، جو نتائج ہیں، اُن کا مواجہہ کرنے کے لیے تیار رہیے۔ حقیقت
سے گریز کی پالیسی نہایت بزدلانہ بلکہ منافقانہ ہے۔ اور قرآن کے مطالعے میں جس نتیجہ پر پہونچ
ہوں، وہ یہ ہے کہ مآل کے لحاظ سے کفر اور نفاق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے مابین فرق
صرف ظاہر کا فرق ہے۔ نتیجہ کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا انجام ایک ہے۔ تو جو لوگ
انکار میں مبتلا ہیں وہ تو انکار میں مبتلا ہیں ہی، لیکن جو لوگ اقرار والے انکار میں مبتلا ہیں تو واقعہ یہ
کہ وہ صریح نفاق میں مبتلا ہیں۔ اب اس صریح نفاق کو اپنے اندر سے نکالنا ایک بڑا معرکہ ہے، او
دوسروں کے اندر سے نکالنا اس سے بھی بڑا معرکہ ہے۔ اللہ جن کو ہدایت بخشتا ہے وہ نفاق کو اپنے
اندر سے نکال سکتے ہیں، اور جن کی ہدایت میں، جن کی توفیق میں زیادتی فرماتا ہے وہ دوسروں
اس کو دور کرنے کی سعی اور جدوجہد کرتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے بڑی سخت بازی کھیلنی پڑتی ہے۔ حاصل
کلام یہ ہے کہ حقیقت سے گریز کی پالیسی بالکل غلط ہے۔ حقیقت کا مواجہہ کیجیے۔ اور پوری جرأت
ساتھ مواجہہ کیجیے اور وہی بندے مبارک بندے ہیں جو یہ کام کریں۔ اللہ تعالیٰ کو بہت ساری بھ
مطلوب نہیں، وہ تو کھرا چاہتا ہے۔ ایسے تو وہ بندے پسند ہیں جو اس کو اس طرح مانیں جیسے کہ اس
ماننے کا حق ہے۔ مولویوں کی زبان میں سننا چاہیں تو سنئے کہ "مانیں ماننا کر" سر دینے کے لیے تیا

ہو کر مانیں۔ یوحنا و مسیح کی طرح مانیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے طریقہ سے مانیں۔ باقی اس کے سوا دوسرا طرز عمل مہمل و خرافات ہے۔

پس حق کو جانئے، حق کو سمجھئے، حق کا علم حاصل کیجئے، حق کی معرفت حاصل کیجئے اور پھر اس حق کو اپنے اوپر قائم کرنے کے لیے اور دوسروں پر قائم کرنے کے لیے اپنے اندر صبر اور عزیمت پیدا کیجئے۔ اسی حق اور اسی صبر پہ حقیقت میں صحیح زندگی قائم ہوتی ہے۔ جہاں تک حصول علم و معرفت کا تعلق ہے تو یہ زیادہ مشکل کام نہیں۔ نبیوں کی تعلیم، نبیوں کے صحیفے، اللہ کا شکر ہے موجود ہیں۔ اللہ کی آخری کتاب قرآن بتمام و کمال موجود ہے، آخری نبی کی سنت موجود ہے، صحابہؓ کی زندگی موجود ہے۔ اگر آپ جاننا چاہیں اور آپ میں جاننے کا شوق اور طلب ہو، جس طرح زندگی کی اور طلبیں ہیں، تو یہ کام بہت مشکل نہیں ہے۔ لیکن صبر کا معاملہ بہت مشکل ہے۔ یہ میری زندگی کا تجربہ ہے کہ صبر کا معاملہ واقعی بہت مشکل ہے، عزیمت کا معاملہ بہت مشکل ہے۔ میں اس صبر کے متعلق عرض نہیں کر رہا ہوں جس کے کھوکھلے وعظ ہمارے منبروں سے ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ صبر حقیقی، عزیمت، استقامت سے میری مراد یہ ہے کہ اللہ کو ماننے اور حق کو تسلیم کرنے کے جو حقیقی تقاضے ہیں اُن کو پورا کیا جائے۔ جس حق کو قبول کیا جائے اُس کی اپنے قول و عمل سے شہادت بھی دی جائے۔ یہ ہر مومن کا فرض ہے۔ اولین فرض ہے۔

جس شخص میں حق کی طلب نہ ہو، حق کا علم حاصل کرنے کا شوق نہ ہو۔ اُسے آپ ارسطو کی تعریف کے مطابق انسان کہہ دیجئے لیکن میں تو اسے دو ٹانگوں پر چلنے والا جانور ہی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک وہ حقیقت میں انسان نہیں ہے۔ انسان وہ ہے جس میں حق کی طلب ہو، جس کا عظیم داعیہ انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ جس کے اندر یہ داعیہ نہیں ہے وہ مردہ ہے۔ وہ آدمی نہیں ہے، بلید ہے اور جانور سے بھی زیادہ بلید ہے[۲]۔ لہذا اس حق کو قائم کرنا بہت بڑی سعادت ہے۔ پہلے تو اس حق کو اپنے اوپر قائم کیجئے۔ اس لیے کہ جس نے اپنے اوپر اس حق کو قائم نہیں کیا، اس کا حق کی شہادت دینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہونا فضول کام ہے۔ ایسے کھوکھلے سینوں کی شہادت کچھ کارگر نہیں ہوتی۔ بالکل بے کار ہوتی ہے۔ صرف اُن ہی لوگوں کو حق کی شہادت پیش کرنے کا حق ہے

---

[۱] اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ　　[۲] بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔

جو حق کو پہلے اپنے اوپر قائم کرلیں۔ اور اچھی طرح جان لیجیے کہ حق کی شہادت دینا بھی فرض ہے
حق کو جاننے والے اور علم صحیح رکھنے والے کے لیے میں دین میں اور قرآن کے تیس پاروں میں کہیں
کوئی گنجائش نہیں پاتا کہ اسے حق کی شہادت دینے سے مفر ہو۔ شہادت حق اس پر واجب ہے۔ لازم
ہے، فرض ہے، دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، جس حد تک ممکن ہو حق کی شہادت دیجیے۔

لیکن جب شہادت کا مرحلہ آتا ہے تو بڑی مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اس کے لیے بسا اوقات
ایسے لوگوں کے کانوں میں حق کی آذان دینی پڑتی ہے جن کے کانوں میں یہ آذان دینا کوئی
آسان کام نہیں ہوتا۔ بڑے عزیز تعلقات اس کے لیے منقطع ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے عزیز رشتے
اس کے لیے کٹ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے محبوبوں کی دوستی اس کے لیے قربان کرنی پڑتی ہے۔ اور
بسا اوقات سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ آخری چیز جان ہے۔ اس کی بھی نذر گزارنی پڑتی ہے۔ اور
صاف سن لیجیے کہ اگر آپ جان کو عزیز رکھتے ہوں تو اس راستے میں بالکل قدم نہ رکھیے۔ یہ وہ
راستہ نہیں جس میں آسانیاں ہوں۔ اس راستہ میں بڑی مشکلات ہیں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں
ہے کہ میں ان تمام مشکلات کو بیان کروں۔ آپ قرآن کریم کا جو درس حاصل کریں گے اُن سے
مشکلات معلوم ہو جائیں گی۔

لیکن میرے عزیز دوستو! ایک بات میں آپ کو ضرور بتانا چاہتا ہوں، اور کاش میں اسے
اچھی طرح آپ کو سمجھا بھی سکوں۔ وہ بات یہ ہے کہ 'صبر' کہنے کے لیے بہت آسان ہے لیکن کرنے
کے لیے بہت مشکل ہے۔ اور پھر یہی وہ چیز ہے جس پر صحیح زندگی استوار ہوتی ہے۔ جہاں تک اہل حق
کا تعلق ہے۔ شہادت حق دینے والے لوگوں کا تعلق ہے۔ ان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ صبر کی
بنیاد ایک علمی حقیقت پر ہے۔ ایک حکمت پر ہے۔ جب تک وہ حقیقت و حکمت پوری طرح
واضح نہ ہو، اس پر علم الیقین اور حق الیقین نہ ہو تو اس وقت تک صبر کرنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ حقیقت
و حکمت یہ ہے کہ آپ کے راستہ میں جو کچھ پیش آئے گا وہ اللہ کے ارادہ اور مشیت کے تحت
پیش آئے گا۔ اللہ کے ارادہ اور مشیت کے سوا اس دنیا میں اور کوئی ارادہ اور مشیت کارفرما
نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر ارادہ میں خیر مضمر
ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمیں اس کا خیر معلوم نہ ہو۔ اسی حقیقت کو سمجھنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام

حضرت خضر کی تلاش میں نکلنے کا حکم ہوا۔ اس کو خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جب تک آپ اس حقیقت کو مستحضر نہیں رکھیں گے آپ کی اندرونی زندگی میں اور آپ کی خارجی زندگی میں ایسے ایسے فتنے پیش آئیں گے کہ شیطان آپ کو لوٹا دے گا، آپ کے قدم متزلزل ہو جائیں گے۔ لیکن اگر اس حقیقت پر آپ کا مضبوط یقین ہے کہ جو ہوگا خدا کے ارادہ سے ہوگا اور خدا کا ارادہ ہمیشہ خیر اور حکمت ہی پر مبنی ہوتا ہے تو آپ یقین کریں کہ آپ بڑے سے بڑے مشکل مرحلہ میں بھی ثابت قدم رہیں گے۔ رہی یہ بات کہ خدا کا ہر ارادہ خیر پر مبنی ہے اور خدا کے ارادہ کے سوا کوئی دوسرا ارادہ اس کائنات میں کارفرما نہیں ہے تو یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ جو اس کو نہیں مانتا وہ مومن نہیں۔ اس کو سمجھنے کی دو شکلیں ہیں، یا یہ کہ ہر کام کی حکمت ہمارے اوپر عیاں اور واضح ہو جائے۔ جس کا کوئی امکان نہیں۔ اس لیے کہ ہم خدا تو نہیں بن سکتے۔ ہم بندے ہیں۔ ہمارا علم محدود ہے۔ یا پھر یہ کہ ہم اس بات پر یقین رکھیں کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے اس میں خدا کی حکمت مضمر ہوتی ہے۔ کچھ کی حکمت ہماری سمجھ میں آجاتی ہے اور کچھ کی حکمت اپنے محدود علم کی وجہ سے ہم سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لیکن یہ بات کہ ہر کام میں خیر و حکمت پوشیدہ ہوتی ہے تو اس پر پورا پورا ایمان اور یقین رکھیں۔ خدا چاہے گا تو وہ آپ پر حکمت بھی واضح کر دے گا، لیکن حکمت جاننے کے لیے ہم کو بے صبر نہیں ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اس راستہ میں آپ دیکھیں کہ ظالموں کی گرتی ہوئی دیوار، باغیوں اور طاغیوں کے گرتے ہوئے دستار کو سنبھالا دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں بھی خدا کی حکمت ہی کارفرما ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس راستہ میں آپ دیکھیں کہ اہل حق مظلوم ہیں، مقہور ہیں، ان کو ستایا جا رہا ہے، ان کو دکھ دیا جا رہا ہے، وہ فاقے کر رہے ہیں۔ یہ باتیں بھی آپ دیکھیں اور اس پر بھی یقین رکھیں کہ اس میں بھی خدا کی کوئی حکمت ہو گی۔ یہاں مسکینوں کی کشتی میں سوراخ کرا دیا جاتا ہے تو اس کے اندر بھی حکمت مضمر ہوتی ہے۔ ظالموں اور باغیوں کی دیوار اونچی کرا دی جاتی ہے تو بہر حال اس دیوار کے نیچے غریبوں اور یتیموں کا خزانہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ ظالموں اور طاغیوں کو جو مہلت دی جاتی ہے، اس کے اندر کیا کیا حکمتیں ہیں تو ان میں سے کچھ کا اندازہ آپ کو قرآن مجید کے مطالعہ سے ہوگا اور اصل حقیقت تو قیامت کے دن ہمارے سامنے آئے گی۔

بہر حال ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اس بات پر ایمان رکھیں کہ اگر حق کی راہ میں کسی پر ظلم ہوتا

ہے تو اسی کے اندر حکمت ہے۔ اسی کے اندر بہتری ہے۔ اسی کے اندر خیر ہے۔ اسی کے اندر فلاح ہے اور اسی کے اندر کامیابی ہے۔ اور اگر ظالموں کو، طاغیوں کو، سرکشوں کو، نافرمانوں کو، باغیوں کو، غافلوں کو، اور بے پرواؤں کو خدا کی طرف سے ڈھیل دی جاتی ہے تو اس کے اندر بھی حکمت ہے، اس پر بھی پورا یقین رکھئے۔ اگر آپ اس بنیادی حقیقت کو پیش نظر رکھیں گے تو یہ چیز ہمیشہ شیطان کے مقابلے میں آپ کو پناہ میں رکھے گی۔ آپ ثابت قدم رہ سکیں گے۔ اور اگر اس سے غفلت ہوگئی تو شیطان آپ کو ٹھوکر کھلائے گا اور آپ کو دھوکہ دے گا۔ لہٰذا یہ بڑی بنیادی چیز ہے جو آپ کو ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔

دوسری ایک اور بات بھی میں آپ کے سامنے واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہم کو اور آپ کو اس دُنیا میں اپنا موقف اور مقام بھی طے کر لینا چاہیے کہ ہم اس دُنیا میں "کیا" ہیں؟ خالق ہیں؟ ظاہر ہے کہ خالق نہیں ہیں، مخلوق ہیں۔ مالک ہیں؟ ظاہر ہے کہ مالک نہیں، مملوک ہیں۔ ہمارا صحیح موقف اور صحیح مقام جو قرآن مجید میں سورۂ حدید میں بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ہم مُستخلَف ہیں مُستخلِف نہیں ہیں مُستخلَف کا مفہوم اگر آپ اُردو میں سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھ لیجیے کہ ہم امین ہیں۔ ہمیں جتنی قوتیں، صلاحیتیں، اور ذہنی و دماغی قابلیتیں اور جسمانی توانائیاں ملی ہیں، جو مال و دولت، اسباب، سامان، ذرائع اور وسائل ملے ہیں ہم اُن سب کے امین ہیں مالک نہیں۔ اور جب ہم امین ہیں تو ظاہر بات ہے کہ ہمیں ہر امانت کے لیے جواب دہی کرنی ہو ایک ایک چیز کے متعلق حساب دینا ہے۔ امانت دینے والے نے جس حد تک اختیار دیا ہے بیشک اُس اختیار کے دائرہ کے اندر ہم اختیار استعمال کرنے کا حق رکھتے ہیں، لیکن اس کے باہر رتی برابر بھی ہٹے تو اُس کا حساب دینا ہوگا، جواب دہی کرنی ہوگی اور نتیجہ بھگتنا ہوگا اور کسی ایسے ویسے سے نہیں بلکہ اُس ہستی سے بھگتنا ہوگا جو ذرہ ذرہ کا علم رکھتی ہے۔ پھر یا تو اس بات کا انکار کر دیجیے کہ آپ مستخلف نہیں ہیں بلکہ مالک ہیں۔ ورنہ اپنے سمع پر، اپنے فواد پر، اپنے بصر پر، اپنی ایک ایک چیز پر پہرہ بٹھائیے، اپنی زبان پر بھی پہرہ بٹھائیے، یہ آپ کی زبان کس کی ترجمان ہے؟ یہ آپ کی عقل کی ترجمان ہے۔ یا آپ کے بطن و فرج کی ترجمان ہے! ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت عقل کی ترجمان ہے۔ ہم نے اس کو بطن اور فرج کا غلام بنا کر رکھ دیا ہے۔ اگر موقع ہوتا تو میں تفصیل سے

آپ کو بتا تا کہ ہماری شاعری، ہمارا ادب اور ہمارا لٹریچر بالکل........ مہمل، گندی، ناپاک اور لغو چیستر بن کر رہ گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شمشیر جوہر دار جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی تھی، اس تلوار سے ہم نے گھانس کاٹنے کی درانتی کا کام لینا شروع کر دیا ہے۔

بہرحال اس بات کو ملحوظ رکھیے کہ ایک ایک چیز کے آپ مسئول ہیں۔ ذمہ دار ہیں۔ جو شخص اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر زندگی بسر کرتا ہے، اُس کے قدم جادۂ حق پر استوار رہتے ہیں اور جہاں اس حقیقت سے غفلت ہوئی وہیں وہ فوراً مار کھا جاتا ہے۔ تو اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھیے۔ اس موقف کو، اپنے مقام کو، اپنے درجہ کو، اپنے مرتبے کو کبھی فراموش نہ کیجیے اور اگر اس کے انکار کی آپ میں ہمت ہے تو میں کسی ایسے دوست کا خیر مقدم کروں گا جو مجھ پر ثابت کرنے کہ اس کے انکار کی عقلی دلیل موجود ہے اور اس کی گنجائش ہے۔ کم از کم قرآن مجید میں، جس پر آپ کا ایمان ہے، اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اگر یہ قرآن قبروں پہ کے اوپر پڑھ کر صرف ایصالِ ثواب کے لیے ہے، تب تو میں کچھ نہیں کہتا۔ ان لوگوں کی قبروں پر بھی پڑھ کر اس کے ذریعہ ایصالِ ثواب کیجیے کہ جنھوں نے ساری عمر کبھی قرآن کو ہاتھ تک نہ لگایا ہو۔ لیکن اگر قرآن زندگی کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے ہے جیسا کہ فی الواقع وہ ہے، حق بتانے کے لیے ہے، صراطِ مستقیم پر گامزن رکھنے کے لیے ہے۔ مآلِ کار شعور دینے کے لیے ہے۔ تب میں یہ کہتا ہوں کہ آپ کا مستقر، آپ کا مقام اور آپ کا موقف اس قرآن میں یہی بیان کیا گیا ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔ اگر کوئی صاحب اس کے برعکس مجھے کوئی بات سمجھا سکیں تو میں ان کا خیر مقدم کروں گا۔ یہ بات بڑی تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت تھی لیکن میں نے مختصراً عرض کیا ہے۔ چونکہ مجھ میں زیادہ بولنے کی طاقت نہیں ہے۔

عزیزو! اب ایک حقیقت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس کو آپ ہمیشہ پیش نظر رکھیے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ ہر ابن آدم اور بنت حوّا اس دُنیا میں محاذِ جنگ پر ہے، اور بڑے شاطر دشمن کے مقابلہ میں محاذ جنگ پر ہے۔ بڑے کائیاں دشمن کے مقابلے میں۔ جس نے خدا کو یہ چیلنج دے رکھا ہے کہ "اگر تو مجھے مہلت دے تو میں اس انسان کے داہنے سے، بائیں سے، آگے سے، پیچھے سے، اس کے آرٹ سے، ادب سے، لٹریچر سے، ثقافت سے، کلچر سے، غرضیکہ ہر پہلو سے، اس پر کھا دھا تاخت کروں گا، اور اسے تیری صراطِ مستقیم سے ہٹا کر چھوڑوں گا۔ اس کو گمراہ کر کے

رہوں گا اور ثابت کر دوں گا کہ اس کو میرے اوپر کوئی فضیلت نہیں ہے۔" اللہ تعالیٰ نے اس شان
کے ساتھ جو اسی کو زیبا ہے، جواب میں فرمایا کہ "جا تجھے مہلت دی گئی، جس کو تو بہکا سکتا ہے،
بہکا لے۔ جو تیرے پیچھے لگ جائیں گے میں اُن سے اور تجھ سے، تیری ذریت سے، تیرے اولیاء سے
جہنم کو بھر دوں گا۔" یہ قرآن مجید کی ایک واضح حقیقت ہے۔ قرآن حکیم میں قصۂ آدمؑ و ابلیس
صرف حکایت سنانے کے لیے نہیں بلکہ ایک حقیقت بیان کرنے کے لیے ہے۔ اس کی بیشمار حقیقتوں
میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ آپ اچھی طرح یہ سمجھ لیں کہ آپ اس دنیا میں ایک بڑے شاطر اور
کائیاں دشمن کے مقابلہ میں محاذ جنگ پر ہیں، اور دشمن چالاک و مکّار ہونے کے ساتھ طاقت ور
بھی ہے۔ اس نے جس وقت انسان کو گمراہ کرنے کا چیلنج کیا تھا اور مہلت مانگی تھی تو اس کے چیلے
چاٹنے گنتی کے ہوں گے لیکن آج تو اس کی فوج بے شمار ہے۔ پھر اس کی فوج میں ایسے ایسے کائیاں
لوگ پیدا ہو گئے ہیں کہ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ وہ آج خود ابلیس کے کان کتر سکتے ہیں، ابلیس کو بھی
فلسفہ پڑھا سکتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ کائیاں ہیں۔ اب ابلیس کو خود کچھ کرنے کی خاص ضرورت
نہیں ہے، اس سے زیادہ شاطر اس کے شاگرد ہیں۔ اگر تفصیل کا موقع ہوتا تو میں ان شاگردوں کے
کرتوتوں کو ایک ایک کر کے آپ کے سامنے رکھتا اور آپ کو اپنی بات پوری طرح سمجھا دیتا۔ اچھا! یوں
سمجھ لیجیے کہ یہ شاگرد آج آرٹ کے نام سے، ادب کے نام سے، لٹریچر کے نام سے، ثقافت کے
نام سے، کلچر کے نام سے، فیشن کے نام سے، تہذیب کے نام سے، پیٹ کے نام سے، سکس کے نام
سے، جمہوریت کے نام سے، عوام کے نام سے، خود اسلام کے نام سے، اور نہ جانے کس کس نام سے خدا
کی خلق کو گمراہ کر رہے ہیں اور ابلیس کے کان کتر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ابلیس بھی شاید قیامت کے دن
چیخ اٹھے گا کہ بے شک تم نے مجھے بھی مات دے دی۔ میں بھی تم سے یہ توقع نہیں رکھتا تھا۔ بس اے بھائیو
ایسے چالاک دشمن اور اس کے ایسے لاؤ لشکر کے مقابلہ میں آپ محاذ جنگ پر ہیں۔ جو سپاہی محاذ جنگ
پر ہے وہ واقعہ یہ ہے کہ بدبخت ہے، بدقسمت ہے، نالائق ہے اگر وہ اتنا غافل ہو کر اور گھوڑے بیچ کر
سو جائے، گھوڑے بیچ کر سونے کا کیا موقع ہے؟ جن لوگوں کی صفت یہ تھی کہ وہ دن کو گھوڑے کی پیٹھ
باطل سے پنجہ آزمائی کرتے تھے اور اللہ کی کبریائی کی شہادت دینے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتے تھے ان
پھر رات کو مصلے پر اپنے آقا کے حضور کھڑے ہوتے تھے۔ اُس سے مناجات کیا کرتے تھے۔ وہ آخ

کلمے کو جاگتے تھے ؛ ان کو آخر کونسا غم تھا ؛ بس ان کو اگر فکر تھی تو یہی کہ بڑے کائیاں دشمن سے مقابلہ ہے، بڑے شاطر دشمن سے سابقہ ہے، جس کے ایجنٹ شیطانوں میں بھی ہیں جنوں میں بھی ہیں اور خود انسانوں میں بھی ہیں، اور جیسا کہ میں عرض کر چکا آپ کو تو بڑے خطرہ کا سامنا ہے۔ اس زمانہ میں تو ابلیس کے بڑے ہوشیار، چالاک ایجنٹوں کا پورا کا پورا لاؤ لشکر آپ کے داہنے بائیں، آگے اور پیچھے موجود ہے لہذا آپ کے لیے تو از حد ضروری ہے کہ آپ کسی وقت غافل نہ ہوں، ہر وقت جاگتے رہیں، ہر وقت ہوشیار رہیں، چوکس اور چوکنے رہیں۔ محاذِ جنگ پر جس طرح سپاہی سوتا ہے اسی طرح سوئیں۔ جس طریقہ سے جاگتا ہے اسی طریقہ سے جاگیں۔ یہ اللہ کو معلوم ہے کہ اس کے مقابلہ میں بالآخر جیتے گا کون ؛ اور ہارے گا کون ؛ لیکن آدم کی ناخلف اولاد ہوگا وہ جو اس حقیقت سے غافل ہو۔ یاد رکھیے کہ اس کی یہ غفلت اس کو شیطان کے مقابلے میں چاروں خانے چت کر دے گی۔

پس، میرے عزیزو! جاگتے رہو، آگاہ رہو۔ رات کو بھی، دن کو بھی، سوتے وقت بھی، جاگتے وقت بھی، ہر وقت ہوشیار رہو، دائیں بائیں، آگے پیچھے، ہر سمت اور ہر طرف سے چوکنے رہو۔ اگر آپ اس حقیقت کو یاد رکھیں گے تو آپ صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں گے۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ محاذِ جنگ پر ہر سپاہی کو ہتھیار کی ضرورت ہوتی ہے اور آپ کو بھی ہتھیار درکار ہے۔ یہ ہتھیار کیا ہے؟ تو جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کے چیلنج کے جواب میں جو بات ارشاد فرمائی تھی، وہی ارشاد آپ کے لیے ہتھیار اور وہی چیز آپ کے لیے نسخۂ علاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ

"جا میں انسانوں کی رہنمائی اور مدد کے لیے اپنی ہدایت اور اپنی کتاب نبیوں اور رسولوں کے واسطے سے نازل کروں گا۔ جو لوگ میری کتاب (اور میرے انبیاء و رسل کی سنت کو) کو مضبوطی سے پکڑے رہیں، ان کو تو ہرگز گمراہ نہیں کر سکے گا ہاں جو میری ہدایت کو چھوڑ دیں گے تو ان پر تیرا جادو بے شک چل جائے گا۔"

پس شکر کیجیے کہ شیطان کے مقابلے میں آپ کے پاس اللہ کی آخری کتاب کمال و تمام موجود ہے، اس کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑیے۔ اس کو ایصالِ ثواب کا نسخہ نہ سمجھ لیجیے۔ بلکہ اس کے ایک ایک لفظ کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اس کے اوامر و نواہی کو معلوم کیجیے۔ اس کے احکام اور ان کی حکمتوں کو جاننے کی سعی کیجیے۔ اس کی دعوت کا شعور حاصل کیجیے۔ برے اعمال، نافرمانی، سرکشی، طغیان و بغاوت

سے کے ہولناک انجام سے آگاہی حاصل کیجئے اور ساتھ ہی ساتھ جو کچھ علم حاصل ہوتا ہے اس پر عمل کی جد و جہد شروع کیجئے۔ اور دوسروں تک قرآن کی دعوت کو نہایت دلسوزی کے ساتھ پہونچانے کی فکر کیجئے۔ اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیجئے۔ اس کا حق اسی طرح ادا ہوگا۔ اس کو مضبوطی سے تھام لینے کا یہی مطلب اور مفہوم ہے۔ اس کے برعکس طرز عمل اللہ کی کتاب کے ساتھ مذاق ہے۔ اس کی محبت کا دعویٰ لاف زنی ہے، بے وزن ہے، بے حقیقت ہے جس کا پتہ آخر کار روزِ حساب چل جائے گا۔

(بشکریہ میثاق۔ لاہور)

افاداتِ قاسمیہ

از امام کبیر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی
(مرتبہ مولانا سعید احمد صاحب پالنپوری، استاذ دار العلوم اشرفیہ)
(راندیر ضلع سورت)

تمہید: حجۃ الاسلام حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: "امت میں چار عالم —— امام غزالی، محی الدین ابن عربی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی —— ایسے گزرے ہیں جن کی تصانیف کے ساتھ مزاولت سے آدمی اگر غبی بھی ہو تو ذہین ہو جاتا ہے" —— حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ مذکورہ مقولہ نقل فرما کر ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ: "پانچویں کا میں اضافہ کرتا ہوں اور وہ ہیں" حضرت الاستاذ" یعنی حضرت نانوتوی رحمہ اللہ (دیباچہ مصابیح التراویح صفہ)

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ "قاسمی تبرکات" سہل الحصول نہیں ہیں، علوم قاسمیہ کے کما حقہ سمجھنے کے لیے کئی فنون سے مناسبت ضروری ہے۔ اس ہیچ میرز کی عرصہ سے خواہش ہے کہ حضرت رحمہ اللہ کے علوم کی تشریح و تدوین کروں۔ آج سے بنام خدا یہ سلسلہ شروع کرتا ہوں، اہل علم سے درخواست ہے کہ حضرت قدس سرہ کے علوم سے استفادہ فرمائیں اور حضرت رحمہ اللہ کی کتابوں پر گہری نظر رکھنے والے بزرگوں سے التماس ہے کہ اگر کسی جگہ تسامح ہو جائے تو رہبری فرمائیں۔

طریقہ کار یہ رکھا گیا ہے کہ عنوان اور سوال خود تجویز کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اگر حضرت قدس سرہ کی عبارت سلیس اردو میں ہے تو جواب میں اسے بعینہ مع حوالہ درج کیا گیا ہے، اور اگر فارسی ہے یا خالص علمی اصطلاحات میں ہے تو اس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھا گیا ہے پھر حضرت رحمہ اللہ کی عبارت مع حوالہ نقل کی گئی ہے۔ واللہ ولی التوفیق —————— (مرتب)

۱:- زیارت قبور

سوال: (۱) مردوں کے لیے زیارتِ قبور جائز ہے یا نہیں؟

(۲) عورتوں کے لیے کیا حکم ہے؟

(۳) بعض روایات میں زیارت قبور کے لیے جانے والی عورت پر لعنت کی گئی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟

جوابات۔ (۱) مردوں کے لیے زیارت قبور مسنون ہے، سنّت پر عمل کی نیت سے قبروں کی زیارت کرنا چاہیے ـــ یعنی یہ کہ زیارتِ قبور اور اس کی اجازت آنحضرتؐ سے ثابت [۱] ہے اور اس سے آپؐ کا منشا تھا کہ موت کی یاد دہانی اور عبرت حاصل ہو۔ ان شاء اللہ مناسب اجر و ثواب ملے گا۔

"زیارت قبور مرداں را مسنون است، کہ بہ نیت ادائے سنت ـــ کہ ہماں طریقہ مرویست و بہر عبرت و تذکر موت تجویز کردہ شد ـــ زیارتِ قبور خواہند کرد، ان شاء اللہ تعالیٰ اجر مناسب خواہند یافت۔" (فیوض قاسمیہ ص۲۲ مطبوعہ اعزازیہ دیوبند)

(۲) عورتوں کے لیے احتراز (بچنا) ضروری ہے، کیونکہ زیارت قبور کے لیے جانے والی عورتوں پر احادیث میں اللہ کی لعنت (رحمت سے محرومی) وارد [۲] ہوئی ہے۔

"آرے! دربارہ زناں کہ بہرِ زیارتِ قبور روند لعنت خدا در احادیث مرویست بنا بر علیہ زناں را احتراز ضروری است۔" (حوالۂ بالا)

---

[۱] حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:

كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا فَإِنَّهَا تُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا وَتُذَكِّرُ الْآخِرَةَ۔ (ابن ماجہ)

"میں نے تمھیں قبروں کی زیارت سے روکا تھا، پر اب زیارت کرو قبروں کی کیونکہ زیارت قبور سے دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی ہے اور آخرت یاد آتی ہے۔" (ابن ماجہ)

[۲] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کے لیے جانے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ زَوَّارَاتِ الْقُبُوْرِ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

(۳) صریح حکم سن لینے کے بعد مؤمن کے لیے زیبا نہیں ہے کہ چون وچرا کرے اور لعنت و ممانعت کی وجہ پوچھے۔ لیکن مصلحۃً اشارہ کرتا ہوں:

عورتوں کے لیے زیارت قبور کی اجازت دینے میں اندیشہ تھا کہ ان کی ناسمجھی اور بے صبری کی وجہ سے رسوم مشرکانہ وبدعات کا رواج ہوجائے گا ــــ اور بالآخر یہ اندیشہ واقعہ بن کر رہا۔ نیز ان کی بے تابی بے قراری اور نوحہ وزاری کا خوف بھی تھا، بہرحال اس حقیقت کے پیش نظر اجازت میں دینی نفع تو چنداں تھا نہیں، البتہ نقصان بہت زیادہ تھا، اور قاعدہ ہے کہ "غالب کی رعایت کی جاتی ہے" قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیات میں اسی قاعدہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے:

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ۔ (القارعہ)	جس کا نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگیا سو وہ تو من پسند عیش میں پہونچ گیا۔

شراب اور جوئے کے بارے میں ارشاد باری ہے۔

فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ (البقرۃ)	ان دونوں میں بڑا گناہ ہے، اور لوگوں کے لیے چند منافع بھی ہیں۔ البتہ ان کے نقصانات نفع سے زیادہ ہیں۔

پس غلبۂ مفاسد کی وجہ سے عورتوں کے لیے زیارت قبور کی ممانعت مناسب معلوم ہوئی اور اسی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی اور مردوں کے متعلق مذکورۂ بالا اندیشہ نہ تھا اس لیے ان کے لیے اجازت مناسب معلوم ہوئی، وہ عبرت پذیری اور تذکیر موت کی صورت میں ثواب کے مستحق ہوں گے۔[۱]

---

[۱] قال الترمذی: قال بعض اهل العلم: انما كره زيارة القبور للنساء لقلة صبرهن، و كثرة جزعهن الخ. کتب فقہیہ میں اصح قول یہ لکھا ہے کہ زیارت قبور مرد وزن سب کے لیے جائز ہے نور الایضاح میں ہے۔ ندب زيارتها للرجال والنساء على الاصح نیز حدیث كنت نهيتكم عن زيارة القبور الخ بھی عام ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ ممانعت دونوں صنفوں کے لیے ختم ہوگئی ہے اور جس حدیث میں (باقی اگلے صفحہ پر)

"از استماع حکم صریح کار اہل ایمان نیست کہ چون وچرا کنند، واز وجہ لعنت و ممانعت پرسند، مگر بنظر دور اندیشی رمزے آں ہم میگویم۔

زبے خردئ زناں وبے صبری شاں ــــ ہر دو عیاں است ــــ در صورت اجازت زیارت اندیشۂ رواج مراسم شرک وبدعت بود ــــ وآخر کار مشہود شد ــــ وخوف بے تابی وبے قراری ونوحہ وزاری بود ــــ چنانچہ ظاہر است۔ پس اندریں صورت نفع دینی چنداں نبود ونقصان دینی زیادہ۔ از آں برآمد موافق قاعدہ "رعایت غلبہ" کہ در آیۃ "فاما من ثقلت" و "فیہما اثم کبیر ومنافع للناس واثمہما اکبر من نفعہما" اشارہ بآں فرمودہ اند، نہی از زیارت درخورِ حالِ شاں برآمد، بایں وجہ لعنت براوشاں کردند ــــ از مرداں اندیشۂ مذکور، وخوفِ مسطور نبود، اجازت لائق شاں بنظر آمد، بوجہ حصول عبرت، وتذکیر موت امیدوار ثواب نمودند۔" (فیوض صفحہ ۴-۵)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لعنت وارد ہوئی ہو وہ نسخ سے پہلے کی ہوگی ــــ لیکن جب عورتوں میں جہالت بڑھی اور طرح طرح کی رسوم وبدعات ایجاد کی جانے لگیں تو متاخرین احناف نے عورتوں کے لیے زیارت کے عدم جواز کو ترجیح دی۔ علامہ بدر الدین عینی بخاری شریف کی شرح میں لکھتے ہیں۔ وحاصل الکلام انہا تکرہ للنساء، بل تحرم فی ھذا الزمان، لاسیما نساء مصر لان خروجھن علی وجہ فیہ فساد وفتنۃ (عمدۃ القاری صفحہ ۸۴ ج ۴ ملخصاً) حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے بھی متاخرین کے قول کو اختیار فرمایا ہے۔ بلکہ حضرت کے جواب سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ اصل حکم عدم جواز ہی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ارشاد سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے بھائی کی قبر پر گئیں تو فرمایا: "اگر میں تمہاری وفات کے وقت موجود ہوتی تو پھر یہاں قبر پر نہ آتی۔" (مشکوٰۃ ۱/۱۴۹) لیکن چونکہ حضرت نانوتوی کی یہ رائے احناف کے صحیح قول کے خلاف ہے اس لیے حضرت قدس سرہ ارقام فرماتے ہیں:

"ایں تجویز شاید سرمایۂ پریشانئ ناظراں، وموجب حیرانی ابنائے روزگار شود، مگر چہ کنم مفتی نیم، نہ سامان افتاء در بردارم، آنچہ رقم زدم بپاس خاطر سامی رقم زدم، ومی ترسم مبادا بہ تہمت مخالفت اکابر اہلسنت بندہ را بے وجہ ابنائے روزگار مجرم قرار دادہ غوغا کنند وقیامت برسرم بپاکنند فقط (فیوض صفحہ ۵)

(۲) ذو الفقار[1]

سوال:۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مشہور تلوار "ذو الفقار" کی کیا حقیقت ہے؟ وہ آپؓ کے پاس کہاں سے آئی؟ اور کس طرح آئی؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد کس کے پاس گئی؟ شیعہ حضرات اس کے متعلق جو روایات بیان کرتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے؟

جواب:۔ شیعہ حضرات نے "ذو الفقار" کے متعلق جو افسانے عوام کے کانوں میں ڈالے ہیں وہ سب سراسر غلط ہیں۔ اس کی حقیقت صرف اس قدر سمجھنا چاہیے کہ جب حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرام کے جم غفیر کے اصرار سے بیعت خلافت قبول کی تو امور خلافت کے انصرام اور اوقاف وبیت المال کی نگرانی کو اپنا فرض منصبی سمجھا۔ اور چونکہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ جانتے تھے اسلیئے ان کے روبرو اپنا تمام ترکہ وقف کر دیا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انھیں کسی قسم کا خلجان پیش نہ آئے اور حقیقت حال سے ناواقفی کی بنا پر وہ کوئی اور انتظام نہ کر بیٹھیں۔

اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرما دیا تھا: لانورث ماترکناہ فھو صدقۃ یعنی چونکہ نبی وفات کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں اس لیئے ہم اپنے وارثوں کے لیئے "مورث" نہیں بنیں گے، ہم جو کچھ چھوڑ کر جائیں گے وہ سب صدقہ ہوگا، میراث نہ ہوگا، یعنی راہ خدا میں جس کو جو مناسب سمجھیں دے دیں۔ بنا بریں علیہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آراضی کو اہل بیت و ازواج مطہرات کے نان ونفقہ کے لیئے رکھ چھوڑا اور اشیائے منقولہ بطور تبرک تقسیم فرما دیں۔ چند چیزیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حصہ میں آئیں۔ منجملہ اُن کے تلوار بھی تھی جس کا نام ذو الفقار مشہور ہے[2]۔ کتب احادیث سے حضرت امام

---

[1] اصل لفظ فاء کے فتحہ سے ہے لیکن عوام کسرہ پڑھتے ہیں۔ (مرقات شرح مشکوٰۃ ۴/۲۸۰)

[2] بدر کے مال غنیمت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیف ذو الفقار کو بطور صفی لیا تھا (مشکوٰۃ باب قسمۃ الغنائم ص۳۵۰) پھر یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملی (قاموس مادہ فقر)

زین العابدین[1] تک اس کا پہونچنا بظن غالب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ ان کی وفات کے بعد وہ کس کے قبضہ میں گئی۔ بعض صحابہ نے تبرکاً اس کو مانگا تھا[2]۔ ممکن ہے کہ حضرت امام رحمۃ اللہ نے ان کے حوالہ کر دی ہو۔ واللہ اعلم۔

"القصہ ایں ہمہ افسانہائے" ذوالفقار" کہ از شیعاں بگوش عوام رسیدہ باشد سراسر غلط اند، اصل حقیقت آں نقط ایں قدر باید فہمید کہ پس از وفات حضرت سرور کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات چوں بوجہ اصرار جم غفیر صحابۂ کرام صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دست اہل بیعت گرفتند، انتظام مہام خلافت، ونگہداری بیت المال واداقات فرض منصب خود دانستند، لیکن حضرت سرور کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات بلحاظ آنکہ حضرت ابوبکر را جانشین خود فہمیدہ بودند، روبروئے اوشاں ہمہ ترکۂ خود را وقف فرمودند، تا پس از وفات حضرت شاں صلی اللہ علیہ وسلم طلبجانے پیش پائے شاں نشود، ومبادا بوجہ بے علمی از حقیقت حال ـــ اعنی وقف بودن آں ـــ بطور دیگر انتظام آں کنند، بایں وجہ اگر فرمودند روبروئے حضرت صدیق فرمودند" یعنی ارشاد رفت "لانورث ماترکنہ صدقۃ" مطلب ایں جملۂ ایست کہ بوجہ وصیت کہ بوجہ حیات النبی بودن مورث وارثاں لمی توانیم شد، ہرچہ بگذاشتہ رویم آں ہمہ صدقہ

---

[1] اسم شریف علی، لقب زین العابدین، سلسلہ نسب: ابن حسین بن علی بن ابی طالب ہے، اور شہرت "علی اص... سے ہے۔ ولادت ۳۸ھ میں اور وفات ۹۴ھ میں ہوئی۔

[2] جب امام زین العابدین اپنے والد ماجد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے جام شہادت نوش کرنے کے بعد سے مدینہ شریف واپس تشریف لائے تو حضرت مسور بن مخرمہ زہری قرشی (۲ ـــ ۶۴ھ) نے، جو صغار صحابہ میں ہیں، وہ تلوار تبرکاً مانگی تھی۔ ابوداؤد شریف باب مایکرہ ان یجمع بینھن (کتاب النکاح) میں روایت ہے قال مسور لہ، ھل انت مُعطِی سیف رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ فانی اخاف ان یغلبك القوم علیہ! وأیم اللہ! لئن اعطیتنیہ لا یُخلَصُ الیہ ابداً حتی یبلغ الی نفسی (ج ۱ ص ۲۹۰) لیکن حضرت امام کا عطا فرمانا اس روایت میں مذکور نہیں ہے۔

باشد، نہ میراث، یعنی براہ خدا ہر کرا مناسب دانند بدہند، نظر بریں حضرت ابوبکر صدیق اراضی را بہر نان ونفقہ اہل بیت وازواج گذاشتند، واشیائے منقولہ را بطور تبرک تقسیم فرمودند چند اشیاء بحصہ حضرت علی امیر المومنین کرم اللہ وجہہ آمدند منجملہ آں شمشیر ہم بود کہ نامش "ذوالفقار" مشہور است، ورسیدنش تا بحضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ از کتب احادیث بظن غالب معلوم می شود، پس از وفات حضرت شاں ندانیم بدست کہ افتاد، مگر آنکہ بعض صحابہ بغرض تبرک سوال آں کردہ بود، حضرت امام حوالہ شاں فرمودہ باشد واللہ اعلم اینست آں چیکہ در کتب معتبرہ خواہد بود، وسوائے ایں ہر چہ گفتہ اند، یا می گویند، ہمہ بے اصل می نماید (فیوض صہ ۱۱-۱۲)

(۳) یا رسول اللہ!

سوال:- کوئی شخص درود میں صرف "الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ" پڑھے تو جائز اور کافی ہوگا؟

جواب[۱]:- "الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ" بہت مختصر ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر نہ سمجھنا چاہیے، ورنہ اسلام کیا ہوگا؟ کفر ہوگا! بلکہ یوں سمجھے (کہ) یہ پیام فرشتے پہونچاتے ہیں۔" (فیوض صہ ۲۹)

(۴) مرشد مرید کے ہمراہ

"مرشدوں کی نسبت یہ خیال غلط ہے کہ وہ ہر دم ساتھ رہتے ہیں، اور ہر دم آگاہ رہتے ہیں۔ یہ (تو) خدا ہی کی شان ہے (البتہ) گہہ و بیگاہ ـ بطور خرق عادت ـ بعض اکابر سے ایسے

---

[۱] حضورؐ کے لیے علم غیب" کا عقیدہ رکھ کر "یا رسول اللہ" کہنا کفر ہے، اور اگر یہ عقیدہ نہیں تو مشابہ بکفر ہے۔ البتہ اس کلمہ کو درود شریف کے ضمن میں کہے اور یہ عقیدہ رکھے کہ ملائکہ اس درود شریف کو آپ کے سامنے عرض کرتے ہیں تو درست ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ ملائکہ بندۂ مومن کا درود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرتے ہیں اور ملائکہ کی ایک صنف اسی خدمت پر مقرر ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ صہ ۹۶)

معاملات ظاہر ہوئے ہیں، اس سے جاہلوں کو یہ دھوکا پڑا ہے۔" (فیوض ص۱۴۹)

(۵) کیا گروہ بندیاں ختم ہو سکتی ہیں؟

"اس زمانے میں یہ توقع بے جا ہے کہ اختلاف اُٹھ جائے اور اتحاد پیدا ہو جائے۔ ا
بالعموم ابنائے روزگار میں فہم و انصاف ہوتا تو بعد فہمائش ممکن تھا کہ یہ اختلاف اُٹھ جاتا، مگر آپ جا
ہیں کہ آج کل یہ دونوں باتیں نصیب اعدا ہیں۔ یہ اختلاف ہی موجب عداوت ہے اور یہ عداو
باہمی موجب منفر (تنفر) یکہ گر ہے، اس لیے کوئی کسی کی نہیں سنتا، اور بے سمجھے دوسروں کے
رسم و راہ کو غلط سمجھتا ہے، پھر آپ ہی فرمائیں (جب) یہ حال ہو تو کیا حال ہوگا؟! اس صور
میں توقع فہم و انصاف ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ ہر کسی کی خود رائی، اُدھر مذہب باطل ک
خوش نمائی اور (بھی) موجب ازدیاد ترقی باطل ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سب جانتے ہیں، خدا کے کیسے پیارے تھے؟! اور کیسے بلند ہمت
اور اولوالعزم تھے؟! پھر بنی اسرائیل پر ان کا کتنا بڑا احسان تھا کہ غلامی فرعون و قوم سے چھڑا کر باد
مملکت وسیعہ بنا دیا، مگر تس پر (یعنی باوجود اس کے) تسلیم احکام میں اتنی سرتابی کرتے تھے کہ بعض بعض
دفعہ پہاڑ کو اٹھا کر سر پر معلق کر دیا، تو (یعنی تب) حکم مانا، نہیں تو نہیں (مانا)، اور سامری نے ایک کرش
بے معنی دکھلایا اور سب کے سب جھٹ پٹ اسکے حلقہ بگوش ہو گئے! آواز بے معنی کجا اور معجز
موسیٰ کجا! پھر کرشمہ سامری بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز کا طفیل تھا۔ نہ حضرت جبرئ
علیہ السلام ان کی مدد کو آتے نہ ان کی اسپ مادہ کے سُم کی تاثیر سامری کو نظر پڑتی، نہ اس کر
کی نوبت آتی۔ پھر حضرت موسیٰ کجا اور سامری مردود، دغاباز کجا! مگر چونکہ اسکی رسم و راہ یعنی ڈ
ڈھمکا، روشنی چراغی، مرغوبات طبعی میں سے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ارشادات نف
پر دشوار (تھے) تو (یعنی اس لیے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اتباع دشوار تھا اور سامری کا ا
سہل ـــــ غرض اس زمانہ میں مذاہب باطلہ بوجہ مذکور قابل ارتفاع نہیں۔" (یعنی یہ تو
نہیں کہ وہ ختم ہو جائیں گے اور ان پر چلنے والے راہ حق پر آجائیں گے) فیوض ص۱۴۹

(۶) جمعہ کی پہلی اذان

سوال :۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جمعہ کی پہلی اذان کیوں بڑھائی؟ وجہ کیا ہے؟ ــــ

جواب :۔ خطبۂ جمعہ کا اصلی مقصد وعظ سننا ہے (اور جب مدینہ کی آبادی بڑھی اور دور تک پھیل گئی تو منبر والی اذان سب لوگ نہیں سُن سکتے تھے نیز لوگوں میں سستی راہ پانے لگی چنانچہ تبکیر (جمعہ کی نماز کے لیے جلد جانا) کا اہتمام ختم ہوگیا، تو) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خطبہ والی اذان سے پہلے ایک اذان بڑھائی تاکہ لوگوں کے پہونچنے میں تاخیر نہ ہو اور خطبہ کا اصلی مقصد حاصل ہوسکے۔

"غرض اصلی استماع است ...... و شاید ہمیں است کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اذانے دیگر قبل از اذانِ خطبہ افزودند، تا نہ باشد کہ در رسیدنِ سامعان دیر شود، و خطبہ بیکار رود ــــ غرض بوجہ غرض مذکور ــــ باوجود مقرر بودن یک اذان کہ بر ہر ہر نماز مقرر است ــــ اذانے دیگر پیشتر از اذانِ خطبہ افزودہ شد، تا مطلب اصلی بوجہ احسن بدست آید" (فیوض ص۲۷)

(۷) حدیث: من کنتُ مولاہ فعلیٌّ مولاہ

سوال :۔ حدیث "من کنتُ مولاہ فعلیٌّ مولاہ" کا مرتبہ کیا ہے؟ اور معنی کیا ہیں؟ شیعہ حضرات "مولیٰ" کے معنی "حاکم" کرتے ہیں کیا یہ معنی صحیح ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت کا ثبوت اس حدیث سے نکلتا ہے؟

جواب :۔ حدیث صحیح ہے، لیکن "مولیٰ" اور "ولی" کے اصلی معنی "دوست" ہیں، دونوں لفظ ایک ہی مصدر سے بنے ہیں اور ایک ہی معنی رکھتے ہیں، جس طرح کہ "ولی اللہ" اور "اولیاء اللہ" کے معنی "اللہ کے دوست" ہیں۔ "ولی" اور "اولیاء" کے معنی حاکم یا حکام نہیں ہیں ورنہ "ولی اللہ"

۱؎ وصار ذلک الاذان الذی بین یدی الخطیب لا یسمعہ جمیع اھل المدینۃ اھ (ابن حجر عسقلانی) او لما ظھرت البدعۃ ـ علی ما قیل إنھا اول البدع ـ وھی ترک التبکیر اھ (ملا علی قاری)

کا مطلب ہوگا "خدا پر حاکم"۔ العیاذ باللہ!

دلیل یہ ہے کہ حدیثِ مذکور کا آخری حصہ اس طرح ہے۔ اللّٰھم وَالِ من وَالَاہُ، وَعَادِ مَنْ عَادَاہُ ۔۔ یعنی "خدایا! اس شخص کو اپنا دوست بنا جو علیؓ کو اپنا دوست بنائے اور اس شخص سے عداوت رکھ جو علیؓ سے عداوت رکھے"۔ اگر حضراتِ شیعہ کا ترجمہ صحیح ہو تو جملۂ مذکورہ کا ترجمہ یوں کرنا ہوگا:

"خدایا! اس شخص پر حکومت کیجئے جو علیؓ پر حکومت کرے۔"

علاوہ بریں حدیث کا محلِ ورود یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی مقام پر بھیجا تھا[1] وہاں ان کے بعض ساتھیوں کو کچھ باتوں کی وجہ سے ان سے رنجش ہو گئی تھی چنانچہ انھوں نے دربارِ نبوی میں آپؓ کی شکایت گزاری لیکن درحقیقت شکایت غلط فہمی اور حضرت علیؓ کی قدر ناشناسی پر مبنی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شکایت سُن کر فرمایا:۔ مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ الخ یعنی جسے میں محبوب ہوں اسے علی بھی محبوب ہونے چاہئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ساتھیوں کی رنجش ختم ہو گئی۔ نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے لیے لازم ہے حضرت علیؓ سے محبت کرنا اور یہ بات قرینِ عقل ہے۔ استاذ اور پیر سے محبت کے لیے استاذ زادگاں و پیر زادگان کی محبت لازم ہے۔ حضرت علیؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بمنزلۂ فرزند کے تھے اس لیے ان سے محبت بعینہٖ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے۔

---

[1] یمن میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لشکر سے خمس (مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ) وصول کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بھیجا تھا اور اسی سلسلہ میں ساتھیوں کو کچھ شکایات حضرت علیؓ سے پیدا ہوئی تھیں حضرت خالدؓ نے حضرت بُرَیدۃ بن الحُصَیبؓ کو مامور کیا کہ وہ دربارِ نبوی میں شکایت پہنچائیں جب شکایت پہنچائی گئی تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من کنت مولاہ الخ جس کی وجہ سے حضرت علیؓ کو ابدی اہمیت حاصل ہو گئی چنانچہ مجلس سے نکلتے ہی حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: ھَنِیْئًا لَکَ یَا اَبَا الْحَسَنِ! لَقَدْ اَصْبَحْتَ مولیٰ کُلِّ مُؤْمِنٍ! مبارک! آج سے آپ ہر مؤمن کے دوست بن گئے! کیونکہ اب کون مؤمن ہوگا جو مؤمن بھی ہو دعوئ حبِ رسول بھی کرے اور حضرت علیؓ سے محبت نہ رکھے؟ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

لیکن پیرزادگان کی خلافت و جانشینی ضروری نہیں ہے۔ اس کا تعلق قرابت سے نہیں ہے بلکہ جو شخص علم و زہد میں درجۂ کمال تک پہونچا ہوا ہوگا اور دوسروں سے گوئے سبقت لے چکا ہوگا وہی استاذ اور پیر کی خلافت کا مستحق ہوگا ــــ مگر شیعہ حضرات خلافت کے مسئلہ کو سلاطینِ دنیا کی ولیعہدی پر قیاس کرتے ہیں اور حضرت علیؓ کو ترجیح دیتے ہیں لیکن انھیں معلوم نہیں کہ اگر دین کو دنیا پر قیاس کیا جا سکتا ہے تو بھی حضرت علیؓ کا نمبر چوتھا ہی آتا ہے سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ مستحقِ خلافت ہیں پھر حضرت حسنؓ پھر حضرت حسینؓ۔

بہرحال سنی حضرات اگر حضرت علیؓ کو چوتھے نمبر پر رکھتے ہیں تو وہ ان کو ان کے مقام ہی پر رکھتے ہیں ــــ ہاں اس قدر "غلطی" کرتے ہیں کہ ان سے پہلے اصحاب ثلٰثہ (ابوبکرؓ عمرؓ اور عثمانؓ) کو رکھتے ہیں تاکہ حضرت علیؓ کی باری بھی آ سکے، ورنہ اگر پہلے حضرت فاطمہؓ کو خلافت دیں پھر بالترتیب آپ کے دونوں صاحبزادوں کو، تو بتلایا جائے کہ حضرت علیؓ تک خلافت کس طرح پہونچے گی؟ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں صاحبزادوں سے پہلے ہی وفات پا چکے ہوں گے۔ پس سنیوں کی خطا کس قدر عمدہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو محروم نہ ہونا پڑا بلکہ ان کے نمبر پر ان کو حق مل گیا البتہ شیعہ حضرات کے دل سے کوئی پوچھے کہ سنیوں کی یہ "غلطی" "از صد صواب اولیٰ تر" کی مصداق ہے یا نہیں؟

حدیث: "من کنت مولاه فعلی مولاه" مسلّم، مگر "مولیٰ" در اصل ہمچوں "ولی" بمعنی "دوست" آید، ہر دو لفظ از یک مصدر اند، و یک معنی دارند، و پیدا است کہ "ولی اللہ" و "اولیاء اللہ" را کہ ولی و اولیاء می گویند، مراد از آں "دوست خدا" و "دوستان خدا" می باشد، نہ آنکہ ولی و اولیاء بمعنی حاکم و حکام باشد، و مراد آن بود کہ ولی حاکم بر خدا باشد، و اولیاء حکام خدا باشند۔

و زیادہ تر قرینہ ایں مطلب اینست کہ در آخر ایں حدیث ایں ہم ارشاد است:

(گزشتہ سے پیوستہ) (علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے البدایہ والنہایہ ۷/ ۳۴۳۔ ۳۵۰ میں حدیث زیر بحث کی تمام سندیں جمع فرما دی ہیں فجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء)

"اللھم وال من والاہ، وعاد من عاداہ" معنی ایں جملہ اینست کہ: "بارخدایا! دوستِ خویش گردان آنرا کہ بہ علی دوستی کند، وعداوت کن باکسیکہ با علی عداوت کند" اگر مطلوبِ شیعاں مرادِ حدیث بودے، ترجمہ جملۂ مذکورہ بدیں طور می شد کہ: "حکومت کن برکسیکہ حکومت کند بر علی"

علاوہ بریں قصہ ایں ارشاد ایں است کہ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رض را بجائے فرستادہ بودند، بعض ہمراہیاں از اوشاں در بعضے کارہا آزردہ، شکایت بخدمتِ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم رسانیدند، چوں شکایت شاکیاں بوجہ غلط فہمی، وناقدرشناسی حضرت علی بود، حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرمودند: "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" یعنی "ہر کہ من محبوبِ او باشم علی نیز محبوبِ او باشد" بایں ارشاد شکایت از دلِ ہمراہیاں زائل شد، وہمگنا نرا معلوم شد کہ محبت حضرت علی را۔ رضی اللہ عنہ۔ محبتِ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم لازم است۔

وایں امر عین موافقِ عقل است۔ محبت پیرزادگاں واستاذزادگاں محبتِ پیر و استاذ را لازم است۔ حضرت علی بمنزلۂ فرزند بودند، محبت اوشاں عین محبت حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم باشد اما خلافت وجانشینیٔ پیرزادگاں ضروری نیست، ایں امر مربوط بقرابت نیست، علاقہ بہ کمالِ علم وکمالِ فقیری دارد، وہرکہ دریں امر گوئے سبقت ربودہ باشد، ہماں مستحق خلافتِ استاذ وپیر بود۔ مگر شیعاں قصۂ خلافتِ نبی را۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ بقصۂ ولیعہدیٔ سلاطینِ دنیا قیاس نمودہ حضرت علی را ترجیح می دہند، ونمی دانند کہ اگر بفرضِ محال دین را بدنیا قیاس تواں کرد، تاہم حضرت علی رض اگر بودند بمرتبۂ چہارم بودند: اول حضرت فاطمہ مستحق خلافت بودند، دوم حضرت حسن، سوم حضرت حسین رضی اللہ عنہم، بہرحال سنیاں اگر حضرت علی را بمرتبۂ چہارم داشتند بجائے خود داشتند۔

آرے ایں قدر خطا کردند کہ اول از اوشاں اصحاب ثلثہ را نہادند تا نوبت بحضرت علی ہم برسد، ورنہ اگر اول بحضرت سیدۃ النساء دادہ، باز اول اوشاں بعد اوشاں بپسر دادند، رسیدن خلافت بآنحضرت علی معلوم می شد؟ مگر از دلِ شیعاں باید پرسید کہ ایں خطا از صد صواب اولی تر است؟! (افیوض ص ۱۴۱، ۱۵۱)

ایک بندۂ مومن کا مکتوب

لاہور کے متوطن ایک دوست ـــــ جن کا رفیق محترم مولانا علی میاں اور اس عاجز سے قریباً چالیس سال سے ایسا تعلق رہا کہ بعض احباب ہم تینوں کو "اصحاب ثلٰثہ" کہا کرتے تھے ـــــ ہندوستان و پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہونے کی وجہ سے مدت سے اُن کا کچھ حال معلوم نہ تھا ـــــ گزشتہ مہینے اپریل میں ایک افریقی دوست جو ہندوستان آئے ہوئے ہیں، اپنی کسی ضرورت سے چند روز کے لیے پاکستان گئے تھے ـــــ مولانا علی میاں نے اُن کے ذریعہ لاہور کے اُن دوست کو خط بھیجا جسمیں اپنی خیر و عافیت سے اطلاع دینے کے ساتھ ان کا حال دریافت کیا تھا ـــــ اس کے جواب میں موصوف کا جو مکتوب اسی طرح دستی آیا ہے، خود اس عاجز نے اس میں اپنی اصلاح کا بڑا سامان پایا، ـــــ امید ہے کہ اللہ کے جن بندوں کو اپنے حال اور آخرت کی کچھ فکر ہوگی انشاء اللہ اُن سب کے لیے اس کا مطالعہ نفع مند ہوگا ـــــ اسی توقع پر اس کو ناظرین تک پہونچانے اور الفرقان کے صفحات میں محفوظ کر دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے ـــــ چونکہ اس کو صاحب مکتوب کی اجازت کے بغیر شائع کیا جا رہا ہے اس لیے ان کا نام حذف کر دینا ضروری سمجھا گیا ـــــ اتنا ذکر کر دینا انشاء اللہ ناظرین کے لیے مفید ہوگا کہ ہمارے یہ دوست ایم۔ اے ہیں۔ برطانوی حکومت کے دور میں یہ سرکاری محکمۂ تعلیم سے وابستہ اور انسپکٹر آف اسکولز رہے ہیں، بیعت کا تعلق ہم دونوں کی طرح مرشدنا حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ سے رہا۔ اللہ تعالیٰ

ہم سب کو اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائے۔ نعمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

آپ کا والا نامہ شرف صدور لایا۔ حامل رقعہ نے زبانی بھی صحت اور خیریت کے حالات سنائے
اللہ تعالیٰ ان حالات پر شکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ عاجز اپنی صحت کے بارے میں
یوں عرض کرتا ہے کہ ایک نہایت نادر قسم کا سفید موتیا بند تیرہ برس پہلے بائیں آنکھ میں ظاہر ہوا جس کی
سست خرامی کا یہ عالم تھا کہ دس برس تک وہ عینک کے قابو میں رہا۔ اوپر اور نیچے کے شیشے بدلتے
رہے اور عاجز کو دور کے دیکھنے اور نزدیک کے دیکھنے میں کوئی دقت لاحق نہ ہوئی۔ تین برس گزرے
کہ آنکھوں کا پڑھنا اور ساتھ ہی لکھنا اور شکل سے آدمی کو پہچاننا ختم ہوا مگر دھوپ میں موٹا موٹا راستہ
نظر آتا رہا۔ گھر میں ذاتی ضروریات اور مسجد تک جانے کے لیے کسی کا محتاج نہ تھا۔ تین برس
یوں بھی گزر گئے۔ دائیں آنکھ کا مشہور ترین اسپتال اور لائق ترین ڈاکٹر نے آپریشن کیا۔ مگر
اس کی تقدیر میں دیکھنا نہ رہا تھا۔ اور وہ ضائع ہوگئی۔ اب اسمیں شیشہ کی آنکھ لگی ہوئی ہے۔ رہا بائیں
کا ماجرا تو پندرہ بیس دن کے قریب گزرے اس میں یک لخت مزید پانی اترنا شروع ہوا۔ اور آج
بالکل اور دیکھتے ہی دیکھتے روشنی اور تاریکی کے احساس کے علاوہ ہر قسم کا دیکھنا جاتا رہا۔ ڈاکٹر حسب
سابق آپریشن کے لیے تیار تھا۔ مگر موسم کے یک لخت گرم ہو جانے کی وجہ سے اعزہ نے آپریشن
روک دیا۔ اور اکتوبر پر ملتوی کر دیا۔ خانہ نشین بلکہ بستر نشین سارا دن یوں ہی کٹ جاتا ہے۔ کوئی
ہاتھ پکڑے اور زبانی راستہ بھی بتاتا جائے۔ اس کے بغیر گھر سے باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ نماز کی بھی عزیزی حافظ قاسم رضوان گھر میں ہی جماعت کر دیتا ہے۔ اس
مالک کی کس کس نعمت کا کس منہ سے شکر ادا کروں۔ تکلیف کوئی نہیں۔ آنکھ میں مطلق درد نہیں۔
ریاحی درد جنھوں نے ان تین برسوں میں دو تین بار زور مارا اور کافی عرصہ کے لیے صاحب
فراش رکھا۔ اس وقت ان کا بھی افاقہ ہے۔ وقت گزرتا جاتا ہے۔ الحمد للہ اور خیر سے گزرتا جاتا
ہے۔ ثم الحمد للہ۔ صحت کا حال آپ نے سن لیا۔ شاید معاملات کا حال بھی سننا پسند کریں۔ دنیا

میں عام انسان کا تین قسم کا اثاثہ شمار ہوتا ہے۔ اوّل اس کا جسم اور اس کی قوتیں یعنی جان۔ دوسرے
ورثہ میں ملا ہوا یا اپنا کمایا ہوا مال۔ ان کے بعد تیسرے نمبر پر اعزہ یا احباب وغیرہ کی جماعت جو
بوقت ضرورت رکن شدید کا کام دے سکتی ہے۔ جسم اب کہیں جانے یا از خود کچھ کام کرنے کا نہ
رہا۔ کرایہ دار انکاری اور باغی ہوئے۔ دائرہ شدہ مقدمات کی پیروی اور نئے مقدمات کا دائر
کرنا بس کی بات نہ رہی۔ اعزہ اللہ کو پیارے ہوئے یا کہیں دور چلے گئے۔ یا چھٹتے ہٹتے پرے ہو گئے۔
بوقت ضرورت بلایا جانے والا یا کسی حد تک بھی کام آنے والا کوئی نہ رہا۔ پندرہ برس کی مدت میں
آہستہ آہستہ مگر بتدریج اس نوبت تک پہونچا کہ عبد کے لیے اس واحد القہار کے سوا کوئی آسرا
نہ رہا۔ یوں تفہیم ہوئی کہ جیسے بعض اوقات وہ قادر مطلق کسی فرد کو حکومت، دولت، قوت اور طاقت
کا فرعون اور نمرود کی طرح وافر حصہ دیکر دیکھتا ہے کہ یہ بندہ اس قوت سے کیا کام لیتا ہے
اور اس کے گرد و پیش میں لوگوں کا کیا ردِّ عمل ہوتا ہے۔ آیا باطل کے آگے دبے چلے جاتے
ہیں یا کسی حد تک کوئی مقابلہ بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات وہ الٰہ العالمین کسی شخص
سے اس کو دی ہوئی ایک ایک چیز واپس لے کر اسے مجبور محض بنا دیتا ہے۔ اور پھر دیکھتا ہے کہ
وہ اس حالت میں کہاں تک شکر و صبر کرتا اور نافرمانی و ناشکری سے بچتا ہے۔ اور اس کے
گرد و پیش میں بھی لوگ اسے معذور اور ضعیف سمجھ کر اس کی کچھ مدد اور اعانت کرتے ہیں۔
یا ناتواں اور بے بس دیکھ کر آسان شکار بنانے پر اتر آتے ہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
باری تعالےٰ نے اپنی حکمت میں اس اذل خلائق کو اس دوسرے امتحان کے لیے منتخب کر لیا
اور وہ وقت جس کا ذکر اوپر کیا ہے۔ عاجز پر آ گیا۔ زہے قسمت اس مالک نے اپنی اس
گنہگار ترین مخلوق کو اپنی ایک تدبیر کے لیے چن لیا۔ وہ وقت آیا اور اوّل سے آخر تک ایک ایک
کرکے سب پرے سے پرے ہوتے چلے گئے۔ عاجز کو حسرت تھی کہ کیا در پیش ہونے والا ہے۔
اس آزمائش کی گھڑی میں قرآن مجید پر غور کام آیا کہ جب نبی تک پکار اٹھے کہ مدد کہاں ہے
تو اس وقت بھی اللہ کی مدد قریب تھی۔ یہ بھی اس مالک کی ہی خصوصی رحمت اور خصوصی کرم
تھا کہ اس نے دل کو ڈھارس بندھائی اور ایسی حفاظت فرمائی کہ اضطرار کی حالت میں
زبان سے کوئی لفظ یا ہاتھ سے کوئی عمل ایسا نہ ہونے دیا جس سے اس کی قریب آئی ہوئی رحمت

پھر دور ہو جاتی اور اسی اثنا میں اپنے دو بندے بھیج دیے. جنھوں نے علیحدہ علیحدہ پوچھا کہ کیا عاجز کسی بارے میں پریشان ہے. بتانے پر انھوں نے اپنے کام کی طرح ہاتھ بٹایا اور دیکھتے دیکھتے حالات بہتر ہو گئے. یہ تھی اس مالک کی خصوصی عنایت. اب امید غالب ہے کہ انشاء اللہ یہ طویل ابتلا بفضلہٖ خیر پر ختم ہو جائے گا. اور وہ ارحم الراحمین اس امتحان کو انعام میں تبدیل فرمائے گا. انشاء اللہ

.... اللہ کی زمین پر بستے ہیں، اس کا رزق کھاتے اور پیتے ہیں. اس کی فضا میں سانس لیتے ہیں، اور اسی کا ذکر کرتے ہیں. شوق بھی اسی کا دیا ہوا ہے. توفیق بھی اسی کی دی ہوئی ہے. اور قبول بھی وہی کرے. آمین!

شاید آپ کو خیال گزرے کہ یہ وقت جو بیان کیا ہے عاجز پر کس طرح گزرا. عاجز کا وظیفہ یا معمول شاید آپ کے علم میں ہو. وقت گزرنے کے ساتھ اسمیں درود شریف آیۃ کریمہ اور سورۃ والضحیٰ کا اضافہ ہوتا گیا. قرآن مجید کی بعض چھوٹی چھوٹی حسب حال دعائیں بھی دل کو لگیں اور یہ بھی تسبیحات میں شامل ہو گئیں. اللہ تعالیٰ کی خاص الخاص نعمت یہ ہے کہ اس نے اپنی شفقت سے ذکر میں جی لگا دیا. ایک تسبیح ختم ہوئی تو دوسری شروع کر دی. وہ ختم ہوئی تو تیسری علیٰ ھذا القیاس شفقتی کیا عرض کروں وہی چادر پائی اور مصلے پر چوبیس گھنٹوں میں نہ کبھی دل اکتایا نہ گھبرایا نہ اداس ہوا نہ پریشان ہوا نہ کبھی ایام گزشتہ کی یاد آئی نہ مستقبل کے سہانے خواب دیکھے. اللہ تعالیٰ نے دل کو ایسا صبر اور سکون اور ایسا اطمینان اور توکل عطا فرما دیا کہ وقت کا کٹنا تو کیا بات ذکر کے لیے وقت کم معلوم ہونے لگا. آپ چاہیں تو اس کو دل کی بادشاہی کہہ لیں آپ چاہیں تو اس کو دل کی فقیری کہہ لیں. دونوں انتہائیں ایک ہی مقام پر جا کر مل جاتی ہیں. اے اللہ میں تجھ سے راضی ہوں. تو مجھ سے راضی ہو جا. آمین........ جب حضرت اقدس کی خدمت میں آپ کے ساتھ حاضر ہو کر حضوری کے لیے درخواست کی تھی تو حضرت نے فرمایا تھا کہ وہ تو مجذوب بنا دیتی ہے اور پھر فرمایا کہ ایک قسم کی حضوری ایک وقت پر نصیب ہو جاتی ہے جس کا اسی وقت پتہ چلتا ہے اللہ جانے یہ وہ مقام یا اس کے لگ بھگ یا اس کا راستہ ہے.

مکرمی علی آدم صاحب منتظر بیٹھے ہیں اور عاجز عریضہ کو دعا کی درخواست پر ختم کرتا ہے. والسلام

تحدیثِ نعمت

کیا پایا اور کن کو پایا؟

(۲)

محمد منظور نعمانی

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے، یہ عاجز شوال ۱۳۴۳ھ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تھا۔ اس سال مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ اخیرین وغیرہ وہ کتابیں پڑھیں جن کا دورۂ حدیث سے پہلے پڑھنا ضروری تھا۔ اور ابھی تک میں نے نہیں پڑھی تھیں۔

مشکوٰۃ شریف حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں تھی، اس کا سبق دو گھنٹے مسلسل ہوتا تھا۔ مولانا ممدوح کو اپنے مرشد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ سے عشق تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ سبق میں کسی نہ کسی سلسلہ سے ان کا ذکر آجاتا، کبھی کبھی اس تذکرہ میں مولانا کی آنکھیں آبدیدہ اور آواز گلوگیر ہو جاتی اور ایک خاص درد بھرے انداز میں مولانا یہ مصرعہ پڑھتے

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے

اسی زمانہ سے حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کی عظمت و محبت کا بیج دل میں پڑا۔

حضرت مولانا سراج احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر آگیا تو ان کا ایک اور واقعہ بھی ذکر کرنے کا دل چاہتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دیوبند میں جب کسی کا انتقال ہوتا ہے تو جنازہ نماز کیلئے دارالعلوم میں لے آتے ہیں درسگاہوں میں اطلاع کر دی جاتی ہے کہ نماز کے لیے جنازہ

آیا ہوا ہے۔ اسی گھنٹے کے اختتام پر نماز جنازہ ہوگی۔"۔۔۔ ایک دن مشکوٰۃ شریف کا سبق ہو رہا تھا، پہلا ہی گھنٹہ تھا، جنازہ کی اطلاع آئی، پہلا گھنٹہ پورا ہو جانے پر حضرت مولانا نے ہم لوگوں سے فرمایا، چلو، جنازہ کی نماز پڑھ لیں۔ باقی سبق بعد میں ہوگا! اس جماعت میں قریباً ۳۵۔ ۴۰ طالب علم رہے ہوں گے۔ ان میں سے صرف چار پانچ وضو کرنے کے لیے تیزی سے مسجد کی طرف چلے، باقی سب مولانا کے پیچھے پیچھے نودرہ کے صحن میں آگئے، جہاں نماز جنازہ ہونے والی تھی ۔۔۔۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت مولانا اور ہم سب پھر درسگاہ میں آگئے۔ مولانا نے سبق شروع ہونے سے پہلے ہی بڑے درد اور تاثر کے ساتھ فرمایا آج مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ آپ میں سے کچھ لوگ وضو کرنے کے لیے مسجد کی طرف دوڑے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ لوگ حدیث شریف کے سبق میں بغیر وضو بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کا طریقہ یہ نہیں تھا۔ حدیث کی برکتیں جب ہی حاصل ہوں گی جب اس کو ادب سے پڑھا جائے گا ۔۔۔۔ حضرت مولانا کی اس بات کا سب ہی طلباء پر بہت اثر ہوا اور میرا اندازہ ہے کہ پھر سبھی وضو کا اہتمام کرنے لگے۔

دوسرے سال یہ عاجز دورۂ حدیث میں شریک ہوا۔ یوں تو اس وقت دارالعلوم کے سبھی بڑے اساتذہ باکمال، اپنے اپنے فن کے امام اور صلاح و تقویٰ اور تعلق باللہ میں بھی صاحب مقام تھے، لیکن ان میں اس وقت کے صدر المدرسین، شیخ الحدیث استاذنا العلام حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ کا خاص الخاص مقام تھا، جنھوں نے نہیں دیکھا وہ غالباً یہ تصور بھی نہ کر سکیں گے کہ چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں اس شان کا بھی کوئی متبحر عالم ہو سکتا ہے۔۔۔! ان کی علمی جلالت کا کچھ اندازہ ان کے معاصر اور قرین حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کی اس شہادت سے کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے اپنی جلیل القدر تصنیف فتح الملہم شرح صحیح مسلم میں ایک جگہ ان الفاظ میں ادا کی ہے۔

الشیخ التقی النقی الذی	وہ صاحب تقویٰ اور پاک سیرت شیخ
لم تر العیون مثلہ ولم یر ھو	جس کی کوئی دوسری مثال لوگوں کی
مثل نفسہ ولو کان فی سالف	آنکھوں نے نہیں دیکھی اور خود اس

الزمان لکان لہ شأن فی	نے بھی انکی کوئی مثال نہیں دیکھی، اور اگر
طبقۃ اھل العلم عظیم۔[1]	وہ پچھلے دور میں ہوئے ہوتے تو طبقۂ
	اہل علم میں ان کی بڑی عظیم شان ہوتی۔

اور حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا یہ ملفوظ مشہور و معروف ہے اور غالباً حضرت کے ملفوظات کے کسی مجموعہ میں طبع بھی ہو چکا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے بارے میں فرمایا کہ "اُن کا وجود اسلام کی حقانیت کی ایک روشن دلیل ہے۔

جن اصحاب نظر نے حضرت ممدوح کو کچھ مدت تک قریب سے دیکھا ان سب کا احساس یہی ہو گا کہ وہ علوم دین کے بحرِ ذخار اور ورع و تقویٰ کے لحاظ سے اُن خاصان خدا میں سے تھے جن کی منجانب اللہ منکرات و معصیات سے حفاظت فرمائی جاتی ہے ___ صورت بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی حسین و جمیل اور معصومانہ بنائی تھی کہ دیکھنے والے بے ساختہ کہہ اٹھیں۔

"ان ھذا الا ملک کریم"۔

اس زمانہ میں دار العلوم کے جو طلباء اپنی اصلاح کے لیے کسی صاحب ارشاد شیخ سے تعلق قائم کرنا چاہتے تھے وہ یا تو دیو بند ہی میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مجددی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق قائم کر لیتے تھے، یا پھر حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تھانہ بھون جایا کرتے تھے، بعض طلباء سہارنپور جا کر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی بیعت ہوتے تھے، لیکن دار العلوم دیوبند میں میرا جو آخری سال دورۂ حدیث کا تھا اس سال کے شروع ہی میں حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ مدینہ طیبہ ہجرت فرما گئے تھے اور کچھ ہی عرصہ کے بعد وہیں وصال ہو گیا۔

میں طالب علمی کے زمانہ میں، خاصکر دار العلوم کی طالب علمی کے دو سالوں میں، صرف طالب علم تھا اور اول و آخر دلچسپی بس درس و مطالعہ سے تھی ___ جب سال کا اختتام قریب آیا جس کے بعد دار العلوم میں قیام کا خاتمہ تھا تو میں نے بیعت کے مسئلہ پر سوچا۔

---

[1] فتح الملہم ج ۱ ص ۳۳۵

میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنے زندہ اکابر میں سب سے زیادہ عقیدت و محبت حضرت است[اذ]
رحمۃ اللہ علیہ سے ہے اس لیے مجھے حضرت ہی سے بیعت کی درخواست کرنی چاہیے۔ لیکن یہ
مشہور تھی اور ہم دیکھتے بھی تھے کہ وہ کسی کو بیعت نہیں فرماتے تھے۔ اس کے باوجود میں نے ا[پنے]
حق میں یہی طے کیا۔

جس دن سالانہ امتحان کا آخری پرچہ ہوا، جس سے اگلے دن مجھے دیوبند سے وطن رو[انہ]
ہو جانا تھا، میں رات کو بعد عشاء حضرت کی خدمت میں دولت کدہ پر حاضر ہوا۔ حضرت اس و[قت]
تنہا تھے، میں نے درخواست بیعت کی۔ حضرت نے مجھے دوسرے اکابر کی طرف رجوع کرنے [کے]
لیے فرمایا، لیکن جب میں نے اس کے بعد بھی اپنی یہی بات عرض کی اور ایک درجہ میں نیاز مندا[نہ]
اصرار کیا، تو قبول فرمالیا، توبہ کی تلقین اور تسبیحات اور شغلِ پاس انفاس کی تعلیم فرمائی۔ مگر ا[فسوس]
کے ساتھ اعتراف ہے کہ اس تعلق سے جتنا فائدہ اٹھانا چاہیے تھا، اپنی نااہلی اور خام[ی]
کی وجہ سے نہیں اٹھا سکا، اور چند ہی سال کے بعد حضرت کا وصال ہو گیا۔

اللهم اغفرله وانزل على تربته شآبيب رحمتك ورضوانك

سرمہ
آنکھوں کی
حفاظت، شادابی
اور نکھار
کے لیے
سچے موتی
سونے چاندی کے ورق
اور ۲۶ دواؤں کا یہ مرکب
طب قدیم کے ایک
نادر نسخے سے قدیم ہی
طرز پر تیار کیا جاتا ہے۔
آنکھوں کی تمام بیماریوں
میں مفید۔
نگاہ کو قوت اور
پائداری دینے والا
ہماری خاص جستی
سلائی ۱۵ پیسے
تاجر حضرات
قواعد ایجنسی
طلب فرمائیں
لگتا بالکل نہیں ہے بلکہ
ٹھنڈک اور سکون پہونچاتا ہے
ایک تولہ
۷/-
چھ ماشہ
۴/-
ڈاک خرچ
۲/۵۰
کوئی بھی تین شیشی ایک ساتھ طلب کرنے پر ڈاک خرچ معاف
دار الفیض رحمانی
دیوبند۔ یو۔پی

پاکستان کا المیہ

(از ڈاکٹر اسرار احمد)

[پاکستان اور بنگلہ دیش کے قضیے میں، اس قضیے کے آغاز سے اب تک ہم نے کئی بار لکھا ہے، گزشتہ اشاعت میں بھی ضمناً یہ موضوع زیر بحث آگیا ہے۔ الحمد للہ اس کی تو گنجائش کسی کے لیے نہیں ہے کہ اس مسئلے میں ہماری رائے کو "نیشنلزم" پر محمول کرے، پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ کتنوں ہی کے لیے یہ رائے تلخ ہے اور ان کے دل شاکی ہیں کہ ہم یہ کیا لکھتے رہتے ہیں — ایسے لوگوں کو اور تلخ کرنے کے لیے نہیں بلکہ حقیقت سمجھانے کی ایک کوشش کے طور پر ذیل میں ہم لاہور کے ماہنامہ "میثاق" کا ایک اداریہ نقل کر رہے ہیں جو جنوری فروری ۱۹۷۲ء کے شمارہ کا ہے اور ہمیں مئی ۱۹۷۲ء کے دوسرے ہفتے میں دستیاب ہوا ہے۔ جن لوگوں نے اس موضوع پر ہماری تحریریں پڑھی ہیں وہ دیکھیں گے کہ جو کچھ ہم نے یہاں بیٹھ کر پورے اعتماد کے ساتھ لکھا ہے اس کے ایک ایک لفظ کی تصدیق اور تائید اس پاکستانی ماہنامہ اور اس کے پاکستانی ایڈیٹر کے قلم سے ہو رہی ہے۔ مرتب]

دسمبر ۱۹۷۱ء کا شمارہ پاک ہند جنگ کے دوران شائع ہوا تھا اور اس کے "تذکرہ و تبصرہ" میں ہم نے "وقت دعا ہے....!" کے عنوان سے عرض کیا تھا کہ

"کل کیا ہوگا — "وما تدری نفس ماذا تکسب غدا"[1]

[1] "اور نہیں جانتا کوئی ذی نفس کہ کل وہ کیا کمائے گا۔" سورۂ لقمان آیت ۳۴

کے مصداق کسی کو معلوم نہیں اور اس جنگ کا مجموعی نتیجہ کیا نکلے گا وہ بھی "وَأَنَّا لَا نَدْرِي أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَن فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا"[1] کے مصداق کسی کے علم میں نہیں ...."

تو اگرچہ ہم ان لوگوں میں سے تو نہیں تھے جو "فتح لازماً ہماری ہوگی!" اور ہم عید کی نماز دہلی اور کلکتہ میں پڑھیں گے!" کی قسم کی بڑیں ہانکتے تھے۔ تاہم اس اقرار میں ہمیں کوئی باک محسوس نہیں ہوتا کہ ایسی ذلت آمیز شکست کا تو ہمیں تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ مشرقی پاکستان کی مخصوص جغرافیائی پوزیشن کے سبب سے یہ خدشہ تو ہمیں کبھی کبھی ہوتا تھا کہ کہیں مشرقی پاکستان ہماری فوج کا قبرستان نہ بن جائے[2]۔ لیکن یہ کبھی تصور میں بھی نہ آسکتا تھا کہ مشرقی پاکستان عالم اسلام کی سب سے بڑی مسلمان مملکت کی عزت و ناموس کی شمشان بھومی کی صورت اختیار کرے گا اور ایک ایسی فوج کے ایک لاکھ کے لگ بھگ جوان اور افسر انتہائی ذلت کے ساتھ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے جس کی شجاعت کا ڈنکہ صرف عالم اسلام ہی میں نہیں پوری دنیا میں بجتا ہے اور جس کی بہادری کے اپنے ہی نہیں دشمن بھی معترف ہیں۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کے دوران کئی بار ایسا ہوا کہ انھیں دشمنوں کے ہاتھوں عبرتناک شکستیں اٹھانی پڑیں۔ تاریخ کے اوراق میں ایسے کئی مواقع کی داستانیں تفصیل کے ساتھ محفوظ ہیں، چنانچہ جب کبھی پڑھنے میں آتا کہ اس طرح کے مواقع پر کئی کئی لاکھ کی تعداد میں یہودی مرد عورتیں اور بچے اسیر بنا لیے جاتے تھے تو حیرت ہوتی تھی کہ کیا واقعی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک قوم ابھی لاکھوں کی تعداد میں موجود ہو لیکن اسیری کی ذلت کو قبول کر لے۔ اور جیسا کہ بنو کد نصر کے حملے کے بعد ہوا، بالکل بھیڑ بکریوں اور ڈھور ڈنگروں کی طرح لاکھوں کی تعداد میں ہنکا کر ایک ملک سے دوسرے ملک کو لے جائی جائے۔

______ افسوس کہ ملت اسلامیہ پاکستان نے اپنی آنکھوں سے جیتے جی یہ منظر دیکھ لیا کہ اس کے ایک لاکھ کے لگ بھگ کڑیل جوانوں نے نہ صرف یہ کہ انتہائی ذلت آمیز طریقے پر دشمن کے سامنے

---

[1] "اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کی شامت آگئی ہے یا ان کا رب ان پر کرم فرمائی کا ارادہ رکھتا ہے۔" سورہ جن آیت ۱۰۔

[2] چنانچہ مخدومی پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے یاد دلایا کہ بالکل ان ہی الفاظ میں ایک بار راقم نے اس خدشے کا اظہار ان کے سامنے کیا تھا!

ہتھیار ڈالے بلکہ انھیں اس حال میں "بنگلہ دیش" سے بھارت منتقل کیا گیا کہ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے ——— اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ،

اس حادثہ فاجعہ پر جو کرب و الم نہ صرف مسلمانان پاکستان بلکہ مسلمانان عالم نے محسوس کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ بیان سے باہر ہے۔ کتنے ہی لوگوں کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ کاش کہ ہماری یہ فوج ایک ایک کر کے کٹ مرتی لیکن ہتھیار نہ ڈالتی۔ ہر شخص اپنے دل میں غم کا ایک بند طوفان لیے پھرتا ہے اور پوری قوم کے احساسات میں تلخی کا زہر گھل کر رہ گیا ہے

اس صورت حال میں اس چیز کی شدید ضرورت ہے کہ رنج والم اور درد و کرب کے احساسات کو زبان اظہار عطا کرنے کے ساتھ ساتھ سنجیدگی سے تجزیہ بھی کیا جائے کہ جو کچھ پیش آیا اس کے اسباب کیا تھے۔ حقیقی غلطی کہاں تھی اور کتنی تھی، بلکہ یہ بھی کہ واقعہ جو پیش آیا ہو وہ حقیقت میں ہے کیا؟ اور اس سے ہماری کمزوریاں یا خامیاں ظاہر ہوئی ہیں تو کون سی؟ ——— تاکہ قوم پر بحیثیت مجموعی ناامیدی اور مایوسی کی جو کیفیت طاری ہو گئی ہے وہ ختم ہو اور بے اعتمادی اور غیر یقینی کے بادل جو ملک و ملت کی فضا پر چھا گئے ہیں وہ چھٹ جائیں۔

ہمارے نزدیک "سقوطِ مشرقی پاکستان" ایک حادثہ نہیں بلکہ دو واقعات کا مجموعہ ہے، اور کسی حقیقی تجزیے کے لیے لازمی ہے کہ ان دونوں پر آغاز ہی سے علیحدہ علیحدہ غور کیا جائے۔ ان میں سے ایک تو ہے مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی اور وہاں ایک نئی خود مختار مملکت کا "بنگلہ دیش" کے نام سے قیام اور دوسرا ہے ——— پاک ہند جنگ میں پاکستان کی ذلت آمیز شکست اور عبرتناک ہزیمت۔ ان دونوں حوادث کے جمع ہو جانے اور بیک وقت وقوع پذیر ہونے کو چاہے تو اتفاقی طور پر اپنی بدقسمتی پر محمول کر لیا جائے چاہے چند افراد کی نااہلی اور بدتدبیری یا غداری پر، چاہے پوری قوم کی سیاسی بے شعوری اور اجتماعی نابالغی پر، بہر حال یہ حقیقت ہے کہ یہ ہیں دو بالکل جدا جدا حادثات اور انھیں گڈمڈ کرنا کسی طور پر درست نہیں، اس لیے کہ اس حادثے کی اصل تلخی دوسرے جزو سے متعلق ہے نہ کہ پہلے سے!

جہاں تک مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی کا تعلق ہے، اس سے پہلے کہ

ہم اس واقعے پر اپنا حالیہ "تبصرہ" پیش کریں مناسب ہے کہ آج سے ڈھائی سال قبل جولائی ۶۹ء کے "تذکرہ و تبصرہ" میں ہم نے اس مسئلے کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اسے دوبارہ قارئین کی خدمت میں پیش کردیں۔

اس "تذکرہ و تبصرہ" کا آغاز ہم نے بانیٔ پاکستان محمد علی جناح مرحوم کے اس مشہور فقرے سے کیا تھا کہ:

"GOD HAS GIVEN US A GOLDEN OPPORTUNITY TO SHOW OUR WORTH AS ARCHITECTS OF A NEW STATE AND LET IT NOT BE SAID THAT WE DID NOT PROVE EQUAL TO THE TASK."

اور اس کے بعد عرض کیا تھا کہ

"افسوس کہ آج جبکہ پاکستان کو قائم ہوئے بائیس سال ہونے کو آئے اور خود محمد علی جناح مرحوم کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بیس سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا، مملکت خداداد پاکستان بزبان حال نوحہ خواں ہے کہ اس کے بانی و محسن کا خدشہ صحیح ثابت ہوا اور اس نئی مملکت کو وہ معمار میسر نہ آسکے جو ایک انگریز شاعر کے قول کے مطابق اس کے ستونوں کو نہایت گہری اور پختہ بنیادوں سے اٹھاتے اور پھر تعمیر کرتے ہوئے اوج ثریا تک پہنچا دیتے۔"

پھر اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے اسباب میں سے "تین تاریخی عوامل" پر گفتگو کی تھی اور تین ایسی "پیچیدگیوں" کا ذکر کیا تھا جو "قیام پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہو گئی تھیں اور گویا پاکستان کی تعمیر ہی میں مضمر ہیں اور جن کا الجھاؤ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے ....." اور پھر ان میں سے ایک کے بارے میں عرض کیا تھا کہ:

"ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین پیچیدگی خالص جغرافیائی ہے یعنی یہ کہ مملکت خداداد پاکستان دو ایسے علیحدہ اور دور دراز خطوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر واقع ہوئے ہیں اور جن کے درمیان ایک ایسی مملکت حائل ہے جو حالت جنگ ہی میں نہیں عین حالت امن میں بھی ایک بالقوہ دشمن ——

(POTENTIAL ENEMY) کی حیثیت رکھتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یوں تو اگرچہ پاکستان کا وجود ہر اعتبار ہی سے ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن خاص اس اعتبار سے تو یہ تاریخ عالم کا ایک نہایت ہی انوکھا اور محیر العقول تجربہ ہے جس کی شاید ہی کوئی دوسری نظیر کبھی موجود رہی ہو۔

یہ جغرافیائی پیچیدگی بجائے خود بھی کچھ کم اہم اور الجھی ہوئی نہ تھی لیکن دو مزید عوامل نے اس کے الجھاؤ کو دوگونہ کر دیا ہے ـــــ یعنی ایک تو اس حقیقت نے کہ تہذیب، تمدن، زبان، لباس، طرز بود و باش اور جذباتی و ذہنی ساخت غرض ایک مذہب کے سوا ہر اعتبار سے ان دو خطوں کے رہنے والے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور اگر دین و مذہب کے سوال کو خارج از بحث کر دیا جائے تو دنیا کے مروجہ معیارات میں سے کسی معیار کے اعتبار سے بھی انھیں ایک قوم قرار نہیں دیا جا سکتا ـــــ اور دوسرے اس واقعے نے کہ ان دو خطوں میں سے جو خطہ رقبہ، محل وقوع، دفاع اور تعمیر و ترقی کے امکانات، الغرض تمام اعتبارات سے اہم تر ہے، وہ بلحاظ آبادی کم تر ہے اور دوسرا خطہ جو نہ صرف یہ کہ ان تمام اہم وجوہ کے اعتبار سے بہر حال ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ ایک نہایت جاندار، فعال، سرمایہ دار اور تعلیم یافتہ، غرض ہر اعتبار سے نہایت مؤثر لیکن پاکستان کے اساسی نظریے کی دشمن اور اس کے عین وجود سے بغض و عداوت رکھنے والی اقلیت کی اضافی پیچیدگی بھی لیے ہوئے ہے، تعداد نفوس انسانی کے لحاظ سے پہلے خطے سے برتر ہے۔ ذرا دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دو اضافی عوامل کی بنا پر اس خالص جغرافیائی اشکال نے ایک نہایت پیچیدہ مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہے۔

اور یہ اسی پیچیدگی اور اشکال کا نتیجہ ہے کہ بائیس سال کی طویل مدت میں بھی پاکستان کا کوئی دستور نہیں بن سکا اور دستور سازی کے میدان میں نہ صرف یہ کہ ہنوز روز اول کا معاملہ ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دور دور تک امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی اور الجھاؤ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے!!!

اس اشکال اور الجھاؤ کا مستقل حل تو ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ دینی جذبات اور ملی احساسات کو مسلسل اجاگر کیا جاتا رہے اور اس جذبہ کے دوام اور تسلسل کا مستقل اور پائدار بندوبست کیا جائے جو ایک دوسرے سے اتنے بعید اور باہم اس قدر مختلف خطوں کے ایک مملکت میں

شامل ہونے کا سبب بنا تھا تاہم فوری طور پر بعض دوسری چیزیں بھی پیشِ نظر رہنی ضروری ہیں۔
ایک یہ کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اس "سنجوگ" کا برقرار رہنا مشرقی پاکستان کے عوام کی آزاد مرضی پر منحصر ہے اور اسے کسی طرح بھی ان پر ٹھونسا نہیں جا سکتا۔ بلکہ اس معاملے میں جبر و تشدد کا ردِ عمل نہایت خوفناک ہو سکتا ہے۔
دوسرے یہ کہ اس "آزاد مرضی" کا انحصار بھی جتنا کچھ دینی جذبات اور ملی احساسات پر ہے اتنا ہی اس امر پر بھی ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ محسوس کریں کہ ہمارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو رہی ہے بلکہ مثبت طور پر انھیں یہ احساس بھی ہو کہ خود ان کا مفاد مغربی پاکستان کے ساتھ جُڑے رہنے سے وابستہ ہے اور مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں ایک دوسرے سے پیوستہ رہ کر ہی دنیا میں ایک باعزت اور باوقار آزاد مملکت کی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ اگر خدا نخواستہ کبھی "علیحدگی" کی صورت پیدا ہوئی تو مغربی پاکستان کے لیے تو پھر بھی امکان غالب موجود ہے کہ وہ اپنی آزاد باوقار حیثیت کو برقرار رکھ سکے گا۔ لیکن مشرقی پاکستان کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوگا کہ کسی دوسری وسیع تر قومیت میں ضم اور کسی دوسری بڑی مملکت میں جذب ہو کر رہ جائے۔
ان دو امور کی روشنی میں جائزہ لیا جانا چاہیے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی مرضی دراصل کیا ہے؟ ـــــ اگر وہ واقعۃً مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو کر ایک آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے کے خواہشمند ہیں تو ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کی اس خواہش کے آڑے نہیں آ سکتی ـــــ بین الانسانی علائق میں سب سے زیادہ مقدس رشتہ میاں اور بیوی کا ہوتا ہے، لیکن اس میں بھی دینِ فطرت نے علیحدگی کی ایک سبیل رکھ دی ہے اور صاف ہدایت کی ہے کہ اگرچہ "طلاق" حلال چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے تاہم "معلق" رکھنے سے بہتر یہی ہے کہ علیحدگی اختیار کر لی جائے ـــــ بالکل اسی طرح اگر ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی واقعۃً یہ محسوس کرتے ہوں کہ مغربی پاکستان کے ساتھ جُڑے رہنے میں انھیں کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے تو ان کی بے اطمینانی کے سبب سے پورے ملک کی سیاسی و دستوری زندگی کو مسلسل معطل رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ ان کی مرضی کو بروئے کار آنے کا موقع دے دیا جائے۔"

اس قدر طویل اقتباس کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی حادثے کے وقوع پذیر ہو جانے کے بعد تو ہر شخص ہی 'پنڈت' بن جاتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اپنی اس تحریر میں اس "انتشار اور الحاد" کے جس مستقل حل کی طرف اشارہ کیا تھا، یعنی یہ کہ "دینی جذبات اور ملی احساسات کو مسلسل اجاگر کیا جاتا رہے اور اس جذبے کے دوام اور تسلسل کا مستقل اور پائیدار بندوبست کیا جائے جو ایک دوسرے سے اتنے بعید اور باہم اس قدر مختلف خطوں کے ایک مملکت میں شامل ہونے کا سبب بنا تھا۔" وہ تو نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ البتہ "جتنی قابل حذر چیزوں کا ذکر ہم نے کیا تھا، شامت اعمال سے وہ سب کی سب بدترین صورتوں میں رونما ہو کر رہیں۔ چنانچہ جب یہ کمزور رشتہ کمزور تر ہوتا نظر آیا تو نہ تو مشرقی پاکستان کے عوام کی "آزاد مرضی" کو بروئے کار آنے کا موقع دیا گیا، نہ ان سے سیدھی طرح بات ہی کی گئی، بلکہ اس کے برعکس "جبر و تشدد" کی راہ اختیار کی گئی اور دفعۃً طاقت و قوت کا سخت ترین استعمال کر لیا گیا۔ نتیجۃً اس کا "ردِ عمل" بھی "نہایت خوفناک" صورت میں سامنے آیا۔

اور آج ہم اس صورت حال سے دوچار ہیں کہ ایک طرف مغربی پاکستان کے عوام کی گردنیں شدید ترین احساسِ ذلّت و رسوائی سے جھکی ہوئی ہیں اور ان کی آنکھوں میں مایوسی اور دل شکستگی کے مہیب سائے ڈیرہ ڈالے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف وہ حسین و زرخیز اور سرسبز و شاداب خطہ جسے دنیا ربع صدی تک 'مشرقی پاکستان' کے نام سے جانتی رہی ہے نہ صرف یہ کہ ہم سے کٹ گیا ہے بلکہ اس وقت دشمن کے قبضے میں ہے اور اس بات کا حقیقی خطرہ موجود ہے کہ کہیں وہ مستقل طور پر "مہابھارت" میں "ضم" اور ہندی قومیت میں "جذب" ہو کر نہ رہ جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ دسمبر ۷۰ء کے عام انتخابات کے بعد پاکستان میں جو حالات اور واقعات رونما ہوئے وہ ہمارے سابق حکمراں ٹولے کی شدید نااہلی اور انتہائی بے بصیرتی و بے تدبیری حتی کہ بدنیتی اور بددیانتی کے شاہکار تو ہیں ہی، مجموعی اعتبار سے ہماری پوری قوم کے سیاسی افلاس کا بھی منہ بولتا ثبوت ہیں —— ہم نے گزشتہ پورے سال کے دوران اس موضوع پر بالکل قلم اس لیے نہیں اٹھایا کہ مارشل لا کی تلوار سر پر لٹکی ہوئی تھی اور زبان و قلم پر سخت پہرے قائم تھے چنانچہ ستمبر/اکتوبر ۷۱ء کے "تذکرہ و تبصرہ" میں ہم نے عرض بھی کر دیا تھا کہ:

"جہاں تک ملکی حالات کا تعلق ہے ان پر کچھ لکھنے پر ابھی طبیعت بالکل آمادہ نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ بحالات موجودہ "پورا سچ" (WHOLE-TRUTH) کہنا ممکن نہیں اور جزوی صداقت (HALF TRUTH) کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ وہ بسا اوقات جھوٹ اور کذب کی صورت اختیار کر لیتی ہے لہٰذا جب تک قلم غیر معمولی حالات کی بنا پر عاید شدہ پابندیوں سے آزاد نہیں ہو جاتا ہم منقار زیر پر رہنے ہی کو ترجیح دیتے ہیں ...."

ہماری حتمی رائے جو مندرجہ بالا اقتباس کے بین السطور میں بھی موجود ہے، یہ ہے کہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کو ابتدا ہی سے ایک ملک متصوّر کر کے سفر کا آغاز اگرچہ نہایت خلوص کے ساتھ اور "INABSOLUTEGOODFAITH" ہوا تھا تاہم تھی یہ ایک غلطی۔ اس کے برعکس صحیح شکل وہی تھی جس کے جانب مشہور و معروف "قرارداد لاہور" میں اشارہ کیا گیا تھا یعنی یہ کہ جغرافیائی حقائق کا منہ چڑانے کی بجائے ان کا مناسب لحاظ کیا جاتا اور ان دونوں خطوں کو ابتدا ہی سے دو آزاد اور خود مختار ملک تصوّر کر کے سفر کا آغاز کیا جاتا۔ اس صورت میں غالب امکان یہی تھا کہ ایک طرف تو یہ دونوں ملک بھارت کی مشترک دشمنی کے زیر اثر آپ سے آپ بغیر کسی بیرونی دباؤ کے ایک دوسرے کے ساتھ نہایت قریبی تعاون اور اشتراک عمل رکھنے پر مجبور ہوتے اور دوسری طرف مشرقی پاکستان میں مقامی ہندو سرمایہ داروں کے غریب مسلمان عوام کے معاشی استحصال کا وہ احساس و شعور بھی برقرار رہتا جو پاکستان کے وجود میں آنے کا اصل اور بنیادی محرک بنا تھا۔ لیکن افسوس کہ ہم بحیثیتِ قوم چاہے خالص عارضی اور محض وقتی طور پر ہی سہی بہرحال آزادیٔ ہند سے متصلاً قبل کے زمانہ میں جذبۂ ملی سے اس درجہ سرشار ہو گئے تھے کہ نہایت ٹھوس حقائق بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، اور ہم نے ان دونوں دور دراز خطوں کا "سنجوگ" ایک متحدہ ملک کی صورت میں قائم کر دیا۔ یہ دراصل قومی سطح پر ہمارے سیاسی افلاس کا ایک بہت بڑا ثبوت اور ہمارے قومی مزاج کی جذباتیت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر بحیثیت قوم ہم میں کچھ بھی سیاسی شعور ہوتا تو ہم بہت جلد اس غلطی کا احساس و ادراک کر لیتے۔ اس لیے کہ خان لیاقت علی خان مرحوم کی بی پی سی رپورٹ کا حد درجہ حسرتناک انجام

اسی لیے ہوا تھا کہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کے مابین بندھن کے لیے کوئی قابلِ قبول دستوری فارمولا تلاش نہ کیا جا سکا۔ لیکن ہماری "جذباتیت" اور حقائق سے گریزی کی مستقل عادت پھر آڑے آئی اور ہم نے حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد پاکستان میں حکومت کی سطح پر سازشوں اور انقلابوں کا جو چکّر چلا اس کا اصل اور بنیادی سبب تو اگرچہ یہ تھا کہ یہاں جو قوم آباد تھی وہ دفعتہً "آزاد" تو ہو گئی تھی لیکن اس کا سیاسی و اجتماعی شعور ابھی بالکل خام تھا اور یہاں قومی سطح پر نہ کوئی محکم تنظیم موجود تھی نہ مضبوط قیادت لیکن اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ جب ملک کی کوئی دستوری اساس قائم نہ ہو سکی تو لامحالہ ؎ "خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری!" کے مصداق بے دستوری ہی یہاں کا دستور اور بے آئینی ہی یہاں کا آئین قرار پایا۔ چنانچہ ملک و ملت کا سفینہ کچھ عرصہ تو سازشوں اور انقلابوں کے چھوٹے چھوٹے گردابوں میں ہچکولے کھاتا رہا اور بالآخر ایک بڑے بھنور میں آپھنسا۔ اور ایوب خاں کا گیارہ سالہ "سنہری دور" شروع ہو گیا جس کے دوران میں صدارتی طرزِ حکومت نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کے سیاسی محرومی کے احساس کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔

اس میں شک نہیں کہ دورِ ایوبی میں مشرقی پاکستان میں صنعتی ترقی وغیرہ کی صورتوں میں وہاں کے عوام کی اشک شوئی اور دلجوئی کی بہت سی کوششیں بھی ہوئیں لیکن اس کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ ان تمام کوششوں کے علی الرغم رفتہ رفتہ مشرقی پاکستان واقعتہً مغربی پاکستان کی نوآبادی (COLONY) بنتا چلا گیا جس سے وہاں فطری طور پر سیاسی بے چینی مسلسل بڑھتی چلی گئی۔

اس صورتِ حال سے دشمن نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ ایک طرف مشرقی پاکستان کی اس ہندو اقلیت نے جلتی پر تیل ڈالا جو خود ہمارے الفاظ میں "نہایت جاندار، فعال، سرگرم اور تعلیم یافتہ۔ غرض ہر اعتبار سے نہایت موثر لیکن پاکستان کے اساسی نظریے کی دشمن اور اس کے عین وجود سے بغض و عداوت رکھنے والی تھی۔" اور جو وہاں زبان اور کلچر کی بنیاد پر جداگانہ قومیت کے احساس کو اجاگر کرنے کا کام بھی مسلسل بیس سال سے کر رہی تھی۔ ہندوؤں کو ابھی اس نہج پر کام کرکے کسی نتیجے پر پہنچنے میں یقیناً بہت مدت تک جد و جہد کرنی پڑتی لیکن اس سیاسی بے چینی نے ان کے لیے ایک سنہری موقع فراہم کر دیا اور انھوں نے سیاسی محرومی کے احساس کو باسانی مغربی

پاکستان کے خلاف جذبہ نفرت (HATE COMPLEX) میں تبدیل کر دیا۔ اور دوسری طرف ہمارے عظیم ہمسائے نے اس آگ کو نہ صرف ہوا دی اور بھڑکایا بلکہ اس کے لیے ہر طرح کا ایندھن بھی فراہم کیا ـــــ نتیجۃً علیحدگی پسندی کا ایک زبردست رجحان پیدا ہوا اور اس کے لیے ایک عوامی تحریک بن پڑ گئی۔

۶۹ء میں دوسرے مارشل لا کے نفاذ کے بعد اگرچہ حکومت وقت نے بہت سی حالیہ ایسی غلطیاں بھی کیں مثلاً یہ کہ مغربی پاکستان کی وحدت کو بلاوجہ ختم کر دیا تاہم دسمبر ۷۰ء کے انتخاب کے بعد تک بحیثیت مجموعی سابق صدر یحییٰ کی نیک نیتی پر شک کے لیے کوئی گنجائش موجود نہ تھی اور ان کا ملک کو ہنگاموں اور ایجی ٹیشنوں کی فضا سے نکال کر معروف سیاسی سرگرمی حتیٰ کہ عام انتخابات کی راہ پر لے آنے میں کامیاب ہو جانا تو بلاشبہ بہت قابل قدر تھا۔ لیکن اس کے بعد کی داستان نہایت تلخ ہے اور جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں حکمراں ٹولے کی شدید نااہلی اور انتہائی بے بصیرتی اور بے تدبیری ہی نہیں بد نیتی اور بد دیانتی کا عظیم شاہکار ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے سقوط مشرقی پاکستان، کے اصل تلخ جز یعنی ہماری ذلت آمیز شکست اور عبرتناک ذلت و رسوائی کے اسباب کا آغاز ہوتا ہے۔

دسمبر ۷۰ء کے انتخابات کے نتائج سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ مشرقی پاکستان نے بحیثیت مجموعی علیحدگی پسندی ہی کے حق میں واضح فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کی آزاد ہونے کو عملاً بروئے کار آنے کا موقع دیا جاتا یا کم از کم یہ کہ ان سے واضح انداز میں بات کی جاتی اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جاتی کہ حقیقتاً وہ چاہتے کیا ہیں؟ آیا مغربی پاکستان سے مکمل علیحدگی کے خواہاں ہیں یا کسی درجے کا کوئی بندھن قائم رکھنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ راقم نے انتخابات کے نتائج مدینہ منورہ میں سنے تھے اور اسی وقت احباب سے عرض کر دیا تھا کہ اب مشرقی اور مغربی پاکستان کو کوئی طاقت ساتھ نہیں رکھ سکتی۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ؎

ہر چہ دانا کند کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار!

کے مصداق یہ علیحدگی خوش اسلوبی سے نہ ہو بلکہ بھونڈے طریق پر ہو اور صرف خرابی ہی نہیں

خون خرابے کے ساتھ ہو۔ ساتھ ہی بارگاہِ رب العزّت میں دعا بھی کی تھی کہ "پروردگار! پاکستان کے موجودہ فوجی حکمرانوں کو جنرل ڈیگال ہی کی سمجھ عطا فرمائے کہ وہ اس علیحدگی کو خوش اسلوبی کے ساتھ عمل میں لے آئیں!" لیکن افسوس کہ ہماری یہ دعا بارگاہِ رب العزّت میں قبول نہ ہوئی اور قوم کے سیاسی افلاس اور اجتماعی شعور کے فقدان کے نتائج سامنے آکر رہے۔

اب یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ سابق صدر یحییٰ خاں اور ان کے مشیروں کا "عام انتخابات" کے انعقاد کا کریڈٹ حاصل کرنے کا فیصلہ اس غلط اندازے پر مبنی تھا کہ دونوں خطوں میں چاہے کچھ بڑے بڑے گروپ بھی انتخابات جیت لیں لیکن اکثریت چھوٹے چھوٹے سیاسی گروپوں کی ہوگی جن کو مہرے بنا کر ہم سیاست کی شطرنج پر بازی کھیلتے رہیں گے۔ لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خوش قسمتی تھی یا بد قسمتی کہ ان کے یہ اندازے غلط ثابت ہوئے مغربی پاکستان میں تو پھر بھی پیپلز پارٹی کے بڑے دھڑے کے ساتھ کچھ نہ کچھ چھوٹے گروپ بھی آگئے لیکن مشرقی پاکستان میں تو ساری سیٹیں عوامی لیگ نے حاصل کر لیں۔ اور اس طرح شطرنج کی کسی بساط کے بچھنے کا امکان ہی موجود نہ رہا۔

بس یہیں سے بدنیتی کے اس سلسلے کا آغاز ہو گیا جو بالآخر انتہائی ذلّت و رسوائی پر منتج ہوا۔ پہلے تو تین ماہ شش و پنج ہی میں گزار دیے گئے۔ پھر اسمبلی کا اجلاس طلب بھی کیا تو اس پیشگی اہتمام کے ساتھ کہ وہ بالفعل منعقد نہ ہونے پائے۔

اس مرحلہ پر پاکستان کے موجودہ صدر مملکت اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا کردار بھی نہایت مشکوک اور صد درجہ تباہ کن ثابت ہوا۔ اور اب چاہے بھٹو صاحب اپنے اس وقت کے مؤقف کی کیسی ہی خوشنما تاویلیں کر لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ داغ ان کے دامن پر ہمیشہ قائم رہے گا کہ وہ چاہے دانستہ اس سازش میں شریک نہ رہے ہوں اور محض نادانستہ ہی استعمال ہوئے ہوں بہرحال ایک بہت بڑی تباہی کے اسباب میں شامل ضرور ہو گئے۔ ان کے بارے میں ہمارا اندازہ یہ تھا کہ ان کی جذباتی، سیماب وش، جلد باز اور VOLA-TILE شخصیت کے ظاہری خول کے اندر ایک سنجیدہ، حقیقت بیں اور ٹھوس CALCU-LATING شخصیت چھپی ہوئی ہے لیکن افسوس کہ مشرقی پاکستان کے معاملے میں انھوں

نے کسی تدبر اور معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں دیا۔

اس مسئلے میں تھوڑا سا الزام ہماری رائے میں مغربی پاکستان کے دائیں بازو کے ان شکست خوردہ سیاست دانوں پر بھی آتا ہے جنھوں نے انتخابات کے فوراً بعد بھٹو دشمنی کے جذبات سے مغلوب ہو کر شیخ مجیب الرحمٰن کی مدح سرائی اور کاسہ لیسی شروع کر دی اور اس طرح گویا بھٹو صاحب کو بالکل (CORHER) کر دینے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ہمارے نزدیک یہ ان لوگوں کی بے تدبیری اور ناسمجھی کا بہت بڑا ثبوت تھا۔ لیکن اگر بھٹو صاحب کا رویہ ان کے اس طرز عمل کے ردِ عمل کے طور پر تھا تب بھی یہ بھٹو صاحب کے اپنے فہم اور تدبر کے دامن پر ایک بہت بڑا داغ ہے۔

بہر حال اسمبلی کے انتہائی تاخیر کے ساتھ طلب کیے جانے اور پھر ملتوی کر دیے جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں نے محسوس کیا کہ ہم اپنا مقصود آئینی طریق پر حاصل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ حالات بگڑنے شروع ہوئے، قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا جس پر پہلے تو حکومتِ وقت نے نہایت پُر اسرار خاموشی اختیار کی اور پھر یکبارگی سخت ترین ملٹری ایکشن کا آغاز کر دیا۔

اس کے بعد کی داستان بہت طویل ہے اور داستان سرائی یہاں مقصود نہیں۔ مختصراً یہ کہ ملٹری ایکشن کے نتیجے میں لاکھوں افراد گھر بار چھوڑ کر بھارت بھاگ گئے جسے بھارت نے اپنا مسئلہ بنا لیا۔ اور اس کے پردے میں پہلے گوریلے اور مسلح تخریب کار بھیج کر اور پھر براہِ راست حملہ کر کے مشرقی پاکستان کے لیے فوری خطرہ پیدا کر دیا۔ اور پھر وہ چودہ روزہ جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں پاکستان کو ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی اور مشرقی پاکستان "بنگلہ دیش" بن گیا۔

جہاں تک اس "ذلت آمیز شکست" اور "عبرتناک ہزیمت" کے اسباب کا تعلق ہے اب تک اس موضوع پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ سے یہی ہمارے عوام کی گفتگوؤں کا موضوع بھی رہا ہے اور "دانشوروں" کے تجزیوں کا بھی۔ اور اب تو اس قضیے کے باقاعدہ تصفیے کے لیے ایک اعلیٰ سطح کا کمیشن بھی کام کر رہا ہے۔ تاہم اس مسئلے کے بعض

بعض پہلو ایسے ہیں جو عوام کی نظروں سے تو اوجھل رہیں ہی، ہمارے علم کی حد تک دانشوروں نے بھی کم از کم تا حال دانستہ یا نادانستہ ان سے اعراض ہی کیا ہے۔ رہا حمود الرحمٰن کمیشن تو غالباً یہ پہلو اس کے دائرۂ تحقیق و تفتیش (SCOPE) سے بھی باہر ہی رہیں گے۔ لہٰذا ہماری رائے میں ان صفحات میں ان کی جانب مختصر اشارہ مناسب رہے گا۔

اب تک جو کچھ کہا اور لکھا گیا ہے اس کا مرکز و محور سابق صدر یحییٰ خاں اور ان کے رفقائے کار فوجی حکمران رہے ہیں۔ اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ اس شکست کے فوری اسباب.... (EXCITING CAUSES) بہر حال ان لوگوں کی شدید ترین نا اہلی، حد درجہ کی بے تدبیری اور بے بصیرتی، حوصلے کی کمی، قوتِ فیصلہ کے فقدان اور اعصاب کے ضعف کے گرد ہی گھومتے ہیں۔ اور یہ تمام چیزیں براہِ راست نتیجہ ہیں ان کی عیاشیوں اور بدکاریوں کا اور ان کے کردار کی پستی، اخلاق کی دناءت اور سیرت کے گھناؤنے پن کا۔ خمر تو کہتے ہی اسے ہیں جو عقل کو ڈھانپ لے، (الخمر ما خامر العقل) لہٰذا ہمارے ان حکمرانوں کی سمجھ بوجھ اور معاملہ فہمی تو اس راہ سے رخصت ہوئی۔ رہی ہمت و جرأت اور حوصلہ و ارادہ تو ان سب کا جنازہ بدکاریوں نے نکال دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف یہ کہ یہ لوگ خود بتاشے کی طرح بیٹھ گئے بلکہ ساتھ ہی ایک پوری قوم بلکہ روئے ارض کی پوری امّت مسلمہ کی عزت و ناموس کا دھیلا کر گئے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا یہ سب شکست کے صرف فوری اسباب ہیں اور اس بحر کی گہرائیوں میں "ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" کے مصداق تہ بر تہ تاریکیاں موجود ہیں اور صرف سطح آب پر چمکنے والی چیزوں پر نگاہ رکھنا اور گہرائیوں میں اتر کر حقائق کا مواجہہ کرنے سے گریز کرنا بھی من جملہ ان بیماریوں کے ہے جو ہمیں اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں۔ اس لیے کہ یہ درحقیقت قومی سطح پر گریز اور فراریت کا وہ مرض ہے جس نے پوری قوم کا مزاج اس طرز پر ڈھال دیا ہے کہ ہر ناکامی اور ہر خرابی کی ساری ذمہ داری کسی ایک یا چند افراد یا کسی ایسے گروہ یا طبقے کے سر تھوپ کر پوری قوم اپنی جگہ مطمئن ہو جائے اور بڑی سے بڑی ناکامی پر بھی نہ اس کا اجتماعی شعور بیدار ہو، نہ اسے اپنی خامیوں

اور کوتاہیوں کا احساس وادراک ہو سکے اور نہ ہی اس کے قومی ضمیر میں کوئی خلش یا چبھن پیدا ہو۔ اس صورتِ حال کی ذمہ داری سب سے بڑھ کر دانشوروں اور خصوصاً صحافیوں پر عائد ہوتی ہے کہ ان کا دماغ اور قلم اکثر و بیشتر قوم کے اجتماعی شعور کو تھپک تھپک کر اور لوریاں دے دے کر سلانے ہی کا کام کرتا ہے۔ اب یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ اس طبقے کے فہم وادراک کے قصور کا نتیجہ ہے یا مصلحت بینی اور عافیت کوشی کا ثمرہ۔ اس لیے کہ اس دور میں اصل "سلطان جائر" عوام ہیں اور ان کے سامنے "کلمہ حق" کہنا ـــــ لانا ہے جوئے شیر کا!"

ہمارے نزدیک ہماری ذلت آمیز شکست کے متذکرہ بالا فوری اور سطحی سبب کے نیچے کے تہ در تہ اسباب میں سے پہلا سبب یہ ہے کہ نہ صرف اس جنگ بلکہ اس پورے قضیے میں ہمارے سے کوئی اخلاقی موقف ہی موجود نہیں تھا بلکہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں دسمبر ۷۰ء کے عام انتخابات کے انعقاد کے بعد سے جو کچھ ہوا وہ سب سے بڑی دھاندلی اور صریح بددیانتی پر مبنی تھا۔ نتیجتاً چاہے ہم خود اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے میں کتنے ہی کامیاب ہو گئے ہوں۔ بہرحال پوری دنیا کے سامنے ہم بالکل ننگے (EXPOSED) تھے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ دنیا میں جس کسی نے بھی ہمارے طرفدی الیکشن کی کسی درجے میں برداشت کی اسے کس قدر بوجھ اپنے ضمیر پر ڈالنا پڑا ہوگا۔ خود ہم اپنے موقف کی مدافعت میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہہ سکے وہ یہ تھی کہ اس حمام میں صرف ہم ہی ننگے نہیں ہیں بلکہ ع "ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند"! بھارت نے بھی تو کشمیر میں یہی کیا تھا اور خود روس بھی تو اپنے کئی حلیف ممالک میں یہی کچھ کر چکا ہے!

اس معاملے کا افسوسناک ترین پہلو یہ ہے کہ اس مسئلے میں بعض ایسے لوگوں نے بھی نہ صرف یہ کہ حکومتِ وقت کی تائید کی اور اس پر تحسین وآفرین کے ڈونگرے برسائے بلکہ عملاً امداد اور تعاون کی روش اختیار کی اور ایک بددیانت اور شرابی وزانی ٹولے کا آلۂ کار بننا قبول کر لیا جو اس ملک کے سیاسی میدان میں حق وصداقت کے سب سے بڑے علمبردار رہے ہیں اور جن کا سارا سیاسی کاروبار دین ومذہب کے نام پر چل رہا ہے! ہمارا دل اس تصور سے کانپ اٹھتا ہے کہ اگر حظ قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا! " کے مصداق اسی واقعے کو ہماری پوری قوم کی اخلاقی حس کو ناپنے کے لیے پیمانہ بنا لیا جائے تو نتیجہ کیا نکلے گا! ـــ ظلم اور دھاندلی کے

خلاف بولنے کی جرأت اور ہمت نہ ہو تو کم سے کم خاموش تو رہا جا سکتا ہے۔ یہ کتنی بڑی ابن الوقتی اور جواری پن ہے کہ انسان اپنے مفادات پر نگاہ رکھتے ہوئے اور ذاتی مواقع کے پیش نظر کسی ظالم کے ظلم میں اس کا ساجھی اور مددگار بن جائے۔ ہماری قوم کے اخلاقی دیوالیہ پن کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ اس دھاندلی کے آغاز میں تو مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی کا لیڈر اس کا آلۂ کار بن گیا اور دوسرے مرحلے (PHASE) میں جب اس لیڈر کو ہوش آ گیا اور اس نے دبی زبان سے ہی سہی ظلم کے خلاف کسی قدر بولنا شروع کیا تو اس ملک میں مذہبی سیاست کی سب سے بڑی علمبردار جماعت کو اس ظلم اور زیادتی کا آلۂ کار بننے کا شرف حاصل ہو گیا۔

شکست کے اسباب و عوامل میں سے دوسرا گہرا سبب یہ ہے کہ ہم تاحال سیاسی اعتبار سے ایک "نابالغ" قوم ثابت ہوئے ہیں اور ہمارے یہاں جو ذمہ داریاں کسی قوم کی قیادت کو سنبھالنی چاہئیں تھیں ان کا بوجھ بھی فوج کو اٹھانا پڑا ہے۔ جدید دور کی "ریاست" (STATE) ایک بڑا عظیم اور ہمہ گیر ادارہ ہے اور اس میں مختلف ذمہ داریاں مختلف طبقوں کو اٹھانا پڑتی ہیں اور "ہر کسے را بہر کارے ساختند" کے مصداق ہر طبقے کو اپنی مخصوص ذمہ داریوں کے لیے مناسب تربیت (TRAINING) دی جاتی ہے اور جس طرح ملک کے دفاع اور اس کی سرحدوں کا تحفظ نہ عوام کے بس کا ہے نہ سول انتظامیہ کے، اسی طرح اہل سیاست کے حصے کا بوجھ نہ فوج اٹھا سکتی ہے نہ سول انتظامیہ، اور کبھی قومی تنظیم اور قومی قیادت کے خلا کو کوئی دوسرا ادارہ پُر نہیں کر سکتا۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہماری حالیہ شکست قومی اور اجتماعی سطح پر ہماری مسلسل ناکامیوں (FAILURES) اور درجہ بدرجہ پسپائی کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ہے اور بظاہر تو یہ نتیجہ ہے صرف ہماری فوج بلکہ صحیح تر الفاظ میں اس کی بھی صرف سابق عیاش اور بدکردار قیادت کے بودے پن کا لیکن درحقیقت یہ منطقی انتہا ہے ہمارے سیاسی دیوالیہ پن کی اور مظہر اتم ہے پوری پاکستانی قوم کی نااہلیت اور ناقابلیت اور اجتماعی سیاسی نابالغی کا! جیسا کہ ہم نے جولائی ۶۹ء کے محولہ بالا "تذکرہ و تبصرہ" میں بھی عرض کیا تھا:—

پاکستان کی ربع صدی کی مختصر سی تاریخ کے ابتدائی گیارہ سالوں کے دوران یعنی ۴۷ء

سے ۵۸ء تک کے عرصے میں پاکستان کے سیاستدانوں کی نااہلی اور ناقابلیت کا تدریجی ظہور ہوا اور اس کے اختتام کے قریب قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور شخصیتیں اس عظیم مملکت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں بالکل ناکام ہو چکی ہیں اور ان کے ہاتھوں اب کسی خیر کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کے فطری نتیجے کے طور پر ۱۹۵۸ء میں ایک انقلاب آیا جو بظاہر اور ابتداءً تو فوجی تھا لیکن اس نے بہت جلد ایک سابق فوجی کے زیر سربراہی خالص نوکر شاہی کی صورت اختیار کر لی اور اہل سیاست کو میدان سے ہٹا کر مملکت کے دوسرے منظم ادارے یعنی سول سروسز نے ملک کے نظم و نسق کو سنبھال لیا چنانچہ دوسرا گیارہ سالہ دور جو ۵۸ء سے ۶۹ء تک جاری رہا در حقیقت بیوروکریسی کا دور تھا اور اس کے دوران قوم کے اس دوسرے طبقے کی بھی بھرپور آزمائش ہو گئی لیکن افسوس کہ اس دور کے بالکل ابتداء ہی سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا کہ قوم کا یہ طبقہ بھی دیانت و امانت اور احساس فرض کے ان اوصاف سے بہت حد تک عاری ہے جو اس عظیم ذمہ داری کو کما حقہ ادا کرنے کے لیے لازمی ہیں جو اس کے کندھوں پر آ پڑی ہے، چنانچہ رفتہ رفتہ اس طبقے کی نااہلیت بھی واضح ہوتی چلی گئی اور ۶۸ء کے اواخر میں بے اطمینانی کا وہ لاوا جو قوم کے مختلف طبقات میں اس طبقے کی دست درازیوں کے باعث کھول رہا تھا اچانک پھٹ پڑا اور اس طرح یہ دور بھی دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔

ان دونوں طبقات کی ناکامی کے بعد ملک و ملت کے پاس ایک ہی منظم ادارہ باقی رہ گیا تھا یعنی فوج۔ چنانچہ اب کی بار ایک خالص 'جرنیلی حکومت' قائم ہوئی اور فوج نے ملک کے پورے نظم و نسق کو سنبھالا۔ ہم نے اسی وقت عرض کر دیا تھا کہ:

"اس ادارے کا اصل فریضہ دفاع وطن ہے اور یہ بجائے خود اتنی عظیم ذمہ داری ہے کہ اس پر کوئی مزید بوجھ ڈالنا حد درجہ ناانصافی ہے۔ بین الاقوامی حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اس کے پیش نظر مستقبل میں دفاع وطن کی ذمہ داری یقیناً پہلے سے بھی کہیں زیادہ بھاری اور بوجھل ہو جائے گی اور ڈیفنس سروسز کے کندھوں پر اگر زیادہ دیر تک ملک کے داخلی نظم و نسق کا بوجھ بھی پڑا رہا تو اس سے دفاع وطن کے محاذ کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے اور یہ خطرہ اتنا بڑا ہے کہ اسے کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔"

اب اگر یہ ادارہ ان دو طرفہ ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے میں ناکام ہوا تو اس کا الزام جتنا ان کے سر آتا ہے اتنا ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ پوری قوم پر آتا ہے کہ اس نے اس پر اس کی بساط سے زیادہ بوجھ ڈالا ہی کیوں۔ لہٰذا سابق صدر یحییٰ خاں اور ان کے رفقائے کار کی نا اہلیت کے پردے میں در اصل پوری قوم کی ناقابلیت کا ظہور ہوا ہے اور ان کی ناکامی اصلاً پوری قوم کی ناکامی ہے یہ بالکل دوسری بات ہے کہ ارباب سیاست اور بیوروکریسی کی نااہلیوں اور ناکامیوں کے نتائج صرف اندرون ملک بدانتظامی اور بے چینی و خلفشار تک محدود رہے تھے اور فوج کی ناکامی نے ہماری خامیوں اور ناکامیوں کا بھانڈا بین الاقوامی چوراہے میں پھوڑ کر رکھ دیا اور ہم اپنے قدیم دشمن کے ہاتھوں شرمناک شکست سے دوچار ہو گئے۔

سونے کے دانتوں کا شرعی حکم

محمد منظور نعمانی

(بمبئی کے ایک دنداں ساز ڈاکٹر جو اپنے فن میں بڑے ماہر اور ممتاز سمجھے جاتے ہیں، اس عاجز کے خاص عنایت فرما دوستوں میں سے ہیں، جہاں تک علم و اندازہ ہے اللہ تعالیٰ نے دینداری اور تقویٰ کی دولت سے بھی وافر حصہ عطا فرمایا ہے، ایک دفعہ جبکہ میں بمبئی گیا ہوا تھا انھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ دانتوں کے بعض مریض ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کے لیے سونے کے دانت ہی مناسب ہوتے ہیں، دوسرے دانت کام نہیں دے سکتے — اسمیں شرعاً کوئی حرج تو نہیں ہے — میں نے ان کو بتلایا تھا کہ ایسی صورت میں سونے کے دانت لگوانے کی اجازت ہے۔

کچھ دن ہوئے اُن کا خط آیا کہ ایک صاحب جو اچھے دینداروں میں ہیں، میرے پاس آئے میں نے ان کا حال دیکھ کر سونے کے دانت لگوانے کا مشورہ دیا وہ دوسرے دن میرے پاس آئے اور بتلایا کہ میں نے ایک مولوی صاحب سے دریافت کیا تھا، انھوں نے بتلایا ہے کہ مردوں کو سونے کے دانت لگوانا جائز نہیں ہے — ڈاکٹر صاحب نے مجھے لکھا کہ آپ اس مسئلے کی پوری تحقیق کر کے مجھے بتلائیں، اگر سونے کے دانت لگوانا مردوں کے لیے جائز نہیں ہے تو آئندہ میں خود بھی احتیاط کروں گا اور اگر جائز ہے تو اس مسئلہ پر تفصیل سے اس طرح روشنی ڈالیں کہ مجھے خود بھی اطمینان ہو جائے اور جن مولوی صاحب نے ناجائز بتلایا ہے وہ بھی آپ کے جواب کی روشنی میں دوبارہ غور کر سکیں۔

ڈاکٹر صاحب کو جو جواب دیا گیا تھا، مناسب معلوم ہوا کہ اس کو الفرقان میں شائع کر دیا جائے)

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ

مخلص مکرم! زیدت الطافکم۔ سلام مسنون

اخلاص نامہ مورخہ ۱۴/ اپریل موصول ہوا ــــ آپ کی فرمائش کی تعمیل کرتے ہوئے میں نے اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے کتابوں سے بھی مراجعت کی، یہی معلوم ہوا کہ طبی نقطۂ نظر سے اگر ماہر ڈاکٹر کا مشورہ سونے کے بنے ہوئے دانت لگوانے یا سونے کے تاروں سے دانت بندھوانے کا ہو تو شرعاً جائز ہے ــــ اس کی واضح دلیل عرفجہ ابن اسعدؓ کی وہ حدیث ہے جس کو امام ابوداؤد اور امام ترمذی اور امام نسائیؒ نے اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے اور ان ہی کے حوالے سے صاحب مشکوٰۃ المصابیح نے بھی اس کو نقل کیا ہے ــــ حدیث کا مضمون یہ ہے کہ ایک جنگ میں خود عرفجہ ابن اسعدؓ کی ناک کٹ گئی تھی، انھوں نے چاندی کی مصنوعی ناک لگوا لی۔ کچھ دنوں کے بعد اس میں بدبو پیدا ہونے لگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ وہ سونے کی مصنوعی ناک لگوا لیں۔

ترمذی کی روایت میں حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں:۔

"فامرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اتخذ انفاً من ذھب"	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ارشاد فرمایا کہ میں سونے کی ناک بنوا کے لگوا لوں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب چاندی کی ناک نے کام نہیں دیا اور اس سے بدبو پیدا ہونے لگی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی ناک لگوانے کی ہدایت فرمائی ــــ اسی سے دانت کا مسئلہ بھی معلوم ہو جاتا ہے ــــ چنانچہ امام ترمذی اور امام ابوداؤد دونوں نے اس حدیث سے دانتوں میں سونے کے استعمال کا جواز سمجھا ہے، امام ترمذی نے باب باندھا ہے

"باب ماجاء فی شدّ الاسنان بالذھب" (جامع ترمذی ابواب اللباس)

اور امام ابوداؤد نے باب باندھا ہے "باب ماجاء فی ربط الاسنان بالذھب" (سنن ابی داؤد کتاب الخاتم)

اور بذل المجہود شرح سنن ابی داؤد میں اسی حدیث کے ذیل میں لکھا ہے۔

وکذا حکم الاسنان فانه یثبت هذا الحکم فیها بالمقایسة سواء ربطها بخیط الذهب او صنعها بالذهب۔

(بذل المجهود ص ۵۷ ج ۵)

اور دانتوں کا حکم بھی یہی ہے (کہ ناک کی طرح ان میں بھی سونے کا استعمال جائز ہے) یہ حکم دانتوں کے لیے اس حدیث سے بطور قیاس ثابت ہوتا ہے، پھر اس میں بھی کوئی فرق نہیں کہ دانتوں کو سونے کے تاروں سے باندھا جائے یا دانت ہی سونے کے بنائے جائیں (یعنی دونوں صورتیں جائز ہیں)

اور ہدایہ کی تخریج نصب الرایہ میں اس مسئلہ سے متعلق چند حدیثیں نقل کی گئی ہیں ان میں ایک معجم اوسط طبرانی کی یہ روایت کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے آگے کے دانت گر گئے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا کہ وہ ان کو سونے سے بندھوالیں (فامرہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یشدھا بذهب)

اور اس سے بھی زیادہ صریح وہ حدیث ہے جس کو امام زیلعی نے ابن قانع کی "معجم الصحابہ" کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن اُبی ابن سلول کے بیٹے عبداللہ رضی نے بیان کیا کہ غزوۂ اُحد میں میرے آگے کے دانت ٹوٹ گئے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم فرمایا کہ میں وہ دانت سونے کے لگوالوں۔ (فامرنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اتخذ ثنیة من ذهب)

اور مسند احمد کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دانتوں پر سونے کے خول چڑھوائے تھے۔ (انه ضبب اسنانه بذهب)

اور طبرانی کے حوالے سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ ان کے دانت سونے کے تاروں سے بندھے ہوئے تھے۔

(نصب الرایہ للامام الزیلعی ص ۲۳۷ ج ۴)

ان روایات کے بعد اس میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ بضرورت سونے کے دانت لگوانا جائز ہے ــــ ہاں اگر طبی ضرورت نہ ہو اور کوئی شخص صرف اپنی دولتمندی کے

تفاخرہ اور تفاخر کے لیے لگوائے۔ تو جائز نہ ہوگا۔

جن صاحب نے ناجائز بتلایا انھوں نے غالباً ہدایہ وغیرہ فقہ حنفی کی کتابوں میں دیکھا ہوگا کہ اگرچہ امام محمدؒ نے اس کی اجازت دی ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ اجازت کے حق میں نہیں ہیں۔ مگر صاحب ہدایہ نے امام صاحب کے قول عدم جواز کی وجہ اور بنیاد یہ بتلائی ہے کہ "دانت میں سونے کے استعمال کی ضرورت ہی نہیں ہوتی چاندی وغیرہ کا استعمال کافی ہوجاتا ہے"

(ہدایہ جلد ثالث ص۳۸۵)

اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر ماہر ڈاکٹر اس پر مطمئن ہو کہ سونے کے دانتوں کی ضرورت ہے چاندی وغیرہ سے ضرورت پوری نہ ہوگی تو پھر امام صاحب کے اصول پر بھی اس کی اجازت ہوگی ـــــ علاوہ ازیں مندرجۂ بالا احادیث و آثار کا تقاضا اور حق ہے کہ فتویٰ امام محمدؒ کے قول پر دیا جائے ـــــ واللہ اعلم

Regd. No. L-353

Monthly **ALFURQAN** Kutchery Road, Lucknow U. P.

VOL. 41 NO. 4 **JUNE, 73** Phone No. 25547

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow-1

الفرقان

لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمن سنبھلی

مولانا محمد منظور نعمانی کی

منتخب تقریریں

مولانا محمد منظور نعمانی کی ایمان افروز
اصلاحی و تبلیغی تقاریر کا مجموعہ

مرتبہ
محمد حسان نعمانی

کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے .... -/8
بنگلادیش سے .... -/8
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت فی کاپی ..... ۷۵ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد (۴۱) | بابت ماہ جمادی الاول ۱۳۹۳ھ مطابق جولائی ۱۹۷۳ء | شمارہ (۵)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۵ راگست تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہو۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو۔ اگر ۱۵ر تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، انکی اطلاع ۲۰ر تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

الفرقان کوئی سیاسی رسالہ نہیں، یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے، لیکن ملّی مسائل اس کے ادارتی صفحات کا ہمیشہ ایک خاص موضوع رہے ہیں۔ ان مسائل کے تعلق سے بسا اوقات سیاسی گفتگو بھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اہم مسائل یہاں کی سیاست سے اس طرح گتھے ہوئے ہیں کہ ان کا مطالعہ یوں بھی سیاست کی طرف سے آنکھ بند کر کے نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر جب انھیں حل کرنے کے لیے ہمارے یہاں کچھ سیاسی تحریکیں بھی چل رہی ہوں تب تو ان مسائل پر ان تحریکوں کے اثرات بھی ایک مستقل موضوعِ مطالعہ بن جاتے ہیں۔

الفرقان کی پچھلی تین اشاعتوں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سیاق و سباق میں ملک کی حکمراں جماعت اور مسلم قیادت کے رویّوں کا جائزہ اسی نقطۂ نظر کے ماتحت تھا۔ اس کی فکری رُوح یہ ہے کہ غلط روی کے نتائج سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ حکمراں جماعت کی قائد مسز اندرا گاندھی کچھ زعم اور کچھ طیش میں اگر مسلمانوں کے معاملات میں غلط چلیں تو آج بڑے مخمصے میں اپنے آپ کو گرفتار پا رہی ہیں۔ اور اب مسلمانوں کی باری ہے کہ وہ اگر محض طیش اور انتقامی جذبے کو اپنا رہنما بناتے ہیں تو یہ بہترین وقت ہاتھ سے نکل جائے گا جس میں حکمراں جماعت سے اُس کی غلطی کی تلافی کرائی جا سکتی ہے۔

ملّی معاملات پر گفتگو میں غیروں کے رویّہ پر بے لاگ بات کرنا تو سبھی کے لیے آسان ہے، مگر ہم مجبور ہیں کہ اپنوں کے ساتھ بھی رو رعایت ہم سے نہیں ہوتی۔ ہم نے اگر مسز اندرا گاندھی کے متعلق یہاں تک کہا کہ "انھوں نے علی گڑھ کے متعلق جو وعدے کیے تھے اُن میں بہت خلوص محسوس کرنے کی کوئی گنجائش ان کے پچھلے رویّے کی بنا پر نہیں تھی۔" تو مسلم قیادت کے بارے میں بھی کہا کہ "ایک وعدہ

فراموش سے بڑھ کر ایک ازلی مخالف کے روپ میں مسز گاندھی کا آجانا، بے سبب نہیں تھا، بلکہ اُن تمام لوگوں کے ایک جذباتی رویہ کا ردعمل تھا جن کا مجموعی نام "مسلم قیادت" ہے۔ اور ساتھ ہی اُن میں سے زیادہ سرگرم لوگوں کی اس وقت کی سیاسی روش کو دیکھتے ہوئے ہمیں یہ بھی کہنا پڑا اور دلائل سے اس پر روشنی ڈالنی پڑی کہ اس میں جذباتیت اور انتقامی ہیجان کے سوا کچھ نہیں ہو، جس سے مسئلہ سلجھنے کے بجائے اور اُلجھے گا۔ — اس موقع پر اگر ناظرین ان تینوں اداریوں (اپریل، مئی، جون) پر از سرِ نو نظر ڈال لیں تو بہتر ہو گا۔

ہمیں وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان مضامین پر کوئی صاحب ہمیں چھپا کانگرسی بلکہ "اندرائی" ٹھہرا دیں گے۔ لیکن نہ صرف "کسی صاحب" نے بلکہ اس مسلم قیادت کے ممتاز ترین رکن اور ہمارے محترم ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی صاحب نے یہ فردِ جرم عائد کی ہے اور اسی پر بس نہیں بلکہ پیشہ ور اہلِ سیاست کی زبان پر جو گالیاں چڑھی ہوئی ہوتی ہیں، یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ وہ بھی ڈاکٹر صاحب جیسے باوقار آدمی کی زبان قلم پر بے تکان آتی چلی گئی ہیں۔ کیا ڈاکٹر صاحب نے اور شرم ہمیں آرہی ہے! حالانکہ اس سے ہمارے تجزیہ کی حد درجہ تصدیق ہو جاتی ہے۔ کہ یہ حضرات انتقامی جوش اور جذبے میں کہ درپے تک کچھ بھی نہیں سوچتے۔ — ڈاکٹر صاحب کا یہ جوابی مضمون چونکہ چھپ چکا ہے اس لیے کوئی مضائقہ نہیں کہ ہم بھی چھاپ دیں۔ — لیجئے مع عنوان کے ملاحظہ فرمائیے۔ البتہ یہ یاد رہے کہ نقل بالکل مطابق اصل ہو۔ کوئی غلطی محسوس ہو تو وہ اصل کی سمجھئے!

"اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا"

دنیا میں ہر زمانے اور ہر سماج میں ایسے اشخاص پیدا ہوتے ہیں جو ہمہ تن جاہل، ناسمجھ اور حالاتِ زمانہ سے بے خبر رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو عقلِ کل کا مالک سمجھتے رہے ہیں اُن پر حسب ذیل شعر بالکل صادق آتا ہے۔

آں کس کہ نہ داند و بداند کہ بداند

در جہل مرکب ابد الدہر بماند

اس کے علاوہ کچھ لوگ حالتِ وقت اور سیاست وقت کو سمجھتے ہوئے بھی اپنے پیٹ اور جیب سے مجبور ہو کر اپنے ضمیر کو دبا کر ایسی باتیں کہتے ہیں جن کی

اُمید ان سے نہیں رکھی جاسکتی۔ حالات کا تقاضہ ان کو اس تقیہ پر مجبور کردیتا ہو مجھ کو ان اشخاص سے بہت ہمدردی ہے اس زمرہ میں بہت سے قابل قدر لوگ بھی ہیں جو خاندانی اعتبار سے ولد "مولانا" ہونے کے باوجود دنیاوی ضروریات ان کو غلط بات کہنے پر مجبور کردیتی ہو۔ آج کل بھی مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا ہو جو ہر غیر کانگریسی لیڈر چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کی ہر بات پر تنقید ضرور کریں گے۔ اور اس میں خرابیاں نکالنے کی ہر ممکن کوشش کررہے ہیں۔ اس گروہ نے آج تک کسی بھی مسلم کانگریسی لیڈر کو برا نہیں کہا۔ افسوس کی بات ہے کہ یہ حضرات غیر کانگریسی مسلم لیڈروں کو بُرا ضرور کہتے ہیں۔ لیکن صاف صاف یہ نہیں بتاتے کہ ان میں سب سے کم بُرا کون ہے۔ اگر وہ کسی کو اچھا قرار نہیں دے سکتے اور یہ بھی نہیں بتاتے کہ اگر حسب بالا لیڈروں نے غلط پالیسی اختیار کر رکھی ہے تو اُس کا بدل یا صحیح پالیسی کیا ہونا چاہیئے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا اور نہ کبھی کسی اندرائی مسلمان کی قیادت پر تنقید کرتے ہیں۔

حیف صد حیف کہ یہ نیابتِ رسولؐ کے دعویٰ دار اس اوچھی ذہنیت کا مظاہرہ کریں اس المیہ پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ "یہ مسلم قیادت" اور "اسلامی دعوت" پر کیچڑ اچھالنے اور بُرا بھلا کہنے ہی کو سب سے بڑا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں اور حد یہ ہے کہ اس گروہ نے عالمِ اسلامیہ کے ہندوستانی مفکر کو بھی لعن طعن کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

اسی طرح کا ایک مضمون "الفرقان" مئی ۷۳ء شمارہ نمبر ۳ بعنوان "نگاہ اولیں" نظر سے گزرا جس میں انتہائی ناشائستگی اور زبانِ صحافت سے گر کر غلط بات کو "حق" کا نام لے لے کر پیش کیا گیا ہے۔ اس مضمون کے چیدہ چیدہ جملے ناظرین ملاحظہ فرمائیں اور اندازہ کریں کہ یہ مضمون کس قدر نیچی سطح سے لکھا گیا ہے۔

۱۔ دوسری مخالف پارٹیوں کے گاڑی کے قلی بننا (ان پارٹیوں میں سے کانگریس پارٹی کے قلی بننا ان کے نزدیک کوئی بُری بات نہیں)

۲۔ بجز دیوانوں کے کون یہ خواب دیکھ سکتا ہے۔ (کیا کانگریسی مسلمانوں کے علاوہ اور سب دیوانے ہیں)

۳۔ یہی کورچشم سرتاپا جذباتی اور حرماں نصیب سیاست ہے جس سے علی گڑھ کی بگڑی کو اس بار بنانے کی کوشش مسلم قوم کے قائدین نے شروع کردی ہو۔ (مگر مصنف نے اپنی رائے ظاہر نہیں کی کہ کیا کرنا چاہیے کہ علی گڑھ اچھا ہو یا بُرا)

(۴) یہ قیادت نہیں۔ اپنے ساتھ اور بڑے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قوم کے ساتھ تمسخر ہے۔ (اگر یہ قیادت نہیں تو کیا مصنف اندرائی مسلمانوں کی قیادت بہتر سمجھتا ہے)

(۵) ایسی بے رحمانہ خود غرضی اُسے ماننا پڑے جس میں قوم کی مصلحت سے کوئی سروکار نہیں۔ (غالباً قوم کا سارا درد مضمون نگار ہی کے لیے وقف ہوگیا ہو)

(۶) اتنی بُری اور قابلِ نفرت ہو کہ ہم اسے فرض کرنے کے بجائے پہلی ہی صورت فرض کرنے کو ترجیح دیتے ہیں (پھر قابلِ عزت صرف اندرائی مسلمان کی قیادت مسلمانوں کے لیے ہی باقی رہتی ہے) (بریکٹ میں لکھے ہوئے جملے میرے ہیں)

میں نے یہ چند جملے مولانا کے مضمون سے اس لیے نقل کر دیے ہیں کہ خواہ وہ کسی بھی تمہید میں لکھے گئے ہوں معیارِ شرافت سے بہت گر گئے ہیں۔

آج کل کانگریس نے بہت سے اپنے گُرگے مسلمانوں میں محض اس لیے چھوڑے ہیں کہ وہ کسی طرح سے جا و بیجا موجودہ اپوزیشن پارٹیوں کے مسلمانوں کو بدنام کریں۔ یہ چھپے کانگریسی ان کانگریسیوں سے زیادہ ملت دشمن ہیں جو برسرِعام ایک اصول کے تحت کانگریس کے ساتھ ہیں اور دل سے یقین رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی بھلائی اب بھی کانگریس کا ساتھ دینے میں ہو۔ میں اُن کی قدر کرتا ہوں۔ برخلاف ان "چھپے دشمنوں" کے جو مسلمانوں کو کانگریس(R) کے نزدیک لانا تو چاہتے ہیں اور صاف صاف یہ بھی نہیں کہتے کہ اندرا کانگریس اچھی جماعت ہو۔ یہ حضرات یہ بھی نہیں فرماتے کہ اگر موجودہ مسلم قیادت

غلط راستے پر ہو تو کون "قائد" صحیح راستے پر ہو۔ لہٰذا سوائے ملت کی قسمت پر افسوس اور ایسے حضرات پر ملامت کے ہمارے سامنے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

آخر میں بڑے ادب سے عرض کرتا ہوں کہ آج کل اتر پردیش میں شاید ہی کوئی طبقہ ایسا ہو جو شریمتی اندرا گاندھی کی پالیسیوں سے متفق ہو۔ وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی کا نام اس وجہ سے نہیں لیتا کہ یہ بیچارے اندرا جی کے ہاتھ کٹھ پتلی کی طرح ناچ رہے ہیں اور یو۔پی حکومت کی ساری باگ ڈور اندرا جی نے اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے۔ یہ ہر وہ شخص جو حالات حاضرہ پر نظر رکھتا ہو خوب جانتا ہو۔ اس وقت سارے طبقہ جات خواہ ڈاکٹر ہوں یا وکیل، انجنیئر ہوں یا تاجر، ملازم ہوں یا دستکار، امیر ہوں یا غریب، شہری ہوں یا دیہاتی، مزدور ہوں یا کسان۔ سبھی پریشانیوں سے دو چار ہیں اور اندرا سرکار سے سخت ناراض ہیں۔ اندرا جی کے "غریبی ہٹاؤ" کے فریبی نعرے نے عوام کو سخت بدظن کر رکھا ہے۔

بیچارے مسلمان ان مشترک تکالیف کے ساتھ من حیث القوم بھی تکالیف میں مزید مبتلا ہیں۔ ایسی حالت میں ان کو یہ رائے دینا کہ وہ قومی دھارے سے کٹ کر اندرا حکومت کا ساتھ دیں۔ انتہائی نادانی ہوگی۔

یہ مضمون غالباً چند ناظرین سخت اور نامناسب سمجھیں گے لیکن میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ایسے ملت فروش مسلمان صحافیوں کی حقیقت ملت کے سامنے عیاں کر دی جائے۔"

محمد عبد الجلیل فریدی

مجھے معلوم ہے کہ لوگوں کو اس تحریر پر میرے جواب کا بڑی بیچینی کے ساتھ انتظار ہو۔ مگر میں انھیں مایوس کرتا ہوں کہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں!۔ اگر یہ ذاتیات کی جنگ کا معاملہ ہو تو میں یوں بھی ذات کے لیے مشتعل ہونے کی فطرت لے کر پیدا نہیں ہوا۔ اور ڈاکٹر صاحب تو میرے لیے قابل احترام بھی ہیں، ایک بزرگ کی حیثیت میں بارہا میں نے ان کے کرم اٹھائے ہیں۔ اور انکے بوجھے میں کبھی بھی سبکدوش نہ ہو سکوں گا۔ تو کیلئے میں انکی سیاست کو غلط سمجھتا ہوں تو ذاتی احترام کو اس میں دخیل ہونے دینا گناہ سمجھتا ہوں۔ وہ اپنی پالیسی پر میری تنقید کے دلائل اور اس کی بنیادوں سے بحث فرماتے تو میرے لیے گفتگو کا میدان

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

بوئے گل در برگِ گل

حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلوی اپنے مکتوبات کے آئینے میں

تلخیص و ترجمہ از۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

ایک مقام پر نماز اور روزے کے بارے میں ارقام فرماتے ہیں ۔۔۔ ..... نماز، جماعت کے ساتھ پڑھنا نیز رکوع و سجود اور قومہ و جلسہ کو اطمینان کے ساتھ ادا کرنا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ نماز میں اطمینان و طمانیت (تعدیل ارکان) کو بعض فقہاء نے فرض کہا ہے۔ قاضی خاںؒ نے جو مفتیانِ حنفیہ میں سے ہیں، نماز میں طمانیت کو واجب کہا ہے ۔۔۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ بھول کر اس کے چھوڑنے پر؟ سجدہ سہو آتا ہے اور جان بوجھ کر چھوڑنے پر نماز کو لوٹانا چاہیے ۔۔۔ اور جس نے طمانیت کو سنتِ موکدہ کہا ہے وہ بھی قریب بواجب کے مرادف ہے۔ ۔۔۔ علاوہ ازیں کسی سُنّت کو استخفاف کے ساتھ یعنی گھٹیا جان کر چھوڑنا کفر ہے ۔۔۔

نماز کے قیام میں کیفیت، جدا ہے۔ رکوع میں جدا ہے اور قومہ، جلسہ، سجود و قعود میں بھی نوع بنوع کیفیات و حالات حاصل ہوتے ہیں۔ نماز "جامع انواعِ عبادات" ہے ۔۔۔ نماز، تلاوت، تسبیح، درود، استغفار اور دعا کو شامل ہے۔ درخت گویا کہ قیام میں، حیوانات رکوع میں اور جمادات، قعود میں ہیں۔ نماز اِن سب کی عبادات پر مشتمل ہے ۔۔۔ نماز معراج میں فرض ہوئی ہے۔ جو کوئی نماز کو صاحبِ معراج صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر ادا کرتا ہے، وہ مقاماتِ قُرب کی بلندی پر فائز ہوتا ہے۔ اربابِ ادب و حضور، نماز میں عروج پاتے ہیں ۔۔۔ خدا اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک احسانِ عظیم اُمت

مسلمہ پر کیا ہے کہ نماز کو فرض قرار دیا ہے، پس اللہ کے لیے حمد و شکر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے درود، لاکھوں بار ـــــ

نماز میں عجیب، صفائی اور حضوری حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے پیر و مرشد (حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ) نے فرمایا ہے کہ "نماز میں اگرچہ رویتِ خداوندی نہیں ہوتی لیکن ایک ایسی حالت حاصل ہو جاتی ہے جو مانند، رویت کے ہوتی ہے" اور یہ بات مجربات میں سے ہے ـــ جس وقت بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف، تحویلِ قبلہ کا حکم ہوا تو یہود نے کہا کہ وہ نمازیں جو بیت المقدس کی طرف ہوئیں اُن کا کیا حکم ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ما کان اللہ لیضیع ایمانکم (اللہ تعالےٰ تمہارے ایمان یعنی نماز کو ضائع نہیں کرے گا) یہاں نماز کو ایمان سے تعبیر فرمایا گیا ہے ـــ پس غیر طریقۂ مسنونہ پر ادا کر کے نماز ضائع کرنا ایمان کا ضائع کرنا ہے ـــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے یعنی نماز میں حضرتِ ذات کا ایسا ظہور و شہود ہوتا ہے جو میری آنکھوں کو راحت پہونچاتا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ اَرِحْنِی یَا بِلَالُ (اے بلال مجھ کو نماز و اقامت سے راحت پہونچاؤ) جو شخص غیر نماز میں راحت سمجھتا ہے وہ مقبول نہیں ہے۔ نماز، تلاوت و اذکار کو شامل ہے۔ جو شخص نماز کو ضائع کرتا ہے دین کے دوسرے امور کو زیادہ ضائع کرے گا۔

روزہ، کلامِ لغو اور غیبت سے بے ثواب ہو جاتا ہے۔ غیبت، ثواب اعمال کو جبط و ضائع کرنے والی ہے اس سے بچنا ضروری ہے ـــ انتہائی بے وقوفی کی بات ہے کہ مشقت اُٹھا کر اعمال، انجام دیے جائیں اور اُن کا ثواب ضائع ہو جائے ـــ اعمال، درگاہ کبریا میں پیش ہوتے ہیں بے ادبی ہو گی اگر غیبت اور لایعنی امور اپنے پروردگار کی درگاہ میں روانہ کریں۔

منشی امین الدولہ احمد خاں کو تحریر فرماتے ہیں:۔

منشی صاحب والا مراتب۔ عالی مناقب السلام علیکم و رحمۃ اللہ

حضرت منشی نعیم الدین خاں صاحب نے آنجناب کے بہت مناقب بیان فرمائے

ہیں لہٰذا آپ سے گزارش ہے کہ گوشہ چشم عنایت کے ذریعے دور افتادگان کو یاد فرماتے رہیں اس بوڑھے کی عمر گناہوں میں گزر گئی۔ خالص گناہوں مثلاً غیبت اور طعن و لعن وغیرہ نے اور مخلوط گناہوں، مثلاً نمازِ بے حضور، قرأتِ بے ترتیل اور لغو ولا یعنی سے ملے ہوئے روزوں نے تلاوتِ بے تدبر اور خشیت و حضوری سے خالی اوقات نیز غفلت میں مشغول انفاس نے اعمال نامے کو سیاہ کر دیا ہے۔

افسوس صد افسوس — ہم باغ جہاں میں پھولوں کے لیے آئے تھے مگر سر پر کانٹوں (گناہوں) کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ افسوس — صحت و عافیت اور کیا بیاں اللہ نے مرحمت فرمائیں ان سب نعمتوں کے شکر میں کوتاہی واقع ہوئی، قرآن مجید اور نبی حمید صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بہت سی عنایات ہوئیں اُن کے شکریہ میں ایسی غفلت۔ معاذ اللہ — حیرت ہے کہ کل بروزِ قیامت کس طرح پیشِ رسولِ خدا قبولیت حاصل ہوگی، اس ناقابلیت کے ساتھ شفاعت و مغفرت کی امید کتنی نافہمی کی بات ہے۔ البتہ اگر سابقۂ رحمت متوجہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ تدارکِ مافات اپنے فضل سے کر سکتا ہے — اپنے پاس کوئی عذر نہیں ہے — انا للّٰہ — موت سر پر ہے اور قیامت نزدیک ہے۔ کون سا عمل کام آئے گا؟ نیک لوگ جنت میں جائیں گے اور نعمات و دیدار حضرتِ حق سے فیضیاب ہوں گے اور ہم جیسے غافل محاسبے میں گرفتار — ایسے روز جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے — ہائے ہائے کاش میں پیدا نہ ہوتا۔

اس بات کی فکر ضروری ہے کہ کل کو حسرت نہ ہو۔ سحر خیزی اور دیدۂ حسرت سے اشک ریزی اور مجاہدہ و جانفشانی کا التزام، مقربانِ بارگاہِ الٰہی سے منقول ہے — اللہ تعالیٰ غیرت و حمیت مرحمت فرمائے۔ منشی نعیم الدین خاں اور آنجناب اوقاتِ مخصوصہ میں، راہ میں تھکے ہوئے شکستہ پا بوڑھوں کو یاد فرمائیں ؎

سبک پے جواناں چو منزل رسند
نخسپند کہ واماندگاں در پس اند

(یعنی جلدی چلنے والے جوان جب منزل پر پہونچ جاتے ہیں تو اس خیال سے نہیں سوتے کہ تھکے ہوئے لوگ پیچھے رہ گئے ہیں) غائب کی دعا غائب کے واسطے بہت مقبول ہوتی ہے، جمادی الثانی

نویں شب سے درویشوں سے آپ کے واسطے دعا کرنے کے لیے کہدیا گیا ہے اور بعد ختم بھی دعا کی جاتی ہے۔ بندہ بھی دعا سے غافل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی دارین پر فائز فرمائے اور بندے کو بھی (آمین) والسلام۔

شیخ اللہ داد کو رقمطراز ہیں۔

فقیر عبداللہ عرف غلام علی کی طرف سے معلوم کریں۔ حاصل زندگانی کیا ہے؟ علم دین، جناب حق سبحانہٗ اور محبت خدا اور رسول خدا، حاصل زندگانی ہے۔ محبت کے اسباب میں سے عمل موافق علم اور دوام ذکر ہے پس اپنے اوقات تحصیل علم سے اور اپنے انفاس یادِ حق سے آراستہ رکھیں ـــ تہجد، استغفار اور دعا کے بعد آخر شب سے لے کر نماز اشراق تک تلاوت و ذکر میں مشغول رہیں .... علم صرف و نحو کے حصول کے بعد توضیح و تلویح اور معقولات میں قطبی تک نیز (علم کلام میں) شرح عقائد اور حاشیہ خیالی میں سے کوئی ایک جو میسر آجائے اس کی تحصیل کرنی چاہیے اور اپنی توجہ علم حدیث، علم تفسیر اور علم صوفیہ میں تبحر پیدا کرنے کی طرف مبذول رکھیں ـــ کتاب میں مشغول ہو کر ذکر الٰہی اور یادداشت سے غافل نہ ہوں ـــ ....

ظہر سے عصر تک شغل کتاب رکھیں۔ بعد عصر، ذکر و شغل اور استغفار کا وقت ہے ـــ نماز مغرب کے نوافل کے بعد چہارم شب تک مطالعۂ کتاب کریں۔ بعد نماز عشاء درود شریف پڑھنے کا وقت ہے .... کسی سے (دنیاوی) واسطہ اور امید نہ رکھ کر اللہ تعالیٰ کے سچے وعدوں پر یقین کر کے زندگی گزارنا چاہیے ـــ واقعات کو تقدیر حق سبحانہٗ کی طرف سے جان کر لب چون و چرا نہ کھولنا .... اپنی کوتاہی کو پیش نظر رکھ کر خود کو نیست و عدم سمجھ کر سب کے ساتھ اکرام کے ساتھ پیش آنا .... اور جتنا ہو سکے سب کے ساتھ مروت کے ساتھ پیش آنا اور بھوکوں کو دو روٹیاں اور ایک پیالہ پانی دیدینا۔ ہماری اس پُر از وسوسہ نفلی نماز سے بہتر ہے ـــ

کثرت ذکر، توجہ، نگہداشتِ حضور و آگاہی کے ساتھ دنیا سے بے تعلقی، عقبیٰ کی جانب توجہ اور موت کی استعداد (تیاری) کو اپنا شعار بنا کر اخلاقِ حسنہ، نرمی، عفو، فروگذاشت، چشم پوشی اور (برائیوں سے) اعراض، اپنی عادت بنانا اور خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کی ادائیگی، تعظیم سادات کبار اور احترام علماء و فقراء لازم رکھنا اپنے حق

سے درگذر کرنا اور دوسرے کے حق ادا کرنے کو اپنا وطیرہ بنانا ــــ یہ سب خوبیاں ذکر، توجہ اور نگہداشت سے حاصل ہوتی ہیں۔ ان خوبیوں کے حصول کی علامت خشیتِ الٰہی، دوام تضرع اور انکساری ہے۔ یہ محسوس ہونے لگے کہ وہ گویا اپنے شامتِ اعمال سے اسی وقت ماخوذ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی باطن کا احاطہ کر لے۔ اصل کام تقویٰ اور اتباعِ حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اعتقاداً، اخلاقاً، اعمالاً اور احوالاً ہر طریقے سے کوشش کرنا چاہیے کہ ہر کام میں تقویٰ اور ترک و تجرید، توکل اور تسلیم و رضا میں شرفِ متابعتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، عادت و ملکہ ہو جائے (آمین)

اللہ تعالیٰ اس "پیرِ عمرِ ضائع کردہ" کو اور تم کو ان مقاصد پر عمل کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ بمنہٖ وکرمہٖ ــــ ... مشاجراتِ صحابہ اور ایک سلک پر دوسرے سلک کو ترجیح نیز مشائخ عظام کے درمیان تفاضل ہرگز نہ کرنا چاہیے۔

اِفَادَاتِ قَاسِمِیَہ

از امامِ کبیر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی

مرتبہ۔ مولانا سعید احمد پالن پوری، استاذ دار العلوم اشرفیہ (راندیر۔ ضلع سورت)

(۸) جب ملازمت کی وجہ سے جمعہ وجماعت ادا نہ کرسکے

ایک مسترشد کو تحریر فرمایا:

"نماز روزہ بھی ضروری ہے اور روزگار بھی ضروری ہے۔ اگر جمعہ وجماعت کے چھوٹنے کا رنج بے قرار بنا دیتا ہے تو خدا کا نام لے کر (توکل کر کے) ملازمت ترک کر دو، اور دوسری جگہ تلاش کرو، خداوند قدوس رزاق ہے، کفیل رزق ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ رزق دے گا ہی ___ اور اگر ملازمت ترک کرنے کی جرأت بایں وجہ نہیں ہے کہ کوئی دوسری جگہ نظر نہیں آتی تو خاموش بیٹھو" (جب تک کوئی راہ نکلے)"۔

"نماز روزہ ہم ضروری، و روزگار ہم ضروری۔ اگر رنج جمعہ وجماعت بے قرار میدارد، بنام خدا ترک دادہ بجائے دیگر تجسس کنند، خداوند رزاق کفیل رزق است، انشاء اللہ تعالیٰ خواہد داد۔ و اگر جرأت ترک، بایں وجہ نیست کہ جائے دیگر بنظر نمی آید، خاموش بنشیند"

(مکتوبات قاسمیہ ص۸ مکتوب ۸)

(۹) استاذ کا ادب

"جو شاگرد استاذ کی خدمت میں گستاخ ہوتا ہے، عادت الٰہی یوں جاری ہے کہ علم سے بہرہ ور نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ حدیث میں ہے:

مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللہَ۔　　　یعنی: جو کوئی آدمیوں کا شکر نہ کرے گا وہ اللہ کا بھی شکر نہ کرے گا۔

اور ظاہر ہے کہ ہر چند منعم حقیقی خداوند کریم ہے، پر دولتِ علم بواسطہ استاد ہی حاصل ہوتی ہے" (اور جو استاذ کا ادب و شکر نہ کرے گا وہ اللہ کا شکر بھی نہ کرے گا پھر اُسے دولتِ علم کس طرح عطا ہو؟!)　　　(ہدیۃ الشیعہ صـ۱۷ مطبوعہ حقانیہ کراچی)

(۱۰) کفرانِ زوالِ نعمت کا سبب ہے

"شکر پر وعدہ مزید نعمت ہے چنانچہ فرمایا ہے:

لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَأَزِیْدَنَّکُمْ　　　یعنی: اگر شکر کروگے تو البتہ ہم اور زیادہ دیں گے۔

تو اس صورت میں ـ بشہادتِ عقل ـ کفران پر زوالِ نعمت متفرع ہونا چاہیے۔" (حوالہ بالا صـ۱۱)

(۱۱) بزرگی کا مدار

"بزرگی کا مدار" اطاعتِ خداوندی" پر ہے، چنانچہ کلام اللہ میں خود فرماتے ہیں:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللہِ اَتْقٰکُمْ　　　یعنی: بیشک اللہ کے نزدیک زیادہ تعظیم و

(الحجرات آیت ۱۳)　　　تکریم اسی کی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔"

(حوالۂ بالا صـ۳۱۶)

(۱۲) گناہ سے باز آجانا توبہ ہے

"وعظ کے سبب جو کوئی گناہ سے باز آئے تو وہ توبہ ہی ہوتی ہے۔ توبہ کے اور کچھ سر سینگ نہیں" (ہوتے)　(حوالہ بالا صـ۲۴۲)

(۱۳) بے وقوفوں کی اصلاح جوئے شیر لانے کے مرادف ہے

"بے وقوفوں کی اصلاح انبیاء سے بھی نہیں ہوتی...... شاہد اس کا یہ ہے کہ امام غزالی کی بعض کتابوں میں کچھ ایسا لکھا ہے کہ ایک بار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہسار کی طرف بھاگے جاتے تھے۔ کسی نے عرض کی: آپ ایسے افتاں خیزاں اس طرف کیوں جاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ایک نادان آتا ہے! اُس نے عرض کی کہ: پھر آپ کو کیا اندیشہ ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ بے وقوفی کا کچھ

علاج نہیں، وہ کسی کے فیض صحبت یا برکت نصیحت سے زائل نہیں ہوتی، اُلٹے اسی کا اثر پڑ جائے تو پڑ جائے فقط (یعنی امام غزالی کا بیان پورا ہوا) اور کسی نے سچ کہا ہے کہ ؎

لِکُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ یُسْتَطَبُّ بِہٖ　　　اِلَّا الْحِمَاقَۃَ دَاءٌ لَا دَوَاءَ لَہَا

یعنی: ہر بیماری کا کچھ نہ کچھ علاج ہے جس سے اس کے زائل ہونے کی تدبیر کی جاتی ہے، پر حماقت ایسی بیماری ہے کہ اس کا کچھ علاج ہی نہیں" (حوالۂ بالا صد ۳۱۷)

(۱۴) آمدنی کے حلال و حرام ہونے کی بنیاد

"رزق (آمدنی) اپنی حلّت و حرمت میں اُن اسباب کا تابع ہوتا ہے جس کے وسیلہ سے وہ رزق حاصل ہو۔ اگر وہ اسباب حرام ہوں تو وہ رزق بھی حرام رہے گا، اور اگر اسباب حلال و مباح ہوں تو وہ رزق بھی حلال و مباح سمجھا جائے گا۔ (مثلاً) اگر رزق تجارت، کھیتی، کھانے پکانے، سینے پرونے کی مزدوری سے میسر آئے، یا اس مال کے عوض مول لیا جائے جو اسباب مذکورہ سے ہاتھ آئے تو اس رزق کو حلال ہی کہیں گے۔ اور اگر سود۔ زنا۔ چوری۔ غصب سے۔ مثلاً۔ ہاتھ لگے تو اس کو حرام ہی کہیں گے۔ جب تک کہ صاحب مال بطیب خاطر۔ بے وجہ۔ اجازت نہ دے اور مباح نہ کرے حلال و مباح نہیں کہہ سکتے۔

اور وجہ اس کی یہی ہے کہ جو شئے جس راہ سے آتی ہے اس کی کیفیت اس کے ساتھ لاحق ہو جاتی ہے۔ دیکھئے نور اگر آئینۂ سبز، زرد، سرخ، سیاہ وغیرہ میں ہو کر آتا ہے تو ان آئینوں کی سبزی، زردی، سرخی، سیاہی وغیرہ اس کے نور کے ساتھ آتی ہیں، آدمی کے نطفہ سے آدمی ہی کی شکل کا بچہ ہوتا ہے تو اسی وجہ سے کہ وہ نطفہ اسی بدن سے آیا ہے، اور گیہوں، چنے وغیرہ کے بیج پر، اور آم، جامن وغیرہ کے تخم پر اگر ویسا ہی اناج اگتا ہے یا ویسا ہی پھل لگتا ہے تو اس کا سبب بھی یہی ہے کہ اجزاء زمین اس بیج یا تخم کی راہ سے نکل کر باہر آتے ہیں۔

الغرض، جو شئے کسی شئے پر موقوف ہو یعنی بے اس کے اس شئے کے وجود کی کوئی صورت ہی نہ ہو، تو اس شئے کا اثر اس دوسری شئے میں ضرور ہوگا۔" (فیوض قاسمیہ صد ۳۴، ۳۵)

(۱۵) حلال ہونا اور ہے قبول ہونا اور

"حلال ہونا اور ہے اور قبول ہونا اور، غرض حلال ہونے کو قبول ہونا لازم نہیں، اور

قبول نہ ہونے سے حرام لازم نہیں آتا، اگر ہماری نماز — خدانخواستہ — قبول نہ ہو، کہ ہم کہیں دھوپ اور ہمارا) دل کہیں (ہو)، تو ارکان ظاہرہ کو — جن کو قیام، قعود، رکوع، سجود کہتے ہیں — حرام نہ کہیں گے .... (یا مثلاً) کفار اگر خدا ہی کی عبادت کریں، خاص اسی کی نیت سے نذر نکالیں یا اسی کی نیت سے نماز، روزہ گزاریں تو اس کو حرام نہیں کہہ سکتے اگر (چہ) بوجہ کفران سے ناخوش ہو کر (اللہ پاک) ان کے ان اعمال کو قبول نہ فرمائیں اور ان پر ثواب عنایت نہ ہو۔

(جیسے) اگر بادشاہِ وقت کسی امیر کا سلام نہ لے اور نذر قبول نہ کرے تو یوں نہیں کہہ سکتے کہ بادشاہ ایسے کاموں سے — یعنی سلام و نذر سے — ناخوش ہوتا ہے، یا ان کاموں کی اس کے یہاں ممانعت ہے۔ اگر یہ بات ہو تو اس امیر کی کیا تخصیص تھی؟ کسی کی بھی نذر نہ لی جایا کرتی اور کسی کا بھی سلام و نیاز و آداب قبول نہ ہوا کرتا، بلکہ ان باتوں کی ممانعت عام ہو جاتی۔

مگر سب جانتے ہیں کہ آداب بجالانا، اور نذریں پیش کرنی، علامت تابعداری اور نشانِ اطاعت ہے، از قسم معصیت نہیں ہے، ایسے ہی اگر کسی کی عبادت نماز، روزہ، زکوٰۃ، قربانی، نذر، فطرہ، خدا تعالیٰ کی درگاہ میں قبول نہ ہو — جیسے کفار کی عبادت کا حال ہوگا — تو اتنی بات سے اس نماز، روزہ، زکوٰۃ، نذر، قربانی، فطرہ کو گناہ نہیں کہہ سکتے، جو حرام کہہ دیں۔ اگر یہ بات ہوتی تو ان باتوں کی ممانعت (عام) ہوتی، کسی کے حق میں یہ باتیں طاعت نہ ہو سکتیں۔"

(حوالۂ بالا صفحہ ۳۵)

(۱۶) دینی امور میں بھی ذوق مختلف ہوتے ہیں

"طبائع انسانی وحیوانی باعتبار غذا کے جیسے مختلف ہیں، کہ کسی کو میٹھا بھاتا ہے تو کسی کو نمکین، کسی کو ایک چیز کی طرف رغبت ہوتی ہے، کسی کو نفرت، انگریزوں کو عطر نفیس سے تنفر اور مچھلی کے اچار سے — جسے سونگھ بھی لیجئے تو دماغ پھوڑ، جان کی خیر نہیں — رغبت۔ پاخانہ کے کیڑے گندگی میں خرم و شاد و عیش و آرام سے رہیں، اور خوشبو سونگھیں تو مر جائیں۔ ایسے ہی باعتبار امور دینی کے — جو غذا ارواح ہیں — ارواح بنی آدم مختلف ہیں، کسی کو رغبت ہو، کسی کو نفرت، کسی کو لذت آتی ہے، کسی کی جان نکل جاتی ہے۔"

(ہدیۃ الشیعہ صفحہ ۱۶۷)

(۱۷) تصورِ شیخ

سوال: کیا شیخ کا تصور جائز ہے؟ بعض لوگ منع کرتے ہیں؟

جواب: تصورِ شیخ کی دو صورتیں ہیں اول: شیخ کا تصور واسطہ در ابطہ کے طور پر ہو یعنی وصول الی اللہ کے لیے شیخ کو ذریعہ بنایا جائے اور اصل تصور و ذکر صرف اللہ ہی کا ہو تو یہ جائز ہے، عقلاً بھی اور نقلاً بھی، عقلاً تو اس لیے کہ جب کوئی کام دشوار ہوتا ہے اور کسی کی معاونت سے اس کے سرانجام پانے کی امید ہوتی ہے تو اس شخص سے مدد لینا عقل کا فیصلہ ہے، اور نقلاً بایں وجہ کہ کلمہ طیبہ میں لا الٰہ الا اللہ کے بعد محمد رسول اللہ بھی ہے، جو اسی طرف مشیر ہے۔

"وقتِ یادِ خداوند جل وعلا اگر شیخ را رابطۂ خود تصور کند چہ باک؟! کہ "محمد رسول اللہ" پس از "لا الٰہ الا اللہ" ہمیں جانب مشیر است، و ایں بداں ماند کہ کسے را با کسے کارے افتد — کہ نظر عنایت بادداشتہ باشد، و بارِ کارِ خود بر و انداختہ — پس چنانکہ مرد حاجت مند را بہ تقاضائے ضرورت دقت، تدبیر و جانفشانی ہائے خود باد محتاج الیہ ضرور یست، و بوجہ مداخلت آں ذکرِ نیاز باد لازم و توسل باو واجب، ہمچناں طالبانِ خدا را یادِ خداوند متعال ضروریست، و نیاز بر پیرانِ ایں راہ لابدی، و وقتِ عرضِ نیاز اقرار بعدم استحقاق و نفی لیاقتِ خود لازم، و بدیں وجہ توسل آں مقربان واجب. بالجملہ ایں چنیں تصور شعبہ از اعتقادِ شفاعت است، یا پر تو اعتقادِ رسالت، و ہمیں (وجہ) است کہ ایں تصور را اکابرِ طریقت "رابطہ و وسیلہ" نام نہادہ اند" (فیوض ص ۳۱)

تصور کا طریقہ: "تصور میں (شیخ کی) صورت کا خیال (کرنا) امرِ فضول ہے (جائز طریقہ یہ ہے کہ) جیسے کسی کے تذکرہ کے وقت کسی کا خیال آتا ہے، ایسا ہی تصورِ شیخ میں (چاہیے) مگر (یعنی یہ بھی ضروری ہے کہ اگر) تصور کرو تو اپنے آپ کو اپنی جگہ اور شیخ کو اپنے وطن میں (سمجھو) اور اس کے ساتھ یہ خیال رہے کہ ادھر سے کچھ فیض آتا ہے" (فیوض ص ۲۹)

دوم: بالذات اور مستقلاً شیخ ہی کا تصور کیا جائے تو یہ قطعاً ناجائز ہے۔ اور آیت

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (الانبیاء ۵۲)　　یہ کیا (واہیات) مورتیں ہیں، جن (کی عبادت) پر تم جمے بیٹھے ہو؟!

کا مصداق ہے — اگرچہ اس قسم کا تصور کرنے والوں میں عقیدۂ استقلال میں تفاوت کی وجہ سے

تفاوت رہے گا ــــ کیونکہ قرآن پاک اور حدیث کا واقف یہ ضرور جانتا ہے کہ ذکر و تصور صرف اللہ تعالیٰ کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ وہی جمال و کمال کا مالک ہے۔ لہٰذا ہر وقت انھیں کا ذکر و فکر اور تصور ہونا چاہیے۔ پس جو شخص اپنے شیخ کا تصور مستقلاً اور بالذات کرتا ہے وہ اس شخص کے مانند ہوگا جس نے اپنے آپ کو بتوں کے لیے وقف کر دیا ہو۔

"آرے اگر تصور مستقل است، و از مفہوم ربط و توسل عاری، آں را مسقط اشارہ ماھذہ التماثیل التی انتم لہا عٰکفون تصور باید فرمود ــــ گو فیما بین افراد ایں قسم تصور، باعتبار اعتقادِ استقلال، فرق باشد ــــ بالجملہ بخیالِ احقر یاد ایادِ اینکہ، مقتضائے یادِ خدا نیش نتواں گفت، و از یادِ خدا دل محو، یا دیگر را خبر نہ باشد، شائبہ از تماثیل مشار الیہا دارد ــــ گو صاحبِ تصور پیر را حسب اعتقاد اسلام بندہ محتاج اعتقاد کردہ باشد ــــ چہ یادِ اصلی از حقوقِ خداوندیست، چنانچہ بر ماہران قرآن و حدیث مخفی نخواہد بود، چوں ذکر و یاد ثمرہ محبت است، و محبت اصلی غیر ذات تبارک و تعالیٰ ــــ کہ اصلِ ہر جمال و کمال است ــــ نسزد، پس ہر کہ باختیار خود دل بیادِ دیگراں داد، ازیں وجہ دل خود را از یادِ خداوندی پرداخت، و باز ایں کار خود را بنظر استحسان دید، لاجرم رہ کساں رخت کہ بہر بتاں خود را وقف کردہ اند۔"　　　(حوالہ بالا)

تتمہ جواب: جن لوگوں نے تصور شیخ کو منع کیا ہے انھوں نے یا تو قسم دوم کو معمول بہ دیکھا ہوگا یا سداً للذریعہ اور حسماً لمادۃ الفتنہ منع فرمایا ہوگا۔ پس انھوں نے جو کیا وہ بجا کیا۔ لیکن تصور شیخ کی تفصیل و حقیقت وہ ہے جو اس پراگندہ حال نے عرض کی۔ واللہ اعلم

"و چوں ایں صورت تصور حاصل شیخ اول (؟) است آنانکہ علی الاطلاق منع کردہ اند، یا ہمیں قسم را معمول بہ یافتہ یا رخنہ بندی شریعت و طریقت مدنظر داشتہ، و ہر چہ کردند بجا کردند، اما حقیقت حال ایں است کہ ایں پراگندہ حال بعرض رسانید واللہ اعلم و علمہ اتم"　　　(حوالہ بالا)

اضافہ از حضرت اقدس تھانوی رحمہ اللہ

"تصور کا مفہوم عام ہے "رابطہ" کے مفہوم سے، کیونکہ "رابطہ" ایک خاص شغل کا نام ہے، جس میں شیخ کی صورت ذہن میں حاضر کر کے نظر قلب سے اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر اور خیال کو سادہ کر کے دیکھا جاتا ہے۔

فيفرض كأنه حاضر ناظر، لكن تصوراً فقط لا اعتقاداً، فانه شرك، ولذا يمنع منه العوام وهذا هو المراد في كلام بعض الأكابر حيث ادخل هذا في عموم قوله تعالى: ما هذه التماثيل التي انتم لها عاكفون	(پس شیخ کو ایسا فرض کیا جاتا ہے گویا کہ وہ حاضر و ناظر ہے، لیکن صرف تصور و خیال ہوتا ہے، اعتقاد نہیں ہوتا، کیونکہ اعتقاد تو شرک ہے اور اسی وجہ سے عوام کو اس سے منع کیا جاتا ہے، اور یہی مراد ہے بعض اکابر کے اس کلام میں کہ انھوں نے تصورِ شیخ کو باری تعالیٰ کے قول ماھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون کے عموم میں داخل کیا ہے)

یہ تو حقیقت ہے اس کی، اور فائدہ اس کا شغف ہے شیخ کے ساتھ، جس سے بے تکلف اس کا اتباع اخلاق و اعمال میں ہونے لگتا ہے، چونکہ احوال ثمرات ہیں اعمال کے اسلئے وہ احوال بھی اس پر وارد ہونے لگتے ہیں۔

لكن لما كان ضرره للعوام اكثر من هذا النفع المذكور، لم يعتبر هذا النفع في منعهم منه۔	(لیکن جبکہ عوام کے لیے اس کا نقصان مذکورہ نفع سے زیادہ ہے تو منع کرنے والوں نے اس نفع کا اعتبار نہیں کیا)۔

اور تصور شیخ کوئی خاص شغل نہیں، بلکہ اس کی حقیقت وہی ہے جو لغۃً مفہوم ہوتی ہے۔ محل اس کا وہ وقت ہے کہ ذکر کے ساتھ خطرات فاسدہ کا ہجوم ہو، اور دفع کرنے سے مندفع نہ ہوتے ہوں تو منتہی اس کا علاج زیادتِ توجہ الی المذکور سے کرتا ہے اور متوسط زیادتِ توجہ الی الذکر سے، کیونکہ جب نفس کو ایک طرف توجہ تام ہو جاوے گی، حسب قاعدہ فلسفیہ النفس لا تتوجه الى شيئين في آن واحد دوسری طرف نہ رہے گی۔ اور مبتدی چونکہ غائب یعنی مذکور کی طرف زیادتِ توجہ کا خوگر نہیں، اور ذکر گو امر حسی شاہد مسموع ہے اور توجہ دشوار نہیں، لیکن اس کے ساتھ انجذاب طبعی نہیں اس لیے وہ جمتا

ہیں، اس سبب سے اس کے لیے تصور شیخ کو نافع سمجھا گیا ہے کہ وہ محسوس بھی ہے اور محبوب بھی، ہے، اس کا خیال جلدی جم جاتا ہے۔ اور خیال جمنے سے خطرات مندفع ہو جاتے ہیں۔ مگر بعد فراغ پھر اس تصور کو نہیں جماتے کہ اشتغال بغیر المقصود مخل اشتغال بالمقصود ہے ۔۔ اور س تقریر سے حقیقت کے ساتھ ان دونوں کا نفع بھی معلوم ہو گیا"۔

(التکشف عن مہمات التصوف ص۵۰۰، مطبوعہ ادارہ تالیفات اولیاء دیوبند)

ارشاد حضرت گنگوہی قدس سرہ

کسی کا تصور کرنا بطور خیال کے کچھ حرج نہیں، مگر "رابطہ" جو مشائخ میں مروج ہے۔ ۔۔ کہ اس کو مشائخ نے کسی علاج کے واسطے تجویز کیا تھا ۔۔ اگر اسی حد پر رہے، کہ جس حد پر ید لوگ نے تجویز کیا تھا، تو چنداں دشواری (برائی) نہیں، گو ترک اس کا بھی اولیٰ ہے، کہ مختلف فیہ بین العلماء ہے، اور ایسا ضروری بھی نہیں کہ بدوں اس کے کام نہ چل سکے، جو اس حد سے بڑھ جاوے تو البتہ ناجائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔　　(فتاویٰ رشیدیہ ص۱۹۶)

(۱۸) تکفیر میں احتیاط

مسلمانوں میں کون ایسا ہے جس کا قرآن پر ایمان نہ ہو؟ لہٰذا حتی الامکان کسی کو کافر نہ سمجھنا چاہیے۔

"در مسلماناں کیست کہ قرآن دین و ایمان او نباشد؟ بناءً علیہ تا مقدور کسے را کافر نباید دانست"۔　　(فیوض ص۲۰ مکتوب ۱۳)

"اپنے خیالِ ناقص میں قطعی کافر تو وہی ہے جس کو خدا تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک سے کافر فرمایا ہو)۔ ہاں ظاہر میں جس سے افعالِ کفر وکلمات (کفریہ) صادر ہوں ۔۔ اگر ہم کو ان باتوں کے دیکھنے سننے کا خود اتفاق ہو، یا روایت متواترہ ہم تک پہونچ جائے تو اس وقت ۔۔ بظاہر ہم کو اس کے ساتھ معاملات کفر ہی کرنا چاہئیں"۔　　(فیوض ص۳۲-۳۳ مکتوب ۹)

(۱۹) آخرت میں شراب حلال کیوں ہو گی؟

سوال: شراب جب دنیا میں حرام ہے تو آخرت میں حلال کیوں ہو گی؟ یہاں اور

وہاں کا یہ فرق کیوں؟

جواب: شراب میں دو باتیں ہوتی ہیں ایک نشہ دوسری سرور۔ اور ان دونوں میں اگرچہ تضاد ہے۔ کیونکہ نشہ تو بیہوشی کا نام ہے، کم نشہ ہو تو کم بیہوشی ہوتی ہے اور (اگر) زیادہ نشہ ہوتا ہے تو زیادہ (بے ہوشی ہوتی ہے) اور سرور کے لیے ہوش لازم ہے۔ لیکن تضاد کے باوجود دونوں باتوں کا شراب میں مجتمع (اکٹھا) ہونا ایسا ہے جیسے تمام مادی مرکبات میں۔ حتیٰ کہ انسان کے جسم میں بھی۔ گرمی سردی دونوں کا اجتماع ہوتا ہے، حالانکہ یہ گرمی سردی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی طرح شراب میں بھی دو مختلف چیزوں۔ یعنی نشہ اور سرور کا اجتماع ہوتا ہے۔

اب یہ سرور اور نشہ جو شراب میں مجتمع ہیں کسی شئے واحد کا اثر تو ہو نہیں سکتے، لامحالہ ماننا ہوگا کہ نشہ کسی اور چیز کی خاصیت ہے اور سرور کسی دوسری چیز کی تاثیر ہے، مثلاً انسان کے جسم میں حرارت بھی ہے اور برودت بھی، لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ گرمی اور سردی، دونوں ایک چیز کا اثر ہیں۔ بلکہ دو چیزیں (آگ اور پانی) ماننا ہوں گی، جن میں سے ایک کا اثر سردی ہو اور دوسری کا گرمی۔

پھر اگر شراب میں وہ چیز نہ رہے جس کی خاصیت نشہ ہو یعنی قدرت الٰہی کی چھلنی سے چھان کر اس چیز کو جدا کر دیا جائے تو اس وقت شراب میں فقط لذت اور سرور ہی رہ جائے گا اور ہر عقلمند کے نزدیک ایسی شراب حلال ہوگی۔ کیونکہ تمام عقلمندوں، اور شراب کو حرام ماننے والوں کے نزدیک یہ بات مسلمہ ہے کہ شراب کی حرمت کا سبب "نشہ" ہے۔ مسلمان بھی اس کی حرمت اس وقت تک مانتے ہیں جب تک کہ اس میں "نشہ" ہے۔ چنانچہ شراب اگر سرکہ بن جائے اور "نشہ" نہ رہے تو مسلمان اس کے پینے میں باک محسوس نہ کریں گے۔ نیز قرآن و حدیث، و فقہ میں بھی حرمت شراب کی یہی وجہ مرقوم ہے۔[۱]

---

[۱] کلام اللہ میں ہے: لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ (النساء، آیت ۴۳) "نماز کے پاس ایسی حالت میں مت جاؤ کہ تم نشہ میں ہو"۔ اور ارشاد باری عز اسمہ ہے: قل: فیھما اثم کبیر و منافع للناس (البقرہ آیت ۲۱۹) "آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

بہرحال جب وجہ حرمت "نشہ" ٹھہری۔ اور اس کا مبدار (علت) ایک الگ چیز ہوئی اور اس مبدار کا شراب سے الگ ہونا ممکن ثابت ہوا تو جب اس مادہ کو جدا کر دیا جائے گا تو شراب میں صرف سُرور ہی باقی رہے گا، جو اصل مقصود ہے، کیونکہ جو شخص شراب پیتا ہو وہ سرور کی خاطر پیتا ہے، بیہوشی کے لیے نہیں پیتا، کلام اللہ میں بھی جنت کی شراب میں لذت کا تو اثبات ہو[1] — جو سرمایۂ سرور ہے — اور نشہ کی نفی ہے — جو وجہ ممانعت ہو۔ ارشاد باری ہے[2]:

لَا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ (الطور) (وہاں آپس میں جام شراب میں چھینا جھپٹی بھی کریں گے کہ) اس میں نہ بکبک لگے گی اور نہ کوئی بیہودہ بات ہوگی

(انتصار الاسلام صد ۳۹-۴۰ درجواب اعتراض نمبر۱ ترتیب اور عبارت کے تغیر کے ساتھ)

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) اور لوگوں کو فائدے بھی ہیں۔" یعنی ان کے استعمال سے اکثر اوقات دوسری باتیں گناہ کی پیدا ہو جاتی ہیں، کیونکہ شراب سے عقل جاتی رہتی ہو اور وہی مانع بھی ارتکاب معاصی سے (بیان القرآن ۱/۱۲۴) اور ارشاد ہو انما یرید الشیطٰن الآیۃ (المائدہ آیت ۹۱) "شیطان تو یوں چاہتا ہو کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض واقع کر دے، اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے تم کو باز رکھے، سو اب بھی باز آؤ گے؟" شراب میں عقل نہیں رہتی، گالی گلوچ، دنگہ فساد ہو جاتا ہے الخ (بیان القرآن ۳/۵۸)

عن ابن عمر: قال خطب عمر علی منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: .... والخمر ما خامر العقل (رواہ البخاری)، وعن عائشۃ قالت: سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن البتع؟ — وھو نبیذ العسل — فقال: کل شراب اسکر فھو حرام متفق علیہ (مشکوٰۃ جلد ۳۱۷)

[1] ارشاد باری عزاسمہ ہے: وَأَنْهَارٌ مِنْ خَمْرٍ لَذَّةٍ لِلشَّارِبِينَ (محمد آیت ۱۵) "اور بہت سی نہریں ہیں شراب کی جو پینے والوں کو بہت لذیذ معلوم ہوں گی۔"

[2] سورۃ الواقعہ میں ہے لَا يُصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُونَ (نہ اس سے ان کو درد سر ہوگا اور نہ اس سے عقل میں فتور آوے گا) اور سورۂ وَالصّٰٓفّٰت (آیات ۴۵-۴۷) میں ہے یطاف علیھم بکاس من معین بیضاء لذۃ للشربین، لا فیھا غول ولا ھم عنھا ینزفون (ان کے پاس ایسا جام شراب لایا جاوے گا جو بہتی ہوئی شراب سے بھرا جاوے گا، سفید ہوگی، پینے والوں کو لذیذ معلوم ہوگی۔ نہ اس میں درد سر ہوگا اور نہ اس سے عقل میں فتور آوے گا۔" اللھم ارزقنا شراب محبتک ومن شراب جنتک۔ (آمین)

اذکارِ خمسہ

(از مولانا محمد سراج الحق مچھلی شہری)

(۱) سُبْحَانَ اللہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ ۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ ۔ اَللہُ اَکْبَرُ
وَلَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ ؕ

مسطورہ بالا عبارت عموماً "کلمۂ تمجید" کہلاتی ہے۔ اُمّت کے ہر طبقہ نے اس کی پذیرائی بڑے اہتمام سے کی۔ بچوں کو اسے تیسرا کلمہ کہکر یاد کرایا۔ اہل اللہ نے اسے ذکر اللہ جانکر مجموعی کلمہ کی بھی اور اس کے مقررہ اجزاء کی بھی تسبیحیں پڑھنے کا معمول بنایا۔ پھر تمام ہی مسلمانوں نے انتہائی تعجب پر سُبْحَانَ اللہ شکر کے موقع پر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ٹھنڈی لمبی سانس لیتے وقت لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ غضب مع التعجب کے محل پر اَللہُ اَکْبَر اور نفرت وحقارت ظاہر کرنے کے لیے لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ بے ساختہ کہہ اٹھنا معاشرہ کا شعار سا بنا لیا ہے۔ بے شک یہ سب کچھ ٹھیک ہی کیا گیا میں بھی اس وقت اس سلسلہ میں چند باتیں عرض کرنے کی جراءت کرتا ہوں:۔

ایک یہ کہ یہ پوری عبارت کوئی ایک جملہ نہیں بلکہ یہ الگ الگ پانچ مستقل ذکر ہیں اور بے انتہا بابرکت اور پُر حکمت کلمات ہیں جن کو اپنے محدود علم وفہم کی حد تک کچھ تفصیل سے آگے لکھوں گا۔

دوسرے یہ کہ ہم مسلمانوں کی افسوسناک روایتی سرد مہری بلکہ "سرد روحی" کی

وجہ سے جب نماز جیسی نعمت، جو فرضِ خداوندی ہے جو رسولؐ اور متبعینِ رسولؐ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے جو کلماتِ عظمت و کبریائی اور حرکاتِ تذلل و ادنائی کے آئینوں میں ایک طرف انسان کو عرفانِ رب اور دوسری طرف معرفتِ نفس کی جھلکیاں دکھاتی۔ اور اسمیں رویت باری کی استعداد پیدا کرتی ہے (ایسی بے مثال عبادت بھی جب) یوں شکوہ سنج اور نوحہ کناں ہے کہ بقولِ اقبالؒ ؎

صفیں کج، دل پریشاں، سجدے بے ذوق
کہ سوزِ اندروں باقی نہیں ہے

یا ؎
گلہ جفائے وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

تو بھلا یہ نفلی اذکار ان کی سرد مہری سے کیونکر بچ جاتے؟ آہ کہ ان اذکارِ خمسہ کا تلفظ، ان کا مفہوم، ان کا مقصد سب کچھ ان کی ناقدریوں، ان کی بے التفاتیوں۔ ان کی غفلتوں کے بوجھ کے تلے چیخ چلا رہے ہیں اور کوئی نہیں اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰه کہ ادھر رُخ کرے ناظرین معاف کریں خدانخواستہ یہ کوئی طعنہ نہیں محض بیانِ واقعہ ہے اور معاذ اللہ! یہ الزام نہیں، ایک سعی ہے، اہتمام ہے۔ وَمَا تَوْفِيقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

(۳) اذکارِ خمسہ کی ترتیب۔ جو اوپر لکھی گئی ہے، اکثر احادیث میں بھی یہی ترتیب مذکور ہے۔ یہ ترتیب یقیناً اولیٰ اور مستحب ہے اور بعض فقہائے باطن کے نزدیک اسمیں ایک لطیف باہمی ربط اور ایک عقلی ترتیب بھی موجود ہے اور کیوں نہ ہوتی کہ سید کونین، فخر موجودات، ناطقِ وحی رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ حکمت ترجمان سے نکلی ہوئی ترتیب ہے لیکن دوسری احادیث پر غائر نظر ڈالنے سے دو باتیں صاف سمجھ میں آتی ہیں: ایک یہ.. کہ اذکارِ خمسہ کی مذکورہ ترتیب، کوئی موکد شرعی اور ناقابلِ تبدیل ترتیب نہیں چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد ہے: "لَا یَضُرُّكَ بِاَیِّهِنَّ بَدَأْتَ" (تم جس ترتیب سے بھی ان کو پڑھنا شروع کرو کسی میں کوئی حرج و ضرر نہیں) دوسرے یہ کہ ہم کو اکثر احادیث میں یہی اذکار دوسری دوسری نئی ترتیب و ترکیب سے بھی ملتے ہیں جس سے کچھ ایسا شبہ و اندازہ ہوتا ہے

کہ شاید اس تنوع سے صرف نشاطِ طبع مقصود نہیں بلکہ ہر نئی ترکیب میں غرض اور تاثیر کچھ جداگانہ رکھنا منظور رہے۔ ہم نمونہ کے لیے ذیل میں صرف دو اذکار سے ترکیب پانیوالے اذکارِ ماثورہ درج کرتے ہیں:۔

(الف) فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (میں ذکر اول و دوم و ششم ہے) سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ (میں اول و دوم و اول و ششم ہو) سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ (میں اول و دوم و چہارم ہو) سُبْحَانَ اللّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ يَنْعَطِفْنَ حَوْلَ الْعَرْشِ الخ (اول و سوم و چہارم) سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (اول دوم پنجم) سُبْحَانَكَ لَا اِلٰهَ غَيْرُكَ (اول و سوم) سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ (اول دوم سوم)

(ب) لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (میں سوم اول و ششم ہو) لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (سوم اول دوم) لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ (سوم و چہارم) لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (سوم و پنجم)۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ لَا شَرِيْكَ لَكَ سُبْحَانَكَ (سوم و اول) وَهُوَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ (سوم و دوم) فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ (سوم و ششم)

نماز ہی پر نظر ڈالیے سر سے لے کر پیر تک تکبیر، تسبیح، تحمید، تہلیل، استغفار کا مجموعہ ہے۔

(۲) اسلام نے عقائد کی تصحیح پر بہت زور دیا ہے۔ خاص کر حق تعالےٰ کی ذات صفات اور افعال کے بارہ میں تو نہایت ہی جچے تلے، نفیس و رفیع عقائد بتائے ہیں۔ ان اذکار خمسہ میں درحقیقت حق تعالےٰ کی ذات۔ صفات اور افعال ہی کے متعلق کچھ تعلیمات مخفی ہیں۔ انسان کو ان اذکار خمسہ کے ذریعہ حق تعالےٰ کی معرفت کرائی گئی ہے اور چونکہ معرفت رب کے لیے معرفتِ نفس بھی لازم ہے اس لیے میرے نزدیک عبد اور معبود دونوں کا صحیح مقام انھیں سے متعین ہوتا ہے۔

"اللہ تعالےٰ اپنی "ذات" کے لحاظ سے الباطن اور پوشیدہ، سرچہ ادراک سے وراء الوراء ہیں لیکن اپنی "صفات" اور اپنے "افعال" کے لحاظ سے بہت ہی نمایاں

اور الظاہر ہیں۔ شیخ عطار نے بڑے پُرجوش انداز میں اس ظہور کا ذکر کیا ہے ؎

چشم بکشا کہ جلوۂ دلدار متجلّی است از در و دیوار

اس لیے حق تعالیٰ کی معرفت ان کے افعال و صفات ہی کے ذریعہ ممکن ہے اور اس دارِ دنیا میں مومن کے لیے یہی معرفت، رویتِ حق کا درجہ رکھتی ہے پس اذکار سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اور اَللّٰهُ اَكْبَرُ کے ذریعہ توصفاتِ حق کی اور لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ..... کے ذریعہ ذاتِ حق کی اور لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ سے افعالِ حق کی معرفت کرائی گئی ہے۔ اس اجمال کی مختصر تفصیل یہ ہے:۔

(الف) سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ. حضرت حق جلَّ وعلیٰ شانہٗ کی نصف تعریف وثنا سُبْحَانَ اللّٰهِ ہے اور نصف اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ہے۔ یہ دونوں ذکر مل کر ہی در اصل حق تعالیٰ کی پوری تعریف وثنا کی تکمیل کرتے ہیں، کیونکہ سبحان اللہ میں حق تعالیٰ کی تقدیس و تنزیہ ہے اور تمام صفات۔ نقص و عیب، عجز، ضعف۔ نقص۔ بخل۔ تھکن۔ نیند۔ غفلت۔ جہل۔ نسیان۔ احتیاج۔ زوال۔ موت۔ خود غرضی۔ خونی رشتوں وغیرہ) سے نفی و انکار ہے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ میں اس کی حمد وثنا اور جملہ صفاتِ کمال (حُسن۔ قدرت۔ قوت۔ کمال۔ جود۔ رحم تیقظ خبر۔ علم۔ حفظ۔ بے نیازی۔ ابدیت۔ بقا۔ کرم۔ علو وغیرہ) کا اثبات و اقرار ہے۔ پس حق تعالیٰ کی پوری پوری حمد وثنا یوں ہوئی کہ "اس ذاتِ پاک میں عیب کوئی نہیں اور خوبیاں سب ہیں۔" اسی لیے یہ دونوں ذکر زیادہ تر ملا کر استعمال ہوتے ہیں مثلاً۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ بعض عارفین کا ارشاد ہے کہ "حق تعالیٰ بندوں سے اپنی حمد وثنا سے زیادہ اپنی تنزیہ اور سماتِ نقص سے سننا پسند فرماتے ہیں" اس لیے تسبیح خود بھی مستقل ذکر ہے اور اسی لیے وہ اس ترتیب میں دوسرے اذکار سے مقدم ہے۔

مگر بندہ جب تسبیح کے ذریعہ نقائص سے حق تعالیٰ کی نزاہت و پاکی کا اعتراف کرے گا تو معاً اُسے اپنے اندر یہ صفاتِ نقص محسوس بھی ہوں گے۔ یہ معرفت

نفس ہے۔ یہ بندہ پر اللہ تعالےٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس لیے میرے نزدیک سبحان اللہ کے ذکر کا حق یہ ہے کہ دس پانچ بار اس کے تلفظ اور اس سے تلذذ کے بعد ایک بار زبان سے یہ اعتراف بھی کر لیا جایا کرے کہ "پاک ذات صرف اللہ کی عیبوں سے بھرا تو میں ہوں۔" اور اسی طرح اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کا دس پانچ بار تلفظ اور اس سے تلذذ کے بعد ایک بار زبان سے یہ اعتراف بھی ضرور کیا جائے کہ "خوبیاں اور ان پر تعریف کا استحقاق تو صرف خدائے پاک میں ہے۔ میرے اندر نہ کوئی خوبی نہ میں تحسین کا مستحق۔ میں تو خوبیوں سے کورا اور عاری ہوں۔"

یہی مقام ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کا۔ اور یاد رکھیے کہ ان کلمات سے جب تک عرفانِ رب کا کام لیا جائے گا اس وقت تک تو یہ کلمات "ذِکْرُ اللّٰہ" ہیں لیکن جب ان سے عرفانِ نفس کا کام لیا جائے گا تو پھر یہی کلمات "مِصْقَلَہ" (پالش اور منجن) بن جائیں گے کیونکہ اس صورت میں اس کے نفس کا کچھ نہ کچھ زنگ چھوٹنا شروع ہو گا۔ ایک حدیث میں جو یہ ارشاد ہے کہ "لِکُلِّ شَیْءٍ مِصْقَلَۃٌ وَصِقَالَۃُ الْقَلْبِ ذِکْرُ اللّٰہ" تو میرے نزدیک اس کا محل یہی "طریق ذکر" ہے اور اگر اس طریقِ ذکر پر کچھ عرصہ خلوص وانہماک سے دوام کیا جائے تو انشاء اللہ یہی ذکر بندہ کے قلب سے چند رذائل مثل عُجب۔ حُبِ جاہ۔ حسد۔ دعوائے وغیرہ کو کھرچ کر پھینک دے گا اور رحمت کی ہوائیں قلبِ مومن کے اس جدید خلا کو فضائل خمول۔ فنا۔ حمد۔ قناعت وغیرہ سے معمور کر دیں گی۔

وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْم وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْز۔

(نکتہ) بہتر یہ ہو کہ نفس کے تزکیہ وتنقیہ کے اس نسخہ کو زیادہ قوی اور دو آتشہ بنانے کیلئے اس ذکر کے تلفظ سے قبل یہ نیتِ احتساب بھی کر لے کہ "اے رب! میں تو اس ذکر سے تیری رضا اور یہ اجر وثواب لوں گا کہ میرے قلب سے فلاں فلاں رذائل زائل ہوں اور فلاں فلاں فضائل داخل ہوں۔" اور اسکے ختم کے بعد یہ صیغۂ دعا و التجا پھر یہی عرض کرے۔ یقین ہو کہ حق تعالیٰ ایک عبدِ مومن کے اس حُسنِ ظن کی لاج رکھ لیں گے۔

(ب) تہلیل: جب بندہ کو اللہ پاک وتعالےٰ کی صفات عالیہ کے بارہ فی الجملہ معرفت (اور اس کی روشنی میں کچھ معرفت نفس بھی) تسبیح وتحمید سے ہو گئی تو اب صفات سے آگے بڑھ کر خود ذاتِ حق کے متعلق بھی کچھ معرفت اور تعلیم ضروری ہوئی تاکہ خالی الذہن بندہ

عقیدہ صحیحہ لے اور بھٹکے ہوئے بندہ کے غلط عقیدہ کی اصلاح ہو۔ خوب کہا ہے اردو کے حافظ شیرازی حضرت اصغرؒ نے :۔

مذاقِ سجدہ کو شائستہ و مکمل کر جہاں سے یوں تو بنائے ہزار ہا معبود

اور احقر کا شعر ہے

اے عندلیب ! تو بھی عجب کم نظر سی ہو گل میں خرام و غمزہ و برقِ نظر کہاں

اس لیے لا الٰہ الا اللہ کے ذریعہ اسے تعلیم دی گئی کہ پہلے تو ہر چیز کی محبت کو ہر طاقت و اقتدار کے دباؤ کو، ہر بڑائی اور بزرگی کے اثر کو دل سے نکال دے۔ قلب کو تمام تعلقات سے خالی کرلے۔ پھر دل میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک کو اپنا معبود، اپنا قبلۂ مقصود بنائے۔ بشر ساری کائنات سے افضل ہے تو بشر بھی کائنات کی کسی چیز کے سامنے نہ جھکے اپنے کو کائنات سے کم نہ سمجھے نہ اُن سے مدد مانگے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکے۔ اسی سے ہر کام میں مدد مانگے۔ عارفین کا ارشاد و تجربہ ہے کہ یہ کلمہ قلب مومن میں محبّت حق پیدا کرنے کا بڑا زود اثر نسخہ ہے۔ شرط یہ ہے کہ یہ ذکر بے خیالی سے نہ کرے بلکہ حق تعالیٰ کے قرب و معیت کا زیادہ سے زیادہ استحضار و تصور کر کے یہ ذکر کرے۔

یہ کلمۂ تہلیل، کلمۂ توحید ہے۔ تمام مفرد اذکار میں سب سے بدرجہا افضل ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی ذاتِ بے نشان کا اگر کچھ سراغ ملتا ہے تو اسی کلمہ سے ملتا ہے جس نے جس قدر زیادہ سوز و خلوص سے ذوق اور شوق سے، جوش اور تڑپ سے اس کا تلفظ اور اس سے تلذذ کیا اُتنا ہی زیادہ اس کلمہ نے اُسے ذاتِ بے نشان کے قریب اور اس کے سامنے حاضر کردیا۔ اس قرب کی کیفیت کیا بیان کیجئے۔ کسی نے اسے وصل اور وصول سے تعبیر کیا۔ کسی نے اس کو رویت و مشاہدہ کہا۔ کسی نے اپنی ذات کو بھی معدوم، و غیر محسوس سمجھا۔ اور ان کو موجود جانا کسی نے غلبہ و ہیجان میں یہ محسوس کیا کہ (معاذ اللہ) صرف میں ہی موجود ہوں۔ مناسبتِ مقام کے لحاظ سے چند اشعار لکھتا ہوں :۔

سرِ ذاتِ رحماں ہے، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ وصفِ خاص یزداں ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

اہلِ دل کا ایماں ہے۔ اہلِ دل کی یہ جاں ہے کیونکہ دیدِ جاناں ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

ہے یہی مئے اسلام۔ اس کا رنگ بو ایماں
کیف اس کا احساں ہے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه

بادہ ہو یہ وحدت کا۔ مادہ اَنَا الحق کا
نشۂ اسمیں پنہاں ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

یاد میں کروں "اُن" کو۔ ذکر "وہ" کریں میرا
عین لطف جاناں ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

چھوٹ مت اسے لے دل۔ کھینچ پوری طاقت سے
"یکسی" کا داماں ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

جان شرم عصیاں سے کیوں سراج کھوتے ہو؟
شافع مسلماں ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

اس کے پہلے جزء میں نفی ہے۔ حق تعالیٰ کے کسی شریک۔ ہمسر۔ مددگار کی۔ خواہ وہ بندہ کا نفس ہو یا کوئی دوسری مخلوق۔ مطلب یہ ہے کہ نہ ذاکر کا نفس اب اُس کا قبلۂ مقصود بن سکتا ہے نہ کائنات کی کوئی چیز۔ اور اس کے دوسرے جزء میں اثبات و اقرار ہے حق تعالیٰ کی وحدانیت کا' اس کی الوہیت کا اس کی معبودیت کا۔ اسی کلمہ میں اَشْهَدُ اَنْ کا اضافہ کر کے اسے کلمۂ شہادت کہتے ہیں۔ ترتیب میں اسے تیسرے نمبر پر رکھنے کا مطلب یہ ہوا کہ جب بندہ نے سُبْحَانَ اللّٰه سے تنزیہ اور الحمد للّٰه سے تحمید کر کے اسم رب کی فی الجملہ معرفت اور اس سے قرب حاصل کر لیا تو اب وہ ترقی کر کے ذاتِ بے نشان کی طرف بڑھتا ہے۔ اور چونکہ وہ ساری کائنات کو اور خود اپنی ذات کو عاجز و ناقص پا چکا ہے اس لیے لا اِلٰه کہتا ہوا یعنی ان سب کو اپنا قبلۂ توجہ بنانے سے انکار کرتا ہے۔ سب سے قلب کو خالی کرتا ہے۔ اس خلا کو جلد ہی عنایت حق اپنے ذکر اسم سے اپنی فکر سے اپنے تصوّر سے اپنے "مشاہدہ" سے (حسب استعداد ذاکر) پُر فرما دیتے ہیں یعنی ذاکر دربار قرب میں پہونچنے کا اہل بن جاتا ہے (نکتہ بہتر یہ ہے کہ اسے زود اثر بنانے کے لیے اس کے تلفظ سے قبل یہ نیتِ احتساب بھی کر لے کہ "اے اللہ! میں تو اس ذکر کو آپ کی رضا کے لیے اور اس اجر و ثواب لینے کے لیے پڑھتا ہوں کہ ہر قسم کے کفر ارتداد۔ شرک۔ نفاق۔ ریا۔ ہوائے۔ شک وسوسہ سے محفوظ رہوں اور توحید۔ اخلاص۔ یقین۔ صدق۔ محبت پا سکوں۔" پھر ختم کے بعد یہ صیغۂ دعا و التجا بھی عرض کرے۔ حدیث اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ کے

مضمون سے رجاء کامل ہے کہ ذاکر کا نفس کچھ عرصہ میں مطمئنہ بن جائے گا۔

(ج) **تکبیر**:- پھر جب بندہ اللہ کی ذات اور صفات کی فی الجملہ معرفت حاصل کر چکا تو وہ اس اعتراف پر مجبور ہو جاتا ہے کہ "اللہ" کی ذات بہت بزرگ، عالی ہے۔ ساری کائنات سے بھی بزرگ تر ہے اور سارا عالم کمتر اور فروتر ہے۔ اس مرحلہ پر وہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ پکار اٹھتا ہے۔ یہ کلمہ ذاکر کو مجبور کرتا ہے کہ کبریائی۔ بڑائی اللہ کے سوا کسی میں نہ دیکھے کبریائی کو صرف حق تعالیٰ کے لیے مخصوص جانے۔ خود کو بڑا بننا۔ خود کو بڑا سمجھنا۔ شرک اور کفر کی طرح بُرا جانے۔

بندہ جب اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہتا ہے تو (حدیث میں ہے کہ) حق تعالیٰ اسے سُن کر فرماتے ہیں کہ ہاں سب سے بڑا بس میں ہی ہوں۔

(نکتہ) بہتر یہ ہے کہ اس ذکر کا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے اس کے تلفظ سے قبل بہ نیت احتساب بھی کرلے کہ "اے اللہ! میں یہ ذکر آپ کی رضا کے لیے بہ ثواب لینے کی نیت سے پڑھتا ہوں کہ مجھے کبر جیسے خبیث مرض سے بچائے رکھیے اور تواضع للّٰہی نصیب فرمائیے۔ یا اللہ میں تو اس ذکر کا یہی صلہ لوں گا" پھر بعد ختم بہ صیغۂ دعا و التجا بھی یہی عرض معروض کرے۔ تو امید واثق ہے کہ بندہ کے اس عزم و الحاح اور جزم و رجا کو دیکھ کر حق تعالیٰ اُسے نوازدیں۔

(د) **حَوْقَلَہ**: حق تعالیٰ کی تنزیہ۔ حمد۔ توحید اور کبریائی کی تعلیم اور معرفت کے بعد اسلام یہ تعلیم دینا چاہتا ہے کہ بندہ ہر قسم کی قوّت۔ قدرت۔ حول و تصرّف کو صرف حق تعالیٰ کے اندر جانے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی میں نہ کوئی اثر و طاقت سمجھے نہ کسی سے خوف کرے نہ کسی سے امید رکھے۔ نفع پہونچانا۔ ضرر پہونچانا۔ حاجات سننا اور پوری کرنا حالات بدلنا۔ کمزور کو قوی یا قوی کو کمزور بنانا۔ زندہ کو مُردہ یا مُردہ کو زندہ کرنا۔ صاحب تاج کو محتاج اور فقیر کو صاحب تاج بنانا۔ تندرست کو بیمار اور بیمار کو تندرست کردینا۔ اشیاء و اعمال میں اچھی یا بری تاثیر و خاصیت پیدا کرنا، سب کو اسی خالق مطلق کا کام جانے۔ دوا اور دعا تو ایک بہانہ ہے حاجت تو خدا پوری کرتا ہے۔ آگ تو ایک پردہ ہے ورنہ جلانے

اور گرانے کا کام حق تعالیٰ کرتے ہیں۔ دوست اور دشمن ظاہری سبب ہیں ورنہ رنج و راحت پہونچانے والے صرف حق تعالیٰ ہیں۔ ساری مخلوق مل کر بھی کسی کو نفع یا ضرر پہونچانے سے عاجز ہے ہاں خدا کا حکم ہو تو نفع یا ضرر پہونچتا ہے۔

(نکتہ) بہتر یہ ہے کہ اس کے تلفظ سے قبل یہ نیتِ استحضار بھی کرے کہ "اے کریم! میں یہ ذکر آپ کی رضا کے لیے یہ ثواب لینے کو پڑھتا ہوں کہ ہر غیر اللہ کا خوف ہر ماسوی اللہ سے امید و توقع میرے دل سے نکل جائے۔ اور میں کوئی تاثیر کوئی قدرت، کوئی طاقت، حالات بدلنے والی کسی اور میں نہ سمجھوں۔ میرے اندر یہ یقین پیدا ہو جائے، کہ ہر طاقت آپ کی طرف سے ہے۔ میں تو یہی ثواب لوں گا۔" پھر بعد ختم بھی بصیغۂ دعا یہی کہے اور اُسی خدا سے امید کامل رکھے کہ حسب دستور اور مصلحت ذاکر کے اندر یہ یقینی کیفیت پیدا فرمادے گا کہ ہر غیر اللہ سے ضرر کا خوف، نفع کی رجا قلب سے نکل جائے اور خشیت۔ تقویٰ۔ توکل قلب میں رچ جائے۔

افسوس کہ ہم نے اس عظیم النفع ذکر کا حق نہ پہونچا۔ ہم نے اسے طبعی کراہت و نفرت کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس کے برکات سے محروم ہے۔ یہ کلمہ، قریب قریب کلمہ توحید لا الٰہ الا اللہ کے درجہ کا ہے۔ تہلیل میں ذاتِ حق کی توحید ہے اور اسمیں افعال حق کی توحید ہے تہلیل میں ہر غیر اللہ کے معبود و مقصود بنانے کی نفی ہے اس میں ہر ماسوی اللہ کو نافع ضار جاننے کی نفی ہے۔ یہ نہایت بلند پایہ اور پُر تاثیر کلمہ ہے اسی لیے حضورؐ نے اسے تحت العرش خزانوں کی کنجی فرمایا۔ جس طرح تہلیل جنت کی کنجی ہے۔ نیز فرمایا یہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے بہت سے امراض کی۔ خاص کر فکر و پریشانی۔ فقر و تنگ دامانی کی دوا ہے۔

---

(۸) توبہ و استغفار[ع]: بندہ جب اذکار خمسہ (کلمہ تمجید سے اللہ تعالیٰ کے

ع۔ اذکار خمسہ سے استغفار، اور پھر درود و سلام کا بھی ایک ربط سمجھ میں آگیا تو جی چاہا کہ ان کا بھی اضافہ کر دوں۔ سراج

کے مجد و بزرگی کا یقین حاصل کر لیتا ہے تو اس کے سامنے ایک طرف تو "معرفتِ رب" کے مقامِ رفیع سے رہ رہ کر تجلیاں ہونے لگتی ہیں اور دوسری طرف "معرفتِ نفس" کے مقامِ بعید سے بھی رہ رہ کر ایک بجلی کوندتی نظر آتی ہے کہ "آہ! میں نے نہ جانے کتنی بار خود اپنے نفس کو نقص و عیوب سے پاک سمجھا۔ اپنے اندر خوبیاں دیکھیں۔ اپنی خواہشات کو مقصود و معظّم بنایا۔ اپنے کو بڑا اور دوسروں کو حقیر جانا۔ اپنے عمل پر بھروسہ کیا اور اسے اچھا سمجھا" ان بجلیوں کے کوندنے سے وہ شرم سے زمین میں گڑنے لگتا ہے اور بے چین ہو کر اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے خدا سے عفو و درگزر کا طالب ہوتا ہے اس فعل سے گناہوں کا بوجھ کچھ ہلکا اور قلب کچھ ساکن ہوتا ہے اس استغفار کی کثرت سے قلب سے ظلمت دور ہوتی ہے اور حق تعالیٰ کی طرف سے نور، رحمت اور سکینت کی بارشیں ہونے لگتی ہیں۔

(۵) درود: اس مرحلہ پر ایک حق شناس بندہ کو خیال آتا ہے اور آنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کی یہ معرفت مجھ نالائق کو تو حضرت سرورِ کائنات رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں حاصل ہو سکی ہے تو وہ حق شناسی اور فدائیت کے جذبے کہہ اٹھتا ہے کہ ع

صدقے اس ساقی کے جس نے درد پیدا کر دیا

اور خلوص و نیاز کا ہدیہ اور درود و سلام کا تحفہ حضورؐ کے دربار میں بھی پیش کرتا ہے کہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی نَبِیِّکَ وَحَبِیْبِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اَزْوَاجِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَذُرِّیَّتِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ۔

خاتمہ خیر استغفار و درود کا ذکر تو اس میں ضمناً و استطراداً آ گیا ورنہ میں اذکارِ خمسہ کا ذکر کر رہا تھا کہ ان اذکارِ خمسہ کی حقیقت، اہمیت اور رفعت ہم بھلا از خود کیا جان سکتے تھے۔ احادیث میں کہیں ان کو احب الکلام الی اللہ فرمایا کہیں مَا اَثْقَلَھُنَّ فِی الْمِیْزَانِ فرمایا۔ کہیں ان کو باقیاتِ صالحات کا لقب دیا گیا۔ ان ارشادات سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ بندۂ مومن کے لیے بیحد نافع ہیں۔ جسمِ انسانی کے لیے جس طرح مادّی غذا ضروری ہے اسی طرح روحِ انسانی کے لیے یہ اذکارِ خمسہ ناگزیر ہیں بلکہ جیسا اوپر عرض کیا گیا یہ اذکار گویا امراضِ نفس کے لیے ایک پورا خدائی دواخانہ ہے۔ اگر حق

صفحہ ملاحظہ ہو اگلا صفحہ

تعالیٰ نے جسمانی امراض پیدا کرنے کے ساتھ ان کی دوائیں بھی خود ہی پیدا فرمائی ہیں تو یقین کیجیے کہ خدا ہی نے روحانی اور قلبی امراض پیدا کرنے کے ساتھ ان کی دوائیں بھی خود ہی نازل اور عام فرمادی ہیں۔ نفسانی امراض میں کبر۔ عُجب۔ حُبِّ جاہ۔ حسد۔ حرص۔ ریا۔ ہوی۔ شک۔ وسوسہ۔ دعوے۔ عصیان۔ غفلت۔ کفران۔ غضب۔ حقد۔ سوءِ ظن وغیرہ بہت عام مگر سخت ہیں۔ حق تعالیٰ کی کتنی شفقت ہے کہ ان امراض کا علاج ہومیو پیتھک گولیوں کی طرح ان مفت کی بولیوں کے ذریعہ اتارا ہے اور ان کے استعمال کی ترغیب اس طرح دلائی کہ فرمایا ہمیں اس کا پڑھنا بہت پسند ہے۔ یہ نامۂ اعمال میں وزن بڑھاتی ہیں ان کا فائدہ مرنے کے بعد بھی ملتا رہے گا۔ ہم ان کے بدلے جنت میں شاداب درخت لگا دیں گے وغیرہ۔ غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ انھیں اذکار خمسہ سے نہ صرف مذکورہ رذائل کا ازالہ ہوتا ہے بلکہ انھیں اذکار خمسہ کے تلفظ کے وقت معمولی توجہ و نیت سے رذائل مذکورہ کے مقابل فضائل، تواضع للّٰہی۔ فنا۔ خمول۔ رضا۔ قناعت۔ اخلاص عبودیت۔ یقین۔ محبت۔ اطاعت۔ ذکر و فکر۔ شکر۔ حلم۔ کرم۔ حسن ظن وغیرہ حاصل بھی ہو جاتے ہیں۔ وھٰذا ما ینبغی۔ صرف خلوص و اہتمام کی ضرورت ہے۔ واللہ اعلم

عہ (گزشتہ صفحہ کا حاشیہ) جسمانی امراض کے سہل مگر نافع علاج کا ایک طریق ہومیو پیتھک مشہور ہے اس رنگ پر اگر اس خدائی مطلب کا نام "ہولیو پیتھک" کہہ دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ ہولی انگریزی میں مقدس و متبرک کو کہتے ہیں مطلب یہ کہ مقدس طریق علاج!

زکوٰۃ اور ٹیکس

استاذ یوسف القرضاوی ـــــ ترجمہ خلیل الرحمٰن سجاد

(۵)

کیا ٹیکس زکوٰۃ کے قائم مقام ہو سکتا ہے؟

ہم یہ بات کئی دفعہ کہہ چکے ہیں کہ زکوٰۃ عبادت بھی ہے اور ٹیکس بھی، اور اس طرح وہ حصول رضاد تقرب کا اہم ترین وسیلہ بھی ہے اور سوسائٹی کی مالی ضرورتوں کے حل کا بہترین ذریعہ بھی، چنانچہ جس طرح صاحب نصاب اپنی زکوٰۃ ادا کرنے کا مکلف ہے، اسی طرح حکومت اُس کی وصولیابی اور مصارف مقررہ میں صرف کی ذمہ دار ہے لیکن اس زمانے میں مسلم حکومتوں کو بھی زکوٰۃ سے کوئی مطلب نہیں رہا ہے، اجتماعی ضرورتوں کے لیے وہ جدید ٹیکس کو اپناتی ہیں۔ دوسری طرف اسلام مسلمانوں سے زکوٰۃ کے نام سے ایک متعین اور مستقل مالی حق کا مطالبہ کرتا ہے، اس طرح مسلمانوں پر دوہرا بوجھ پڑجاتا ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے ایک سوال یہ سامنے آیا ہے کہ کیا عام حکومتی ٹیکس زکوٰۃ کا بدل ہو سکتے ہیں؟ اور کیا وہ فریضہ زکوٰۃ سے عہدہ برآ کر دیں گے؟ یا نہیں ـــــ ہم زیر نظر مقالہ میں اس مسئلہ پر کچھ کلام کرنا چاہتے ہیں۔ واللہ یہدی الی سواء السبیل۔

اس سوال کے جواب کے لیے ٹیکس اور زکوٰۃ کی حقیقت جاننا ضروری ہے، ہم گزشتہ فصلوں میں اس پر خاصی تفصیل کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں۔ ہم نے ذکر کیا تھا کہ ان دونوں کی کچھ صفات مشترکہ ہیں،

ع۔ اس سے پیشتر کی قسط کے لیے ملاحظہ ہو الفرقان بابتہ ماہ صفر ۱۳۹۲ھ

اور کچھ اختلافی، یہاں ہم مختصراً یہ بتانا چاہتے ہیں کہ زکوٰۃ اور ٹیکس میں سب سے نمایاں اختلافی عناصر زکوٰۃ کی یہ تین امتیازی صفات ہیں ۱۔ اس کی شرح و مقدار ۲۔ اس کی عبادتی حیثیت اور ۳۔ خاص مصارف۔ مؤخر الذکر دو صفات میں زکوٰۃ اور ٹیکس کا اختلاف تو بالکل کھلا ہوا ہے ٹیکس ایک شہری فریضہ ہے اور بس! اس سے زیادہ کچھ نہیں، اور زکوٰۃ، سب سے پہلے ایک عبادت اور اسلامی شعار ہے، اس کی اسی حیثیت کی وجہ سے شریعت نے اس کے مواقع صرف بھی مقرر کر دیے ہیں، اور اس معاملہ میں اس کے احکام اتنے سخت ہیں کہ زکوٰۃ کی مد کا ایک حبہ بھی ان مصارف کے سوا کہیں اور خرچ نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک شرح و مقدار کے اختلاف کا سوال ہے تو یہ ہمارے مشاہدہ میں ہے کہ ان دونوں کی مقداروں میں یکسانیت کم ہی پائی جاتی ہے ___ ان چیزوں کے علاوہ زکوٰۃ "اسلامی شعار" ہے اور شعار میں ادنیٰ سی ترمیم بھی نہیں ہو سکتی، ان کا نام بھی نہیں بدلا جا سکتا، اس لیے ٹیکس کے نام سے جو مال خرچ کیا جائے اسے زکوٰۃ نہیں سمجھا جا سکتا، یا یوں کہیے کہ اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہو سکتی۔

بہر حال ان وجوہ سے ہمارے نزدیک ٹیکس زکوٰۃ کا بدل نہیں ہو سکتے ___ کوئی شے اپنی ضد کا بدل نہیں ہو سکتی، اور ٹیکس اور زکوٰۃ مختلف النوع اور متضاد الصفات "حقوقِ مالیہ" ہیں۔

یہاں تک تو ہم نے اپنی رائے پیش کی، اب آئیے یہ دیکھیں کہ علمائے کرام کے اقوال سے اس مسئلہ میں کیا رہنمائی ملتی ہے؟ ___ ہمیں اس مسئلہ میں علماء کی دو رائیں ملتی ہیں ___ ایک سے ٹیکس کو زکوٰۃ کا بدل سمجھنے کا جواز ثابت ہوتا ہے، اور دوسری سے عدم جواز، جمہور نے دوسری رائے ہی کو اختیار کیا ہے ___ ذیل میں پہلی رائے پر مبنی بعض علماء کے اقوال درج کیے جا رہے ہیں

مشہور شافعی محقق امام نووی فرماتے ہیں ___ "شوافع کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ خراج جو غیر منصفانہ طور پر اور جبراً لیا جائے (شرعی) فریضۂ عشر کا بدل نہیں ہو سکتا، ہاں اگر حاکم (کسی مصلحت کی بناء پر) عشر نہ لے بلکہ اس کے بجائے خراج ہی لے (یعنی اس صراحت کے ساتھ کہ یہ خراج عشر کے بدل کے طور پر لیا جا رہا ہے) تو اسمیں اختلاف ہے کہ اس خراج سے فریضۂ عشر ادا ہو جائیگا یا نہیں؟ ___ لیکن ترجیح اسی رائے کو ہے کہ ادا ہو جائے گا، اس قول کے مطابق اگر یہ خراج عشر کی مقدار واجب سے کم ہو تو یہ کمی الگ سے پوری کی جانی چاہیے"۔

امام نووی کا یہ قول براہ راست ہمارے زیر بحث موضوع سے متعلق تو نہیں ہے، تاہم اس سے

اس میں رہنمائی (دلالت) ضرور ملتی ہے اور قیاسی استدلال کیا جا سکتا ہے' اس طرح کہ عشری زمین سے عشر کے بجائے خراج لیا جانا' اموالِ زکوٰۃ سے ٹیکس لیے جانے کا مرادف ہے۔ لہٰذا اس قول کے مطابق جس طرح پہلی صورت میں خراج عشر کی جگہ لے سکتا ہے اور اس سے فریضۂ عشر ساقط ہو سکتا ہے اسی طرح دوسری صورت میں ٹیکس کو زکوٰۃ کا بدل سمجھنا چاہیے۔

فقہ حنبلی کی متعدد کتابوں میں یہ واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ کسی نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ کیا امام صلح کے علاقے کی زمین سے نصف پیداوار لے سکتا ہے؟ امام احمد نے جواب دیا "نہیں! یہ ظلم ہے" پھر یہ دریافت کیے جانے پر کہ اگر بالفرض کوئی حاکم ایسا کرے تو کیا اس سے اس زمین کے مالک کے ذمہ سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی؟ یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ساقط ہو جائے گی۔ اگر وہ اس زبردستی چھینے گئے مال ہی میں زکوٰۃ کی نیت کر لے[۱]

اس سے زیادہ صراحت امام ابن تیمیہؒ سے منقول اس عبارت میں ہے کہ "امام' مکس (یعنی ٹیکس) کے نام سے جو کچھ لے زکوٰۃ کی نیت سے اس کی ادائیگی جائز ہے اور اس سے فریضۂ زکوٰۃ ادا ہو جائے گا[۲] ـــــ لیکن یہ عبارت اس لیے قابلِ اعتبار نہیں ہے کہ امام موصوف کے فتاویٰ کے مجموعہ میں اس کے بالکل برعکس عبارت نقل کی گئی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "حکومت جو مال' زکوٰۃ کے نام سے ساتھ نہ لے اسے زکوٰۃ کا بدل نہیں سمجھا جا سکتا" ـــــ ان دونوں عبارتوں کا تضاد بالکل کھلا ہوا ہے' اس لیے بلا اس تحقیق کے کہ کون سی عبارت صحیح تر ہے یا اگر دونوں صحیح ہیں تو کون سی بعد کی ہے' اس عبارت سے استدلال درست نہ ہوگا۔

ان فتاویٰ کے متعلق اپنے خیالات ہم بعد میں ذکر کریں گے۔ پہلے ان علماء کے اقوال ملاحظہ فرمائیے جو ٹیکس کو زکوٰۃ کا بدل سمجھنے کے خلاف ہیں ـــــ یاد رہے کہ جمہور علماء کی رائے یہی ہے۔

علامہ ابن حجر ہیتمی (شافعی) اپنی کتاب "الزواجر" ج ا صفحہ ۱۴۹ میں بہت سختی کے ساتھ اس نظریہ

---

[۱] شرح غایۃ المنتہی ج ۲ ص ۱۳۳ [۲] الفواکہ العدیدۃ فی المسائل المفیدۃ ج ا صفحہ ۱۵۱ مطبوعہ المکتب الاسلامی (دمشق)

کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں

...... یہ ایک بے بنیاد بات ہے، فقہ شافعی میں اس کی کوئی اصلیت نہیں — زکوٰۃ تب ہی ادا ہو سکتی ہے جب زکوٰۃ وصول کرنے والے خاص عملہ کو زکوٰۃ کے نام کے ساتھ دی جائے، دوسرے واجبات وصول کرنے والے عملہ کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی،

لہٰذا زیر بحث مسئلہ میں ٹیکس وصول کرنے والوں کو جو دیا جائے، وہ زکوٰۃ نہیں ہو سکتا، کیونکہ نہ تو یہ زکوٰۃ کے نام اور عنوان سے ہوتا ہے اور نہ یہ وصول کرنے والے "عاملین" ہوتے ہیں۔ آگے چل کر ابن حجر لکھتے ہیں:۔

لوگوں کا یہ خیال کہ ٹیکس کے ساتھ زکوٰۃ کا مطالبہ مشقت اور دوہرے بوجھ کا باعث ہوگا، دراصل شیطانی وسوسہ اور فریب نفس ہے — زکوٰۃ اللہ کا واجب کردہ فریضہ ہے اگر آپ مالک نصاب ہیں تو زکوٰۃ بہرحال آپ کے ذمے واجب الادا ہے اور اس کا ایک ایک پیسہ ادا کر دینے تک واجب الادا رہے گی۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی ڈاکو آپ کا مال زبردستی چھین لے اور آپ اس مسلوب مال میں زکوٰۃ کی نیت فرمالیں تو کیا زکوٰۃ ادا ہو جائے گی —؟ — آپ کے ذمے سے فرض ساقط ہو جائے گا؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر اس ٹیکس کو (جو زبردستی اور جبراً لیا جاتا ہے) زکوٰۃ کا بدل کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟

فقہ حنفی کے معتمد عالم و مقتدیٰ علامہ ابن عابدین شامی ردالمحتار (ج ۲ ص ۴۲) میں ابن حجر ہیثمی کا مذکورہ بالا کلام نقل فرمانے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"ان سب باتوں کے علاوہ (جو ابن حجر ہیثمی نے لکھی ہیں) ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ ٹیکس وصول کرنے والے جمع شدہ مال میں سے اپنے حصے (کمیشن) کے طور پر بھی کچھ ... لیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کا ان کے لیے کوئی جواز نہیں، دوسری بات یہ بھی ہے کہ ٹیکس تقریباً ان تمام ہی شرائط سے خالی ہوتے ہیں جو زکوٰۃ کے ساتھ لگائی گئی ہیں، مثلاً سال بھر میں صرف ایک ہی دفعہ ٹیکس کا عائد ہونا ضروری نہیں، کئی دفعہ بھی عائد ہو سکتا ہے اور مال کی بہت سی ان قسموں میں جن پر زکوٰۃ نہیں ہے ٹیکس لاگو ہوتا

ہے ـــــ الغرض ان وجوہ سے بھی ٹیکس کو زکوٰۃ کا بدل نہ سمجھنے کی تائید ہوتی ہے۔

یہ مسئلہ ہمارے زمانہ میں وضاحت کے ساتھ ابھرا ہے لہٰذا عصر جدید کے علماء کے خیالات کی خصوصی اہمیت ہے، ذیل میں ان ہی علماء کے خیالات پیش کیے جا رہے ہیں۔

شیخ علیش فقہ مالکی کے مشہور مفتی شیخ محمد بن احمد علیش سے سوال کیا گیا کہ اگر کوئی حاکم کسی مالک نصاب شخص سے جس پر زکوٰۃ واجب ہو، کوئی سالانہ ٹیکس لے تو کیا اس کی ادائیگی زکوٰۃ کی نیت سے کی جا سکتی ہے؟ اور کیا اس سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟ شیخ موصوف نے جواب دیا کہ نہیں، غیر زکوٰۃ میں نیتِ زکوٰۃ جائز بھی نہیں ہے اور محض نیت سے زکوٰۃ ادا بھی نہیں ہو گی۔

علامہ سید رشید رضا مصری عصر حاضر کے مشہور عالم و مفسر علامہ سید رشید رضا مصری سے بعض ہندوستانی مسلمانوں نے یہ دریافت کیا کہ انگریز حکومت مسلمانوں کی آراضی سے جو محصول (لگان) لیتی ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ کیا اسے "عشر" سمجھا جا سکتا ہے۔ علامہ موصوف کا جواب تھا۔ "عشر اور نصف عشر (وغیرہ) زکوٰۃ کی مقداریں ہیں اور اموالِ زکوٰۃ ہی پر ان کا وجوب ہو سکتا ہے۔ اگر دار الاسلام میں "امام" کی طرف سے کوئی "وصول کنندہ" عشر وصول کرے تو اسے عشر سمجھا جائے گا اور زمین کا مالک اس "وصول کنندہ" کو مقدارِ واجب سونپ کر اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو جائے گا اور حکومت پر اس کے صحیح صرف کی ذمہ داری عائد ہو جائے گی ـــــ اگر یہ صورت نہ ہو تو مستحقین تک پہونچانے کی ذمہ داری بھی فرد ہی کی ہو گی ـــــ دنیا کی کوئی حکومت چاہے وہ مذہباً مسیحی ہو یا کوئی اور اپنی سلطنت کی آراضی سے جو محصول یا لگان لیتی ہے اس کی حیثیت صرف شہری ٹیکس کی ہے، اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہو گی، پس اگر کوئی مسلمان اس کے بعد بھی نصابِ زکوٰۃ کا مالک رہے تو زکوٰۃ اس کے ذمے بدستور واجب الادا رہے گی۔"

ایک شبہ کا ازالہ یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ بحث اصلاً تو اسلامی حکومت کے عائد کردہ ٹیکسوں پر ہو رہی ہے اور علامہ سید رشید رضا کے اس فتوے کا تعلق غیر اسلامی حکومت کے ٹیکس سے ہے، لہٰذا اس سے استدلال بے محل ہو گا، لیکن علامہ کی عبارت ہی میں اس شبہ کا جواب بوجودہ موجود ہے، الفاظ یوں ہیں۔" ان ما یاخذہ النصاریٰ وغیرہم ...... یعنی من الضرائب لاتسقط بہ الزکاۃ (نصرانی جو کچھ وصول کرتے ہیں اور ان کے علاوہ بھی جو اس طرح

پر وصول کیے وہ ٹیکس میں شمار ہوگا اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی)

نصاریٰ کے بعد "غیر ہم" کا اضافہ کر کے تخصیص کے شبہ کو زائل کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس عموم میں اسلامی حکومت بھی شامل ہے۔

شیخ شلتوت مشہور مفتی و مفسر سابق شیخ الازہر شیخ محمد شلتوت سے جب یہی سوال کیا گیا تو آپ نے اپنے مفصل جواب میں زکوٰۃ کی حقیقت اور عبادتی حیثیت کو خصوصیت کے ساتھ نمایاں کرنے کے بعد لکھا:۔

زکوٰۃ ایک مذہبی فریضہ ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گا، اس کی ادائیگی ہر حالت میں لازمی ہے، خواہ کسی زمانہ میں عام معیشت کی خوشحالی، وسائل کی فراوانی یا کسی اور وجہ سے اس کی ضرورت نہ معلوم ہو —— اس کے برعکس ٹیکس میں اس ثبات و دوام کا وجود نہیں وہ بس ضرورت کے وقت اور ضرورت ہی کے بقدر عائد کیا جا سکتا ہے —— الغرض ٹیکس اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک عارضی فریضہ ہے اور زکوٰۃ دائمی، لہٰذا ایک عارضی فریضہ کسی دائمی فریضہ کی جگہ کیسے لے سکتا ہے؟ علاوہ ازیں ان دونوں کے اغراض و مقاصد شرح، مقدار اور قانونی اساس میں بھی اختلاف ہے، اس لیے بھی ایک کو دوسرے کی جگہ نہیں دی جا سکتی۔

جو مسلمان کسی ٹیکس کا مکلف کیا جائے وہ اسے ادا کرے اور اسے اپنے مال پر "دین واجب" سمجھے اگر باقی ماندہ مال پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہو تو زکوٰۃ نکالے،

اگر کسی کو اسمیں کچھ شقت، حرج اور گرانی محسوس ہو تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ کسی کے کچھ محسوس کرنے سے نہ تو خدا کا حکم بدل سکتا ہے اور نہ فقراء و مساکین کے حقوق جو خدا نے سب مالداروں پر رکھے ہیں، ان میں کچھ نرمی پیدا ہو سکتی ہے —— اس مشقت کو دور کرنے کے لیے خدائی احکام اور قوانین میں ترمیم کی آواز بلند کرنے کے بجائے ان لوگوں کو اپنے سیاسی حالات اور امکانات کو سامنے رکھ کر حکومتوں کا طرز عمل بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اسلامی قوانین پر مکمل اور حقیقی عملدرآمد کا مطالبہ ہونا چاہیے۔

علماء کرام کے اقوال کے اس مختصر خاکہ سے یہ بات دلائل کے ساتھ سامنے آگئی۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ اس سلسلہ میں علماء کی دونوں رائیں ہیں ــــ یہ بھی کہ ٹیکس کو زکوٰۃ کا بدل مانا جا سکتا ہے اور یہ بھی کہ نہیں مانا جا سکتا ــــ ہم اپنی رائے اور اپنا رجحان ذکر کر چکے ہیں۔ پہلی رائے پر مبنی بعض علماء کے اقوال ذکر کرنے کے بعد ہم نے کہا تھا کہ ان فتاویٰ کے متعلق اپنے خیالات ہم بعد میں ذکر کریں گے ــــ اب ہم اسی سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ ان فتاویٰ کو غور سے پڑھیے اور ان کے پس منظر یا "شانِ نزول" پر غور کیجیے، صاف معلوم ہو جائے گا کہ زیادہ تر فتاویٰ "ناجائز اور ظالمانہ ٹیکسوں" کے بارے میں ہیں جو مالدار یا برسرِ اقتدار طبقہ عوام پر ان کی معاشی حالت کمزور کرنے اور خود عیش و سرمستی کی زندگی گزارنے کے لیے لگاتا تھا۔ اس کا کوئی نفع عوام کو نہیں ہوتا تھا، حکام کے پیش نظر صرف اپنا مفاد اور اپنا خزانہ ہوتا تھا ــــ ان علماء کرام نے اپنی بصیرت و فراست سے یہ محسوس کیا اور محض مصلحت اندیشی کی خاطر یہ رائے ظاہر کی تاکہ عام مسلمان جو یونہی ظلم و ستم کا شکار ہو رہے ہیں اور جن کی مالی حالت، جس کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے، روز بروز بگڑتی جا رہی ہے، مزید بربادی کا شکار نہ ہوں ــــ الغرض ہمیں تو صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ ان فتاویٰ کا تعلق "ناجائز اور ظالمانہ ٹیکسوں" سے ہے ــــ اور ہماری گفتگو جائز اور منصفانہ ٹیکسوں کے بارے میں ہے یعنی ہم جن ٹیکسوں کو زکوٰۃ کا بدل سمجھنے کے لیے تیار نہیں وہ جائز ٹیکس ہیں، جن میں وہ تمام شرائط ملحوظ ہوں جن کے بغیر شریعت ٹیکس عائد کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ لہٰذا ان مذکورہ فتاویٰ سے ہمارے موضوع میں استدلال ہی درست نہیں۔

آخر میں ہم ایک بات اور عرض کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ اس طرح کے کسی سوال کا جواب دیتے وقت اس ذہنیت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو سوال کے پس منظر میں کارفرما ہوتی ہے۔

ہمارے زمانہ میں عام مسلمانوں کی جو دینی حالت ہے اور انھیں اسلام کی تعلیمات، اس کے اصول و نظریات اور مزاج اور روح سے جو بُعد ہے وہ نہ بیان کے قابل کوئی چیز ہے اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔

اسلامی تعلیمات سے شرمناک حد تک ناواقفی، مغرب کی ذہنی غلامی اور اس کے سامنے

مکمل فکری سپر اندازی ہی کی وجہ سے تقریباً پورے عالم اسلام میں عملی طور پر اسلام بالکل بے دخل ہے ــــ اسلام دشمن مغربی استعماری طاقتیں ایک مدت سے تعلیمی، ثقافتی، ادبی، فکری، سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی ہر میدان میں گھس کر یک آواز یہ پروپیگنڈا کرنے میں مصروف ہیں کہ "اسلام ایک جامد مذہب ہے، اس میں عصری مشکلات اور مسائل حل کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں۔ وہ بدلتے اور انقلاب پذیر زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

ہماری نئی نسل میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جن کا سابقہ اسلام سے یا کہنا چاہیے کہ اسلامیات سے یا تو پڑا ہی نہیں یا اگر پڑا تو ان ہی "اسلام دشمن ماہرین اسلامیات" کے واسطہ سے، اس کا لازمی نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔

بہر حال یہ ہے وہ ذہنیت جو اس طرح کے تمام سوالوں کے پس منظر میں شعوری یا غیر شعوری طور پر کارفرما ہوتی ہے اور اس کا لحاظ دوسرے تمام علمی پہلوؤں اور فقہی دلائل کے برابر ضروری ہوتا ہے۔

میں بہت صفائی کے ساتھ کہنا چاہتی ہوں کہ اگر ہم نے اس ذہنیت کو پیش نظر نہ رکھا اور زمانہ کے مزاج اور اس کے طرز فکر کو نظر انداز کر کے علمی و فقہی باریکیوں اور گنجائشوں سے فائدہ اٹھا کر یہ کہہ دیا کہ ٹیکس زکوٰۃ کا بدل ہو سکتے ہیں تو اس طرح ہم ایک اسلامی شعار زکوٰۃ کو معدودے چند مسلمانوں کی انفرادی زندگی سے بھی نکال دیں گے اور ایک فریضہ کے مٹانے کے ناقابل معافی گناہ کے مرتکب ہوں گے اور ان مجرموں کی صف میں شامل ہو جائیں گے جن کی ذہنی فکری صلاحیتوں کا تمام تر استعمال اسلام کے مجموعی ڈھانچے یا اس کے کسی خاص فریضہ کو منہدم کرنے پر ہوتا ہے۔ (ختم)

تحدیثِ نعمت

کیا پایا اور کن کو پایا

(۳)

محمد منظور نعمانی

حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت:

میں ذکر کرچکا ہوں کہ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں دار العلوم دیوبند میں شوال ۱۳۴۳ھ میں داخل ہوا تھا جبکہ حضرت شیخ الہندؒ کا وصال اس سے ۴-۵ سال پہلے اوائل ۱۳۳۹ھ میں ہو چکا تھا۔ مالٹا کی اسارت سے واپس آکر آپ صرف ۵-۶ مہینے حیات رہے تھے۔ میں اُن دنوں اپنے وطن سنبھل میں صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھ رہا تھا، اس لیے اُس وقت میرے دیوبند جانے اور حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت کرسکنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ لیکن یہ سعادت میرے لیے مقدر تھی الحمد للہ حاصل ہوئی اور عجیب طریقہ سے حاصل ہوئی۔ إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ ط

مالٹا سے ۵ برس کے بعد حضرت کی واپسی رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کے اواخر میں ہوئی تھی ___ ٹھیک ان ہی دنوں میں میرے بارے میں فیصلہ ہوا کہ آگے کی تعلیم کے لیے مجھے حضرت مولانا کریم بخش صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے سپرد کردیا جائے، وہ اس زمانے میں دہلی کے "مدرسہ عبدالرب" میں مدرس تھے اور رمضان مبارک کی تعطیل میں حسب معمول وطن تشریف

لئے ہوئے تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ حضرت مولانا سے ہم وطنی کے علاوہ قریبی رشتہ داری کا بھی تعلق تھا۔ اُن سے جب میرے بارے میں عرض کیا گیا تو انھوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھنا منظور فرما لیا اور بتلایا کہ شوال کی فلاں تاریخ کو میں دہلی کے لیے روانہ ہونے والا ہوں ـــــ حضرت مولانا کے ساتھ میرا جانا بھی طے ہو گیا۔

غالباً شوال کے پہلے ہفتہ کی کوئی تاریخ تھی مولانا سنبھل سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے، میں بھی ساتھ تھا، مولانا کے دو بڑے صاحبزادے بھی ساتھ تھے: ایک مولانا عبدالحق صاحب مرحوم جو اُس وقت سیالکوٹ کے ایک مدرسہ میں مدرس تھے، دوسرے اُن سے چھوٹے مولانا ضیاء الحق صاحب (مرحوم)، جو اُس وقت کی ریاست جو دھپور کے ایک قصبہ پیپاڑ میں مدرس تھے، اِن دونوں حضرات کو اپنے اپنے مقام پر جانا تھا۔ سنبھل سے روانہ ہو کر ہم سب مراد آباد پہونچے۔ مجھے یہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ حضرت مولانا اور دونوں صاحبزادوں کے سفر کا پروگرام یہ ہے کہ پہلے اپنے استاذ و مخدوم حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت کے لیے دیوبند جائیں گے پھر وہاں سے اپنی اپنی منزلوں کے لیے روانہ ہوں گے۔ (جیسا کہ ابھی ذکر کیا جا چکا ہے حضرت شیخ الہندؒ بس ہفتہ عشرہ پہلے ہی مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند تشریف لائے تھے) مجھے جب سفر کا یہ پروگرام معلوم ہوا تو بیحد خوشی ہوئی کہ حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت کی سعادت مجھے بھی حاصل ہوگی، اُن دنوں ہر طرف حضرت کا ایسا چرچہ تھا گویا کہ وہ ہندوستان کے "امام المسلمین" ہیں۔

ہم سب عصر کے قریب مراد آباد پہونچے تھے، وہاں سے دیوبند کے لیے ٹرین رات کو جانے والی تھی، مراد آباد کے "اسلامیہ مسافر خانہ" میں قیام کیا جو ریلوے اسٹیشن کے بالکل متصل اور سامنے تھا۔ اب تو ماشاء اللہ اس کی عالیشان دو منزلہ یا سہ منزلہ عمارت ہے، اُس وقت کچی خستہ سی عمارت تھی۔ چھوٹے چھوٹے پرانے حجرے تھے یا کھپریل کی کوٹھریاں تھیں جن کے آگے کھپریل کا سائبان تھا، مگر اچھی طرح یاد ہے کہ مسافر خانہ سے تعلق رکھنے والے چھوٹے بڑے سب ملازمین میں گہری دینداری تھی اور خدمت کا جذبہ تھا۔ ایک درجہ میں خانقاہ کی سی فضا تھی ـــــ یہ میرے لیے عمر کا سب سے پہلا سفر تھا، اس سے پہلے کبھی مراد آباد بھی آنا نہیں ہوا تھا، کسی مسافر خانہ کو دیکھنے اور اس میں ٹھہرنے کا بھی پہلا ہی موقع تھا۔ اتنا یاد ہے کہ یہاں کے

آدمیوں کو اور اُن کی دینداری اور خدمت گزاری کو دیکھ کر کم عمری کے باوجود دل بڑا خوش ہوا تھا ___ اُس وقت کے اُس خستہ اور پُرانی کچی عمارت اور کھپریل والے مسافر خانہ کی نورانی فضا اور بیچارے غریب دربان اور محرر صاحب کی مولویانہ صورت، نیک سیرت اور خوش اخلاقی، ۵۵ سال گزر جانے پر آج بھی حافظہ میں پوری طرح محفوظ ہے۔

مسافر خانہ کی جدید پختہ عمارت بننے کا فیصلہ اُس وقت ہو چکا تھا، صدر دروازہ پر لوہے کا قد آدم سیاہ بورڈ لگا ہوا تھا جس میں اُن چند حضرات کے نام تھے جنھوں نے جدید عمارت کے لیے رقوم دی تھیں، اُن میں سب سے اوپر بہت جلی قلم سے "حضرت اقدس حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی مدظلہ العالی" کا نام نامی ان ہی الفاظ میں تھا، اور چندہ کی رقم جہاں تک یاد ہے ۲۵ روپے لکھی تھی ___ یہ بھی اُس وقت معلوم ہوا تھا کہ حضرت تھانوی نے بارہا اس مسافر خانہ میں قیام فرمایا ہے۔

مراد آباد کے "اسلامیہ مسافر خانہ" کا یہ تذکرہ تو یونہی زبان قلم پر آگیا اور جی چاہا کہ یہ پرانی لذیذ یاد بھی تحریر میں آکر محفوظ ہو جائے ___ ورنہ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ہمارے قافلہ کو دیوبند جانا تھا اور وہاں کے لیے ٹرین رات کو ملنے والی تھی، اس وقت تک کے لیے ہم لوگ مسافر خانہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دیوبند کے لیے ٹکٹ بھی خرید لیے گئے تھے ___ مغرب سے کچھ پہلے مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد کے اُس وقت کے صدر مدرس (معلوم نہیں کہ اتفاقی طور پر یا حضرت مولانا کریم بخش صاحب کی اطلاع پاکر اُن سے ملاقات ہی کے لیے) مسافر خانہ میں تشریف لے آئے، اور جب ان کو معلوم ہوا کہ مولانا کا ارادہ حضرت شیخ الہند کی زیارت کے لیے دیوبند جانے کا ہے تو انھوں نے بتلایا کہ حضرت کا پروگرام آج فتحپور ہسوہ کے لیے روانگی کا ہے اب اگر آج آپ دیوبند جائیں گے تو حضرت کی زیارت و ملاقات نہ ہو سکے گی ___ یہ معلوم ہو جانے کے بعد دیوبند کے ٹکٹ جو خریدے گئے تھے واپس کر دیے گئے، مولانا عبد الحق صاحب نے سیالکوٹ، اور مولانا ضیاء الحق صاحب نے پیپاڑ کا ٹکٹ خرید لیا اور حضرت مولانا کے اور میرے لیے دہلی کا ٹکٹ خرید لیا گیا ___ یاد ہے کہ دیوبند کے سفر کی اُس وقت منسوخی کا مجھے بھی بڑا رنج ہوا تھا کیونکہ حضرت شیخ الہند کی زیارت کی جو اُمید بندھی تھی،

وہ ٹوٹ گئی۔

مراد آباد سے دہلی کے لیے ٹرین آدھی رات کے قریب چلتی تھی، ہم اس سے روانہ ہوئے، صبح ۸ بجے کے قریب دہلی کے اسٹیشن پر اتر گئے، وہاں سے مدرسہ عبدالرب میں آئے، دیکھا کہ یہاں فرش وفروش کے غیر معمولی قسم کے کچھ انتظامات ہو رہے ہیں، کچھ لوگ جمع ہیں اور ایک خاص قسم کی چہل پہل ہے ــــــ حضرت مولانا کریم بخش (رحمۃ اللہ علیہ) نے کسی سے پوچھا کہ یہ کیسے انتظامات ہیں؟ اُن صاحب نے بتایا کہ حضرت شیخ الہند تشریف لا رہے ہیں، اسٹیشن سے اُتر کر ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر تشریف لے گئے ہیں، وہاں سے ابھی یہاں مدرسہ میں تشریف لانے والے ہیں اور شام تک یہیں قیام فرمائیں گے، رات کی ٹرین سے حضرت کا پروگرام فتحپور کے لیے روانگی کا ہے ــــــ یہ خبر سُن کر جیسی خوشی ہوئی ہوگی ناظرین اس کا کچھ اندازہ فرما سکتے ہیں۔

مدرسہ عبدالرب کے صدر مدرس اور روح رواں حضرت مولانا عبدالعلی میرٹھی قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور چار شاگردوں میں سے ایک اور حضرت شیخ الہند کے رفیق درس تھے، فالج کے حملہ نے چلنے پھرنے سے بالکل ہی معذور کر دیا تھا، خدام ہی اٹھاتے بٹھاتے تھے، لیکن مسند درس پر جب بٹھا دیا جاتا تو بالکل تندرستوں کی طرح پڑھاتے تھے ــــــ حضرت شیخ الہند نے اپنے اس سفر کے پروگرام میں ایک دن دہلی کا قیام ان ہی کی زیارت وملاقات کے لیے رکھا تھا۔

مدرسہ عبدالرب میں ہمارے پہونچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد حضرت شیخ الہند مع اپنے رفقاء کے تشریف لے آئے اور اس طرح راقم سطور کو بھی نعمت غیر مترقبہ کے طور پر زیارت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس وقت تو عمر اور علم وشعور کی کمی کی وجہ سے اس لائق نہ تھا کہ اس شرف وسعادت کی قدر وقیمت سمجھتا اس کے باوجود یاد ہے کہ صرف زیارت اور دید ہی سے بڑی خوشی ہوئی تھی ــــــ بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کا کچھ شعور بخشا تو جانا کہ جہاد فی سبیل اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کی سچی تڑپ رکھنے والے اور اس کی رضا طلبی کی راہ میں اعداء اللہ اور اعداء اسلام کے ہاتھوں لرزہ خیز مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھانے والے اور اس کی یاد اور چاہ میں اپنی ہڈیاں تک پگھلا دینے والے اس بندہ کی صرف زیارت ہی اللہ تعالیٰ کی کتنی عظیم نعمت تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ خاصان خدا کو عقیدت اور محبت کے ساتھ صرف دیکھنے سے بھی اُن کے ساتھ ایک نسبت قائم ہو جاتی ہے اسی لیے جس کسی نے کسی صحابی کی صرف زیارت کی اُس کو "تابعین" میں اور جس نے کسی تابعی کی زیارت کی اُس کو "اتباع تابعین" میں شمار کیا جاتا ہے ـــــ بلکہ حق یہ ہے کہ مقبولین بارگاہ خداوندی کی صرف خواب میں زیارت بھی بڑی سعادت اور خوش بختی ہے اور کبھی کبھی اُس کے بڑے غیر معمولی آثار و برکات ظاہر ہوتے ہیں۔

حضرت شیخ الہند کیا تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کن کمالات سے نوازا تھا اس کے جاننے کے لیے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی "نقشِ حیات" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ :-

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ منصب اور عہدہ کے لحاظ سے دار العلوم دیوبند کے مفتی اکبر (گویا بعد کی اصلاح میں صدر مفتی تھے) تھے، تفسیر یا حدیث کا کوئی سبق بھی پڑھا دیتے تھے، اسی کے ساتھ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، وہ نقشبندی مجددی طریقہ کے صاحب ارشاد شیخ بھی تھے، حضرت شاہ عبد الغنی مجددی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین دیوبندی علیہ الرحمہ کی رہنمائی اور تربیت میں راہ سلوک طے کی تھی اور ان ہی کے مجاز تھے ـــــ وہ دار العلوم کے اُس وقت کے اکابر و اساتذہ میں سب سے بڑے بلکہ سب کے بڑے تھے اور سب ہی اُن کا بڑا احترام کرتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب میں جو کمال بہت ہی نمایاں تھا جس کو ہم جیسے صرف ظاہری آنکھیں رکھنے والے بھی دیکھتے تھے وہ ان کی انتہائی بے نفسی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اللہ کے اس بندہ کے اندر وہ چیز ہے ہی نہیں جس کا نام نفس ہے ـــــ یہ بات عام طور سے مشہور تھی کہ گھروں کے جو کام نوکروں اور نوکرانیوں کے کرنے کے ہوتے ہیں، حضرت مفتی صاحب عند الضرورت وہ سب کام (جیسے گھر میں جھاڑو لگانا، برتنوں کا دھونا مانجنا وغیرہ) یہ سب بے تکلف بلکہ بشاشت

اور خوشی کے ساتھ کر لیتے ہیں، آس پڑوس کے غریب، گھرانوں کا پیسے پیسے دو دو پیسے کا سودا بھی خرید کے بازار سے لادیتے ہیں! دوسروں کے پھٹے ٹوٹے جوتے لیجا کر ان کی مرمت کرالاتے ہیں۔ راقم سطور شہادت دے سکتا ہے کہ بے نفسی کا ایسا کوئی دوسرا نمونہ اس عاجز نے نہیں دیکھا۔

دارالعلوم کے اُس وقت کے اکابر اساتذہ میں ایک امتیازی فضیلت حضرت مفتی صاحب کی یہ بھی تھی کہ اُن کی سند سب سے عالی تھی۔ اُن کو صحاح ستہ وغیرہ کتب حدیث کی اجازت حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی حاصل تھی اور وہ حدیث میں براہ راست حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، اگرچہ مشہور یہ بھی ہے کہ حضرت گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور اُن سے بھی اجازت تھی، لیکن راقم سطور نے اس بارے میں حضرت مفتی صاحب سے دریافت کیا تو حضرت نے بتلایا کہ حضرت مولانا گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے خود بیان فرمایا تھا کہ حدیث کی کتابیں میں نے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی ہیں اور ان ہی سے مجھے اجازت ہے، ہاں بچپن میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں اور اُن کی مجالس میں حاضر ہوتا تھا، اس وقت میری عمر بہت کم تھی، چھوٹے بچوں کی طرح میں حضرت شاہ صاحبؒ کے گھر میں بھی آتا جاتا تھا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے علو سند کے اس امتیاز کی وجہ سے دورۂ حدیث کے بہت سے طلبہ اُن سے حدیث کی خصوصی سند و اجازت بھی لیتے تھے، اس عاجز کو بھی یہ سعادت حاصل ہوئی، رجب ۱۳۴۵ھ میں جب دورۂ حدیث کی اکثر کتابیں ختم ہو چکی تھیں یہ ناچیز اور بعض اور رفقاءِ دورہ حضرت کی مسجد ہی میں حاضر ہوئے اور اجازت و سند کی درخواست کی، حضرت نے شیوخ حدیث کے طریقہ پر صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابو داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد، اور امام طحاوی کی شرح معانی الآثار کے اوائل ہم لوگوں سے سنے اور ان سب کتابوں کی اور ان کے ساتھ حصن حصین کی بھی اجازت مرحمت فرمائی۔ اسی صحبت میں حدیث مسلسل بالاولیت بھی سنائی اور اس کی بھی اجازت دی

اگرچہ اس کی اولیت کا تسلسل دوسری صدی ہجری میں ختم ہو چکا ہے۔

عرض کر چکا ہوں کہ دارالعلوم کے اُس وقت کے اکابر و اساتذہ میں سب سے زیادہ عقیدت و محبت تو اس عاجز کو حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تھی، اُن کے بعد قلب میں سب سے زیادہ عظمت حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔

دارالعلوم کی رسمی طالب علمی کا سلسلہ تو شعبان ۱۳۴۵ھ میں ختم ہو چکا تھا لیکن وہاں آمد و رفت کا سلسلہ اُس کے بعد بھی برابر رہا، کسی نہ کسی تقریب یا بہانہ سے سال میں دو چار دفعہ تو نوبت آہی جاتی تھی ــــ ۱۳۴۷ھ کا غالباً کوئی مہینہ تھا، راقم سطور امروہہ میں مدرس تھا، دیوبند جانے کا کوئی محرک پیش آیا اور میں روانہ ہو گیا، جہاں تک یاد ہے، شام کے وقت یا رات کے ابتدائی حصے میں دارالعلوم پہونچنا ہوا، کسی نے بتلایا کہ حضرت مفتی صاحب سخت علیل ہیں، ارادہ کیا کہ انشاء اللہ صبح زیارت و عیادت کے لیے حاضر ہوں گا۔ لیکن اللہ کی مشیت کہ اسی شب میں حضرت کا وصال ہو گیا، بعد نماز فجر غسل دیا گیا، اُس وقت یہ عاجز اپنی خوش قسمتی سے حاضر تھا۔ غسل کے وقت اور پھر کفن پہنانے کے وقت قلوب کو ایک عجیب سکینت کی کیفیت حاصل تھی جس کا کم از کم اس عاجز کو نہ کبھی اُس سے پہلے تجربہ ہوا تھا نہ اس کے بعد ہوا۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مفتی صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔ اُن کے پاس کعبہ مکرمہ کے غلاف کے استر کا کبھی کا رکھا ہوا ایک ٹکڑا تھا قریباً سوا گز لمبا رہا ہو گا وہ کفنی کے بالائی حصہ کے لیے کافی ہو سکتا تھا، یہ دیکھنے میں ایک خستہ پرانا سا کپڑا تھا کبھی اس کو دھویا بھی نہیں گیا تھا (اور دھونا چاہیے بھی نہیں تھا) اس کو جوڑ کر کفنی بنائی گئی۔ جب غسل کے بعد وہ کفنی پہنائی گئی تو اس بظاہر خستہ پرانی بے دھلی فقیرانہ کفنی میں حضرت مفتی صاحب کو دیکھ کر دل پر ایک خاص اثر ہوا جس کو الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے ــــ پھر نماز جنازہ اور تدفین میں بھی شرکت کی سعادت نصیب ہوئی اور اس کی بڑی خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے اُس دن دیوبند پہونچا دیا ــــ یقیناً یہ بھی اس بندہ پر اللہ تعالیٰ کا خاص انعام تھا۔ فللہ الحمد ولہ الشکر۔

مسلمانوں کے باعزت مستقبل کا مسئلہ

سہ روزہ دعوت دہلی کے دو اداریوں سے اقتباس

(۱)

ایک پرانی کہاوت ہے کہ ایک حساب داں نے کسی سیلابی ندی کے کنارے کھڑے ہو کر اس کے پورے بہاؤ کا جائزہ لیا اور جگہ جگہ کی گہرائی کا اندازہ کر کے یہ اوسط نکال لیا کہ اس ندی کے پانی کی گہرائی اوسطاً ۲½ فیٹ ہے اس کے بعد اس نے اپنی گاڑی کے پہیوں کی اونچائی ناپی اور فیصلہ کر دیا کہ گاڑی میں سب لوگ بیٹھ جائیں کیونکہ یہ آسانی سے پار جا سکتی ہے۔ یقیناً حساب داں کے حساب میں کوئی خامی نہیں تھی، مگر اس بات میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اس کنبے کو بہر حال ڈوبنا ہی تھا۔ ہمارے اکثر حساب داں مفکر ہندوستانی مسلمانوں کو سامنے رکھ کر حساب لگاتے رہتے ہیں کہ وہ بنگال میں مثلاً ۲۱، آسام میں ۳۲، کیرالا میں ۲۴، یو۔پی میں ۱۵، بہار میں ۱۲، اور دوسری ریاستوں میں کم و بیش تناسب سے آباد ہیں۔ اس لیے وہ وہاں کی سیاسی زندگی پر اپنا گہرا اثر ڈال سکتے ہیں اور توازن کی پوزیشن میں آ سکتے ہیں۔ اسی حساب دانی میں وہ برہمن، راجپوت، بدھ، سکھ اور ہریجنوں کی بھی ایک فہرست تیار کرتے ہیں اور یہ باور کر لیتے ہیں کہ اس طرح وہ طبقہ جو اب تک حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہے اور اقتدار کے نشے میں بدمست ہو چکا ہے بے دخل کیا جا سکتا ہے۔

بعض دوسرے حساب داں یوں حساب لگاتے ہیں کہ ۶۔یا ۷ کروڑ مسلمان اگر فی کس ایک روپیہ سالانہ دیں تو اس بڑی رقم سے وہ ہر سال اتنے تعلیمی ادارے قائم کر سکتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے اتنے وظائف دے سکتے ہیں، اتنے رفاہی مرکز، اتنے کارخانے اور اتنے نئے ترقیاتی شعبے کی

تشکیل کر سکتے ہیں جن سے فلاں فلاں خوش گوار نتائج پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ ہم ان کی حساب دانی کی خوش فہمی کو غلط نہیں کہتے اور نہ ان صورتوں کو ناقابلِ عمل سمجھتے۔ البتہ اصل سوال جو اس پوری حساب دانی کی تہ میں پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ ملّت میں یہ نظم و اتحاد اور اعتماد کیسے پیدا ہو کہ وہ ایک اشارے پر حرکت کر سکے۔ کیا جوشیلی تقریروں سے یہ کام انجام پا سکتا ہے، کیا اچھے مضامین سے یہ ضرورت پوری ہو سکتی ہے، کیا دو اور دو کو جوڑ کر چار کی گردان پڑھ لینے سے یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

یہ سب تجربے برابر ہوتے رہے ہیں اور مسلمانوں نے ان کی بڑی قیمت بھی ادا کی ہو۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ بالآخر ہمارے بہت سے مخلصین تھک تھک کر گر گئے ہیں۔ لیکن یہ نسخے کارگر نہیں ہوئے۔ ہم مسلمانوں کے سوچنے کے لیے عرض کرتے ہیں کہ ان کی بجائے نیچے کی سطح سے کام کا آغاز کیا جائے اور محلوں، بستیوں اور شہروں میں کچھ لوگ ان اکائیوں کو سامنے رکھیں اور ایک طویل منصوبہ وہاں کے مسلمانوں کو تعلیمی، اخلاقی، دینی اور اقتصادی اعتبار سے اونچا اٹھانے کا بنائیں اور نہ صرف مسلمانوں کا بلکہ مسلمانوں کو ہراول دستے کی طرح آگے بڑھا کر یہ سوچیں کہ بستی کے تمام رہنے والوں کو اپنے مسائل کے سلسلے میں مسلمانوں پر اعتماد ہو اور ایسا ماحول پیدا ہو جائے کہ وہ آنکھیں بند کر کے مسلمانوں پر بھروسہ کر سکیں اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے سکیں۔ ہر ریاست میں اگر ایسے کچھ محلوں اور بستیوں کی مثالیں سامنے آسکیں تو ان کی روشنی چھپی نہیں رہ سکتی بلکہ ان چراغوں سے دوسرے چراغ روشن ہوتے چلے جانا یقینی ہے۔

اسی بات پر اگر مزید غور کیا جائے تو یہ ضرورت بھی سامنے آئے گی کہ جو لوگ بھی ان آبادیوں کے روحِ رواں ہوں وہ یقین، پختگیِ کردار، ایثار، خلوص، بہی خواہی، محبت، جرأت، استقلال اور حرکت و عمل کا پیکر ہوں اور ان کے سامنے منزل اور اس کے تمام مراحل ہوں، دوسرے گروہوں کی بات چھوڑیے لیکن مسلمانوں کے سلسلے میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہو کہ اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام رضؓ اور صلحائے امت رحؒ کی شکل میں روشنی کے جو مینار موجود ہیں اور انھوں نے قرآن مجید کی تعلیمات پر اپنے دور میں جس تندہی اور ولولے سے کام کیا ہے وہ رہنمائی کی مطلوبہ سیرت کے حصول کے لیے بہت کافی ہے۔

(۲)

کئی سال ہوئے ڈاکٹر سید محمود صاحب مرحوم نے ایک مسلم کنونشن کا خطبۂ صدارت دیتے ہوئے مسلمانانِ ہند کے بارے میں کہا تھا کہ حکومت نے انھیں دوسرے درجے کا شہری بنا دیا ہے۔ لوگوں کو یہ بھی یاد ہوگا کہ اس پر پنڈت نہرو بہت زیادہ چراغ پا ہوئے تھے اور مدتوں تک اس کی صفائی پیش کرتے رہنے کی کوشش کی تھی۔

اس الزام کا ایک پہلو تو وہ تھا جس کی ڈاکٹر صاحب مرحوم نے نشاندہی کی تھی مگر اس کا دوسرا پہلو وہ ہے جس پر خود مسلمانوں کو غور کرنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی گروہ دوسروں کی سازشوں اور کوششوں سے دوسرے درجے کا شہری نہیں بنتا بلکہ خود اس کی اپنی کوتاہ بینی کا اس میں بہت زیادہ دخل ہوا کرتا ہے۔

فرض کیجیے آپ ہر وقت حقوق کی بھیک مانگتے رہیں اور کبھی شدت سے اور کبھی نرمی سے اپنے فرقے اور گروہ کی طرف سے کچھ ایسی مانگیں پیش کرتے رہیں جن کا تعلق صرف آپ کے فرقے سے ہی ہو تو خواہ یہ مطالبے اپنی جگہ کتنے ہی حق بجانب اور منصفانہ ہوں مگر جب آپ کسی سے کچھ مانگنے جائیں گے تو اس کا لازمی مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے اپنے لیے مانگنے کا اور دوسرے گروہ کے لیے دینے اور عطا کرنے کا درجہ تجویز کر لیا ہے، اس پوزیشن کا اور تجزیہ کیا جائے تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ ملک میں ایک طبقہ وہ ہے جو دینے کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا وہ ہے جس کا کام مانگتے رہنا ہے۔ دینے والا طبقہ خواہ اپنے لیے یہ لقب پسند نہ کرے کہ وہ اول درجے کا شہری ہے، مگر عملاً اس کا درجہ یہی ہو جاتا ہے۔ ادھر لینے والا چاہے کتنی ہی ناک بھوں چڑھائے مگر دستِ سوال دراز کرتے ہی خود بخود دوسرے درجے کی شہریت کے مقام پر آ گرتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کی عزتِ نفس کبھی اپنے لیے دوسرے درجے کی شہریت کا لقب اختیار کرنے کو گوارا نہیں کرتی مگر ان کا طرزِ فکر اسی راہ پر ان کو دھکیلے چلا جا رہا ہے۔

سوچنا دراصل یہ چاہیے کہ آخر ہم مانگنے کی پوزیشن سے کس طرح نکلیں اور کس طرح دینے کی پوزیشن میں آئیں۔

مسلمان اگر غور کریں تو انھیں ہرگز مایوسی نہیں ہوگی اور وہ ہر میدانِ کار میں خواہ وہ فلاحی یا سیاست

کی تشکیل ہو یا صحت مند سماج کی تعمیر، نیز اخلاق، روحانیت، سیاست، اقتصادیات اور اجتماعیت کا کوئی بھی پہلو ہو وہ آج بھی فرد اور سماج کو بہت کچھ دے سکتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان کے ساتھ جو ناانصافیاں ہوئی ہیں وہ اُن کی تلافی نہ چاہیں وہ ان ناانصافیوں اور ظلموں کا ضرور مداوا ڈھونڈیں۔ مگر اس کو اپنی کوششوں کا محور نہ بنالیں۔ بلکہ ملک اور سماج تعمیر کے ہر گوشے کو اپنی جولانگاہ قرار دینے کی کوشش کریں۔ ہمارا اپنا تاثر تو یہ بھی ہے کہ جو گروہ دوسروں کو دینے کی کوشش کرتے کرتے موثر پوزیشن میں آجاتا ہے، اُس کے اپنے مسائل چٹکی بجانے میں حل ہو جاتے ہیں۔ تاہم اگر مسلمان اس حد تک آگے نہ بڑھ سکیں تو کم از کم اپنے محدود خول سے نکل کر گرد و پیش پر نظر ڈالنے اور خدمت و محنت کے نئے دائرے تلاش کرنے کی کوشش تو ضرور کرنی چاہیئے۔

بقیہ نگاہ اوّلیں

کھلا ہوا تھا۔ اسکے بجائے انھوں نے "تنقید کو" "برا کہنے" کا نام دے کر اس میدان میں اپنی فوقیت ثابت کرنا چاہی ہو تو میں اپنی طبیعت سے بھی اور مزید براں اُن کے احترام کے تقاضے سے بھی اس میدان میں ان کا حریف نام کو بھی نہیں ہو سکتا۔ ع۔ اگر آں خوش است تو در خوری وگر ایں بدست مرا سزا

عتیق الرحمٰن سنبھلی

نئی مطبوعات

مسلمان اور عصری مسائل
از ڈاکٹر سید عابد حسین
صفحات ۱۶۸، سائز ۲۲×۱۸/۸ کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ۔ مجلد قیمت ۵/۵۰
ناشر:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ہمارے ملک کی معروف علمی شخصیت ہیں۔ تقریباً چار سال سے آپ کی ادارت میں ایک سہ ماہی مجلّہ "اسلام اور عصر جدید" نئی دہلی سے نکل رہا ہے۔ زیر نظر کتاب اس رسالے کے تین سال اداریوں کا مجموعہ ہے۔

"اسلام اور عصر جدید" کا مقصد ڈاکٹر صاحب ہی کے الفاظ میں "مسلمانوں کو نئے زمانے کے اہم ترین مسئلوں کی طرف توجہ دلانا اور ان میں یہ اعتماد پیدا کرنا ہے کہ یہ مسئلے کتنے ہی پیچیدہ کیوں نہ ہوں، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عقل و تدبر سے کام لے کر حل کیے جا سکتے ہیں۔"

رسالوں کے اداریے عام طور پر ان کے خاص موضوع تک محدود نہیں ہوتے۔ یہ اداریے بھی گرد و پیش کے مختلف مسائل پر ہیں، بغیر اس قید کے ان کا تعلق اصطلاحی معنی میں "عصری مسائل" سے یا مخصوص طور پر مسلمانوں ہی سے ہو، البتہ ان سب میں وہ ذہنی اصلاح ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر رہی ہے جس کی ضرورت وہ عصری مسائل کے سلسلے میں مسلم ذہن کے لیے محسوس کرتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ذہنی رویہ ایک ہی ہوتا ہے جو اگر صحیح ہو تو ہر میدان میں اچھے نتائج پیدا کرے گا اور غلط ہے تو ہر میدان میں الجھاؤ ڈالے گا۔ اس معاملے میں تقسیم اور خانہ بندی نہیں ہو سکتی۔

ڈاکٹر صاحب جس ذہنی رویے کے داعی ہیں اس سے نہ بالکلیہ اختلاف کیا جا سکتا ہے نہ بالکلیہ

اتفاق۔ اصولی حد تک یہ بات صحیح ہے کہ مسلمانوں کو بے تعصبی، حقیقت بینی اور حقیقت پسندی کا رویہ اختیار کرنا چاہیے، مگر اس کی تعبیر کے لیے جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (مرحوم) کو نمونہ بنا کر پیش کیا جائے تو پھر اختلاف کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ وہ بڑے لائق احترام اور کئی حیثیتوں سے مثالی آدمی تھے مگر مسائل زمانہ کے سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر کا نمونہ نہیں قرار دیے جا سکتے۔ "ایمان اور عقیدہ" کے زیر عنوان اداریے میں ہر مذہب کے بزرگوں سے اور بطور خاص گرو نانک جی اور گاندھی جی سے، ایمانی استفادے کی جو تلقین ڈاکٹر صاحب نے کی ہے (اور بلاشبہ خلوص اور خدا پرستی کے جذبے سے کی ہے) اُسے بھی ایک "اسلامی" رہنمائی تسلیم کرنا مشکل ہے۔ اس کتاب کے بعض مقامات پر نظر کرتے ہوئے یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کے تصور مذہب میں گاندھی جی، ڈاکٹر رادھا کرشنن اور ٹیگور کے افکار کا بڑا دخل ہے اور اس کے بعد خالص اسلامی رہنمائی کا مسئلہ باقی ہی نہیں رہتا۔

اس پہلو سے قطع نظر ڈاکٹر صاحب کے اِن اداریوں میں بڑی علمی اور فکری افادیت ہے۔ ادبی اعتبار سے بھی وہ بڑے بلند پایہ اور لائق مطالعہ ہیں۔ ہاں ایک اداریہ "مسلم پرسنل لا" اُن کے علمی اور تحقیقی معیار سے بہت فروتر نظر آتا ہے۔ ہمیں یاد آتا ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد قاضی محمد عدیل عباسی صاحب کی ایک تنقید اس پر نکلی تھی۔ اس کے بعد بھی اس کا اپنی عین شکل میں اس مجموعہ کے اندر آجانا تعجب خیز ہے۔

معرکۂ ایمان و مادیت از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

صفحات ۱۵۰۔ کتابت، طباعت اور کاغذ بہتر $\frac{18\times22}{8}$ مجلد قیمت ۳/۵۰

ناشر: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹ لکھنؤ

یہ قرآن مجید کی مشہور سورت "سورۂ کہف" کا مطالعہ ہے۔ تفسیر، حدیث، قدیم تاریخ، جدید معلومات اور حالات حاضرہ کی روشنی میں، احادیث میں اس سورت کو یاد کرنے اور بکثرت پڑھنے کی ترغیب آئی ہے اور اسے فتنۂ دجال سے حفاظت کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ ہمارے مخدوم و محترم حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے لیے قرآن مجید خاص شغف کی کتاب ہے۔ خاندانی اثرات نے اس سورت کی تلاوت کو ان کا بچپن سے معمول بنایا۔ احادیث میں اس کے خواص اور فضائل پڑھ کر یہ ان کے خصوصی

غور و فکر کا مرکز بھی بن گئی، مدتوں کے غور و فکر کے نتائج انھوں نے اس کتاب میں قلم بند فرمائے ہیں، اصلاً عربی میں لکھی گئی تھی، یہ اس کا اردو ترجمہ ہے۔

مولانا مرحوم نے اس کے مقدمے میں لکھا ہے کہ

"اس سورہ میں ایسی رہنمائی، واضح اشارے بلکہ ایسی مثالیں اور تصویریں موجود ہیں جو ہر عہد میں اور ہر جگہ دجال کو نامزد کر سکتی ہیں اور اس بنیاد سے آگاہ کر سکتی ہیں جس پر اس کا فتنہ اور اس کی دعوت و تحریک قائم ہے۔ مزید براں یہ کہ یہ سورہ ذہن و دماغ کو اس فتنے کے مقابلے تیار کرتی ہے، اور اس کے خلاف بغاوت پر اکساتی ہے۔۔۔۔۔"

اس سورہ کے مضامین کے بارے میں لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔۔ میں نے دیکھا کہ پوری سورہ صرف ایک موضوع پر مشتمل ہے جس کو میں "ایمان و مادیت کی کشمکش" یا "غیبی قوت اور عالم اسباب" سے تعبیر کر سکتا ہوں، اس میں جتنے اشارے، حکایات و واقعات اور مواعظ اور تمثیلیں گزری ہیں، وہ سب ان ہی معانی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، کبھی کھل کر، کبھی در پردہ۔"

اس اجمال کی تفصیل یہ کتاب ہے۔

ترجمۂ قرآن مجید

از مولانا حمید الدین فراہیؒ

صفحات ۱۲۰ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ۔ قیمت ۲/۲۵

ناشر:- مکتبہ الحسنات۔ رام پور۔ یوپی

مولانا حمید الدین فراہیؒ کی ذات تعارف سے بے نیاز ہے۔ قرآن مجید کی مبصرانہ خدمت نے انھیں زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ زیر نظر کتاب ان کے قلم سے قرآن پاک کی آخری چالیس سورتوں (سورہ قیامہ تا سورۂ الناس) کا ترجمہ ہے۔ شروع میں موصوف کے مفصل اور سبق آموز سوانح حیات آپ کے نامور شاگرد مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے قلم سے ہیں اور "خیالات اثنائے ترجمہ" کے عنوان سے ایک بہت قیمتی یادداشت خود مفسر مرحوم کے قلم کی۔

قرآن مجید کے طالب علموں کے لیے ایک قیمتی تحفہ بہت معمولی قیمت میں۔

گنجینۂ اسرار

مرتبہ و مترجمہ مولانا مظفر الحسن القاسمی
صفحات ۱۶۰۔ کاغذ اور کتابت و طباعت بہتر سائز ۲۰×۳۰/۱۶ مجلد قیمت ۳/۔
ناشر:۔ بیت الحکمت۔ دیوبند۔ یوپی

یہ حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے مجرب عملیات کی کچھ مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ بیاض کا اردو ترجمہ ہے۔ جو خلف الصدق مولانا انظر شاہ صاحب (استاذ دار العلوم دیوبند) کے ایک شاگرد مولوی مظفر الحسن صاحب نے ان کی اجازت سے شائع کیا ہے ـــــ یہ عملیات دینی اور دنیوی ہر طرح کے مقاصد و حاجات کے لیے ہیں۔

تخلیق انسانی کا مقصد دین و شریعت کا قیام

از مولانا حبیب ریحان خاں ندوی لیکچرر اسلامک انسٹی ٹیوٹ البیضاء (لیبیا)۔ صفحات ۲۲۶۔ کتابت و طباعت معمولی قیمت ۲/۵۰
ناشر:۔ دار التصنیف و الترجمہ ۱۲ مسجد شکور خاں روڈ۔ بھوپال ایم۔ پی

اس کتاب کے تعارف کے لیے اس کے بنیادی عنوانات یا مباحث درج کر دینا زیادہ مفید نظر آتا ہے۔

۱۔ شریعت ماضی کی روشنی میں ۲۔ خلافت شریعت کی محافظ ۳۔ خاتم الانبیاء کا مقصد قیادت ۴۔ شریعت عصر حاضر کے آئینہ میں۔ ۵۔ شریعت کا تابناک مستقبل ۶۔ عصر حاضر میں شریعت کی کامیابی کے چند شرائط ...... ۴ اور ۵ کے ذیل میں موجودہ لیبین حکومت کے اقدامات کا بہت مفصل بیان ہے۔ اتنی تفصیل اردو خواں حضرات کو اس کتاب کے علاوہ شاید اور کہیں نہ مل سکے گی۔

آنکھوں کی
حفاظت، شادابی
اور نکھار
کے لیے
سچے موتی
سونے چاندی کے ورق
اور ۲۶ دواؤں کا یہ مرکب
طب قدیم کے ایک
نادر نسخے سے قدیم ہی
طرز پر تیار کیا جاتا ہے
آنکھوں کی تمام بیماریوں
میں مفید
نگاہ کو قوت اور
پائداری دینے والا
ہماری خاص جستی
سلائی ۱۵ پیسے
تاجر حضرات
قواعد ایجنسی
طلب فرمائیں
لگتا بالکل نہیں بلکہ ٹھنڈک
اور سکون پہونچاتا ہے
ایک تولہ
-/۷
چھ ماشہ
-/۴
ڈاک خرچ
۲/۵۰
دارالفیض رحمانی
دیوبند۔ یو۔پی
کوئی بھی تین شیشی ایک ساتھ طلب کرنے پر ڈاک خرچ معاف

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Kutchery Road, Lucknow U. P.

VOL. 41 NO. 5 JULY, 73 Phone No. 25547

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow-1

الفرقان
لکھنؤ

مرتبہ

عتیق الرحمن سنبھلی

مولانا محمد منظور نعمانی کی

منتخب تقریریں

مولانا محمد منظور نعمانی کی ایمان افروز
اصلاحی و تبلیغی تقاریر کا مجموعہ

مرتبہ
محمد حسان نعمانی

کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصولڈاک کا اضافہ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
بنگلادیش سے ۸/-
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت فی کاپی ..... ۷۵ پیسے

جلد (۴۱)	بابت ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۳ھ مطابق اگست ۱۹۷۳ء	شمارہ (۶)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۸ ستمبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

پیاسی زمینوں کی پکار

——— از مولانا اقبال احمد اعظمی

[ناظرین الفرقان میں سے بہت سوں کے لیے مولانا اقبال احمد اعظمی کا نام نیا نہیں ہے۔ چند سال پیشتر ان کے قلم سے بہت سے مفید ترجمے الفرقان میں مسلسل نکلے ہیں۔ اس زمانے میں دیوبند سے فراغت کے بعد ان کا قیام کچھ دن لکھنؤ میں رہا تھا، بعد میں مدینہ یونیورسٹی چلے گئے اور اب اس کی طرف سے مغربی افریقہ کے ملک ایوری کوسٹ میں دینی خدمت پر مامور ہیں۔ ذیل میں انہی کا ایک مکتوب ہدیۂ ناظرین ہے، یہ مکتوب والد ماجد مولانا نعمانی مدظلہ کے نام ہے ——— (مرتب)]

مخدوم و مکرم .... السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔ اپریل سے میں افریقہ کے ایک ملک "ساحل العاج" (IVORY-COAST) آگیا ہوں

جیسا کہ حضرت والا کو معلوم ہے کہ میرا یہ سفر مجبوراً ہوا ہے، میرا پہلے سے قصد تھا کہ جامعہ اسلامیہ سے فراغت کے بعد حرمین میں قیام کی سعی کروں گا، وہاں ملازمت اور اقامہ کی سہولت ہوگئی فبہا، ورنہ وطن واپس آجاؤں گا۔ حرمین کے علاوہ کسی جگہ کے لیے وطنِ عزیز چھوڑنا کبھی نہیں سوچا تھا .... لیکن یہاں پہونچا تو اللہ تعالیٰ کا بیحد شکر ادا کیا، کہ اگر مدینہ سے باہر نکلنا ہی تھا تو یہاں آکر کوئی غلطی نہیں کی، دیکھا کہ لوگوں میں دین کی بیحد طلب اور علم کی پیاس ہے، مسلمان تو مسلمان یہاں کے کافروں میں بھی دعوت کا کام بہت آسان اور نہایت مفید ہے، باوجود مسلمانوں کے مادی، اور روحانی و علمی ضعف، نیز دعاۃ الی اللہ کی کمی اور ندرت بلکہ فقدان کے اللہ کے کچھ بندے اسلام میں داخل ہوتے رہتے ہیں، مقامی حکومت عام دنیا کی اکثر حکومتوں کی طرح سیکولر، اور رئیس (صدر) مسیحی ہے، اور چونکہ زمانۂ قریب تک یہ علاقہ فرانس کے استعمار میں رہا ہو، اور اس کی وجہ سے عیسائیت اور

یورو پین تہذیب غالب ہے لیکن کسی شخص کے کوئی بھی دین قبول کرنے میں سرکاری یا اجتماعی طور پر کوئی مزاحمت نظر نہیں آتی من شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر سیکڑوں گھر ایسے ملیں گے جن میں ایک بھائی مجوسی ہے تو دوسرا عیسائی اور تیسرا مسلمان، اور ان سب میں برادرانہ تعلقات بھی ہیں، کسی کو دوسرے سے سماجی اعتبار سے کوئی نفرت اور عداوت نہیں معلوم ہوتی ۔ ایسے میں میرے ایسا کمزور صلاحیت و ہمت کا شخص بھی توقع رکھ سکتا ہے کہ اس کے ذریعہ کچھ دین کی خدمت ہو جائے اور خدا کے کچھ بندوں کو ہدایت ہو جائے

حضرت والا نے مشرقی افریقہ کے بعض ملکوں کا دورہ فرمایا ہے، وہاں کے حالات اور ضروریات کا حضرت کو اندازہ ہے، میرا خیال ہے کہ تمام افریقی ممالک کے حالات تقریباً یکساں ہیں، سبھی برطانیہ یا فرانس کے استعمار میں تھے، اور ابھی آزاد ہوئے ہیں، سب علم اور ترقی کی تلاش میں سرگرداں ہیں، اللہ تعالیٰ حکومت سعودیہ کو قوت بخشے، اس وقت تاریکی میں روشنی کا مینار ہے تقریباً سو علماء افریقہ میں اس وقت حکومت سعودیہ کی طرف سے کام کر رہے ہیں، اس اندھی مادیت کے دور میں یہ بے لوث، انسانی اور روحانی خدمت ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے موجب صد تشکر اور ساری انسانیت کے لیے لائق صد ستائش ہے

۲۔ مدینہ منورہ میں قیام کی وجہ سے جہاں اور بہت سے فوائد ہوئے وہاں ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ پوری دنیا کے مسلمانوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں جو کہیں اور رہ کر بے حساب دولت خرچ کر کے بھی شاید حاصل نہ ہوتیں۔

حضرت رائپوری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین میں جناب سید جمیل صاحب جنھوں نے مسیحیت کے رد میں کچھ کتابیں لکھی ہیں اور الفرقان میں ایک آدھ بار میں نے ان کے بعض مضامین کا ترجمہ بھی کیا تھا، ان سے مدینہ منورہ میں تقریباً ہر سال ہی ملاقات ہوتی رہی بہت شفقت فرماتے اور اپنے تجربات سے مستفید فرماتے تھے، انھوں نے بتایا کہ ادھر چند سالوں میں خاص طور سے ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد انھوں نے مشرقی ایشیا کے کچھ ملکوں کے کئی تبلیغی دورے کیے اور جاپان اور کوریا وغیرہ بار بار جانے کا موقع ہوا، اور اللہ عزوجل کے فضل سے بہت سے بندگان خدا کو ان کے ہاتھوں ہدایت بھی نصیب ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ ممالک جاپان وغیرہ جہاں صنعتی میدان میں امریکہ وغیرہ بڑی طاقتوں سے آنکھیں ملائے ہوئے ہیں، دینی اور خلقی اعتبار سے بالکل صفر اور بہت مسکین ہیں، نیز جیسا کہ مسلّم ہے کہ انسانیت کا سکون روحانی قدروں اور خاص طور سے اسلام کی عظیم تعلیمات ہی میں ہے، انھوں نے بتایا کہ پوری جاپانی قوم اس وقت روحانی سکون و سکینت کی تلاش میں

ہے اور اپنے محدود ذرائع اور وقت کے مطابق وہ جو کچھ کام کر سکے اسمیں خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی، اور جیسا کہ افریقہ کے متعلق میں نے عرض کیا، انھوں نے بتایا کہ ان مشرقی ملکوں میں بھی مذہبی عصبیت نام کی کوئی مصیبت نہیں ہے، جس کا جو جی چاہے دین اختیار کرے، نہ کوئی مزاحمت ہے اور نہ سماجی تنافر۔ انھوں نے جامعہ اور رابطہ وغیرہ کے ذمہ داروں کو بھی اس طرف توجہ دلائی ہے اور غالباً وہ لوگ اس مسئلہ پر غور بھی فرما رہے ہیں۔

یہ سب ذکر کر کے میں حضرت والا سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی حکومتیں الهمها الله رشدها۔ تو اپنا فرض جو انھیں توفیق ہوگی ادا کریں گی ہی، لیکن حق کی دعوت تو حکومتوں کی محتاج نہیں ہے، بلکہ تاریخ کے تجربوں نے بتایا کہ دعوتی کام بے سروسامانی میں زیادہ ہوا ہے، اس لیے ہم ہندوستان کے لوگ جو اس وقت سیاسی، اقتصادی اور سماجی ہر اعتبار سے تنزل میں ہیں، اور خاص حالات کی بناء پر مستقبل قریب میں کسی بڑی تبدیلی کی کوئی توقع بھی نظر نہیں آتی، کیوں نہ اپنا اصل فرض منصبی "کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر" لیکر اٹھیں اور آسمانی تعلیمات دنیا میں پھیلا کر اپنے تئیں "انما بعثت معلما" سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتِ معلمی کے مظہر اور متبع ثابت کریں، ممکن ہے یہی عمل ہمارے دوسرے حالات کی تبدیلی کا بھی ذریعہ بن جائے۔

ہمارے مدارس کے طلب اور فارغین جن کے بارے میں لوگ آج عام طور سے کہنے لگے ہیں کہ ان کا مصرف کیا ہے، بلکہ بعض سر پھرے تو یہاں تک کہدیتے ہیں کہ جسے اپنی اولاد کو کہیں کا نہ رکھنا ہو وہ اسے مولوی بنادے۔ لیکن وہ مولوی بلکہ وہی اس کام کو بہت خوبی سے انجام دے سکتے ہیں، میں آپ سے صحیح عرض کرتا ہوں کہ میں نے اپنی طالب علمی میں گاؤں کے قاری صاحب سے جو تھوڑی سی تجوید مشق کی تھی وہ بھی یہاں بہت فائدہ پہونچا رہی ہے۔ یہاں تو لوگ اس کے لیے ترستے ہیں کہ کوئی انھیں صحیح قرآن ہی پڑھادے۔

اگر دعاۃ و مدرسین کے تیار کرنے اور بھیجنے کا پروگرام بن جاتا تو یہ ممالک ایسے ہیں کہ توجہ دلانے پر مالی تعاون بھی کریں گے، اور اگر کچھ لوگ اس غرض سے آکر انھیں وطن بنانا چاہیں تو یہ ممالک پوری ترحیب کریں گے اور میرا اندازہ ہے کہ یہ ممالک اپنی وسعت اراضی و سائل زندگی کی فراوانی اور موسم کی خوشگواری کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ انھیں وطن بھی بنایا جاسکتا ہے۔

یہ معلوم ہو کر تعجب ہوگا کہ عیسائی مشنریاں ان ملکوں میں جس نشاط سے کام کر رہی ہیں انھیں دیکھ کر دہشت ہوتی ہے، کوئی گاؤں اور شہر کا کوئی محلہ ایسا نہیں ہے جہاں انھوں نے اپنا گرجا اور اسکول نہ بنایا ہو، اسپتال اور اس طرح کے دوسرے اجتماعی کاموں کے استقلال کے لیے تو وہ ہیں ہی معروف، عیسائی

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

درس قرآن (مرکز والی مسجد)

۵ر جولائی ۷۳ء

○ — قیامت کے دن اپنی امتوں کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کی شہادت

○ — قرآن پاک میں انسانوں کی ہدایت اور صلاح و فلاح کی سب باتیں بیان کر دی گئی ہیں

○ — خیر و شر کے بارے میں قرآن پاک کی جامع ترین آیت

حمد و صلوٰۃ اور اعوذ اور بسم اللہ کے بعد

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِم مِّنْ أَنفُسِهِمْ ۖ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ ۚ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ○ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○

(سورۃ النحل ع ۱۲ آیات ۸۹ — ۹۰)

اور (قیامت کا) وہ دن (یاد رکھنے کے لائق ہے) جب ہر امت پر شہادت دینے والا اور ان کے احوال بتانے والا ہم انھیں میں سے کھڑا کریں گے اور (اے پیغمبر) تم کو ہم ان لوگوں پر شہادت دینے کے لیے لائیں گے۔ اور ہم نے تم پر نازل کی "الکتاب" پوری طرح بیان کرنے کے لیے

(ہدایت اور سعادت سے متعلق) سب باتیں، اور تاکہ ہدایت اور رحمت کا ذریعہ ہو اور بشارت ہو قبول کرنے والوں اور فرمانبرداری کرنے والوں کے لیے ــــ اللہ حکم فرماتا ہے عدل کا اور احسان کا اور قرابت والوں کے ساتھ داد و دہش کا اور منع فرماتا ہے گندی بے حیائی کی باتوں سے اور ہر طرح کی نامعقول بری باتوں سے اور ظلم و زیادتی سے، وہ تم کو نصیحت فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو اور نصیحت پکڑو"۔

(النحل آیات ۸۹ تا ۹۰)

تفسیر و تشریح یہ سورۂ النحل کا سلسلہ چل رہا ہے، میں بتا چکا ہوں کہ یہ سورۃ بھی مکی ہے۔ اور اکثر مکی سورتوں کی طرح اس کا خاص روئے سخن بھی مکہ کے کفار و مشرکین کی طرف ہے، اور شرک کا رد اور توحید و خدا پرستی کی دعوت اس کا بنیادی مضمون اور پیغام ہے ــــ سورۃ کی سب سے پہلی آیت میں ہر طرح کے شرک اور شریکوں سے اللہ تعالیٰ کی پاکی اور برتری بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا تھا ــــ اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝"۔ اس کے بعد دوسری آیت میں فرمایا گیا تھا کہ سارے پیغمبروں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آتا رہا ہے کہ لوگوں کو خالص توحید کی اور صرف اللہ کی عبادت و بندگی اور صرف اسی سے ڈرنے اور اس کے حکموں پر چلنے کی دعوت دو ــــ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝ ــــ

اس سورت میں توحید و خدا پرستی کی دعوت کا خاص انداز یہ اختیار کیا گیا ہے کہ اس زندگی اور اس دنیا میں بندوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بے شمار نعمتیں مل رہی ہیں اُن کی طرف توجہ دلا کر فرمایا گیا ہے کہ جو خالق و پروردگار ان نعمتوں سے تم کو نواز رہا ہے اسی کا حق ہے کہ اس کو اپنا معبود سمجھو، اور صرف اسی کی عبادت و بندگی کرو اور بس اُسی کے ہو جاؤ، اُسی کے حکموں پر چلو۔

میرا خیال ہے کہ خدا کی نعمتوں کا جیسا بھرپور اور موثر بیان اس سورت میں کیا گیا ہے غالباً قرآن مجید کی کسی دوسری سورت میں نہیں کیا گیا ــــ اس مضمون اور اس سلسلہ کی

آیتوں کی طرف میں اس وقت کچھ اشارات کرتا ہوں ___ شروع کی جو دو آیتیں میں نے ابھی پڑھیں اُن کے بعد تیسری ہی آیت سے ان نعمتوں کا بیان شروع ہو جاتا ہے ___ فرمایا گیا ہے "خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ تَعَالٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ" ___ بلا شبہ زمین و آسمان کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، ہم کو جو کچھ مل رہا ہے زمین یا آسمان ہی سے مل رہا ہے ___ آگے فرمایا گیا ہو کہ انسان خود اپنے بارے میں غور کرے اُس کو اللہ تعالیٰ نے ایک گندے بے جان قطرہ سے بنایا اور پھر اسے زبان و بیان کی عظیم نعمت دی جو اس دنیا میں اس کے سوا کسی کو نہیں ملی، وہ تقریریں اور بحثیں کرتا ہے، اپنی بات کو دلائل سے ثابت کرنے کی خاص صلاحیت رکھتا ہے ___ (خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝) ___ آگے ارشاد فرمایا کہ اس نے تمھارے لیے طرح طرح کے چوپائے پیدا کیے جن سے کہ سواری اور بار برداری کا کام بھی لیتے ہو اور اُن کا گوشت تمھارے لیے بہترین غذا ہے، اور اُن کی کھالوں اور اُن کے اُون سے تمھاری بہت سی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں ___ (وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝) ___ پھر بارش کے نظام کا اور اس کے نتیجہ میں زمین سے پیدا ہونے والی غذائی اجناس اور پھلوں میووں وغیرہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے ___ پھر دن رات کے نظام اور چاند سورج کا ذکر فرمایا گیا ہے ___ پھر زمین پر اللہ تعالیٰ نے انواع و اقسام کی اور رنگ برنگ کی جو لاتعداد نعمتیں بکھار رکھی ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے ___ (وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ) ___ پھر سمندری نعمتوں اور وہاں کی غذائی اور غیر غذائی پیداوار کا ذکر فرمایا گیا ہے اور سمندروں دریاؤں میں چلنے والی کشتیوں اور جہازوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن کے ذریعہ ایک علاقہ کے آدمی اور وہاں کی خاص نعمتیں دوسرے علاقوں تک پہونچتی ہیں ___ اس کے بعد اسی طرح کی کچھ اور نعمتوں کا ذکر فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝	اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو سب کو شمار نہیں کر سکتے، یقیناً اللہ بہت بخشنے والا اور بہت مہربان ہے۔

یہ میں نے صرف اُن نعمتوں کی طرف اشارات کیے ہیں جن کا ذکر اس سورۃ النحل کی ابتدائی

آیتوں میں کہا گیا ہے ۔۔۔ اس کے آگے بھی اس سورت میں جا بجا اسی طرح ان نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن سے انسان عام طور سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں ۔۔۔ کچھ ہی پہلے وہ آیات گزر چکی ہیں جن میں انسانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ سوچیں اور غور کریں کہ گائے، بکری، بھینس وغیرہ جانوروں کے پیٹ میں جہاں غلاظت کے ڈھیر ہیں اور سرخ ناپاک خون کی نالیوں کا جال پھیلا ہوا ہے اسی کے درمیان سے اللہ تعالیٰ کیسا صاف شفاف لذیذ اور صحت بخش دودھ انسانوں کے لیے نکالتا ہے، اسی طرح وہ خاص قسم کی مکھیوں کے ذریعہ شہد کی رنگ برنگ کی قسمیں انسانوں کے لیے تیار کراتا ہے ۔۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کیسی نعمتیں اور اس میں اس کی قدرت کی کیسی نشانیاں ہیں ۔۔۔

پھر جو آیتیں آج زیر درس ہیں جن کی میں نے ابھی شروع میں تلاوت کی تھی اُن سے ایک ہی رکوع پہلے پچھلے ہفتہ کے درس میں وہ آیتیں گزر چکی ہیں جن میں انسانوں کو یاد دلایا گیا ہے کہ جب وقت تم ماں کے پیٹ سے اس دُنیا میں آئے تھے تو تمھیں کسی بات کا علم و شعور نہیں تھا، نہ وہ معلومات تھے جو آنکھ یا کان کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں اور نہ وہ جو غور و فکر اور سمجھ بوجھ سے حاصل ہوتے ہیں ۔۔۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تم کو علم و شعور کے یہ سارے ذریعے عطا فرمائے ۔۔۔ "وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔاۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مستقل سکونت والے گھروں، اور سفری خیموں اور پہاڑی پناہ گاہوں کے سایوں اور گرمی سردی کی تکلیف سے بچانے والے کپڑوں، اور جنگ میں کام آنیوالے حفاظتی لباسوں کا ذکر کر کے آخر میں فرمایا گیا تھا۔ "كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ۝" ۔۔۔ یعنی اللہ تعالیٰ اسی طرح تم کو اپنی نعمتیں بھرپور عطا فرما رہا ہے تاکہ تم ان انعامات و احسانات کو محسوس کر کے اُس کی بندگی اور فرمانبرداری کا راستہ اختیار کرو۔

یہاں تک اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات تفصیل سے بیان فرما کر گویا حجت تمام کر دی گئی ۔۔۔ اور اس کے بعد خطاب کا انداز بدل گیا اور اس میں جلال کا رنگ آگیا ۔۔۔ ارشاد فرمایا گیا ہے، فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (یعنی اگر یہ منکرین ان نعمتوں کی یاد دہانی کے بعد بھی نہ مانیں اور اُلٹے ہی چلیں تو اے پیغمبر تم پر کوئی ذمہ داری نہیں تمہارے ذمہ تو بس صاف صاف

تبلادینا اور پہونچا دینا ہے) ـــــ اس کے بعد فرمایا گیا ہے۔ "یَعْرِفُونَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُونَهَا وَأَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُونَ ۝" یعنی یہ ظالم اللہ کی نعمتوں سے ناواقف نہیں ہیں، خوب جانتے ہیں، لیکن اس کے باوجود منکر ہیں اور ان میں سے اکثر کفر ہی پر قائم رہنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور کافر ہی رہیں گے۔

اس کے بعد ان منکرین کے کافرانہ رویہ کا جو انجام آخرت میں ان کے سامنے آنے والا ہو وہ بیان فرمایا گیا ہے ـــــ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

"وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ۝" اس کا مطلب یہ ہے کہ جس اُمت میں جو نبی اور ہادی بھیجے گئے تھے قیامت کے دن اُن سے اُس اُمت کے بارے میں گواہی لی جائے گی اور وہ خدا کے سامنے گواہی دینگے۔ اور بتائیں گے کہ ان لوگوں نے میرے ساتھ اور میری دعوت و ہدایت کے ساتھ یہ معاملہ کیا تھا۔ پھر وہ لوگ جنھوں نے پیغمبر کی مخالفت اور کفر کی راہ اختیار کی ہوگی چاہیں گے کہ اب اُن کو توبہ کرنے کا موقع دے دیا جائے اور معاف فرما دیا جائے ـــــ لیکن وہاں ان کے لیے توبہ اور معافی کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔

ذرا اس وقت کا تصور کیجیے کہ میدان حشر ہے، اللہ تعالیٰ کے جلال و غضب کا پورا پورا ظہور ہے، ہر نبی اور ہر قوم کے ہادی اور داعیِ حق کی اللہ کے حضور میں پیشی ہو رہی ہے اور وہ سرکاری گواہ کی حیثیت سے اپنی اپنی اُمتوں اور قوموں کے بارے میں بیان دے رہے ہیں، جنھوں نے مخالفت اور کفر کا راستہ اختیار کیا تھا وہ بھی موجود ہیں اور اُن کے بارے میں اللہ کے پیغمبروں اور حق کے داعیوں کی شہادت گزر رہی ہو، جہنم کا عذاب سامنے ہو، اس وقت اُن مجرموں کی جو حالت ہوگی اُس کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے، وہ درخواست کریں گے کہ اب ان کو توبہ کی اجازت دے دی جائے اور معاف فرما دیا جائے۔ لیکن زندگی بھر کفر و انکار پر قائم رہ کر وہ اس کا استحقاق بالکل کھو چکے ہوں گے، پھر اُن کی خواہش اور استدعا ہوگی کہ سزا میں کچھ تخفیف ہی ہو جائے، یا معاملہ کچھ مؤخر کر دیا جائے لیکن کفر کے سنگین جرم کے بعد کوئی رعایت بھی ان کو نہ دی جا سکے گی۔ اسی کو فرمایا گیا ہے ـــــ وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ۝

یہ آیتیں مکہ معظمہ میں نازل ہو رہی ہیں اور اہل مکہ کو سنائی جا رہی ہیں تاکہ وہ اپنے انجام کو سوچیں اور اپنے رویہ پر نظر ثانی کریں ـــ پھر ان اہل مکہ میں وہ اشرار بھی تھے جو خود کفر اور مخالفت کا رویہ اختیار کرنے کے علاوہ دوسروں کو بھی دین حق قبول کرنے سے روکتے تھے اور اس کے لیے طرح طرح کی شیطانی تدبیریں اختیار کرتے تھے، ضعیفوں کمزوروں کو ستاتے بھی تھے، اور ہر زمانہ میں ایسے اشرار ہو سکتے ہیں ـــ آگے خاص طور سے ایسوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ٥ یعنی جن لوگوں کا کردار یہ ہے کہ انھوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا اور دوسروں کو بھی اللہ کے راستے پر اور اللہ کے دین کی طرف آنے سے روکا، اُن کو اُن کے اس مفسدانہ جرم کی پاداش میں اور زیادہ عذاب بالائے عذاب دیا جائے گا۔

اس کے آگے وہ آیتیں ہیں جو میں نے آج تلاوت کی ہیں ـ پہلی آیت میں تو قیامت میں نبیوں، رسولوں اور حق کے داعیوں کی شہادت کے اس مضمون کو کچھ اضافہ کے ساتھ دہرایا گیا ہے جو ابھی ذکر کیا جا چکا ہے ـــ فرمایا گیا ہے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ٥ ـــ یعنی اُس دن کو یاد کرو اور اس کا دھیان کرو جب ہم ہر اُمت میں سے اُن پر شہادت دینے والا انھی میں سے کھڑا کریں گے اور اے پیغمبر تم کو ان لوگوں پر گواہ بنا کے لائیں گے۔ ـ یعنی قیامت کے دن کے اس منظر کا دھیان کرو جب اللہ کے حکم سے ہر اُمت کے پیغمبر اور ہر قوم میں آنے والے داعیانِ حق کو سرکاری گواہ کی حیثیت سے کھڑا کیا جائے گا اور وہ اس اُمت اور قوم کے رویہ کے بارے میں بیان دیں گے کہ انھوں نے حق کی دعوت کو قبول کیا تھا یا انکار و استکبار کیا تھا۔ ـــ اور اللہ کے آخری نبی سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کی اُمت اور خاص طور سے اُن کے پہلے مخاطبین اہل مکہ کے بارے میں بیان دینے کو کہا جائے گا اور آپ آخری سرکاری گواہ کی حیثیت سے بیان دیں گے اور بتلائیں گے کہ ان لوگوں نے آپ کے اور آپ کی دعوت کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا تھا، تو اہل مکہ کے لیے سوچنے کی بات ہے کہ اُس دن ان کا کیا حشر اور کیا انجام ہو گا ـــ

یہ مضمون سورہ نساء میں بھی گزر چکا ہے وہاں ارشاد فرمایا گیا ہے "فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا" صرف الفاظ کا کچھ فرق ہے مضمون بالکل وہی ہے۔

ان آیتوں میں قیامت کے دن اپنی اپنی امتوں کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کے بارہ میں آپ کی جس شہادت اور گواہی کا ذکر فرمایا گیا ہے اُس کے بارے میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُمتوں کے جو لوگ انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں تھے اور جن سے ان کو واسطہ پڑا تھا اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اُمتی آپ کے زمانہ میں تھے اُن کے بارہ میں شہادت دینا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن جو لوگ بعد کے زمانوں میں پیدا ہوئے اور اگلے انبیاء علیہم السلام نے اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کو دیکھا بھی نہیں اُن کے بارے میں شہادت کیسے دے سکیں گے؟ — اس سوال کے دو جواب دیئے گئے ہیں، ایک یہ کہ شہادت اُمتوں کے صرف انہی لوگوں کے بارے میں ہو گی جو اُن کے زمانہ میں تھے اور جن سے ان کو واسطہ پڑا تھا — اس کا اشارہ ایک حدیث سے بھی ملتا ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ حضورؐ کے مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضورؐ کے حکم سے قرآن پاک کی کچھ آیات آپؐ کو سنائیں، ان میں سورہ نساء کی یہ آیت بھی سنائی جس میں قیامت کی اس شہادت کا ذکر ہے فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو جاری ہو گئے اور آپ نے فرمایا "شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ" یعنی اے اللہ میں اسی وقت تک کا حال بتا سکوں گا جب تک میں ان میں رہا تھا۔ پھر اے اللہ جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان کا نگراں اور دیکھنے والا تھا — اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہادت انہی امتیوں کے بارے میں ہو گی جن سے اس دنیا میں واسطہ پڑا تھا — اور دوسرا جواب اس سوال کا یہ بھی دیا گیا ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی اُمّت کے اعمال و احوال کی اور اسی طرح سب نبیوں کو اُن کی اُمتوں کے اعمال و احوال کی برابر اطلاع دی جاتی ہے۔ اسی اطلاع کی بنیاد پر وہ سب اُمتیوں کے بارے میں شہادت دیں گے، اور اُن کی یہ شہادت گویا سرکاری گواہ کی شہادت ہو گی۔

بعض مفسرین نے ان آیات کی تفسیر میں یہ بھی لکھا ہے کہ قیامت میں یہ شہادت انبیاء علیہم السلام بھی

دیں گے اور ان کے علاوہ اُن کے سچے نائبوں اور ان کی دینی دعوت کے داعیوں نے جن لوگوں اور جن طبقوں کو دعوت دی ہوگی اُن کے بارے میں وہی شہادت دیں گے اور ان کی حیثیت بھی قیامت کے دن سرکاری گواہ کی ہوگی۔

بہرحال ان آیتوں کا اصل مقصد اور مدعا تو قیامت کے اُس منظر کی طرف توجہ دلانا ہے جب اللہ تعالیٰ کے جلال کا پورا ظہور ہوگا اور انبیاء علیہم السلام اور امتوں کے ہادیوں اور حق کے داعیوں کی گواہیاں گزریں گی اور وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بیان دیں گے کہ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ اور خدا کے دین کی دعوت کے ساتھ یہ معاملہ کیا، تو آج کے منکروں اور کافروں کو یہ سوچنا چاہیے کہ اس دن اُن کا کیا حال ہوگا۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے "وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ" مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر ہم نے تم پر "الکتاب" (یعنی اپنا مقدس فرمان قرآن مجید) نازل فرمایا ہے جس میں سب ضروری باتوں کا واضح بیان ہے، اور وہ ہدایت اور رحمت ہے اور قبول کرنے والوں اور ماننے والوں کے لیے اچھے اور مبارک انجام کی بشارت ہے۔"

اس سے پہلے والی آیت تک روئے سخن منکروں اور کافروں کی طرف تھا، انواع و اقسام کی نعمتیں یاد دلاکر ان لوگوں کو شکر گزاری، خدا پرستی اور توحید اور ایمان کی دعوت دی جا رہی تھی، اور کفر و انکار کے بُرے انجام سے ڈرایا جا رہا تھا۔ اب اس آیت "وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ" سے روئے سخن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والوں کی طرف ہو گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے آپ پر "الکتاب" نازل فرمائی ہے، یعنی جس جامع اور مکمل آخری آسمانی کتاب کا اگلی آسمانی کتابوں میں بھی ذکر کیا گیا تھا، وہ ہم نے آپ پر نازل فرمائی ہے، یہ قرآن مجید آپ پر ہماری طرف سے نازل ہو رہا ہے جس میں سب ضروری چیزوں کا کھلا اور واضح بیان ہے، یہ آپ پر ہمارا بہت ہی بڑا انعام ہے۔ آپ اس نعمت کا شکر ادا کریں اور آپ پر اس کا جو حق ہے وہ ادا کریں۔۔۔ اور یہ قرآن ایمان لانے والوں اور ماننے والوں کے لیے ہدایت کا نور اور خدا کی رحمت ہے، وہ اس کی روشنی میں خدا کا راستہ پالیں گے اور اس پر چل کر

اس کی خاص رحمت کے مستحق ہو جائیں گے، اور یہ قرآن ان کو دنیا اور آخرت کے اچھے انجام کی بشارت بھی سناتا ہے۔ (هُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ) تو انھیں چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس عظیم احسان کی عظمت کو سمجھیں اور اس کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں۔

اس آیت سے متعلق ایک بات اور بھی ذکر کر دینا انشاء اللہ آپ حضرات کے لیے مفید ہوگا۔ اس آیت میں اور اس کے علاوہ بھی کئی مقامات پر قرآن مجید کو "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" فرمایا گیا ہے اور کہیں "تفصیلاً لِّكُلِّ شَيْءٍ" بھی فرمایا گیا ہے۔ ان آیتوں کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کی ہدایت و سعادت اور صلاح و فلاح کے لیے جن چیزوں کا بیان کر دینا ضروری تھا وہ سب چیزیں قرآن پاک میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں، عام مفسرین نے یہی مطلب سمجھا اور یہی لکھا ہے، اور یہی عقل کی بات ہے، اگر طب اور حکمت کی کسی کتاب کے بارے میں یہ کہا جائے کہ "اس میں سب کچھ بیان کر دیا گیا اور لکھ دیا گیا ہے" تو اس کا مطلب یہی سمجھا جائے گا کہ فن طب اور علاج معالجہ سے متعلق تمام ضروری باتیں جن کے جاننے کی کسی طبیب اور معالج کو ضرورت ہو سکتی ہے وہ اس میں بیان کر دی گئی ہیں۔ اس کا یہ مطلب کوئی بھی نہیں سمجھے گا کہ کھیتی باڑی اور باغبانی سے متعلق یا لوہار اور سنار یا درزی اور بڑھئی کے کاموں سے متعلق بھی ساری باتیں طب کی اس کتاب میں لکھی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی دعویٰ کرے کہ اس کا مطلب یہی ہے کہ طب کی اس کتاب میں یہ سب چیزیں بھی بیان کی گئی ہیں اور اس میں سارے فقہی مسائل بھی اور فن حدیث و تفسیر سے متعلق ساری باتیں بھی لکھی ہوئی ہیں تو لوگ ایسا دعویٰ کرنے والے کو خبطی سمجھیں گے۔ بہر حال یہ بالکل سیدھی اور یہی سی بات ہے کہ قرآن پاک کے "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" اور "تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" ہونے کا مطلب یہی ہے کہ انسانوں کی ہدایت اور سعادت سے متعلق تمام ضروری باتیں اس میں بیان فرما دی گئی ہیں، اور جو جزئی اور فروعی مسائل اس میں بیان نہیں فرمائے گئے ہیں ان کے بارہ میں واضح اصولی رہنمائی دے دی گئی ہے۔ اس طرح ان کا بھی بیان ہو گیا ہے۔ مفسرین نے "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" اور "تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" کا عام طور سے یہی مطلب بیان فرمایا ہے۔

لیکن ہمارے زمانے کے بعض لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب اور جمیع ماکان و مایکون کا عالم ثابت کرنے کے لیے یہ عجیب بات کہنی شروع کی ہے کہ دنیا میں جو کچھ

ہو رہا ہے جو ہو چکا اور جو قیامت تک ہوگا خواہ اس کا تعلق کسی لائن سے ہو، قرآن مجید میں اس سب کا تفصیلی بیان ہے اور "تبیاناً لکل شیئٍ" اور "تفصیلاً لکل شیئٍ" کا یہی مطلب ہے۔ یعنی قرآن حکیم میں دنیا بھر کی مکھیوں اور مچھروں کا بھی بیان ہے، سمندر کی لاتعداد مچھلیوں اور ان کے انڈوں تک کا بیان ہے۔ ہمارے گھروں میں جو چوہے اور چارپائیوں میں جو کھٹمل ہیں اُن کا بھی بیان ہے، زمین کے سارے کیڑے مکوڑوں کا بھی بیان ہے، دُنیا بھر کے ہزاروں مختلف زبانوں کے اخباروں رسالوں میں جو کچھ روز چھپتا رہتا ہے، جو خرافاتی تصویریں اور کارٹون چھپتے رہتے ہیں اور دنیا بھر کے بازاروں، تماشوں اور تفریح گاہوں میں جو کچھ ہوتا ہے، قرآن پاک میں معاذ اللہ اس سب کا بھی کھلا بیان ہے (لاحول ولا قوۃ الا باللہ)۔ حیرت ہے کہ یہ لوگ ایسی بات کس طرح منہ سے نکالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی عقل سلیم رکھنے والا اس کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ قرآن میں اس ساری خرافات کا بھی بیان ہے قرآن پاک کے "تبیاناً لکل شیئٍ" اور "تفصیلاً لکل شیئٍ" ہونے کا مطلب یہی ہے کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے اور دنیا و آخرت میں ان کی صلاح و فلاح کے لیے جن باتوں کا بیان ضروری تھا وہ سب قرآن مجید میں واضح طور پر بیان کر دی گئی ہیں، اب قیامت تک انسانوں کو کسی نئے ہدایت نامہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ بس یہی قرآن اُن کے لیے کافی ہے۔

اس کے آگے متصلاً یہ آیت ہے "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاۤئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۤءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝" ——— یہ آیت قرآن پاک کے "تبیاناً لکل شیئٍ" ہونے کی حقیقت اور نوعیت کو پوری طرح واضح کر دیتی ہے اور اس کی ہدایت کی جامعیت کا بہترین نمونہ ہے ——— اس میں تین باتوں کا حکم فرمایا گیا ہے عدل، احسان، ایتاء ذی القربیٰ ———

عدل کا مطلب یہ ہے کہ آدمی عقائد و خیالات، اعمال اور اخلاق، جذبات اور معاملات میں اعتدال اور توازن کو اپنائے، افراط اور تفریط اور ہر قسم کی بے اعتدالی سے بچتا رہے، دشمنوں کے ساتھ بھی بے انصافی نہ کرے۔

اور احسان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پر نگاہ رکھتے ہوئے نیک کرداری اور بھلائی کو اختیار کرے اور عدل و انصاف کے مقام سے بھی بلند ہو کر دوسروں کے ساتھ تبرع اور ترحم اور حسن سلوک کا معاملہ

کرے، برائی کا بدلہ بھی بھلائی سے دے ـــــ عدل اور احسان ان دو باتوں کا حکم تو اپنوں پرایوں سب کے لیے دیا گیا ہے، تیسرا حکم "ایتاء ذی القربیٰ" کا خاص اہلِ قرابت اور رشتہ داروں سے متعلق ہے کہ اُن کے ساتھ عدل و احسان کے مقام سے بھی آگے بڑھ کر داد و دہش کا معاملہ کیا جائے، یعنی اللہ نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں سے اپنے عزیزوں قریبوں کو ضرور دو اور اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں میں ان کا بھی حصہ لگاؤ اور اُن کو شریک کرو۔

واقعہ یہ ہے کہ آدمی کا ہر وقت کا معاملہ عزیزوں قریبوں ہی سے رہتا ہے انہی سے معاملات زیادہ پڑتے ہیں اور انہی کے ساتھ نزاعات اور اختلافات ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے زندگی کبھی کبھی جہنم بن جاتی ہے، اس لیے قرآن پاک کی اس آیت میں اور اس کے علاوہ بھی بیسیوں آیتوں میں ذوی القربیٰ یعنی قریبی عزیزوں رشتہ داروں کو اپنی محنت کی کمائی میں سے تحفے تحائف دینے اور حسنِ سلوک کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

غور فرمایئے اگر قرآن پاک کی ان تین ہدایتوں پر عمل نصیب ہو جائے، عدل، احسان، ایتاء ذی القربیٰ، تو ہماری زندگی کیسی چین سکون کی زندگی ہو اور دنیا ہمیں کس نگاہ سے دیکھے، اور دشمن بھی ہمارے کیسے گرویدہ ہو جائیں۔ اور یہ دنیا ہمارے لیے کیسی جنت بن جائے۔

اس آیت میں ان تین باتوں کا حکم دینے کے بعد تین ہی باتوں سے منع فرمایا گیا ہے ـــــ ارشاد فرمایا گیا ہے "وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ" یعنی اللہ تعالیٰ تم کو منع کرتا ہے ان تین چیزوں کے پاس جانے سے، فحشاء سے منکر سے اور بغی سے۔

فحشاء سے وہ گناہ مراد ہیں جو شہوت نفس کے تقاضے سے ہوں جیسے زنا وغیرہ، اور منکر سے مراد وہ گناہ ہیں جن کو عقل سلیم اور شریف طبیعتیں برا سمجھتی ہیں، انکی مثال جھوٹ، خیانت اور بد عہدی اور شراب وغیرہ سے دی جا سکتی ہے ـــــ اور بغی سے ہر قسم کی ظلم و زیادتی مراد ہے خواہ کسی شکل میں ہو، غور کیا جائے تو آسانی سے سمجھ میں آجائے گا کہ ساری برائیاں اور ساری شرارتیں اور سارے گناہ ان تین عنوانوں کے تحت آجاتے ہیں ـــــ اس طرح قرآن کریم کی یہ آیت اوامر و نواہی کے سلسلہ کی جامع ترین آیت ہے ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ اس آیت میں ہر قسم کے خیر و شر کے

بارے میں جامع ہدایت فرمادی گئی ہے ۔۔۔ اس آیت کی اسی خصوصیت کی وجہ سے خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اس کو خطبۂ جمعہ کا مستقل جزو بنا دیا تھا اور اُس وقت سے برابر یہی دستور ہو گیا ہے کہ جمعہ کا خطبہ اسی آیت پر ختم کیا جاتا ہے ۔ اور ہر جمعہ کو یہ خداوندی پیغام مسلمانوں کو سنایا جاتا ہے ۔ کاش ہم اس سے نصیحت حاصل کریں۔

الغرض یہ آیت قرآن مجید کے "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" ہونے کا بہترین نمونہ ہے اور اس سے صاف اشارہ ملتا ہے کہ قرآنِ پاک کے "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" ہونے کا مطلب یہی ہے کہ انسانوں کی ہدایت و سعادت اور صلاح و فلاح سے متعلق تمام ضروری باتیں اس میں بیان فرمادی گئی ہیں۔ ۔۔ اور ہمارا ایمان ہے کہ ایسا ہی ہے ۔

اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کو توفیق دے کہ اللہ تعالیٰ کی اس مقدس کتاب کی قدر کریں، اس کی عظمت کو سمجھیں اور اس کو اپنی زندگی کا راہنما بنائیں اس کے احکام اوامر و نواہی کی تابعداری کریں۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ ٥

خدا کی ہستی پر عقل اور فطرت کی شہادت

(پروفیسر یوسف سلیم چشتی)

قرآن شریف میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات اور خود حضرت انسان کے اندر ایسی نشانیاں رکھی ہیں جو اس ذات یکتا کی ہستی پر گواہی دیتی ہیں۔

چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

(۱) سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ۔	ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی، اور خود ان کی اپنی ہستی میں بھی۔
(۲) وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ	اور ہم نے خود تمھارے اندر نشانیاں رکھی ہیں پس کیا تم غور نہیں کروگے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی دلیل خواہ خطابی ہو یا برہانی[1] ہمارے اندر حق الیقین یا ایمان کامل نہیں پیدا کرسکتی۔ کیونکہ دلائل کا تعلق عقل وحواس سے ہے اور اللہ تعالیٰ ان دونوں کی دسترس سے بالاتر ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ کائنات اور اپنے آپ میں غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر ضرور پہونچ سکتے ہیں کہ

---

[1] خطابی دلیل وہ ہوتی ہے جس میں انسان کی توجہ خود اس کی ذات، کائنات اور مظاہر قدرت کی طرف مبذول کی جائے یعنی جو دل سے اپیل کرے۔ برہانی دلیل وہ ہوتی ہے جس میں منطقی طور پر صغریٰ کبریٰ مرتب کر کے نتیجہ نکالا گیا ہو یعنی وہ دلیل جو دماغ سے اپیل کرے۔ مناطقہ کے برخلاف قرآن پاک علت اور معلول، حادث اور قدیم کی بحث میں نہیں پڑتا کیونکہ یہ باتیں سب محل نظر ہیں۔ قرآن تو ایسی دلیلیں پیش کرتا ہے جو سننے والے کے دل میں اتر جاتی ہیں اور عالم اور عامی دونوں کو تسلی عطا کرتی ہیں ۱۲۔

ایک مدبر اور حکیم، قادر مطلق اور عالم الغیب ہستی ضرور ہے جو اس کائنات کو چلا رہی ہے، چنانچہ (اکبر) فرماتے ہیں:۔ "نظام عالم بتا رہا ہے کہ ہے اک اس کا بنانے والا"

عقل کی حد یہاں ختم ہوجاتی ہے۔ اب اگر کسی کو ایمان و ایقان کی آرزو ہو تو اس کے پیدا کرنے کی صورت دوسری ہے۔ ایمان اور ایقان، خلفائے راشدین، صحابۂ کبار، اولیاء اور صوفیائے کرام کا سا ایمان) منطقی بحثوں، فلسفیانہ بحثوں، کلامیہ نکتہ سنجیوں، دار المطالعوں، بحث مباحثہ، سکولوں کالجوں، لیباٹریوں، لیکچروں اور کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ قلب کی صفائی سے حاصل ہوتا ہے، اور تصفیہ قلب اور تزکیۂ باطن اتباعِ رسول سے پیدا ہوتا ہے۔

اگر کوئی مرشدِ کامل مل جائے تب تو کیا کہنا، ع طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے۔ لیکن اگر یہ کبریتِ احمر نہ ملے تو ملول ہونے کی ضرورت نہیں قال الرسول صلعم ترکت فیکم الثقلین کتاب اللہ و سنتی، پس مسلم اگر مومنِ حقیقی بننا چاہے تو سرکارِ مدینہ کا دامن مضبوطی سے پکڑے اور قرآن حکیم کا مطالعہ کرے۔ انشاء اللہ منزلِ مقصود کو پہونچ جائے گا۔

بایں ہمہ ایک مبلغ اسلام کو ان دلائل سے بھی واقف رہنا چاہیے تاکہ وہ غیر مسلم پر اتمام حجت کر سکے، اس لیے ذیل میں ہم چند دلائل لکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو ہم سے قریب الفہم بنانے کے لیے مہیا فرما دیے ہیں۔

(۱) زمین کے موجودات تین قسموں میں منقسم ہیں۔ ایک وہ جو زندگی رکھتے ہیں اور حرکتِ ارادی کے بھی مالک ہیں۔ مثلاً انسان، شیر، مچھلی، چڑیا وغیرہ۔ اس قسم کو حیوان کہتے ہیں۔ دوسری قسم میں وہ مخلوقات ہیں جو زندہ تو ہیں لیکن حرکتِ ارادی سے محروم ہیں، مثلاً درخت۔ تیسری قسم وہ ہے جو نہ زندہ ہے اور نہ متحرک، مثلاً پتھر۔

ظاہر ہے کہ یہ تینوں قسمیں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں اور یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ پتھر کا ٹکڑا ترقی کر کے گلاب کا پودا بن جائے، اور گلاب ترقی کر کے انسان ہوجائے۔ لیکن کس قدر حیرت انگیز امر ہے کہ اس ظاہری اور باطنی اختلاف اور تفریق کے باوجود، جب ان تینوں (حیوان، نباتات، جماد) کی کیمیاوی تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی بنیاد ایک ہی ہے یعنی یہ سب کے سب پیدا ہوئے ہیں اُن مواد جامدہ سے جو نہ جان رکھتے ہیں اور نہ حرکتِ ارادی پر قادر ہیں، جن کا نام علمی دنیا میں عناصر

(ELEMENTS) ہے۔

آپ گیہوں کا دانہ زمین میں بوتے ہیں اور یہ دانہ مٹی پانی اور ہوا سے بعض عناصر جذب کر کے رفتہ رفتہ درخت کی شکل اختیار کرتا ہے جس سے وہی گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ آپ لیموں کا تخم بوتے ہیں اور لیموں ہی حاصل کر لیتے ہیں۔ مرغی کے انڈے کو مدت معینہ تک گرمی پہونچا کر مرغی ہی کا بچہ حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح مرغابی کے انڈے سے مرغابی نکلتی ہے۔ تماشہ یہ ہے کہ ان سب کی ترکیب انہی عناصر سے ہوئی ہے جو بے جان ہیں۔ جن میں کوئی حرکت ارادی نہیں۔ لیکن کیا مجال کہ گیہوں کے تخم سے نارنگی، اور طاؤس کے انڈے سے سانپ پیدا ہو سکے؛ عناصر بے جان ہیں، لا یعقل ہیں، یعنی غیر ذی شعور ہیں، جامد ہیں، لیکن ہم کائنات میں ہر جگہ یہ اصول پاتے ہیں کہ "LIKE BREEDS LIKE" یعنی گندم از گندم بروید جو ز جو۔ از مکافات عمل غافل مشو، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی چیز دوسری چیز سے ملتی جلتی نہیں۔ ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است، پس سوال یہ ہے کہ جب بنیاد سب کی ایک ہے تو یہ تفریق کیسی؟ اور موجودات کی مختلف صورتوں میں یہ نیرنگی اور بوقلمونی کہاں سے آئی؟

اہل علم اس راز کے دریافت کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ رکھتے ہیں اور وہ یہ کہ مختلف زندہ اجسام کو تحلیل کر کے دیکھیں کہ حیوانات و نباتات و جمادات کے اجزائے حیات میں کیا فرق ہے لیکن جب انھوں نے ایسا کیا تو انھیں معلوم ہوا اور بہرحال وہ اسی نتیجہ پر پہونچے کہ تمام موجودات خواہ وہ جاندار ہوں یا بے جان، چند عناصر بسیط سے مرکب ہیں جو خود بے جان ہیں اور لا یعقل ہیں۔

انھوں نے خیال کیا کہ شاید ان کو علیحدہ علیحدہ کرنے سے یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہو لاؤ ان کو پھر ملا کر دیکھیں، لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ جدا ہو جانے کے بعد وہ عناصر دوبارہ مل نہیں سکتے اور اگر کسی طرح ان کو ملا بھی دیں تو آثار حیات پیدا نہیں ہوتے۔

ایک بلبل ہمارے سامنے چہک رہا ہے، طرح طرح کے نغمے اس کی منقار سے پیدا ہو رہے ہیں۔ پاس ہی ایک گلاب کا درخت ہے جس کے پھولوں سے ہمارا دماغ معطر ہو رہا ہے۔ وہیں پتھر کا ایک وزنی ٹکڑا پڑا ہے جسے ہم ہلا نہیں سکتے۔ جب ہم بلبل کو ہلاک کر کے اس کی ترکیب حیات معلوم کرتے ہیں، گلاب کا پھول توڑ کر اس کے عناصر دریافت کرتے ہیں، پتھر کو ریزہ ریزہ کر کے اس کے اجزاء کی تحلیل کرتے ہیں تو ان تینوں کے اجزا بالکل جامد ہیں، بے جان ہیں، غیر ذی شعور ہیں، نہ آواز ہے نہ نغمہ نہ رنگ ہے

نہ بو، نہ ثقل ہے نہ وزن، اور ہماری سمجھ میں مطلق نہیں آتا کہ وہ کیا چیز تھی جو بلبل کے حقیر جثہ میں دنیائے نغمہ، پھول کی نازک شکل میں ہنگامۂ نکہت، اور پتھر کے سکون میں وزن اعصاب شکن کی کیفیت رکھتی تھی۔

جب تحقیق و تفتیش کی یہ صورت سائنسدانوں کو کسی نتیجہ پر نہ پہونچا سکی، تو انھوں نے جستجو کی اور ایک راہ اختیار کی یعنی خوردبین ایجاد کی، اس کے ذریعہ سے جب انھوں نے زندگی کے راز کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ زندہ اجسام میں بہت چھوٹے چھوٹے جراثیم (CELLS) پائے جاتے ہیں جو شفاف، بے رنگ اور لیس دار ہیں۔ مختلف شکل کے ہیں اور حیوانات کے اندر ہر وقت حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ان کا مشغلہ یہ ہے کہ آس پاس سے موادِ جامدہ بطور غذا حاصل کرتے ہیں اور کسی ایسے مخفی طریقے سے جس کا علم انسان کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوا، اس مواد کو زندگی بخشتے ہیں اور پھر اعصاب، شرائین اور عضلات کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ نظام اس قدر مکمل اور باقاعدہ ہے کہ جو جراثیم ہڈیاں بنانے کے لیے متعین ہیں وہ ہڈی ہی بناتے ہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ پھول کی پتی بنا دیں۔

ظاہر ہے کہ ان جراثیم کو حصولِ غذا کے لیے ایک ہی قسم کا ماحول نہیں ملتا۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود نتیجہ یکساں ہوتا ہے یعنی پھل کی جگہ پھل اگتا ہے اور کونپل کی جگہ کونپل نکلتی ہے، اور یہ جراثیم تمام اجسام میں اس قدر کثرت کے ساتھ پھیل کر جزو ہستی ہو جاتے ہیں کہ جسم کا کوئی حصہ بھی ان سے خالی نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ تمام جراثیم چند ابتدائی جراثیم سے پیدا ہوئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سب سے پہلا زندہ جرثومہ جو باقی جراثیم کی آفرینش کا باعث ہوا کیا ہے؟ اور اس میں حیات کہاں سے آئی؟ اور اس سے مختلف الکیفیات جراثیم کیسے پیدا ہو گئے؟

یہ سوال ایسا ہے جس کا جواب آج تک کسی بڑے سے بڑے عالم، حکیم، فلسفی یا سائنسداں سے نہیں ہو سکا اور یہی وہ معجزہ ہے جو انسان کو کسی برتر قوت کے تسلیم کرنے کی طرف مائل کرتا ہے۔

دوسری مثال پر غور کیجیے:

آپ کسی کارخانہ میں جائیں تو دیکھیں گے کہ بڑے بڑے پہیے ہر وقت گردش میں ہیں۔ بہت سے

آلات ادھر اُدھر تیزی سے حرکت کر رہے ہیں۔ اور مشین کے تمام پُرزے منظم طریق پر اپنا اپنا کام کر رہے ہیں۔ یہ دیکھنے کے بعد کیا ایک لمحہ کے لیے بھی، کسی کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ یہ تمام حرکت، جنبش نظم و عمل خود بخود ہو رہا ہے، یقیناً عقلِ انسانی اس کا سبب دریافت کرے گی اور جب اس کو معلوم ہوگا کہ یہ سب اس بھاپ کی قوت سے ہو رہا ہے جو کوئلہ اور پانی کی مدد سے پیدا کی جاتی ہے تو وہ مطمئن ہو جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ جب ایک معمولی مشین کا وجود اور اُس کی حرکت بغیر کسی موجد اور محرک کے نہیں ہو سکتی تو قدرت کے یہ بے شمار مظاہر و آثار اور موجودات کی کروڑوں صورتیں کس طرح از خود ظہور میں آسکتی ہیں؟

آپ ان چھوٹے چھوٹے جاندار کیڑوں کو لیجیے جن کو نگاہ نہیں دیکھ سکتی۔ یہ اسی طریق پر پیدا ہوتے ہیں جس پر حیوانات اور ذی حیات مخلوق پیدا ہوتی ہے، بڑھتی ہے اور فنا ہو جاتی ہے۔ علم انسانی نہ آج تک ان کی حقیقتِ آفرینش کو دریافت کر سکا اور نہ ان چھوٹے کیڑوں میں سے کسی کی ٹانگ تک بنا سکا۔

انسان ہوا میں اُڑ سکتا ہے، برق و کہربا کی مدد سے دُنیا پر حکمرانی کر رہا ہے، تمام جمادات، نباتات اور حیوانات کو مسخر کر چکا ہے، ایجادات اور اختراعات کی وجہ سے اُس نے دُنیا کا نقشہ ہی بدل دیا ہے مگر آپ دُنیا جہان کے ماہرین کیمیا، حیاتیات، طبیعات کو جمع کر کے دریافت کیجیے کیا وہ مچھر کی ٹانگ بنا سکتے ہیں؟

انسان کا یہی اعترافِ عجز، یہی حیرانی، یہی بیچارگی، ہمیں کسی فوق البشر ہستی کے وجود کا پتہ دیتی ہے اور غور کرنے کے بعد ایک عقلمند آدمی امام رازی کی ہمزبانی پر مجبور ہو جاتا ہے کہ خدا کو پہچاننے کے لیے نہ کسی دلیل کی ضرورت ہے نہ برہان کی، کیونکہ کائنات کے ایک ایک ذرہ کی تکوین خدا کی ہستی پر گواہ ہے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ تمام زندہ اجسام، شفاف اور لیس دار جراثیم سے بنے ہیں اور ان جراثیم کی بنیادی ترکیب پر غور کیجیے۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہ جراثیم چار عناصر بسیط کے مرکب ہیں آکسیجن، ہائیڈروجن، نائٹروجن اور کاربن۔ کاربن ایک زہریلی گیس ہے، آکسیجن اجسام کو مشتعل کرنے والی گیس ہے، ہائیڈروجن اور نائٹروجن

بھی شفاف گیس ہیں جو آکسیجن سے ہلکی ہوتی ہیں۔ یہ عناصر باہم ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن ان کے امتزاج سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ اسکول کے طلبہ کو بھی معلوم ہیں۔ یعنی جب آکسیجن اور ہائیڈروجن دونوں ملتے ہیں تو پانی بن جاتا ہے۔ نائٹروجن اور آکسیجن کے ملانے سے تیزاب پیدا ہو جاتا ہے۔ آکسیجن اور کاربن جب ملیں گے تو زہریلی گیس بن جائے گی۔ اگر چاروں کو ملا دیں تو انہی اشکال میں سے کوئی شکل پیدا ہوگی جو یقیناً حیات انسانی کے لیے مفید نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو ان متضاد عناصر کو مخلوط کر کے جراثیم پیدا کر دیتی ہے، جن میں زندگی ہوتی ہے اور زندگی کہاں سے آجاتی ہے؟ اگر ترکیب کا نتیجہ ہے تو ہمارے ترکیب دینے سے کیوں نہیں ظاہر ہوتی؟ اور ان جراثیم میں یہ اہلیت اور صلاحیت کہاں سے آجاتی ہے کہ مرغی بنانے والے جراثیم کبھی بلی نہیں بناتے؟ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ طائر بنانے والے جراثیم انسان بنانے لگیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ان غیر ذی عقل عناصر میں یہ لیاقت کہاں سے آگئی کہ کائنات میں عقل (خیر) حسن اور صداقت ہر جگہ جلوہ گر کر دیں؟ کیا ان عناصر میں (TRUTH, BEUTY AND GOODNESS) کہیں پائی جاتی ہے، تو جو چیز اجزاء میں نہیں وہ مرکب میں کہاں سے آگئی؟ اور یہ نظم و نسق کس طرح پیدا ہو گیا؟

اگر یہ نظم و اہتمام جسے ہم مسلمان، مشیت ایزدی کہتے ہیں نہ ہو تو آکسیجن ہمارے اجسام کو جلا کر خاک سیاہ کر دے۔ اور ہائیڈروجن تمام دنیا کو پانی کی شکل میں تبدیل کر دے۔ اور نائٹروجن ہر جگہ تیزاب کا کام کرے اور کاربن حیات کا نام دنیا سے مٹا دے۔ کاشتکار گیہوں بوئے اور کھیتوں میں مینڈک پیدا ہوں۔ مرغی کو انڈوں پر بٹھائیں تو انڈوں میں سے سانپ بچھو نکل پڑیں۔ الغرض نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ خدا کو منطقی طور پر ثابت کرو، اس کا جواب یہ ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں امر کو ثابت کرو، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے ان مسلمات کے مطابق کر کے دکھاؤ جو ہمیں پہلے سے مسلم ہیں، جن کی صحت و صداقت کے متعلق ہمیں شک نہیں ہے، یعنی اس امر کو ہمارے معتقدات کے مطابق دکھاؤ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اعتقاد ثبوت سے بالاتر ہے۔ ۱۲

ہر ثبوت کی بنیاد کسی نہ کسی اعتقاد پر ہے اس لیے اعتقاد کا درجہ ثبوت سے بلند تر ہے۔ کسی بات کو ثابت کرنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اسے کسی ایسی دوسری بات کے مطابق کر دیا جائے جسے ہم پہلے سے درست مانتے ہیں۔

اب اگر اس چیز کا ثبوت مانگا جائے کہ ہم اسے کیوں درست تسلیم کرتے ہیں تو وہ کسی دوسری مسلمہ شئے کے مطابق ہوگی، اسی طرح بڑھتے چلیں تو آخر کار ہم ایسے اصولوں پر پہونچ جائیں گے جن کا ثبوت خود اپنے اندر رکھتے ہیں اور انھیں علوم متعارفہ کہتے ہیں (AXIOMATIC TRUTHS)

لیکن ایک متشکک (دہریہ) سوال کر سکتا ہے کہ ان آخری اصولوں کے شک و شبہ سے بالاتر ہونے کی کیا دلیل ہے؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ اگرچہ ہم منطقی طور پر ثابت نہیں کر سکتے لیکن محسوس کرتے ہیں کہ وہ صحیح ہیں، ہمیں ان کے غلط ہونے کا خیال ہی نہیں آتا۔ یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے جو بہت غور طلب ہے۔

(۲) کسی بات کا ثابت نہ ہو سکنا اس کے غلط ہونے کی دلیل نہیں ہے کیونکہ منطق اور عقل دونوں محسوسات ہی میں کار آمد ہو سکتی ہیں۔ بعض حقائق منطق سے بالاتر ہوتے ہیں۔ مثلاً عام طور سے یہ بات مسلم ہے کہ اگر جینا چاہتے ہو تو موت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔ لیکن ہیگل لکھتا ہے "اگر تم جینا چاہتے ہو تو مرنا سیکھو!" عام منطقی اصولوں سے یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی لیکن اس کے صحیح ہونے میں مجھے کسی قسم کا شک نہیں ہے۔

(۳) ایک منکر جب خدا کی ہستی کا ثبوت طلب کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے پہلے سے یہ فرض کر لیا ہے کہ دنیا میں یا اس کے پاس بعض اصول ایسے ہیں جن کو وہ بنیادی اصول سمجھتا ہے اور ان کی صحت و صداقت میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے۔ ہم سوال کرتے ہیں کہ تمھارے پاس یہ ماننے کی کیا وجہ ہے کہ تمھارے اصول "خدا کی ہستی" سے بھی زیادہ لائق اعتماد اور قابل یقین ہیں؟

وہ کہے گا کہ میری عقل کی ہدایت ہے، اس کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عقل کی تعلیم ہمیشہ صحیح نہیں ہوتی اور عقل انسانی محدود ہے۔ رہے حواس وہ بھی بعض اوقات دھوکہ دے جاتے ہیں پس یہ معیار لائق اعتماد نہیں ہے، علاوہ بریں حواس اور عقل تو عالم محسوسات میں چلتے ہیں۔ اور اس عالم کے علاوہ بھی ایک عالم ہے جو حواس کی دسترس سے بالاتر ہے۔ لاکھوں انسانوں کی گواہی ہمارے پاس

موجود ہے کہ ایک ایسا عالم ہے وراء العقل ہستی کو عقل سے معلوم کرنے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسے ناک سے دیکھنے اور کان سے سونگھنے کی کوشش کرنا۔

(۴) ملحد جب ہم سے خدا کی ہستی کا ثبوت چاہتا ہے تو وہ یہ پہلے فرض کر لیتا ہے کہ ثابت کرنے اور دلیل دینے والی طاقت اس قابل ہے کہ خدا کو جان سکے۔ لیکن ہم اس سے یہ سوال کرتے ہیں کہ تمہارے پاس اس اعتماد کا کیا ثبوت ہے؛ ممکن ہے کہ تمہارا خیال غلط ہو۔

دنیا کے اکابر فلاسفہ اس امر میں متفق ہیں کہ انسان کا شعور عقلی (INTELLECTUAL - CONSCIOUSNESS) مظاہر فطرت کی تحقیق اور اُن کے مابین ربط قائم کرنے سے آگے نہیں بڑھ سکتا یعنی انسان کی عقل کی پرواز مادیات کی حدود سے متجاوز نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے کانٹ نے لکھا ہے کہ لفظ ثبوت کے عام معنوں کے لحاظ سے خدا کی ہستی ثابت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ خدا عقل و ادراک کی رسائی سے پرے اور بہت پرے ہے۔ کانٹ کے علاوہ ہیگل کا عقیدہ بھی یہی ہے لیکن کانٹ اور ہیگل دونوں خدا پرست ہیں۔

اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہاری آواز کو دیکھ نہیں سکتا یا تمہاری رنگت کو سُن نہیں سکتا تو میں تمہاری رنگت کی ہستی سے انکار تو نہیں کرتا۔

(۵) جس دلیل نے مجھے ہمیشہ تسلی دی ہے وہ یہ ہے۔

(i) اس کائنات میں ہر جانب اور ہر جا نظم و تنظیم نظر آتے ہیں۔

(ii) نظم مستلزم ہے کسی ناظم کے وجود کو۔

(iii) لہٰذا کائنات کا لازماً کوئی ناظم ہے اور وہ باشعور بھی ہے اور باحکمت بھی۔

اگر کائنات میں قانون کی حکومت نہ ہوتی تو آسمان و زمین اور اجرام سماوی کے متعلق جو پیشگوئیاں کی جاتی ہیں وہ کبھی صحیح نہ ہوتیں۔ لیکن ہم رات دن مشاہدہ کرتے ہیں کہ منجم کسوف و خسوف کے متعلق پیشگوئی کرتے ہیں اور وہ صحیح ہوتی ہے۔ نظم و نسق اور قوانین، یقیناً ایک منتظم اور مقنن پر دلیل ہے۔

(۶) ایک اور دلیل جو تسلی بخش ہے یہ ہے کہ نظام حیاتی اور خارجی کائنات میں ایک زبردست مطابقت پائی جاتی ہے۔ ایک دُنیا انسان کے اندر ہے (اسی لیے اسے عالم صغیر کہتے ہیں) اور ایک دنیا انسان کے باہر ہے۔ ان دونوں دنیاؤں میں مطابقت پائی جاتی ہے بیرونی دنیا کا نظام ایسا ہے کہ یہاں

تنازع للبقا کا "راج" ہے، اور اگر کوئی شخص اپنی حفاظت نہ کرے تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔ اسکے بالمقابل ہمارے اندر اپنے جسم و جان کو محفوظ رکھنے کی زبردست خواہش پائی جاتی ہے کیونکہ دنیا کا نظام ہی اس قسم کا ہو کہ جب تک ہم اپنے آپ کو بچایا نہ کریں اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے کوشش نہ کریں، اس وقت تک ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ مطابقت اس امر پر دال ہے کہ کائنات کا انتظام، غیر ذی شعور اور غیر مدرک "سالمات" کے ہاتھ میں نہیں، بلکہ ایک ذی شعور اور مدرک ہستی اس کائنات کے پس پردہ کار فرما ہے۔

ہربرٹ اسپنسر (۱۸۲۰-۱۹۰۳) اس مطابقت سے بہت متاثر ہوا ہے، وہ لکھتا ہے کہ اندرونی اور بیرونی دنیا میں جو اصول کام کر رہا ہے وہ ایک ہی ہے۔ اور قادر مطلق ہے، غیر محدود، لامتناہی اور ازلی ہے۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جان سکتے کہ ایک اصول علی الاطلاق یا فوق الکائنات طاقت ہے جو قادر مطلق اور غیر ممکن الفہم ہے۔

بہر حال ایک ازلی، مطلق اور مدبر طاقت کے وجود کا اسپنسر کو بھی اعتراف کرنا پڑا۔

(۷) مسئلہ ارتقار بھی خدا کی ہستی پر گواہ ہے۔ کائنات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز کا ایک مصرف اور ہمارے جس قدر حواس ہیں اُن کے لیے میدان عمل موجود ہے۔ یہ نہیں کہ خوشبو ہو اور سونگھنے کا آلہ نہ ہو یا ناک ہو اور بو نہ ہو۔ تو جب جسمانیات میں یہ باطنی اور خارجی مطابقت پائی جاتی ہے تو خیالات (روحانیات) میں بھی یہی اصول ہونا چاہیے۔ اگر کوئی خیال انسانی دماغ میں مضبوطی کے ساتھ جما ہوا ہے تو گمان غالب یہی ہے کہ اس خیال کا جواب یعنی امر واقعی خارج میں موجود ہے۔

اب خدا کے خیال کی وسعت اور ہمہ گیری اور عالمگیریت تو روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔ اگر خدا کی ہستی کا یقین اس قدر عام ہے (کما مرّ) اور لاکھوں برس سے انسانی روح میں جلوہ گر چلا آتا ہے تو ماننا پڑتا ہے کہ اس "یقین" کا خارج از ذہن انسانی، جواب بھی موجود ہے۔ TISKE جو مسئلہ ارتقار کے زبردست حامیوں میں سے ہے، اس دلیل کو بہت وزنی خیال کرتا ہے۔

(۸) حُسن و جمال جو اس کائنات میں پایا جاتا ہے وہ بھی خدا کی ہستی پر دلالت کرتا ہے۔ قطع نظر اس امر سے کہ اگر ایک طرف ہمارے اندر حُسن سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ہے تو دوسری طرف کائنات میں، اس کے ہر ذرہ میں حُسن موجود ہے۔ خود ہمارے اندر حُسن و جمال سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت یہ بتاتی ہے کہ کوئی حسین و جمیل قادر مطلق ہستی اس کائنات پر حکمراں ہے جس نے انسان کی زندگی کو اعلیٰ بنانے کے لیے اور جذبات عالیہ کی پرورش کے لیے کائنات کے ذرہ ذرہ میں حُسن بھر دیا ہے، بے شعور مادے کو حُسن و جمال سے کیا علاقہ؟ آواز تو ہے ہی مگر اس میں سُریلا پن

بھی ہے جو ہمارے دل کو موہ لیتا ہے۔
اسی لیے بعض صوفیا نے کہا ہے" اللہ جمیل ویحب الجمال"۔
(۹) محبت بھی، جس کی بہترین مظہر" ماں" ہو، ہماری توجہ اس طرف مبذول کرتی ہے کہ کائنات کی علّت کوئی محبت کرنے والی ہستی ہے۔ مادہ بے شعور اور جامد ہے اس میں محبت کی صلاحیت نہ تھی اور نہ ہے۔
(۱۰) ضمیر یا حسِ اخلاقی کی گواہی بھی خدا کی ہستی پر ایک روشن دلیل ہو۔ کانٹ کے نزدیک تو— "THE STARRY HEAVENS WITHOUT AND THE MORAL LAW WITHIN"
یہ دو چیزیں خدا کی ہستی پر زبردست گواہ ہیں اور قرآن مجید نے ان دونوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ چھوٹی سی مشین کے لیے ایک سمجھدار انسان کی ضرورت ہوتی ہو تو اس قدر وسیع کائنات کا انتظام آپ ہی آپ کیسے ہو رہا ہے؟
پھر انسان اپنے اندر غور کرے، کیا ایک قوت اس کے اندر ہر لحظہ کار فرما نہیں، جو اسے نیکی کی طرف مائل کرتی ہے، اگر خدا نہیں تو پھر نیکی کا تصور کہاں سے آیا؟ اگر کوئی معیار نہیں تو پھر نیک بننے کی کیا ضرورت ہے؟ اسکے جواب میں کہا جائے گا کہ نیکی سے دنیا میں امن قائم ہوگا۔ میں کہتا ہوں اس سے کیا فائدہ؟ مجھے تو بدامنی میں لطف آتا ہے۔ دہریہ کے پاس میرے اس سوال کا کیا جواب ہے؟
جب خدا نہیں تو ذمہ داری کیسی اور کیوں؟ دہریہ کے نزدیک امن وامان، اچھی عمدہ مفید یا ضروری چیز ہے میرے نزدیک نہیں، مجھے تو بدامنی میں لطف آتا ہے کیونکہ خواہشات کی تکمیل بدامنی میں زیادہ آسانی سے ہوسکتی ہے اور مجھے نیک بننے کی ضرورت نہیں کیونکہ مرنے کے بعد زندگی نہیں، نہ کسی کے سامنے جوابدہی کرنی ہے۔
نیک و بد کا امتیاز صرف اس لیے ہے کہ ہمارے دماغ میں نیک و بد کا معیار موجود ہو اور وہ معیار ہم نے خود پیدا نہیں کیا۔ وہ معیار اگر غور سے دیکھا جائے، تو خدا کی ہستی پر منتج ہوتا ہے۔
اگر خدا نہیں تو پھر نہ صرف یہ کہ زندگی میں کوئی معنی نہیں رہتے، بلکہ نیک و بد، زشت و خوب، حسن و قبح خیر و شر، یہ سب باتیں مہمل اور لایعنی ہیں، پھر نہ کوئی نیکی ہے نہ بدی نہ اچھائی ہے نہ برائی۔
الغرض بقول افلاطون صداقت، حسن اور خیر یہ تینوں حقائق، خدا کی ہستی پر دال ہیں۔۱۲

افاداتِ قاسمیہ

از امام کبیر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی

(۳)

(مرتبہ مولانا سعید احمد پالن پوری دار العلوم اشرفیہ۔ راندیر ضلع سورت)

(۲۰) بتوں پر چڑھائے ہوئے جانوروں کے خریدنے کا حکم

سوال:۔ بتوں پر چڑھائے جانے والے جانور اگر سادھو یا چوری کرنے والے فروخت کردیں تو ان کا مول لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: بعد حمد و صلوٰۃ معروض ہے کہ مسئلے کی کئی صورتیں ہیں:۔

پہلی صورت: اگر کوئی کافر ــــ ہندو ہو یا نصرانی ــــ خدا کے نام کی نذر نکالے اور کسی ہندو یا مسلمان کو دیدے تو اس شے کو حرام نہیں کہہ سکتے (جیسا کہ افادہ نمبر ۱۵ میں بیان ہوا) اس کو (موہوب لہ کو) اختیار ہے (کہ چاہے) خود کھائے یا کسی اور کو کھلائے، غیر کے ہاتھ بیچ دے یا غیر کو ہبہ کردے، پھر وہ غیر آپ رکھے یا کسی کو دے دے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ فعل (یعنی اللہ کے لیے نذر نکالنا) اصل سے (یعنی در حقیقت) حرام نہیں ہے۔ اس لیے جو مال اس راہ سے آیا ہے اسے حرام نہیں کہہ سکتے (جیسا کہ افادہ نمبر ۱۲ میں بیان ہوا) البتہ مسلمان کے حق میں ــــ بشرطیکہ نذر کرنے والا کافر خود اس مسلمان کو دے ــــ لینا کراہت سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ لینے والا خدا کی طرف سے لیتا ہے۔ اور جب خدا کے یہاں

قبول ہی نہیں تو اس مسلمان کا لینا ایسا سمجھئے، جیسے بادشاہ کے سامنے ہدیہ، نذرانہ پیش کیا گیا، اس نے ناراض ہو کر ہدیہ رد کر دیا، اور نذرانہ قبول نہ کیا۔ لیکن خدمتگار شاہی نے بادشاہ کی طرف سے اُسے لے لیا۔ تو جیسے یہ بات بادشاہ کو مکروہ (ناگوار) معلوم ہو گی، ایسے ہی خدائے تعالیٰ کے اِن کا قصہ سمجھئے۔ لیکن جیسے وہ خدمت گار اگر کسی کے ہاتھ بیچ دے یا کسی کو دے دے تو اس لینے پر مشتری یا لینے والا معتوب شاہی نہیں ہوتا۔ ایسے ہی یہاں بھی سمجھ لیجئے۔

دوسری صورت: اور اگر نذر خدا کے نام کی نہیں ہے کسی اور کے نام کی ہے (یعنی وہ نذر کسی سادھو، سنت، بشپ، پادری یا بزرگ کے نام کی ہے) تو جس طرح یہ نذر نکالنا حرام اور شرک ہے ایسے ہی اس مال کو بھی حرام اور ناپاک سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ شرک کو (اللہ پاک نے) ناپاک فرمایا ہے۔ کلام اللہ میں موجود ہے:۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (الحج۔ رکوع ۱۰) (تو تم لوگ گندگی سے یعنی بتوں سے کنارہ کش رہو" ترجمہ تھانوی")

عربی داں جانتے ہیں کہ "رجس" ناپاک کو کہتے ہیں۔ پھر ناپاکی اگر ظاہری ہوتی تو معاملہ سہل بھی تھا۔ شرک سے (تو) دل ناپاک ہو جاتا ہے۔ پھر سات سمندر سے بھی دھویا جائے تو بھی وہ پاک نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب نذر ایسے ناپاک دل سے نکلی ہو تو اس دل کی گندگی اس نذر میں آجائے گی۔

پھر جیسے وہ نور جو سبز، زرد آئینہ میں ہو کر نکلا ہو، وہ کہیں (رنگ) جائے سبزی، زردی اُسکے ساتھ جاتی ہے، یا جیسے اناج، گیہوں، چنے، جَو کے بیج میں سے ہو کر باہر آتا ہے اس لیے گیہوں، جو، چنے کی شکل وخاصیت وغیرہ اس کے ساتھ رہتی ہے، یا جو پھل، آم، جامن، وغیرہ کی گٹھلیوں میں سے ہو کر باہر آتے ہیں، اُن کے ساتھ کہیں تک جاؤ آم کی شکل اور خاصیت ساتھ ساتھ جاتی ہو۔ علیحدہ نہیں ہوتی (جیسا کہ افادہ ۱۴ میں بیان ہوا) ایسے ہی جو مال حرام طریقہ سے آئے گا وہ کہیں تک جائے گا اُس کی حرمت اُس کے ساتھ ساتھ جائے گی۔

اور ایسی ناپاک (حرام غذا) سے جو دل اور بدن پیدا (پرورش) ہو گا اُس سے جو عبادت ہو گی وہ قبول نہ ہو گی۔ کیونکہ اس عبادت میں ناپاکی کا لگاؤ ہو گا۔ اور ظاہر ہے کہ ناپاک کام اس پاک درگاہ میں کیوں قبول ہونے لگے۔ ؟!

اس لیے اگر سادھو وغیرہ لے کر کسی کے ہاتھ بیچ دیں یا کسی کو ہبہ کر دیں تو خریدار اور لینے والے کے حق میں وہ مال حرام ہی رہے گا، حلال نہ ہوگا، جیسے خنزیر کا گوشت — بیچو یا ہبہ کرو — حلال نہیں ہو سکتا۔

تیسری صورت: اگر پوجا کرنے والے اس مال کو کسی کو دیں نہیں۔ یوں ہی چھوڑ دیں اور پھر اس کے بعد کسی کے لینے کے روادار بھی نہ ہوں، بلکہ لینے سے ناخوش ہوں — جیسے اس طرف میں ہندو گائے بیل معبودوں کے نام پر چھوڑ کر مطلق العنان کر دیتے ہیں اور ان کو "سانڈ" کہتے ہیں اور کسی کو اجازت ان کے پکڑ لینے کی نہیں دیتے — تو ایسے جانوروں کو اگر مجاہدین غنیمت میں لے جائیں تو ان کو بلا کراہت اس قسم کے جانوروں کا کھانا جائز ہوگا بلکہ وہ جانور جو پوجا کرنے والے اپنے آپ زنار داروں کو دیتے ہیں اُن کا کھانا بھی درست ہوگا۔

ورنہ (یعنی مجاہدین کے علاوہ کے لیے) بوجہ غصب دُزدی (چوری)، اور بوجہ پوجا و پرستش غیر خدا کراہت رہے گی۔

دُزدی کی وجہ سے جو حرمت ہے وہ تو ظاہر ہے پر یہ بات تامّل طلب ہے کہ پوجا کی وجہ سے کراہت ہے۔ کیونکہ پوجا کی وجہ سے ہوتی تو حرمت ہوتی، کراہت نہ ہوتی۔ اس لیے یہ عرض ہے کہ پوجا کو اس مال کے حصول میں کوئی دخل نہیں، جیسے اور مال چراتے ہیں ایسے ہی یہ مال بھی چرا لیا۔ اس لیے یوں نہیں کہہ سکتے کہ اس مال کا حصول لینے والوں کے حق میں پوجا پر موقوف تھا، ہاں چوری پر یا غصب پر موقوف کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے یوں کہنا ضرور ہے کہ شرک کی ناپاکی اور حرمت تو یہاں مؤثر نہیں ہوئی البتہ چوری اور غصب کی حرمت نے اس مال کو حرام کر دیا۔

بہرحال حرام ہونے میں کچھ شک نہیں بلکہ حرمت سے ایک نمبر زیادہ ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ کسی شخص نے ایک سفر میں ایک ناقہ (اونٹنی) پر لعنت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نے یہ فرمایا کہ ہمارے ساتھ شتر مادہ ملعون نہ رہنے پائے اور یہ فرما کر اس ناقہ کو چھوڑ دیا۔[۱] جب بندوں

---

[۱] عن عمران بن حُصَینٍ، قال: بینما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی بعض اسفارہ، و امرأۃٌ من الانصار علی ناقۃٍ، فَضَجِرَتْ، فلعنتہا، فسمع ذلک رسول اللہ صلی اللہ علیہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

کی لعنت کا یہ اثر ہو کر ساتھ رہنے میں حرج نظر آئے تو لعنت خداوندی میں یہ اثر کیونکر نہ ہوگا؟!

یہی وجہ ہوئی کہ قوم ثمود کے کنوئیں سے پانی پینے کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے اصحاب کو منع فرمایا، اور اس پانی سے گندھے ہوئے آٹے کو نہ کھانے دیا[1] اور سب جانتے ہیں کہ اسی کو لعنت کہتے ہیں کہ رحمت سے دور کر دیجئے، نظرِ عنایت سے علیحدہ کر دیجئے، اور ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا رحمت سے دوری ہوگی (کہ) اپنے آپ تو جدا رہے، اپنے بندوں کو بھی اس طرف دیکھنے نہیں دیا۔

غرض بوجہ لعنت ثمود کے کنوئیں کے پانی کے استعمال سے منع فرمایا اور جب اس پانی کے استعمال سے ممانعت ہے تو اس جانور کے کھانے سے بدرجۂ اولیٰ ممانعت ہوگی جس کو پرستشِ غیر خدا میں مطلق العنان بنا دیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ثمود کے کنوئیں کا پانی بذاتِ خود سامانِ شرک نہ تھا البتہ مشرکوں کے نام لگا ہوا تھا، اس چاہ پر ان کا آنا جانا تھا، اس چاہ سے پانی پی کر اپنی پیاس بجھاتے تھے اس چاہ کے پانی سے آٹا گوندھ گوندھ کر روٹیاں پکاتے تھے اور کھاتے تھے اور پانی اور روٹی کھا پی کر توانا ہو کر شرک و کفر وغیرہ کرتے تھے غرض (اس) شرک سے جو زمانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود تھا ایک دور کا

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) وسلم، فقال: "خُذُوا مَا عَلَيْهَا وَدَعُوهَا، فَإِنَّهَا مَلْعُونَةٌ" قال عمران: فكأني أراها الآن تمشي في الناس ما يعرض لها أحدٌ وفي رواية: فقال النبي صلى الله عليه وسلم "لا تُصَاحِبُنَا نَاقَةٌ عَلَيْهَا لَعْنَةٌ" (رواهما الامام مسلم في صحيحه ۲/۳۲۳) قال النووي: والمراد النهي عن مصاحبته صلى الله عليه وسلم في الطريق وأما بيعها وذبحها وركوبها في غير مصاحبته صلى الله عليه وسلم وغير ذلك من التصرفات، التي كانت جائزةً قبل هذا فهي باقية على الجواز، لأن الشرع انما ورد بالنهي عن المصاحبة، فبقي الباقي كما كان الخ

[1] عن ابن عمر: ان الناس نزلوا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم على الحِجْرِ، أرضِ ثمود، فاستقَوا من آبارها، وعجنوا به العجين، فأمرهم رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يُهَرِيقُوا ما استقَوا ويَعلِفوا الابل العجين (مسلم شریف ۲/۴۱۱)

علاقہ تھا۔ اور جانور مذکور ہے ـــــ جس کو بوجہ پرستش بتاں وغیرہ معبودان باطل ـــــ شرک کو یہ (یعنی ایسا) رابطہ ہے (کہ) اس سے زیادہ (رابطہ) کیا ہوگا؟! یعنی اس جانور ہی پر، وہ اُن کی پرستش موقوف تھی، وہ شرک بے جانور وغیرہ متصور نہیں، جیسے قربانی اہلِ اسلام بے جانور ممکن نہیں۔ اور (جب) اس قدر ارتباط ہے کہ شرک اس پر موقوف ہے تو وہ لعنت، مذکورہ آب چاہ مذکورہ کی لعنت سے کہیں بڑھ کر ہوگی۔ اور اس لیے یہ لعنت اور وہ چوری دونوں مل کر قریب دو علتوں کے ہو جائے گی۔ جس سے حرمت ثابت ہو چکی۔

چوری کی حرمت تو ظاہر ہے۔ اور لعنت کی کراہت، حرمت سے برائے نام ہی کم ہے، کیونکہ ایسی کراہت کو تحریمی کہیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ کراہت تحریمی ہم پلہ حرمت ہوئی، بالجملہ اس قسم کے جانور اور اموال جن کا سوال مذکورہ ذکر میں ہے سب کے سب ناجائز ہیں۔ اہلِ اسلام کو ان کا کھانا روا نہیں۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال فقط مورخہ ششم ماہ صفر ۱۲۹۵ھ

(فیوض قاسمیہ ص ۳۶-۳۸ معمولی تغیر کے ساتھ)

اضافہ از مرتب

دوسری صورت کا حاصل یہ ہے کہ جو بکرا، مرغا، گائے وغیرہ کی نذر سادھو سنت، بزرگ، تھان، نشان اور جھنڈے وغیرہ کے نام کی ہے۔ یعنی وہ نذر اس لیے ہے کہ وہ بزرگ ہم سے خوش ہوں اور ہمارا کام کر دیں، اور ان کو متصرف بالتکوین سمجھے، اور ان سے تقرب کے لیے ذبح کرے۔ اور ذبح سے وہی مقصود ہوں جیسا کہ اس زمانے میں اکثر جہال کا یہی عقیدہ ہوتا ہے تو یہ عقیدہ رکھنے والا مشرک، اور وہ ذبیحہ بالکل حرام ہے، خواہ چڑھانے والا مسلمان ہو یا ہندو اور خواہ بوقت ذبح اللہ کا نام لیا جائے یا غیر اللہ کا۔ یہ جانور۔ مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ اور وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ کا مصداق ہیں۔ لہٰذا ان کا خریدنا حرام ہے۔ البتہ اگر اللہ کے واسطے جانور ذبح کیا جائے اور اللہ ہی کے واسطے صدقہ کر کے اس کا ثواب کسی بزرگ کی روح کو بخشا جائے تو یہ جائز اور حلال ہے۔

(امداد الفتاوی ۲/۵۵۲ و ۵۶۲ مطبوعہ کراچی)

تیسری صورت کا حاصل یہ ہے کہ کسی جانور کو تقرب الی غیر اللہ اور تعظیم غیر اللہ کے لیے چھوڑ دیا جائے، نہ اس سے کام لیں، نہ اس کے ذبح کرنے کا قصد ہو۔ یہ جانور بحیرہ اور سائبہ ہیں اور ما اھل

بہ لغیر اللہ اور وما ذبح علی النصب میں داخل نہیں ہیں اس لیے ان کا حکم یہ ہے کہ یہ فعل (سانڈ بنانا) تو بنص قرآنی حرام ہے لقولہ تعالیٰ: ماجعل اللہ من بحیرۃ ولا سائبۃ الآیۃ۔ لیکن ان جانوروں کی حرمت صرف بوجہ ملک غیر ہونے کے ہے، جب مالک کسی کو ان کے ذبح کرنے اور کھانے کی اجازت دے دے تو وہ حلال ہیں۔

حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ صاحب دہلویؒ سے پوچھا گیا کہ ہنود اپنے دیوتاؤں کے یا مُردوں کے نام پر گائے کو داغ لگا کر یا بلا داغ چھوڑتے ہیں، جس طرح بعض مسلمان شیخ سدو یا پیران پیر وغیرہ کے نام بکرا یا مرغ چھوڑتے ہیں۔ اسی طرح ہنود گائے کو متبرک سمجھ کر چھوڑتے ہیں، اُن کو ذبح کر کے گوشت کھانا جائز ہے یا ناجائز؟ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ کا جواب مندرجہ ذیل ہے:-

الجواب: جو جانور بتوں کے نام پر یا کسی غیر اللہ کے نام چھوڑے جاتے ہیں۔ اور اُن کی جان لینا مقصود نہیں ہوتا بلکہ صرف کام لینے سے آزاد کرنا مقصود ہوتا ہے اور ما اھل بہ لغیر اللہ میں داخل نہیں ہیں اُن کو سائبہ کہتے ہیں اور ان کی حرمت صرف بوجہ ملک غیر ہونے کے ہے کہ وہ مالک کی ملک سے خارج نہیں ہوتے اگر مالک کسی کو ان کے ذبح کرنے اور کھانے کی اجازت دیدے تو وہ حلال ہیں اور ایسی گایوں کی اولاد بھی مالک کی ہوتی ہے۔ پس ان گایوں کو یا ان کی اولاد کو بلا اجازت مالک کے کھانا حلال نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

محمد کفایت اللہ۔ دہلی

الجواب صحیح علی ما قال مولانا کفایت اللہ سلمہ (مولانا) اشرف علی (تھانوی قدس سرہ)

(فتاویٰ دارالعلوم قدیم جلد ۷، ۸ صفحہ ۱۷۰)

الحاصل: سوائب کی حلت کے لیے مالک کی اجازت ضروری ہے۔ اس کے بغیر ان جانوروں کے حلال ہونے کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔ اور چونکہ حضرت الامام النانوتوی رحمۃ اللہ سے یہ پوچھا گیا تھا کہ اس قسم کے جانوروں کو سادھو بیچ دیں یا اور کوئی چوری کر کے فروخت کرے تو ان کا خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ اس صورت میں مالک کی اجازت نہیں پائی گئی اس لیے بوجہ ملک غیر ہونے کے یہ غصب اور دزدی ہوئی۔ پس حضرتؒ نے لکھا کہ نہ ان کا خریدنا جائز ہے نہ مفت لینا جائز ہو۔

نہ ان کو ذبح کر کے کھانا جائز ہے، البتہ مجاورین لے جا سکتے ہیں کیونکہ ملک مالک ان کے حق میں مؤثر نہیں ہے۔

حضرت الامام رحمہ اللہ نے صورتِ دوم وسوم کے درمیان فرق پر بھی بحث فرمائی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ دوسری صورت میں وہ جانور نذر لغیر اللہ کی وجہ سے ہی حاصل ہوا ہے، یعنی ناذر نے نذر ہی کی وجہ سے وہ جانور سادھو یا فقیر کو دیا ہے اگر وہ نذر نہ مانتا تو سادھو اور فقیر کو یہ جانور حاصل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پس پرستش غیر خدا اس جانور کی ذات سے متعلق ہوئی اور چونکہ نذر لغیر اللہ شرک ہے اس لیے اس راہ سے آیا ہوا مال ناپاک ہوگا، پس وہ جانور حرام ہوگا خواہ وہ سادھو یا فقیر کے پاس رہے یا وہ کسی کو بیچ دے یا ہبہ کر دے۔

اور تیسری صورت میں سادھو نے یا چوری کرنے والے نے جو جانور حاصل کیا ہے وہ نذر لغیر اللہ کی وجہ سے حاصل نہیں کیا بلکہ چوری یا غصب سے حاصل کیا ہے۔ کیونکہ چوری یا غصب جس طرح اور مال کا ہوتا ہے اسی طرح منذور لغیر اللہ کا بھی ہوتا ہے۔ بہر حال اس جانور کے حصول کا ذریعہ غصب اور دزدی ہے، نذر لغیر اللہ نہیں ہے۔ ہاں البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ پرستش غیر خدا کا تعلق اس جانور سے ہوا ہے اور یہ تعلق ہے بھی کافی قوی جیسے قربانی کا تعلق جانور سے ہوتا ہے اس لیے لعنت خداوندی کا سزاوار ہوگا، لیکن اس کے باوجود پرستش غیر خدا اس مال کے حصول کی راہ نہیں ہو بلکہ حصول کی راہ غصب اور دزدی ہے، برخلاف صورتِ دوم کے کہ وہاں مال حاصل ہونے کی راہ ہی نذر لغیر اللہ ہے اس لیے دونوں صورتوں کے حکم میں فرق ہوا۔

اب رہی یہ بحث کہ اگر صورتِ دوم وسوم، دونوں میں، مالک خود اس جانور کو ذبح کر کے کھانے کی اجازت دے تو دوسری صورت میں اس کا کھانا حرام ہے اور تیسری صورت میں جائز ہے۔ یہ فرق کیوں؟ کیونکہ اب دزدی اور غصب کا واسطہ صورت سوم میں بھی نہیں رہا۔ پس دونوں قسم کے جانوروں کے حصول کی راہ ایک ہو گئی پھر فرق کیوں ہے؟ تو وجہ فرق یہ ہے کہ دوسری صورت میں ان چیزوں کا استعمال کرنا نذر کرنے والے کی ناجائز غرض کی تکمیل ہے اور اس کی اعانت ہے کیونکہ اس نے سادھو کو یا فقیر کو کھلانے ہی کے لیے یہ جانور دیا ہے اس لیے اس کی حرمت جو آیت ما اھل بہ لغیر اللہ سے ثابت ہوئی تھی وہ مالک کے اجازت دینے کی صورت میں بھی بجالھا قائم رہی۔ اور تیسری صورت

میں چونکہ سوائب کا ذبح کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کے ذبح کرنے اور کھانے میں ناذر کی غرض کا ابطال ہے اس لیے اس کے ذبح کرنے اور کھانے کی فی نفسہ تو اجازت ہے لیکن مالک کے حق کی وجہ سے ممانعت تھی۔ پس جب مالک فروخت کردے یا بلا معاوضہ کسی کو دیدے تو اس کا کھانا جائز ہوگا۔

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ وہ نذریں جو غیر اللہ کے لیے ہوں اور از قبیل حیوانات نہ ہوں جیسے شیرینی، پھول وغیرہ ان کا کھانا مالک کی اجازت سے بھی درست نہیں ہے، مالک کے اجازت دینے کے باوجود وہ حرام رہیں گی، کیونکہ ان چیزوں کا استعمال کرنا نذر کرنے والے کی باطل کی غرض کی تکمیل ہے اور اس کی اعانت ہے۔ اور سوائب میں ان کو ذبح کرنے اور کھانے میں نذر کرنے والے کی غرض کا ابطال ہے۔ اور نہ کھانے میں اس کی تکمیل ہے۔

الحاصل شیرینی وغیرہ اجازت کے باوجود حرام ہی رہیں گی۔ اس کے حلال ہونے کی شرط یہ ہے کہ ناذر توبہ کرے اور اپنی نذر سے رجوع کرے پھر اجازت دے تب اس کا کھانا حلال ہے فسبحان الذی لاشریک لہ فی الملک والمال۔

(۲۱) جنت میں جنتیوں کے فضلات نہ ہونے کی وجہ

سوال: جنت میں جنتیوں کے فضلات (پیشاب، پاخانہ وغیرہ) نہ ہوں گے، وجہ کیا ہے؟ جبکہ وہاں وہ کھائیں گے پئیں گے؟

جواب: اس لیے کہ جنت کی غذاؤں میں فضلات نہ ہوں گے، صرف جوہر ہی ہوگا، اس لیے کھانے والوں کے بھی فضلات نہ ہوں گے ــــ اور غذاؤں کا یہ فرق کہ کسی میں فضلہ زیادہ ہوتا ہے کسی میں کم سب کے نزدیک مسلّم ہے، پس اگر کوئی ایسی غذا ہو جس میں فضلہ ہو ہی نہ تو کیا محال ہے؟ مثلاً زمین کی قوتِ نامیہ کی چھان پھٹک سے زمین سے اجزائے نباتی نکلتے ہیں اور زمین کے دیگر کثیف اجزاء زمین ہی میں رہ جاتے ہیں۔ پھر اللہ کی قدرت اجزاء نباتی کا خلاصہ کرکے اس سے غلہ اور میوے بناتی ہے اور کثیف اجزاء درخت، گھاس پھونس، اور بھوس کی شکل میں باقی رہ جاتے ہیں۔ پھر انسان اس غلہ کو صاف کرکے، پیس چھان کرکے کھاتے ہیں۔ لیکن اب بھی

بہت سے اجزاء کثیفہ اس میں باقی رہتے ہیں، پھر معدہ کا عمل شروع ہوتا ہے۔ وہ اس کی صفائی کرتا ہے۔ وہاں پکنے کے بعد فضلات تو آنتوں میں چلے جاتے ہیں اور باقی ماندہ مادہ (چاول کی پیچھ کی طرح کا جسے کیلوس کہتے ہیں) جگر کی چھلنی میں چھنتا ہے۔ اور اس میں سے پیشاب علیحدہ ہوتا ہے اور اخلاط اربعہ — سوداء، صفراء، دم اور بلغم — جدا جدا ہو جاتے ہیں۔ پھر یہاں سے دم (خون) قلب کی طرف جاتا ہے اور وہاں پکتا ہے۔ قلب کی حرارت کی وجہ سے اس میں سے ایک بھاپ اٹھتی ہے جو تمام بدن میں پھیل جاتی ہے۔ یہ بھاپ "روح ہوائی" کہلاتی ہے (اطباء اس روح کو "روح حیوانی" کہتے ہیں جس پر حیات کا مدار ہے)

بہر حال یہ بھاپ (روح ہوائی) اگر بالفرض برف کی طرح جم جائے اور اس کو کھائیں تو اس غذا سے فضلہ پیدا نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ غذا اصل میں "ہوا" ہوگی۔ اور اس صورت میں اگر آئے تو ڈکار[1] آجائے۔ اور اس طرح کھایا ہوا نکل جائے۔ اور پیٹ خالی ہو جائے۔ بس یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ جنتیوں کو پیشاب پاخانہ کی حاجت کیوں پیش نہ آئے گی؟ (انتصار الاسلام ص ۳۹ توضیح کے ساتھ)

(۲۲) اِنَّ لِلّٰهِ مَا اَخَذَ، وَلَهٗ مَا اَعْطٰی

"اصل مالک (ہر شے کا) اللہ تعالیٰ ہو، بندوں کی جان و مال سب اسکی ملک ہو، بندوں کی ملک اسکی ملک کے سامنے ایسی ہو، جیسے رعیت کے گھر کو رعیت کا گھر کہتے ہیں۔ وجہ اس (تشبیہ) کی سمجھی جانے ہیں کہ جیسے اصل مالک کو اس بات کا اختیار ہوتا ہو کہ اپنی رعیت کو اپنے مکان میں چاہے رکھے، چاہے نکالدے، اور رعیت والوں کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ اس مکان پر چاہیں تو اصل مالک کو تصرف کرنے دیں، چاہیں نہ کرنے دیں، ایسے ہی خدائے تعالیٰ کو اس بات کا اختیار حاصل ہو کہ جو چیز چاہے مخلوقات کے پاس رہنے دے (اور) جو چاہے اُن سے لے لے، پر مخلوقات کو یہ اختیار نہیں کہ جو چیز چاہیں، جونسی چاہیں، نہ جانے دیں۔ اگر یہ بات ہوتی تو کاہے کو کوئی اپنے خویش و اقرباء کو مرنے دیتا؟ اور کاہے کو کوئی غنی مفلس ہوا کرتا؟ جان و مال ہمیشہ ہمیشہ کو رہا کرتا۔ (فیوض ص ۳۳)

---

[1] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جنتی جنت میں کھائینگے پئینگے لیکن قضائے حاجت نہ کرینگے، نہ پیشاب کرینگے، نہ تھوکیں گے، نہ ناک صاف کرینگے، ان کا کھانا ڈکار اور مشکی پسینہ ہوگا۔" مسلم ۲/۳۷۹، کتاب الجنۃ باب صفات الجنۃ واہلہا، مسند احمد ۳/۳۱۶ مسند جابر بن عبد اللہ)

ذکرِ جمیل

(از ــــ مولانا ابو الحسن حیدری صاحب)

(حال ہی میں حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مختصر تذکرہ نظر سے گزرا۔ اس کے بعض مندرجات سے دل نے خاص اثر لیا، اس لیے جی چاہا کہ اس کو الفرقان میں شائع کر کے اپنے ناظرین کو بھی اس کے مطالعہ میں شریک کر لیا جائے اور اس طرح یہ الفرقان کے صفحات میں بھی محفوظ ہو جائے۔

حکیم صاحب علیہ الرحمہ جیسا کہ اس تذکرہ سے بھی معلوم ہوگا دار العلوم دیوبند کے دور اول کے فضلا میں سے تھے، اب سے قریباً ایک صدی پہلے ۱۲۹۶ھ میں فارغ ہوئے تھے، حدیث میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ سے تلمذ کا شرف بھی حاصل تھا اور حضرت ہی سے بیعت کر کے راہ سلوک طے کی تھی ــــ صلاح و تقویٰ اور اتباع سنت میں اپنے شیخ کے طریقے پر مستقیم و راسخ اور ہمارے لیے مثالی نمونہ تھے۔ــ اسی کے ساتھ حاذق و کامل الفن طبیب بھی تھے۔ اور اس سلسلہ میں یہ تعارف کافی ہوگا کہ حکیم اجمل خاں مرحوم کے استاذ تھے۔ حکیم صاحب نے طب کی اکثر کتابیں آپ ہی سے پڑھی تھیں۔

طب اور معالجہ کی یہ مشغولیت آپ کے لیے ایسا حجاب بن گئی .... کہ شاذ و نادر ہی وہ لوگ ہوں گے جو آپ کے علمی و دینی مقام و مرتبہ سے واقف ہوں۔)

حضرت مولانا حکیم جمیل الدین صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اپنے وطن نگینہ ضلع بجنور میں ۱۲۷۔ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد نے تاریخی نام منظور جمیل تجویز فرمایا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار جناب منشی محمد الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ مولانا عبدالہادی صاحب شیرکوٹی مولانا محمد فاضل صاحب پھلتی اور مولانا کوثر علی صاحب مہاجر مکی رحمہم اللہ سے حاصل کی۔ اس کے علوم اسلامی کی سب سے بڑی درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی اور حضرت مولانا عبدالعلی صاحب رحمہم اللہ جیسے یگانہ روزگار اساتذہ سے درس نظامی کی بیشتر کتابیں پڑھیں اور پھر حدیث کی کتابیں پڑھنے کے لیے قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حدیث کی تکمیل کے بعد حضرت سے دریافت کیا کہ فنون کی چند کتابیں رہ گئی ہیں کس سے پڑھوں۔ فرمایا مولوی محمود حسن (حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) سے پڑھو وہ علم کا کھلا ہے۔ چنانچہ حسب ارشاد گنگوہ سے دیوبند تشریف لائے اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سے فنون کی باقی ماندہ کتابیں پڑھیں اور ۱۲۹۔ھ میں فارغ ہو کر وطن تشریف لے آئے۔

۔۔۔کے بعد حضرت قطب عالم سے بیعت

بیعت کی کہانی خود حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنیئے۔ قطب عالم حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے پہلے جلسۂ دستار بندی میں جو ۱۳۰۵ھ میں ہوا تھا، تشریف لائے ہوئے تھے۔ چھتے کی مسجد کے بڑے حجرے میں جو کنوئیں کے پاس ہے حضرت رحؒ کا قیام تھا۔ ان کے قیام میں احقر نے اور مولوی محمد اسحاق فرخ آبادی مرحوم نے بیعت کی درخواست کی۔ فرمایا۔ کس لیے بیعت ہوتے ہو۔ اور جلدی نہیں۔ آج کل پرسوں تک سوچ سمجھ کر بتلاؤ۔ رات کو عشاء کے بعد پھر حاضر ہوا تو فرمایا کیا سوچ کر لائے۔ مولانا فخرالحسن صاحب گنگوہی مرحوم نے میرے کان میں آہستہ سے کہا یہ کہدو سلسلہ میں داخل ہونے کے لیے بیعت ہوتا ہوں۔ سُن کر فرمایا۔ بہت سے لوگ سلسلہ میں کس غرض سے داخل ہوتے ہیں۔ میں خاموش رہا۔ تو خود ہی فرمایا کہ سلسلہ میں اس لیے داخل ہوتے ہیں تاکہ بمقتضائے حدیث "اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ" قیامت کے دن سلسلہ کے بزرگوں کے ساتھ حشر نصیب ہو تو جب تم کو اس سلسلہ سے محبت ہے تو وہ غرض

بھی حاصل ہو گئی، پھر کیوں بیعت ہوتے ہیں۔ میں کچھ جواب نہ دے سکا بلکہ میرے سکھلانے والے مولانا فخرالحسن صاحب مرحوم بھی کچھ نہ بتلا سکے۔ فرمایا جاؤ پھر سوچو کس غرض سے بیعت ہوتے ہو۔ دوسرے دن اشراق کی نماز کے بعد پھر حاضر ہوا۔ فرمایا کیا سوچ کر لائے۔ میں نے عرض کیا حضرت آپ ہی بتلا دیں کیوں بیعت ہوا کرتے ہیں۔ حجرہ حاضرین سے بھرا ہوا تھا اور غالباً حجرہ سے باہر چھپر کے نیچے بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت نے ایک مبسوط تقریر فرمائی جو یاد نہیں رہی اس کا خلاصہ چند لفظوں میں یہ یاد رہ گیا ہے کہ تکلیفات شرعیہ نفس پر نہایت شاق ہیں۔ شیخ کامل سے بیعت ہونے اور ان کی ہدایات پر عمل کرنے سے وہ تکلیفات شاقہ آسان ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد احقر سے مخاطب ہو کر پوچھا اسی غرض سے بیعت ہوتے ہو۔ میں نے عرض کر دیا جی ہاں۔ فرمایا استخارہ کرو، مسنونہ کر کے آنا۔ دوسری مرتبہ استخارہ کر کے حاضر ہوا تو فرمایا ایک دفعہ اور استخارہ کر لو اس کے بعد اگر تم بیعت ہونا نہ بھی چاہو گے تو زبردستی بیعت کر لوں گا۔ تیسری مرتبہ استخارہ کر کے حاضر ہوا تو مسجد کے اندر نماز ظہر کے بعد چاروں خاندانوں میں بیعت فرما لیا۔

علوم دین کی تکمیل کے بعد

طب یونانی کی تحصیل کے لیے حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں صاحب مرحوم دہلوی کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے۔

حاذق الملک کی فنی حذاقت اور علمی مہارت کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بج رہا تھا اس لیے ان کا حلقۂ درس بڑے بڑے علماء فضلا کا مرجع تھا۔ مریضوں کے ہجوم کے ساتھ نسخہ نویسوں کی ایک جماعت بھی حاذق الملک کی مسند کے قریب گوش برآواز بیٹھی رہتی تھی ادھر حاذق الملک نے مریض کی نبض دیکھ کر نسخہ بتلانا شروع کیا، ادھر نسخہ نویسوں کے قلم کاغذ پر دوڑنے لگے۔ حضرت استاذی حکیم جمیل الدین صاحب قبلہ مرحوم خود فرماتے تھے مجھے یاد نہیں کہ مجھ سے پہلے کسی نے نسخہ لکھ کر حاذق الملک کے ہاتھ میں دیا ہو۔ حکیم عبدالمجید خاں صاحب کے دل میں حکیم صاحب قبلہ کی علمی قابلیت ذہانت اور تدین کی بڑی ہی قدر تھی۔ طالب علمی کے زمانہ میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کی تعلیم و تربیت کا کام حکیم صاحب مرحوم کے سپرد ہوا۔ شریفی خاندان کے مجرب نسخوں کے راز داں رہے۔ حاذق الملک نے اپنے قلم سے حکیم صاحبؒ کی سند میں یہ الفاظ لکھے —

الذی ھو من بین تلامذتی کالقلب من الاعضاء فارغ ہونے کے بعد مدرسہ طبیہ جو بعد میں

طبیہ کالج بنا اس کا پہلا پرنسپل اور پہلا مہتمم حکیم صاحب مرحوم کو بنایا۔ حکیم صاحب ہی کی ذات گرامی کی بدولت جناب حاذق الملک کو حضرت قطب عالم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے غائبانہ بڑی عقیدت تھی۔ ایک دفعہ حاذق الملک کی صاحبزادی ایسی علیل ہوئیں کہ شفایابی کی امید کسی کو نہ رہی۔ حکیم صاحب کو بلایا اور کہا حضرت کی خدمت میں ابھی جاؤ اور میری جانب سے اس کے لیے دعا کی درخواست کرو۔ حکیم صاحب فرماتے تھے گنگوہ پہونچکر جس وقت میں نے عرض کی حضرت نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ دہلی پہونچکر معلوم ہوا کہ عین وہی وقت اسکی شفایابی کا تھا۔ حاذق الملک حکیم عبد المجید خاں صاحب مرحوم نے جب طبیہ کالج کا سنگ بنیاد رکھنا چاہا تو حکیم صاحب مرحوم کو گنگوہ یہ کہلا کر بھیجا کہ میری یہ آرزو ہے کہ آپ تشریف لاکر اپنے مبارک ہاتھوں سے اس کا سنگ بنیاد رکھدیں مگر حضرت نے اپنے مشاغل کی وجہ سے عذر فرمادیا۔

حکیم صاحب مرحوم آخر عمر تک مطب کے ذریعہ خلق اللہ کی خدمت میں مشغول رہے لاکھوں نے ان کے ہاتھوں سے شفا پائی۔ ہند اور بیرون ہند کے ہزارہا طلبہ نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا اور طب کی علمی اور عملی تعلیم حاصل کر کے آج وہ مختلف ممالک میں خلق اللہ کی خدمت کر رہے ہیں۔ مگر شب و روز کے اس مشغلہ کے باوجود جب بھی ان جھمیلوں سے فرصت ملتی حدیث تفسیر، فقہ اور تصوف کے درس و مطالعہ میں لگ جاتے۔ حکیم صاحب کا مشغلہ مطب ضرور تھا مگر درحقیقت ان کے دل کا لگاؤ اور طبیعت کا میلان علوم نبوت کی جانب زیادہ تھا جو علماء حکیم صاحب مرحوم سے طب کی کتابیں پڑھنے کی درخواست کرتے ان کو بڑی ہی لجاجت سے اس سے روکتے اور دین کی خدمت کی جانب متوجہ فرماتے۔ ایک صاحب کو تحریر فرماتے ہیں "علاوہ بریں علم دین کی خدمت میں اگر بقدر کفاف مل جائے تو اس پر قناعت کرنا دارین میں بہتر ہے اور زیادہ طلبی کی ہوس اور امید موہوم میں دین کی خدمت چھوڑ کر دنیا کی خدمت کرنا مثمر خیر و برکت نہیں ہو سکتا۔ میں خود بدقسمتی سے اسی میں مبتلا ہو کر علی وجہ البصیرۃ اس نقطہ پر پہونچا ہوں۔

روز گار م بشد بنادانی من نکردم شما حذر بکنید

ایک واقعہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر طب پڑھنے کے لیے حاذق الملک حکیم عبد المجید خاں مرحوم

کی خدمت میں جب دہلی پہونچے تو حضرت مولانا حکیم جمیل الدین صاحبؒ نے ان کو سمجھایا کہ آپ اس میں نہ پڑیں آپ تو دین ہی کی خدمت میں لگ جائیں۔ چنانچہ حضرت مولانا تھانویؒ ان کے کہنے سے تھانہ بھون واپس چلے گئے۔ حضرت مولانا تھانویؒ اپنے مواعظ اور مجالس میں اکثر اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا کرتے تھے "کہ میرے اوپر مولانا حکیم جمیل الدین صاحب کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے مجھ کو طب پڑھنے سے باز رکھا ورنہ میں اسی میں رہ جاتا۔

حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہ جملے مجھے یاد ہیں کہ حضرت مولانا تھانویؒ نے زندگی بھر دین کی جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں ان سب میں حضرت حکیم صاحبؒ کا حصہ ہے۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من دعا الی ھدیً کان لہ من الاجر مثل اجور من تبعہ لا ینقص ذلک من اجورھم شیئاً

ترجمہ:۔ حضور نے فرمایا جس شخص نے ہدایت کی جانب دعوت دی تو اس کو ہدایت پر عمل کرنیوالے تمام لوگوں کے برابر ثواب ملے گا اور یہ ثواب ان لوگوں کے ثوابوں میں سے کاٹ کر نہیں دیا جائے گا۔

علمی ذوق حکیم صاحب کی علمی منزلت کا کچھ تھوڑا بہت اندازہ ان کے علمی مقالات، درس تدریس اور ان کی گرانمایہ تصنیف سے ہو سکتا ہے جو مختلف مباحث پر مرحوم نے اپنی یادگار چھوڑی ہیں مگر مرحوم پر اخفاء کمالات اور کتمان حالات کا جذبہ کچھ اس درجہ غالب تھا کہ اپنی تمام تر تصانیف اپنے شاگردوں کے نام سے شائع کیں اور عمر بھر اپنی جانب ان کی نسبت سے گریز فرمایا اب کہ حکیم صاحب جوار رحمت میں آرام فرما ہیں ان چیزوں کا اظہار مناسب نہیں جن کو مرحوم نے خود اپنی حیات میں ظاہر کرنا پسند نہیں فرمایا۔

غازی پور کے زمانۂ قیام میں مستفیدین سے حکیم صاحب مرحوم کے مذاکرات بہت ہوتے رہتے تھے۔ حدیث سے خطبۃ الوداع کے عدم ثبوت کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ ایک صاحب نے کہا کہ رمضان جیسے بابرکت مہینہ کے وداع و فراق پر اگر غم و الم کا اظہار کیا جائے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ اسلام نے رمضان کے اول کو رحمت اور اوسط کو مغفرت اور اس کے آخر کو عتق من النیران قرار دیا ہے۔ تم خود ہی بتاؤ کہ عتق من النیران نوحہ وزاری کی چیز ہے یا مسرت و بشارت کی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ للصائم فرحتان فرحۃ عند الافطار و فرحۃ عند لقاء الرحمٰن اور آخری افطار وہ ہے جس کے بعد عید کے

دن کا روزہ حرام ہو جاتا ہے بلکہ اصلی افطار یہی آخری افطار ہے اسی وجہ سے شریعت نے یوم عید یوم فرحت و سرور قرار دیا ہے لہٰذا رمضان کا ختم ہو جانا جبکہ عتق من النیران اور فرحت دونوں کا سبب ہے تو اس پر یہ نوحہ و زاری اور الوداع اور الفراق کا شور مچانا پرلے درجہ کی حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

ایک اور واقعہ ایک صاحب نے معارضہ کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی صحابی کو حدیث کی سند عطا نہیں فرمائی نہ کبھی سند کے بعد اپنی عمر مبارک میں کبھی دستار بندی کا جلسہ کیا نہ کسی دار الحدیث کا سنگ بنیاد رکھا نہ روایت حدیث کے لیے کسی دار یا مکان کو مخصوص فرمایا بلکہ ان سب کے خلاف عمل رہا پس یہ تمام امور بھی ناجائز و حرام ہونے چاہئیں۔

حکیم صاحب نے برجستہ فرمایا کہ یہ سب چیزیں شریعت سے ثابت ہیں دیکھو شاگرد کو سند اس لیے دی جاتی ہے کہ جب یہ لوگوں کے پاس احکام الٰہی کی تبلیغ و تلقین کے لیے پہنچے تو ہماری دی ہوئی سند اس کے معتبر اور مستند ہونے کا ثبوت ہو۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت ابوہریرہؓ کو اپنے مبارک نعلین (بطور سند) دے کر یہ فرمایا کہ جاؤ باغ سے باہر جو ایسا شخص تم کو ملے جو حق تعالیٰ کے وحدہٗ لاشریک لہٗ ہونے کی بیقین قلب سے شہادت دے تو اس کو جنت کی بشارت دیدینا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امام اپنی متبعین کے پاس کسی شخص کو کوئی ایسی علامت دے کر بھیج سکتا ہے جس سے وہ یہ سمجھ لیں کہ یہ اسی امام کا فرستادہ اور معتبر ہے۔

حواریوں نے جب حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام سے نزول مائدہ کے لیے دعا فرمانے کی درخواست کی تو اس کو یوں ادا کیا۔ قالوا نرید ان ناکل منھا و تطمئن قلوبنا و نعلم ان قد صدقتنا و نکون علیھا من الشاھدین۔ لے تشھد علیھا عند من لم یحضرھا۔

دستار بندی طبرانی کی اس حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کو والی اور حاکم بنا کر بھیجتے تھے تو اس کے سر پر عمامہ باندھ دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے اس وقت کے حاکم نرے حاکم ہی نہیں مذکر اور واعظ بھی ہوتے تھے۔

دار الحدیث کا سنگ بنیاد رکھنا بھی حدیث سے ثابت ہے حضور پر نورؐ نے مسجد نبوی کا سنگ بنیاد رکھا اور وہی آپ کا دار الحدیث تھا۔

ہجرت سے پہلے جو لوگ مدینہ منورہ میں مشرف باسلام ہو چکے تھے ان کی تعلیم کے لیے

حضورؐ نے مکہ معظمہ سے حضرت مصعب بن عمیر کو بھیجا۔ انھوں نے مدینہ میں پہونچکر تعلیم قرآن و حدیث کے لیے بنی ظفر کا گھر مخصوص کیا جس میں بیٹھ کر وہ وہاں کے مسلمانوں کو تعلیم دیتے تھے۔ ہجرت کے بعد جب حضورؐ مدینہ تشریف لائے تو آپ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا۔

ایک صاحب نے مولود میں قیام کو فاذکروا اللہ قیاماً سے ثابت کیا کہ ذکرِ رسول درحقیقت ذکر اللہ ہی ہے حکیم صاحب نے فرمایا اس آیت میں وقعوداً وعلیٰ جنوبہم بھی ہے جب آپ کے نزدیک اس آیت سے ذکرِ رسول کے وقت قیام جائز ہے بیٹھا رہنا بلکہ ذکرِ رسول کے وقت لیٹ جانا بھی جائز اور مستحب ہونا چاہیے۔

طب یونانی

کے علم و عمل پر حکیم صاحب مرحوم کو بڑی دستگاہ تھی۔ تمام مہمات مسائل کا استحضار تھا۔ متقدمین اطباء میں شیخ الرئیس اور متاخرین میں حکیم محمد اکبر ارزانی و حکیم علی گیلانی، حکیم اعظم خاں، حکیم عابد سرہندی کے مداح تھے رحمہم اللہ۔

(۱) طالب علمی کے زمانہ میں حکیم صاحبؒ کو وجع المفاصل ہوگیا۔ استاذ حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں نے فصد تجویز فرمائی۔ حکیم صاحب نے استاذ کو پرچہ لکھ کر بھیجا کہ فصد تو میرے خیال میں مضر ہوگی۔ استاذ نے دلائل سے اس کا رد کیا۔ حکیم صاحب نے پھر مدلل وہی عرض کیا۔ استاذ نے پھر اس کا جواب دیا۔ حکیم صاحب نے جواب الجواب لکھ بھیجا۔ استاذ نے جواب دیکھ کر فرمایا اس کو پکڑ کے لاؤ۔ حکیم صاحب حاضر کیے گئے، دیکھتے ہی ملازم کو آواز دی اکبر! فصاد کو بلا کے لاؤ۔ فصاد آگیا۔ خود بیٹھ کر اپنے سامنے فصد کھلوائی۔ دوسرے دن درد بڑھ گیا۔ حکیم صاحب نے جب حال کہلا کر بھیجا تو ذرا تامل کے بعد فرمایا۔ تمہیں ٹھیک کہتا تھا، مجھ سے غلطی ہوگئی۔

(۲) حکیم محمد ابراہیم خاں صمصامی مرحوم جو دہلوی راوی ہیں کہ ایک شخص کو روزانہ ٹھیک دو بجے پیٹ میں شدید قسم کا درد اٹھا کرتا تھا۔ بہت علاج کیا کوئی فائدہ نہ ہوا ناچار اس کو لے کر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حکیم صاحب نے صرف عناب اور تخم کشوث پیس کر پلانا تجویز فرمایا۔ چند روز کے استعمال سے مریض بالکل شفایاب ہوگیا۔

(۳) ایک مریضہ کا نچلا دھڑ زچگی میں مفلوج ہوگیا۔ حکیم صاحب نے صرف چوب چینی پلائی۔ ہفتہ بھر کے بعد وہ خود اپنے پاؤں سے چل کر مطب میں آئی۔

دہلی میں آپ کا مطب مرجع خلائق بنا۔ علاج میں طب کے اصول کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ طلبہ کو ہمیشہ اسی کی تاکید تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ اصول کے مطابق علاج کرنے والا کبھی مار نہیں کھا سکتا۔ دواؤں کے استعمال میں شرعی حلت و حرمت کا بڑا احترام تھا۔ طبی مسائل اور مباحث کا بڑا استحضار تھا۔ الجھے ہوئے امراض کی تشخیص میں کمال تھا۔ وقت کے بڑے بڑے اطباء اپنے زیر علاج مریضوں کو لا لاکر یا ان کے حالات لکھ لکھ کر مشورے لیتے تھے۔ فن طب میں چھوٹی بڑی کئی کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔ الطاعون، شفاء الاسقام اور بعض دیگر غیر مطبوعہ مسودات۔

ذوق ادبی اردو، فارسی اور عربی ادب سے فطری لگاؤ تھا۔ اردو فارسی دونوں میں بڑے شگفتہ مضامین لکھتے تھے۔ اشعار اگرچہ کم لکھتے تھے مگر قلم سے جو شعر نکلتا زبان اور ادب کا شاہکار ہوتا۔ تشبیب (غزل) کے یہ تین شعر ملاحظہ فرمائیے۔

همٌّ الم بقلبي غير منفصم	بالغانيات عن الاطواق والخدام
الغانيات بحسن الخلق عاشقها	عما سواها من اللذات والنعم
القاتلات بلحظٍ لو شزرن به	والمحييات بلفظٍ ان يقلن قم

تاریخ نکالنے میں بڑا کمال تھا۔ حاذق الملک حکیم عبد المجید خاں مرحوم کی وفات پر لکھتے ہیں

یار، بش جلئے وہ بخلد بریں	هم بنوشان زبادۂ مختوم
سال تاریخ رحلتش گفتم	حبر عبد المجید خاں مرحوم

مولانا فضل الرحمان صاحب دیوبندی مرحوم کی تاریخ وفات ۱۳۰۵ھ ہے علیہ فضل رحمان

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی نور اللہ مرقدہ کی تاریخ وفات حدیث کے اس جملہ سے نکالی ہے۔ موت عالم ثلمة فى الدين ۱۳۳۹ھ

صاحبزادہ حکیم مسعود احمد صاحب گنگوہی کے نکاح کی تاریخ

"کیا خوب ہوا قران مسعود" ۱۳۲۳ھ

گلستان سعدیؒ کے بعض اشعار کا منظوم ترجمہ ملاحظہ ہو۔ سعدیؒ

قرار در کف آزادگان نگیرد مال	نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال
ترجمہ: ہاتھ میں آزادہ رو کے مال و دولت کیا رہے	عاشقی میں صبر اور چھلنی میں پانی کیا رہے

استغناء

طبیعت میں قناعت اور استغناء اس درجہ تھی کہ ریاست حیدرآباد، ریاست رامپور کے درباروں میں، دلی اور علیگڈھ کے طبیہ کالجوں میں امراء اور احباب کی سعی و طلب کے باوجود کبھی ملازمت گوارا نہیں کی۔ نواب صاحب رامپور نے ایک دفعہ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے توسط سے طبیب خاص بنکے عہدہ جلیلہ پر بلایا۔ اتفاق سے اس وقت حکیم صاحبؒ عسرت کی وجہ سے ضرورت مند بھی تھے۔ شیخ وقت حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مشورہ کے لیے خطوط لکھے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے تو جواب دیا "چلے جایئے کیا عجب ہے آپ کی وجہ سے وہ ظلمت کدہ نور کدہ بن جائے" اور حضرت رائے پوریؒ نے تحریر فرمایا کہ استفت قلبک یعنی فتویٰ اپنے قلب سے لے لیجیے۔ حکیم صاحبؒ نہیں گئے۔ ایک بار حکیم اجمل خاں مرحوم نے اور دوبارہ مسیح الملک ثانی حکیم محمد احمد خاں مرحوم نے بڑے معقول مشاہروں پر بڑے ہی اصرار سے طبیہ کالج میں ایک گھنٹہ روزانہ لیکچر دینے کی درخواست کی۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ میں اپنی آزادی کو کسی قیمت پر بیچنے کے لیے تیار نہیں۔

کیمیا کا نسخہ

حکیم صاحب خود فرماتے تھے کہ حضرت گنگوہیؒ ترمذی شریف پڑھا رہے تھے اشیاء کی قلب ماہیت کا ذکر آ گیا۔ حضرت نے فرمایا "محال نہیں ممکن ہے" اب کے سفر حج میں ایک مغربی نے خود میرے ہاتھ سے سونا بنوا دیا اور اس کا نسخہ بھی مجھے بتلا دیا۔ حج سے واپسی کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں جب میں نے اس کا ذکر کیا تو فرمایا "توکل سے بڑھ کر کوئی کیمیا نہیں۔" سبق سے فارغ ہو کر حکیم صاحب حضرت کے حجرہ شریفہ میں پہونچے اور کیمیا کا نسخہ دریافت کیا۔ حضرت نے وہ نسخہ عطا فرما دیا۔ ایک نے حکیم صاحب سے پوچھا تو وہ نسخہ اب بھی آپ کے پاس ہے۔ فرمایا جی ہاں — تو پھر آپ بناتے کیوں نہیں۔ فرمایا مولوی صاحب خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کبھی خیال تک نہیں آتا کہ کیمیا بناؤں۔

پھر فرمایا کہ غازی پور میں میرا ایک دوست واقعی کیمیا جانتا تھا۔ اس نے خود مجھ سے کہا کہ میں تم کو اس کا نسخہ بتا دوں گا۔ خدا کی قسم وہ دن ہے اور آج کا دن اس کے گھر کا رخ تک نہیں کیا۔

آنکس کہ ترا بخواست جاں را چہ کند — فرزند و عیال و خان و ماں را چہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی — دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند

اتباعِ شریعت قرآن کریم میں صحابہ کرام کی شان یہ فرمائی گئی ہے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ قطب عالم حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ "طاعت سے بھی رغبت ہوگئی ہے اور معصیت سے طبعی نفرت" حضرت حکیم صاحبؒ میں بھی کچھ یہی شان دیکھنے میں آئی۔ غازی پور میں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ جون اور رمضان کا مبارک مہینہ تھا۔ انہی دنوں میں حکیم صاحب کو بخار ہوگیا اور اتنا شدید کہ کئی دن مسلسل بے ہوشی میں بیت گئے۔ حکیم صاحب کے برادر خورد مولانا حکیم محمد یٰسین صاحب مدظلہ کا بیان ہے کہ اس بے ہوشی کے عالم میں ہم یہ دیکھتے تھے کہ جہاں نماز کا وقت ہوا اور تیمم کر کے حکیم صاحب نے نماز پڑھ لی۔ افاقہ کے بعد حکیم صاحب نے دریافت فرمایا کہ میری کتنی نمازیں قضا ہوئیں۔ کہا گیا کہ ایک بھی نہیں آپ تو تیمم کر کے برابر پڑھتے رہے فرمایا مجھے تو خبر ہی نہیں۔ جناب حکیم یٰسین صاحب مدظلہ یہ بھی سناتے تھے کہ میں نے حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں بھائی کا حال لکھ کر بھیجا اور اپنے جی میں یہ اندازہ لگایا کہ یہ خط فلاں دن فلاں وقت حضرت کی خدمت میں پہونچے گا۔ حکیم یٰسین صاحب فرماتے ہیں میرے اندازے کے مطابق عین اسی وقت حکیم صاحب کے افاقہ اور شفایابی کا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جس وقت خط پہونچا فوراً حضرت نے ہاتھ اٹھا کر حکیم صاحب کے لیے دعا فرمائی۔

جماعت کے ساتھ نماز کی پابندی حکیم صاحب مرحوم کی اپنی اولاد میں سب سے چہیتی نوجوان لڑکی آمنہ نزع کے عالم میں ہے۔ فجر کی جماعت کا وقت قریب ہے۔ حکیم صاحب کبھی آمنہ کے چہرے کو دیکھتے ہیں اور پھر گھبرا کر کبھی اپنی گھڑی کو اور کبھی کمرے سے باہر اجالے کو دیکھنے لگتے ہیں۔ جب یہ سمجھتے ہیں کہ مسجد میں جماعت کھڑی ہونے والی ہوگی، چہیتی بیٹی کو اسی عالم نزع میں چھوڑ کر لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے مسجد میں پہونچ کر تکبیر اولیٰ میں شریک ہو جاتے ہیں ادھر آمنہ چند ہی منٹ بعد رخصت ہو جاتی ہے۔

حضر ہو یا سفر تہجد، محال ہے کہ ناغہ ہو جائے اور پھر تہجد میں سوز و گداز اور دعاؤں میں گریہ وزاری، زبان و قلم اس کے بیان سے درماندہ ہے رحمۃ اللہ واعلیٰ درجتہ۔

سیاسیات میں اپنے اکابر حضرت گنگوہی اور حضرت شیخ الہند کے قدم بقدم تھے۔

حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی پانی پتی کا بیان ہے کہ حکیم صاحب حضرت شیخ الہند کی جماعت مجاہدین کے لیے دہلی سے چندہ کی بڑی بڑی رقمیں لے کر مولانا حامد اللہ صاحب پانی پتی کو پہونچایا کرتے تھے۔ رات کو چپکے سے پہونچتے اور صبح کو واپس دہلی آجاتے۔

گیارہ ماہ تک مرض سل میں مبتلا رہے مگر معمولات میں ذرہ برابر فرق نہ آیا، جس رات

وفات کے آخر میں دنیا کو چھوڑنا ہے، اپنے معمول سے گھنٹہ بھر پہلے ہی ڈھائی بجے اٹھ گئے، حوائج سے فارغ ہو کر فرمایا مجھے تیمم کرا دو۔ تیمم فرما کر اشارہ سے تہجد کی چار رکعتیں پڑھیں اور بڑی تیزی سے دعائیں مانگنے لگے۔ دعا کی حالت میں فرشتہ اجل آپہونچا اور ۲۱، ۲۲ صفر سنہ ھ کی درمیانی شب میں رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام۔

دہلی میں پنجابیوں کا مخصوص گورستان گھر سے نزدیک اور بہت محفوظ تھا، مگر حکیم صاحب نے خصوصی طور پر یہ وصیت فرمائی اگر میرا انتقال نگینہ میں ہو تو مجھ کو والدین مرحومین کے قدموں میں دفن کیا جائے اور دہلی میں انتقال ہو تو سبزی منڈی کے گورغریباں میں۔ مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور علم و حکمت کے اس گنج گرانمایہ کو حسب وصیت سبزی منڈی کے گورغریباں میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

رہے نام اللہ کا۔ غفر اللہ لہ واعلی درجتہ آمین

محمد منظور نعمانی

تحدیث نعمت

کیا پایا اور کن کو پایا

(اس عنوان کے تحت اپنے بعض اکابر کے متعلق جو کچھ لکھا جارہا ہے یہ اُن کے حالات و سوانح نہیں ہیں، بلکہ اُن حضرات کے متعلق اس عاجز کے کچھ تجربات اور تاثرات ہیں۔ (نعمانی)

—— ؛ ۴ ؛ ——

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ

راقم سطور اب سے ٹھیک پچاس سال پہلے، شوال سنہ ۱۳۴۲ھ میں جب ایک طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تھا تو اگرچہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحبؒ کو اس وقت کاغذات میں "نائب مہتمم دارالعلوم" دیوبند ہی لکھا جاتا تھا اور ضابطہ میں ان کا عہدہ اور منصب یہی تھا لیکن فی الحقیقت وہی مہتمم تھے، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ جو عہدہ کے لحاظ سے اصل مہتمم تھے، کچھ مدت پہلے سے مرحوم ریاست حیدرآباد کے "مفتیٔ عدالت العالیہ" کا منصب قبول فرما چکے تھے اور اس کی وجہ سے وہیں قیام فرماتے تھے۔ بلکہ کہا جاتا تھا کہ حضرت حافظ صاحب کے حیدرآباد تشریف لے جانے سے پہلے بھی اہتمام سے متعلق کاموں کا زیادہ تعلق حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ہی سے رہتا تھا۔ غالباً اس میں اس کو بھی دخل تھا کہ دونوں حضرات میں ایسا تعلق تھا کہ دوئی کا احساس ہی نہیں تھا۔

ایک دفعہ دارالعلوم کی میری طالب علمی ہی کے زمانہ میں ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں اپنے کو دارالعلوم کا نائب مہتمم ہی کہتا اور لکھتا ہوں لیکن واقعہ یوں ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جب مجھے اس خدمت کے لیے مامور اور مقرر کیا تھا تو مجھے "نائب مہتمم" نہیں بلکہ "مہتمم ثانی" بنایا تھا۔

بہرحال ہر قسم کی ذمہ داری اور عمل دخل کے لحاظ سے وہی اُس وقت دارالعلوم کے مہتمم تھے اور حق یہ ہے کہ مثالی مہتمم تھے ـــــ ہر طرف سے یکسو ہو کر صرف دارالعلوم ہی کو انھوں نے اپنی زندگی کا مصرف اور موضوع بنا لیا تھا، اہل و عیال کے جھمیلوں سے بھی اللہ نے آزاد رکھا تھا، بس اپنی اکیلی زندگی تھی، دارالعلوم کا دارالاہتمام (یا دفتر اہتمام) ہی اُن کا مسکن تھا، اسی کے ایک کونے میں پلنگ پر اُن کا بستر لگا رہتا تھا ـــــ دیکھنے میں نہایت ضعیف اور نحیف تھے، معلوم ہوتا تھا کہ بوڑھی اور سوکھی ہڈیوں کا ایک کشیدہ قامت ڈھانچہ ہے جس پر کھال منڈھی ہوئی ہے مگر آنکھوں میں غیر معمولی قسم کی ایک چمک تھی" چلتے پھرتے ہمیشہ تسبیح ہاتھ میں رہتی لب متحرک ـ لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللهِ ـ کی تصویر نظر آتی۔

مشہور تھا کہ غذا برائے نام ہی ہوتی ہے، بس چائے اور دواؤں پر گزارا ہے۔ سنتے تھے کہ چائے بہت اعلیٰ قسم کی استعمال ہوتی ہے، ذوق نہایت لطیف ہے، دودھ بھی پیالی میں چھلنی سے چھان کر ڈالا جاتا ہے کہ بالائی کا کوئی ریشہ نہ آ جائے۔ کیا عجب کہ ذوق کی یہ لطافت اپنے مرشد حضرت گنگوہیؒ کی خدمت کی برکات میں سے ہو ـــــ میں نے کئی بزرگوں سے یہ واقعہ سنا ہے کہ یہی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ایک زمانہ میں حضرت گنگوہیؒ کے ہاں خادمانہ طور پر مقیم تھے، تہجد کے وقت حضرت کے لیے چائے تیار کرنے اور پلانے کی خدمت اپنے ذمہ لے رکھی تھی، ایک رات کو چائے تیار کر کے حضرت کو پیش کی، حضرت نے چائے پینا شروع کی اور فرمایا "مولوی حبیب! آج چائے میں کچے پانی کا اثر ہے ـــــ اگلے دن انھوں نے چائے کے تیار کرنے میں خاص احتیاط کی، کیتلی کو پہلے کھولتے ہوئے پانی سے گرم کیا اس کے بعد اُسمیں چائے بنائی پھر پیالی تیار کر کے حضرت کی خدمت میں پیش کی، حضرت نے پیالی منھ سے لگائی اور فرمایا مولوی حبیب آج بھی کچے پانی کا کچھ اثر ہے، انھیں سخت ندامت ہوئی اور تعجب بھی ہوا ـــــ اگلی رات کو انھوں نے پھر بہت احتیاط اور اہتمام سے چائے تیار کی اور مزید یہ کیا کہ پیالی کو دھو کر پہلے تولیہ سے خشک کیا اُس کے بعد اُس میں چائے بنا کر

حضرت کی خدمت میں پیش کی، حضرت نے چائے پی اور فرمایا مولوی حبیب! آج کچھے پانی کا وہ اثر نہیں ہے۔

حضرت گنگوہی قدس سرہ کی لطافتِ مزاج کے حضرت میرزا مظہر جان جاناںؒ کی طرح اس طرح کے بہت سے قصے مشہور ہیں، تو ممکن ہے کہ چائے کے بارہ میں حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب کے ذوق ومزاج کی لطافت قیام گنگوہ کی برکات میں سے ہو۔

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ بہت ہی ضعیف اور منحنی تھے، اُن کے دُبلے پتلے اور سوکھے جسم کو دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ ان کی رگوں میں خون بس برائے نام ہی ہوگا، مگر اس حالت میں بھی کارکردگی کا یہ عالم تھا کہ جب بھی کسی ضرورت سے دار الاہتمام کی طرف سے گزرنا ہوتا حضرت مولانا کو کام ہی میں مصروف ومنہمک دیکھا جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے بڑا ہی تیقظ دیا تھا۔ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے دار العلوم کے ہر گوشے اور شعبے کی خبر رکھتے تھے، سب بڑوں اور چھوٹوں پر اُن کا غیر معمولی اثر اور بڑا رعب تھا۔ طلبہ کے ساتھ اُن کا رویہ بڑا ہی مشفقانہ تھا، جو طالب علم اپنی کوئی ضرورت لے کر اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا، پوری توجہ اور ہمدردی سے اس کی بات سنتے اور چاہے اُس بیچارہ کا کام بالکل نہ ہو پاتا لیکن وہ یہی احساس اور تاثر لے کر واپس آتا کہ مجھ پر حضرت مہتمم صاحب کی خاص نظرِ عنایت ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ خاص کمال حضرت ممدوح کو عطا فرمایا تھا۔ خود اپنا ذاتی واقعہ عرض کرتا ہوں، میں ایک طالب علم کی حیثیت سے دو سال دار العلوم میں رہا، میرا قیام چند اور طلبہ کے ساتھ دار العلوم سے باہر مطبع قاسمی کے ایک خستہ سے کمرے میں تھا، میری برابر یہ خواہش اور کوشش رہی کہ دار العلوم کے احاطہ کے اندر کسی مناسب حجرہ میں قیام کی جگہ مل جائے کئی دفعہ حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں درخواست لے کر حاضر ہوا۔ خوب یاد ہے جب پہلی دفعہ اس ضرورت سے حاضری ہوئی اور درخواست پیش کی، حضرت ممدوح نے بڑی ہمدردی اور شفقت کا معاملہ فرمایا، درخواست پڑھ کر فوراً اُس پر کچھ لکھا اور اپنے پیشکار مولوی عبد الاحد صاحب کو (جو برابر کے کمرے میں بیٹھ کر کام کرتے تھے) خود بلند آواز سے پکارا — **مولوی عبد الاحد!** — وہ فوراً حاضر ہوئے، میری طرف اور میری درخواست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُن سے فرمایا

"یہ حجرہ کے لیے مولوی صاحب کی درخواست ہے اس کو اپنے پاس رکھیے اور جب بھی کوئی

مناسب جگہ خالی ہو پہلے مولوی صاحب کو دی جائے۔" ___ میں مطمئن بلکہ بہت خوش ہو کر واپس آگیا، لیکن جب دو تین مہینے تک کوئی انتظام نہیں ہوا تو پھر دوسری درخواست لیکر حاضر ہوا حضرت مہتمم صاحب نے پھر ویسی ہی شفقت کا معاملہ فرمایا، پھر اسی طرح پیشکار مولوی عبد الاحد صاحب کو خود ہی پکار کے بلایا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اُن سے فرمایا کہ "بھئی مولوی صاحب کی درخواست پہلے بھی آئی تھی، آپ کے لیے ابھی تک حجرہ کا انتظام نہیں ہو سکا؟ ___ انھوں نے اپنے خاص انداز میں عرض کیا کہ "حضرت ابھی تک کوئی اچھی جگہ خالی نہیں ہوئی۔" ___ حضرت مہتمم صاحب نے پھر فرمایا کہ "بھئی خیال رکھنا چاہیے اور جب بھی کوئی مناسب جگہ نکلے مولوی صاحب کو پہلے دینا چاہیے ___ اور میری دوسری درخواست بھی کچھ لکھ کر مولوی عبد الاحد صاحب کے حوالہ کر دی گئی میں پھر مطمئن ہو کر واپس آگیا اور میرے دل نے پوری طرح محسوس کیا کہ حضرت مہتمم صاحب کو میرا بڑا خیال ہے اور مجھ پر خاص نظر عنایت ہے اور اب تک مجھے حجرہ نہ مل سکنے کا خود اُن کو بھی رنج اور قلق ہے۔

دار العلوم کے دو سالہ قیام میں کم از کم ۳، ۴ دفعہ اس طرح درخواست لے کر حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں حاضری کی نوبت ضرور آئی تھی، اگرچہ نتیجہ یہ رہا کہ اپنے قیام کے آخری دن تک بھی مجھے دار العلوم کے احاطہ میں جگہ نہیں مل سکی لیکن یہ خیال مجھے کبھی نہ ہوا کہ حضرت مہتمم صاحب نے بے توجہی برتی، بلکہ میرا تأثر ہر دفعہ یہی رہا کہ ان کو تو میرے ساتھ بڑی ہمدردی اور بڑی مربیانہ فکر ہے لیکن اتفاق سے کوئی جگہ ہی نہیں نکل سکی، یا نیچے کے حضرات نے دوسرے لوگوں کو ترجیح دی اور میں محروم رہا۔

بہرحال حضرت مہتمم صاحب کا رویہ اس قدر مشفقانہ تھا کہ اُن کی طرف سے دل میں شکایت کی کبھی لہر بھی نہیں پیدا ہوئی۔

ایک دفعہ طلبہ میں دار العلوم کے بعض انتظامی کارکنوں کے کسی نامناسب طرزِ عمل سے برافروختگی پیدا ہوئی، لیڈرانہ مزاج رکھنے والے کچھ طالب علموں نے اس کو ایک احتجاجی تحریک کی شکل دینے کی کوشش شروع کی۔ حضرت مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب نے طلبہ کو جمع کر کے خطاب فرمایا ___ ان کی اس تقریر کے یہ الفاظ اب تک اس عاجز کے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

"سن لو! تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں۔ تم ہی میری اولاد ہو، تمہارے ہی ساتھ جی رہا ہوں، انشاء اللہ تمہارے ہی درمیان رہتے ہوئے مروں گا، تم ہی میری تجہیز و

...... تکفین کرو گے، تم ہی میری نماز جنازہ پڑھو گے، تم ہی مجھے دفن کرو گے۔

اس طرح اپنا کے خطاب کرنے کے بعد تنبیہ بھی خوب فرمائی اُس وقت بالکل ایسا محسوس ہوا کہ شاید سب کے دلوں کا غسل ہو گیا۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کوئی رسمی قسم کے واعظ اور خطیب نہیں تھے لیکن بڑی ٹھوس مدلل اور دلنشین تقریر فرماتے تھے۔ میں نے ان سے بہتر کسی سے مسلک جماعت دیوبند کی ترجمانی نہیں سُنی۔

میری طالب علمی کے آخری سال میں پنجاب کے ایک بہت بڑے پیر صاحب، جو ایک ایسی درگاہ کے صاحب سجادہ تھے جس کا حلقۂ اثر وعقیدت وہاں کی درگاہوں اور گدیوں میں غالباً سب سے زیادہ وسیع ہوگا، دارالعلوم تشریف لائے۔ یہ پیر صاحب پنجاب کے اکثر سجادہ نشینوں کی طرح بے علم نہیں تھے، بلکہ صاحب علم تھے لیکن اندازہ کیا جاتا تھا کہ اگرچہ ان کے دل میں اکابر علماء دیوبند کا احترام ہے اور وہ بریلوی ذہن کے قطعاً نہیں ہیں تاہم کسی نہ کسی درجہ میں جماعت دیوبند کے بارہ میں اُس قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں جن میں ناخدا ترس مخالفین کے پروپیگنڈہ سے بہت سے ناواقف مخلص حضرات بھی مبتلا ہو جاتے ہیں ــــــ دو تین دن اُن کا قیام دارالعلوم میں رہا، ایک دن غالباً اُن کے بعض رفقاء کی یہ خواہش معلوم ہونے پر کہ وہ یہاں کے حضرات اکابر سے کچھ سننا اور مستفید ہونا چاہتے ہیں، حضرت پیر صاحب کے اعزاز واکرام میں دارالعلوم کی طرف سے ایک خاص جلسہ ہوا، اس میں حضرت الاستاذ العلامہ سید محمد انور شاہ کشمیری اور حضرت مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری نے بھی خطاب فرمایا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے مدلل انداز میں اور بڑے مؤثر و دلنشین طریقہ پر اپنے اکابر کے مسلک و مشرب کی وضاحت فرمائی۔

جہاں تک یاد رہ گیا ہے اُس کا حاصل اور خلاصہ یہ تھا کہ ــــ ہم اور ہمارے اکابر عقائد اور اصول میں طریقہ اہل السنۃ والجماعۃ کے متبع ہیں اور پوری طرح مطمئن ہیں کہ وہی طریقہ ما انا علیہ واصحابی کا مصداق ہے۔

فروع میں ہم پوری بصیرت کے ساتھ فقہ حنفی کا اتباع کرتے ہیں اور اتباعِ ہوی اور اعجاب کل ذی رأی برأیہ کے اس دور میں عام امت کے دین کی حفاظت کے لیے اور فتنوں سے ان کو بچانے کے لیے ائمہ کی تقلید شخصی کو ہم پورے شرحِ صدر کے ساتھ ضروری سمجھتے ہیں۔

اور حضرات صوفیاء کرام کی نسبت احسانی اور تزکیۂ اخلاق کو ہم روح دین سمجھتے ہیں۔

ان تینوں اصولی باتوں پر حضرت مہتمم صاحب نے پوری تفصیل اور بھرپور استدلال کے ساتھ روشنی ڈالی تھی۔ خاص کر تقلید شخصی کے بارہ میں جو کچھ اُس تقریر میں فرمایا تھا وہ بہت ہی بصیرت افروز اور اطمینان بخش تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر آج تک کبھی میں نے ایسی اطمینان بخش نہ کوئی تحریر پڑھی نہ کسی کی تقریر سنی۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس دور میں صرف دار العلوم کے مہتمم اور انتظامی افسر ہی نہیں تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پوری جماعت کے زعیم و قائد ترجمان اور گویا غیر رسمی امیر کا مقام بھی ان کو حاصل تھا۔ ہر اہم معاملہ میں وہی پالیسی طے فرماتے تھے اُن کو اطمینان رہتا تھا کہ پوری جماعت دار العلوم میرے ساتھ ہے اور یہ اطمینان برحق ہوتا تھا مگر افسوس ہے کہ آخری دور میں جماعت کی وحدت اور یگانگت کو نظر لگ گئی، باہمی اعتماد و اتحاد کی خاص برکات اٹھ گئیں اور اُن کی جگہ اختلاف و انتشار کے نامبارک اثرات نے لے لی۔ اور جب صحابۂ کرام کی مقدس جماعت بھی نزاعِ باہمی کے خداوندی امتحان سے نہ بچ سکی تو کون طبقہ اور کون گروہ ہو سکتا ہے جو اس ابتلاء و امتحان سے ہمیشہ محفوظ رہنے کا استحقاق رکھتا ہو۔ یفعل اللہ ما یشاء ویحکم ما یرید۔

۱۳۴۷ھ میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد مولینا حبیب الرحمٰن صاحب عہدہ اور منصب کے لحاظ سے بھی دار العلوم کے مہتمم قرار پا گئے تھے لیکن اس کے بعد صرف ایک سال کے قریب حیات رہے اور ۱۳۴۸ھ میں وفات پا گئے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین۔

نئی مطبوعات

ہندوستان اسلامی عہد میں | از مولانا حکیم سید عبدالحئی رحؒ۔ مترجمہ مولوی شمس تبریز خاں صاحب
صفحات ۲۷۲ سائز ۲۰×۲۶ مجلد قیمت : دس روپے
ناشر :- مجلس تحقیقات و نشریات اسلام۔ پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی رائے بریلویؒ (متوفی ۱۹۲۳ء) ہندوستانی مصنفین کی اُس صف میں ہیں جس پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علمی اور تحقیقی ذوق کا خاص میدان ہندوستان کی اسلامی تاریخ تھی۔ لکھتے عام طور پر عربی میں تھے۔ اپنے پیچھے اچھا خاصہ کتب خانہ غیر مطبوعہ چھوڑا جو رفتہ رفتہ اشاعت پذیر ہو چکا ہے بلکہ بعض کتابیں اردو کے قالب میں بھی آگئی ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی مصنف کی اصل کتاب "جنۃ المشرق و مطلع النور المشرق" کا ترجمہ ہی ہے جس میں مسلم عہد حکومت کے ہندوستان کی پوری تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس عہد کے ہندوستان کی انتظامی تقسیم کیا تھی اور اس تقسیم میں مرکزیت اور شہرت کن شہروں اور قصبوں کو حاصل تھی؟ آئین حکومت اور نظم سلطنت کیا تھا اور مختلف دوروں میں اس کے اندر کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ عہدوں اور دفاتر کے نام کیا تھے؟ فوجی نظام کی صورت تھی؟ عدالتی نظام کس ڈھنگ کا تھا۔ مالیات اور محاصل آئین کیا تھا۔ سلاطین کا رہن سہن اور درباروں کے رنگ ڈھنگ کیا تھے؟ مواصلات، رفاہ عام اور آرائش وطن کے لیے سلاطین نے کیا اصلاحات، ایجادات اور کارنامے انجام دیے ہیں؟ اس عہد کی مشہور مساجد، مدرسے، مقابر و مزارات نیز امام باڑے، یہ تمام باتیں زیادہ تر ایک ڈکشنری یا ڈائرکٹری کے انداز میں اس کتاب میں آگئی ہیں۔ تاریخی مذاق رکھنے والوں کے کام کی چیز ہے۔ عام لوگوں کو دلچسپی کم ہی ہو سکے گی۔

کتاب پر مقدمہ مصنف کے فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اصل کتاب

کا شروع کا کچھ حصہ اردو خواں حضرات کے لیے غیر ضروری سمجھ کر ترجمہ میں چھوڑ دیا گیا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ شروع میں ایک ایسے باب کی کمی محسوس ہوتی ہے جس میں ہندوستان میں مسلم فاتحین کی آمد، ان کا عہد حکومت اور ان کے مختلف خاندانوں کا کچھ تعارف کرایا گیا ہو۔

کتاب میں قدرتی طور سے اشخاص کے نام بکثرت ہیں مگر تعارفی نوٹوں کا التزام نہیں تھا جس کی کم از کم ایک عام قاری کو ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ شفاخانوں کے ضمن میں "دار الشفاء لکھنؤ" کا تذکرہ ہے جس میں لکھا ہوا ہے کہ یہ شفاخانہ اب تک جاری ہے" یہ بات مصنف کے زمانے میں صحیح تھی مگر اب تو اس "دار الشفاء" کے معنی کچھ اور ہی ہو گئے ہیں، پر لکھنؤ کے معاملہ ہونے کے باوجود اس پر کوئی نوٹ نہیں۔ اس طرح کتاب کو اپٹوڈیٹ بنانے اور اس کے تمام رجال کو تعارف مہیا کرنے کا ایک ضروری کام ہماری رائے میں رہ گیا ہے جو کم از کم ایک "مجلس تحقیقات" کی طرف سے شائع ہونے والی کتاب میں ضروری تھا۔

مکاتیب گیلانی

مرتبہ: مولانا منت اللہ رحمانی

صفحات ۴۰۰۔ کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ خوبصورت پلاسٹک کور کے ساتھ

ناشر: دار الاشاعت رحمانی۔ خانقاہ رحمانی مونگیر (بہار)

مولانا گیلانی نور اللہ مرقدہٗ ہمارے عہد کی نادرۂ روزگار شخصیتوں میں تھے۔ خدا مولانا منت اللہ صاحب رحمانی کو جزائے خیر دے کہ آپ کے مکتوبات کا ایک ذخیرہ مرتب کر کے آپ کے افادات کے سلسلے میں ایک گرانقدر اضافہ کر دیا ہے۔ یہ اس ذخیرہ کی جلد اول ہے جس میں ۷۰ مکتوب آئے ہیں، شروع کے سات مکتوب چھوڑ کر باقی سب مولانا عبد الباری صاحب ندوی (سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ) یا مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ہیں۔ مولانا گیلانی جیسے صاحب قلم کے مکتوب اور مولانا عبد الباری اور سید سلیمان ندوی جیسے فضلاء وقت کے نام، ہر چند کہ ان میں کچھ ذاتی بھی ہوں مگر مطالعہ کی چیز ہونے ہی چاہئیں۔ علمی، دینی، تاریخی اور ادبی ہر نوع کی افادیت قارئین کو ان میں ملے گی۔

مولانا منت اللہ صاحب نے ان مکاتیب کو صرف جمع کرنے اور مرتب کر کے چھاپ دینے کی خدمت انجام نہیں دی ہے بلکہ دو خاص محنتیں اور بھی ان پر کی ہیں۔ جتنے بھی اشخاص اور کتابوں کے نام آئے ہیں ان سب پر تشریحی اور تعارفی نوٹ لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا کی محنت کا اندازہ اس مجموعہ کو دیکھے بغیر نہیں ہو سکتا۔ دوسرا ایک کام یہ بھی کیا ہے کہ ہر مکتوب سے اس کے مضامین اخذ کر کے نہایت مفصل فہرست مضامین بھی شروع میں دی ہے۔ کتاب پر قیمت درج نہیں ہے۔

مطالعہ از جناب ذکی کاکوروی۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۱۷۶ مجلد قیمت -/۴

"تجلیات" " " " " ۲۴۰ " -/۵

ناشر:- مرکز ادب اردو، شاہ گنج ۱۳۴ لکھنؤ ۳

ذکی صاحب ایک نوجوان ادیب ہیں۔ اپنے کلام کے کئی مجموعے تیار کر دینے کے علاوہ غزل انسائیکلو پیڈیا اور نظم انسائیکلو پیڈیا شائع کر کے ایک خاص شہرت کے مالک بن چکے ہیں۔ زیر نظر دونوں کتابیں ان کی تازہ تصنیف و تالیف ہیں۔

"مطالعہ" چار تنقیدی اور تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے۔ پہلا ملک کے نامور اور بزرگ ادیب مسعود حسن رضوی صاحب (لکھنؤ) کے ایک مضمون کی تردید میں جو نواب واجد علی شاہ کی داغدار شہرت کی صفائی میں لکھا گیا تھا، دوسرا خواجہ حیدر علی آتش کی شاعری پر، تیسرا کلام آتش کے ایک انتخاب کی تنقید میں اور چوتھا اودھ کے "تین حکمرانوں" کے معائب میں۔

"تجلیات" اردو کی نعتیہ شاعری کا انتخاب ہے۔ جامعیت کی اس قدر کوشش کی گئی ہے کہ ڈاکٹر اقبال کی کوئی نعت نہ ملنے پر اُن کے بعض اشعار کو ادنیٰ مناسبت ہی سے اس زمرہ میں لے لیا گیا ہے شروع میں سیرت پاک پر کسی مولانا سید عبد المجید مرحوم کا ایک طویل مضمون بھی کہیں سے لیکر شامل کیا گیا ہے۔

نگاہِ اوّلیں صفحہ ۴ کا بقیہ:-

مشنریاں ہی نہیں کہ ان کے پیچھے دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں ہیں، قادیانیوں کی چھوٹی سی ٹولی پاکستان کے پنجاب میں جس کا باطل اور ضلال پر ہونا خواص ہی نہیں عوام پر بھی واضح ہے، افریقہ کا غالباً کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں اس کے ایجنٹ نہ ہوں، اور دنیا کی کوئی ایسی اہم زبان نہیں ہے جس میں ان کا لٹریچر نہ ہو۔

مجھے بیحد شرم آتی کہ ہم اہلِ حق مسلمان کروڑوں اور بے شمار وسائل رکھنے کے باوجود ایک مستقل ...ی اور مدرس کہیں نہیں بھیج سکے، اور یہ باطل اور گمراہی کی حقیر ٹولی کس طرح اپنے کام میں نشیط ہے ہمارے ...یاں جو کچھ دعوت و تبلیغ کا کام ہو رہا ہے اس کی افادیت و اہمیت سے انکار نہیں لیکن اولاً تو دعاۃ کے ساتھ ...لین بھی چاہئیں دوسرے وقت کی ضرورت اس سے بہت زیادہ کام کا مطالبہ کرتی ہے، اور زمانہ بہت ...ی سے دوڑ رہا ہے آج جو مواقع ہیں شاید آئندہ نہ باقی رہیں گے، اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

سچے موتی
سونے چاندی کے ورق
اور ۲۶ دواؤں کا یہ مرکب
طب قدیم کے ایک نادر
نسخے سے قدیم ہی طرز پر تیار
کیا جاتا ہے
آنکھوں کی تمام بیماریوں
میں مفید
نگاہ کو قوت اور
پائیداری دینے والا
آنکھوں کی
حفاظت، شادابی
اور نکھار
کے لیے
ہماری خاص حبشی سلائی
۱۵ پیسے
تاجر حضرات
قواعد ایجنسی
طلب فرمائیں
لگتا بالکل نہیں بلکہ ٹھنڈک
اور سکون پہونچاتا ہے
ایک تولہ
-/۷
چھ ماشہ
-/۴
ڈاک خرچ
۲/۵۰
دارالفیض رحمانی
دیوبند۔ یو۔ پی
کوئی بھی تین شیشی ایک ساتھ طلب کرنے پر ڈاک خرچ معاف

Regd. No. L-353

Monthly **'ALFURQAN'** Kutchery Road, Lucknow U. P.

VOL. 41 NO. 6 **AUGUST, 73** Phone No. 25547

مرتب

عتیق الرحمن سنبھلی

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/
بنگلہ دیش سے ۸/
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت فی کاپی ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۴۱ | بابت ماہ رجب و شعبان ۱۳۹۳ھ مطابق ستمبر ۱۹۷۳ء | شمارہ ۷-۸

اگر اس دائرہ میں ○ سرخ نشان ہو، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع، راکتوبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری :- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت :- الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو، اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

محمد منظور نعمانی

بزرگانِ دین اور خاص کر اُن میں سے جو اکابر و اعاظم ہیں مثلاً حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ اور حضرت خواجہ علاء الدین صابر کلیریؒ ان کے مزارات پر عرس کے نام سے جو میلے لگتے ہیں اُن میں غلیظ سے غلیظ اور خبیث سے خبیث قسم کا جو فسق و فجور ہوتا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے، شہروں شہروں سے پیشہ ور طوائفیں پہونچتی ہیں اور پھر وہ سب کچھ وہاں ہوتا ہے جو فسق و فجور کے مخصوص بدنام بازاروں میں ہوتا ہے۔ ع "آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں"۔

لیکن جو کھلا شرک ان درگاہوں میں ہوتا ہے اور دین کی حقیقت سے جاہل لوگ ان بزرگانِ دین سے جس طرح حاجتیں اور مرادیں مانگتے ہیں اور جس طرح نذریں مانتے اور چڑھاتے ہیں، جس شخص کو قرآن پاک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کا کچھ بھی علم ہو وہ اس سے یقیناً واقف ہوگا کہ اللہ جل جلالہ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ شرک ہر قسم کے خبیث سے خبیث فسق و فجور سے بڑی مجرمانہ معصیت ہے۔ قرآن مجید میں اعلان فرمادیا گیا ہے۔

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر	اللہ تعالیٰ شرک کو ہرگز نہ بخشے گا اور اس کے سوا
ما دون ذالک لمن یشاء	دوسرے گناہ جس بندہ کے چاہے گا بخش دے گا۔

گزشتہ مہینے رجب میں اس عاجز کا گجرات میں سورت، راندیر وغیرہ جانا ہوا تھا، وہاں ایک صاحب نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ کے عرس کا ایک اشتہار دکھایا جو ان کے پاس ڈاک سے پہونچا تھا۔ اس پر شائع کرنے والے صاحب کا نام پتہ اس طرح چھپا ہوا ہے۔

"پیرزادہ مولوی سید عبدالرحمن گدی نشین خادم خواجہ صاحب ...... درگاہ شریف، اجمیر"

اس اشتہار میں ایک صفحہ پر عرس کا دعوت نامہ اور نذر و نیاز کے لیے رقم جمع کر کے بھیجنے کی اپیل ہے، اور اس کے لیے منی آرڈر کا ایک فارم بھی منسلک ہے جس پر مندرجہ بالا پتہ انگریزی میں چھپا ہوا ہے) اور دوسرے صفحہ پر حضرت خواجہ کے ۱۹۹ اسمائے پاک کا وظیفہ لکھا گیا ہے۔ اس وظیفہ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اشتہار ہی کے الفاظ میں پڑھ لیجئے۔

"حضرت خواجہ خواجگان خواجہ معین الدین چشتی سلطان الہند قدس سرہ کے ۱۹۹ اسمائے پاک کا وظیفہ جو تمام مشکلات کے حل کے لیے نہایت کامیاب

اور آزمودہ ہو جو عقیدتمند اس وظیفہ کو خلوص دل سے پڑھیں گے وہ حضرت
خواجہ کی زیارت با برکت سے شرف اندوز ہوں گے اور دینی و دنیاوی مقاصد
میں کامیاب ہوں گے مگر اس وظیفہ کو شروع کرنے سے پہلے حضرت
خواجہ کی روح پر فتوح کی خوشنودی اور دعا کی مقبولیت کے لیے
حسب توفیق ہدیہ توشہ پیش کیا جائے۔ وہ ہدیہ توشہ بذریعہ منی آرڈر
یا پوسٹل آرڈر یا بذریعہ رجسٹری دعاگو کے پتہ پر ارسال فرماکر سعادتمندی
سے بہرہ اندوز ہوں۔ دعاگو کی اجازت کے بغیر یہ وظیفہ ہرگز نہ پڑھیں۔"

اس کے آگے خواجہ صاحب کے وہ "۹۹ اسمار پاک" بھی لکھے ہیں، افسوس ہو کہ جگہ کی تنگی کی وجہ سے
وہ سب یہاں درج نہیں کیے جا سکتے۔ ان میں سے بعض معنوی لحاظ سے نہایت مہمل اور بے تکے ہیں ۔ مثلاً
عتقاء اللہ معین الدین، علماء اللہ معین الدین، خلفاء اللہ معین الدین، شرفاء اللہ معین الدین، سقداء اللہ
معین الدین، — ان میں یہ اسمار بھی ہیں — اوّل معین الدین، آخر معین الدین، ظاہر معین الدین، باطن
معین الدین، غفار معین الدین، ستار معین الدین، — اس طرح کے ناموں سے ۹۹ کی گنتی پوری کی گئی ہے
اور ایک لمبا وظیفہ بنایا گیا ہے۔

حدیث شریف میں اللہ تعالیٰ کے اسمار حسنیٰ کی تعداد ۹۹ بتلائی گئی ہو اور وہ بطور وظیفہ کے بھی پڑھے جاتے ہیں لیکن
خواجہ صاحب کے ناموں کا وظیفہ پڑھنے والوں نے ان کے لیے ۹۹ نام بھی کافی نہیں سمجھے بلکہ پورے ۱۹۹ نام بنائے۔
اس مشرکانہ ذہنیت کی مثال اگلی امتوں میں شاید ہی مل سکے۔

اور یہ سب کچھ توحید کے اس داعی اور منادی کے ساتھ اور اس کے نام پر ہو رہا ہو جسکی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ
یہی ہے کہ اس نے بتکدۂ ہند میں توحید کی اذان دی اور ہزاروں لاکھوں ایسے بندوں کو جو شرک میں گرفتار
تھے اور اپنی حاجتیں اور مرادیں غیر اللہ سے مانگتے اور اُن کے ناموں کا وظیفہ جپتے تھے سب طرف سے ہٹا کر
اُس خدائے واحد سے وابستہ کر دیا اور اسکے نام کا وظیفہ خواں بنا دیا جسکے وہ خود پرستار اور نام لیوا تھے۔

اللہ نے جن کو عقل و دانش اور نورِ ہدایت کا کوئی ذرہ دیا ہو وہ سوچیں کہ حضرت خواجہ قدس سرہٗ کی روح
پاک کے ساتھ اس سے زیادہ تکلیف دہ کوئی مذاق ہو سکتا ہے؟ — اور یہ سب کچھ ہے کے لیے بس منی آرڈر
اور پوسٹل آرڈر وصول کرنے کے لیے — قرآن پاک میں حق ارشاد فرمایا گیا ہے:-

اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ
یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ

ناظرین کرام! الفرقان سے متعلق ایک نہایت اہم نوٹ رسالے کے آخری صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں!

حقیقتِ دُعا

مولانا عبدالغفار حسن: استاذ الحدیث جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

دُعا انسانی فطرت کا تقاضا ہے

انسان دنیاوی خوش حالی اور مادی ترقی کی بنا پر خواہ اپنے رب سے کتنا ہی دور ہو جائے اور غفلت و نسیان کے کتنے ہی دبیز پردے اس کے دل پر پڑ جائیں، بہر حال مصائب کے ہجوم میں بے ساختہ فریاد اور دُعا کے لیے اس کے ہاتھ اٹھ ہی جاتے ہیں۔ قرآن حکیم نے اس فطری تقاضے کو کئی جگہ بیان کیا ہے۔ فرمایا:

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَسَّهُ.

پ ۱۱ سورہ یونس آیت (۱۲)

جب انسان کو تکلیف پہونچتی ہے تو وہ کروٹ پر لیٹے بیٹھے یا کھڑے (ہر حال میں)، ہم کو پکارے چلا جاتا ہے، پھر جب ہم اس کی تکلیف کو دور کر دیتے ہیں تو ایسا (بے پرواہ ہو کر) چل دیتا ہے گویا اس تکلیف کے (دور کرنے کے) لیے جو اس کو پہونچ رہی تھی ہم کو (کبھی) اس نے پکارا ہی نہ تھا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا

وہی خدا ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے (سفر کی سہولتیں مہیا کرتا ہے)، یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ لوگوں کو

جَآءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوٓا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ، لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ○ فَلَمَّآ أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ

(پ ۱۱ سورہ یونس ع ۳ آیت (۲۲)

خوش گوار ہوا کی مدد سے لے کر چلتی ہیں اور لوگ ان کی رفتار سے خوش ہوتے ہیں کہ ناگاہ کشتی کو تیز تند ہوا کا جھونکا لگتا ہے اور پانی کی لہریں ہر طرف سے چڑھ آتی ہیں اور وہ گمان کر بیٹھتے ہیں کہ اب تو (بری طرح) گھیرے میں آن پھنسے ہیں تو ایسے موقع پر خلوص دل سے خدا ہی کی بندگی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے دعائیں مانگنے لگتے ہیں (کہ اے پروردگار) اگر تو ہم کو اس سے نجات دے تو ہم ضرور ہی تیرے شکر گزار ہوں گے، لیکن پھر جب وہ ان کو اس بلا سے نجات دے دیتا ہے تو وہ خشکی پر پہونچتے ہی ناحق طور پر سرکشی کرنے لگتے ہیں۔

دعا کی فضیلت و اہمیت

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام اور اپنے دوسرے برگزیدہ بندوں کا نمایاں وصف یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ اپنے رب کے حضور دعا کرتے ہیں، فرمایا:-

يَدْعُونَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا

(سورہ انبیاء (پ ۱۷)، آیت ۹۰)

وہ ہم کو رغبت اور خوف سے پکارتے ہیں

دعا کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے،

أُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ

(پ ۲۴ سورہ المومن آیت (۶۰)

مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔

حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الدعاء هو العبادة (مسند احمد، ترمذی) دعا ہی عبادت ہے، دوسری حدیث میں ارشاد ہے الدُّعاء مخ العبادة (ترمذی) (دعا، عبادت کا مغز اور گودا ہے) ایک موقع پر آپ نے فرمایا الدُّعاء سلاح المؤمن (مستدرک حاکم) (دعا مومن کا

رکھا ہے) اور فرمایا لیس شیئ اکرم علی اللہ من الدعاء (ترمذی) (اللہ تعالیٰ کو دعا سے بڑھ کر کوئی چیز عزیز نہیں ہے)

ایک حدیث میں ہے من لم یسئل اللہ یغضب علیہ (ترمذی) (جو اللہ تعالیٰ سے سوال و دعا نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے)

کسی نے کیا خوب کہا ہے

لاتسئل بنی آدم حاجۃ ۔۔۔ واسئل الذی ابوابہ لاتحجب

اللہ یغضب ان ترکت سوالہ ۔۔۔ وابن آدم حین یسئل یغضب!

یعنی انسان کے سامنے اپنی ضرورت کے لیے ہاتھ نہ پھیلاؤ، اس سے مانگو جس کے فضل و کرم کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔ اگر بندہ اپنے رب سے مانگنا چھوڑ دے تو وہ ناراض ہوتا ہے لیکن انسان کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، جب کوئی اس سے مانگتا ہے تو وہ غضبناک ہو جاتا ہے۔

روحِ دعا دعا کے لطف سے صحیح معنی میں انسان اسی وقت آشنا ہو سکتا ہے جبکہ وہ اپنے اندر وہی کیفیت طاری کرلے جسے شاہ ولی اللہؒ نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

وروح الدعاء ان یری کل حول وقوۃ من اللہ ویصیر کالمیت فی ید الغسال وکالتمثال فی ید محرک التماثیل ویجد لذۃ المناجاۃ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۵) یعنی دعا کی روح یہ ہے کہ دعا کرنے والا ہر قوت و حرکت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھے، اور اس کی قوت و عظمت کے مقابلے میں اپنے آپ کو اس طرح بے کس اور بے بس سمجھے جس طرح مردہ غسال کے ہاتھوں میں، یا بے جان صورتیں حرکت دینے والے کے قبضے میں (مجبور محض) ہوتی ہیں۔ اور پھر اس کیفیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مناجات اور سرگوشی کی لذت اسے حاصل ہو۔

دعا کے آداب و شرائط لیکن روحِ دعا کی یہ کیفیت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ قبولیت دعاء کے ان شرائط و آداب کو ملحوظ رکھا جائے جو قرآن و سنت میں وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، اس کی مثال ظاہری جسمانی علاج کی طرح ہے، بیمار دوا کے ذریعہ شفایاب اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ ان شرائط و ہدایات کو ملحوظ رکھے جو معالج نے بتائی ہیں اور ان چیزوں سے پرہیز کرے جن سے بچنے کا اس نے حکم دیا ہے، محض دوا کا استعمال ہی کافی نہیں ہے، یہی حال

اس روحانی علاج کا ہے۔ قرآن و حدیث کی دعائیں باطنی اور ظاہری امراض کے لیے اسی وقت مفید ہوسکتی ہیں جبکہ ان کے اثر کو قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد بھی مریض میں موجود ہو، اور پرہیز و احتیاط کے ان تمام تقاضوں کو بھی پورا کرے، جو اس راہ میں ناگزیر ہیں۔

قبولیت دعا کے شرائط

(۱) اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر ایمان کامل، قرآن حکیم میں ارشاد ہے:۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ، اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ۔

پ سورہ بقرہ آیت (۱۸۶)

اور (اے پیغمبر) جب میرے بندے میرے بارے میں تم سے دریافت کریں تو (ان کو سمجھادو) میں ان سے قریب ہوں، میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے تو چاہیے کہ وہ میری بات مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ ہدایت پائیں۔

(۲) داعی کا دل اخلاص، انابت، حضور قلب اور سوز یقین سے معمور ہو۔ قرآن میں ارشاد ہے:

فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ

(سورہ اعراف ۲۹)

عبادت کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے دعا کرو۔

حدیث میں ہے:

ادعوا اللہ وانتم موقنون بالاجابة واعلموا ان اللہ لا یستجیب دعاءً من قلب غافلٍ لاہٍ (ترمذی)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت کا یقین رکھتے ہوئے اس سے دعا کرو، اور یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ غافل بے پرواہ دل کی دعا کو شرف قبولیت نہیں بخشتا۔

(۳) کسب حلال کا اہتمام کیا جائے، حرام کمائی کے ساتھ دعا بارگاہ الٰہی میں مقبول نہیں ہوتی، حدیث میں ہے:۔

یطیل السفر اشعث اغبر یمد یدیہ الی السماء یارب یارب و

انسان دور دراز مقام کا سفر کرتا ہو پراگندہ حال غبار آلود صورت میں اپنے ہاتھ آسمان

مطعمه حرام و مشربه حرام و	کی طرف اٹھاتے ہوئے کہتا ہے۔ اے رب!
ملبسه حرام و غذی بالحرام فانی	اے رب! حالانکہ اس کا کھانا حرام ہے، پینا
یستجاب لذالک	حرام ہو، لباس حرام ہو اور اس کے گوشت
مشکوٰۃ ص ۲۴۱ بحوالہ صحیح مسلم	پوست کی پرورش حرام مال سے ہوئی ہے تو
	ایسی حالت میں دعا کیسے قبول ہو۔

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو کسب حلال کا حکم دیا ہے، فرمایا:۔

یَا اَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبَاتِ	اے رسولو! پاکیزہ رزق کھاؤ اور نیک
وَاعْمَلُوْا صَالِحًا۔ پ سورہ مومنون آیت ۵۲	اعمال کرو۔

مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے:۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُلُوْا مِنْ	اے ایمان والو! جو ہم نے تمہیں پاکیزہ رزق
طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ پ سورہ بقرۃ آیت (۱۷۲)	دیا ہے اس میں سے کھاؤ۔

(۴) کبائر سے پرہیز، مثلاً مکر و فریب، غیبت، چغلی، حسد، تکبر، کینہ سے اپنے نفس کو پاک رکھے۔ اس قسم کے روحانی اور اخلاقی امراض کے ہوتے ہوئے یہ ناممکن ہے کہ دعا بارگاہ خداوندی میں پہونچنے کے لیے بلند مدارج طے کر سکے، جیسا کہ ارشاد ہے:۔

اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ	اسی کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور
الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ (پ ۲۲ سورہ فاطر آیت ۱۰)	نیک اعمال کے ذریعے بلند مدارج طے کرتے ہیں۔

یعنی عمل صالح کے ذریعہ پاک کلمات خدا کے ہاں مقبولیت کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی بنا پر نیک اعمال کو وسیلہ بنا کر دعا کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، جیسا کہ غار والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تین شخص کہیں جاتے ہوئے باد و باراں کے طوفان میں گھر گئے۔ انھوں نے ایک غار میں پناہ لی، اتفاق سے ایک چٹان لڑھک کر غار کے دہانے پر گر پڑی اور باہر نکلنے کا راستہ بند ہو گیا، اس موقع پر ہر ایک نے اپنی دعا میں اپنے سابق نیک عمل کو پیش کر کے اس قید سے نجات حاصل کی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو صحیح بخاری، مشکوٰۃ، باب الرحمۃ والشفقۃ علی الخلق ج ۲ ص ۴۲۱۔ ظاہر ہے کہ جب نیک عملی دعا کی قبولیت کا سبب بنتی ہے تو بدعملی اس راہ کی رکاوٹ بنے گی۔

دعا کے باطنی اور ظاہری آداب

قرآن مجید میں دعا کے آداب کی طرف مندرجہ ذیل آیت میں رہنمائی کی گئی ہے۔

اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ، وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا، وَادْعُوهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا إِنَّ رَحْمَتَ اللهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ۔

(سورۂ اعراف آیت ۵۶)

اپنے رب کو عاجزی کے ساتھ گڑگڑاتے ہوئے پوشیدہ پکارو، بلاشبہ وہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں اصلاح کے بعد فساد برپا مت کرو اور اسے خوف و طمع (دونوں قسم کے ملے جلے جذبات) کے ساتھ پکارو... بے شک اللہ کی رحمت محسنوں سے قریب ہے۔

اس آیت میں صراحۃً اور اشارۃً دعا کے چھ آداب بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) دعا کے وقت تضرع، خشوع اور عاجزی و انکساری انسان کی ہر ہر حرکت اور ادا سے نمایاں ہو، اس کا دل اپنے رب کی عظمت و جلال سے پوری طرح بھرپور ہو۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی توقع اور اس کے عذاب کے اندیشے سے ملے جلے جذبات دل میں امید و بیم کی ایک اضطرابی کیفیت پیدا کیے ہوئے ہوں۔

اسی خصوصیت کو دوسری آیات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ۔

سورۂ انبیاء، آیت ۹۰

بیشک وہ (انبیاء کرام) نیکیوں میں سبقت کرتے تھے اور ہم کو رغبت و خوف کے ساتھ پکارتے تھے اور وہ ہمارے سامنے عاجزی کرنے والے تھے۔

تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا۔

(پ ۲۱ سورہ سجدہ آیت ۱۶)

ان کے پہلو خوابگاہوں سے الگ ہو جاتے ہیں۔ وہ ڈرتے ہوئے امید رکھتے ہوئے اپنے رب کو پکارتے ہیں۔

قرآن مجید میں مومنین صالحین کی صفات میں خوف اور طمع دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے،

کیونکہ ان دونوں کی یکجائی ہی سے انسان میں توازن اور اعتدال پیدا ہو سکتا ہے، اگر انسان کے سامنے صرف اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت اور فضل و کرم ہی کا تصوّر ہو تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہ سراپا امید بن کر گناہوں پر دلیر نہ ہو جائے، اور اگر عذاب ہی کا نقشہ پیش نظر رہے تو مایوسی اور قوت عمل کے تعطل کا قوی اندیشہ ہے۔

حافظ ابن قیمؒ نے اس حقیقت کو ایک لطیف مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے وہ فرماتے ہیں:۔

"یوں سمجھنا چاہیے کہ اس دنیا کے سفر میں خوف بمنزلہ کوڑے اور تازیانے کے ہے، اور امید حدی خوانی کی حیثیت رکھتی ہے، اس سے سفر کی مشقتیں بآسانی برداشت ہو سکتی ہیں، محبت رہنما کے درجہ میں ہے جو سواری کی نکیل تھامے ہوئے ہے، اگر سوار کے پاس سواری کو قابو میں رکھنے کے لیے کوڑا نہ ہو تو یہ بھی راہ سے ہٹ جانے اور پگڈنڈیوں میں بھٹک جانے کا قوی امکان ہے، اس خوف کے تازیانے کے بغیر حدود الٰہیہ کی حفاظت ناممکن، اور گمراہی یقینی ہے، خوف، رجا اور محبت سے جو دل بھی خالی ہوگا اس کی اصلاح کی کبھی بھی توقع نہیں کی جا سکتی، اور جس قدر یہ صفات کمزور ہوں گی اسی لحاظ سے ایمان میں بھی ضعف نمایاں ہوگا۔" بدائع الفوائد ج ۳ ص ۱۵

(۳) دعا میں جہاں تک ہو سکے اخفاء سے کام لیا جائے یعنی چپ چپاتے اور آہستگی سے اپنے رب کے حضور میں سرگوشی اور مناجات کی جائے۔ دعا کا اصل ادب یہی ہے الا یہ کہ کسی موقع پر خود شارع ہی نے بلند آواز سے دعا کرنے کا حکم دیا ہو۔

حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ سری اور جہری دعا کے درمیان ستر گنا فرق ہے۔ بدائع الفوائد ج ۳ ص ۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی سری دعا کو اللہ تعالیٰ نے مقام مدح میں ذکر فرمایا ہے:۔

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا — جب اس نے اپنے رب کو پوشیدہ طور پر چپ چپاتے پکارا (پارہ ۱۶ سورہ مریم آیت ۳)

سری دعا کے فوائد و منافع بجائے خود نہایت اہم اور اثر انگیز ہیں۔

(الف) دعا کا یہ طریقہ ایمان و یقین کی پختگی کو بتلاتا ہے کیونکہ داعی یہ ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی سرگوشیوں کو بھی سنتا ہے، اس کا حال اس شخص کا سا نہیں ہوتا جو یہ خیال کرتا ہے کہ اگر ہم بلند آواز سے دعا کریں تو اللہ تعالیٰ سنتا ہے ورنہ نہیں۔

(ب) ادب و تعظیم کے لحاظ سے بھی یہی طریقہ موزوں ہے، دنیا میں بادشاہوں اور حاکموں کے

درباروں میں گفتگو کرتے ہوئے ضرورت سے زیادہ آواز بلند کرنا گستاخی اور خلافِ ادب قرار دیا جاتا ہے۔ پھر وہ خدا جو ہلکی سے ہلکی آواز بھی سُن لیتا ہے، اس کے حضور میں تو سرّی دعا اور زیادہ مناسب ہے۔

(ج) یہ صورت خشوع وخضوع اور گریہ وزاری کے لحاظ سے بھی زیادہ موزوں ہے، یہ ادا دعا کی روح اور مغز ہے، ایسے موقع پر دعا کرنے والے کا حال اس عاجز و مسکین کا سا ہوتا ہے جس کا دل ٹوٹ چکا ہے اعضاء ڈھیلے پڑ چکے ہیں، آواز پست ہو گئی ہے، یہاں تک کہ عاجزی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ زبان گویائی کی تاب نہیں ہے۔ اب حال یہ ہے کہ دل آہ وزاری کے ساتھ دعاء ومناجات میں مشغول ہے اور زبان انتہائی عاجزی اور مسکینی کی بنا پر خاموش ہے، یہ رقت انگیز منظر آواز بلند کرنے کی صورت میں حاصل نہیں ہو سکتا۔

(د) اس شکل میں ریاکاری اور نمائش پسندی کے بجائے اخلاص کا پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔

(ہ) پوری یکسوئی اور دل جمعی کے ساتھ بندہ اپنے رب سے راز و نیاز کا موقع پاتا ہے، بلند آوازی سے یکسوئی اور جمعیتِ خاطر پراگندہ ہو جاتی ہے، جس قدر آواز پست ہو گی اسی قدر خدا سے لگاؤ اور تعلق میں اضافہ ہو گا۔

(و) پست آوازی میں ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ بندہ اپنے رب سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے گویا وہ اس طرح سرگوشی کر رہا ہے جس طرح ایک قریبی دوست اپنے دوست سے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کی سرّی دعا کی مدح فرمائی ہے۔

بندہ جس قدر حضورِ قلب کے ساتھ خدا کو پکارے گا اسی لحاظ سے اس کو اپنے رب کا قرب حاصل ہو گا اور جب یہ تصور دل میں جم جائے گا کہ وہ ہر قریب سے بھی زیادہ قریب ہے تو نہایت رازداری سے اپنی درخواست اس کی بارگاہ میں پیش کرے گا، ایسے موقع پر بلند آوازی پسندیدہ نہ ہو گی، ظاہر ہے کہ اگر ہم نشین ساتھی آہستہ گفتگو سن لیتا ہے تو ایسی صورت میں بلند آواز سے چیخنا چلانا عام طور پر معیوب سمجھا جائے گا۔

اس امر کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ صحابہؓ نے ایک سفر میں بلند آواز سے تکبیر کہنا شروع کر دی تھیں تو آپ نے ارشاد فرمایا! ارحموا علی انفسکم "اپنے اوپر رحم کرو" تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے ہو، تم ایسی ہستی کو پکار رہے ہو جو سننے والی اور تم سے انتہائی قریب ہے، جتنی سواری کی گردن تم سے قریب ہے اس سے کہیں زیادہ وہ تم سے قریب ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے دریافت کیا کہ ہمارا خدا ہم سے قریب ہے کہ اس سے سرگوشی کریں یا دور ہے کہ زور سے اور بلند آواز سے پکاریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مندرجہ بالا سوال و جواب سے یہ واضح ہوا کہ سِرّی دعا اللہ تعالےٰ کو بہت زیادہ پسند ہے۔

(ز) سِرّی دعا کی شکل میں سوال و طلب کا سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہ سکتا ہے۔ نہ زبان تھکتی ہے اور نہ اعضا پر بوجھ پڑتا ہے، جہر (بلند آوازی) کی صورت میں زبان اور اعضاء جلد ساتھ چھوڑ دیتے ہیں

(ح) پست آوازی کی شکل میں شیطانی وساوس، موانع اور رکاوٹوں سے محفوظ رہ سکتا ہے کیونکہ اس طرح ارواح خبیثہ اور شیاطین انس و جن اس کے طرز عمل سے بے خبر رہیں گے اور اپنے فتنے پھیلانے کے مواقع نہ پا سکیں گے، جن لوگوں کو اس بات کا تجربہ ہے وہ اس فائدے سے انکار نہیں کر سکتے۔

(ط) خدا کی سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کی طرف کامل یکسوئی اور پوری توجہ کے مواقع حاصل کر سکے، اس نعمت سے بڑھ کر دوسری نعمت اور کیا ہو سکتی ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ کوئی نعمت، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، حاسدوں کی نگاہ سے نہیں بچ سکتی، پھر اس اعلیٰ نعمت پر حاسدین کا پیدا ہو جانا بعید از قیاس نہیں ہے۔ ایسی صورت میں حاسد کی شر۔ بار نگاہوں سے بچنے کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ اس نعمت کو پوشیدہ رکھا جائے۔ اس کا چرچہ نہ کیا جائے۔

اسی بنا پر یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام سے فرمایا تھا۔

لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلٰى اِخْوَتِكَ — اپنے خواب اپنے بھائیوں سے نہ کہنا ورنہ وہ

فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا (پ ۱۲ سورہ یوسف) — کوئی چال چلیں گے۔

کتنے ہی ایسے صاحب دل بار سا گزرے ہیں جو اپنی اس نعمت کو ظاہر کر کے اطمینان قلب کی نعمت سے محروم ہو گئے۔ اسی لیے اس راہ کے سالک کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالےٰ سے تعلق، اور مناجات کے نتیجے میں جو احوال و کیفیات محسوس ہوں ان کو پوشیدہ ہی رکھا جائے، خصوصاً اس راہ کے مبتدی کے لیے تو یہ پابندی نہایت ہی ضروری ہے۔ ہاں جن لوگوں میں یہ ربانی کیفیات اور روحانی

احوال پوری طرح راسخ ہو جائیں اور جم جائیں اور ان کو تیز و تند ہواؤں سے اس پاکیزہ درخت کی مضبوط جڑوں کے اکھڑنے کا اندیشہ نہ رہے تو پھر عوام کی اتباع اور پیروی کے لیے اس حالت کے ظاہر کرنے میں حرج نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دعا، طلب، تمنا، محبت، انابت اور توجہ الی اللہ جیسے عظیم القدر مضامین پر مشتمل ہوتی ہے، اس لیے اخفاء کا پہلو زیادہ غالب رہنا چاہیے۔

(ی) دعا کو ذکر بھی کہتے ہیں۔ اس میں طلب و سوال کے ساتھ حمد و ثنا بھی ہوتی ہے، ربانی اوصاف و اسماء کا بیان بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ذکر کو دعا بھی کہا جاتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے افضل الدعاء الحمد للہ، یعنی بہترین دعا الحمد للہ ہے۔ الحمد للہ محض حمد ہے۔ بظاہر اس میں طلب و سوال کی کوئی آمیزش نہیں معلوم ہوتی، لیکن اس کو دعا اس لیے کہا گیا کہ یہ معنوی طور پر محبت اور ثناء کو شامل ہے اور محبت طلب محبوب کی بلند ترین انواع میں سے ہے بلکہ طالب حاجت سائل کی بہ نسبت عابد اور ذاکر زیادہ اس بات کا حقدار ہے کہ اس کو داعی (صاحب دعا) قرار دیا جائے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ دعا اور ذکر دونوں ایک دوسرے کو شامل ہیں اور ذکر کے آداب میں واضح طور پر ارشاد ربانی ہے۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ	یعنی اپنے رب کو اپنے دل میں گڑگڑا کر اور
خِيفَةً وَّدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ (اعراف رکوع ۲۴)	ڈر کر بغیر آواز بلند کیے یاد کرو

(۴) دعا کا چوتھا ادب یہ ہے کہ دعا مانگنے میں حد سے زیادہ تجاوز نہ کیا جائے۔ یہ ادب قرآن کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ اس اعتداء (حد سے بڑھنے) کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(الف) دعا میں ایسی چیزیں طلب کرنا جن کا داعی اہل نہیں ہے، مثلاً انبیاء کرام کے درجات و مراتب مانگنا۔

(ب) ابوداؤد کی روایت ہے کہ عبداللہ بن مغفل نے اپنے بیٹے کو کہتے ہوئے سنا کہ اے خدا میں تجھ سے جنت کے داہنی جانب سفید محل کا طالب ہوں۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے بچے! بس اللہ تعالیٰ سے جنت طلب کرو اور جہنم سے پناہ مانگو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ میری امت میں

ایسے لوگ ہوں گے، جو طہارت اور دعا میں حد سے بڑھ جائیں گے۔

(ج) حرام کاموں پر نصرت کی طلب۔

(د) اللہ تعالیٰ سے ایسی آرزو کرنا جو وہ پوری نہیں کرتا، مثلاً قیامت تک کی زندگی یا بشری ضروریات کھانے پینے سے بے نیازی حاصل ہو جانا یا یہ سوال کہ بلا شادی بیاہ کے اولاد حاصل ہو جائے اس قسم کے تمام سوالات جو اللہ تعالیٰ کی حکمت، شریعت اور اس کے بنائے ہوئے قوانین فطرت کے خلاف ہوں، اعتداء (حد سے بڑھنے) میں شمار ہوں گے۔

(ہ) ابن جریجؒ کا قول ہے کہ چلا چلا کر دعا کرنا بھی اعتداء میں داخل ہے۔

(و) سب سے بڑا اور خطرناک "اعتداء" یہ ہے کہ بندہ دعا و عبادت میں غیر خدا کو بھی شریک کر لے اور ان سے اسی طرح مدد طلب کرے جس طرح خدا سے طلب کی جاتی ہے۔

(ز) دعا میں تضرع اور عاجزی کے بجائے بے پروائی یا شانِ تغافل کا اظہار کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح بابِ اجابت وقبولیت نہیں کھلتا، بلکہ انسان رحمت خداوندی سے دور تر ہو جاتا ہے۔

(ح) دعا یا عبادت میں ایسے طریقے اختیار کرنا جو شریعت سے ثابت نہیں ہیں۔

(ط) دعا میں بہ تکلف سجع (قافیہ بندی) کا اہتمام بھی اعتداء ہی کی ایک شکل ہے۔ ہاں اگر بلا تکلف موزوں کلمات زبان پر جاری ہو جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے! ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا انظر السجع من الدعاء واجتنبه دعا میں قافیہ بندی سے پرہیز کرو، صحابہ کرامؓ کا یہ طرز عمل نہ تھا (صحیح بخاری، مستدرک حاکم، احیاء العلوم غزالی ج ۱ ص ۳۱۴)

(۵) مذکورہ بالا آیات میں ذکر دعا کے آداب بتلاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:۔

لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا زمین میں اصلاح اور درستگی کے بعد فساد اور بگاڑ نہ پیدا کرو

آیت کے سیاق وسباق سے یہ لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ، مفسدین فی الارض کی دعا بارگاہ خداوندی میں شرفِ قبولیت حاصل نہیں کر سکتی فساد فی الارض (اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی اور غیر اللہ کی طرف دعوت) اس راہ کی بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے نہ دعا و مناجات میں لطف و سکون حاصل ہو سکتا ہے اور نہ حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسان ہمکنار

ایک دوسری روایت میں دعا کی قبولیت کے اثرات تین قسم کے بتلائے گئے ہیں:۔

ما من مسلم یدعو بدعوۃ لیس فیہا اثم ولا قطیعۃ رحم الا اعطاہ اللہ بہا احدی ثلٰث، اما ان یعجل لہ دعوتہ و اما ان یدخرہا لہ فی الاٰخرۃ و اما ان یصرف عنہ من السوء مثلہا قالوا اذاً نکثر قال اللہ اکثر۔ (مسند احمد)	مسلمان کی دعا قبولیت کے لحاظ سے تین حال سے خالی نہیں ہے بشرطیکہ دعا میں کوئی ایسی چیز نہ طلب کی جائے جو گناہ یا قطع رحمی کی موجب ہو (۱) اللہ تعالیٰ دنیا ہی میں بندے کو وہ کچھ عنایت فرما دیتا ہے جس کا وہ آرزومند ہے (۲) دعا کو آخرت کے لیے ذخیرہ بنا دیتا ہے (۳) مطلوبہ بھلائی کے ہم پلہ کسی برائی یا تکلیف کو اس سے دور فرما دیتا ہے، اس پر صحابہ کرام نے عرض کیا تب تو ہم خوب کثرت سے دعا کریں گے۔ آپ نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کونسی کمی ہے اس کا فضل وکرم بھی بے شمار ہے۔

(۹) فراخی ہو یا تنگ دستی ہر حال میں اپنے رب سے دعا اور طلب کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔ یہ انتہائی خودغرضی کی نشانی ہے کہ مصیبت اور پریشان حالی میں تو خدا کو پکارا جائے لیکن جب راحت و آرام اور خوشحالی حاصل ہو جائے تو خدا کو بھول کر دنیا کی آسائشوں اور تفریحات میں انسان گم ہو جائے۔ یہ کردار تو قرآن نے کفار و مشرکین کا بیان کیا ہے۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّہٗ مُنِیْبًا اِلَیْہِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَہٗ نِعْمَۃً مِّنْہُ نَسِیَ مَاکَانَ یَدْعُوْٓا اِلَیْہِ مِنْ قَبْلُ۔ (پ ۲۳ سورہ زمر۔ ع ۵)	اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے پروردگار کی طرف رجوع ہو کر اس کو پکارتا ہے پھر جب خدا اس کو اپنی طرف سے نعمت عطا فرما دیتا ہے، تو جس دعرض کے لیے اس نے پہلے (خدا کو) پکارا تھا اس کو بھلا دیتا ہے۔

اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یستجیب اللہ	جس شخص کو یہ بات بھلی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ

ہو سکتا ہے۔

(۶) آداب دعاء بتلاتے ہوئے آخر میں یہ بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:۔

اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ۔	بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی رحمت صاحب احسان افراد سے بہت ہی قریب ہے۔

احسان کی تعریف حدیث میں اس طرح آتی ہے۔

اَنْ تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہٗ یراک۔	اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو (یہی حقیقت ہے کہ) اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

دعا کے وقت اگر احسان کی یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو رب العٰلمین سے سرگوشی کی حقیقی لذت حاصل نہیں ہو سکتی۔ دعا کا لطف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت، خوف، محبت اور ہیبت وجلال دل پر چھا جائے اور ایسا محسوس ہو کہ بندہ اپنے رب کے حضور آمنے سامنے ہو کر عرض معروض کر رہا ہے۔

لیکن یہ صفت احسان اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ انسان اخلاص اور اتباع شریعت دونوں کو اپنی زندگی کے ہر عمل میں جاری وساری کرے۔

(۷) اُن اوقات واحوال میں دعا مانگنے کا خاص طور پر اہتمام کیا جائے جن میں دعاء کے مقبول ہونے کی تصریح احادیث میں مذکور ہے (ان احوال واوقات کی تفصیل آئندہ صفحات میں بیان ہوگی انشاء اللہ)

(۸) دل میں یہ خیال نہ پیدا ہو کہ دعا کرتے کرتے تھک گیا ہوں لیکن دعا ہے کہ کسی طرح قبول ہونے ہی میں نہیں آتی۔ اس قسم کے گلے شکوے کی پرچھائیں کبھی دل پر نہیں پڑنی چاہیے۔

حدیث میں ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

یستجاب لاحدکم مالم یعجل فیقول قد دعوت فلم یستجب لی۔	تم میں سے کسی کی دعا اس وقت قبول ہوتی ہے جبکہ وہ جلد بازی سے کام نہ لے۔ دعا کرنے والا کہتا ہے میں نے دعا کی لیکن وہ قبول نہیں ہوتی۔

لَہٗ عِنْدَ الشِّدَائِدِ فَلْیُکْثِرِ الدُّعَاءَ فِی الرَّخَاءِ۔ (ترمذی)

و مصائب میں اللہ تعالیٰ اس کی دعا اور فریاد سنے تو اُسے چاہیے کہ راحت اور فارغ البالی کے زمانے میں بھی خدا کو خوب یاد رکھے اور اس سے دعا مانگنے میں کوتاہی نہ کرے

(۱۰) دعا کے وقت اپنی حاجت و ضرورت اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں پیش کرنے سے پہلے حمد و ثنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کا اہتمام ضروری ہے۔ دعا سے قبل دو رکعت نفل نماز کی ادائیگی بھی مسنون ہے۔ حدیث میں ہے:۔

من کانت لہ حاجۃ الی اللہ تعالیٰ او الی احدٍ من بنی آدم فلیتوضأ ولیحسن وضوئہ ثم لیصلّ رکعتین ثم یثن علی اللہ عزّ وجلّ ویُصلّ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ ترمذی، مستدرک حاکم

جس کسی شخص کو اللہ تعالےٰ یا کسی انسان سے ضرورت و حاجت پورا کرانے کا معاملہ در پیش ہو تو اسے چاہیے کہ پہلے وضو کرکے دو رکعت نماز پڑھے پھر اللہ تعالےٰ کی حمد و ثنا بجا لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام بھیجے و اس کے بعد اپنی ضرورت خدا کے حضور عرض کرے)

(۱۱) دعا کرتے وقت عزم و یقین کا پہلو غالب ہونا چاہیے یعنی بندے کو یہ اعتماد ہونا چاہیے کہ اللہ تعالےٰ اس کی عرض معروض ضرور سنے گا۔ حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لا یقل احدکم اذا دعا اللھم اغفرلی ان شئت اللھم ارحمنی ان شئت لیعزم المسئلۃ فانہ لا مکرہ لہٗ
بخاری، مسلم

دعا کرتے وقت تم میں سے کسی کو یہ نہیں کہنا چاہیے "اے اللہ بخش اگر تو چاہے، رحم فرما اگر تیری مرضی ہو۔ بلکہ سوال کا انداز عزم و یقین لیے ہونا چاہیے کیونکہ خدا کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

ان شئت کہنے میں بظاہر بندے کی طرف سے شان بے نیازی کا اظہار بھی ہو جاتا ہے اس لیے اس قسم کے الفاظ سے پرہیز ہی ضروری ہے۔

(۱۲) خدا کی رحمت و نعمت کی طلب خاص اپنے ہی لیے نہ کی جائے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک بدو کہہ رہا تھا۔

اللھم ارحمنی و محمدا ولا ترحم معنا احدا۔ اے اللہ مجھ پر رحم فرما اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ہمارے علاوہ اور کسی پر رحم نہ فرما۔

(آپ نے یہ سُن کر فرمایا) لقد تحجرت واسعاً تو نے تو خدا کی کشادہ رحمت کو تنگ کر دیا ہے (صحیح بخاری)

اسی طرح اگر کوئی شخص امام ہے اور وہ دعا کرتے وقت مقتدیوں کو نظر انداز کر کے محض اپنا ہی خیال رکھتا ہے تو یہ طرزِ عمل بھی خیانت کے ہم معنی ہے جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے:۔ لا یؤم الرجل فیخص نفسہ بالدعاء دونھم فان فعل فقد خانھم۔ (ترمذی)

(۱۳) دعا میں اپنی ضرورت پیش کرنے سے پہلے اپنے گناہوں کا اقرار و اعتراف ضروری ہے جیسا کہ حضرت آدمؑ نے فرمایا تھا رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ اسی طرح مسنون دعاؤں میں یہ الفاظ ملتے ہیں رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْماً کَثِیْراً یعنی اے رب میں نے اپنی جان پر (تیری نافرمانی کر کے) بہت ہی ظلم کیا ہے۔

(۱۴) دعا کرتے وقت ہاتھ اٹھانا بھی مسنون ہے جیسا کہ حدیث میں ہے آپ نے فرمایا۔

اِنَّ اللہَ حَیِیٌّ کَرِیْمٌ یَسْتَحْیِیْ اذا رفع الرجل یدیہ ان یردھما صفرا خائبتین۔ اللہ تعالیٰ فضل و کرم اور حیاء و شرم والا ہے جب کوئی اس کی بارگاہ میں دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتا ہے تو اسے خالی ہاتھ واپس لوٹانے میں شرم آتی ہے۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ

دعا کے بعد دونوں ہاتھوں کا چہرے پر پھیر لینا بھی مسنون ہے (ترمذی۔ ابوداؤد)

(۱۵) جب کہ انسان غصہ کی حالت میں ہو یا بول و براز کی حاجت محسوس کر رہا ہو تو ایسے اوقات میں دعا کرتے وقت دلجمعی حاصل نہیں ہو سکتی اسی لیے اس قسم کے حالات سے پاک صاف اور بالاتر ہو کر دعا میں مشغول ہونا چاہیے۔

(۱۶) دعاء کے وقت آسمان کی طرف نگاہ اٹھانے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے:۔

لینتھین اقوام عن رفع ابصارھم الی السماء عند الدعاء او لتخطفن لوگ اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھانے سے باز آجائیں ورنہ ان کی نگاہیں اچک لی

الصارهم　　(صحیح مسلم)　　جائیں گی۔

(۱۷) دعا یا کلمات کو بار بار دہرایا جائے۔ حدیث میں ہے :۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا دعا کرر ثلاثا	آپ جب دعا فرماتے تو تین بار دہراتے۔

(۱۸) چھوٹی چیز ہو یا بڑی خدا ہی سے مانگے، حدیث میں ہے آپ نے فرمایا :۔

لیسئل احدکم ربّہ حاجۃ کلھا	تم میں سے ہر ایک اپنی تمام حاجتیں اپنے رب
حتی یسئل شسع نعلہ اذا انقطع	ہی سے طلب کرے یہاں تک کہ اگر چپل کا تسمہ
(ترمذی)	بھی ٹوٹ جائے تو وہ بھی اسی سے مانگے۔

(۱۹) دعا کے خاتمہ پر آمین کہنا بھی مسنون ہے، حدیث میں ہے آپ نے فرمایا اوجب إن ختم بآمین۔ (آپ نے ایک شخص کو دعا کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا) اگر اس نے دعا کو آمین کے ساتھ ختم کیا تو لازماً اس نے اپنا مدعا حاصل کر لیا۔

اوقاتِ دعا یوں تو اللہ تعالیٰ ہر وقت، ہر آن اپنے بندوں کی فریاد سنتا اور ان کی دعا قبول فرماتا ہے لیکن کچھ خاص اوقات ایسے ہیں جن میں دعائیں بہت جلد مقبول ہوتی ہیں اور اپنا اثر دکھاتی ہیں۔

(۱) سب سے زیادہ اعلیٰ اور مقبول ترین وقت رات کا پچھلا حصہ ہے اس کے بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہے :۔

اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ	بلاشبہ رات کا اٹھنا (نفس کو) کچلنے اور (رب
وَطْأً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا۔	تعالیٰ سے) گفتگو اور سرگوشی کے لیے بہت ہی
پ ۲۹۔ سورہ مزمل	زیادہ موزوں ہے۔

ایسے سناٹے میں وقت میں میٹھی نیند اور نرم و گرم بستر چھوڑ کر اپنے رب سے مناجات کے لیے اٹھنا انتہائی سعادت اور خوش نصیبی کی نشانی ہے۔

حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

ینزل ربنا کل لیلۃ الی سماء الدنیا	اللہ تعالیٰ ہر رات آسمانِ دنیا پر نزولِ اجلال
حتی یبقی ثلث اللیل الآخر فیقول	فرماتا ہے یہاں تک کہ جب رات کا پچھلا تہائی
من یدعونی فاستجیب لہ، من	حصہ باقی رہ جاتا ہے تو فرماتا ہے کہ کون مجھے پکارتا

یسئلنی فاعطیہ من یستغفرنی	ہے کہ میں اس کی دعا قبول کروں کون مجھ سے مانگتا
فاغفرلہ۔	ہے کہ میں عطا کروں، کون مجھ سے مغفرت چاہتا
(بخاری، مسلم)	ہے کہ میں اُسے معاف کردوں۔ (ترمذی)

(۲) جمعہ کی شب میں بھی ایک ایسی ساعت ہے جس میں دعا قبول ہوتی ہے (۳) جمعہ کے دن میں بھی ایک ساعت ایسی ہے جس میں اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتا ہے (بخاری مسلم) بعض روایات میں متعین طور پر عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت بتلایا گیا ہے (۴) شب قدر۔ قرآن و حدیث میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے (۵) اذان اور (۶) اقامت کے وقت (۷) اور اذان و اقامت کے درمیان دعا قبول ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔

ثنتان لا تردّ ان الدعاء عند النداء وعند الباس (ابوداؤد) دو چیزیں رد نہیں کی جاتیں، دعا، اذان اور جہاد کے وقت

(۸) جہاد فی سبیل اللہ میں صف بندی کے وقت دعا قبول ہوتی ہے جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث میں عند الباس کا لفظ آیا ہے۔

(۹) فرض نمازوں کے بعد بھی دعا کی مقبولیت کا وقت ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ امام کے سلام پھیر لینے کے بعد مقتدی دعا کرنے میں امام کی اتباع کریں، اسی طرح سلام پھیرنے کے فوراً بعد بغیر اذکار مسنونہ پڑھے ہاتھ اٹھا کر دعا بھی سنت سے ثابت نہیں ہے۔

(۱۰) سجدے کی حالت میں دعا قبول ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔

اقرب مایکون العبد من ربہ	یعنی سجدے کی حالت میں بندہ اپنے رب
وھو ساجد فاکثروا الدعاء	سے بہت ہی قریب ہوجاتا ہے تو ایسی
	حالت میں خوب دعا مانگا کرو۔

(۱۱) تلاوت قرآن یا ختم قرآن مجید کے موقع پر دعا قبول ہوتی ہے، حدیث میں ہے۔

من قرء القرآن فلیسئل اللہ بہ	جو قرآن پڑھے اسے قرآن کے واسطے سے
فانہ سیجی اقوام یقرؤن	اپنے رب سے مانگنا چاہیے، عنقریب
القرآن یسئلون بہ الناس۔	ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن پڑھ کر

لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے۔ (ترمذی)

(۱۲) عرفہ کے دن دعا قبول ہوتی ہے، حدیث میں ہے خیر الدعا یوم عرفة (ترمذی)

(۱۳) ماہ رمضان میں خصوصاً افطار کے وقت دعا قبول ہوتی ہے۔

حدیث میں ہے تین قسم کے لوگ ہیں جن کی دعا رد نہیں ہوتی ان میں سے ایک روزہ دار ہے جو افطار کے وقت اپنے رب کے حضور دعا کرتا ہے۔

(۱۴) بارش کے وقت، بارش میں کھڑے ہو کر دعا مانگی جائے تو قبول ہوتی ہے۔

(۱۵) ذکر الٰہی کے لیے مسلمان جمع ہوں تو یہ وقت قبولیت دعا کے لیے سازگار ہے (نزول الابرار)

یہ مقامات زیادہ تر وہ ہیں جن کا تعلق مناسک حج سے ہے۔

دعا کے مقامات

(۱) بیت اللہ شریف یعنی اس کے قریب یا اس کے اندر (۲) مسجد نبوی میں (۳) بیت المقدس (۴) رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان مُلتزم پر دعا قبول ہوتی ہے (طبرانی) (۵) صفا مروہ پر (۶) جہاں سعی کی جاتی ہے (۷) میدان عرفات میں (۸) مزدلفہ میں (۹) تینوں جمرات کے پاس (۱۰) منیٰ میں (۱۱) میزاب کے نیچے (۱۲) مقام ابراہیم کے پیچھے

مندرجہ ذیل افراد کی اللہ تعالےٰ دعا قبول فرماتا ہے۔

مستجاب الدعوات افراد

(۱) مظلوم مضطر یعنی مظلوم اور بے قرار پریشان حال بندے کی اللہ تعالےٰ دعا قبول فرماتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ۔ (کیا ہے کوئی جو بیقرار کی فریاد سے جبکہ وہ اسے پکارے اور ہے کوئی جو اس کی تکلیف کو دور کر دے)

یعنی یہ خصوصیت صرف اللہ تعالےٰ ہی کی ہے۔

(۲) باپ کی دعا بیٹے کے بارے میں (۳) مسافر، حدیث میں ہے: ثلاثة لیستجاب الوالد المسافر، المظلوم (ترمذی) (۴) نیک اولاد کی دعا ماں باپ کے حق میں (بزار) (۵) روزہ دار (۶) انصاف پسند حاکم کی دعا (ابن حبان، ابن خزیمہ) (۷) مسلمان کی دعا اپنے غیر حاضر مسلمان بھائی کے حق میں (ترمذی) (۸) گناہ سے توبہ کرنے والے کی دعا (۹) آیت کریمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ پڑھنے کے بعد دعا قبول ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔

لم يدع بها رجل مسلم فی شیئ قط الا استجیب له یہ آیت کریمہ جو مسلمان پڑھے گا اس کی دعا قبول ہوگی۔

(۹) حاجی جب تک سفر میں ہوتا ہے اس کی دعا قبول ہوتی ہے (حصن حصین)

(۱۰) رات کو جاگے تو لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک له له الملك وله الحمد وھو علی کل شیئ قدیر پڑھ کر دعا کرے تو اس کی دعا قبول ہوگی (بخاری، ترمذی)

دعا کے اثرات و ثمرات دعا اگر بارگاہ الٰہی میں قبول ہو جائے تو اس سے بڑھ کر سعادت اور خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے یہ تو بڑا ہی اعلا مقام ہے۔ دعا اگر بظاہر قبول بھی نہ ہو تب بھی اپنے رب سے اس بہانے مناجات اور سرگوشی کی جو نعمت حاصل ہو جاتی ہے وہ کیا کچھ کم سعادت ہے۔

پھر اس دعا کے نتیجے میں مومن بندے کو تسکین روح اور اطمینان قلب کی جو دولت حاصل ہوتی ہے اس کی برکتوں کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ سنو اللہ تعالیٰ کے ذکر ہی سے دل اطمینان وسکون سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

یہ وہ دولت ہے جس کے لیے بھرپور خزانوں والے سرمایہ دار اور وسیع اختیارات رکھنے والے ارباب اقتدار بھی ترستے ہیں لیکن یہ نعمت ملتی اسی کو ہے جو ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور حُبِّ رسول کی دولت سے مالامال ہو۔ اللھم اجعلنا منھم واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

نوٹ:- مندرجہ بالا مضمون میں دعا میں اخفا اور سر کے بارے میں جو کچھ محترم مقالہ نگار نے تحریر فرمایا ہے وہ بجائے خود صحیح ہے لیکن اس بحث میں بعض دوسرے پہلو اور گوشے بھی ہیں جن کا ذکر اس مقالے میں نہیں آیا ہے انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں اس بارے میں کچھ وضاحت کر دی جائے گی جس سے معلوم ہو گا کہ کن حالات اور موقعوں پر دعا میں جہر صحیح اور ثابت ہے۔

(الفرقان)

بوئے گل در برگِ گل

حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلویؒ اپنے مکتوبات کے آئینے میں

تلخیص ترجمہ ——— از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب ۹۹ یہ ایک طویل تحریر بصورت رسالہ ہے جس کے چند اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

بعد حمد وصلوٰۃ ——— فقیر عبد اللہ معروف بہ غلام علی عفی عنہ تحریر کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے ——— الدین النصیحۃ (یعنی دین خیر خواہی کا نام ہے)۔ بس میں اپنے دوستوں کو وصیت کرتا ہوں کہ طریقہ نقشبندیہ اصحاب کرام رضی اللہ تعالے عنہم کے طریق کے موافق ہے (اس سلسلے کے بزرگوں نے اتباع سنت اور اجتناب از بدعت کو ضروری قرار دیا ہے، اگرچہ وہ بدعت بقیدہ (بدعت حسنہ) ہی کیوں نہ ہو۔

.... الیوم اکملت لکم دینکم (آج کے دن میں نے تمہارا دین کامل کر دیا) اس آیت کی رو سے دین متین کمال پا چکا ہے ...... بس عقائد و اعمال، اخلاق و احوال اور صدقِ معاملات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں، حصولِ نسبت مع اللہ کے لیے کافی ہیں۔

احوال نام ہے باطن طالب پر دوام سکینہ اور انوار و کیفیات کے وارد ہونے کا ...... تہذیب اخلاق، حاصل سیر و سلوک ہے چنانچہ ایک حدیث شریف تحصیلِ مکارمِ اخلاق کی اہمیت ظاہر

کرتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے بُعثت لاتمم مکارم الاخلاق (میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں)

اپنے احوال پر غور کرو کہ کون سی بُری خصلت تم پر غالب ہے پس نفی و اثبات سے اُس بُری خصلت کا ازالہ کرو۔ مثلاً حسد کی اپنے دل سے بذریعہ لا نفی کرو، اس طریقے سے کہ لا الٰہ نہیں ہے حسد مجھ میں الا اللہ مگر حُبّ الٰہی چند دن میں نورِ ذکرِ الٰہی کی برکت سے حسد زائل ہو جائے گا اسی طرح ہر خوئے بد انوارِ ذکر سے چھپ جائے گی اور ختم ہو جائے گی اور ذکر و یاد داشت کے غلبہ سے جبکہ وہ تمام ظاہر و باطن کا احاطہ کرلیں، تمام بُرے خصائل زوال پذیر ہو جائیں گے ___ حسد، بغض، بخل، دناءت، حُبِّ جاہ، تکبر، سُمعہ و ریا، عُجب، تعلق بغیر اللہ، حرص، ہوا و ہوس، طول آرزو، یادہ گوئی، غیبت اور عیب بینی یہ تمام رذائل ہیں ان سے پرہیز لازم ہے۔ جو عمل تم سے ہو اُس کو حقیر جانو کہ نہ معلوم نفس نے اُس میں نیت بد اور عُجب وغیرہ سے کیا کچھ ملا دیا ہو اور جو عمل نیک دوسرے مسلمان سے ہوا ہو اُس کو بڑا سمجھو کہ اس نے نہ معلوم اُس عمل خیر میں کیسی اچھی نیت کی ہوگی اور درگاہِ الٰہی میں بسبب اخلاص وہ کتنی قدر و منزلت رکھتا ہوگا۔ سلفِ صالحین مثلاً حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے عقائد کا اتباع کرنا چاہیے ___ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں سوائے اچھائی کے لب نہ کھولے جائیں۔ اُن کے نفوس نے فیض صحبتِ خیر الاخیار صلی اللہ علیہ وسلم سے تہذیب کامل پائی تھی اور نفسانیت سے پاک و صاف ہو گئے تھے ___ ان حضرات کے تمام معاملات نیتِ صالحہ سے تھے ورنہ لازم آتا ہے کہ حضرتِ خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ مبارکہ نے اُس جماعت کے اندر کوئی تاثیر پیدا نہیں کی، جس نے خدا و رسول کے راستے میں جان و مال کی بازی لگا دی تھی اور قرآن مجید نے جس جماعت کی تعریف کی ہے اور بشارت دی ہے ___ اُن حضرات کے دلوں سے اگر محبت دنیا نہ گئی تو ہم پسماندگان کے لیے اس کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا دین، اُن کے عقائد و اعمال، اُن کے اخلاق اور خدا و رسول کا کلام نیز مناقب اہل بیت رضی اللہ عنہم ہم تک پہنچائے ہیں، اُن کی تفسیق و تکفیر کی صورت میں معاذ اللہ دین سے اعتماد اُٹھ جائے گا ___ وہ دین جس کو فساق و فجار نے پہنچایا ہو اس پر وثوق و اعتماد نہیں کیا جا سکتا ___ اصحاب کرام رضی اللہ عنہم آپس میں ایک تھے آیت شریفہ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ شانِ اصحاب کرام میں وارد ہے رُحماء رحیم کی جمع ہے جو صیغۂ مشبہ ہے اور صفت مشبہ دوام پر

دلالت کرتی ہے پس اُن کی آپس کی اُلفت و دوستی اس آیت شریفہ سے ثابت ہوئی ــــ "وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنیٰ" انھیں کے بارے میں ہے وعدہ حسنیٰ نیکوں کے واسطے ہوتا ہے۔ رضی اللہ عنہم ــــ واجب ہے کہ صحابہ کے باہمی واقعات میں سکوت اور عدم خوض کیا جائے ــــ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کی رعایت کرتے ہوئے کہ ان سب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرفِ صحبت و قرابت حاصل ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جمیع قبائل عرب سے قرابت تھی ــــ مشائخ متقدمین کے لیے جو متاخرین پر اپنا حقِ تلقین و تربیت رکھتے ہیں ــــ فضیلت ثابت ہے ــــ ان اکابر کا پاس ادب لازم ہے ایک سلک کو دوسرے سلک پر، ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد پر اور ایک طریقے کو دوسرے طریقہ پر (خواہ مخواہ) ترجیح نہ دینی چاہیے۔ سب اکابر کی نیتیں نیک تھیں ــــ اُن کا مطمحِ نظر، اتباعِ سنت اور رضائے الٰہی تھا ــــ کسی مسلمان کی تحقیر نیز عیب بینی، سخن چینی، چغلخوری اور اپنے آپ کو کچھ سمجھنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اپنے کو محض عدم خیال کرنا، اپنے کمالات کو اصل کے سپرد کرنا، اپنے حسنات کو قابل قبول نہ سمجھنا، اپنے سیئات کو ایک پہاڑ کی طرح اپنے سر پر محسوس کرنا، دوسرے کی برائیوں کو تاویل کر کے نیکی جاننا، وقائع روزمرہ کو ارادہ حق سبحانہ سے سمجھنا اور چون و چرا کے ساتھ لب کشائی نہ کرنا، نیز کسی سے (بے ضرورت) بحث و جدال نہ کرنا چاہیے۔ اس نوعیت کی تکرار کہ تم کہو بات اس طرح ہے، مخالف کہے اس طرح ہے، دلوں کو آزردہ کرتی ہے ــــ بلکہ مخالف جب ضد کرے اور کہے امر واقعہ یوں ہے، تم کہو ہاں ٹھیک ..... اس سے آگے بات نہ بڑھے تاکہ فتنہ و غوغا پیدا نہ ہو اور دل مکدر نہ ہو یہ اہل معرفت رحمۃ اللہ علیہم کا طریقہ ہے ــــ نقل ہے کہ چند درویش حضرت شیخ فریدالدین شکر گنج قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے درمیان ناخوشی اور ناراضگی ہے آپ ہمارا قضیہ سنیں اور فیصلہ فرمائیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہم کو مقدمات سننے کا دماغ نہیں ہے، مولانا بدرالدین اسحٰق اور بابا نظام الدین تمہارا قضیہ فیصل کریں گے۔ یہ درویش اُن دونوں بزرگوں کے پاس ایک جگہ جا کر بیٹھے اور اپنا نزاعی کلام شروع کیا، ایک نے دوسرے سے کہا آپ نے اس بارے میں ایسا فرمایا تھا، دوسرے نے کہا نہیں آپ نے ایسا فرمایا! تھا اہل منازعت نے اپنی باتوں کو بالفاظ حسن ادب بیان کیا۔ سلطان المشائخ اور مولانا بدرالدین اسحٰق بہت روئے کہ جب تمہارے حالتِ ناراضگی کے کلمات سراسر ادب اور ایکدوسرے کی تعظیم کے حامل ہیں تو درصورت خوشی و رضامندی

ایک دوسرے کی کس قدر رعایت کرتے ہو گے؟ انھوں نے حضرت گنجشکرؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ درویش ہماری اصلاح و تربیت کے لیے آئے ہیں کہ درویشوں کو آپس میں درستی اور سخت گوئی نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کی اتباع عطا فرمائے ــــ ہر ماہ کے تین روزے اور عرفہ و عاشورہ کے روزے نیز پندرھویں شعبان کا روزہ حدیث سے ثابت ہے، شوال کے چھ روزے بھی ثابت ہیں ــــ روزے میں غیبت، جھوٹ، طعن اور فضول گوئی سے احتیاط ضروری ہے ورنہ روزہ قابلِ ثواب نہ ہوگا۔ انتہٰی۔ بعد بیوقوفی ہوگی کہ بھوک اور پیاس کی سختی اٹھائے اور اِن امورِ مذکورہ سے روزہ برباد کرے۔ بعض کے نزدیک غیبت مُفسدِ روزہ ہے اور یہی مذہب امام اوزاعیؒ کا ہے ــــ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے غیبت کرنے والے کو روزہ اور وضو لوٹانے کا حکم فرمایا ہے ــــ تہمد کا ٹخنوں سے نیچے لٹکانا گناہِ کبیرہ ہے.... نسبت و جمعیت اور توجہ کا حصول بغیر اعمالِ ظاہری مُحال ہے ــــ نورِ اعمال کو اطمینانِ باطن میں پورا پورا دخل ہے۔ اندرون کو غیر کے خیال سے خالی رکھنا اور بیرون کو اعمالِ خیر اور شگفتگی و انکسار سے آراستہ کرنا، اس سے اونچا کوئی کمال نہیں ہے۔ ایسے اعمال جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث میں ثابت ہیں اُن کو لازم سمجھو تاکہ سنّتِ حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔ ع ان المحبّ لمن یحبّ مطیعٌ۔ (عاشق اپنے محبوب کا مطیع ہوا کرتا ہے) پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و عادات کی تحقیق کر کے اُن کی متابعت کرنی چاہیے۔ وہ حرکات و سکنات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی نیت سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف توجہ کر کے ادا کیے جائیں ــــ سراسر عبادت ہیں ــــ فرض کی ادائیگی میں، ادائے فرض کی نیت اور پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کی نیت کرو کہ یہ فرض اپنے اوپر فرض ہونے اور اتباعِ حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ادا کرتا ہوں ــــ ایک دوسرے کو ہدایا بھیجنا اور ملاقات کے لیے آنا جانا، گوشت اور کدو کا کھانا نیز سرکہ و شیرینی کا استعمال، دودھ اور ٹھنڈے پانی اور شہد کا پینا اور ملبوساتِ مسنونہ کا پہننا۔ یہ تمام اُمور بہ نیتِ اتباعِ رسول عبادت ہو جاتے ہیں، اور نورِ ایمان میں اضافہ کرتے ہیں کیونکہ یہ سب امور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں ــــ نمازِ تہجد و اشراق، نمازِ چاشت و اوّابین اور دیگر نوافل حدیث سے ثابت ہیں۔ بوقتِ تہجد تلاوتِ قرآن مجید اولیٰ ہے ــــ کلمۂ تمجید سَو بار، دن میں اور سبحان اللہ وبحمدہ سَو سَو بار وقتِ صبح و شام اور سَو بار سوتے وقت درود و استغفار، حدیث میں وارد ہے۔ صبح و شام کی دُعائیں، احادیثِ صحیحہ سے معلوم کر کے صبح و شام،

سوتے وقت اور غیر معیّن اوقات میں جس قدر مواظبت کر سکیں پڑھیں اور ان سب اعمال و عادات میں متابعت حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت کریں ـــــ اس طریقے میں حضرتِ حق کی طرف توجہ باطن کرنا معمول ہے۔ یہ توجہ حضرتِ حق میں دوام آگاہی ہے اور توجہ و حضورِ باطن کے بعد فاعلِ حقیقی سے افعال کا صدور سمجھنا ہے جبکہ ہر امر میں اتباعِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت کروگے اور توجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کروگے تو توجہ دو قسم کی ظاہر ہوگی پس تم کو لازم ہے کہ ان ہر دو توجہ کو حاصلِ زندگی جانو ـــــ

جو شخص ذکی ہو اور فراغت رکھتا ہو وہ علم صرف و نحو اور منطق تا قطبی اور علم کلام نیز فقہ و اصولِ فقہ پڑھے۔ درسِ علمِ حدیث اور صوفیہ کے علوم کا درس جو آدابِ اخلاق اور مقاماتِ سلوک اور احوال کے اندر رسائل کی شکل میں تالیف کیے گئے ہیں نیز مکتوبات حضرت شیخ یحییٰ منیری اور اللہ کے دوستوں کی سوانح عمریوں کا مطالعہ تہذیبِ نفس میں اثر کامل رکھتا ہے ـــــ حقائق کے متعلق رسالے چنداں مفید نہیں ہیں ـــــ اس لیے کہ جو شخص طریقت میں کوشش، مجاہدہ اور کثرتِ ذکر کرتا ہے اسرار و معارف اُس پر خود و اضح ہو جاتے ہیں ـــــ اکثر اولیاء رحمۃ اللہ علیہم جو جہد و جہد و زہد کی روش اور عبادتِ نافلہ کو لازم سمجھتے تھے اور احوال و کیفیات کا غلبہ رکھتے تھے، انھوں نے اسرار و معارف کے بیان میں سکوت اختیار کیا ہے اور یہی اسلم طریقہ ہے۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کے مطالعے سے متابعت حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی توفیق معارف کی تحقیق اور دل و جان کی روشنی حاصل ہوتی ہے نیز اُن اعتراضات کے جوابات واضح ہو جاتے ہیں جو لوگوں نے اُن کے کلام پر کیے ہیں ...... اگر عنایتِ الٰہی سے معاش مقرر اور رزق بقدر پر قناعت حاصل ہو تو اس سے بہتر کوئی راحت اور فراغت نہیں ہے ورنہ ضروریاتِ بشری کے لیے بموافق شریعت ذریعۂ معاش اختیار کرنے کو کوئی منع نہیں کرتا ـــــ اللہ تعالیٰ اس فقیر حقیر اور سب دوستوں کو اپنی یاد میں اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں مشغول رکھ کر کیفیاتِ محبت و معرفت اور ہر عمل کے حُسنِ انجام سے بہرہ یاب فرمائے۔

طریقۂ درد مندی راہِ محبت ہے اور محبت ایسا شعلۂ جانسوز ہے کہ خوف و بیم کو جلا دیتا ہے اور حصولِ محبت، دوامِ ذکر، خلوت و عزلت اور ترکِ آرزو پر موقوف ہے ...... جانبازانِ راہِ حق نے ترکِ مالوفات و مرغوبات کر کے اپنے گوہرِ زندگی کو محبوب کے قدموں پر نثار کر دیا ہے۔ اس کے بعد حضرت شیخ

عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی کثرت عبادت و تلاوت کا ذکر کرکے حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اکثر راتوں میں جاگتے تھے اور رات کے ختم ہونے پر افسوس کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ہائے رات مختصر رہی)

صوفیہ جو کہ مقربانِ بارگاہ الٰہی ہیں اُن کے طریقے کو اختیار کرنا اس لیے ہے کہ اُن کی صحبت کی برکت سے عقائد صحیحۂ اہل سنت و جماعت میں قوت و صفائی حاصل ہو اور تقدیم اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کی توفیق معاون ہو جائے احوالِ نیک، ذوق و شوق، حضور و آگاہی، یادداشت، محبتِ خدا و رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نیز التفات غیر سے دل کی خلاصی اور وہ کیفیات و معرفت وغیرہ حاصل ہو جائیں جن کو اُن بزرگوں نے بیان کیا ہے نیز اگر زواور غفلت سے دل کا تصفیہ اور رذائل سے نفس کا تزکیہ حاصل ہو جائے، اور دل کو بدعت و معصیت سے نفرت و بے تعلقی پیدا ہو جائے ورنہ مُریدی بے فائدہ ہے مُریدی اس لیے نہیں ہے کہ شفاعتِ پیرانِ کرام کے بھروسے پر بدعت اختیار کریں اور جو کچھ زبان پر آئے کہہ دیں ـــ اور افعال میں بے باکی کریں۔ الحمد للہ مشائخ کرام کے توسّل سے مخلصانِ صادق کو یہ اُمورِ صحیحہ زمانے کی ناسازگاری کے باوجود بھی حاصل ہوتے ہیں۔ نقل ہے کہ ایک بزرگ نے اللہ کی بارگاہ میں فریاد کی کہ الٰہی تیری توفیقِ فضل کی برکت سے میں اعمال و اذکار میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا ہوں لیکن جو احوال و کیفیات میری جوانی کے زمانے میں تھے اس بڑھاپے کے زمانے میں اُن کو نہیں پاتا ہوں، ہاتف غیبی نے ندا دی کہ تیری جوانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے قریب تھی" ـــ بس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے دوری ہم بعد والوں کی دوری کا موجب ہے ـــ ہم پسماندگان کے لیے مناسب ہے کہ توبہ و انابت، زہد و ورع، صبر و قناعت، توکل اور تسلیم و رضا کی رعایت کے بعد ماکولات، ترکِ ملبوسات اور ترکِ عادات میں طریقۂ اعتدال اختیار کرکے اپنے اوقات کو وظائف اعمال یعنی نماز.. تلاوت قرآن مجید درود و استغفار اور کلماتِ طیبات سے معمور رکھیں ـــ وقوفِ قلبی کے ساتھ اور قلباً و لساناً ذکر کے ساتھ ـــ خواہ اسم ذات کا ذکر ہو یا نفی و اثبات ہو ـــ اور غلط خیالات سے دل کی نگہداشت کرکے حضرت حق سبحانہ کی طرف کمالِ افتقار و انکسار کے ساتھ ـــ پوری پوری توجہ کریں اور عمر کو برکار نہ گزاریں۔

درویشی یہ ہے کہ یکجانیت کے ساتھ زندگی گزارنا، بکمالِ استقامت براتباع سنّت ـــ اور ایک طرف دیکھنا، فکر، آگاہی نیز حضور و یادداشت کو راسخ رکھنا ـــ تاکہ اہل شرع

(باقی صفحہ (۵۲) پر)

چند دن ایران میں

مشاہدات، تاثرات اور معروضات

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

(ترجمہ: مولوی نذر الحفیظ ندوی)

(رفیق محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے رابطہ عالم اسلامی کی ایک تجویز کے مطابق امسال رابطہ کے ایک وفد کے ساتھ چند اسلامی ملکوں کا دورہ کیا، جن میں افغانستان اور ایران بھی تھے۔ اسی سفر کے دوران میں مولانا نے اطلاع دی تھی کہ انھوں نے ایران کے مشاہدات و تاثرات کی روداد خاص طور سے تیار کی ہے اور آخر میں کچھ معروضات ایرانی علماء سے ہیں، یہ آخری حصہ خاص طور پر الفرقان میں آنے کا ہے۔ ذیل میں روداد سفر کا یہی حصہ کچھ خاص مشاہدات و تاثرات کے ساتھ درج کیا جا رہا ہے۔ (نعمانی)

ایران کا یہ سفر اپنی نوعیت اور اثرات و نتائج کے لحاظ سے بہت اہم تھا، ایران کی مجلسوں اور محفلوں میں اس کا خوب چرچا ہوا، ریڈیو اور ٹیلی ویژنوں کے ذریعہ بھی اس کی اشاعت ہوئی، سیر و سیاحت سے دلچسپی رکھنے والے اس جائزے سے سفر کی ایک اجمالی تصویر اپنے ذہن میں تیار کر سکتے ہیں، اور اس سفر کی تاریخی قدر و قیمت اور علمی و سماجی فوائد کا ایک عام اندازہ کر سکتے ہیں۔

سفر کے اختتام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے نقوش و تاثرات بھی پیش کر دیے جائیں اس لیے

کہ اس سفر کی صرف اس وجہ سے اہمیت نہیں ہے کہ یہ مشرق کے ایک اسلامی ملک کی سیاحت اور خیر سگالی کا دورہ تھا بلکہ اپنے اثرات ونتائج کے اعتبار سے یہ سفر تمام تاریخی سفرناموں اور آثار قدیمہ کی زیارت اور جذبہ خیر سگالی سے زیادہ نتیجہ خیز تھا۔ ہم اس موقع پر اس سفر کے ان خوشگوار اور تابناک پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں جن سے ہمیں کام کا ایک نیا میدان اور امید کی ایک نئی کرن دکھائی دیتی ہے اور جو مستقبل کے لیے فال نیک بن سکتے ہیں، ہم ایسے اہم پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کریں گے جو باعث حیرت ضرور ہوں گے مگر اس کے لیے تھوڑی سی وسیع النظری اور کشادہ دلی سے کام لینا ہوگا، ساتھ ہی کہنے والے کے خلوص و حسن نیت پر بھی اعتماد کرنا پڑے گا۔ ہمارے ایرانی بھائی عالی ظرف اور شریف النفس ہیں اس لیے توقع ہے کہ ایران کے دوران قیام ہم نے جو محسوس کیا اور ہمارے جو تاثرات ہیں وہ اس کی جرأت و صاف گوئی کا خیر مقدم کریں گے۔

ا۔ ایران کے سفر میں ہم نے جس چیز کا مشاہدہ کیا اور اس نے ہماری مسرت میں حیرت انگیز اضافہ کیا وہ ایرانیوں کا جذبۂ اخوت اور عالمگیر اسلامی اتحاد و تعاون کا طاقتور جذبہ ہے جو وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر متفق ہو کر ایک پلیٹ فارم کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم صفائی سے اعتراف کرتے ہیں کہ یہاں آنے سے پہلے ہم اتحاد و تعاون کے اس طاقتور جذبہ اور دنیا کے تمام مسلمانوں کی طرف دوستی و تعاون اور بھائی چارگی اور اپنائیت کے اس غیر معمولی احساس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے ہمیں اس بات کی بالکل توقع نہ تھی کہ ہمارے ایرانی بھائی اس عالمگیر لادینیت کے خلاف متحد ہو کر مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں جو مذاہب عالم اور تمام اخلاقی اقدار کے لیے چیلنج ہے اور جو شیعہ سنی یا حنفی شافعی اور مقلد و مجتہد کے درمیان کوئی تمیز نہیں کرتی۔ ہماری ہر مجلس کی گفتگو کا آغاز اکثر اسی موضوع سے ہوتا اور اسی پر اختتام بھی مجلسوں اور محفلوں میں عام طور سے یہی موضوع سخن ہوتا، اس سے ایرانیوں کی عالمگیر اخوت و تعاون سے دلچسپی اور قلبی شغف کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ یہ بہت مبارک اور قابل قدر جذبہ ہے، عالمگیر اسلامی اخوت سے دلچسپی رکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ ہمارے ایرانی بھائیوں کے ان مبارک اور قابل قدر جذبات سے فائدہ اٹھائیں اور اسلام کی خدمت میں اس سے کام لیں اور اس میں مزید ترقی کی کوشش کریں۔ اس لیے کہ اسلام کے حق میں غلو پسندی نے بڑی زیادتی سے کام لیا ہے، اور اختلافی مسائل میں شدت پسندی نے اس کو بڑا نقصان پہنچایا ہے ساتویں صدی ہجری کے وسط میں تو اسی اختلاف کی شدت نے بغداد میں تاریخ کے سب سے

بڑے سانحہ کو جنم دیا۔[1] اسی اختلاف اور خلوپ زی نے مسلمانوں کو یورپ فتح کرنے اور اس کے آخری حدود تک جانے میں رکاوٹ ڈالی اسی کے نتیجہ میں ہندوستان میں پہلے حکومت کمزور ہوئی پھر آخر میں بالکل ختم ہو گئی۔

۲۔ ایران کے اس سفر میں ہمیں جس چیز سے مسرت ہوئی وہ اسلامی آثار سے دلچسپی عربی زبان سے تعلق، اسلامی کتابوں کی اشاعت، علماء کے کارناموں کے احیاء اور قرآن کی بہترین کتابت و طباعت سے دلچسپی و شیفتگی ہے جس میں ایرانی دوسرے اسلامی ملکوں سے آگے ہیں۔ ایران میں نادر قرآنی مخطوطات کی حفاظت و اہتمام اور قرآن کی اعلیٰ نفیس طباعت دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایرانیوں کے دل میں اس کی عظمت اور احترام ہے۔ جلسوں وغیرہ میں قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے، خاص طور سے مصری قراء کی تلاوت کی ہوئی آیات ٹیپ ریکارڈ سے سنانے کا اہتمام ہے۔

۳۔ دینی غیرت و حمیت ایرانیوں میں بہت پائی جاتی ہے اور وہ اسلام کے خلاف سازشی تحریکوں کے معاملہ میں بڑے حساس واقع ہوئے ہیں۔ بہائیت جو ایران ہی میں پیدا ہوئی قانونی طور پر ممنوع ہے اور بہائی مذہب کے ماننے والوں کو اسلام سے خارج سمجھا جاتا ہے، اسی طرح ایرانی قادیانیت کو بھی اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں اور اس کے خلاف صف آرا ہیں کمیونزم اور دہریت کے ساتھ دشمنی میں بھی ایرانیوں کی غیرت و حمیت اسلامی ملکوں کے لیے اور خاص طور پر پاکستان کے لیے قابل رشک اور قابل تقلید ہے جس کے ایران سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔

۴۔ اعلیٰ اخلاق، لطیف جذبات، مہمان نوازی، اور غیر معمولی تواضع و انکساری یہ وہ امتیازی اوصاف ہیں، جن کا تجربہ ایک مسلم سیاح کو ایران میں قدم قدم پر ہوتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے ہی بھائیوں اور دوستوں کے درمیان اپنے ہی وطن میں ہے۔ ہمیں جس شہر میں بھی جانے کا اتفاق ہوا ہم نے وہاں حکومت کے ذمہ داروں، شہر کے شرفاء اور معززین کو اپنا منتظر اور چشم براہ پایا جب ہم شہر قم جا رہے تھے تو اگرچہ ہمیں پہنچنے میں خاصی تاخیر ہو گئی تھی لیکن ہم نے حکومت کے ذمہ داروں اور علماء و معززین کو راستہ کے دونوں طرف دھوپ میں منتظر پایا۔ اس مختصر سفر میں ہمیں اس کا بار بار تجربہ ہوا۔

آخر میں ہم اپنے ایرانی بھائیوں اور علماء و قائدین کو چند اہم امور کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

۱۔ انسان اور کائنات کی تخلیق کا بنیادی مقصد اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور صحف سماوی کے نزول کی غرض و غایت یہ تھی کہ اس دنیا میں خدائے واحد کی عبادت ہو اور اسی کو لائق پرستش

[1] شیخ سعدی شیرازی نے مسلمانوں کے اس المیہ اور تاریخ کے اس سانحہ پر جو مرثیہ کہا ہے اس کا مطلع یہ ہے:

آسمان را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں ۔۔۔ بر زوال ملک مستعصم امیر المومنیں

سمجھا جائے، محبت، اطاعت شعاری، وفاداری، فرمانبرداری، خوف خدا، گریہ وزاری اور محتاجی و بندگی کا احساس جو وہ صفات ہیں جو بندے میں خدا کو وحدہ لاشریک ماننے سے پیدا ہوتی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد یہی یہ تھا کہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق پیدا کریں اور مخلوق کے جسم و جان کو خدائی احکام کے تابع کریں اور اس کی چوکھٹ پر اس کا سر جھکا دیں۔ انبیاء علیہم کا یہی مقصد حیات، یہی تمنا و آرزو اور ان کی خوش قسمتی و سعادت کا یہی معراج کمال تھا، اسی سے ان کی روح کو راحت اور قلب کو بالیدگی حاصل ہوتی تھی وہ اس دنیا میں اس لیے تشریف نہیں لائے تھے کہ خالق و مخلوق کے درمیان سد راہ بنیں یا انسانوں کو کسی گھرانے سے منسلک اور کسی خاندان کا فرمانبردار یا کسی نسل و خاندان سے ہمیشہ کے لیے مربوط کردیں۔

خون اور رشتہ کا تقدس، نسلی و خاندانی غرور، اپنے بیٹوں پوتوں کے لیے گدیاں بنانا اور ان کے لیے جائدادیں اور جاگیریں تیار کرنا، اپنے کو مافوق البشر ثابت کرنا اور لوگوں پر اپنی خدائی اور فرمانروائی قائم کرنا ہمیشہ سے سلاطین و فاتحین کی خصوصیت اور حکومتوں اور شاہی خاندانوں کی قدیم زمانہ سے نفسیات رہی ہیں ....

.... انبیاء علیہم السلام ان باتوں سے ماوراء اور ان کی ذات گرامی ان تمام آلائشوں سے پاک صاف ہوا کرتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی دعوت و بعثت اور ان کی ذات گرامی کی اس خصوصیت کو بڑے بلیغ اور موثر انداز میں بیان فرمایا ہے۔

«ما کان لبشر أن یوتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون، ولا یامرکم ان تتخذوا الملٰئکۃ والنبیین اربابا، أیامرکم بالکفر بعد اذ انتم مسلمون (آل عمران ۷۹-۸۰)

(کسی بشر کے لیے روا نہیں کہ اللہ اس کو کتاب اور حکم نبوت کا منصب عطا فرمائے پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے سوا خود میرے بندے بن جاؤ، بلکہ اس کی تعلیم و ہدایت یہی ہو گی کو تم جس طرح کتاب اللہ پڑھتے پڑھاتے ہو اس کے مطابق ربانی یعنی صرف اللہ کے پورے فرمانبردار بندے بن جاؤ اور وہ تم کو ہرگز یہ حکم نہیں دے سکتا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو ارباب بنالو۔ کیا وہ تمہارے مسلم ہو جانے کے بعد تم کو کفر کا حکم دے گا۔

اسی بنا پر انبیاء علیہم السلام ایسی چیزوں سے ہمیشہ چوکنا رہا کرتے اور کسی ایسی بات کو قطعاً گوارا

نہیں کرتے تھے جس سے غیر اللہ کیلئے کسی خداوندانہ تقدیس و تعظیم کا شائبہ بھی نکل سکے، یا عبد و معبود کے درمیان کوئی حائل ہونے کی کوشش کرے اور اس تعظیم و تقدیس کا کوئی ادنیٰ جذبہ بھی غیر اللہ کے لیے پیدا ہو خواہ اس کا تعلق انھیں کی ذات سے ہو یا کسی تاریخی آثار، عبادت گاہ یا مزار سے ہو۔ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اے اللہ تو میری قبر کو ایسا بت نہ بنا جس کی پرستش کی جائے۔ خدا کا غضب ہو ان قوموں پر جنھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔" آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا "یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو کہ انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا، انھوں نے جو کچھ کیا اس سے بچنا چاہیے" ایک جگہ ارشاد نبوی ہے۔ "میری قبر کو جشن نہ بنا لو" اس موضوع پر احادیث کثرت سے وارد ہوئی ہیں۔

گزشتہ قوموں کی تاریخ اور تجربات نے یہ بات روز روشن کی طرح واضح کر دی ہے کہ جس جماعت اور قوم نے بھی زیارت گاہوں اور قبروں پر جشن منانا شروع کیا وہ بالآخر حرم مقدس اور مسجدوں سے بے پروا، نماز با جماعت کے اہتمام سے بے تعلق اور ہر مصیبت و آفت کے وقت خدا کے سامنے جھکنے، اس کی طرف رجوع کرنے اور جذبہ عبدیت و بندگی سے خالی ہو گئی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں احادیث میں آتا ہے کہ جب کوئی مصیبت آتی تو آپ نماز کی پناہ لیتے)

ایران کے دوران قیام ہم نے مسجدوں کی بہ نسبت زیارت گاہوں کو زیادہ معمور اور سیاح و زائرین سے آباد دیکھا، جس سے اندازہ ہوا کہ لوگوں کو ان مزاروں سے غیر معمولی لگاؤ اور قلبی تعلق ہے۔ جب ایک سیاح سیدنا امام علی رضا کے مزار پر حاضر ہوتا ہے تو اپنے آپ کو ایسے حرم میں محسوس کرتا ہے جو زائرین سے معمور ہوتا ہے، مردوں اور عورتوں کے غیر معمولی ازدحام کا عجیب منظر ہوتا ہے۔ غیر معمولی آرائش و زیبائش۔ دولتمندوں اور اہل ثروت کے نفیس تحائف اور مختلف طبقوں کے زائرین کے نذر و نیاز سے پٹا پڑا رہتا ہے، حرم مکی اور حرم مدنی اور اس مزار کے درمیان بمشکل امتیاز کیا جا سکتا ہے، یہی حال قم میں سیدہ معصومہ کاظم کے مقبرہ کا ہے۔

ایران میں مسجدیں عظیم الشان اور فن تعمیر کے اعتبار سے تو بعض مسجدیں نادر نمونہ ہیں، ان کی نظیر عالم اسلام کے دوسرے ملکوں میں ملنی مشکل ہے لیکن مقابر و مزارات کے مقابلہ میں ان کی حالت انتہائی عبرتناک ہے۔ ان مسجدوں میں نہ مقابر و مزارات کی طرح بھیڑ نظر آتی ہے اور نہ وہ جوش و جذبہ اور قلبی تعلق نظر آتا ہے جو ان مزارات پر دیکھنے میں آتا ہے، بیشتر مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے۔

حالانکہ جہاں تک مجھے علم ہے اثنا عشری مسلک میں جمع بین الصلوٰتین اور امامت کے شرائط کے بارے میں خاص اور متعین احکام موجود ہیں اس لیے عین ممکن تھا کہ مسجدیں نمازیوں سے معمور اور تسبیح و تلاوت کی صداؤں سے گونجتیں اور مقابر و مزارات کے مقابلہ میں یہاں زیادہ سے زیادہ آبادی اور زندگی پائی جاتی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایرانی علماء اور دینی و ملی غیرت رکھنے والے مخلص حضرات اس نکتہ پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور مساجد و مزارات کے درمیان اس غیر معمولی خلیج کو کم کرنے کوشش کر رہے ہیں تاکہ کوئی زائر اور سیاح اس وسیع فرق کو کم سے کم محسوس کر سکے۔ اس حقیقت و واقعیت کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ قبر پرستی، دور دراز سے اس مقصد کے لیے خصوصی سفر، سالانہ عرس و اجتماع اور مشرکانہ اعمال و رسوم برصغیر ہند و پاک کے علاوہ مصر کے اہلسنت میں بھی کثرت سے مروج ہیں، لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ ہر زمانہ میں سلف سے خلف تک ایسے حق گو اور صداقت کے علمبردار علماء بڑی تعداد میں رہے جنھوں نے ان بدعات اور مشرکانہ رسوم و رواج کی کھل کر مخالفت کی اور اس کو بیخ و بن سے اکھاڑنے میں اپنی پوری جد و جہد صرف کر دی، اس راہ میں ان کو گمراہ عوام کے غیظ و غضب کا بھی نشانہ بننا پڑا لیکن وہ ہمیشہ عوام کو ان گمراہیوں سے بچتے رہنے کی تاکید کرتے رہے اور کسی ملامت اور مخالفت کی پروا کیے بغیر حق گوئی و بے باکی سے توحید خالص کی دعوت دیتے رہے۔

مذاہب اربعہ (حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی) کی کتابیں قبر پرستی اور مشرکانہ بدعات و رسوم کی مذمت سے بھری ہوئی ہیں۔ اثنا عشری حضرات کی اصلاح و تجدید کی تاریخ کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں، ہمیں اس کا علم نہیں کہ شیعہ حضرات میں ایسے داعی اور مصلحین امت ہوئے ہیں یا نہیں جنھوں نے قبر پرستی اور مشرکانہ اعمال و رسوم پر تنقید کی ہو اور لوگوں کو توحید خالص کی دعوت دی ہو۔ (شیعی فضلاء سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس موضوع پر ہماری معلومات میں اضافہ فرمائیں)

قبر پرستی اور شرک و بدعات سے غیر معمولی شغف و انہماک کا تعلق زیادہ تر اہل بیت کی تصویروں سے ہے جو گھر گھر پھیل گئی ہیں، حتیٰ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویریں مسجدوں، زیارت گاہوں اور گھروں میں اس کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ سخت انقباض اور تکدر ہوتا ہے۔ یہی تصویریں بت پرستی اور شرک تک لے جاتی ہیں، گزشتہ قوموں نے صلحاء و اولیاء کی تصویریں اور مجسمے تراش کر بت پرستی

کی بنیاد ڈالی تھی، اللہ تعالیٰ نے ملت اسلامیہ کو اس خطرے سے محفوظ رکھے۔ اور تمام مشرکانہ رسوم و رواج سے حفاظت فرمائے۔

۲- ائمہ اہلبیت یقیناً تاریکی میں مینارۂ نور اور ہدایت و رہنمائی کے امام رہے ہیں لیکن ہمارا احساس یہ ہے کہ شیعہ حضرات کا ان ائمہ اہل بیت سے اتنا غیر معمولی جذباتی تعلق اور اہل بیت کی محبت میں حد سے بڑھا ہوا انہماک عقل و جذبات اور ضمیر پر غالب آگیا ہے اور ہمارا تاثر یہ ہے کہ اس شیفتگی و شغف نے اس نبوت کی بہت حق تلفی کی ہے جو انسانوں کی صلاح و فلاح کی ضامن اور کامیابی و کامرانی کا سرچشمہ ہے حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات گرامی کی وجہ سے اہل بیت کو عزت و احترام کا مستحق سمجھا جاتا ہے، اہل بیت سے یہ محبت و تعلق اس گہری وابستگی اور شیفتگی ہی کی وجہ سے ہو جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے درمیان ہونی چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و تعلق اور گہری وابستگی کا اظہار نعت و منقبت کے ان اشعار سے ہوتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے متعلق کہے گئے ہیں۔ اہل بیت خصوصاً سیدنا علی ابن ابی طالب اور سیدنا حسین ابن علی کے بارے میں جو کچھ مدح و توصیف کی گئی ہے وہ طاقتور تعبیر، دلی جذبات، شعری مہارت، روانی و سلاست کے لحاظ سے ان نعتیہ اشعار پر بھاری ہے جو ہندوستان کے اردو شعراء نے کہے ہیں۔ یہی فرق شیعہ حضرات کے یہاں نعت نبوی اور اہل بیت کی مدح و توصیف کے درمیان دیکھا جا سکتا ہے، کم و بیش یہی فرق سیرت نبوی اور مناقب اہل بیت میں پایا جاتا ہے یہی چیز ہم نے ایران میں دیکھی کہ وہاں مشاہد و مقابر سے تعلق ہے مگر مساجد سے بُعد، نجف و کربلا اور عتبات عالیہ کے سفر کا شوق ہے اور حرمین شریفین کی زیارت کا جذبہ اس درجہ کا نہیں ہے۔

ہو سکتا ہے ہمارے اثنا عشری بھائیوں میں یہ ردعمل اہل سنت کے بعض علماء اور پرجوش حضرات کے رویہ اور اہل بیت کے حقوق کے اعتراف میں کوتاہی سے ہوا ہو لیکن یہ ردعمل اس سے کہیں زیادہ ہے، محبت و عقیدت، جوش و جذبہ اور تقدیس و تعظیم کا جو ہالہ اس روحانی مرکز کے گرد بن گیا ہے اور اس کی مدح و توصیف میں جس مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے اس سے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ چیز امامت کو نبوت کی حریف اور اس کی بہت سی صفات و خصوصیات میں شریک و سہیم نہ بنا دے اگر ایسا ہوا تو پوری زندگی کا دھارا ایک ایسے مرکز کی طرف ہو جائے گا جو افضل الانبیاء خاتم النبیین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو بہ پہلو پروان چڑھے گا اس نقطۂ نظر کے اثرات و نتائج شعر و ادب اور سوچنے سمجھنے کے انداز میں بھی ظاہر ہوں گے، میں اس کی تفصیل میں زیادہ جانا نہیں چاہتا لیکن اگر ہمارے منصف مزاج ایرانی بھائی اپنے دل کی دھڑکنوں کو محسوس کریں تو انھیں اس کا اندازہ ہوگا کہ خواہ وہ سو فیصدی ان باتوں سے اتفاق نہ کریں تاہم یہ باتیں ان کو از سر نو غور کرنے کی دعوت ضرور دیتی ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ ائمہ اہل بیت دین اور توحید خالص کی دعوت میں آنحضرتؐ کے صحیح جانشین تھے وہ اس چیز کے دشمن تھے جو مخلوق کو اپنے خالق سے غافل کردے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس دین کو لے کر اس دنیا میں تشریف لائے تھے وہ اس کے حق میں سب سے زیادہ غیرتمند تھے اور کسی ایسی چیز کو قطعاً گوارا نہیں کرتے تھے جو خالق و مخلوق کے تعلق کو کمزور کردے یا مخلوق کو مخلوق کے ساتھ مشغول کردے، ان کی دینی دعوت مخلوق کے بجائے خالق سے رابطہ، مظاہر دنیا سے بے رغبتی زہد و توکل کی زندگی اور علم نافع میں مشغولیت وہ روشن و تابناک نقوش ہیں جو تاریخی تسلسل اور ہدایت سے ثابت ہیں اور ان کی دینی غیرت و حمیت کی شہادت دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور شیعہ سنیوں کے درمیان وسیع اور گہری خلیج کو پر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس جدوجہد کا رخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور آپ کی نبوت کی طرف موڑ دیا جائے اس لیے کہ آپ کی ذات گرامی مسلمانوں کا مرکز توجہ ہے اور آپ کی نبوت ہی سے یہ چشمہ ابلتا ہے اور آپ ہی وہ روشن چراغ ہیں جس نے پوری دنیا کو منور کیا ہے۔ یہ ایک عظیم الشان تجدیدی کام ہے جس کے لیے عبقری علمی و دینی شخصیتوں نیز بلند ہمتی عزم و حوصلہ، پختہ علم اور روشن ضمیری کی ضرورت ہوگی جب بھی یہ کام پورا ہوگا اسلام کی فکری اور تجدیدی تاریخ میں انقلاب آفریں اور اپنی نظیر آپ ہوگا۔ اسی ٹھوس اور مستحکم بنیاد پر حقیقی اور فطری اسلامی اتحاد قائم ہو سکتا ہے۔

۳۔ اگر اثنا عشری حضرات، خلوص دل سے چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقے ایک دوسرے سے قریب آئیں اور وہ صاف دلی سے متحد ہو کر ایک مرکز پر جمع ہوں تو انھیں صحابہ کرامؓ اور امہات المومنینؓ کے بارے میں اپنے انداز فکر میں تبدیلی کرنی ہوگی، اس لیے کہ افراد اور جماعتوں کی محبوب و محترم شخصیتوں کا جب تک احترام نہ کیا جائے گا اس وقت تک یکجہتی کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ دو آدمی ایک مقصد کے لیے جوش و خلوص، صاف دلی اور جذبہ تعاون سے

آپس میں مل بیٹھیں لیکن ایک ساتھی اپنے رفیق کے مثالی محبوب محترم اور محبت و عقیدت کی مرکز شخصیت کو نامناسب الفاظ میں یاد کرے، طنز و تشنیع اور بے سر و پا الزامات لگانے کو خدا کے یہاں تقرب کا ذریعہ خیال کرے ہم میں سے ہر شخص کو اس کا تجربہ ہے، جب اساتذہ، شیوخ اور آباء و اجداد کے بارے میں ہمارا یہ تجربہ ہے تو بھلا ان پاک نفوس کے بارے میں ہمارا کیا حال ہوگا جن کو انسان اپنے آباء و اجداد اور اساتذہ و شیوخ سے کہیں زیادہ افضل و برتر سمجھتا ہے اور ان پر اپنی جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا ہے اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاون و مددگار اور اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت میں سب سے بڑا محسن خیال کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے خدا کی راہ میں جہاد کیا ہے اور دینی دعوت کے میدان میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور دنیا کی زندگی میں زہد و تقشف اور ایثار و قربانی کے لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔

اس جذباتی پہلو سے قطع نظر کہ یہ ایک اہم علمی اور وسیع موضوع ہے۔ لوگ ہمیشہ دینی دعوت اور اس کی تعلیمات کی خوبیوں اور محاسن کا موازنہ اس دعوت کی شاندار کامیابیوں اور اس کے جامع و کامل نمونوں سے کرتے ہیں، اسلام نے اس اوّلین اور مبارک قافلہ کی خوبیوں اور محاسن کو جس طرح اجاگر کیا اور داعی اول کو اپنی دعوت و تربیت میں جو کامیابی حاصل ہوئی اسکو ہر زمانے میں کامیابی و کامرانی کا معیار سمجھا گیا چنانچہ جب تعلیم و تربیت کے میدان میں معلمین اخلاق اور قائدین جدوجہد کے نتائج غیر معمولی طور پر ظاہر ہوتے ہیں تو ان کو اپنے فنون میں ماہر و ممتاز سمجھ لیا جاتا ہے اور اس میدان میں ان کی قیادت و امامت اور تفوق اور برتری تسلیم کر لی جاتی ہے لیکن اگر نتائج برائے نام اور کامیابی بہت محدود پیمانے پر حاصل ہوتی ہے یا اپنے طالب علموں اور ماننے والوں کی تعلیم و تربیت میں ان کی جد و جہد ضائع ہو جاتی ہے اور یہ طالب علم اپنے اساتذہ کے اس دنیا سے جاتے ہی ان کی جد و جہد کو ناکام ثابت کر دیتے ہیں اور ان کی تربیت کے اثرات بہت جلد زائل ہو جاتے ہیں تو ان اساتذہ اور مربیوں کو اپنی تعلیم و تربیت کی مہم میں ناکام سمجھا جاتا ہے۔ اس موقع پر لوگ یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہوتے ہیں کہ جب یہ دعوت اپنے سب سے بڑے داعی کے ہاتھوں اپنے دور عروج میں کوئی دیرپا اور گہرے نقوش مرتسم نہ کر سکی اور جب اس دعوت پر ایمان لانے والے ابتدا ہی میں اسلام کے وفادار اور امین نہ رہ سکے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس صراط مستقیم پر صحابہ کرامؓ کو چھوڑا تھا ان میں سے معدودے چند

آدمی بھی اس پر گامزن رہ سکے تو ہم یہ کیسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ اس کے اندر نفوس کے تزکیہ کی صلاحیت ہو اور وہ انسان کو حیوانیت کی پستی سے نکال کر انسانیت کی بلند چوٹی تک پہونچا سکتی ہے؟ اسلامی دعوت کا تقاضہ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور آپ کی سیرت و تاریخ سے انصاف کا تقاضہ اور آپ کی شخصیت کو ناقدروں کی نگاہ میں تابناک بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم صحابہ کرام کے محاسن کا اعتراف کریں، ان کے کارنامہ کی عظمت و اہمیت، ان کی وفاداری اور محبت و تعاون علی الحق کے نقوش کو اجاگر کریں۔ اور اس تابناک تاریخ کا یہ روشن ورق دنیا کے سامنے پیش کریں۔ ان کی بھول چوک اور معمولی لغزشوں کی تاریخ کے صاف شفاف صفحہ پر ایک سیاہ نقطے سے زیادہ حیثیت نہیں، صحیح منطق اور عقل سلیم بھی اسی موقف کو قبول کرتی ہے اور قرآن مجید احادیث اور مستند تاریخ سے بھی یہی موقف درست ثابت ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے بھی سابقین اولین اور سلف صالحین کے متعلق اسی روش کو قابل تعریف قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

والذین جاءو من بعدھم یقولون ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا، ربنا انک رؤف رحیم۔ (الحشر)

(اور واسطے ان لوگوں کے جو آئے ان کے بعد کہتے ہوئے اے رب بخش ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے پہلے داخل ہوئے ایمان میں اور نہ رکھ ہمارے دلوں میں بیر ایمان والوں کا اے رب تو ہی نرمی والا مہربان ہے)

گزشتہ قوموں کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ انبیاء علیہم السلام کے حواری اور رفقاء مخلوق خدا میں سب سے بہترین لوگ ہیں، یہ قومیں اپنے پیغمبروں کے حواریوں اور رفیقوں کی محبت و عقیدت میں معروف و مشہور تھیں اس لیے ہمیں صحابہ کرام سے اور زیادہ محبت و عقیدت ہونی چاہیے جو اس نبی کے رفیق اور حواری ہیں جس نے اس دنیا پر سب سے زیادہ اور گہرا اثر ڈالا، قرآن مجید میں اللہ تعالے کا ارشاد ہے۔

ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔ (الجمعہ)

(وہی ہے جس نے بھیجا ان پڑھوں میں ایک رسول ان ہی میں کا وہ پڑھ کر سناتا ہے ان کو اللہ کی آیات اور سنوارتا ہے سکھلاتا ہے ان کو کتاب اور حکمت اور اس سے پہلے وہ پڑے تھے

تھے صرح کے بھول میں)

هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ و دین الحق لیظهره علی الدین کله وکفیٰ بالله شهیدا" (الفتح)

اگر ہم مختلف مسالک کے لوگوں کو قریب کرنے کے لیے خلوص دل سے کوشش کرنا چاہتے ہیں تو پھر یہ کوشش ٹھوس اور فطری بنیاد پر ہونی چاہیے۔ اس نفسیاتی اور فطری راستہ کے علاوہ جو کوشش بھی کی جائے گی وہ خام اور غیر فطری ہوگی۔ ہم نے ایک موقع پر علامہ محمد تقی القمی سے ـــ جو اس مقصد کے لیے تیس سال سے کام کر رہے ہیں، عرض کیا تھا کہ تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، اس کے لیے دو مخلص باعزم اور مضبوط ہاتھوں کا ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی ہاتھ میں ڈھیلا پن سستی یا نرمی ہوگی تو تالی نہیں بج سکتی۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ تقریب بین المذاہب کوئی مشینی عمل نہیں بلکہ زبان سے زیادہ اس کا تعلق دل سے ہے اور خارجی مسئلہ سے زیادہ اس کا تعلق اندرونی مسئلہ سے ہے۔ ابھی تک کسی ایسی گوند کی ایجاد نہیں ہو سکی جس سے کاغذ کی طرح دل بھی جڑ جائیں۔ اس لیے یہ خواہش اور جدوجہد دل سے اٹھنی چاہیے اور اس میں اتنی روانی اور ابال ہونا چاہیے کہ دل اس کی قوت اور حرارت محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے، اس کے لیے آپس میں مفاہمت کرنی ہوگی، کچھ چیزوں سے دستبردار ہونا پڑے گا اور کچھ لین دین کرنا ہوگا لیکن ایک بار ہمارے دل جب اس کو قبول کرنے پر تیار ہو جائیں گے تو پھر محبت و اعتماد کے سیل رواں کے سامنے کوئی چیز نہ ٹھہر سکے گی اس لیے کہ محبت اپنی راہ کی ہر رکاوٹ اور بغض و عداوت کی ہر کدورت کو بہا لے جاتی ہے۔

۴۔ آخر میں آپ حضرات کی توجہ قرآن مجید کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ایرانی بھائی قرآن کریم کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں، اس سے محبت اور غیر معمولی حد تک اس کا اہتمام کرتے ہیں، اہل ایران قدیم زمانہ سے قرآن کی خوبصورت اور زریں کتابت میں آگے رہے ہیں، ان کو کتب خانوں اور میوزیم میں خاص اہتمام سے رکھنے، اس پر فخر کرنے اور انتہائی اہتمام کے ساتھ اور زیور طباعت سے آراستہ کرنے میں اب بھی ہمارے ایرانی بھائی دوسرے ملکوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ ایران کے قدیم و جدید علماء نے قرآن مجید کی تفسیر کا اہتمام ہمیشہ کیا، ایرانی علماء کی بعض اہم کتابیں ہندوستان میں بھی مشہور ہیں۔

لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ قرآن مجید کے ساتھ ایرانیوں کا یہ تعلق اس سے کہیں زیادہ گہرا ہونا چاہیے ان کو قرآن سے صحیح ذوق لینا اور اس سے کما حقہ استفادہ کرنا چاہیے، تلاوت کی کثرت اور اچھے حفاظ کی تیاری میں زیادہ توجہ اور اہتمام سے کام لینا چاہیے اور اس کو ہر چیز پر ترجیح دینا چاہیے یہاں تک کہ قرآن کا ذوق ہر چیز پر غالب و نمایاں ہو جائے اور علم و ادب، عقیدہ و عمل اور طریقہ و سلوک کا منتہائے نظر اور معراج کمال بن جائے۔

ہمارے ایرانی فضلاء اور مفکرین ان پیش کردہ حقائق میں سے بعض حقیقتوں کو محسوس کرتے ہیں اور ان کی اشاعت و ترویج اور تقویت کی ضرورت کا انھیں اعتراف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بڑا اور عظیم الشان اور غیر معمولی تجدیدی کام ہے اور اس سے وہی باکمال شخصیتیں عہدہ برآ ہو سکتی ہیں جو اپنے علمی وقار و احترام کو داؤں پر لگا دیں اور اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہوں، لیکن اس کامیابی سے جو خوشی و مسرت حاصل ہوگی اس سے بڑھ کر کوئی مسرت نہیں ہو سکتی، اس سے تاریخ ان کو جس عزت و احترام کے مقام پر رکھے گی اس کی برابری کوئی عزت و مرتبہ نہیں کر سکتا، اسلام کی صاف شفاف پیشانی اور اس کی حقیقت پر جو گرد و غبار اٹ گیا ہے، تاریخ کے ملبہ نے جس طرح اس کے رخ زیبا کو چھپا لیا ہے اور انکار و تقلید کی جو دبیز تہہ جم گئی ہے اس کو ہٹانا اور قرن اول سے زیادہ کی جو حالت تھی وہ حالت پھر سے پیدا کرنا کوئی آسان اور معمولی کام نہیں بلکہ بہت بڑا جہاد اور عظیم الشان تجدیدی کام ہے، قرآن کا یہ خطاب صرف دوسرے مذاہب اور غیر مسلم اقوام ہی سے نہیں امت کے تمام طبقوں اور گروہوں سے بھی ہو اور کسی مخصوص عہد کے لیے نہیں ہمیشہ کے لیے ہے۔

"تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا وبینکم ألا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً، ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ۔" (آل عمران)

(آؤ ایک بات کی طرف جو برابر ہے ہم میں اور تم میں کہ بندگی نہ کریں ہم مگر اللہ کی اور شریک نہ ٹھہرا دیں اس کا کسی کو اور نہ بنائے کوئی کسی کو رب سوائے اللہ تعالے کے۔)

مولانا سخاوت علی جونپوری

از مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اُستاذ مدرسہ عربیہ قاسم العلوم
منگراواں، اعظم گڑھ

آٹھویں صدی ہجری کی ابتداء سے بارھویں صدی تک دیار پورب میں شہر جونپور اسلامی تہذیب و ثقافت کا اہم ترین مرکز رہا ہے۔ اس سرزمین سے بیشمار علماء و فضلاء اور صوفیا پیدا ہوئے، جنھوں نے مدرسہ اور خانقاہ، دونوں کو اپنی علمی و روحانی سرگرمیوں سے آباد کیا۔

حاجی معین الدین ندوی لکھتے ہیں۔

وکانت جونپور من ادق مدن الھند فی ایام الدولۃ الشرقیہ وخرج منھا خلق من العلماء لایحصرھم عدد (۱)

سلطنت شرقیہ کے دور میں جونپور ہندوستان کے شہروں میں بہت بارونق شہر تھا اور اسمیں بے شمار علماء پیدا ہوئے

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی المتوفی ۸۴۰ھ، شیخ ابوالفتح سوان برسی المتوفی ۸۵۸ھ، میر سید عبدالاول محدث المتوفی ۹۶۸ھ، ملا علاء الدین الاداد المتوفی ۹۳۹، استاذ الملک محمد افضل عثمانی متوفی ۱۰۶۸ھ، ملا محمود مصنف شمس بازغہ متوفی ۱۰۶۸، دیوان رشید مصنف مناظرہ رشیدیہ متوفی ۱۰۸۲ھ، ملا محمد جمیل مرتب فتاویٰ عالمگیریہ متوفی ۱۱۲۳ھ وغیرہ اپنے اپنے عہد میں یہاں کے علمائے فحول اور مشائخ کبار میں گزرے ہیں۔

الا میں العالم النبیل والفاضل الجلیل مولانا سخاوت علی ابن عنایت علی حنفی جونپوری اپنے معاصرین

(۱) نجم الاکرم ص ۷۱ ج ۱

میں خاص شہرت اور مقام کے مالک تھے۔

تیرھویں صدی کے علماءِ شرق میں مولانا شریعت و طریقت کے مسلم مقتدا اور امامت و عبقریت کے اعلا مقام پر نظر آتے ہیں، بالخصوص حدیث و فقہ میں کامل دستگاہ اور خاص مہارت رکھتے تھے۔ صاحب اتحاف نے فقہائے ہند کی فہرست میں آپ کا شمار نہایت شاندار اور پرشوکت الفاظ میں کیا ہے۔ آج کی صحبت میں جونپور کی تاریخ علمی سے آپ ہی کی داستان زیر عنوان ہے۔

نام و نسب اور خاندانی حالات سخاوت علی بن رعایت علی بن درویش علی بن نذر علی عمری (۱) اس سے آگے سلسلۂ نسب تلاش و تتبع کے باوجود حاصل نہ ہو سکا۔ آپ نسلاً شیخ فاروقی ہیں اور شیخ محمد کوفی کی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں مولانا نے خود فرمایا از اولاد شیخ محمد کوفی ہستم پس محمدی نسبت ہست بہ یکی لطبون فاروقیاں (۲)

خواجہ محمد نے کوفہ کب اور کن حالات میں چھوڑا۔ ہندوستان کی اقامت کو دوسرے اماکن پر کیوں ترجیح دی؟ اس کی تفصیل سے تمام تذکرہ نویس خاموش ہیں۔ راقم نے مولانا کے خاندان کے بعض اہل علم سے اسکی تفصیل جاننے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی بس اتنا معلوم ہو سکا کہ شیخ کوفی کوفہ سے ہرات آئے پھر وہاں سے ہندوستان آکر قصبہ منڈیاہوں مضافات جونپور میں فروکش ہو گئے۔

شیخ کوفی کا ہندوستان کے مشہور شہروں کو چھوڑ کر ایک غیر معروف قصبہ کو جائے اقامت کیلیے انتخاب کرنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی آمد ہندستان میں فتنۂ تیموری کے لگ بھگ ہے جبکہ دلی کی تمدنی و معاشرتی دنیا میں بادخزاں کے تیز و تند جھونکے چل رہے تھے اور دیار پورب میں شہر جونپور سلطان ابراہیم شاہ شرقی المتوفی ۸۴۴ھ کے حسنِ انتظام علم دوستی اور علماء و فضلاء کے ساتھ داد و دہش اور فیاضانہ سلوک کی وجہ سے مرجع خلائق بنا ہوا تھا۔ اور اطراف عالم سے ارباب کمال دارالخیر شہر جونپور کی جانب کھنچے چلے آرہے تھے قرین قیاس ہے کہ انھیں وجوہ کی بنا پر شیخ کوفی نے بھی ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں کے بجائے یہاں کی سکونت اختیار کی۔

سن پیدائش و ابتدائی حالات آپ ۱۲۲۵ھ یا ۲۶ میں پیدا ہوئے اس وقت آپ کے خاندان میں علم و فضل کا خاص چرچا تھا اور خاندان کے اکثر لوگ

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۹۳ (۲) جواب سوالات نسخہ ص ۱۴۲

بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے جس کی وجہ سے علم کے ساتھ گھر میں فراغت و رفاہیت بھی تھی اس لیے آپ کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی، مبداء فیاض نے ذہانت و فطانت سے بھی حصۂ وافر عطا فرمایا تھا جس کے آثار ایام طفولیت ہی سے نمایاں تھے (۱)

سن تمیز کو پہنچے تو خاندان کے طریقے کے مطابق اولاً حفظ قرآن شروع کیا اور صرف چھ ماہ کی مدت میں حفظ سے فراغت حاصل کر لی۔ اس کے بعد فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا قدرت علی ردولوی سے پڑھیں اور متوسطات مولانا احمد اللہ انامی اور مولانا احمد علی چریا کوٹی کی خدمت میں ختم کیں اور تکمیل وقت کے عدیم المثال محدث اور مجاہد حضرت شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبد الحی بڈھانوی کے زیر تربیت کی اور عمر کے مختصر سے حصہ میں سرآمد روزگار ہو گئے (۲)

تبحر علمی

آپ کے تمام تذکرہ نگاروں نے آپ کے تبحر علمی کا نہایت شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ زیدی لکھتے ہیں:

در اندک زمان فاضل جلیل و عالم نبیل گشت شہرہ فضیلتش بر سر آسماں رسید و علم تفوق بر اقران افراشت و سر دبازاری علمائے وقت گردید ملک العلماء وقت و استاذ الملک زمانہ بود در دور آخری زندہ کنندہ علوم جونپور و زیبندہ مسند فضلائے گذشتہ شد (۳)

قلیل مدت میں جلیل القدر عالم ہو گئے اور ان کی فضیلت کا چرچا بام آسمان تک پہونچ گیا معاصرین میں سب سے آگے نکل گئے اور وقت کے ملک العلماء اور استاذ الملک قرار پائے۔ آخری دور میں جونپور کے علوم کو زندہ کرنے اور فضلائے گذشتہ کے مسند کو زینت بخشنے کا شرف آپ ہی کے حصہ میں آیا۔

مولانا سید عبد الحی الحسنی تحریر فرماتے ہیں

الشیخ العالم الکبیر المحدث احد العلماء المشہورین (۴)

بیعت و خلافت

تحصیل علوم ظاہری سے فراغت کے بعد علوم باطنی کی جانب متوجہ ہوئے اور مجدد دین احمدی حضرت سید احمد بریلوی قدس اسراہم کی خدمت میں حاضر ہو کر طریقہ مجددیہ

---

(۱) تجلی نور صفحہ ۱۰۶ و نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۹۳ (۲) القول الجلی ص ۱ و تجلی نور ص ۱۰۶ و تذکرہ علمائے ہند (۳) تجلی نور ص ۱۰۶ (۴) نزہۃ ج ۷ ص ۱۹۳

نقشبندیہ میں شرف بیعت حاصل کیا۔

نزھۃ الخواطر میں ہے

واخذ الطریقۃ عن السید الامام احمد بن عرفان الشھید البریلوی ولازمہ برھۃ من الزمان (۱)	حضرت سید احمد بن عرفان شہید بریلوی سے سلوک اخذ کیا اور ایک زمانہ تک ان کی خدمت میں حاضر رہے۔

علوم ظاہری کی طرح علوم باطنی میں بھی کمال جدّ و جہد اور مجاہدہ و ریاضت فرمائی تا آں کہ حضرت سید صاحب نے خلافت سے سرفراز فرما دیا۔

مولانا خود لکھتے ہیں۔

اس فقیر کو بیعت طریقہ چشتیہ اور قادریہ اور نقشبندیہ اور مجددیہ اور محمدیہ، ہاتھ پر امیر المومنین سبط اکبر مجدد ثالث عشر امام ادھ سید احمد دامت برکاتہم الی یوم التناد ہے اور اجازت بیعت لینے کی بھی حاصل ہے الخ (۲)

تعلیم و تدریس ان جملہ کمالات ظاہری و باطنی کی تحصیل کے بعد آپ نے مسند تدریس کو زینت بخشی اور ہر قسم کے علائق دنیوی سے کنارہ کش ہو کر اشاعت علوم میں مصروف ہو گئے۔ مولانا کی علمی حذاقت و مہارت اور زہد و تقوی کا آوازہ چہار سو پھیلا اور طلباء کا اتنا ہجوم ہوا کہ جونپور کی مجلس علمی میں نئے سرے سے جان آگئی۔

ہزارہا طلباء دے از و استفادۂ فیض علوم جدید کرد و صدہا فارغ التحصیل گشتند و در آخری زندہ کنندہ علوم جونپور شد (۳)	دور دور دیکھ سکے ہزاروں طلباء نے آپ کے فیض علم سے استفادہ کیا، اور سیکڑوں فارغ التحصیل ہوئے اور اس طرح آخری دور میں جونپور کے علوم کو آپ کی ذات سے نئی زندگی ملی۔

جونپور سے باندہ شدہ شدہ آپ کے کمالات کی شہرت نواب ذو الفقار بہادر مرحوم باندہ تک پہونچی۔ نواب مرحوم چونکہ علم دوست، علماء نواز تھے اس لیے بہ ہزار اصرار مولانا کو باندہ بلایا، مولانا نے نواب کی خواہش کو قبول کر لیا اور کچھ دنوں کے لیے باندہ کی اقامت منظور کر لی۔

---

(۱) نزھۃ ج ۷ ص ۱۹۳ (۲) رسالہ وصول ص ۳۹ (۳) تجلی نور ج ۱ ص ۱۰

نواب باندہ نے ہر طرح سے آپ کی توقیر و تعظیم کا خیال کیا اور آپ کے فضل و کمال کو دیکھ کر انتظام مدارس اور افسریت علماء کے مناصب آپ کو تفویض کر دیے، اس وقت نواب کے دربار میں بڑے بڑے نامور علماء و فضلاء موجود تھے مگر جو قدر و منزلت نواب کے دل میں مولانا کی تھی وہ کسی کو حاصل نہ تھی۔

اسی زمانہ میں مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی بھی باندہ میں نواب کے دربار سے منسلک تھے۔ مولانا عبد الحلیم مولانا کی جلالتِ علمی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بہت سی کتابیں مولانا سے سبقاً پڑھ کر حلقہ تلمذ میں داخل ہو گئے اور ساتھ ہی درس و تدریس، وعظ و افتاء کی تربیت بھی مولانا سے حاصل کی۔ (۱)

مولانا فطرتاً آزاد منش واقع ہوئے تھے اس لیے باندہ کے قیام کو زیادہ دنوں کے لیے برداشت نہ کر سکے اور باایں ہمہ عزت و منفعت ایک سال بعد میں جونپور واپس چلے آئے۔

استخلاص الجامع الشرق و قیام مدرسہ قرآنیہ

اس زمانہ میں الجامع الشرق (بڑی مسجد شہر جونپور) پر شیعوں کا قبضہ تھا جس میں وہ تعزیہ داری اور اس کے ساتھ تاشہ، نقارہ وغیرہ بجاتے، اس سے بھی آگے کی بات یہ تھی کہ مسجد کو بارات ٹھہرانے کا بنگلہ بنا دیا تھا جسمیں باراتی ہر قسم کی رنگ رلیوں کا پروگرام مناتے۔ غرض اسی طرح کی اور بھی بہت سی شنیع حرکات سے مسجد کی عزت و حرمت کو بالکل پامال کر دیا تھا۔ (۲)

مولانا کی غیرتِ ایمانی خانۂ خدا کی اس بربادی کو کب برداشت کر سکتی تھی چنانچہ آپ نے ابتداءً ان ہی لوگوں کو مسجد کی عزت و حرمت کی جانب توجہ دلائی مگر ان لوگوں نے اس کا کچھ اثر نہیں لیا تو آپ نے حاکم وقت کے دربار میں استغاثہ پیش کر دیا اور بڑی جد و جہد اور سعی و کوشش کے بعد مولانا کی دلی مراد بر آئی اور مسجد کو براءت حاصل ہوئی۔ آپ نے فوراً مسجد کو صاف کرایا اور اسمیں نماز پنجگانہ اور جمعہ کا انتظام فرمایا۔

اس کے بعد مولانا کو یہ خیال ہوا کہ اسمیں کوئی ایسا انتظام کیا جائے کہ ہمیشہ ہمیش کے لیے مسجد کی آبادی کا سبب ہو۔ اس خیال کے ماتحت آپ نے حسبۃً للہ مدرسہ قرآنیہ کی بنا ڈالی اور سب سے پہلے حافظ امام الدین لاہوری کو جو نیک، خدا رسیدہ اور صاحب حال بزرگ تھے مدرس مقرر فرمایا اور خود قیام ہندوستان تک مدرسے کے انتظام و انصرام کی دیکھ ریکھ فرماتے رہے اور ہجرت کے وقت اہل جونپور اور دیگر مضافات کے علاقہ کے لوگوں کو مدرسہ کی بقاء و ترقی کی وصیت بھی فرمائی، بحمد اللہ مدرسہ آج تک جاری ہے اور علوم دینیہ بالخصوص حفظ قرآن کی خدمت انجام دے رہا ہے جس سے بے شمار علماء فضلاء اور حفاظ نے فیض اٹھایا ہے اور اٹھا رہے ہیں۔ (۳)

(۱) القول الجلی ص (۲) القول الجلی ص (۳) تذکرہ علمائے ہند ترجمہ ص ۱۹۲ و القول الجلی ص

مختصر تاریخ مسجد ملک الشرق ابراہیم شاہ شرقی المتوفی ۸۴۴ھ کے نقشہ کے مطابق ان کے بڑے لڑکے سلطان محمود شاہ شرقی المتوفی ۸۶۲ نے اس مسجد کی بنیاد رکھی۔ اس مسجد کا اندرونی صحن ۲۱۷ × ۲۱۹ فٹ ہے اور پورا احاطہ ۳۲۰ فٹ پورب پچھم اور ۳۰۷ فٹ اتر دکھن ہے۔ اور بلندی ۲۰۰ فٹ سے زیادہ ہے۔

تاریخ تعمیر کے بارے میں مورخین کی آراء مختلف ہیں لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ۱۴۳۸ء اور ۱۴۷۰ء کی درمیانی مدت میں اس کی تعمیر ہوئی ہے (۱)

ہجرت مکہ معظمہ مولانا ۱۲۶۴ھ میں اپنے ماموں مفتی محمد غوث صدر الصدور کی معیت میں فریضۂ حج ادا کر چکے تھے اور اپنی نگاہوں سے تجلیات ربانی کے مظہر اتم کو دیکھ آئے تھے اس لیے دل ہر وقت ادھر ہی لگا رہتا تھا۔ اور ادھر مولانا امیر علی شہید کے واقعہ شہادت نے ہندوستان سے مزید دل برداشتہ کر دیا۔ بالآخر ۱۲۷۲ھ میں آپ نے ہجرت کا عزم مصمم کر لیا اور سفر کی تیاریاں شروع کر دیں اس سلسلے میں آپ نے کسی سے کسی قسم کی کوئی اعانت لینا پسند نہیں فرمایا اس لیے زاد راہ کے لیے اپنی والدہ کا وظیفہ جو بنارس کلکٹری میں مقرر تھا فروخت کر دیا اور متوسلین و معتقدین کے سد راہ ہونے کے باوجود اپنے اہل و عیال کو ہمراہ لے کر بذریعہ کشتی بنارس غازیپور، بلیا اور عظیم آباد ہوتے ہوئے کلکتہ پہونچ گئے اور چند یوم مولانا بدیع الزماں کے یہاں قیام فرما کر مکہ معظمہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے بنہایت آرام و اطمینان سے بلدۂ امین میں پہونچا دیا۔

صاحب نزہہ لکھتے ہیں

ثم سار الی الحرمین الشریفین مع خاله المفتی محمد غوث الجونفوری سنة اربع وستین و مائتین والف فحج وزار ورجع الی الهند و درس وافاد مدة ثم هاجر الی المكة المباركة مع عياله سنه اثنتين و سبعين الخ (۲)

بعد ازاں اپنے ماموں مفتی محمد غوث جونپوری کی معیت ۱۲۶۴ میں فریضۂ حج ادا فرما کر ہندوستان مراجعت کی اور درس و افادہ میں لگ گئے۔ پھر ایک مدت کے بعد مکہ معظمہ کی جانب مع اہل و عیال کے ہجرت فرمائی ....

(۱) تاریخ شیراز ہند (۲) نزہۃ ج ۷ ص ۱۹۳ و القول المجلی ص ۶۵ و تجلی نور ج ۱ ص ۱۰۵

وفات

ہجرت کے بعد کے حالات بالکل پردۂ خفا میں ہیں کسی تذکرہ نگار نے اس کی طرف کچھ اشارہ نہیں کیا مولانا کے خاندان کے لوگ جو اس وقت ہندوستان میں موجود ہیں ان سے بھی اس سلسلے میں کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔

حاصل کلام اسی دار ہجرت میں وقت موعود آ گیا اور ۲۹ شوال سنہ ۱۲۷۴ھ کو جان جان آفریں کو تفویض فرما کر جوار رحمت میں داخل ہو گئے۔ مکہ معظمہ کے مشہور قبرستان جنت المعلیٰ میں اس گنجینۂ علم و فضل کو دفن کیا گیا۔ (۱)

تاریخ وفات گفت زیدی از سر تاریخ سال — ختم شد شور علوم چون بود

مولانا کا مسلک

مولانا مسلکاً حنفی تھے اور حنفی ہونے پر آپ کو فخر بھی تھا چنانچہ مولانا نے ہجرت کے وقت جو وصیت نامہ تحریر فرمایا تھا اس میں بصراحت ارقام فرماتے ہیں کہ فقیر اب اس ملک سے سفر کرتا ہے ایسا نہیں کہ کم علم لوگ پیچھے لوگوں کو گمراہ کریں اور فقیر کی طرف نسبت کریں کہ حنفی ہونے کو بد سمجھتے تھے اور حالانکہ فقیر حنفی ہے یا تقلید صحیح کے منکر تھے یا اہل حدیث خواہ فقہ سے انکار تھا اور عمل حدیث (؟) خواہ فقہ پر نہ تھا جس کو شبہ ہو فقیر پاس آ کر رفع اشتباہ کر لے اور جس چیز سے غافل ہو ہوشیار ہو جائے اب زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں والسلام (۲)

ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

آنچہ اعتراضات متعصبین است بجواب آں پرداختن شان اہل حق نیست اگر فرضاً علماء اعلام حنفی نباشند چہ وجہ طعن است حنفی و شافعی بودن خود واجب نیست چنانچہ در فتوح... الرحموت شرح مسلم الثبوت مرقوم است و نسبت فقیر حاجت استفسار نیست حنفی ام و بہ حنفیت ... حقہ اتباع امام اعظم را فخر میدانم الخ (۳)

متعصبین جو اعتراضات کرتے ہیں اس کے جواب کی جانب متوجہ ہونا اہل حق کی شان نہیں ہے۔ بالفرض اگر بڑے بڑے علماء حنفی نہیں تھے تو اس میں وجہ طعن کچھ بھی نہیں کیونکہ حنفی و شافعی ہونا واجب نہیں جیسا کہ فتح الرحموت شرح مسلم الثبوت میں ہے اور فقیر کے بارے میں پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں میں حنفی ہوں اور حنفیت حقہ کے

---

(۱) تجلی نور صہ۱۰۸ ج۱ (۲) رسالہ نصائح صہ۱۱ (۳) جواب سوالات لسعہ صہ۱۵

ساتھ امام اعظم کی اتباع کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتا

ہوں۔

مولانا کی تحریروں کے بعد کسی کا اس بات پر اصرار کہ مولانا غیر مقلد تھے اور موجودہ اہل حدیث کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے ان کے نزدیک کوئی مقام رکھتا ہو لیکن اہل تحقیق کے نزدیک اس کو کوئی حیثیت نہیں۔

تصانیف مولانا کو درس و تدریس سے فرصت بہت کم ملتی تھی اس لیے تصنیف و تالیف کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں ہوا پھر بھی بہت سے رسائل آپ کے قلم فیض رقم سے معرض تحریر میں آئے جو آپ کے تبحر علمی کی واضح دلیل ہیں۔

ان رسائل میں سے اکثر اب ناپید ہیں۔ راقم الحروف کو بڑی تلاش و جستجو کے بعد مندرجہ رسائل دستیاب ہو سکے افادہ عام کے لیے ان کا تعارف درج ہے۔

(۱) رسالہ فقر و۔ فن تصوف پر ایک مختصر سا رسالہ ہے جسے چار فائدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فائدہ اول تقویٰ کے بیان میں ہے۔ دوسرا اہل تصوف کی عادات میں تیسرا قلوب کی بیماریوں اور اس کے علاج پر مشتمل ہے۔ چوتھے میں انقطاع دنیا و ترکِ خواہشات کا تذکرہ ہے۔

اس رسالہ کے مضامین خود مصنف کے بیان کے مطابق فتوح الغیب مصنفہ شیخ عبد القادر جیلانی سے ماخوذ ہیں۔

(۲) رسالہ نصائح:۔ یہ چند ورقی ایک کتابچہ ہے جس میں پندرہ بیش قیمت نصیحتیں نہایت موثر انداز میں بیان کی گئی ہیں دراصل مولانا کی پندرہ وصیتیں ہیں جو آپ نے سفر ہجرت کے موقع پر اپنے متعلقین کو تحریر فرمائی تھیں

(۳) رسالہ عرفان الاوقات:۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ رسالہ نماز پنجگانہ کے اوقات کے متعلق ہے۔ یہ ایک جامع رسالہ ہے جسمیں آیات و احادیث کی روشنی میں مدلل طور پر فرائض خمسہ کے اوقات کی تحدید کی گئی ہے اس رسالہ میں ہر قسم کے تعصبات سے الگ ہو کر اوقات مختلفہ میں معتدل فیصلہ کیا گیا ہے۔

(۴) رسالہ وصول:۔ یہ رسالہ بھی فن تصوف میں ہے۔

(۵) رسالہ در بیانِ کلمات کفر:۔ یہ چھ ورقی رسالہ کلمات کفر کے بیان میں ہے اس رسالہ میں مصنف نے کلمات کفر کے ساتھ گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ کو بھی بالتفصیل بیان کیا ہے اور اصل مقصد کے شروع کرنے سے پہلے ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے جسمیں کلمات کفر اور گناہ کبیرہ و صغیرہ کو بڑے ستھرے انداز میں تحریر کیا ہے۔

(۶) رسالہ ناسخ و منسوخ: یہ رسالہ ایک مقدمہ دو فصل اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں نسخ کی تعریف اور اس کے لغوی و اصطلاحی معنی سے بحث کی گئی ہے اور دو فصلوں میں سے پہلی فصل میں آیات منسوخہ کو بیان کیا ہے اور دوسری فصل میں احادیث منسوخہ کو اور خاتمہ میں مسئلہ تقلید سے بحث کی گئی ہے۔ اثبات تقلید کو ایسے اچھوتے اور دلنشین انداز سے بیان کیا ہے کہ طالب حق کے لیے کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ یہ رسالہ اختصار کے باوجود بہت ہی مفید اور مولانا کی علمی عبقریت بالخصوص قرآن و حدیث پر آپ کی دقت نظر کے لیے کافی ثبوت ہے۔

(۷) رسالہ تقوی:۔ اس رسالے میں پانچ فرقوں کا بیان ہے۔ مقدمہ میں مولانا رقمطراز ہیں کہ اس دیار میں پانچ قسم کے کلمہ گو موجود ہیں۔ ایک اہل سنت و جماعت دوسرے شیعہ امامیہ۔ تیسرے صوفی رونش چوتھے منکر مذاہب۔ پانچویں جاہل تابعدار رسم و عادت و خواہش نفسانی اسمیں کتاب و سنت کی روشنی میں بدلائل یہ ثابت کیا ہے کہ ان فرقوں میں صحیح راستہ پر صرف اہل سنت والجماعت ہیں۔

(۸) قویم فی احادیث النبی الکریم:۔ مولانا کی یہ سب سے اہم اور نادرۂ روزگار تصنیف ہے اس کتاب کو مولانا نے صحاح ستہ کے علاوہ تقریباً چالیس کتب احادیث و تاریخ کو سامنے رکھکر مرتب فرمایا ہے۔

کتاب کی ترتیب ابواب فقہی پر ہے اور ہر باب میں احناف کے مستدلات کو حوالہ اور درجۂ حدیث کے بیان کے ساتھ نقل کیا ہے۔ حقیقت میں یہ کتاب اس لائق ہے کہ احناف کے ہر ادارہ میں اس کو رکھا جائے اور اہل مدارس اپنے نصاب میں داخل کرلیں تاکہ طلباء کی نظر سے مسائل کے ساتھ ساتھ دلائل بھی گزرتے جائیں اور تقلید محض کے بجائے تحقیق کا ذوق پیدا ہو۔ راقم کے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ مترجم ہے اور پانچ سو بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے کتاب الطہارت ہے اور سب سے آخر میں کتاب الفرائض۔

ان رسائل کے علاوہ، رسالہ فصیح فی مسئلہ تقلید صحیح، رسالہ اسرار، رسالہ تعدد لغات۔ السلم فی المنطق۔ رسالہ علم الفرائض، رسالہ عرض نیک، رد شیعہ بھی آپ کی مشہور تصانیف ہیں مگر انتہائی کوشش کے باوجود یہ رسائل دستیاب نہ ہو سکے۔ لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔

اولاد سید و فیاض نے مولانا کو علم و فضل کی دولت جاودانی کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی شادمانی عطا فرمائی تھی مولانا کے چھ بچے تھے جن میں دو لڑکیاں مریم اور جویریہ نامی تھیں اور چار بیٹے تھے جن میں سب سے بڑے مولانا شیخ محمد اور سب سے چھوٹے مولانا ابو الخیر محمد مکی تھے۔ (۱)

---

(۱) از افادہ مولانا علی اعلیٰ نبیرہ مولانا محمد شبلی

(۱) شیخ محمد :- یہ ہمیشہ اپنے والد ماجد کے ساتھ رہے۔ علم و فضل، زہد و ورع، درس و افتاء اور تقریر و تحریر میں نادرۂ روزگار تھے۔ مولانا سلامت اللہ کانپوری سے ان کا ایک مناظرہ آج بھی اہل علم میں مشہور ہے۔ ایک رسالہ کتاب الیسوع میں تحریر فرمایا جو اہل علم کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

مگر افسوس کہ اس گنجینۂ علم و فضل کا عین شباب میں ۲ر شوال ۱۲۷۳ھ کو انتقال ہو گیا۔

(۲) مولانا حکیم محمد جنید :- سفر ہجرت میں یہ اپنے والد بزرگوار کے ہمراہ تھے اور ہر طرح کے فیضان علمی و عملی سے اکتساب کرتے رہے۔ مولانا کی وفات کے بعد جونپور واپس تشریف لائے اور مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی استاذ مدرسہ امام بخش سے متوسطات پڑھ کر مفتی محمد یوسف فرنگی محلی سے بقیہ کتابوں کی تکمیل کی۔ پھر طب کی طرف متوجہ ہوئے اور حکیم اولاد علی جونپوری کے مطب میں کچھ دنوں تک تحصیل کر کے اس فن میں بھی مہارت تامہ حاصل کی۔

یہ بھی ہر قسم کے محاسن صوری و معنوی سے آراستہ تھے۔ افتاء، درس و تدریس، وعظ و نصائح اور انتظام مدرسہ قرآنیہ کے ساتھ طبابت بھی کرتے تھے اور اس طرح سے بندگان خدا کی روحانی و جسمانی دونوں خدمتیں انجام دیتے تھے۔ یہ بھی زندگی کی بہاروں سے زیادہ منتفع نہ ہو سکے اور اپنے برادر کبیر کی طرح عالم شباب ہی میں ۱۲۸۱ھ میں داصل بحق ہو گئے۔ (۱)

(۳) مولانا محمد شبلی :- یہ ۲۵ر شعبان ۱۲۶۳ھ کو پیدا ہوئے۔ مولانا کے سفر ہجرت کے وقت چونکہ صغیر سن تھے اس لیے ہمراہ کے شرف سے قاصر رہے اور اپنے نانا قاضی ضیاء اللہ صدر الصدور کی زیر نگرانی تعلیم کا آغاز کیا۔ خاندانی روایت کے مطابق سب سے پہلے حافظ نعمت اللہ سرائے میری سے حفظ قرآن کیا۔ پھر کتب فارسیہ متداولہ سے فراغت کے بعد مفتی محمد یوسف فرنگی محلی کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے اور انھیں کی خدمت میں درس نظامیہ کی تکمیل کی۔ مفتی صاحب نے فراغت کے موقع پر جو سند انھیں لکھ کر دی تھی وہ ان کے علمی کمال پر روشن دلیل ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم یہاں سند نقل نہیں کر رہے ہیں۔

علوم ظاہری کی تحصیل و تکمیل کے بعد آپ نے علوم باطنی کی جانب توجہ کی اور اپنے والد ماجد کے تلمیذ رشید حضرت سید خواجہ احمد نصیر آبادی کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف بیعت حاصل کیا اور مدت تک سید صاحب کی خدمت میں رہ کر فیضان روحانی سے مستفید ہوتے رہے۔ اسی زمانہ میں خواجہ احمد نے آپ کے دل میں حدیث کا شوق پیدا کر دیا چنانچہ اپنے مرشد کے حکم سے مولانا سید نذیر حسین دہلوی کی خدمت

(۱) القول الجلی ص۸

میں صحاح ستہ کے علاوہ دوسری کتب حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، ان جملہ کمالات کے بعد ۱۲۸۶ھ میں اپنے شفیق مربی اور نانا قاضی ضیاء اللہ کی معیت میں زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔

اس مبارک سفر سے واپسی کے بعد علوم دینیہ کی خدمت میں اپنے اسلاف کی طرح مصروف ہو گئے۔ بالخصوص مدرسہ قرآنیہ کے انتظام و انصرام میں کافی دلچسپی لی اور جو مدرسہ اب تک صرف حفظ قرآن کی خدمت انجام دے رہا تھا اس میں اتنی ترقی ہوئی کہ درس نظامیہ کی مکمل تعلیم ہونے لگی۔

۲۱ رمضان ۱۳۰۳ھ کو بعمر ۶۵ سال اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔

(۴) مولانا ابوالخیر محمد مکی۔ ان کی ولادت ۱۵ جمادی الثانی ۱۲۷۴ھ کو مکہ معظمہ میں ہوئی والد مرحوم کی وفات کے بعد اپنی والدہ اور علاتی بھائی مولانا جنید کے ساتھ جونپور تشریف لائے۔ سن تمیز کو پہنچے تو حافظ نعمت اللہ بڑے میری سے حفظ کلام پاک شروع کیا اور حافظ احمد جونپوری سے تکمیل کی اسی زمانہ میں کتب فارسیہ سے فراغت حاصل کر لی۔ اس کے بعد اپنے برادر بزرگ مولانا محمد شبلی سے عربی کتابیں شروع کیں۔ مختصرات کو ان کی خدمت میں مکمل کر کے ۱۲۹۲ھ میں مولانا حکیم محمد عبداللہ چھپراوی تلمیذ رشید مفتی محمد یوسف سے متوسطات شروع کیں اور کچھ کتابیں مولانا سعادت حسین عظیم آبادی تلمیذ مولانا سخاوت علی اور محمد اکرم آروی سے پڑھیں اور تکمیل ابوحنیفہ وقت حضرت مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کی خدمت میں کی۔

اس کے بعد حضرت سید ضیاء النبی بریلوی کی خدمت میں حاضر ہو کر سلوک کے راہ میں قدم رکھا اور ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہ کر اس راہ کی بھی تکمیل فرمائی۔

بعد ازاں درس و تدریس وعظ و افتاء اور اپنے پیشرو بزرگوں کی طرح مدرسہ قرآنیہ کے انتظام میں ہمہ تن منہمک ہو گئے۔ مولانا کی حیات تک یہ مدرسہ علوم ظاہری و باطنی کا ایک سنگم تھا اور مدرسہ ہر اعتبار سے ترقی پذیر تھا اور ہندوستان کے مشہور مدارس میں اس کا شمار ہوتا تھا مگر مولانا کے بعد مدرسہ میں وہ رونق باقی نہ رہی۔

وہ دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

آپ نے ۱۳۳۲ھ میں وفات پائی۔ [۱]

تلامیذ یوں تو مولانا کے چشمۂ علم و فضل سے بے شمار تشنگان علوم سیراب ہوئے مگر ان میں مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی، مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی، مولانا کرامت علی اور ان کے برادر خورد مولانا رجب علی

---

(۱) القول الجلی ص ۹ و نزہۃ الخواطر ص ۵ ج ۸

جونپوری، مولانا شاہ امیر علی جونپوری، مولانا غلام جیلانی غازیپوری، مولانا فیض اللہ مئوی اعظمی، مولانا شیخ محمد محدث مچھلی شہری، مولانا محمد یعقوب بہاری، مولانا رحیم اللہ بستوی ارشد تلامذہ میں ہیں اور ان میں سے ہر ایک آسمان علم وفضل کا مہر درخشاں تھا۔

بوئے گل در برگ گل کا بقیہ صفحہ (۲۸)

کو اعمالِ ظاہر پر اعتراض کا اور فرشتے کو حضور باطن پر طعن کا موقع نہ ملے، خواہش اتباع مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہو اور دیدۂ دل مشاہدۂ حضرت حق سبحانہٗ سے بینا ہو۔ اللہ تعالیٰ اس بیر عمر ضائع کردہ کو اور تمام دوستوں کو اس طریقے پر توفیق عمل عطا فرمائے نیز ہر دو توجہ (یعنی توجہ بحضرت حق سبحانہٗ اور توجہ بحضرت حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم) نقد وقت فرمائے۔ آمین آمین آمین۔

محمد منظور نعمانی

تحدیث نعمت

کیا دیکھا کن کو پایا

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عربی تعلیم شروع ہونے کے بعد جس مدرسہ میں بھی پڑھنے کا اتفاق ہوا، وہاں اپنے اساتذہ سے اس دور کے بہت بڑے عالم و بزرگ اور شیخ وقت کی حیثیت سے سب سے زیادہ تذکرہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ہی کا سُنا، غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت کے مواعظ و ملفوظات اور دینی و اصلاحی کتابیں اُس وقت کثرت سے شائع ہو رہی تھیں اور مسلمانوں کی دینی اصلاح کے لیے حضرت ممدوح اُس زمانہ میں سفر بھی کثرت سے فرماتے تھے۔ شہروں شہروں وعظ ہوتے تھے بیعت و ارشاد کا سلسلہ بھی اُس وقت کے مشائخ حق میں جہاں تک اندازہ ہے سب سے زیادہ وسیع تھا، اور جماعت دیوبند کے مخالفین اہل بدعت اپنی بدگوئی اور معاندانہ پروپیگنڈے کا نشانہ بھی سب سے زیادہ آپ ہی کی شخصیت کو بناتے تھے۔ ان سب وجوہات سے ہمارے مدارس عربیہ اور دینی حلقوں میں میری طالب علمی کے ابتدائی دور میں سب سے زیادہ تذکرہ حضرت تھانوی ہی کا رہتا تھا۔ لیکن پہلی دفعہ زیارت کی سعادت ۱۳۴۲ھ میں اُس وقت حاصل ہوئی جب میں دار العلوم مئو (ضلع اعظم گڑھ) میں شرح عقائد، میر زاہد رسالہ اور دیوان متنبی وغیرہ پڑھ رہا تھا حضرت کی تشریف آوری کی اطلاع پہلے سے ہو چکی تھی، جس ٹرین سے حضرت تشریف لانے والے تھے، وہ ٹھیک دوپہر کے وقت پہونچتی تھی۔ موسم بھی سخت گرمی کا تھا، اس کے باوجود ہمارے مدرسہ کے

کے قریباً سب ہی اساتذہ اور ذمہ دار حضرات اور طلبہ، اور قصبۂ سنبھل کے بہت سے علماء کرام اور اصحاب وجاہت اور عام دیندار مسلمان بہت بڑی تعداد میں حضرت کی زیارت و استقبال کے لیے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے تھے۔

اس وقت لوگوں سے سنا تھا کہ حضرت کے ساتھ رفقاء سفر کی اچھی خاصی تعداد رہتی ہے۔ یہ سب مختلف مقامات کے مسترشدین اور طالبین اصلاح ہوتے ہیں جو صحبت سے استفادہ اور اپنی اصلاح و تربیت کے لیے حضرت سے اجازت لے کر سفر میں ساتھ ہو جاتے ہیں، ان میں سے ہر شخص اپنے مصارف کا بار خود ہی اٹھاتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے میزبان کو بھی مولانا اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ آپ کے ان رفقاء کو بھی اپنا مہمان بنالے۔ وہ لوگ ہر جگہ پہنچکر اپنے قیام کا انتظام بھی حضرت سے الگ بطور خود کسی دوسری جگہ کرتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ یہ سب پابندیاں اس لیے ہیں کہ کسی میزبان پر میزبانی و انتظام کا بار نہ پڑے۔ یہ بھی سنا تھا کہ ان سب باتوں کی بڑی سختی سے پابندی کی جاتی ہے۔

ٹرین اپنے وقت پر آئی۔ حضرت مولانا ٹرین سے اترے تو پہلی مرتبہ زیارت کی، جیسا کہ پہلے سن لیا تھا، حضرت کے ساتھ رفقاء سفر کی بھی اچھی خاصی تعداد اتری۔ لوگوں کو پہلے سے کہدیا گیا تھا کہ زیارت و مصافحہ کے لیے ہجوم نہ کریں۔ اس ہدایت پر سب نے عمل کیا۔ حضرت ٹرین سے اتر کر پلیٹ فارم ہی پر ایک جگہ دیوار کے سایہ میں کھڑے ہو گئے اور یہاں سب نے سلام اور مصافحہ کیا۔ اس ناچیز کو بھی یہ سعادت حاصل ہوئی۔ اب تک یاد ہے کہ حضرت کا ہاتھ ایسا نرم معلوم ہوتا تھا کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی ایسے نرم کسی ہاتھ کا دیکھنا یاد نہیں —— اس کے بعد حضرت اسٹیشن سے اپنی قیامگاہ تشریف لے گئے، دوسرے رفقاء کو جہاں جہاں جانا تھا وہاں چلے گئے، ہم مدرسہ واپس آگئے۔

یہ معلوم ہو گیا تھا کہ نماز عصر کے بعد قیام گاہ پر حضرت سے ملاقات ہو سکے گی، اس وقت مجلس بھی ہوگی اور رات کو بعد عشاء وعظ ہوگا۔ دار العلوم کے صدر مدرس حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی (علیہ الرحمۃ) جو گویا میرے سرپرست بھی تھے، زیارت و ملاقات کے لیے نماز عصر مدرسہ کی مسجد میں پڑھ کر حضرت کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے، میں بھی ساتھ گیا۔ حضرت حکیم الامت حضرت مولانا کریم بخش صاحب سے اچھی طرح واقف تھے، کھڑے ہو کر معانقہ فرمایا اور بڑے اکرام کا معاملہ فرمایا اور اصرار کر کے اپنے برابر میں بٹھایا۔ یہ مجلس کا وقت تھا۔ حضرت کے تمام رفقاء سفر بھی موجود تھے۔

اُن کے علاوہ شہر کے علماء و خواص کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ مغرب تک حضرت کی مجلس جاری رہی۔ مجلس سے اٹھ کر مغرب کی نماز حضرت کی اقتداء میں قریب کی مسجد میں پڑھی۔ حضرت حکیم الامۃ کی خدمت میں ناچیز راقم سطور کی یہ پہلی حاضری تھی اور یہ پہلی نماز تھی جو حضرت کی اقتداء میں پڑھی تھی۔ یہ یاد ہے کہ اس نماز میں حضرت کو اتنا پسینہ آیا تھا اور کرتے کا سارا بالائی حصہ اس طرح تر بتر تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ پانی اوپر سے انڈیل دیا گیا ہے! اسی وقت کسی سے سنا تھا کہ کسی زمانہ میں حضرت کو زہر دیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ کے فضل سے زندگی تو ختم نہیں ہوئی لیکن اس کے اثر سے مزاج میں ایسی حدت اور گرمی پیدا ہو گئی ہے اور یہ پسینہ اسی کے اثر سے ہے۔ واللہ اعلم۔

پھر عشاء کے بعد حضرت کا وعظ ہوا۔ بہت ہی بڑا مجمع تھا، اور یہ پہلا وعظ تھا جو راقم سطور نے حضرت کا سنا تھا، اس کے کچھ مضامین اور دلچسپ لطیفے اب تک یاد ہیں۔

اس کے بعد تین سال طالب علمی میں گزرے۔ شعبان ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم کے دورۂ حدیث سے فارغ ہوا اور شوال سے مدرسی کا دور شروع ہو گیا۔ کچھ ہی دنوں پہلے یہ عظیم تاریخی واقعہ یا حادثہ ہو چکا تھا کہ مکہ مکرمہ کے شریف حسین کو (جو ترکی حکومت اور خلیفۃ المسلمین سے بغاوت و غداری کر کے برطانوی حکومت کی خاص مدد سے حجاز پاک کا فرمانروا بن گیا تھا) نجد کی سعودی حکومت کے سلطان عبدالعزیز بن سعود نے شکست دیکر حجاز مقدس پر قبضہ کر لیا، اور اپنے مسلک کے مطابق وہاں کے بہت سے مزارات کے اُن قبوں کو منہدم کر دیا جن کو وہ شرعاً منکر اور "واجب الازالہ" سمجھتے تھے۔

حجاز پاک میں ہونے والے اس واقعہ نے یہاں ہندستان میں مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے متبعین اور قبر پرست متبدعین کو اس کا موقع فراہم کر دیا کہ وہ اکابر علمائے دیوبند وغیرہ علمائے حق کے خلاف جن کو وہ وہابی کہتے تھے افترا پردازی کا وہ بازار اور کاروبار پھر گرم کریں جو تحریک خلافت و ترک موالات کے اثر سے بالکل سرد پڑ گیا تھا ــــــ بہرحال بریلوی فتنہ پردازوں نے نجد کی وہابی سعودی حکومت کے قبہ شکنی کے واقعہ کو "قمیص حسین" بنا کر ہندستان کے طول و عرض میں پھر ایک طوفان برپا کر دیا۔ اور اکابر علمائے حق، خاص کر حضرت تھانوی کو اپنی تکفیر بازی کا خاص نشانہ بنایا۔

اس زمانہ میں ہمارا ضلع مراداباد بریلوی فرقہ کے مشہور زعیم و رہنما مولوی نعیم الدین صاحب مرادابادی کی وجہ سے اس فتنہ کا خاص مرکز تھا، گلی کوچے بلکہ گھر گھر یہی چرچا تھا، میری نو عمری کا زمانہ تھا، میں نے

اس حملہ کی مدافعت اور اس فتنہ کے مقابلہ کا فیصلہ کیا اور درس تدریس کے ساتھ اس زمانہ میں یہ بھی ایک مستقل شغل بن گیا۔ اس سلسلہ میں قلم سے بھی کام لینا پڑتا اور زبان سے بھی، دوبدو مناظروں کی بھی بار بار نوبت آئی — (جن کی مفصل روئداد یں بھی اسی زمانہ میں چھپ کر شائع ہوئی تھیں) چونکہ وہ لوگ سب سے زیادہ حملے حضرت حکیم الامت پر کرتے تھے اس لیے قدرتی طور پر مجھے انہی طرف سے مدافعت اور جوابدہی زیادہ کرنی پڑتی تھی، مگر اس کا مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے خود حضرت کو بھی اس کی کوئی خبر ہے یا نہیں، اگرچہ جی چاہتا تھا کہ حضرت کو اس کی اطلاع ہو، لیکن اس سلسلہ میں نہ کبھی حضرت سے خط کتابت کی نہ اس موضوع سے متعلق اپنا کوئی رسالہ یا کسی مناظرہ کی روئداد کبھی حضرت کی خدمت میں بھیجی۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ بات ہمارے حلقہ میں عام طور سے مشہور تھی کہ حضرت کو بریلویوں کی افترا پردازی کی طرف مطلق التفات نہیں ہے اور وہ ان ظالموں کے مسئلہ کو سپرد خدا کر کے اس اصول پر عامل ہیں کہ

"با خدا داریم کار و با خلائق کار نیست۔"

غالباً ۱۳۴۹ھ میں بریلویوں کے تمام مشہور الزامات و اعتراضات کے جواب میں راقم سطور نے ایک جامع کتاب "سیف یمانی" کے نام سے لکھی، اس میں حضرت تھانوی پر عائد کیے جانے والے بہت سے الزامات و اعتراضات کا جواب تھا، لیکن حضرت سے متعلق پنجاب کے کسی عقیدتمند شخص کے اس خواب کی بحث بہت مفصل تھی جس کی بنا پر بریلویوں کی طرف سے حضرت کے خلاف بہت ہی غلیظ پروپیگنڈا بہت وسیع پیمانے پر کیا گیا تھا۔ اور اس کو سن کر بہت سے خالی الذہن عقیدتمند بھی اپنی ناواقفی کی وجہ سے پریشان ہو جاتے تھے — اللہ تعالیٰ کی خاص مدد و توفیق سے "سیف یمانی" میں یہ بحث ایسی ہو گئی تھی، جو میرے نزدیک بہت ہی تشفی بخش تھی اور اس سے مسئلہ بالکل صاف ہو جاتا تھا۔ مجھے اس بحث کے بارہ میں بڑا اطمینان تھا اور بڑی خوشی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کی توفیق دی۔

اس کتاب (سیف یمانی) کے تیار ہو جانے پر میرا جی چاہا کہ حضرت تھانوی سے کوئی تعارف نہ ہونے کے باوجود گزارش کروں کہ وہ اس بحث کو ملاحظہ فرمالیں اور اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔

میں نے سنا تھا کہ حضرت حکیم الامۃ خط کتابت میں بھی بے ضرورت طوالت اور تکلف و تصنع کو بہت ناپسند کرتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ جو کوئی بات کرے یا خط لکھے تو ضرورت کے مطابق مختصر الفاظ میں صاف اور سیدھی بات لکھے۔ میں نے حضرت کی خدمت میں "سیف یمانی" کا ایک نسخہ

ڈاک سے بھیجا اور اس کے ساتھ عریضہ بھی لکھا، جس کا مضمون تعظیمی خطاب اور تحیۂ مسنونہ کے بعد یہ تھا۔

"مجھے حضرت سے تعارف کی سعادت حاصل نہیں ہے، اس لیے غالباً حضرت مجھ سے بالکل واقف نہ ہوں گے۔ میں دارالعلوم دیوبند کا چند سال پہلے کا ایک طالب علم ہوں، آج کل امروہہ کے مدرسہ اسلامیہ (محلہ چلّہ) میں کچھ اسباق پڑھاتا ہوں۔ بریلوی جماعت نے ہمارے اکابر کے خلاف جو طوفانی فتنہ آج کل برپا کر رکھا ہے، ایک ضروری دینی خدمت سمجھ کر اس کی تردید و مدافعت کا کچھ کام بھی اللہ تعالیٰ کی مدد و توفیق سے کر لیتا ہوں۔ اسی سلسلہ میں ایک کتاب "سیف یمانی" حال ہی میں لکھی ہے۔ اس کا ایک نسخہ آج ہی ڈاک سے ارسالِ خدمت کیا ہے۔ اگر حضرت کے اوقات و اشغال میں گنجائش ہو اور زحمت نہ ہو تو میرا جی چاہتا ہے کہ حضرتِ والا اس کتاب کو یا کم از کم اس کی صرف اُس بحث کو جو حضرت ہی کے متعلق ایک صاحب کے مشہور خواب کے بارے میں لکھی گئی ہے اور جو کتاب کے فلاں صفحہ سے فلاں صفحہ تک ہے، ملاحظہ فرمالیں اور اگر اصول کے خلاف نہ ہو اور کسی قسم کی گرانی اور زحمت نہ ہو تو حضرت اپنی رائے گرامی سے بھی مطلع فرمائیں لیکن اگر اوقات میں گنجائش نہ ہو یا کسی وجہ سے اس کا ملاحظہ باعثِ زحمت ہو تو مجھے بالکل اصرار نہیں ہے۔ اور اس صورت میں بھی کتاب کی واپسی کی زحمت فرمانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے محض ہدیہ کی نیت سے یہ کتاب حضرت کی خدمت میں بھیجی ہے۔ اگر قبول فرمائی جائے تو میرے لیے باعثِ منت و سعادت ہوگا ورنہ کسی کو بھی عنایت فرما دی جائے۔"

حضرت حکیم الامت کی خدمت میں یہ میرا سب سے پہلا عریضہ تھا۔ میں نے جواب کے لیے لفافہ بھی رکھ دیا تھا۔ چوتھے پانچویں دن حضرت کا جواب آیا۔ اپنے عام اصول و معمول کے مطابق میرے اس خط ہی پر جواب تحریر فرمایا تھا۔ اس جواب کے جو قابلِ ذکر اجزاء یاد رہ گئے ہیں وہ یہ تھے۔

"آپ کا خط پڑھ کے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے بغیر کسی تکلف کے اپنی بات صاف سیدھے انداز میں لکھ دی اور میرے اوقات اور اصول و مزاج کی بھی پوری رعایت کی، اس پر دل سے دعا نکلی۔

میں آپ سے ناواقف نہیں ہوں۔ آپ کا اور آپ کے کاموں کا ذکر سنتا رہا ہوں، اس لیے آپ سے غائبانہ محبت و تعلق ہے اور دعا کرتا ہوں۔

آپ کی تطییب خاطر کے لیے لکھتا ہوں کہ میں نے آپ کے ہدیہ کو دل سے قبول کیا۔ کتاب کو اسی ارادے سے کھولا کہ جستہ جستہ اس پر نظر ڈالوں گا اور خواب والی جس بحث کے لیے آپ نے خاص طور سے لکھا تھا اس کو پورا پڑھوں گا۔ لیکن جب کتاب پڑھنی شروع کی تو اس کے کسی حصے کو بھی چھوڑنے کو جی نہ چاہا اور جب تک پوری کتاب ختم نہ کر لی، اپنے مقررہ ضروری کاموں کے سوا کوئی دوسرا کام درمیان میں نہیں کیا۔ پوری کتاب سے جی بہت ہی خوش ہوا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ

خواب والی بحث کو خاص طور سے غور سے پڑھا۔ بے تکلف لکھتا ہوں کہ اگر میں خود کوشش کرتا تو مسئلہ کی ایسی اطمینان بخش وضاحت نہ کر سکتا۔ بارک اللہ تعالیٰ فی عمرکم و علمکم و عملکم۔

حضرت نے اپنے معمول کے مطابق یہ جواب میرے عریضہ ہی پر لکھا تھا۔ افسوس ہے کہ وہ خط محفوظ نہیں رہا لیکن اپنے عریضہ کا مضمون اور حضرت کے جواب کے یہ اجزا اچھی طرح یاد ہیں اور حافظہ کی مدد ہی سے یہاں لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت نے الگ سے "سیف یمانی" پر مختصر تقریظ بھی تحریر فرمائی جو اس کے ساتھ اسی وقت چھپ گئی تھی۔

جیسا کہ عرض کیا، حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ کے ساتھ خط کتابت کا یہ پہلا رابطہ تھا۔

پہلی حاضری:۔ غالباً ۵۰ھ (۳۱ء) میں بریلویوں کے ایک مشہور و بدنام، نہایت تیز زبان اور فتنہ پرداز مقرر و مناظر رنگون (برما) پہونچے۔ (برما اس وقت ہندستان ہی کا ایک صوبہ تھا) ان کی وجہ سے وہاں سخت فتنہ برپا ہو گیا۔ ہمارے اکابر سے تعلق رکھنے والے وہاں کے احباب و مخلصین نے مجھے خطوط لکھے اور تار پہ تار دیے۔ میں رنگون پہونچا۔ بریلوی مقرر صاحب کی فتنہ پردازی کے نتیجہ میں وہاں ان کے ایک جلسہ میں بلوہ اور فساد بھی ہو گیا اور معاملہ عدالت میں چلا گیا۔ وہاں کے دوستوں نے اصرار کیا کہ جب تک یہ قضیہ ختم نہ ہو جائے، تم یہاں سے نہ جاؤ۔ میرے لیے طویل قیام بہت مشکل تھا۔ وہاں کے ہماری جماعت کے بعض حضرات نے جو حکیم الامۃ سے خاص نیازمندانہ تعلق رکھتے تھے حضرت کی خدمت میں لکھا کہ حضرت والا اپنی طرف سے مجھے (محمد منظور نعمانی کو) تحریر فرما دیں کہ جب تک یہاں رنگون میں ضرورت ہو، وہ اس وقت تک یہاں قیام کرے۔ حضرت نے اس بارے میں مجھے براہ راست تو کچھ تحریر نہیں فرمایا لیکن اپنے سے خاص تعلق رکھنے والے ایک بزرگ عالم کو تحریر فرمایا کہ وہ مجھے حضرت کا یہ پیام پہونچا دیں کہ رنگون

کے مخلص احباب اس قضیہ کے ختم ہونے تک وہاں آپ کا قیام ضروری سمجھتے ہیں۔ اور وہ بیچارے ہمدردی اور رعایت کے مستحق ہیں پس اگر اسمیں آپ کا کوئی خاص حرج نہ ہو اور واپسی کی کوئی خاص ضرورت نہ ہو تو میں بھی اس کی سفارش کرتا ہوں۔

حضرت کا یہ پیام ملنے کے بعد میں نے قیام کا ارادہ کرلیا۔ اور غالباً حضرت کو بھی لکھدیا اور پھر کئی مہینے رنگون میں رہنا پڑا۔

رنگون کے اس قیام کے زمانہ میں ارادہ کرلیا تھا اور غالباً حضرت کو لکھ بھی دیا تھا کہ یہاں سے واپسی پر انشاء اللہ تھانہ بھون حاضر ہوں گا۔ چنانچہ کئی مہینے کے بعد جب واپسی ہوئی تو تھانہ بھون حاضر ہوا۔ حضرت حکیم الامۃ کی خدمت میں یہ پہلی حاضری تھی، صرف ایک دو دن قیام رہا۔ حضرت نے بڑی عنایتیں فرمائیں۔ اب تک حضرت کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، اس سے کچھ ایسا خیال قائم ہو گیا تھا کہ حضرت کے یہاں بڑی سختی ہے۔ بات بات پر دارو گیر ہوتی ہے لیکن مشاہدہ اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ بات بہت ہی غلط ہے۔ ہاں! یہ ضرور محسوس ہوا کہ لوگوں کی بے وقوفیوں اور بے اصولیوں سے اور تصنع اور بناوٹ سے (جس کا عام رواج ہو گیا ہے) حضرت کو سخت اذیت اور ناگواری ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے لوگوں پر ڈانٹ بھی ہو جاتی ہے۔

(باقی)

اپنی مخلصانہ رائے سے مطلع فرمایئے!

ناظرین کرام کو علم ہے کہ مولوی عتیق الرحمن سنبھلی جو قریباً ۲۳-۲۴ سال سے الفرقان کی ترتیب اور تیاری کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں اور در اصل عملاً وہی اڈیٹر ہیں، ادھر کئی سال سے خرابیٔ صحت کی وجہ سے اس حال میں ہیں کہ مسلسل کئی کئی مہینے ایسے گذر جاتے ہیں کہ الفرقان کیلئے وہ ایک سطر بھی نہیں لکھ سکتے اور اسکی دفتری اور انتظامی دیکھ بھال بھی کچھ نہیں کر سکتے، ادھر ۳-۴ مہینے سے مسلسل اُن کا یہی حال ہو اسلیئے اس شمارہ کیلئے بھی وہ کچھ نہیں لکھ سکے اور انکی اس حالت کی وجہ سے الفرقان کی اشاعت وقت پر نہیں ہو پاتی۔ یہ شمارہ بھی ناظرین کو غالباً ۳ ہفتے کی تاخیر سے ملے گا۔

دوسری طرف قریباً ۵-۷ سال سے (جب سے کہ حکومت پاکستان نے ہندستانی اخبارات اور رسائل کے داخلہ پر پابندی لگادی تھی جسکے بعد الفرقان کی خریداری نصف کے قریب رہ گئی تھی) اسکی مالی حالت اتنی کمزور ہو کہ ہر مہینے ساڑھے تین سو روپے کے قریب اس پر باہر سے خرچ کرنا پڑتے ہیں اور وہ اس طرح ابتک زندہ اور جاری رکھا جا سکا ہو۔ ——— گزشتہ کل (۱۰ شعبان ۱۰ ستمبر) کو مولوی عتیق الرحمن نے مجھ سے کہا کہ میں الفرقان کیلئے نہ کچھ لکھتا ہوں نہ اس سے متعلق کوئی کام دیکھتا ہوں لیکن میرے دل و دماغ پر اسکی بہت فکر اور بہت بوجھ رہتا ہو۔ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ اس کا بھی میری صحت پر بہت برا اثر پڑتا ہو۔ خود آپ پر بھی الفرقان کی فکر کا بہت بار پڑتا ہے۔ اسلئے بہت غور و فکر کے بعد میں نے آخری طور پر یہ رائے قائم کی ہو کہ ایک دو اشاعتوں کے بعد یا یہ اکتالیسواں سال اور اکتالیسویں جلد پوری کرکے ذی الحجہ کا شمارہ شائع کرکے اسکو بند کر دیا جائے۔ ——— اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اب جبکہ میری عمر کا ستروان سال ہے میں اس قابل نہیں رہا ہوں کہ الفرقان کی ترتیب تیاری کی پوری ذمہ داری دوبارہ سنبھال سکوں اسلیئے میرے لیے بھی راحت و سکون اسی میں ہو کہ مولوی عتیق الرحمن کی تجویز پر عمل کر لیا جائے۔ ——— لیکن جسمانی ضعف کے باوجود دل اسکے لیے آمادہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ دینی باتیں ہر مہینے ہزاروں بندوں تک اور دور دراز ملکوں تک پہونچانے کا جو ایک ذریعہ اور وسیلہ عطا فرما رکھا ہو اور جسکو محض اللہ تعالیٰ ہی کے فضل و کرم سے دینی اعتماد کا ایک خاص مقام بھی حاصل ہو، محض مشکلات کی وجہ سے از خود اسکو بند کر دیا جائے۔ شاید اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی جوابدہی بھی مشکل ہو۔

مولوی عتیق الرحمن نے یہ بات کل ایسے وقت مجھ سے کہی جبکہ اس شمارہ کی کاپیاں تیار ہو کر پریس جانے والی تھیں میں نے ضروری سمجھا کہ کسی فیصلہ سے پہلے یہ بات اُن مخلصین تک بھی پہونچا دی جائے جو الفرقان کو دینی خدمت کا ایک سلسلہ سمجھ کر اس سے مخلصانہ تعاون کا تعلق رکھتے ہیں اور وہ صرف خریدار نہیں بلکہ گویا رفیق اور شریک کار ہیں۔ ایسے حضرات براہِ کرم اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ اس بارہ میں آخری فیصلہ وسط رمضان تک انشاء اللہ کر لیا جائیگا۔ اور آئندہ شمارہ میں جو انشاء اللہ ۲۰ رمضان تک شائع ہو سکے گا اسکی اطلاع دیدی جائے گی ——— جاری رکھنے کے فیصلہ کیلئے سب سے زیادہ ضرورت اصحاب علم و قلم کے قلمی تعاون کی ہوگی اور اسکے بعد مالی سلسلہ میں تعاون کی جسکی سب سے سہل اور سب کے لیے آسان اور پائدار شکل یہ ہو کہ خریداروں کی تعداد دو چند کرنے کی مہم چلائی جائے ——— مخلص احباب اس سلسلہ میں اگر کوئی ذمہ داری لے سکیں تو اسوقت صرف ارادے اور عزم سے مطلع فرما دیں، انشاء اللہ فیصلہ میں اس سے مدد ملے گی، دعا بھی فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ صحیح فیصلہ کی توفیق دے اور مدد فرمائے وھو المستعان۔

محمد منظور نعمانی — ۱۲ شعبان ۱۳۹۳ھ

آپ بھی اپنی جلد کو
خوب سے خوب تر بنایئے!
اپنی جلد کو نرم، ملائم و صاف رکھنے کے لیے اور
مہاسوں اور دوسری جلدی تکلیفوں سے
بچنے کے لیے صافی سے اپنا خون صاف رکھیے۔
صافی
SAFI
THE BLOOD PURIFIER
خون صاف کرنے کی قدرتی دوا
SAFI
صافی
خون صاف کرتی ہے
جلد کو نکھارتی ہے
ہمدرد

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Kutchery Road, Lucknow U. P.

VOL. 41 NO. 7, 8 SEPTEMBER, 73 Phone No. 25547

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow 1

الفرقان
لکھنؤ

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
بنگلا دیش سے ۸/-
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت فی کاپی ۷۵ پیسے

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۴۱ | بابت ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۳ھ مطابق اکتوبر سنہ ۱۹۷۳ء | شمارہ ۹

اگر اس دائرہ میں ○ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۰ نومبر تک آجائے ورنہ اگلا پرچہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۸ تاریخ تک آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

بہت زیادہ مدت نہیں گزری، اب سے بس ۵۰۔۶۰ سال پہلے تک حج کا سفر بڑے مجاہدہ اور بڑے خطرہ کا سفر تھا، سمندری سفر یا تو بادبانی کشتیوں سے ہوتا تھا یا بہت گھٹیا قسم کے سست رفتار جہازوں سے، پھر جدہ سے مکہ مکرمہ اور پھر وہاں سے مدینہ طیبہ کا سفر اونٹوں سے ہوتا تھا، بدوؤں کی لوٹ مار کا خطرہ بھی پورے سفر میں سر پہ منڈلایا رہتا تھا۔ اسلیئے اکثر لوگ یہ سفر عمر کی آخری منزل میں کرتے تھے اور عام طور سے کفن ساتھ لے کے جاتے تھے۔ حرمین شریفین میں راحت و آرام کی وہ سہولتیں نہ تھیں جو دنیا کے ترقی یافتہ شہروں میں ہوتی ہیں، تجارت اور مالی منفعت کا بھی وہاں کوئی میدان نہ تھا، اول سے آخر تک بس مجاہدہ ہی مجاہدہ اور خطرہ ہی خطرہ تھا، — اس میں خیر کا بڑا پہلو یہ تھا کہ اللہ کی رضا و رحمت اور مغفرت و جنت اور روضۂ اقدس پر حاضری کی سعادت کے سوا کوئی اور مقصد عازمِ حج کے سامنے نہ ہوتا تھا۔

اب بہت بڑی تبدیلی حج کے سلسلے میں یہ ہو گئی ہے کہ اس مقدس سفر میں مجاہدہ کا پہلو قریب قریب ختم ہو گیا ہے۔ — بلاشبہ ہم جیسے ضعفا کے لیے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے لیکن اس کا ایک افسوسناک نتیجہ یہ بھی ہے کہ بہت سے دولتمند مسلمانوں کے لیے حج کا سفر بھی ایک "مقدس تفریح" بن گیا ہے۔ بس اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ سال بہ سال ہوائی جہاز سے نفلی حج کر کے جو کچھ حاصل کرتے ہیں اُن کے لیے وہ شر ہے یا خیر! — لیکن اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ جو دولت وہ حج کے سفر پر خرچ کرتے ہیں اگر وہ خیر کے دوسرے ضروری مصارف میں صرف کریں تو یہ ان کیلئے بہتر ہوگا۔ کاش انکو غور کرنیکی توفیق ملے!

حالات کی اس تبدیلی کے نتیجہ میں حج کے سلسلے میں ایک بہت بڑی خرابی جو نتائج کے لحاظ سے بہت سے فسق و فجور کے کاموں سے بھی بدتر ہے یہ پیدا ہو گئی ہے کہ بہت سے لوگ صرف دولت کمانے کے لیے اب حج کا سفر کرتے ہیں، یہاں سے غیر قانونی طور پر رقم یا کوئی سامانِ تجارت ساتھ لے جاتے ہیں اور وہاں سے ایسا تجارتی سامان جس سے یہاں زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہونے کی امید ہو مجرمانہ طور پر چھپا کے لاتے ہیں، پھر بعض اوقات کسٹم میں پکڑے بھی جاتے ہیں — بمبئی کے مخلص دوستوں نے جو یہاں سے جانے میں بھی اور وہاں سے واپسی پر بھی حضرات ضیوف اللہ حاجیوں کی خدمت اور مدد کرتے ہیں بڑے رنج اور دکھ کے

ساتھ تبلایا کہ اس طبقہ کی اس مجرمانہ حرکت کی وجہ سے یہ صورت پیدا ہوگئی ہو کہ کسٹم والے قریب قریب ہر حاجی کے سامان کی چوروں کی طرح تلاشی لیتے ہیں اور اُن کے لیے رشوت کی کمائی کا بہت بڑا دروازہ کھل گیا ہو۔ بیچارے بہت سے سیدھے سادے حاجی جنکے ساتھ کوئی چیز بھی خلاف قانون اور قابل اعتراض نہیں ہوتی رشوت دے کر اس ذلت و مصیبت سے نجات حاصل کرتے ہیں یہ سب کچھ اُن ظالم پیشہ وروں کی وجہ سے ہوتا ہو جنھوں نے حج جیسی مقدس عبادت کو ناجائز اور خلاف قانون تجارت کا ذریعہ بنا لیا ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کن الفاظ میں اس مجرمانہ حرکت کی مذمت کی جائے۔ ایسے لوگوں کو جو بھی سخت سے سخت سزا دی جائے برحق ہے۔

حج سے متعلق حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کا ایک نصیحت نامہ:۔

اب سے کئی سال پہلے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ سے بیعت و ارادت کا تعلق رکھنے والے ایک صاحب حج کو گئے تھے، وہاں سے انھوں نے حضرت کی خدمت میں عریضہ لکھا تھا اور نصیحت کی درخواست کی تھی، اسکے جواب میں حضرت نے جو گرامی نامہ لکھا تھا وہ نفع عام کے لیے ایک صاحب نے چھپوا بھی دیا تھا، ابھی حال میں وہ نظر سے گزرا، مناسب معلوم ہوا کہ اسکے بعض اقتباسات یہاں بھی درج کر دیے جائیں۔ اللہ تعالیٰ ناظرین کو خصوصاً سفر زمین حج کو ان سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے!

عنایت فرمایم! سلمہ۔ بعد سلام مسنون، تمہارا عنایت نامہ پہونچا، سب سے پہلے تو تمھیں حج کی مبارکباد دیتا ہوں، اللہ تعالیٰ حج و زیارت قبول فرمائے، تمہارے اس سفر کو دارین کی ترقیات کا ذریعہ بنائے، ۔۔۔ تم نے ہر موقع پر اس سیاہ کار کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھا، اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے اس احسان کا بہترین بدلہ عطا فرمائے، جب مدینہ پاک حاضری ہو تو اس سیاہ کار کی طرف سے بھی صلوٰۃ و سلام عرض کر دیں، بندہ کے نزدیک مکہ معظمہ کا ہدیہ طواف وغیرہ اور مدینہ پاک کا صلوٰۃ و سلام بہترین ہدیہ اور تحفہ ہے...... بندہ کی نگاہ میں مصلّی اور رومال، وغیرہ ہدایا کی کوئی وقعت نہیں کہ وہ کافروں کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں۔ ان کو مکہ مکرمہ کی خاک بھی نہیں لگ سکتی، ہدیہ بھی مشکل سے لگتی ہے۔۔۔ میں تو اپنے گھر والوں اور عزیزوں کے واسطے مکہ مکرمہ سے مسجد حرام کے قریب کے اور مدینہ پاک سے مسجد نبوی کے قریب کے پتھر لایا تھا، اور ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے گھر والوں کو دے دیئے تھے۔۔۔ اپنے دوستوں اور ملنے والوں کو بھی جب وہ حج کو جایا کرتے ہیں ہمیشہ یہ تاکید کر دیا کرتا ہوں کہ میرے لیے کوئی رومال مصلّی وغیرہ ہرگز نہ لاویں، میرا ہدیہ مکہ مکرمہ سے طواف و عمرہ ہے۔ اور مدینہ پاک سے صلوٰۃ و سلام...... یہی ہدایا ایسے ہیں جو میرے ساتھ آخرت میں بھی جا سکتے ہیں۔ اور رومال و مصلّی وغیرہ نہ میرا ساتھ دے سکتا ہے اور نہ آخرت میں میرے کام آسکتا ہے۔۔۔ تمھیں بھی نصیحت کرتا ہوں کہ تم جن عزیزوں اور دوستو کو بہتر تحفہ دینا چاہتے ہو، بالخصوص جو انتقال فرما گئے ہیں ان کو طواف و عمرہ کا ہدیہ دینا اس سے

اُن کی روح بھی خوش ہوگی اور تمہیں اس کا بہت زیادہ اجر ملے گا۔ اگر ہمت ہو تو اس ناکارہ کی طرف سے بھی کوئی عمرہ یا طواف کر دینا، اللہ جزائے خیر دے۔ یہ ناکارہ تمہارے لیے دل سے دعائیں کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حرمین پاک کی برکتوں سے مالامال فرمائے۔ وہاں کے آداب کی توفیق عطا فرمائے۔ وہاں کے قیام کا زمانہ بہت تھوڑا ہے اور یہ معلوم نہیں کہ دوبارہ یہ سعادت نصیب ہو سکے یا نہیں اس لیے ہر ہر منٹ اور ہر ہر سانس بہت قیمتی ہے اس کو بازاروں کے چکروں میں اور ادھر ادھر کی لغویات اور فضول باتوں میں ہرگز ضائع نہ کرنا۔

مکہ معظمہ میں جب تک قیام رہے کلمہ طیبہ اور استغفار میں کثرت سے مشغول رہنا اور جب سے مدینہ پاک کا سفر شروع ہو جائے اور وہاں کے قیام میں درود شریف کی جتنی کثرت ہو سکتی ہے دریغ نہ کرنا۔ میرا رسالہ فضائل حج اور فضائل درود اگر تمہارے پاس ہو تو اُس کو بہت اہتمام سے مطالعہ میں رکھنا اور اگر ہو سکے تو اپنے ساتھیوں کو بھی سناتے رہنا۔

تم نے لکھا ہے کہ بعد مغرب (حرم شریف کے) تبلیغی حلقہ میں شرکت ہوتی ہے تو یہ بہت مبارک ہے، جو صاحب بھی بعد مغرب کے تبلیغی حلقہ میں اردو میں تقریر کرتے ہوں اُن کو یہ میرا خط ضرور دیدیں کہ وہ دوستوں کو سنا دیں۔

اپنے معلم صاحب سے بندہ کا سلام کہدیں اور دعاؤں کی درخواست کر دیں کہ وہ بیت اللہ کے پڑوسی ہیں۔

ہر مدینہ جانے والے سے میری یہ درخواست ضرور کر دیں کہ روضہ اقدس (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) پر وہ میری طرف سے بھی صلوٰۃ وسلام عرض کر دیں۔

فقط والسلام

مسئلۂ بقائے الفرقان

گزشتہ شمارہ میں خاص حالات اور مجبوریوں کی وجہ سے الفرقان بند کر دینے کا جو خیال ظاہر کیا گیا تھا، وہ سب سے زیادہ خود میرے قلب و روح کے لیے اذیت ناک ہو سکتا تھا، لیکن زندگی میں ایسے موقع بھی آتے ہیں کہ عاجز بندہ بعض ایسے فیصلے کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو اس کی اپنی مرضی کے خلاف اور سخت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ مولوی عتیق الرحمن کے لیے صحت اور علاج کے نقطۂ نگاہ سے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ الفرقان کی ہر قسم کی فکر اور کام کے بارے آزاد اور یکسو ہو جائیں۔ دوسری طرف میں اب اپنے کو اس حال میں نہیں پاتا کہ اس کی ترتیب و تیاری اور اشاعت کی ذمہ داریاں پھر سے سنبھال سکوں۔ اس سب کے علاوہ آمد و صرف کا وہ غیر معمولی عدم توازن جس کا گزشتہ شمارہ کے نوٹ میں ذکر کیا گیا تھا اس کا تسلسل حد برداشت سے باہر ہے۔

ان حالات میں اپنے کو مجبور و بے بس محسوس کرتے ہوئے میں نے اس تکلیف دہ اور صبر آزما فیصلہ کے لیے اپنے کو کسی درجہ میں آمادہ کر لیا تھا، لیکن الفرقان کے ناظرین کا جو اُس سے اور اس عاجز سے خاص قسم کا دینی رابطہ اور تعلق رکھتے ہیں، یہ حق سمجھا تھا کہ اُن کے علم و اطلاع اور مشورہ کے بغیر آخری فیصلہ نہ کیا جائے، اس لیے پچھلے شمارہ میں وہ نوٹ لکھا گیا تھا۔

اس نوٹ کے جواب میں مخلصین کے جو خطوط بڑی تعداد میں اب تک آئے ہیں اور برابر آ رہے ہیں، اُن سے معلوم ہوا کہ اللہ کے بہت سے اچھے بندوں کو الفرقان کے ساتھ اُس سے بہت زیادہ گہرا تعلق ہے اور وہ اس کی افادیت اور ضرورت کو اُس سے کہیں زیادہ محسوس کرتے ہیں جتنا میرا اندازہ تھا۔ یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کا اس بندہ پر بڑا انعام اور محض فضلِ ربی ہے، اِس نعمت کی قدر اور شکر کی اللہ تعالیٰ اس عاجز کو توفیق عطا فرمائے۔

ان خطوط کے بعد الفرقان کے بند کرنے کا تو کوئی جواز نہیں رہا، بنام خدا جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اللہ تعالیٰ مشکلات کو آسان فرمائے۔ ان میں سے بہت سے بلکہ قریب قریب سب ہی خطوط اس کے مستحق ہیں کہ ان کو الفرقان میں شائع کر دیا جائے لیکن اس کے محدود صفحات

میں اس کی گنجائش نہیں تاہم چند خطوط جن سے بہ حاجت زیادہ متاثر ہوا نذر ناظرین کیے جارہے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا خط میرے خاص عنایت فرما مشہور و قدیم خادم ملت قاضی محمد عدیل عباسی ایڈوکیٹ (بستی) کا ملا تھا جو بجائے خود ایک مفید اور دلچسپ مضمون بھی ہے اس لیے اس کو بجنسہٖ درج کیا جارہا ہے۔

بستی۔ ۷ر ستمبر ۱۹۷۲ء

مکرمنا جناب مولانا صاحب۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ

"الفرقان" بابتہ ماہ رجب و شعبان آج کچہری میں ملا۔ اس وقت بعد نماز مغرب حسب معمول لوگ بیٹھے ہیں اور میں "الفرقان" کے اسباق پڑھ کر سنا رہا ہوں۔ آخری صفحہ کا مضمون پڑھ کر کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ اپنی زندگی میں "الفرقان" بند کرنے کا خیال فرمائیں گے۔ ہر اس معاملہ میں جہاں انسانی ذہن کو الجھن ہوتی ہے۔ "الفرقان" ایک واضح حل پیش کر کے تسکین قلب و اطمینان روح کا سامان مہیا کرتا ہے۔ شریعت طریقت و معرفت کا ایک ایسا پر نور امتزاج جو الفرقان میں ملتا ہے وہ کسی دوسرے رسالے میں ہندوستان کے اندر نہیں ملتا۔ یہ رسالہ ایک مینارۂ نور ہے اور اس سے ہزاروں کی تعلیم و تربیت ہوتی ہے اس کا بند ہونا ملت اسلامیہ کا ایک عظیم خسارہ ہوگا۔

آپ نے اپنی عمر کا تذکرہ کیا ہے کہ ستر سال ہو گئے اور یہ ایک وجہ رسالے کو بند کرنے کی بتلائی ہے۔ مودبانہ التماس ہے کہ یہ ایک ایسی وجہ رسالے کو جاری رکھنے کی ہے جس سے قوی تر کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، اگر قویٰ میں اضمحلال کا اندیشہ ہے تو ظاہر ہے وہ دوڑ دھوپ جو خدمت دین کی ہوتی ہو اس میں کچھ رکاوٹ پڑ سکتی ہے لیکن رسالہ کے جاری رہنے سے دینی جذبہ کی بیداری، اغلاط کی اصلاح، بدکرداریوں اور بدعقیدگیوں سے اجتناب کی رغبت دلانے کا کام الغرض امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام آرام سے بیٹھے بیٹھے اس رسالے کے ذریعہ انجام پاکر ہزاروں بندگان خدا کی اصلاح اور ان کا تعلق اللہ سے جوڑنے کی خدمت انجام پاسکتی ہے۔

دوسری بات جو میرے لائن کی ہے وہ بھی عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ ستر سال کی عمر ریٹائر ہونے کی عمر تصور نہیں کی گئی ہے۔ صدر جمہوریہ ہند ۷۷ سال کے ہیں اور بہت سے قومی رہنما ستر سال سے زیادہ ہیں۔ میں چوہتر سال کا ہوں اور دنیا کی خرافات میں مبتلا ہوں پھر دین کے کام سے ستر سال کی عمر میں دستکش ہونا تو میری سمجھ میں نہیں آسکتا ہے۔

یہاں ایک گورنر تھے، ان کا نام بھول رہا ہوں۔ انھوں نے یہ خیال قائم کیا کہ دکن میں جو ہندوؤں کے متبرک مقامات ہیں وہاں سنسکرت کے پاٹھ شالے قائم کیے جائیں، چنانچہ انھوں نے چندے کی اپیل کی اور پانچ لاکھ روپیہ ہوا تو وہ برس پڑے کہ اس حقیر رقم سے کیا ہوگا۔ چنانچہ پندرہ لاکھ روپیہ جمع ہوا اور ہمارے ضلع کے ڈاکٹر کملا دت ترپاٹھی اس کے سکریٹری مقرر ہوئے بہت سے سنسکرت پاٹھ شالے قائم ہوئے اور سنسکرت کی تعلیم ہونے لگی تب گورنر صاحب نے ڈاکٹر کملا سے کہا کہ آپ جا کر پورے دکن کا دورہ کر کے ایک مفصل رپورٹ تیار کیجیے۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر اس وقت قریب ۷۲ سال کی تھی، دو سال قبل کا واقعہ ہے۔ وہ دو ماہ اپنی زرخیز پریکٹس چھوڑ کر دکن گئے۔ جگہ جگہ گھومے اور لوٹ کر ایک کتابچہ بطور رپورٹ مرتب کیا۔ وہ انگریزی میں تھا، عبرت کے لیے میں اُسے اپنے دوستوں کو دکھانا چاہتا تھا مگر کہیں گم ہوگیا۔

ابھی چند مہینوں کی بات ہے کہ لکھنؤ کے ایک جلسہ میں ڈاکٹر کملا صاحب گئے۔ وہاں گورنر صاحب بھی آئے تھے۔ ڈاکٹر کملا صاحب نے کہا کہ میری عمر اب زیادہ ہوگئی ہے اس لیے میں استعفا دینا چاہتا ہوں تو گورنر صاحب ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے اور للکار کر بولے کہ کیا کہا میری عمر ۸۵ سال ہے اور میں کٹک سے آیا ہوں اور تم اسی عمر میں ریٹائر ہونے کی بات کرتے ہو، ڈاکٹر کملا صاحب کہتے ہیں کہ میں دم بخود رہ گیا۔

آپ نے (۱) اصحاب علم و قلم کے قلمی تعاون اور (۲) خریداروں کی تعداد دوچند کرنے کے لیے لکھا ہے تاکہ پرچہ چل سکے، یہ دونوں باتیں ٹھیک ہیں اور اگر گستاخی نہ تصور ہو تو عرض کروں کہ آپ کو صرف ان ہی دو باتوں کی اپیل کرنی چاہیے تھی میں نہ اصحاب علم میں ہوں نہ اصحاب قلم میں۔ آپ کا رسالہ یکسر دینی ہے اور اس کا معیار بہت بلند ہے اس لیے اس سے ذمہ بری ہوں البتہ اگر میرے بس کے مثلاً تاریخ اسلام سے متعلق مضامین کی گنجائش ہو تو

ہر ماہ ایک تحقیقی مضمون دے سکتا ہوں، خریداری کے لیے میں فوراً دس خریدار مہیا کر دوں گا اور مزید کے لیے کوشش کروں گا۔ مگر التماس ہے کہ خدارا ایسا قدم نہ اٹھائیے گا۔ جی چاہتا ہے کہ ایک شعر لکھ دوں ؎

خسروا در عشق بازی کم ز ہندو زن مباش ۔۔۔ کز برائے مردہ سوزد زندہ جان خویش را

اور اسی کے ساتھ گستاخی کی وجہ دوسرا شعر ہے ؎

مقام معرفت میں مرحلے ایسے بھی آتے ہیں ۔۔۔ جہاں رہبر نشان رہرواں سے راہ چلتے ہیں

خادم عادل

محترمی مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی نے اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرمایا ہے

اس ماہ کے "الفرقان" کے آخری صفحہ کے مطالعہ سے بہت تکلیف ہوئی "بیّن الحرم" کے سلسلہ میں اس قسم کے حالات سے گزر چکا ہوں، اس لیے آپ کے درد و کرب کا بہتر طریقہ سے اندازہ کر سکتا ہوں۔ "الحرم" تو صرف پانچ سال جاری رہ سکا۔ آپ نے "الفرقان" کو چالیس سال تک اپنے خون جگر سے سینچکر پروان چڑھایا ہے اور ملت نے اس سے بہترین روحانی غذا حاصل کی ہے، یہ آپ کی ہی متاع نہیں بلکہ ملت کا بہترین سرمایہ ہے، ملت اسلامیہ کی اس سے محرومی بڑی بدنصیبی ہوگی۔ .....

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ جناب کے عزم و ہمت میں برکت دے۔

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی "الفرقان" کے مستقل قلمی معاون ہیں، مولانا کی نگاہ کمزور تو پہلے سے تھی لیکن ادھر کچھ عرصے سے یہ حال ہے کہ خود لکھنا پڑھنا بہت مشکل ہے، رمضان مبارک کے بعد آنکھ کا آپریشن کرانے کا ارادہ ہے، ناظرین بھی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ آپریشن کو کامیاب فرمائے (اسی لیے مولانا کی اس حالت کا یہاں ذکر کر دیا گیا ہے) مولانا موصوف نے الفرقان کے بارے میں اپنے تازہ مکتوب میں تحریر فرمایا ہے۔

الفرقان کے متعلق آپ کا نوٹ پڑھوا کر سن لیا تھا جس کا قلب پر بیحد

اثر ہوا۔ الفرقان آپ کی زندگی میں بند نہیں ہونا چاہیے بلکہ آپ وصیت فرمائیں کہ آپ کے بعد بھی یہ پرچہ چلتا رہے۔ اس کے ذریعہ منجملہ اور اہم کاموں کے یہ اہم کام بھی ہو گیا کہ آپ کے مطالعہ کا اور تعلیقات و ترقیمات کا ایک بڑا ذخیرہ مرتب ہو گیا، جس میں مناظرے بھی ہیں، تصوف و سلوک بھی ہے، قرآن پاک کی تشریح اور ترجمانی بھی ہے اور احادیث کے دفتر بھی ہیں یہ سلسلہ نہ ہوتا تو شاید آپ اپنے طور پر ایک جگہ بیٹھ کے یہ کام انجام نہ دے سکتے خود میرے تراجم و تلخیصات بھی "الفرقان" ہی کے ذریعہ سے لکھے گئے، ورنہ میں انتہائی درجہ کا لاابالی انسان ہوں، آپ کی دعاؤں، توجہات نیز میاں عتیق الرحمٰن سلمہ کی تحریر و تاکید نے مجھے کچھ نہ کچھ لکھنے پر مجبور کیا اور اس طرح یہ کام ہو گیا ....

الفرقان جیسے پرچے روز روز نہیں نکلا کرتے بند کرنے کا نام نہ لیجئے!

والسلام

محترمی مولانا عبدالوحید صاحب فتحپوری نے تحریر فرمایا ہے۔

"الفرقان" میں لے بند کر دینے کا ذکر پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ ایسا مفید دینی معیاری پرچہ بند ہو جائے تو یقیناً پوری امت کی بدنصیبی ہو گی۔ احقر کو مولانا عتیق صاحب کی معذوری کا پوری طرح علم ہے، ان کی صحت کے لیے دعائیں کرتا رہتا ہوں ..... یہ بھی صحیح ہے کہ حضرت والا کی عمر جس دور سے گزر رہی ہے اس میں زیادہ محنت کا تحمل نہیں ہو سکتا، ان سب امور کے علم میں ہونے کے باوجود یہ تمنا ہے کہ الفرقان زندہ رہے، اس میں استحکام ہو، اشاعت میں اضافہ ہو۔ اللہ تعالیٰ احقر کی یہ تمنا پوری کرے! آمین! معاونین کے اضافہ کی کوشش احقر بھی کر سکتا ہے۔ انشاء اللہ پوری سعی و جہد کرے گا ...... احقر درخواست کرے گا کہ حضرت والا فیصلہ پر نظر ثانی فرمائیں اور بعید سے بعید امکان بھی اگر نکل سکے تو اس کو جاری رکھیں، اس وقت تو یہی فیصلہ فرمالیں ..... احقر کے نزدیک امت کی بہترین خیر خواہی اسی میں ہے ..... والسلام۔

بنگام (میسور) کے ایک مخلص دوست قطب الدین ملا صاحب نے لکھا ہے۔

تازہ الفرقان میں آخری صفحہ پر الفرقان سے متعلق چند سطور پڑھ کر بہت متاثر ہوا چند باتوں کی طرف توجہ دلانے کی جسارت کرتا ہوں۔

(۱) الفرقان دور دراز مقامات پر اور بہت سے بیرونی ممالک میں بھی جاتا ہے اور اللہ کے بندوں کی بہت بڑی تعداد کو اُس سے دینی فائدہ پہونچتا ہے، اُس کے بند ہونے سے ہزاروں بندوں تک دین کی بات پہونچنے کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

(۲) تبلیغی جماعت کا اپنا کوئی آرگن نہیں ہے اور اس کے لیے یہی صحیح ہے کہ وہ بس اپنے طریقہ پر دین کا کام کرے۔ لیکن ضرورت کے موقعوں پر اُس کی تحریری حمایت اور اُس کی طرف سے علمی مدافعت کا کام الفرقان ہی کے ذریعہ ہوتا رہا ہے، ان حالات میں اگر خدانخواستہ الفرقان بند ہو گیا تو جماعت کی طرف سے علمی مدافعت کا یہ واحد ذریعہ بھی ختم ہو جائے گا اور یہ بہت بڑا نقصان ہوگا۔

(۳) مختلف دینی تحریکیں اس وقت میدان عمل میں ہیں لیکن دین کی تعبیر اور تشریح میں بڑی بڑی سنگین غلطیاں ان کی وجہ سے پھیلتی ہیں، ایسے موقعوں پر امت کو الفرقان سے جو رہنمائی ملتی ہے ہمارے علم میں اُس کا کوئی بدل نہیں ہے، اگر خدانخواستہ الفرقان کو آپ نے بند کرنے کا فیصلہ کیا تو دین کے حق میں یہ بہت بڑا المیہ ہوگا۔

(۴) ہم جیسے ہزاروں لوگ جو ہزاروں میل کے فاصلے پر رہتے ہیں اُن کے لیے آپ سے تعلق کو تازہ رکھنے کا بھی الفرقان ہی واحد ذریعہ ہے جس کے ذریعہ ہر ماہ ایک نئی صحبت کا لطف حاصل ہوتا رہتا ہے اس کا بند ہونا ہزاروں کو اس سے مایوس اور محروم کرے گا۔......

اس لیے عاجزانہ درخواست ہے کہ اس کو جاری رکھنے کا فیصلہ فرمائیں، جو تحریری اور مالی مشکلات درپیش ہیں اُن کے حل کے لیے کوشش کی جائے۔ امید ہے کہ اس کو جاری رکھنے کا فیصلہ فرما کر امت پر احسان فرمائیں گے۔ والسلام

ان کے علاوہ بھی جو خطوط اس سلسلہ میں آئے ہوئے ہیں اُن سب ہی میں اس عاجز کے اور الفرقان کے بارہ میں ایسے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے جن کی قدر اور اُن کا احترام کرنا اور

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

درسِ قرآن (مرکز والی مسجد)

۱۲ راگست سنہ ۷۳ء

○ **ابراہیمؑ** جو سب اہل ادیان کے مسلم مقتدا ہیں توحید خالص کے علمبردار تھے

○ **ہمارے** ان پیغمبر (محمد صلعم) کا طریقہ بعینہٖ ابراہیمی طریقہ ہے

○ **راہِ حق** کی طرف دعوت کے بارے میں اہم ہدایات

حمد و صلوٰۃ اور اعوذ اور بسم اللہ کے بعد

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَاٰتَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ ثُمَّ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ

هِيَ أَحْسَنُ ؕ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۝ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ۝ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ ۝

(سورۃ النحل آیت ۱۱۹ تا ۱۲۸)

بیشک ابراہیم (علیہ السلام) بڑے مقتدا اور عظیم پیشوا تھے، اللہ کے پورے فرمانبردار بندے تھے، ہر طرف سے رخ موڑ کے پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ ہی کے ہو گئے تھے اور وہ ہرگز اہل شرک میں سے نہ تھے، اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے، اللہ نے ان کو اپنے خاص انعام اور منصب نبوت کے لیے) منتخب کر لیا تھا۔ اور صراط مستقیم کی ہدایت سے نوازا تھا اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی بھلائی اور بہتری دی، اور وہ آخرت میں بھی (ہمارے خاص) عباد صالحین میں سے ہوں گے۔ پھر اے پیغمبر! ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ تم ابراہیم والے طریقہ ہی پر چلو، جنھوں نے ہر طرف سے منھ موڑ کر خدا ہی کی طرف رخ کر لیا تھا، اور وہ مشرکوں سے بالکل الگ تھے

یوم السبت (ہفتہ کے دن) کے خاص احکام تو صرف ان لوگوں پر عائد کیے گئے تھے، جنھوں نے اس کے بارے میں خلاف کیا تھا، اور یقیناً تمہارا پروردگار قیامت کے دن ان امور کا (خاص طور سے) فیصلہ فرمائے گا جن کے بارے میں وہ باہم اختلاف رکھتے تھے۔

اے پیغمبر! آپ لوگوں کو اپنے پروردگار کی راہ کی طرف حکمت سے اور موعظہ حسنہ سے بلائیے (یعنی دین حق کی دعوت کے لیے حکمت و دانش اور موعظہ حسنہ کا طریقہ اختیار کیجیے) اور اس طریقے سے بحث کیجیے جو مستحسن ہو۔ تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے ان کو جو اس راہ سے بھٹک گئے ہیں، اور ان کا بھی اس کو پورا علم ہے جو ہدایت یاب ہیں۔

اور اے اہل ایمان اگر تم مخالفین سے زیادتی کا بدلہ لینے لگو تو جوابی کارروائی بھی بس اتنی

ہی زیادتی کرو جتنی اُن کی طرف سے تم پر زیادتی کی گئی تھی، اور اگر صبر کرو (اور قدرت حاصل ہو جانے پر مخالفین کے ظلم وجفا کا بدلہ نہ لو) تو صبر کا یہ رویہ صابرین کے حق میں بہت ہی اچھا ہے۔ اور اے پیغمبر تم تو صبر ہی کو اختیار کرو اور تمہارا یہ صبر کرنا اللہ ہی کی توفیق سے ہوگا اور ان منکرین کے حال پر تم غم نہ کھاؤ اور نہ ان کی مخالفانہ چالوں سے دل تنگ ہو۔ یہ یقینی ہے کہ اللہ تعالیٰ (اور اُس کی پوری مدد و نصرت) ان بندوں کے ساتھ ہے جو پرہیزگاری اور نیک کرداری کے ساتھ زندگی گزارنے والے ہیں۔

(سورۂ نحل آخری رکوع آیت ۱۱۹ سے ۱۲۸ تک)

(تفسیر و تشریح) یہ سورۂ نحل کا سولہواں[16] اور آخری رکوع ہے اور اسی پر چودھواں[14] پارہ بھی ختم ہوتا ہے۔ اسی درس کے سلسلے میں میں نے کئی دفعہ یہ ذکر کیا ہے کہ قرآن مجید کی اکثر بڑی سورتوں میں ایسا ہے کہ اس کا آخری حصہ گویا مقطع کا بند ہوتا ہے اور اس میں اس کے خاص پیغام کا خلاصہ آجاتا ہے۔ اس آخری رکوع کی بھی یہی نوعیت ہے۔

یہ سورت جیسا کہ میں بتلا چکا ہوں مکی ہے اور اس کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کی ہے جب مکہ میں آپ کی دعوت پر کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ اس سورت کا خاص موضوع توحید کی دعوت اور شرک کا رد ہے۔

اگرچہ ضمنی طور پر وحی و رسالت اور قیامت، آخرت اور وہاں کی جزا سزا کا ذکر بھی فرمادیا گیا ہے جیسا کہ قرآن مجید کا طریقہ ہے ۔ اور توحید کی دعوت کے سلسلے میں بھی اس سورت میں یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں بندوں کو اس زندگی میں مل رہی ہیں اُن کا بڑی تفصیل سے ذکر کر کے فرمایا گیا ہے کہ تمہارا جو رب تم کو ان نعمتوں سے نواز رہا ہے اُس کا حق ہے کہ بس اسی کی عبادت کرو، اُس کے شکر گزار بندے بنو، اسی سے اپنی حاجتیں مانگو اور کسی دوسری ہستی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور اُس کے قہر اور عذاب سے ڈرو۔

مکہ کے مشرکین اپنے کو ابراہیم علیہ السلام کا وارث اور ملت ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے، اہل کتاب یہود و نصاریٰ بھی اپنی نسبت ابراہیم علیہ السلام ہی سے جوڑتے تھے اور کہتے تھے کہ اُن کا طریقہ وہی تھا جو ہمارا طریقہ ہے۔ گویا ان سب ہی کو مخاطب کر کے سورہ نحل کے اس آخری

رکوع میں پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے " اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ حَنِيْفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ " ۔ اُمت کے معروف و مشہور معنی تو وہی ہیں جس میں ہم اور آپ اس لفظ کو بولتے ہیں یعنی گروہ اور جماعت ۔ اس آیت میں ابراہیم علیہ السلام کو اُمت کہا گیا ہے (اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً) تو اس معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابراہیم علیہ السلام اگرچہ بظاہر ایک فرد تھے لیکن اپنی صفات اور غیر معمولی شخصیت کے لحاظ سے گویا ایک پوری اُمت اور قوم تھے جیسے کہ ہمارے محاورہ میں بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی اپنی ذات سے ایک انجمن ہے ۔ " اُمَّة " کے دوسرے معنی امام اور مقتدا کے بھی ہیں یعنی وہ ہستی جس کی اقتدا اور پیروی کی جائے ۔ اگر یہ معنی لیے جائیں تو پھر سیدھا مطلب یہ ہوگا کہ بلاشبہ ہمارے بندے ابراہیم انسانی دنیا کے لیے امام اور مقتدا تھے ۔ آگے فرمایا گیا ہے " قَانِتًا لِلّٰهِ حَنِيْفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ " یعنی وہ ہمہ تن اللہ کے فرمانبردار تھے اور انھوں نے ہر طرف سے اپنا رُخ موڑ کے پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ کی طرف رُخ کر لیا تھا اور وہ اہل شرک میں سے نہیں تھے یعنی وہ شرک اور اہل شرک سے بیزار اور خالص توحید کے علمبردار تھے ۔ پس جو لوگ کسی بھی قسم کے شرک میں مبتلا ہیں خواہ وہ مشرکین عرب ہوں یا یہود و نصاریٰ ، وہ ہرگز ہمارے بندے ابراہیم کے راستہ پر نہیں ہیں ، اور ان کا ملت ابراہیمی سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ آگے فرمایا گیا ہے " شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ " یعنی وہ اللہ کی نعمتوں کے شکرگزار تھے ۔ " اِجْتَبٰهُ وَهَدٰهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ " یعنی اللہ نے ان کو نبوت و امامت کے منصب عظیم کے لیے منتخب اور ممتاز کیا تھا اور صراط مستقیم کی ہدایت سے نوازا تھا ۔

" وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ " یعنی ہم نے اس دنیاوی زندگی میں بھی ان کو خوبی اور بھلائی عطا کی تھی اور آخرت میں وہ ہمارے خاص صالح بندوں میں ہوں گے ۔ اس دنیا میں ابراہیم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی جو خاص عنایت ہے جس کو فرمایا گیا ہے " وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً " اس کا ایک ظہور ہے کہ تمام اہل ادیان ان کا احترام کرتے ہیں ان کو اپنا مقتدا مانتے ہیں اور ان کے بعد ان کی نسل میں نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری رہا ، اور خانہ کعبہ جس کو انھوں نے اللہ کے حکم سے مرکز عبادت بنایا تھا اس کی وجہ سے بھی ان کا ذکر خیر جاری ہے ۔ اور حج اور قربانی وغیرہ اعمال ان کی خاص عملی یادگاریں ہیں جن کو قیامت تک کے لیے

اسلام کا رکن اور شعار بنا دیا گیا ہے اس سب کے علاوہ جو درود شریف ہم لوگ ہر نماز میں پڑھتے ہیں اس میں ان پر بھی خدا کے درود کا ذکر ہے اور اس کے ذریعہ ہر نماز میں ان کی عظمت اور محبوبیت کے عقیدہ کو تازہ کیا جاتا ہے —— یہ سب آتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً کا ظہور ہے۔ اس کے بعد آخرت کے بارے میں جو فرمایا گیا ہے۔ "وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ" اس کا ظہور انشاء اللہ آخرت میں ہو گا وہاں سب دیکھ لیں گے کہ اللہ کے خاص بندے اور خلیل حضرت ابراہیمؑ کا مقام کتنا اونچا اور ممتاز ہے اور ان کے رب کی ان پر کیسی عنایتیں ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام بھی ان کا کیسا ادب کرتے ہیں۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے "ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ" مطلب یہ ہے کہ اے محمدؐ! اب قرنہا قرن کے بعد جب ہم نے تم کو نبوت کے سلسلہ کا خاتم اور آخری نبی بنا کر بھیجا ہے تو وحی کے ذریعہ ہم نے تم کو یہ حکم دیا ہے کہ تم ہمارے خلیل ابراہیم ہی کی ملت یعنی ان کے طریقہ اور اصول کی پیروی کرو جن کا حال یہ تھا کہ وہ ہر طرف سے کٹ کے بس اللہ ہی کے ہو گئے تھے اور یکسوئی کے ساتھ اسی کی طرف انہوں نے رخ کر لیا تھا اور وہ قطعاً اہل شرک کے گروہ میں سے نہیں تھے بس تمہارا بھی حال اور طریقہ یہی ہونا چاہیے —— اس آیت کا مطلب اور مدعا یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو خاتم النبیین اور سید المرسلین ہیں ان کو بھی اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ خدا پرستی اور خلق اللہ کے ساتھ برتاؤ میں ان ہی اصولوں کی پیروی کریں اور اپنی تعلیم اور عمل سے انہی کو زندہ کریں اور رواج دیں جو ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے تھے، جو توحید خالص کے داعی اور علمبردار تھے، جو شرک اور مشرکین سے الگ اور بیزار تھے

اس آیت میں اگرچہ براہ راست خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن اس کے ذریعہ ساری دنیا کو اور خصوصیت کے ساتھ مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ کو بتلایا گیا ہے کہ ہمارے یہ آخری رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جس راہ کی دعوت دیتے ہیں وہ وہی راہ ہے جس کی دعوت ابراہیم علیہ السلام دیتے تھے، ان کا طریقہ عین ابراہیمی طریقہ اور ان کی ملت ابراہیمی ملت ہے، تو جن کو فی الحقیقت ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر چلنا ہے، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کریں، ان کا راستہ بعینہٖ ابراہیمی راستہ ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے۔ "اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ۔" یہ آیت در اصل ایک سوال کا جواب ہے۔ یہود کہتے تھے کہ ہم لوگ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور ہماری شریعت کے خاص احکام وہی ہیں جو ان کی شریعت میں تھے اور ان میں سے ایک "سبت" کا حکم بھی تھا یعنی یہ کہ ہفتہ کے دن کا خاص احترام کیا جائے اور اس دن شکار بھی نہ کیا جائے تو یہود کا دعویٰ تھا کہ یہ حکم حضرت ابراہیمؑ کی شریعت کا بھی خاص شعار تھا، جس طرح جمعہ کی نماز اور خطبہ اور جمعہ کے خاص احکام اور اُس دن کا خاص احترام شریعت اسلامی کا شعار ہے۔

تو یہود یہ کہتے تھے کہ اگر یہ نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ابراہیمی طریقے پر ہوتے تو ان کی شریعت میں بھی یوم السبت کے بارے میں یہی حکم ہوتا اور یہی پابندیاں ہوتیں اور اُس دن کا شکار حلال نہ ہوتا

تو اس آیت میں گویا اس سوال یا اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ابراہیمی شریعت میں سبت کا یہ حکم ہرگز نہیں دیا گیا تھا، یہ حکم تو عہد ابراہیمی کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں سال بعد موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان یہودیوں پر عائد کیا گیا تھا جنھوں نے سبت کے بارے میں اختلاف کی روش اختیار کی تھی، گویا یہ حکم ایک طرح سے ان کے اختلاف اور عدم اطاعت کی سزا تھی۔

اس کی تفصیل سورۂ اعراف میں گزر چکی ہے، جہاں یہ آیت ہے "وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ۔"

وہاں میں نے شریعت یہود کے اس حکم کی پوری تفصیل بیان کی تھی اور یہ بھی بتلایا تھا کہ جب انھوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی تو ان پر خدا کا سخت قہر و عذاب نازل ہوا اور قرآن مجید میں صراحۃً بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ بندروں اور سؤروں کی شکل میں مسخ کر دیئے گئے۔

الغرض اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ سبت کا حکم تو (موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں) سزا کے طور پر صرف ان لوگوں پر عائد کیا گیا تھا جنھوں نے اس کے بارے میں اختلاف کی روش اختیار کی تھی اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے درمیان ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ فرمائے گا جن میں وہ باہم اختلاف کرتے تھے اور اُس وقت سب کو معلوم ہو جائے گا کہ اصل حقیقت کیا تھی۔

اسی طرح کی ایک بات سورۂ انعام میں بھی بیان فرمائی گئی ہے۔ جہاں ذکر کیا گیا ہے کہ یہود کے لیے بعض فلاں فلاں چیزوں کا کھانا بھی حرام کیا گیا تھا جو شریعت محمدی میں حلال ہیں تو وہ

چیزیں یہود پر اس لیے حرام نہیں کی گئی تھیں کہ اُن میں کوئی خباثت اور نجاست ہے بلکہ اُن کی باغیانہ روش اور سرکشی کی سزا کے طور پر یہ حلال طیب چیزیں اُن پر حرام کر دی گئی تھیں، وہاں فرمایا گیا ہے "ذٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ٥

یہاں تک تو عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ سب پر حجت قائم کر دی گئی اور ان کو بتایا گیا کہ ہمارے برگزیدہ بندے ابراہیم شرک اور اہل شرک سے بیزار اور توحید کے علمبردار تھے اور ہمارے یہ نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ان ہی کے طریقہ پر ہیں، اس لیے جن کو ابراہیم علیہ السلام کی راہ پر چلنا ہو وہ اُس راہ پر چلے جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود چل رہے ہیں اور جس کی طرف وہ اللہ کے بندوں کو دعوت دے رہے ہیں، کیونکہ وہی ابراہیمی راستہ ہے ـــــ پھر "یَوْمُ السَّبْتِ" کے خاص احکام کے حوالہ سے جو اعتراض یا سوال یہود کی طرف سے اٹھایا جاتا تھا اُس کا جواب دیا گیا کہ ابراہیمی شریعت میں "یوم السبت" کے یہ احکام قطعاً نہیں تھے، یہ احکام تو دراصل موسوی دور میں بنی اسرائیل کی عدم اطاعت اور بے راہ روی کی سزا کے طور پر اُن پر عائد کیے گئے تھے۔

اس کے بعد سورت کی جو آخری ۲۔۳ آیتیں ہیں ان کا روئے سخن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت کی طرف ہے اور ان میں دین کی دعوت کے بارے میں خود آپ کو اور امت کو نہایت اہم ہدایت فرمائی گئی ہے۔ ارشاد ہے: "اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ٥

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص وحی کے ذریعہ جس ابراہیمی اور حنیفی ملت کی طرف آپ کو رہنمائی کی ہے جو دراصل خدا کا مقرر کیا ہوا اور خدا تک پہونچانے والا زندگی کا طریقہ اور راستہ ہے اُس کی طرف لوگوں کو بلانے اور دعوت دینے میں آپ حسب موقع تین طریقے استعمال کریں۔

اول یہ کہ حکمت اور دانائی کے انداز میں ان کو سمجھانے اور حکیمانہ دلائل و براہین سے ان کی عقل و فہم کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں۔ اس کا بہترین نمونہ خود قرآن مجید کے دلائل و براہین ہیں "اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ" کا یہی مطلب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں کو عقل و دانائی کا وافر حصہ دیا ہوتا ہے، جن کو عقلا اور حکما کہا جاتا ان کو یہی طریقہ مطمئن کر سکتا ہے ـــــ

دوسری صورت یہ ہے کہ دل کو متاثر کرنے والی موعظت و نصیحت اور ترغیب و ترہیب کا خطیبانہ اور

واعظانہ انداز اختیار کریں، عام نیک دل اور نیک فطرت لوگوں کے لیے یہی طریقہ زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔" والموعظة الحسنة" کا یہی مطلب ہے۔ قرآن مجید میں جابجا یہ طریقہ بھی استعمال کیا گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خطبات و مواعظ میں اس کے بہت اچھے نمونے ہیں ـــــ تیسری صورت یہ ہے کہ اگر مخاطب بحث و مباحثہ اور حجت بازی کرے جیسا کہ بہت سے لوگوں کا مزاج ہوتا ہے، تو ان سے بحث ایسے طریقے سے کی جائے اور ان کے اعتراضات اور سوالات کا جواب ایسے انداز میں دیا جائے جو خوشگوار اور حسین و جمیل ہو، کلام میں تلخی اور دل آزاری کا عنصر بالکل نہ آئے، مخالف کے پتھروں کا جواب پھولوں سے دیا جائے اور گالیوں کے جواب میں دعائیں دی جائیں۔ بحث مباحثہ اور مناظرہ کرنے والوں کے دل اسی طریقہ سے فتح کیے جا سکتے ہیں "جادلهم بالتي هي أحسن" میں یہی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

اگر مخاطب کے دل میں کچھ بھی صلاحیت اور سلامتی ہوگی تو وہ ان طریقوں سے ضرور متاثر ہوگا، اور جو آدمی نہ حکیمانہ دلائل و براہین سے متاثر ہو، نہ موعظہ حسنہ کا اس پر کوئی اثر ہو اور حسین جمیل بحث و مباحثہ کے بعد بھی اس کی کٹ حجتی ختم نہ ہو اور اس سب کے بعد بھی انکار ہی پر جما رہے جیسا کہ قرآن مجید کے اول مخاطبین میں ابوجہل اور ابولہب وغیرہ کا حال تھا تو سمجھنا چاہیے کہ اس کی فطرت مسخ ہو چکی ہے اور اس کے دل میں حق قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رہ گئی ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے اِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر! تمہارا کام اور وظیفہ مذکورہ بالا تین طریقوں سے لوگوں کو راہ حق کی طرف دعوت دینا ہے اور اپنے امکان کی حد تک اس کی کوشش کرنا ہے کہ وہ حق کو قبول کرلیں اور راہ حق پر آجائیں۔ تمہاری، اور حق کے کسی بھی داعی کی، یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے حق کو منوالے ـــــ بہت سے لوگ آپ کی مخلصانہ دعوت اور دلسوزی کے ساتھ محنت کے باوجود نہیں مانیں گے، اس کی وجہ سے آپ بےچین اور آزردہ خاطر نہ ہوں، آپ نے دعوت کا فرض ادا کر دیا، جو بدبخت اس کے بعد بھی گمراہی پر جمے رہنے والے ہیں اور جو خوش نصیب ہدایت قبول کرنے والے ہیں اُن سب کا یہ حال تمہارے پروردگار کو خوب معلوم ہے اور یہ سب کچھ اس کے علم میں ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ

آگے فرمایا گیا ہے "وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ۔"

راہ حق کی تبلیغ و دعوت کے سلسلے میں یہ بھی پیش آتا ہے کہ باطل پرست حق کے داعیوں کو ایذائیں پہنچاتے ہیں، طرح طرح سے ستاتے ہیں۔۔۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے صحابہ خصوصاً سابقین اولین کو جو ایذائیں پہنچائی گئیں، اور جس طرح وطن تک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا وہ ہم نے اور آپ نے حدیث اور سیرت کی کتابوں میں پڑھا ہے یا آپ میں سے بعض بھائیوں نے سنا ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "ما اوذی فی اللہ احدٌ مثل ما اوذیت" یعنی اللہ کے راستہ میں کسی کو اتنا نہیں ستایا گیا جتنا مجھے ستایا گیا، تو اس آیت (وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ) میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جب تمہارے ہاتھ میں طاقت آئے اور تم اس پوزیشن میں ہو کہ ان ظالموں مجرموں کو ان کی شرارتوں اور ایذا رسانیوں کی سزا دے سکو تو اس وقت کے لیے تمہارے خدا کا تم کو یہ حکم ہے کہ اس سزا میں بھی، اور اس جوابی کارروائی میں بھی عدل و انصاف کے قانون کی پابندی کرو، یعنی ان کو سزا ان کی شرارت اور ایذا رسانی کے حساب ہی سے دو! ۔۔۔ آگے فرمایا اور یہ بھی تم کو صرف اجازت ہے، لیکن اگر تم صبر کرو، اور طاقت حاصل ہونے پر بھی اپنے پر ظلم کرنے والوں کو سزا نہ دو اور معاف ہی کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اور اس سے تمہارا خدا زیادہ راضی ہوگا اور اس کے نتائج بہتر نکلیں گے اور تمہارے ان دشمنوں پر بھی اس کا اثر اچھا پڑے گا، اور وہ ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر مجبور ہوں گے اور پھر تمہارا یہ صبر ہی ان کی ہدایت کا باعث ہو جائے گا۔ "وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ" میں اس سب کی طرف اشارہ ہے۔

آگے خصوصیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے "وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ"۔ یعنی اے ہمارے پیغمبر! خود آپ کا ذاتی رویہ تو صبر و برداشت اور معافی کا ہونا چاہیے۔ یعنی اگر خود آپ کی ذات پر کسی نے زیادتی کی ہو، آپ کو کسی نے ایذا پہنچائی تو آپ اس کا جائز اور منصفانہ بدلہ بھی نہ لیں، درگذر ہی سے کام لیں آپ کے مقام عالی کے لئے یہی بہتر ہے۔ اور چونکہ انسانی ذات کے لئے یہ بہت مشکل ہے اس لئے فرمایا کہ آپ کو اس کی توفیق اللہ ہی کی طرف سے ملے گی۔ "وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ"

حدیث شریف میں غالباً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پر کیے جانے والے کسی ظلم و زیادتی کا کبھی بدلہ نہیں لیا، ذاتی مجرموں کو ہمیشہ معاف فرما دیا۔ ہاں! جب کسی نے خدا کا جرم کیا، جس پر سزا دینے اور حد جاری کرنے کا خدا ہی کی طرف سے آپ کو حکم تھا، تو آپ نے اُس خداوندی حد اور سزا کو نافذ کیا۔ اسمیں آپ کو کسی رعایت کی کبھی اجازت نہیں تھی۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ" اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مخلصانہ دعوت و نصیحت، اور دلسوزی کے ساتھ اُن کی ہدایت کے لیے محنت کے بعد بھی جب وہ ایمان نہ لائیں تو آپ اس کا غم نہ کھائیں، آپ نے اپنا فرض اور دعوت کا حق ادا کر دیا، اور اپنے خدا کو راضی کر لیا، اِن بدبختوں نے آپ کی بات نہ مان کر خود اپنے کو ہلاک و برباد کیا ہے اور اپنے لیے خدا کی رضا اور جنت سے محروم رہنا اور دوزخی بننا پسند کیا ہے اس لیے آپ ان کا غم نہ کھائیں "وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ"۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ" مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو سازشیں اور فتنہ انگیزیاں آپ کے خلاف اور آپ کی دعوت حق کے خلاف کرتے ہیں اُن کی وجہ سے آپ دل تنگ اور فکرمند نہ ہوں، یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ "وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ" (یہاں ایک طالبعلمانہ بات بھی عرض کر دوں، اہلِ لغت نے لکھا ہے کہ "ضَيْق" ض کی فتح کے ساتھ دل کی تنگی اور اندرونی پریشانی کو کہتے ہیں اور "ضِيق" ض کے کسرہ کے ساتھ معاشی تنگی یا گھر یا راستہ وغیرہ کی تنگی کو کہتے ہیں) بہرحال اس جملہ میں اطمینان دلایا گیا ہے کہ ان اشرار کی شرارتیں اور سازشیں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔

ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا ہے یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ اور ایک اور جگہ ارشاد فرمایا گیا "وَيَأْبَى اللّٰهُ اِلَّا اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝" یعنی یہ حق کے دشمن منکرین اللہ کے نازل کیے ہوئے نورِ ہدایت کو بجھا دینا چاہتے ہیں اور اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ ہدایت کا یہ نور باقی رہے گا اور چمکے گا اور مشرق و مغرب کو روشن کرے گا۔

سورت کی بالکل آخری آیت ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّالَّذِينَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝

یہ گویا سورہ کا آخری مقطع اور نہایت اہم خداوندی منشور ہے۔ اس میں بہت بڑی بشارت اور بڑا اطمینان بخش وعدہ ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور قیامت تک پیدا ہونے والے حق پرستوں کو خوش خبری سنائی گئی ہے اور گویا ضمانت دی گئی ہے کہ جس جماعت اور گروہ کی زندگی تقویٰ پرہیزگاری اور نیکوکاری کی ہوگی، اللہ تعالےٰ اپنی قدرت کاملہ اور اپنے غیبی لشکروں کے ساتھ ان کا رفیق اور مددگار ہوگا۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّالَّذِينَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝

آج مسلمان عرب و عجم میں، مشرق و مغرب میں ہر جگہ ذلیل و خوار ہیں، اگرچہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت دنیا کے مختلف براعظموں میں ان کی ۳۰۔۳۵ خود مختار حکومتیں ہیں لیکن جن لوگوں کو دنیا کے حالات کی کچھ خبر ہے وہ سب جانتے ہیں کہ آج کی دنیا میں ان مسلمان حکومتوں کا کچھ وزن نہیں ہے۔ اگر اس میں کسی کو شک ہو تو وہ ان میں سے ایک ایک کے حالات تفصیل سے مطالعہ کر لے۔ اور ہم ہندوستانی مسلمان اپنی تاریخ اور اپنے حالات پر نظر ڈال لیں ــــ ملک کی آزادی سے پہلے یہاں مسلمانوں کی جو حالت تھی اس کو دیکھنے والے خود ہم لوگ موجود ہیں۔ اور آزادی کے بعد جن حالات سے گزر رہے ہیں وہ آپ سب ہی دیکھ رہے ہیں۔ ہم نے بہت آسان نسخہ یہ سیکھ رکھا ہے کہ پہلے انگریزوں کے دور میں اپنی ساری مصیبتوں اور بدحالیوں کی ذمہ داری ہم انگریزوں پر ڈال دیتے تھے اور آزادی کے بعد سے جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری ہندوؤں پر یا کانگرسی حکومت پر ڈال دیتے ہیں۔ گویا خود ہم بالکل بے قصور ہیں۔ اور ہمارے ان حالات میں ہماری بدعملیوں اور غفلتوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ہم نے اس کا حل اور علاج بس یہ سمجھا ہے کہ سیاسی پلیٹ فارموں سے اپنی مظلومیت کا بس شور مچائے جاؤ، حکومت کے خلاف احتجاج کرتے رہو، چیلنج دیتے رہو اور اخبارات و رسائل میں مضامین پر مضامین لکھے جاؤ! ــــ واقعہ یہ ہے کہ یہ طریقہ بس اپنے کو اور بیچارے اپنے عوام کو فریب دینے کا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری ذلت و خواری اور تباہی و بربادی کی جڑ بنیاد خود ہمارے اندر ہے ــ۔ قرآن مجید میں قوموں اور خاص کر پیغمبروں کی دعوتوں کی عزت و ذلت اور خوش حالی و بدحالی کا جو قانون جا بجا بیان فرمایا گیا ہے وہ صرف اگلے پیغمبروں اور ان کی امتوں ہی کے زمانہ کے لیے نہیں تھا، وہ ہمیشہ کا اٹل الٰہی قانون ہے۔ قرآن پاک میں جا بجا یہ حقیقت بیان فرمائی گئی ہے کہ قوموں اور امتوں پر جو حالات آتے ہیں وہ ان کے

اندر کے بگاڑ کی وجہ سے آتے ہیں۔ ارشاد فرمایا گیا ہے ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ـــــ دوسری جگہ فرمایا گیا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ـــــ بنی اسرائیل اور دوسری قوموں کے بارے میں جن کے حالات خراب ہوئے اور جن پر تباہیاں آئیں، جا بجا فرمایا گیا ہے۔ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ٥

اگر قرآن پاک کی یہ بات صحیح ہے تو ہمیں یقین کر لینا چاہیے کہ ہمارے یہ حالات خود ہمارے ایمانی نقص اور اعمال و اخلاق کی خرابی کا نتیجہ ہیں اور ہمیں ان حالات سے اس وقت تک نجات نہیں مل سکتی جب تک کہ ہم اپنے اندر حقیقی ایمان و یقین پیدا کرنے اور اعمال و اخلاق کی اصلاح کی فکر نہ کریں۔

میں کوئی صاحب کشف و کرامت بزرگ نہیں ہوں، ایک گنہگار آدمی ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن پر ایمان اور اس کا کچھ سمجھنا نصیب فرمایا ہے اسکی بنیاد پر قسم کھا کے پیشین گوئی کر سکتا ہوں کہ اس دور کے مسلمانوں کی اور خاص کر ہم ہندوستانی مسلمانوں کی یہ پریشانیاں اور رسوائیاں ہرگز ختم نہیں ہوں گی اور ہمارے مسائل ہرگز حل نہیں ہوں گے، جب تک کہ ہم خود اپنی ایمانی، عملی اور اخلاقی حالت کو بدلنے کی فکر نہ کریں۔ یہ حالات خود بخود پیدا نہیں ہو گئے ہیں نہ کسی دوسری قوم، یا پارٹی یا حکومت نے ان کو پیدا کیا ہے، یہ خدا کا عذاب ہے۔ (از ماست کہ بر ماست) حدیث قدسی ہے " اَعْمَالُكُمْ اُحْصِيْهَا لَكُمْ " اس کے علاج کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ پہلے اپنے حال اور خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کرنے کی کوشش کی جائے، ایمان و تقویٰ پرہیزگاری اور نیکوکاری امت میں عام کرنے کی امکانی حد تک جد و جہد کی جائے۔ اس کے بغیر ہماری تدبیریں اور کوششیں اور ہمارے پلیٹ فارموں کے شور و ہنگامے اسی طرح بالکل بے نتیجہ رہیں گے جس طرح اب تک بے نتیجہ رہے ہیں، اس کا بنیادی سبب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہم خدا کی مدد اور نصرت کا استحقاق کھو چکے ہیں۔ خدا کی نصرت اور رفاقت کی شرط اس آخری آیت میں تقویٰ، پرہیزگاری اور نیکوکاری والی زندگی بتلائی گئی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ٥

میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ تقویٰ اور پرہیزگاری والی زندگی کے بعد آپ سے آپ ہمارے حالات خود بخود بدل جائیں گے اور ہمارے مسائل آپ سے آپ حل ہو جائیں گے، ... بلکہ ہم خدا کی امداد و نصرت کے مستحق ہو جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف اپنے مسائل حل کرنے کے

افاداتِ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ قدس سرہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اصلاح کسے کہتے ہیں؟

مجلس ۲۱؍ رمضان سنہ ۷۹ھ

آج کل کے اکثر دیندار لوگ جو بزرگوں کے پاس آتے جاتے اور اُن سے بیعت وغیرہ کا تعلق رکھتے ہیں، اور اسی طرح جو مدرسوں میں علم دین پڑھتے پڑھاتے ہیں، اُن کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ انھوں نے دین کی حقیقت کو صرف ظاہر میں منحصر اور مقصور کر رکھا ہے اس لیے دل میں اور باطن میں ہاتھ نہیں لگاتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی نظر دل ہی پر ہے۔ بغیر دل میں ہاتھ لگائے ہوئے کشود کار ہوگا نہیں اور نہ اللہ تعالیٰ سے تعلق ہی استوار ہوگا۔

حدیث شریف میں ہے کہ:۔

ان اللہ لا ینظر الی اجسادکم ولا الی صورکم ولکن ینظر الی قلوبکم واعمالکم، التقویٰ ھٰہنا التقویٰ ھٰہنا التقویٰ ھٰہنا۔ ولیشیر الی صدرہٖ (رواہ البخاری ومسلم فی کتاب الادب)

اسی کو مولانا روم فرماتے ہیں کہ:۔

ناظر قلبیم اگر خاشع بود گرچہ گفت لفظ ناخاشع بود

ما درون را بنگریم و حال را ما بروں را ننگریم و قال را

یعنی ہم قلب کو دیکھتے ہیں یہ کہ اُس میں کتنا خشوع موجود ہے (وہی ہمارے یہاں معتبر ہے) اگرچہ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ خضوع والے نہ ہوں ہم باطن کو دیکھتے ہیں اور حال کو اور ظاہر کو اور قال کو نہیں دیکھتے۔

اوپر جو حدیث نقل کی گئی ہے وہ تو صرف ایک ٹکڑا ہے حدیث کا۔ استشہاد چونکہ اُسی جزو سے متعلق تھا اس لیے وہاں تو اُس کا اتنا ہی حصہ بیان کیا گیا باقی افادہ ناظرین کے لیے پوری حدیث اب نقل کرتا ہوں۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث ولا تجسسوا ولا تحسسوا ولا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللہ اخوانا، کما امرکم اللہ تعالیٰ المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یخذلہ ولا یحقرہ بحسب امری من الشر ان یحقر اخاہ المسلم کل المسلم علی المسلم حرام مالہ ودمہ وعرضہ ان اللہ لا ینظر الی اجسادکم ولا الی صورکم ولکن ینظر الی قلوبکم واعمالکم۔ التقوی ھھنا التقوی ھھنا۔ التقوی ھھنا ویشیر الی صدرہ۔ رواہ البخاری و مسلم فی کتاب الادب من صحیحیہما من طرق مختلفۃ و الفاظہ فیہما مفرقۃ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے کو بدگمانی سے بچاؤ اس لیے کہ سب سے بڑا جھوٹ بدگمانی ہے اور تجسس مت کرو اور کسی کے عیب پر نظر مت ڈالو اور باہم حسد نہ کرو اور ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو اور قطع تعلق نہ کرو اور اے اللہ کے بندو آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اس پر ظلم نہیں کرتا اور اس کی نصرت نہیں ترک کرتا اور اس کو حقیر نہیں سمجھتا۔ کسی انسان کی برائی کے لیے بس یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلم بھائی کو حقیر جانے۔ ایک مسلمان کا سب کچھ دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ اس کا

مال بھی اُس کا خون بھی اور اُس کی عزت و آبرو بھی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں اور صورتوں کو نہیں دیکھتے بلکہ تمہارے قلوب اور اعمال کو دیکھتے ہیں (اور سُن لو کہ) تقویٰ یہاں پر ہوتا ہے اور آپ نے اس کلمہ کو تین بار فرمایا اور اپنے (سینہ) مبارک کی جانب اشارہ فرمایا مطلب یہ کہ تقویٰ قلبی چیز ہے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے اپنی اپنی کتابوں کے کتاب الادب میں روایت کیا ہے۔ اسناد مختلف ہیں اور الفاظ میں بھی فرق ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان نیک لوگوں نے بھی دین صرف ظاہر داری کا نام رکھ لیا ہے۔ بندگوں کے یہاں آمد و رفت بھی جاری ہے۔ چنانچہ اُن کے آنے جانے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ طالب ہیں اور واقعی ان حضرات سے عقیدت رکھتے ہیں، طریق حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اصلاح نفس انھیں منظور و مقصود ہے لیکن دیکھتا ہوں کہ ان کو ان کے صریح عیوب پر بھی مطلع کر دیتا ہوں تب بھی اُس کی جانب کان تک نہیں دیتے۔ اپنے مرکز سے ذرا نہیں ہٹتے اپنی جگہ پر اَڑے رہتے ہیں۔ جانتے ہو اس کی وجہ کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اپنے قدیمی حال اور سابق اخلاق سے ان کو ایک طرح کا الف اور تعلق ہو جاتا ہے یہی الفت قدیم ان کو ہٹنے نہیں دیتا ورنہ تو آپ خود غور کیجیے کہ شیخ کے کہہ دینے کے بعد پھر ترک کے لیے کیا مانع رہ جاتا ہے۔ شیخ غلط تو کہہ نہیں رہا ہے لہٰذا اس کا تو کوئی موقع ہی نہیں کہ شاید اپنے مرض کو یہ سمجھا نہ ہو، کیونکہ کسی حالت نا ملائم (یعنی نا مناسب اور ناپسندیدہ کام یا حالت) سے نہ ہٹنا دو ہی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اپنی بد فہمی کی وجہ سے آدمی اُس کو سمجھے ہی نہیں اور اُس پر اُس کا یہ مرض کھلے ہی نہیں، دوسرے یہ کہ سمجھتا ہے اور نہیں مانتا تو یہ صریح اکبر ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ کبر کے طور پر نہ ماننا تو شاید ہی کسی میں ہوتا ہے۔ زیادہ تر تو لوگ اس زمانہ میں بد فہمی ہی کے شکار ہیں اسی کی وجہ سے حقیقت حال اُن پر کھلتی ہی نہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس بد فہمی کی وجہ سے وہ اپنے کو کبھی نہ سمجھتا ہو۔ ورنہ کبر سمجھنے کے بعد پھر مُصر رہنا نادر ہے۔

اتنی بات تو آپ سب لوگ بھی جانتے ہیں کہ ایسی جگہوں پر (یعنی اکابر و مشائخ کے یہاں) اِس لیے جایا جاتا ہے، مگر اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے حقیقت پر آنا نہیں چاہتے صرف رسم ہی پر قناعت کر کے ہم لوگوں کو بہلانا چاہتے ہیں۔

آپ سے کہتا ہوں کہ صرف ظاہری صورت پر آپ لوگ حقیقت کا حکم لگا دیں یہ کیسا ہے؟ اور نہ صرف مخلوق سے بلکہ اللہ تعالیٰ سے بھی محض صورتِ ظاہری پر حقیقت کا اجر چاہیں یہ کیسا ہے؟

کیا یہ اخلاص کی کمی کی وجہ سے نہیں ہے؟ اس وقت صاف صاف کہتا ہوں کہ اس کا نام دنیاداری ہے۔ دنیا ہم کو مطلوب ہے دین مطلوب نہیں ہے اس لیے کہ دنیا کے لیے تو صورت اور رسم بھی کافی ہے اس کو ہم حاصل کر لیتے ہیں اور دین کے لیے اخلاص شرط ہے اور اس کا مطالبہ حقیقت کا ہے چونکہ دین مطمح نظر ہی نہیں اس لیے حقیقۃً بھی مطلوب نہیں اور جب حقیقت ہی مطلوب نہیں تو پھر اس کے حصول کا طریق یعنی یہ کہ جو کام کیا جائے دل کی شرکت اور اہتمام اور توجہ سے کیا جائے اس کی بھی فکر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بھی جو آتے ہیں تو صرف تن بدن سے آتے ہیں اور اسی کو کافی سمجھتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ میں تو آپ کے پاس دل سے آؤں اور آپ تن سے ہی آنے کو کافی سمجھیں یہ کیسا ہے؟ کیا یہی انصاف ہے۔ میں تو دل سے اس لیے آتا ہوں کہ بے دلی سے کسی کام کے کرنے کا کیا مطلب؟ یہ تو جائز بھی نہیں اور نہ میں اس کو پسند کرتا ہوں۔ یہ کیا واہیات بات ہے کہ ایک شخص تو آپ کے پاس دل سے آتا ہے اور آپ اُس سے بے دلی سے ملتے ہیں اس تعلق کا تقاضا تو یہ تھا کہ بالفرض اگر میں صرف بدن ہی سے آتا تو آپ کو دل سے آنا چاہیے تھا چہ جائیکہ میں تو دل سے آؤں اور اہتمام کروں آپ سے ملنے کے لیے وقت دوں اور آپ کی جانب سے اس کی یہ قدردانی ہو کہ صرف جسم کی حاضری کو کافی سمجھیں اور اسی سے اپنے کو عہدہ برآ سمجھ لیں۔

ایک صاحب ایک بزرگ کی قبر پر گئے۔ اُن کو یہ خیال ہوا کہ نہ معلوم حضرت کو میری اس حاضری کی اطلاع بھی ہوئی ہے یا نہیں؟

جواب میں منکشف ہوا یعنی اُن کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا حضرت یہ فرما رہے ہیں ؎

مرا زندہ پندار چوں خویشتن من آیم بجاں گر تو آئی بہ تن

یعنی مجھے اپنے مانند زندہ ہی سمجھو اور تم تو صرف تن بدن سے میرے پاس آتے ہو لیکن میں دل و جان سے حاضر ہوتا ہوں۔ یہ فیضِ قبور کہلاتا ہے اور اہل کو ہوتا بھی ہے جس طرح کہ اُن صاحب کو ہوا۔ چنانچہ اس جواب سے وہ کس قدر خوش ہوئے ہوں گے کیونکہ کسی کی صرف جسمانی حاضری کے جواب میں کسی کا جان و دل کے ساتھ حاضر ہونا ظاہر ہے کہ کہیں بڑھ کر ہے۔ اب آپ کی غیرت اگر اجازت دے تو آپ کسی کی دلی اور قلبی حاضری کے جواب میں اپنی جسمانی اور بدنی ہی حاضری کو کافی سمجھ لیجیے۔

اسی بات کو سمجھانا چاہتا ہوں، اور سمجھانے میں کبھی کچھ تیز کہہ دیتا ہوں تو آپ لوگوں کو ناگوار ہوتا ہے۔ آپ صرف رسم کو اور ظاہری دین کو کافی سمجھتے ہوں تو سمجھئے یا جو چاہے کیجئے آپ کو اختیار ہے۔ لیکن جو جگہ کہ اصلاح کی ہو اور جہاں مطالبہ حقیقی دین، اور اخلاص کا ہو وہاں اس طرح سے صرف آمد ورفت رکھی جائے اور ظاہری دین پر قناعت کی جائے۔ اصلاحی باتوں کو جان سُن کر اُس کی طرف سے بے توجہی برتی جائے اس کے متعلق کہتا ہوں کہ پھر یہ محض آنا جانا کس لیے ہے اور اس کا کیا فائدہ ہے؟ اور کیا یہ کافی ہے؟ محض تکثیر سواد (یعنی کسی جماعت یا حلقہ کی تعداد میں اضافہ اور بھیڑ بھاڑ) خدا تعالیٰ کے یہاں کیا کام آئے گی؟ اللہ ورسول کے نزدیک اس کی کیا وقعت ہے؟ کیا آپ صرف کثرت ہی کو کامیابی کی دلیل سمجھتے ہیں؟ اور کیا صرف اسی لفے سے فلاح ہو جائے گی؟ اگر ایسا ہے تب تو سب ہی کافر کامیاب ہیں اس لیے کہ کثرت ہر زمانہ میں انھیں کی رہی ہے۔

میرے نزدیک اس رسمی بھیڑ بھاڑ کی کچھ بھی حیثیت نہیں ہے اور یہی آپ کو بھی بتانا چاہتا ہوں کہ بدون اخلاص کے محض ظاہرداری کچھ بھی کام آنے والی چیز نہیں ہے۔ اصل یہی ہے کہ آدمی اگر کہیں جائے تو دل سے جائے۔ دل میں عقیدت ہو اور عقیدت میں خلوص ہو تب تو یہ جانا بہتر ہے ورنہ کچھ بھی نہیں ہے چنانچہ میں اس بات کو کبھی اس عنوان سے بیان کرتا ہوں کہ لوگ جب اپنا گھر فاسد کر چکتے ہیں تو یہاں آکر ہماری جگہ کو بھی فاسد کرنا چاہتے ہیں، مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنی بداخلاقیوں کی وجہ سے آپ نے اپنا گھر تو فاسد کر ہی لیا ہے اور اپنا ماحول خراب کر لیا ہے ایک یہ جگہ ہم لوگوں کی فتنہ وفساد سے خالی تھی تو آپ اپنا فیض یہاں بھی پہونچانا چاہتے ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ جب بہت سارے ایسے لوگ جو الگ الگ اپنے گھر کو فاسد کر چکے ہوں وہ سب کے سب کسی ایک منزل میں جمع ہو جائیں گے اور اصلاح کے لیے نہیں بلکہ اپنے قدیمی اخلاق سے متصف ہونے ہوئے تو اس جگہ کا کیا حال ہوگا؟ بلا شبہ فساد ہو گا۔ ہاں اگر اخلاص کے ساتھ کہیں سب لوگ جائیں تو بیشک اُن کے اخلاص کی وجہ سے وہ جگہ فاسد نہ ہو سکے گی۔ بلکہ اُس کی برکت سے امید ہے کہ پہلا فاسد شدہ گھر بھی درست ہو جائے گا۔ بس اس ایک بات کو سمجھانا چاہتا ہوں مگر ابھی تک سمجھا نہیں سکا ہوں نہ غصہ سے نہیں بہت نرمی سے سمجھاتا ہوں کہ دیکھو اس جماعت کو عوام الناس صالحین اور نیک لوگوں کی جماعت سمجھتے ہیں۔ اب ایسے لوگوں سے بھی اگر فساد کا صدور ہو تو اور دوسروں کا کہنا ہی کیا۔ ایسی حالت میں کتنے رنج کی بات

ہے اور کس قدر افسوس کی بات ہے اور کتنے غیرت کی یہ بات ہے کہ ہمارے ظاہر سے لوگ ہم کو نیک سمجھیں اور ہمارے اندر فساد موجود ہو اور ہم اپنے باطنی اخلاق کے ذریعہ فساد کا سبب بنیں کیا یہ نفاق نہیں ہے؟ اور احتراز کی چیز نہیں ہے؟ اس طور سے نرم و گرم ہر طرح افہام و تفہیم کرتا رہتا ہوں وہ اس کے جیسے دیکھتا ہوں کہ بہت سے لوگ رنجیدہ رہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ بات چونکہ صحیح کہتا ہوں اس لیے اپنا مرض ان کی سمجھ میں بھی آجاتا ہے۔ باقی صاف کہتا ہوں کہ اعتقاد چونکہ ضعیف ہوتا ہے خلوص کامل و تغییر حاصل ہوتا نہیں اس لیے اپنے میں تبدیلی پیدا کرنا آسان نہیں ہوتا اس لیے رنجیدہ رہتے ہیں تو میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ میں تو آپ کو رنجیدہ کرنا نہیں آپ اگر رنجیدہ ہوں گے تو اپنے فہم کی کمزوری کی وجہ سے رنجیدہ ہوں گے۔ اب اس کو میں کیا کروں میں تو سب باتیں صاف صاف بیان کر دیتا ہوں اور یہی اتنا کر بھی سکتا ہوں، باقی عمل وہ تو آپ کی طرف سے میں کروں گا نہیں وہ تو آپ ہی کو کرنا ہوگا، مگر دیکھتا ہوں کہ رنجیدہ رہنا پسند ہے اور کسی کی بات مان لینا اور اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے حالانکہ بات بہت آسان ہے ذرا اس جانب توجہ کرلیں ان کا کام بن جائے۔ یہی کہہ رہا تھا کہ خدا تعالےٰ کے یہاں تکثیر سواد رجبیر بھاری کا اعتبار نہیں وہاں تو اعتبار قلب کے اخلاص کا ہے اب اگر ہم بھی کثرت پر اکتفا کرلیں اور آپ کو کچھ نہ کہیں آپ لوگوں سے اخلاص کا مطالبہ نہ کریں تو یہ ہمارے لیے جائز کب ہے؟ اور اگر یہاں اس کو کامیابی قرار بھی دیدیا جائے تو خدا کے یہاں سرخروئی کا تو یہ طریقہ نہیں ہے، یعنی ہم لوگ اگر یہ سمجھ لیں کہ ہمارے پاس بہت سے لوگ آتے ہیں اس میں ہماری عزت ہے اور جاہ حاصل ہوتی ہے اور اسی کامیابی پر خوش ہوں تو یہ ہو سکتا ہے لیکن آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ و رسول کے نزدیک بھی یہ چیز کامیابی کی ہے اور جس کو ہم نے کامیابی سمجھ رکھا ہے کیا عند اللہ وہ معتبر ہے اور جس حالت پر آپ خوش ہیں کیا عند الرسول بھی وہ خوشی کی چیز ہے۔

اسی سلسلہ میں رسالہ قشیریہ سے یہ مضمون بھی سنایا۔ قال ابو عثمان الولی قد یکون مشہوراً ولکن لا یکون مفتوناً۔

یعنی ولی مشہور تو ہو سکتا ہے مگر مفتون نہیں ہوتا۔

ابھی آپ نے یہ نہ سمجھا ہوگا کہ مشہور کے کیا معنی ہیں اور مفتون کا کیا مطلب ہے اور ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ اس کے متعلق محشیؒ لکھتے ہیں سنیے:۔

(لا یکون مفتوناً) بان تکون شهرته برکة علیه و علی غیره بان لا تشغله عن ربه فیسعد بها و تضاعف اعماله بکثرة من یقتدی به بخلاف من اشتغلته شهرته عن ربه فانه یکون مفتوناً بها۔

(قشیریہ صفحہ ۲۱۹)

یعنی ولی مفتون نہیں ہوتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس کی شہرت خود اُس پر اور دوسروں پر بھی برکت کا سبب بنتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی وہ شہرت اس کو اپنے رب سے مشغول نہیں کرتی (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی توجہ ہٹانے کا سبب نہیں بنتی) لہٰذا وہ اُس کے ذریعہ سے کامیاب ہوتا ہے بلکہ اس کا عمل مریدین اور متبعین کی کثرت کے سبب زیادہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ بخلاف اُس شخص کے جس کی شہرت فیما بین الخلق اس کو اپنے رب اور خالق ہی سے ہٹا دے اور (غیر میں) مشغول کر دے تو اُس شخص کے متعلق کہا جائے گا کہ اُس کی یہ شہرت اُس کے حق میں فتنہ ہے اور خود وہ شخص مفتون ہے۔

دیکھا آپ نے علماء فن کیا فرماتے ہیں۔ ولی کا حال بیان فرماتے ہیں کہ کبھی ولی مشہور بھی ہوتا ہے مگر اُس کی شہرت اُس کے حق میں نیز دوسروں کے حق میں سبب برکت بنتی ہے اور کبھی مفتون ہوتا ہے۔ یعنی بجائے اس کے کہ وہ شیخ تھا تو لوگوں کو اُس سے صحیح تعلق کا فائدہ پہونچتا اور لوگ اُس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی اپنی نسبت درست کرتے یہ تو ہوتا نہیں بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اُس کی شہرت کی وجہ سے خود اُس کا معاملہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ پہلے سے ہوتا ہے اُسی میں خلل اور فتور واقع ہو جاتا اور خود اُس کی ہی نسبت منقطع ہو جاتی ہے اس طرح پر مخلوق کا اُس سے تعلق اور اُس کے پاس آمد و رفت رکھنا اُسی کے حق میں فتنہ ثابت ہو جاتا ہے۔ (اعاذنا اللہ تعالیٰ منہا)

اب ہم لوگ ان آنے جانے والوں سے اتنا ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ آنا جانا ہمارے لیے فتنہ نہ ثابت ہو اور آپ لوگ ہیں کہ اسی کثرت پر خوش ہیں اور اسی کو مقصود سمجھے بیٹھے ہیں اور بد اعتقادی کی وجہ سے ہمارے متعلق بھی یہی رائے قائم کر لیتے ہیں کہ ان لوگوں کو مجمع پسند ہے اور صرف بدنی قرب سے یہ راضی ہو جاتے ہیں۔ اس لیے آپ لوگ بھی بس اسی پر قناعت کر لیتے ہیں اور حقیقت کی جانب توجہ نہیں کرتے اور دامن ہاتھ میں لگانا چاہتے نہ اپنے دل کو چھیڑنا چاہتے ہیں اور نہ مشائخ ہی کے دل میں اترنا چاہتے ہیں اور نہ ان سے مناسبت اور قلبی رابطہ قائم کرنا چاہتے ہیں

بس جسمانی قرب کو کافی سمجھتے ہیں بدون اس علاقہ کے تنہا قرب جسمانی کچھ بھی نہیں ہے۔

اب یہاں ایک بات اور سمجھ لیجئے کہ یہ جو بیان کیا گیا کہ ولی کبھی مفتون بھی ہوتا ہے تو اس کو سن کر آپ لوگ خوش نہ ہوں کہ یہ تو ولی کا حال ہوا ہم لوگ اس سے محفوظ ہیں، وہی لوگ مفتون ہوتے ہوں گے تو یہ بات نہیں ہے لیکن جس طرح ولی مفتون ہوتا ہے اسی طرح سے عام لوگ بھی مفتون ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ اس میں اولاد کو اور مال کو فتنہ فرمایا ہے اور فتنہ ہونے کا یہاں بھی وہی مطلب ہے جو پہلے بیان ہوا کہ جو مال اور اولاد کہ شاغل عن الحق بنے اور اللہ تعالیٰ سے ہٹا دے وہ فتنہ ہے پس جو حیثیت کہ ولی میں اس کی شہرت کو حاصل تھی کہ اگر وہ اس کے اور دوسروں کے حق میں سبب برکت بنے تو نعمت اور رحمت ہے اور اگر خود اسی کو اللہ تعالیٰ سے روک دے تو فتنہ ہے۔ یہی حیثیت عام لوگوں میں مال اور اولاد کو حاصل ہے لہٰذا جب یہ امر دونوں میں مشترک ہے تو پھر آپ اس کو صرف مشائخ کے ساتھ کیسے خاص کر سکتے ہیں۔

اور میں اتنی بات اور کہتا ہوں کہ جس طرح سے مشائخ کے مریدین مشائخ کے حق میں سبب ابتلاء اور فتنہ بن سکتے ہیں۔ اسی طرح سے علماء جو پڑھتے پڑھاتے ہیں اُن کے شاگرد بھی وہی حیثیت رکھتے ہیں جو یہاں مریدین رکھتے ہیں۔ پس ہو سکتا ہے کہ شاگردوں کی کثرت بھی کسی مدرس کے لیے سبب فتنہ بن جائے اور یہ اسی وقت ہوگا جبکہ ان پڑھنے پڑھانے والوں میں بھی خلوص نہ ہو اور یہ تعلق خدا کے لیے نہ ہو مقصود اس سے دنیا ہو اور علم دین بجائے اس کے راہ حق دکھلائے اُلٹے شاغل عن الحق بن جائے کیونکہ مشائخ نے ایسے علم کو علم ہی نہیں کہا ہے بلکہ جہل کہا ہے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

جز یاد دوست ہر چہ کنی عمر ضائع است	جز سر عشق ہر چہ بخوانی بطالت است
سعدی بشوئے لوح دل از نقش غیر حق	علمے کہ رہ بحق نہ نماید جہالت است

یعنی دوست کی یاد کے علاوہ جو کچھ بھی تم کرو وہ بس عمر کو ضائع ہی کرنا ہے۔ اسی طرح سے عشق کے رموز کے سوا جو کچھ بھی پڑھو پڑھاؤ وہ سب واہیات اور لغو ہے۔ اے سعدیؒ تم اپنے دل کی تختی سے غیر اللہ کے تمام نقوش کو مٹا ڈالو اور سمجھ لو کہ جو علم کہ محبوب حقیقی کا راستہ نہ دکھائے وہ علم نہیں بلکہ جہل ہے۔

(بشکریہ معرفت حق الہ آباد)

زکوٰۃ

(مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی)

اسلام کی ایک اور اہم تعلیم زکوٰۃ ہے۔

زکوٰۃ کے معنی "پاکیزگی اور زیادتی" ہیں۔ چونکہ زکوٰۃ کی ادائگی سے اخلاقِ انسانی میں پاکیزگی، انسانیت کی اعلیٰ قدروں میں اضافہ اور سوسائٹی میں امن و اطمینان اور دولت و ثروت کی بہتات ہوتی ہے اس لیے اس کو زکوٰۃ کے نام سے موسوم کیا گیا۔

انسان اپنی دنیوی زندگی میں قدم قدم پر مال کا محتاج ہے۔ مال کی یہ ضرورت اس کے دل میں مال کی طرف رغبت پیدا کرتی رہتی ہے۔ یہی رغبت آہستہ آہستہ محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور وہ سخت قسم کے اخلاقی امراض پیدا کر دیتی ہے جنھیں "حرص اور بخل" کہتے ہیں۔ حرص اور بخل بہت سے دوسرے اخلاقی امراض حق تلفی، ناانصافی، خود غرضی، زر پرستی پیدا کر دیتے ہیں۔ حریص و بخیل یہ تو چاہتا ہے کہ ساری دنیا کی دولت سمٹ کر اس کے گھر میں آ جائے مگر وہ اسے اس کے مصرف میں استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ دولت کو اللہ تعالیٰ نے اس کی اور اس کے بھائیوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا وسیلہ بنایا تھا مگر وہ اس کے جمع کرنے کو اپنا مقصدِ زندگی بنا لیتا ہے۔ اس طرح وہ خود بھی اس کے فوائد سے محروم رہتا ہے اور دوسروں کو بھی محروم رکھتا ہے۔

حرص و بخل کے امراض دور کرنے کے لیے زکوٰۃ و خیرات بہترین علاج ہے۔ یہ مال کی محبت دل میں پیدا نہیں ہونے دیتا۔ اس طرح ان امراض کی جڑیں جمنے نہیں پاتیں۔ زکوٰۃ ادا کرنے والا جب دوسروں کی ضرورتوں میں پیسہ خرچ کرنے کا عادی ہو جاتا ہے تو دوسروں کی ضرورتوں کو بھی اپنی ضرورت

کی طرح سمجھتا ہے دوسروں کے مال پر ہاتھ ڈالنا پسند نہیں کرتا، کسی پر ظلم کرنا اسے گوارا نہیں ہوتا۔ پھر اپنی ضرورتوں میں بھی وہ اسے فراخ دلی کے ساتھ کام میں لاتا ہے۔ اس انفرادی مصلحت کے علاوہ زکوٰۃ بہترین اجتماعی مصلحتوں کی بھی حامل ہے۔

اسلام سے پہلے حکومتیں غریبوں اور متوسط طبقوں پر بھاری ٹیکس لگاتی تھیں، بادشاہ، خاندان شاہی کے افراد، ارکان حکومت اور مذہبی پروہت اس ٹیکس سے بری ہوتے تھے۔ رعایا کے عام افراد کا فرض ہی یہ قرار دے دیا گیا تھا کہ وہ حکمراں طبقے کے لیے آرام و راحت اور عیش و عشرت کے وسائل فراہم کریں اور حکمراں طبقے کا یہ حق قرار دے دیا گیا تھا کہ وہ غریبوں اور محکوموں کی گاڑھے پسینہ کی کمائی سے گلچھرے اڑائیں۔ یوں سوسائٹی دو طبقوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ بالادست اور زیردست۔ بدنصیب اور خوش نصیب۔

مذہبی مصلحین نے امیروں کو غریبوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تلقین کی، مگر یہ تلقین اخلاقی نوعیت کی تھی جس سے بدباطن اور خود غرض متاثر نہ ہوئے۔

اسلام نے قانونی طور پر امیروں کو مجبور کیا کہ وہ ہر سال اپنی دولت کا ایک حصہ لازمی طور پر غریبوں کی ضرورتوں کے لیے ادا کریں۔ اس ادائیگی کو محض امیروں کا غریبوں پر رحم و کرم نہیں بلکہ غریبوں کا امیروں پر "حق" قرار دیا۔

وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ	اور وہ لوگ جن کے مالوں میں ایک مقرر حق
لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔	ہے سائل کے لیے اور محروم کے لیے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں اسلامی نظام قائم ہوا وہاں غریبوں اور امیروں کے درمیان کشمکش ختم ہو گئی۔ غریبوں کے دلوں سے رشک و حسد کی چنگاریاں بجھ گئیں، اپنے محسنوں سے محبت اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے اور وہ بجائے ان کے دشمن بننے کے ان پر جان قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

امیری اور غریبی کا فرق بالکل ختم ہونا تو قانونِ قدرت کے خلاف ہے، مگر زکوٰۃ اور دوسرے اسلامی ٹیکسوں سے ایک ایسا اقتصادی اعتدال .... پیدا ہو گیا جس سے زندگی کی اہم ضرورتوں کو پورا کرنے سے کوئی مجبور نہ رہا۔ مزدوروں اور دولت مندوں کے درمیان تعاون کی راہیں ہموار ہو گئیں اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ گیا جس میں امیر غریبوں کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے تھے اور غریب

امیروں پر جان قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

اسلام نے زکوٰۃ ادا کرنے ہی پر نہیں بلکہ زکوٰۃ کا نظام قائم کرنے پر زور دیا اور حکومت اسلامی کا فرض قرار دیا کہ وہ بیت المال کا محکمہ قائم کر کے سرمایہ داروں سے رقوم وصول کر کے سرمایہ داروں سے رقوم وصول کر کے ضرورت مندوں میں اسے تقسیم کرے۔ اصول یہ قرار دیا گیا کہ ہر مال دار شخص جس کے پاس ۵۲½ تولہ چاندی یا ۷½ تولہ سونا ہو یا اس کی قیمت کی رقم ہو اس پر فرض ہے کہ سال گزرنے پر اس کا چالیسواں حصہ محتاجوں اور غریبوں کے لیے راہ خدا میں نکالے۔ سونے چاندی کے علاوہ کھیتی باڑی کی پیداوار، مویشیوں اور تجارتی مال پر بھی زکوٰۃ واجب کی گئی ہے۔

فتح مکہ کے بعد جب اسلام عرب کے مختلف حصوں میں پھیل گیا تو ۹ھ کے آغاز میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محصلین زکوٰۃ مقرر فرمائے اور انھیں اسلامی ریاست کے مختلف علاقوں میں روانہ کیا۔ اسی سلسلہ میں آپ نے حاکم یمن حضرت معاذ بن جبل کو ہدایت فرمائی کہ پہلے غیر مسلموں کو توحید و رسالت کی دعوت دینا، پھر نماز کی ادائگی کا حکم دینا، پھر انھیں زکوٰۃ کے فریضہ سے آگاہ کرنا اور اس کی مصلحت بھی بتا دینا کہ

توخذ من اغنیائهم وترد الی فقرائهم۔	زکوٰۃ کا مال قوم کے امیر لوگوں سے وصول کر کے اُن کے غربا ہی پر خرچ کر دیا جاتا ہے۔

اس نظام کی اس قدر اہمیت تھی کہ جن لوگوں نے اس سے انکار کیا حضرت ابوبکر اسلام کے خلیفۂ اوّل نے اُن کو مرتد قرار دیا اور اُن سے جہاد کیا۔ نظامِ زکوٰۃ کے قیام سے وصول میں باقاعدگی کے علاوہ ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس کی حیثیت بھیک کی نہ رہی بلکہ حکومتی امداد کی ہو گئی۔ جس سے ہر ضرورتمند بغیر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے، بغیر اپنی عزت نفس کو ٹھیس لگائے اور بغیر ذاتی طور پر کسی کا مرہون احسان بنے فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔

اسلامی زندگی اور نظام شرعی کا قیام

(جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب)

خلافت کی تحریک نے مسلمانانِ ہند میں مذہبی جوش و خروش اور اتفاق و اتحاد کی جو فضا پیدا کی تھی (جس کا آج اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا) اس سے بڑا قیمتی فائدہ صوبۂ بہار کے بعض صاحب بصیرت علماء نے (جن میں حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے) یہ اٹھایا کہ ممکن حد تک مسلمانوں میں شرعی نظام کے نفاذ کے لیے امیر شریعت کا انتخاب کیا اور "امارت شرعیہ" کا ادارہ شرعی بنیادوں پر قائم کیا۔ اس کے مختلف شعبوں میں سے اہم اور مسلمانوں کے لیے نہایت مفید شعبہ محکمۂ قضا کا ہے جس کے تحت بہار کے مختلف اضلاع میں دار القضاء کے عنوان سے شرعی عدالتیں قائم ہیں اور امارت شرعیہ کے مرکز پھلواری شریف (پٹنہ) میں مرکزی دار القضاء ہے جس کی حیثیت شرعی عدالت عالیہ کی ہے۔ ان عدالتوں میں طلاق، خلع، تفریق اور فسخ نکاح اور ولایت و حضانت وغیرہ کے مقدمات خصوصیت سے آتے ہیں۔ اور قانون شریعت کے مطابق مقدمہ کی پوری کارروائی ہوتی ہے اور فیصلہ دیا جاتا ہے۔

موجودہ امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی اور امارت شرعیہ کے قاضی القضاۃ مولانا مجاہد الاسلام صاحب سے اس کام کی تفصیلات جب سے معلوم ہوئیں اس وقت سے برابر دل میں یہ داعیہ تھا اور ہے کہ دوسرے علاقوں میں بھی اسی طرح کے دار القضاء قائم ہوں۔ پچھلے مہینے ان دونوں حضرات سے ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ آپ حضرات دوسرے علاقوں اور شہروں میں بھی اس طرح کے دار القضاء قائم کرنے کی کوشش کریں اور طریقہ کار کے بارے میں ان لوگوں کی رہنمائی کی ذمہ داری بھی قبول کریں۔ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ اس مقصد کے لیے آپ الفرقان کو بھی استعمال

فرما سکتے ہیں۔

میری اس گزارش کے نتیجہ میں مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب نے اپنی ایک تقریر جو نظام شرعی اور قضاء کی اہمیت و ضرورت کے موضوع پر کی گئی تھی اور ان کے پاس قلمبند محفوظ تھی الفرقان کے لیے بھیجی ہے۔

یہ تقریر ۱۹۶۷ء میں صوبہ بہار کے مشہور شہر کٹیہار میں علمائے کرام اور علاقے کے دینی با اثر حضرات کے ایک نمائندہ اجتماع میں کی گئی تھی جو دار القضاء کے قیام ہی کے سلسلے میں بلایا گیا تھا قاضی صاحب موصوف کے شکریہ کے ساتھ اس کو الفرقان میں شائع کیا جا رہا ہے۔ نعمانی

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

میرے دوستو اور بزرگو!

آج آپ ایک اہم اور تاریخی اجتماع میں تشریف فرما ہیں۔ آج آپ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہم ترین سنت کو زندہ کرنے اور اسلام کی قدیم روح کو واپس لانے کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں۔ آج آپ مسجدوں کی چار دیواری سے باہر بھی اسلامی زندگی کو چلتا پھرتا دیکھنے کی تمنا لے کر جمع ہوئے ہیں۔ آج آپ جماعت مسلمین کے بکھرے ہوئے موتیوں کو کتاب و سنت کی لڑیوں میں پرو دینا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپکی ان آرزوؤں کی تکمیل فرمائے۔ آپکے خواب پورے کرے۔ آپکی مخلصانہ کوششوں کو قبول فرمائے۔ آمین۔ اس موقع پر میں آپکو مبارکباد دیتا ہوں اور اس اہم اجتماع میں شرکت کو اپنی بڑی سعادت سمجھتا ہوں۔

برادران دین!

اسلام کی روح

اسلام کی اصل روح کیا ہے؟ اگر آپ کتاب سنت اور تاریخ و سیر کا جائزہ لیں گے تو آپ میرے اس خیال سے پوری طرح اتفاق کریں گے کہ ملت ابراہیمی اور دین حنیفی کی اصل روح بس اتنی ہے کہ انسان خدا کی مرضی اور خوشی میں اپنے کو فنا کردے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بندہ اللہ کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اسی کے کان سے سنتا ہے اور اسی کی زبان سے بولتا ہے سیدنا ابراہیم کو مقام خلت و سلام اسی کی وجہ سے ہی تو ملی تھی کہ انھوں نے اللہ کی خوشی کے لیے آگ میں کودنا، بیوی بچوں کو وادی غیر ذی ذرع میں چھوڑنا اور اکلوتے بیٹے کی گردن پر چھری چلانا گوارا کیا۔

جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی قرآن نے اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرایا۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝

(آپ کہہ دیجئے میری نماز، میری قربانی، میرا مرنا اور میرا جینا بس اللہ رب العالمین کے لیے ہے)
اور خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی جب اللہ کی مرضیات کا نمونہ ہے تو اب کوئی شخص بھی مومن اس وقت ہو سکتا ہے جب اس کی ہر خواہش حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کے تابع ہو جائے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ۔"

یعنی تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشات میری شریعت کے تابع نہ ہو جائیں۔ (رواہ فی شرح السنۃ وقال النووی فی اربعینہ حدیث صحیح رویناہ فی کتاب الحجۃ باسناد صحیح)

پس حاصل کلام یہ ہے کہ اسلام کی اصل روح بس رضاء خداوندی میں اپنے کو فنا کر دینا اور اپنی خواہشات کو شریعت محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے تابع کر دینا ہے۔

اللہ کی اطاعت مسلمان کی زندگی کا نصب العین ہو

پس بندہ کو اگر اللہ سے صحیح تعلق ہے تو وہ ہر لمحہ، ہر حال میں، اور زندگی کے ہر موڑ پر اللہ کی اطاعت کو ہی اپنی زندگی کا نصب العین جانے گا۔ اور احکام الٰہی سے گریز اور اس سے روگردانی اس کے نزدیک ہلاکت کے مرادف ہوگی، اور وہ کبھی بھی اسلام اور خدا کی فرماں برداری سے الگ ہو کر جینا گوارا نہ کرے گا اور نہ مرنا۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝

"یعنی اے ایمان والو اللہ سے ڈرتے رہو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے اور ہرگز ہرگز اسلام اور فرمانبرداری کی زندگی چھوڑ کر نہ مرنا۔"

پس ایک مسلمان ہر لمحہ اللہ کے ساتھ مضبوط تعلق قائم رکھنا اپنا فریضہ جانتا ہے۔

رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے

قرآن نے جہاں جہاں بھی اللہ کی اطاعت کا تذکرہ کیا ہے اسی جگہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کی عملی صورت اس کے علاوہ نہیں ہو سکتی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی جائے۔ قرآن کریم نے ایک جگہ یہ کہا ہے۔

"قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ"۔ (آل عمران)

یعنی آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں اگر (اگر انھوں نے ایسا نہ کر کے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری سے) روگردانی کی (تو کیا کریں) اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

یہ آیت صاف بتاتی ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت سے روگردانی کفر ہے۔

اس طرح مختلف آیتوں میں اللہ اور ان کے رسول کی اطاعت کی اہمیت واضح فرمائی گئی ہے لہٰذا ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کے پابند ہیں کہ زندگی کے تمام ہی معاملات میں زمانہ اور حالات کی تفریق کے بغیر اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت کرتے رہیں کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔

"وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ھُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ"۔ (آل عمران)

جو اللہ کو مضبوطی سے تھام لیتا ہے اسے سیدھا راستہ مل جاتا ہے۔

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل امتی یدخلون الجنۃ الا من ابیٰ قیل ومن ابیٰ قال من اطاعنی دخل الجنۃ ومن عصانی فقد ابیٰ"۔ (رواہ البخاری)

یعنی حضور ؐ فرماتے ہیں کہ میری امت کے وہی لوگ جنت میں جائیں گے جنھوں نے میری اطاعت کی اور جنھوں نے میری نافرمانی کی وہ منکرین کی صف میں داخل ہیں۔

شریعت محمدی کو زندہ رکھنے کی کوشش جہاد

اس لیے اگر شریعت محمدیہ مٹ رہی ہو، حضور ؐ کی سنت مردہ ہو چکی ہو، ایسے وقت میں شریعت محمدیہ کے قیام اور طریقہ رسالت مآب کی احیاء کی جدوجہد میں داخل ہے۔ اور مسلمان کا فریضہ ہے جس کے پاس لٹتے ہوئے دیکھنا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا۔ غیر اسلام پر راضی اور قانع ہو جانا اور پھر ایمان کا دعویٰ کرنا دونوں میں کوئی ربط نہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضؓ آنحضور ؐ سے راوی ہیں۔

"مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَہُ اللّٰہُ فِیْ اُمَّتِہٖ قَبْلِیْ اِلَّا کَانَ لَہٗ مِنْ اُمَّتِہٖ حَوَارِیُّوْنَ وَاَصْحَابٌ یَّاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِہٖ وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِہٖ ثُمَّ اِنَّھَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِھِمْ خُلُوْفٌ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ وَیَفْعَلُوْنَ مَا لَا یُؤْمَرُوْنَ فَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِیَدِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِلِسَانِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِقَلْبِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ وَلَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّۃُ خَرْدَلٍ" (رواہ مسلم)

یعنی جو نبی بھی اللہ نے بھیجا ان کے ساتھ ان کی اُمت میں کچھ جاں نثار ساتھی رہے جو نبی کی سنت پر عمل کرتے رہے اور نبی کے احکام پر چلتے رہے۔ پھر ان کے بعد کچھ لوگ ایسے پیدا ہوتے ہیں جو کہتے ہیں مگر کرتے نہیں اور ایسے کام کرتے ہیں جن کا انھیں حکم نہیں ملا۔ پس ایسے حالات میں جو ایسے لوگوں کے ساتھ طاقت سے مقابلہ کرے وہ مومن ہے اور جو زبان سے مقابلہ کرے وہ مومن ہے اور پھر کم از کم دل سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور اس کے بعد ایمان کی ایک رائی باقی نہیں رہتی۔

اسی مضمون کو دوسری حدیث میں اس طرح فرمایا:۔

"من رأى منكم منكراً فليغيره بيده ومن لم يستطع فبلسانه ومن لم يستطع فبقلبه وذلك اضعف الايمان"

جب یہ بات صاف ہو گئی کہ اسلام کی اصل روح رضائے خداوندی میں اپنے کو فنا کر دینا ہے اور رضائے خداوندی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے حاصل ہوتی ہے اور یہی نجات کا اکیلا راستہ ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جب شریعت محمدی انسانوں کی عملی زندگی سے فنا ہی جا رہی ہے۔ ایسے حالات میں ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ دین محمدی کے قیام کی جدوجہد کے لیے اٹھ کھڑا ہو پس ایسے حالات میں ہم ایک ایسے بنیادی فریضہ کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں جو مسلمانوں کی زندگی سے مٹتا جا رہا ہے اور جس کے قیام کی جدوجہد ہمارا آپ کا دینی اور ایمانی فریضہ ہے۔

اسلام انتشار کو پسند نہیں کرتا میرے بزرگو!

خدا نے اور خدا کے رسولؐ نے مسلمان کی زندگی کو اجتماعیت کے مضبوط دھاگوں سے باندھ دیا ہے۔ اسلام انتشار، انارکی اور لامرکزیت کو کسی حال میں پسند نہیں کرتا۔ وہ مذہب کو انسانوں کا پرائیویٹ مسئلہ قرار نہیں دیتا بلکہ قرآن کی روشنی میں اسلام انسانوں کی پیدائش سے لے کر موت تک اور خالص نجی زندگی سے لے کر اجتماعی اور تمدنی مسائل تک میں یہ چاہتا ہے کہ بندے بس خدا کی مرضی پر چلیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ چند وقتوں کی نماز پڑھ کر اپنے کو فارغ کر لیں۔ دین کو مسجد کی چار دیواروں میں محدود کر دیں۔ گھروں میں، بازاروں میں، کاروبار میں، شادی بیاہ میں اور مرنے جینے میں نیز دوسرے سیاسی اور تمدنی مسائل میں اسلام کی رہنمائی سے الگ ہو کر زندگی گزارں ایسا نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک صاف کہتا ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً (اے ایمان والو! پوری طرح اسلام میں داخل ہو جاؤ)

دوسری جگہ فرمایا گیا۔

اَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ (کیا تم کتاب اللہ کے کچھ حصوں پر ایمان رکھتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو)

اسی طرح قرآن نے انسانوں کے تین طبقات کیے ہیں اور تینوں کی زندگی کے تین حالات بیان کیے ہیں۔ ایک طبقہ تو کافروں کا ہے جن میں باہم کھلی ہوئی عداوت اور دشمنی ہوتی ہے اور دوسرے مسلمان جن کے دل باہم ملے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ باہم بھائی بھائی ہوتے ہیں اور تیسرا طبقہ منافقین کا ہے جو اوپر سے اکٹھے لگتے ہیں اور اندر سے ان کے دل ٹوٹے ہوئے اور ایکدوسرے سے نفرت و عناد رکھتے ہیں، حالت کفر اور حالت اسلام کا موازنہ کرتے ہوئے اور اپنا احسان جتاتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ۔"

یعنی اللہ نے تم پر جو احسان کیا ہے اسے یاد رکھو جبکہ تم باہم دشمن تھے پس اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور اللہ کی مہربانی سے تم بھائی بھائی ہو گئے اور تم جہنم کے گڑھے کے کنارے تھے اللہ نے تمہیں اس سے نجات دی۔ ایسے ہی اللہ اپنی آیتوں کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پا سکو۔

اور منافقین کا حال بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے۔

تَحْسَبُھُمْ جَمِیْعًا وَّقُلُوْبُھُمْ شَتّٰی۔ (تم ان کو اکٹھا محسوس کرو گے حالانکہ ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔)

اسلامی زندگی اور غیر اسلامی زندگی میں فرق

پس ان آیات کی روشنی میں اسلامی زندگی سے امتیاز اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی زندگی پوری طرح اللہ کی مرضیات اور رسول کی شریعت کو سونپ دی جاتی ہے اور دوسری طرف اسلامی زندگی باہمی الفت و موانست، قلبی ربط، بھائی چارہ اور تعاون و تناصر کی زندگی ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جو زندگی شریعت اسلامی

سے بے تعلق ہو کر اور باہمی انتشار، لامرکزیت اور انارکی کا شکار ہو وہ غیر اسلامی زندگی ہے۔

اجتماعیت اسلام میں مطلوب ہے

دوسری طرف قرآن کی آیات اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں اس کی بھی شہادت دیتی ہیں کہ "اجتماعیت اور" اعتصام بحبل اللہ" اسلام میں مطلوب ہے۔

قرآن نے کہا ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعاً وَّلَا تَفَرَّقُوا۔ (آل عمران)

اللہ کی رسی (یعنی اس کے دین) کو سب مل کر مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور تفریق کا شکار نہ ہو۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ (آل عمران)

ان لوگوں کی طرح بن جاؤ جو آپس میں فرقے بن گئے اور اختلاف میں پڑ گئے۔ اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی ہوئی ہدایتیں آچکی تھیں۔ ایسے لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے (آل عمران)

امام احمد بن حنبل نے سیدنا معاذ بن جبل سے روایت کی ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا۔

"اِنّ الشيطانَ ذئب الانسان كذئب الغنم ياخذ الشاذة والقاصية والناحية واياكم والشعاب وعليكم بالجماعة والعامة"

یعنی جس طرح بھیڑیا اکیلی ریوڑ سے دور اور کنارے رہ جانے والی بکریوں کو پکڑ لے جاتا ہے۔ ایک بھیڑیے جو تم میں سے ان لوگوں کو گمراہ کر لینے میں جلد کامیاب ہو جاتا ہے جو جماعت سے الگ تھلگ ہوں۔ پس کبھی گروہ بندیوں میں مت پڑنا اور جماعت کو مضبوطی سے پکڑے رہنا۔

یہ حدیث مسلمان کی زندگی میں جماعتی نظام کی ضرورت پر واضح دلیل ہے کہ انفرادیت شیطانی بھیڑیے کا شکار بنا دیتی ہے۔

سیدنا ابوذرؓ راوی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا۔

مَن فارق الجماعة شبراً فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه" یعنی جس نے جماعت سے ایک ذرا علیحدگی اختیار کی اس نے اسلام کا ہار اپنی گردن سے نکال دیا۔ (رواہ احمد و ابوداؤد)

اور سیدنا حارث اشعریؓ فرماتے ہیں کہ آنحضورؐ نے فرمایا۔ میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں۔ جماعتی زندگی گزارنے کا۔

(باقی ص۵۵ پر ملاحظہ ہو)

محمد منظور نعمانی

تحدیثِ نعمت

کیا دیکھا کیا پایا

(۵)

حکیم الامت حضرت تھانویؒ (۲)

میری تعلیم دار العلوم دیوبند کی تھی اور اس سے پہلے جن دوسرے مدارس میں پڑھا تھا، ان کے اساتذہ بھی دار العلوم ہی کے فیضیافتہ تھے، اسی وجہ سے میرا سیاسی ذہن وہی تھا جو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اثر سے اور پھر خلافت کی تحریک سے جماعت دیوبند کا بن گیا تھا، اسی بناء پر شروع ہی سے جمعیۃ العلماء سے تعلق رہا، اگرچہ جمعیۃ کی سیاسی سرگرمیوں میں میرا کوئی قابلِ ذکر عملی حصہ کبھی نہیں رہا لیکن جس زمانہ کی میں اس وقت بات کر رہا ہوں اس زمانہ میں میرا ذہنی اور فکری تعلق جمعیۃ سے خاصا گہرا تھا۔ اس کے صدر حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور ناظم (آج کی زبان میں جنرل سکریٹری) حضرت مولانا احمد سعید صاحب خاص عنایت و شفقت کا معاملہ فرماتے تھے۔ الفرقان اُس زمانہ میں چونکہ دہلی میں چھپتا تھا، اس لیے ہر مہینے چار پانچ دن کے لیے مجھے دہلی جانا پڑتا تھا اور وہاں قیام زیادہ تر جمعیۃ العلماء کے دفتر میں اور کبھی جامع مسجد کے قریب حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانہ رحیمیہ کی بالائی منزل پر ہوتا تھا، اس وجہ سے ان بزرگوں کی خدمت میں حاضری اور گفتگوؤں کا بہت موقع ملتا تھا۔

اپنے بڑوں کے سامنے بھی بولنے کی اور اگر ان سے کہیں اختلاف ہو تو صفائی سے اُن کے بھی عرض کر دینے کی، بُری یا اچھی، میری عادت شروع سے رہی ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ غالباً اس کی

قدر فرماتے تھے اور اگرچہ میں مرکزی جمعیۃ کی عاملہ کا رکن کبھی نہیں رہا مگر اس کے اہم جلسوں میں بھی حضرت مفتی صاحبؒ اکثر طلب فرما لیتے تھے ۔ جمعیۃ کے اس وقت کے نظام میں تیسری اہم شخصیت حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ (نائب امیر شریعت بہار) کی تھی، جمعیۃ کے کاموں ہی کے سلسلہ میں مہینوں ان کا قیام دہلی جمعیۃ کے دفتر ہی میں رہتا تھا، اس کی وجہ سے ان سے باتیں کرنے کا بہت موقع ملتا تھا، میں ان کے علمی رسوخ اور فقیرانہ زندگی سے بہت متاثر تھا، اور خاص کر ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل سے ان کی سیاسی بصیرت کا بہت قائل اور معتقد تھا۔

انڈیا ایکٹ ۳۵ء کی بنیاد پر ۱۹۳۶ء میں جنرل الکشن ہو چکا تھا اور اس کے نتیجہ میں صوبوں میں عوامی حکومتیں قائم ہو چکی تھیں جن میں سے سات صوبوں میں کانگریسی حکومتیں تھیں (جنھوں نے اس شرط کے ساتھ حکومت قبول کی تھی کہ گورنر ان کے کاموں میں دخل نہیں دے گا اور ان صوبوں کے گورنروں نے یہی رویہ اختیار کر لیا تھا) اس وقت یہ بات کھل کر سامنے آگئی تھی کہ ہندوستان جلدی ہی کامل آزادی حاصل کرے گا۔ اور یہاں قومی جمہوری حکومت ہوگی یعنی عوام کے منتخب نمائندوں کی پارلیمنٹ اقتدار کی مالک ہوگی۔

اور یہ بات بھی بالکل ظاہر تھی کہ وہ حکومت کانگریس ہی کی ہوگی (آج کانگریس کے علاوہ جو سیاسی پارٹیاں کسی قدر نمایاں ہیں ان کا اس وقت وجود ہی نہیں تھا)

شروع سے جمعیۃ العلماء کے سامنے سب سے اہم مقصد یہ رہا تھا کہ آزاد ہندوستان میں شرعی نصب العین کے مطابق مسلمانوں کے لیے نظام شرعی قائم ہو سکے، آزادی کی جنگ میں کانگریس کے ساتھ جمعیۃ کی شرکت کا یہ ایک خاص محرک تھا۔ لیکن یہ شرکت یا جمعیۃ کے بہت سے ارکان کا مقامی کانگریس کمیٹیوں کا ممبر بن جانا کانگریس کے فیصلوں اور پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کے لیے کافی نہیں تھا اس حقیقت کو سامنے رکھ کر حضرت مولانا محمد سجادؒ نے ایک اسکیم تیار کی اس کا حاصل اور خلاصہ جو اب یاد رہ گیا ہے یہ تھا کہ جمعیۃ العلماء مسلمانوں کی ایک عوامی جماعت قائم کرے جس کے نظام میں جمعیۃ کو مؤثر دخل رہے (غالباً اس کا نام "نظام ملت" تجویز کیا گیا تھا) کانگریس کی طرح اس کی ممبری کی فیس ہو، اور بہت ہلکی بس برائے نام ہو۔ ہر عاقل بالغ مسلمان کو اس کا ممبر بنانے کی کوشش کی جائے اور یہ شرط ہو کہ جو آدمی اس کا ممبر بنے، وہ لازمی طور پر کانگریس

کا بھی ممبر بنے۔ اس طرح مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو کانگریس کے نظام میں شریک کیا جائے اور ان سب کا رابطہ نظام ملت کے واسطے سے جمعیۃ العلماء سے بھی رہے۔ خیال تھا کہ اس راستے سے جمعیۃ العلماء کانگریس کے فیصلوں اور پالیسیوں پر اثر انداز ہو سکے گی (یہ ملحوظ رہے کہ جمعیۃ العلماء اُس وقت نہ عوامی جماعت تھی اور نہ انتخابی، اس کے نام اور عنوان کے مطابق عموماً علمائے کرام ہی اس کے ارکان ہوتے تھے)

حضرت مولانا محمد سجاد کا خیال تھا کہ اس طرح کی کسی تدبیر اور کوشش کے بغیر آزاد ہندوستان میں ہم اپنے وہ مذہبی و ملی مقاصد حاصل نہیں کر سکیں گے جن کے لیے اور جن کی امید پر ہم نے اور ہمارے بزرگوں نے قربانیاں دی ہیں اور دے رہے ہیں۔ مولانا موصوف نے یہ اسکیم بڑی تفصیل کے ساتھ مرتب کی تھی اور ابھی اس پر وہ خود اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا محمد سعید صاحبؒ غور فرما رہے تھے (یہ سنہ ۱۹۳۷ء کا ذکر ہے) ان ہی دنوں میں میرا دہلی جانا ہوا۔ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب نے پہلے زبانی اپنے اس خیال کا ذکر فرمایا پھر بتلایا کہ انھوں نے اس کا پورا خاکہ تحریری شکل میں بھی مرتب کر لیا ہے۔ میرے عرض کرنے پر وہ مجھے مطالعہ کے لیے عنایت بھی فرما دیا، میں نے اس کو بہت غور سے پڑھا اور میرے دل نے اس کو پوری طرح سے قبول کر لیا۔ ساتھ ہی شدت کے ساتھ دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ اس اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا ہو وہ سب کیا جائے میں نے سوچا کہ سب سے پہلے یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اپنی جماعت کے وہ اکابر بھی اس سے اتفاق کر لیں جو جمعیۃ العلماء اور اس کی سیاسی طرز کی سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہیں بلکہ ان کو ایک گونہ بُعد یا اختلاف رہا ہے۔ ان اکابر میں میری نظر میں سب سے اہم اور باعظمت شخصیت حکیم الامۃ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی میں نے ارادہ کر لیا کہ تھانہ بھون حاضر ہو کر حضرت کی خدمت میں اس مسئلہ کو رکھوں۔ جمعیۃ العلماء کے طریق فکر اور طرز کار سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ذہنی اور ذوقی اختلاف مجھے اچھی طرح معلوم تھا اور اُس کی وجہ سے امید کی کچھ زیادہ گنجائش نہیں تھی، لیکن حضرت کے اخلاص للہیت اور فہم و فراست کی بنا پر یہ یقین تھا کہ اگر تفصیل کے ساتھ حضرت کے سامنے پورے مسئلہ کو رکھا جائے گا تو اس پر غور ضرور فرمائیں گے اور اگر ذہن نے قبول کر لیا تو ان شاء اللہ اتفاق بلکہ کھلی تائید و حمایت پر بھی آمادہ ہو جائیں گے۔

میں نے اپنے اس خیال یا خبط کا کسی سے ذکر بھی نہیں کیا۔ اور اگلے دن صبح کو جمیعۃ کے

دفتر سے سیدھا شاہدرہ آیا اور وہاں سے تھانہ بھون روانہ ہو گیا۔ ٹرین میں بیٹھ کر راستے میں اطمینان سے حضرت سے گفتگو کرنے کے لیے ایک مفصل نوٹ تیار کیا تاکہ وقت پر کوئی ضروری بات رہ نہ جائے۔

غالباً ظہر کی نماز کے بعد حضرت سے ملاقات ہوئی۔ حسب معمول شفقت و عنایت کے ساتھ مصافحہ فرمایا، خیریت دریافت کی، اور فرمایا کہ کیا اس وقت کسی خاص ضرورت سے آنا ہوا؟" میں نے عرض کیا کہ ایک خاص معاملے کے بارے میں حضرت سے کچھ عرض کرنا ہے! فرمایا "کیا اسی وقت؟" میں نے عرض کیا نہیں! یہیں قیام کروں گا۔ آج یا کل جس وقت حضرت کو فرصت و فراغت ہو فرمایا کہ پھر آج ہی ان شاء اللہ مغرب کے بعد۔

یہ حضرت کی مجلس کا وقت تھا، شعبان کی غالباً ۱۲ تاریخ تھی، ہمارے عربی مدارس میں تعلیم و تدریس کا کام عام طور سے شعبان سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے اس لیے حضرت سے بیعت اور اصلاح و تربیت کا تعلق رکھنے والے بعض مدارس کے اساتذہ بھی آئے ہوئے تھے اور مجلس میں شریک تھے، (جن میں سے حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری رحمۃ اللہ علیہ خاص طور سے یاد ہیں) حضرت نے مجھے اپنے برابر میں بیٹھنے کا حکم فرمایا، میں تعمیل حکم میں بیٹھ گیا، لیکن جیسا کہ چاہیے تھا، ادب سے بیٹھا، ارشاد فرمایا بے تکلف ہو کر آرام سے بیٹھیے، اس سے مجھے انشراح ہوگا، میں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی پھر مجلس کے پورے وقت میں حضرت کا خاص التفات رہا۔ (اور اس کے علاوہ بھی جب کبھی حاضری ہوئی حضرت کا یہی طرز عمل رہا، لیکن الحمد للہ کبھی بھی حضرت کے اس رویہ کی وجہ سے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی، اس وقت بھی یہی احساس تھا اور آج بھی یقین ہے کہ یہ سیہ کار حضرت کے ادنیٰ خادموں کی صف میں بیٹھنے کے لائق بھی نہیں تھا)

مغرب کی نماز کے بعد خانقاہ کی مسجد ہی کے ایک کنارے چٹائی پر حضرت بیٹھ گئے، وہیں مجھے یاد فرمایا، میں حاضر ہو گیا سب سے پہلے میں نے عرض کیا کہ میں اس وقت جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اس کے بارے میں خود مجھے شبہ ہے کہ شاید حضرت اس کو پسند نہ فرمائیں، لیکن بہت غور کرنے کے بعد میں نے اپنے لیے یہ ضروری سمجھا ہے کہ حضرت کی خدمت میں اس کو عرض کر دوں حضرت نے بڑی عنایت و شفقت کے ساتھ فرمایا کہ آپ پوری بے تکلفی کے ساتھ اپنی بات کہیں، میں بالکل خالی الذہن ہو کر سنوں گا اور غور کروں گا۔

میں نے جیب سے وہ کاغذ نکالا جس پر وہ سب باتیں میں نے نمبر وار نوٹ کر لی تھیں جو مجھے حضرت کے سامنے عرض کرنی تھیں حضرت نے اس پر خوشی اور تحسین کا اظہار فرمایا کہ میں نے گفتگو کے لیے اہتمام سے تحریری یادداشت مرتب کر لی ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنی بات شروع کی، جس کا سلسلہ قریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ حضرت نہایت توجہ کے ساتھ سنتے رہے، درمیان میں کبھی کبھی یہ فرما دیتے کہ "اس بات کو ذرا پھر سے کہہ دیجئے" میں دوبارہ عرض کر دیتا میں نے جو کچھ عرض کیا تھا وہ سب تو اب محفوظ نہیں، لیکن اس کے اہم اجزاء جہاں تک یاد ہے یہ تھے :-

(الف) انڈیا ایکٹ ۳۵ء کی کچھ وضاحت اور یہ کہ اس کے ذریعہ حکومتی اختیارات کا کتنا بڑا حصہ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آ گیا ہے اور کتنا حکومت برطانیہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔

(ب) اب یہ بات یقینی نظر آتی ہے کہ جلدی ہی انگریزی اقتدار کلی طور پر ختم ہو جائے گا اور سارے اختیارات ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آ جائیں گے اور یہاں قومی جمہوری حکومت ہو گی، جس طرح اس وقت صوبوں میں عوامی حکومتیں قائم ہیں۔

(ج) یہ بھی ظاہر ہے کہ الکشن کے ذریعہ یہاں حکومت کانگریس ہی کی قائم ہو گی اور سارے اختیارات اس کے ہاتھ میں ہوں گے۔

(د) آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ہم جو کچھ چاہتے ہیں بالخصوص اُن کے لیے اپنے نظام شرعی کے قیام کا حق، اس کا بظاہر اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ کانگریس کے فیصلوں اور پالیسی میں دینی مزاج کے مسلمانوں کا بھی عمل دخل ہو۔

(ہ) اس کے بعد میں نے حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کی تجویز اور اسکیم کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا اور عرض کیا کہ یہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے جب اس کو ہمارے دینی حلقوں کی زیادہ سے زیادہ تائید و حمایت حاصل ہو اور ہم سب اس کے لیے کوشش اور محنت کریں جو کانگرسی مسلمان بھی ذہن کے نہیں ہیں وہ تو اس کی مخالفت کریں گے۔

آخر میں میں نے عرض کیا کہ حضرت اس مسئلہ پر غور فرمائیں۔ اور اگر حضرت کی رائے اس سے متفق ہو اور اس بارے میں شرح صدر ہو جائے کہ یہ کوشش اسلام اور مسلمانوں کے لیے ان شاء اللہ مفید ہو گی تو پھر حضرت اس کی تائید فرما دیں۔ پھر ان شاء اللہ مخلص اور دیندار مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کا تعاون

ف۔ انڈیا ایکٹ ۳۵ء کا اردو ترجمہ جو ایک ضخیم کتاب کی شکل میں چھپ چکا تھا اس وقت میرے ساتھ تھا۔

حاصل ہو جائے گا اور اُس وسیع پیمانے پر کام ہو سکے گا جس کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، میری یہ گفتگو بہت طویل اور مفصل تھی، اس کے یہ چند اجزاء اور نقاط تھے جو یاد رہ گئے ہیں۔

جب میں نے اپنی بات ختم کی اور عرض کیا کہ جو مجھے عرض کرنا تھا وہ میں عرض کر چکا تو حضرت نے فرمایا "میں نے آپ کی بات اور مقصد کو سمجھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، مجھے اس وقت بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن کا معلوم ہونا ضروری تھا، میرا طریقہ یہ ہے کہ میں جلدی رائے قائم نہیں کرتا ہوں۔ پہلے خود اچھی طرح غور کرتا ہوں، پھر ضرورت سمجھتا ہوں تو اُن دوستوں سے مشورہ بھی کرتا ہوں جن کو مخلص اور صاحب رائے سمجھتا ہوں، اس لیے اپنی رائے تو اس وقت ظاہر کر سکوں گا جب قائم ہو جائے گی، لیکن میرا حال اس وقت یہ ہے کہ آپ کی باتوں نے میرے دل کو بہت متاثر کیا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ اس سے پوری طرح اتفاق کر لوں، لیکن میں غور کر کے رائے قائم کروں گا اور ان شاء اللہ کل صبح بتلا دوں گا کہ میری رائے کیا قائم ہوئی؟"

اگلے دن صبح فجر کی نماز کے بعد حضرت نے مسجد ہی میں مجھ سے فرمایا "میں نے غور کیا، میری وہی رائے ہے جو میں نے رات ظاہر کی تھی، اب میں یہاں کے لیے خاص احباب سے مشورہ کروں گا لیکن اس کی صورت یہ ہوگی کہ آپ نے جس طرح میرے سامنے پوری تفصیل سے بات رکھی تھی اُسی طرح ان کے سامنے بھی آپ رکھیں، میں ان کو اطلاع دوں گا کہ وہ آٹھ بجے یہاں خانقاہ ہی آجائیں۔"

وہ حضرات آٹھ بجے جمع ہو گئے۔ ان میں ایک حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی تھے دوسرے مولانا مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلوی مرحوم تھے، جو حضرت حکیم الامۃ کے ممتاز اصحاب علم خلفاء میں سے تھے۔ تیسرے صوبہ بہار کے ایک عالم تھے جو اُس زمانہ میں خانقاہ کے مدرسہ میں غالباً صدر مدرس تھے، (ان کا نام اب یاد نہیں) ان کے علاوہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری بھی تھے۔ غالباً صرف یہی چار حضرات تھے۔ حضرت حکیم الامۃ نے ان حضرات سے مخاطب ہو کر میرا نام لے کر ارشاد فرمایا کہ رات انھوں نے ایک بہت اہم مسئلہ پر مجھ سے بات کی، میں نے آپ حضرات کو اس وقت اس لیے جمع کیا ہے کہ آپ بھی اس کو سنیں، اس پر غور کریں اور مشورہ دیں۔ اس کے بعد میری طرف مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ جو بات آپ نے جس طرح تفصیل

کے ساتھ مجھ سے کہی تھی اسی طرح ان حضرات کے سامنے بھی آپ وہ بات رکھیں۔

میں نے اس مجلس میں بھی پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ مسئلہ کو رکھا جب میں اپنی بات پوری کر چکا تو حضرت نے ان حضرات سے فرمایا کہ اب آپ حضرات اس مسئلہ میں اپنی اپنی رائے ظاہر فرمائیں یہ سب حضرات خاموش رہے، کچھ دیر کے بعد حضرت نے دوبارہ یہی فرمایا، اس پر بھی کسی نے اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی اور خاموشی رہی، تو حضرت نے فرمایا کہ میں نے رات سے اب تک اس مسئلہ پر جو کچھ غور کیا ہے اس کی بناء پر میرا رجحان تو یہ ہے کہ مولانا نے (یعنی راقم سطور محمد منظور نعمانی نے) جو بات ہمارے سامنے رکھی ہے وہ صحیح ہے اور ہمیں اسے قبول کر لینا چاہیے یہ خیال ہمارے لیے مانع نہیں ہونا چاہیے کہ تحریکات کے بارے میں اب تک ہمارا جو طریقہ اور مسلک رہا ہے یہ اس کے خلاف ہے۔ ہماری اب تک جو رائے رہی اور ہم نے جو کچھ کیا، حق سمجھ کر کیا اور اللہ کے لیے کیا، اور اب اگر یہ رائے قائم ہو جائے کہ یہ دوسرا طریقہ جمعیۃ علماء والے حضرات کا صحیح ہے اور اس سے اسلام اور مسلمانوں کے حق میں خیر کی امید ہے تو اس کو بھی ہم اللہ ہی کے لیے اختیار کریں گے" اس کے بعد ارشاد فرمایا "اگر اس رائے کے بارے میں اطمینان اور شرح صدر ہو جائے تو پھر میں اپنی ذات سے اس کے لیے تیار ہوں کہ جمعیۃ العلماء میں شامل ہو جاؤں اور کانگریس کا بھی ممبر بن جاؤں۔"

حضرت کی زبان سے یہ آخری بات سُن کر میں بھی حیران رہ گیا، اس حد تک تو میرا ابھی وہم وخیال نہیں جا سکتا تھا میں تو زیادہ سے زیادہ بس تائید اور حمایت ہی کی توقع کر سکتا تھا میری طرح اور سب حاضرین کو بھی حضرت کی یہ بات سُن کر حیرت ہوئی ہوگی، لیکن اس مرحلہ پر بھی کسی نے اختلافی رائے کا اظہار نہیں کیا۔

حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ نے اصولی طور پر حضرت کی رائے سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے عرض کیا کہ میری گزارش یہ ہے کہ حضرت اپنی ذات کے بارے میں تو ابھی کوئی اقدام اور اعلان نہ فرمائیں، بس زیادہ سے زیادہ تائید فرمادیں لیکن اپنے خاص معتمد چند حضرات کو ارشاد فرمادیں کہ وہ شامل ہو جائیں اور، دو یا تین مہینے کی مدت مقرر کر دی جائے، اس مدت میں وہ جمعیۃ العلماء کے حضرات کے ساتھ کام کر کے حضرت کی خدمت میں اپنا تجربہ اور اپنی رائے عرض

کریں، اس کے بعد اپنی ذات کے بارے میں حضرت کوئی فیصلہ فرمائیں۔

میں نے حضرت مولانا جالندھری کی اس رائے کی تائید کی۔ حضرت نے بھی اس کو پسند فرمایا اور اس حد تک بات اس مجلس میں گویا طے پا گئی۔

اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ اب اس کی ضرورت ہے کہ خود جمعیۃ العلماء کے حضرات سے بھی گفتگو ہو، میں نے عرض کیا کہ حضرت ارشاد فرمائیں تو میں دہلی چلا جاؤں اور اُن حضرات سے عرض کردوں، انشاء اللہ وہ ضرور تشریف لے آئیں گے، چنانچہ میرا دہلی جانا طے ہو گیا، مجھے حضرت نے ایک رقم بھی عنایت فرمائی۔ یہ میرے اور اُن اکابر جمعیۃ کے کرایہ کے لیے تھی

پھر حضرت نے فرمایا کہ یہ بہتر ہوگا کہ دیوبند اور سہارنپور کے حضرات بھی اس مشورہ میں شریک ہوں چنانچہ طے ہو گیا کہ فلاں صاحب حضرت کا خط لے کر سہارنپور اور دیوبند جائیں گے

صرف ایک دن درمیان میں چھوڑ کے دوسرے دن صبح کا وقت اس مشاورت کے لیے مقرر کیا گیا۔

میں اسی دن دہلی روانہ ہو گیا، سب سے پہلے جمعیۃ کے دفتر پہنچا، وہاں مولانا سجاد صاحب تشریف فرما تھے، ان کو تھانہ بھون کے اپنے سفر کی روداد سنائی اور عرض کیا کہ آپ کو حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا احمد سعید صاحب کو تھانہ بھون تشریف لے چلنا ہے، میں اسی لیے آیا ہوں۔

مولانا کو یہ سن کر کہ حضرت تھانویؒ اس حد تک آمادہ ہو گئے ہیں بڑی حیرت ہوئی اور مولانا اسی وقت مجھے اپنے ساتھ لے کر کوچہ چیلان، حضرت مفتی صاحب کے ہاں پہنچے، وہاں بھی میں نے پوری تفصیل سے تھانہ بھون کے اپنے سفر کی روداد سنائی، حضرت مفتی صاحب نے بھی بڑی حیرت و استعجاب کا اظہار فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ آج ہی شام کو آپ حضرات کو تھانہ بھون تشریف لے چلنا ہے، کل صبح آٹھ بجے کا وقت گفتگو کے لیے مقرر ہے، سہارنپور اور دیوبند کے حضرات کو بھی بلایا گیا ہے۔

حضرت مفتی صاحب اور ان کے ساتھ ہم دونوں (راقم سطور اور حضرت مولانا محمد سجاد) مولانا احمد سعید صاحب کے مکان پہنچے جو اسی کوچہ چیلان میں قریب ہی تھا، وہ اس وقت نگینہ کے سفر کے لیے تیار ہو کر گھر سے نکلنے ہی والے تھے، حضرت مفتی صاحب نے ان سے میرے تھانہ بھون کے سفر کا مختصر طور پر تذکرہ کر کے فرمایا کہ آج ہی شام کو ہم تینوں کو (یعنی حضرت مفتی صاحب، مولانا سجا

صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب کو تھانہ بھون کے لیے روانہ ہونا ہے۔ مولانا احمد سعید صاحب نے فرمایا کہ میں تو اسی وقت نگینہ جا رہا ہوں، حافظ ابراہیم صاحب کے الکشن[۱] کے سلسلہ میں مجھے وہاں جگہ جانا ہے، مولوی حفظ الرحمٰن کے دو تار آچکے ہیں، الکشن کا بالکل اخیر وقت ہے، اس لیے میرے لیے اس وقت تھانہ بھون جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ بس آپ دونوں حضرات تشریف لے جائیں حضرت مفتی صاحب نے اس کے بعد بھی فرمایا کہ میری رائے میں تو تھانہ بھون کا سفر مقدم ہے لیکن مولانا احمد سعید صاحب نے پھر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے تار کا حوالہ دیکر معذرت کی اور اسی وقت اسٹیشن کے لیے روانہ ہوگئے۔ پھر اسی دن شام کو حضرت مفتی صاحب، مولانا محمد سجاد صاحب اور یہ عاجز شاہدرہ سہارنپور ٹرین سے تھانہ بھون کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہاں ٹرین رات کو پہونچتی تھی۔ حضرت تھانوی نے میرے دہلی جاتے وقت یہ فرمادیا تھا کہ ان حضرات، کو اسمیں راحت رہے گی کہ قیام مولوی شبیر علی صاحب کے مکان پر رہے۔ یہ حضرات بستر وغیرہ ساتھ لانے کی زحمت نہ اٹھائیں ہم لوگ اسٹیشن پر اترے، خانقاہ کے خادم خلیفہ اعجاز صاحب ہاتھ میں لالٹین لیے موجود تھے۔ ان کے ساتھ ایک دو آدمی اور بھی تھے۔ اسٹیشن سے راستہ پیدل ہی کا تھا خلیفہ صاحب کی رہنمائی میں ہم تینوں، مولانا شبیر علی صاحب کے مکان پر پہونچے۔ وہاں بستر لگے ہوئے تھے، غالباً کھانے کا بھی بندوبست تھا لیکن ہم سب فارغ ہو چکے تھے اس لیے معذرت کردی اور سو گئے۔ صبح فجر کی نماز کے لیے خانقاہ پہونچے، حسب معمول حضرت تھانوی نے خود نماز پڑھائی نماز سے فارغ ہو کر ملاقات ہوئی۔ حضرت مفتی صاحب اور مولانا سجاد صاحب سے حضرت نے معانقہ بھی فرمایا، مزاج پرسی ہوئی، حضرت نے فرمایا کہ آپ حضرات کی راحت کے لیے میں نے مولوی شبیر علی صاحب کا مکان قیام کے لیے تجویز کیا ہے۔ اس مکان میں راحت کے انتظامات زیادہ ہیں۔

چائے ناشتہ بھی مولانا شبیر علی صاحب ہی کے یہاں ہونا تھا جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے، مجلس اور گفتگو کے لیے آٹھ بجے کا وقت مقرر تھا، ہم لوگ کچھ پہلے خانقاہ پہونچ گئے۔ حضرت تشریف لا چکے تھے، سہارنپور سے حضرت مولانا حافظ عبداللطیف صاحب، شیخ الحدیث حضرت مولانا

۱؎ یہ حافظ ابراہیم مرحوم کا وہ الکشن تھا جو انھوں نے ۳۷ء میں یوپی کی کانگریس حکومت میں وزارت قبول کرنے کے بعد مسلم لیگ کے مطالبہ اور چیلنج پر اسمبلی کی ممبری سے استعفا دینے کے بعد دوبارہ لڑا تھا اور اسمیں بھی کامیابی حاصل کی تھی۔ مولانا احمد سعید صاحب اسی الکشن کے سلسلہ میں نگینہ جا رہے تھے۔

ہندوستانیوں کے حوالہ کرے، وہ اختیارات کافی حد تک بھی ہوا ہے اور حالات جس رفتار سے چل رہے ہیں اُن سے اندازہ یہ ہے کہ مستقبل قریب ہی میں برطانوی حکومت باقی اختیارات بھی ہندوستانیوں کے حوالہ کرنے پر مجبور ہو جائے گی اور یہاں قومی جمہوری حکومت اُس کی جگہ لے گی، ہم مسلمان کانگریس کا ساتھ دیں جب بھی یہی ہوگا اور کانگریس کا ساتھ نہ دیں جب بھی یہی ہوگا، زیادہ سے زیادہ کچھ دیر سویر کا فرق پڑے گا، یہاں جو جمہوری حکومت قائم ہوگی ہمیں ہرگز یہ غلط فہمی نہیں ہے اور کسی کو بھی یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ وہ اسلامی حکومت ہوگی ـــــ وہ ہندوستانی جمہوری حکومت ہوگی

اب ہم مسلمانوں کے سامنے دو راستے ہیں ایک یہ کہ ہم آزادی کی اس جنگ میں کوئی حصہ نہ لیں، اس صورت میں جب ملک آزاد ہوگا اور یہاں جمہوری حکومت قائم ہوگی تو ظاہر ہے کہ ہم اس میں مؤثر نہیں ہو سکیں گے اور ہمارے اندر سخت کمتری کا اور شرمندگی کا احساس ہوگا، ہم خود اپنے کو برابر کا شریک اور حقدار نہیں سمجھیں گے اور زور اور قوت سے اپنے حقوق کا مطالبہ بھی نہیں کر سکیں گے۔

اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم آزادی کی جنگ میں شریک ہوں، اس صورت میں ہمیں یہ امید ہے کہ جب ملک آزاد ہوگا اور یہاں جمہوری حکومت قائم ہوگی تو ہم اُس میں مؤثر اور دخیل ہوں گے، وہ اسلامی حکومت تو نہیں ہوگی لیکن ہمارے دینی مقاصد کے لیے بھی موجودہ انگریزی حکومت سے ہمارے لیے بھی وہ بہتر ہوگی، اور ہماری حیثیت اُس میں ایک ایسے شریک کی ہوگی جو جنگ اور قربانی میں بھی شریک رہا ہے۔

حضرت مفتی صاحب نے اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کے بعد فرمایا ـــــ ہم نے جہاں تک غور کیا ہے ہم مسلمانوں کے لیے اس دوسرے راستہ کو صحیح سمجھتے ہیں اور فیما بیننا وبین اللہ اس پر مطمئن ہیں۔

حضرت مولانا محمد سجاد صاحب نے اس پر اتنا اور اضافہ فرمایا "لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا" (کلمۂ اسلام کے بلند ہونے کا) اعلیٰ درجہ تو بے شک یہی ہے کہ صحیح دینی اصولوں پر اسلامی حکومت قائم ہو ـــ اس کا تو ہندوستان میں کسی کے نزدیک بھی کوئی امکان اس وقت نہیں ہے لیکن اس کا ایک دوسرا درجہ یہ بھی ہے کہ مذہبی امور اور معاملات کے لحاظ سے اس وقت ہماری جو حالت ہے، اُس سے بہتر حالت ہو جائے، ہم جو کچھ کر رہے ہیں اسی امید پر کر رہے ہیں اور اس کا راستہ ہمارے نزدیک یہی ہے۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے غالباً اسی مرحلہ پر یہ بھی فرمایا کہ میں اس سلسلہ میں ایک یہ بات بھی اس مجلس میں ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس راستہ میں جس کو ہم مسلمانوں کے لیے صحیح سمجھتے ہیں اور جس کو ہم نے اختیار کیا ہے، بعض منکرات بھی پیش آتے ہیں، مثلاً ہم کانگرس کی میٹنگ میں شریک ہیں، اُس کے ارکان اور ممبران میں عورتیں بھی ہیں وہ بھی اس میٹنگ میں شریک ہوں گی، بحث مباحثہ میں حصہ لیں گی، جلسہ میں تقریر بھی کریں گی۔ یہ سب کچھ ہماری موجودگی میں اور ہمارے سامنے ہوگا، اگر ہم شرکت ضروری سمجھتے ہیں تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم شریک رہیں، اور کارروائی میں حصہ لیں اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہیں۔ ہم نے اس پر بھی بار بار غور کیا ہے اور فیما بیننا وبین اللہ۔ ہم مطمئن ہیں کہ ان منکرات کے باوجود ہمیں کانگریس میں شریک ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں مفتی صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ۔ اس طرح کے منکرات کا واسطہ تو مسلم لیگ کے جلسوں میں بھی پڑتا ہے

اس گفتگو میں جہاں تک اب یاد ہے حضرت مولانا ظفر احمد صاحب اور حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کے سوا حاضرین میں سے کسی نے کوئی خاص حصہ نہیں لیا، حضرت تھانویؒ نے بھی اس دن اس سلسلہ میں اپنے کسی رجحان کا اظہار نہیں فرمایا۔ اس سے مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ پہلی دو گفتگوؤں کے آخر میں حضرت نے اپنے جس تاثر اور رائے کا اظہار فرمایا تھا اب اس میں غالباً فرق پڑ چکا ہے اور حضرت کا موقف وہ نہیں رہا ہے جو میرے دہلی جانے سے پہلے تھا یا کم از کم یہ کہ میں نے جو سمجھا تھا۔

حضرت مولانا حافظ عبداللطیف صاحبؒ (ناظم مظاہر علوم سہارنپور) نے بھی اس مجلس میں کچھ گفتگو فرمائی تھی اور مولانا مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلوی مرحوم نے بھی ایک مختصر تحریر پڑھ کر سنائی تھی جو وہ قلمبند کر کے لائے تھے، لیکن یہ دونوں چیزیں مجلس کے اصل موضوع سے غیر متعلق تھیں اور اب اُن کا ذکر کرنا غالباً مناسب بھی نہ ہوگا۔

یہ بات ذکر سے رہ گئی کہ مجلس کے شرکاء میں جناب مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند بھی تھے، حضرتؒ نے ان کو بھی بلوایا تھا لیکن جہاں تک یاد ہے وہ اس وقت پہونچ سکے تھے جب بات شروع ہو چکی تھی۔

یہ مجلس تقریباً ۳-۴ گھنٹے جاری رہی، آخر میں حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ اب کافی وقت

ہو گیا اور مسئلہ سے متعلق سارے پہلو سامنے آگئے، اب آپ حضرات کھانے سے فارغ ہو لیں اور آرام فرمالیں — چنانچہ مجلس برخواست ہوئی، ہم لوگوں نے مولانا شبیر علی صاحب مرحوم کے مکان پر آکر کھانا کھایا اور آرام کیا۔ یہ شعبان کی ۱۵ تاریخ تھی، خود حضرت تھانویؒ کا اور وہاں کے اکثر دوسرے حضرات کا بھی اور غالباً سہارنپور سے آنے والے حضرات کا بھی اُس دن روزہ تھا۔ ظہر کی نماز ہم لوگوں نے خانقاہ میں پڑھی۔ ظہر کے بعد حسب معمول حضرات کی مجلس ہوئی۔ جہاں تک یاد ہے سب حضرات نے مجلس میں شرکت فرمائی۔

رات کے کھانے کا اہتمام خود حضرت نے اپنے بڑے گھر پر کیا تھا۔ صحیح گنتی تو یاد نہیں لیکن یہ یاد ہے کہ کھانے کی انواع و اقسام بہت تھیں، اور حضرت نے بڑا اہتمام فرمایا تھا۔

مجلس کے موضوع پر پھر کسی گفتگو کی نوبت نہیں آئی۔ میں نے حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری سے (جو خانقاہ کے اس مجمع میں اور حضرت کے خاص معتمدین میں میرے خیالات سے نسبتاً قریب تھے) تنہائی میں دریافت کیا کہ آپ کا کیا اندازہ ہے حضرت نے پرسوں کی مجلس میں اپنے جس رجحان کا اور آخر میں جس رائے کا اظہار فرمایا تھا جس میں جمعیۃ العلماء اور کانگرس میں شرکت تک کی اجازت بھی فرمائی تھی، کیا اب حضرت کی رائے وہ نہیں رہی؟ — انھوں نے فرمایا کہ میرا اندازہ یہی ہے کہ اب حضرت کو اُس رائے پر اطمینان نہیں رہا اور مزید غور و فکر کی ضرورت محسوس فرماتے ہیں۔ اُسی رات میں یا اگلے دن صبح کی ٹرین سے ہم لوگوں کی تھانہ بھون واپسی ہو گئی — اس کے بعد دوسرے ذرائع سے مجھے یہ بات معلوم ہو گئی کہ حضرت کی رائے کے بارہ میں میرا اور مولانا خیر صاحب کا اندازہ صحیح تھا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں حضرت نے میری بات سُن کر جو غیر معمولی اثر فوری طور پر لیا تھا اور اس کی بنا پر جو رائے ہو گئی تھی، جس کا پہلی مجلس میں اظہار بھی فرمایا تھا، وہ حضرت کے عمر بھر کے طرز فکر اور طرز عمل اور ذوق و مزاج کے بالکل خلاف نیز حضرت کے پورے ماحول کے بھی بالکل خلاف ہونے کی وجہ سے خود میرے لیے بھی انتہائی حیرت کا باعث ہوا تھا اس لیے اُس رائے میں تبدیلی واقع ہو جانے کی اطلاع سے اگرچہ قدرتی طور پر مجھے افسوس ہوا لیکن کوئی تعجب نہیں ہوا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، یہ واقعہ سنہ ۳۸ء کا ہے جبکہ صوبوں میں کانگرسی حکومتیں

کو قائم ہوئے چند مہینے ہی گزرے تھے بعد میں ان حکومتوں کے رویہ سے مسلمانوں میں عام طور کانگریس سے بدظنی اور دوری بڑھتی ہی رہی ان ہی چند مہینوں میں خاص کر ہمارے صوبہ یوپی میں مسلم لیگ کا دور شروع ہوا اور اس نے کانگریس اور اس کی حکومتوں کے خلاف وسیع پیمانہ پر پروپیگنڈے کی مہم شروع کی (جس کے لیے کسی حد تک مواد کانگریسی حکومتوں کے رویہ نے بھی فراہم کیا) اس صورتحال نے حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ کی "نظام ملت" والی اسکیم کی کامیابی کے امکانات کو بڑی حد تک ختم کر دیا اور غالباً اسی وجہ سے پھر جمعیۃ العلماء کے کسی جلسہ میں بھی باضابطہ اس پر غور و بحث کی نوبت نہیں آئی۔

حالات کی اس رفتار نے قدرتی طور پر حضرت تھانویؒ کے اس احساس کو اور آگے بڑھایا کہ کانگریس کے بارہ میں ہمارا جو طرز عمل اور طرز فکر رہا ہے وہی صحیح تھا اور صحیح ہے اور اس طرح مسلم لیگ کیساتھ ایک طرح ذہنی قرب اور ہمدردی کا جذبہ بڑھتا رہا اور بعد میں تو کھلی حمایت کا بھی فیصلہ فرمایا۔۔۔ قُلْ کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ فَرَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ ھُوَ اَھْدٰی سَبِیْلًا ۞

دار العلوم دیوبند کے میرے خاص متعارف اساتذہ میں ایک صاحب مولانا سید حسن صاحب دیوبندی مرحوم تھے۔ بڑے صالح عالم دین تھے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ سے بیعت اور اصلاح و تربیت کا تعلق تھا۔ جلدی جلدی تھانہ بھون حاضر ہونے کا ان کا معمول تھا۔ حضرتؒ کے وصال کے بعد ایک دن انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ میں ایک دفعہ حضرتؒ کی مجلس میں تھانہ بھون حاضر تھا حضرت نے تم سے متعلق کسی واقعہ کا کچھ ذکر کیا جس کا تعلق جمعیۃ العلماء اور کانگریس سے تھا اور تمہارے بارہ میں فرمایا کہ میں "اس وقت اُن کے اخلاص سے مغلوب ہو گیا" ۔۔۔ مولانا سید حسن صاحب مرحوم نے یہ بات بیان کر کے مجھ سے دریافت کیا کہ وہ کیا واقعہ تھا؟ حضرت نے مجلس میں واقعہ تفصیل سے بیان نہیں فرمایا تھا اور پوچھنے کی میری ہمت نہ ہوئی، اگر آپ کو یاد ہو تو بتلائیے!

۔۔۔ مجھے مولانا سید حسن صاحب مرحوم کے اس بیان سے یہ معلوم کر کے کہ حضرت قدس سرہٗ نے مجھے اس درجہ کا مخلص گمان کیا، بیحد خوشی ہوئی۔ اللہ تعالے حضرت کے اس حسن ظن کو میرے حق میں واقعہ بنا دے ۔۔۔ میں نے مولانا سید حسن صاحب کو یہ واقعہ پوری تفصیل سے سنایا، انھوں نے غالباً فرمائش کی کہ اس کو اسی تفصیل سے لکھ دو ۔۔۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے حضرات

جن کے سامنے یہ واقعہ بیان کرنے کی کبھی نوبت آئی انھوں نے بھی یہی فرمائش کی اور خود میں بھی ضروری سمجھتا تھا کہ اس واقعہ کو لکھ کے محفوظ کر دیا جائے کیونکہ اس کے سارے اجزاء اور اس سلسلہ کی ساری کڑیاں میرے سوا کسی بھی دوسرے کے علم میں نہیں تھیں اور نہیں ہیں — آج قریباً ۲۶ سال کے بعد اس کو حوالۂ قلم کرنے کی توفیق ملی ہے۔

اس عاجز پر اللہ تعالیٰ کا ایک خاص انعام و احسان یہ بھی ہے کہ اس طرح کے واقعات اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ محفوظ رہتے ہیں — اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۰)

امیر کے احکام کو سننے اور اس کو ماننے کا۔

اللہ کے دین کے لیے ہجرت کا۔

اللہ کی راہ میں جہاد کا

اور یہ کہ جو جماعت سے ایک بالشت برابر نکلا اس نے اسلام کی رسی اپنی گردن سے نکال دی الا یہ کہ وہ واپس آجائے۔ (ترمذی، امام احمد)

یہ آیات و احادیث مسلمانوں کے لیے اجتماعی زندگی کے لزوم کی واضح دلیلیں ہیں۔

(باقی)

بقیہ درس قرآن (صفحہ ۲۲ کا بقیہ)

صحیح تدبیریں اختیار کرنے کی اور صحیح طریقہ پر جد و جہد کی ہمیں توفیق ملے گی، اور پھر ہماری اس جد و جہد کے صحیح اور خاطر خواہ نتائج و ثمرات پیدا ہوں گے۔ یہی سنت اللہ ہے اور یہی انبیاء علیہم السلام کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا طریقہ ہے۔ بلکہ میں تو قرآن مجید ہی کی روشنی میں اور اپنی تاریخ کی روشنی میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اگر ہم مسلمانوں میں تقویٰ اور نیکو کاری کی زندگی وسیع پیمانے پر پیدا ہو جائے تو دنیا بھر کے ملکوں اور خاص کر ہمارے اس ملک ہندوستان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کی ایسی ہوائیں چلیں گی کہ قوموں کی قومیں اور علاقے کے علاقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا طریقہ زندگی قبول کرنے لگیں گے۔ لیکن کیسی بد قسمتی کی بات ہے! کہ ہم سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہیں مگر اپنی اصلاح کی کوشش کرنے کے لیے تیار نہیں، حالانکہ ہمارے لیے راستہ صرف یہی ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ ٥

بقیہ مسئلہ بقائے الفرقان (صفحہ ۱۰ کا بقیہ)

اُن پر اپنے رب کریم کا شکر ادا کرنا میرا فرض ہے، ان میں سے قریب قریب سب میں توسیع اشاعت کی کوشش کا عزم بھی ظاہر فرمایا گیا ہے، اور اکثر میں الفرقان کا چندہ آٹھ کے بجائے دس روپے کر دینے کا مشورہ بھی دیا گیا ہے ـــــــ اگرچہ کاغذ کی قیمت اور کتابت طباعت وغیرہ کی اجرت میں ان ۲، ۳ سالوں میں پھر اتنا اضافہ ہو چکا ہے کہ عام اصول کے مطابق چندہ میں یہ اضافہ ضروری ہے، لیکن جی یہی چاہتا ہے کہ اسمیں اضافہ نہ کرنا پڑے، خریداروں ہی کی تعداد میں اتنا اضافہ ہو جائے کہ مالی خسارہ کی موجودہ مشکل نہ رہے اس لیے مخلصین امکانی حد تک اسی کی کوشش کریں، اور یہ کوشش ایک وقتی مہم کی طرح دو تین ہفتے کے اندر اندر (وسط شوال تک) کر لیں۔

اگر خریداروں کی تعداد میں یہ اضافہ ضرورت اور توقع کے مطابق نہ ہو سکا تو الفرقان کو جاری رکھنے کے لیے مجبوراً چندہ میں دو روپے کے اضافہ کا فیصلہ کرنا ناگزیر ہوگا۔

اللّٰھم الطف بنا فی تیسیر کل عسیر فان تیسیر کل عسیر علیک یسیر۔

پیٹ میں بھاری پن اور سینے میں جلن
جلد آرام کے لیے
پچنول
PACHNOL
پچنول پیٹ کے درد، کھٹی ڈکاریں، اپھارا، جلن
کمی اور کھانے کے بعد طبیعت کی سستی وغیرہ جیسی
نہایت مفید ہے۔
ہمدرد

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Kutchery Road Lucknow U. P.

VOL. 41 NO. 9 OCTOBER, 73 Phone No. 25547

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow-1

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی

جلد ۴۱ | بابت ماہ شوال ۱۳۹۳ھ مطابق نومبر ۱۹۷۳ء | شمارہ ۱۰

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو، تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع یکم دسمبر تک آجائے ورنہ اگلا پرچہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۸ تاریخ تک آجانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

محمد منظور نعمانی

حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، یہ عہد فاروقی میں مجاہدین کے اُس لشکر کے قائد اور افسر اعلیٰ تھے جس کی جنگ اور قربانیوں کے نتیجہ میں اسوقت کی دنیا کی عظیم ترین اور نہایت طاقتور سلطنت فارس کی شہنشاہی کے قریباً سارے مقبوضات اسلامی حکومت کے دائرہ میں آگئے۔ تاریخ و سیرت کی کتابوں میں اُن کے نام فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ایک خط نقل کیا گیا ہے، یہ گویا ایک ہدایت نامہ ہے، اس کے ایک ایک لفظ میں اسلام کی رُوح بھری ہوئی ہے، کاش ہم مسلمانوں کو خاص کر آج کی مسلم حکومتوں کے ذمہ داروں اور بالخصوص اُن کے فوجی افسروں اور عام لشکریوں کو اس پر غور کرنے ہی کی توفیق ملے۔ آپ بھی اس کو پڑھ کر ایمان تازہ کیجیے! تحریر فرمایا ہے:۔

انی امرك ومن معك من الاجناد بتقوی اللہ علی کل حال فان تقوی اللہ افضل العدۃ علی العدو، واقوی المکیدۃ فی الحرب.	میں تم کو اور تمہارے ساتھ جو مجاہدین اور لشکری ہیں اُن سب کو اللہ سے ڈرنے کی اور تقوے والی زندگی کی وصیت و ہدایت کرتا ہوں، اس لیے کہ یہ تقویٰ ہی دشمن کے مقابلے کے لیے سب سے زیادہ قابل اعتماد سامانِ جنگ، اور مضبوط ترین تدبیر ہے، اور میں تم کو
وامرك ومن معك ان تکون اشد احتراسا من المعاصی منکم من عدوکم فان ذنوب الجیش	اور تمہارے ساتھ والے سارے مجاہدین کو وصیت کرتا ہوں کہ دشمن کے حملے سے بچنے کی فکر سے بھی زیادہ گناہوں سے بچنے کی فکر کریں، کیونکہ لشکر کے اپنے گناہ دشمن سے بھی زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہوتے ہیں۔ — اور معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے

اخوف علیہم من عدوھم وانما ینصر المسلمون بمعصیۃ عدوھم اللہ ولولا ذالک لم تکن لنا بھم قوۃ (ثم یقول لھم) فاعلموا ان علیکم فی سیرکم حفظۃ من اللہ یعلمون ما تفعلون

مسلمانوں کی مدد اُن کے دشمنوں کے مقابلہ میں دشمنوں کی معصیتوں اور نافرمانیوں ہی کی وجہ سے ہوتی ہے اور اگر ہمارے دشمن گناہوں سے بچیں تو ہم ان کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔ (پھر اسی سلسلہ میں فاروق اعظم نے آگے تحریر فرمایا) اور تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمھارے ساتھ ساتھ تمھاری نگرانی کرنے والے فرشتے رہتے ہیں وہ تمھارے سارے اعمال و افعال سے باخبر رہتے ہیں۔

ولا تعملوا بمعاصی اللہ و انتم فی سبیل اللہ ولا تقولوا ان عدونا شر منا فلن یسلط علینا فرب قوم سلط علیہم شر منھم کما سلط علی بنی اسرائیل لما عملوا بمساخط اللہ کفار مجوس "فجاسوا خلال الدیار وکان وعدا مفعولا" و اسئلوا اللہ العون علی انفسکم کما تسألونہ النصر علی عدوکم اسأل اللہ تعالیٰ ذالک لنا ولکم۔

اور دیکھو تم خدا کے راستے پر جہاد کے لیے نکلے ہوئے ہو ایسی حالت میں تم سے ہرگز کوئی گناہ نہ ہونا چاہیے۔ اور تم کبھی یہ خیال نہ کرنا کہ تمھارے دشمن بہرحال تم سے بُرے ہیں (وہ کفار و مشرکین ہیں) اسلیے اللہ تعالیٰ ہرگز ان کو تم پر مسلط نہیں کرے گا، سنو! ایسی بہت سی قومیں اور اُمتیں گزری ہیں جن کی معصیتوں کی وجہ سے اُن سے بدتر لوگوں کو اُن پر مسلط کیا گیا۔ چنانچہ جب بنی اسرائیل نے اللہ کی نارضی والا رویہ اختیار کیا تو مجوسی کفار اُن پر مسلط کیے گئے جنھوں نے اُن کے گھروں میں گھس گھس کر ان کو تباہ و برباد کیا اور یہ اللہ کا وعدہ تھا جس کو پورا ہونا تھا (جیسا کہ قرآن پاک میں ذکر فرمایا گیا ہے) اور جس طرح تم دشمنوں پر غالب آنے کے لیے اللہ سے مدد مانگتے ہو اسی طرح اپنے نفس اور نفسانی خواہشات پر قابو پانے کے لیے بھی ہمیشہ اُس سے مدد چاہو۔ میں بھی اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور تمھارے لیے اس کی دُعا کرتا ہوں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس خط سے قوموں خاصکر مسلمانوں کی فتح و شکست

اور عزت و ذلت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابہ کرام کا بنیادی طرز فکر اور نقطۂ نظر بھی معلوم ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ اسلام کے عہد اول میں رومی اور ایرانی فوجوں کے مقابلہ میں تعداد اور اسلحہ وغیرہ سامانِ جنگ کی بیحد کمی کے باوجود مسلمان مجاہدین کے غالب اور فتحیاب ہونے کا راز کیا تھا، اور بعد کے دور میں خاصکر ماضی قریب میں بعض مسلمان ملکوں کی فوجوں کو اپنے دشمن کے مقابلہ میں تعداد اور سامان جنگ کی کھلی برتری کے باوجود جو شرمناک ہزیمت ہوئی اور پیشانی پر ذلت و رسوائی کا کلنک لگا اس کا بنیادی سبب کیا تھا۔ — قرآن پاک میں جا بجا فرمایا گیا ہے

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○	اُن پر خدا کی طرف سے کوئی ظلم نہیں ہوا، بلکہ انھوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا۔

ہمارے مخلصین ملاحظہ فرمائیں

آج شوال کی ۲۰ تاریخ ہے، جن نئے خریداروں کی اطلاع آج تک آئی ہے اور چندے وصول ہوئے ہیں اُن کی کل تعداد پچاس کے قریب ہے۔

اللہ تعالیٰ اُن حضرات کو بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے جنھوں نے اسکے لیے جد و جہد فرمائی — لیکن الفرقان کی بقا کے لیے جتنے اضافے کی ضرورت ہے یہ تو اُس کا پورا دسواں حصہ بھی نہیں ہے۔ الفرقان کے جو مخلصین اس سلسلے میں کوئی کوشش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، براہ کرم وہ اپنی کوششوں کی رفتار تیز فرما دیں اور جو کچھ کرنا ہے بس ہفتہ عشرہ کے اندر کرلیں — اللہ تعالیٰ آپ کی اور ہماری مدد فرمائے!

ناظم دفتر الفرقان

درس قرآن	محمد منظور نعمانی

مرکزوالی مسجد - ۱۰ اگست ۱۹۷۳ء

اسرا اور معراج
خواب تھا یا عالم بیداری کا واقعہ؟
عقلی اشکالات اور ان کا حل

بنی اسرائیل پر
اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات و پیشگی آگاہی
پھر نافرمانی اور سرکشی پر خداوندی عذاب کا تازیانہ

حمد و صلوٰۃ اعوذ اور بسم اللہ کے بعد

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ○ وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ أَلَّا تَتَّخِذُوا مِن دُونِي وَكِيلًا ○ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ○ وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ○ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ ۚ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ○ إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ ۖ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا ○ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يَرْحَمَكُمْ ۚ وَإِنْ

عُدْتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝

(سورہ بنی اسرائیل آیت ۱ سے ۸ تک)

پاک اور مقدس ہے وہ ذات جو اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو راتوں رات مسجد حرام (یعنی مسجد کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک لے گئی جس کے ماحول اور اطراف کو ہم نے بابرکت بنا دیا ہے، تاکہ اس بندے کو ہم اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھائیں، بلاشبہ وہ خداوند قدوس سمیع و بصیر ہے۔

اور ہم نے (اپنے پیغمبر) موسیٰ کو کتاب (تورات) دی اور اس کو بنی اسرائیل کے لیے نسخۂ ہدایت بنایا اور اس میں حکم دیا کہ میرے سوا اور کسی کو کارساز نہ ٹھہراؤ، اے اُن لوگوں کی نسل کے لوگو جن کو ہم نے اپنے پیغمبر نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کرایا تھا، (اور طوفان کی ہلاکت سے بچا لیا تھا) بلاشبہ وہ نوح شکرگزار بندہ تھا۔

اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلہ کی آگاہی دے دی تھی کہ تم ملک میں دو مرتبہ خرابی پھیلاؤ گے اور بڑی سرکشی کی حرکتیں کرو گے، پھر جب اُن میں سے پہلے کا موعود وقت آگیا (اور تم نے ملک میں پہلی دفعہ خرابیاں پھیلائیں اور سرکشی کا مجرمانہ رویہ اختیار کیا) تو اے بنی اسرائیل ہم نے تمہاری سزا اور سرکوبی کے لیے) اپنے ایسے بندے تم پر بھیج دیے جو بڑے خوفناک اور جنگ آزما تھے، پس وہ گھس پڑے تمہاری آبادیوں کے اندر، اور یہ اللہ کا وعدہ تھا جس کو پورا ہونا تھا ـــــ پھر ہم نے دوبارہ تم کو ان پر غلبہ دیا اور تمہارے مال و اولاد میں خوب بڑھوتری کی، اور تم کو بہت بڑے جتھے والا بنا دیا (اور تم کو یہ انتباہ بھی دے دیا گیا تھا کہ) اگر تم بھلائی کے کام کرو گے تو اپنے ہی نفع کے لیے بھلائی کرو گے، اور اگر برائیاں کرو گے تو وہ بھی اپنے ہی لیے کرو گے (یعنی تمہارے اچھے اور برے اعمال کے نتائج ہی تمہارے سامنے آئیں گے) پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آگیا (اور تم نے دوبارہ شرارت اور سرکشی کی تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کر دیا) تاکہ وہ تمہارے چہروں کو بگاڑ دیں اور مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) میں اس طرح حملہ آور ہو کر گھس جائیں جس طرح پہلے گھسے تھے اور تمہاری جن چیزوں پر

اور جہاں تک غلبہ پائیں سب تباہ و برباد کر ڈالیں گے) اور اس کتاب میں یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ اس کے بعد بھی تم شرارت اور نافرمانی سے باز آگئے اور اپنی اصلاح تم نے کر لی تو) امید رکھ سکتے ہو کہ تمہارے مالک و پروردگار کی تم پر پھر رحمت ہو، اور اگر تم نے پھر وہی کیا جو پہلے کیا تھا (یعنی شرارت اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا) تو ہم بھی وہی کریں گے جو ہم نے پہلے کیا تھا (یعنی تمہارے بدترین دشمنوں کو تم پر پھر مسلط کر دیں گے، اور یہ تو اس دنیا میں ہوگا اور آخرت کے لیے) ہم نے دوزخ کو نہ ماننے والوں کا قید خانہ قرار دے دیا ہے۔

(سورۂ بنی اسرائیل رکوع ۱ پہلی آیت سے آٹھویں آیت تک)

(تفسیر و تشریح) یہ سورۂ بنی اسرائیل شروع ہوئی اور یہیں سے پندرھواں پارہ شروع ہوتا ہے۔ اس کی پہلی آیت میں واقعہ اسرا کا غیر معمولی انداز میں ذکر فرمایا گیا ہے عرف عام میں اسی واقعہ کو معراج کہا جاتا ہے۔ معراج کا واقعہ آپ حضرات نے کتابوں میں پڑھا ہوگا اور سنا ہوگا قرآن مجید میں اس کا ذکر بہت اجمال کے ساتھ آیا ہے، ہاں حدیثوں میں واقعہ کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے ــــ اکثر روایات کے مطابق یہ واقعہ ہجرت سے قریباً ایک سال پہلے مکہ معظمہ میں پیش آیا تھا۔ معراج کی حقیقت اور نوعیت کو یوں سمجھنا آپ حضرات کے لیے کچھ آسان ہوگا کہ جس طرح اللہ کے حکم سے فرشتے آسمان سے زمین پر آتے ہیں اور یہاں سے آسمانوں پر چلے جاتے ہیں اور ایک لمحہ میں مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق پہونچ سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک رات میں بلکہ رات کے بھی بہت تھوڑے سے حصے میں بس چند لمحات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص قدرت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے مکہ معظمہ سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے آسمانوں سے بھی اوپر سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچایا اور اپنی قدرت کی خاص نشانیوں اور بہت سی غیبی حقیقتوں کا مشاہدہ کرایا اور یہ مشاہدہ کرانا ہی اس سفر معراج کا خاص مقصد تھا، اسی آیت میں فرمایا گیا ہے "لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا" یعنی ہم نے یہ سفر اسی لیے کرایا کہ اپنے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کچھ عجائبات قدرت کا مشاہدہ اور نظارہ کرائیں۔

اس سفر کے دو حصے ہیں ایک مکہ مکرمہ کی مسجد حرام سے فلسطین کی مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس تک، اور دوسرا حصہ سفر کا ہے وہاں سے آسمانوں اور ان کے بھی اوپر سدرۃ المنتہیٰ تک۔

عرف عام میں اس پورے سفر کو معراج کہا جاتا ہے، اور اہل علم کی خاص اصطلاح میں پہلے حصہ کو اسرا اور دوسرے کو معراج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہاں سورہ بنی اسرائیل کی اس پہلی آیت میں صرف پہلے حصہ کا ذکر ہے، یعنی مسجد حرام سے بیت المقدس تک کے آپ کے سفر کا ذکر ہے۔ اور چونکہ یہ سفر ایسا تھا کہ عام عقلیں اس کو سمجھ نہیں سکتیں اور باور نہیں کر سکتیں کہ رات کے ذرا سے حصہ میں مکہ سے مسجد اقصیٰ تک کا سفر ہو گیا۔ اس لیے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کی بے انتہا قدرت کی طرف اشارہ کر کے یہ صراحت کر دی گئی کہ یہ محیر العقول سفر خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل نہیں تھا بلکہ اُس خداوند قدوس کا فعل تھا جس کی قدرت کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے اور جو "فعالٌ لما یرید" ہے۔

آیت کے سب سے پہلے لفظ "سُبْحَانَ الَّذِیْ" سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اگر یہ کہا جاتا کہ یہ سفر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا جو اپنی ذات سے ایک بشر اور پیغمبر تھے تو شک شبہ کی گنجائش تھی کہ ایک انسان اور آدم زاد کے لیے بظاہر یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ چند لمحوں میں حرم مکہ سے بیت المقدس تک اور وہاں سے آسمانوں کے بھی اوپر سدرۃ المنتہیٰ تک جائے اور واپس آ جائے۔ لیکن اس آیت میں اس سفر معراج کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا فعل بتلایا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے "سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَهٗ" (یعنی وہ خداوند قدوس ہر نقص اور کمزوری سے پاک ہے جو اپنے خاص بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو رات کے ایک حصہ میں مکہ کی مسجد حرام سے اس مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک لے گیا جس کے آس پاس اور ماحول کو ہم نے اپنی خاص برکتوں سے مالا مال کیا ہے) قرآن مجید نے اس آیت میں اسرا اور معراج کو اللہ تعالیٰ کا فعل بتلا کر منکرین اور مخالفین کے تمام اعتراضات اور شکوک و شبہات کا جواب دے دیا اور ہم مسلمانوں کو بھی اس مشرکانہ گمراہی سے بچا دیا جس میں عیسائی مبتلا ہوئے، انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو اُن کا ذاتی فعل اور اُن کا تصرف سمجھا اور اُن کو خدائی میں اور خداوندی صفات میں شریک مان لیا، اگر وہ حضرت مسیح کے ان معجزات کو خدا کا فعل اور خداوندی تصرف سمجھتے تو اس شرک میں مبتلا نہ ہوتے۔

اس آیت میں مسجد اقصیٰ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اس کے ماحول اور اطراف کو

برکتوں سے نوازا ہے، ——— مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس جس سرزمین اور جس علاقہ میں واقع ہو اس کی سب سے بڑی برکت اور عظمت تو یہ ہے کہ وہ انبیاء بنی اسرائیل کے تقریباً پورے سلسلہ کا مرکز دعوت و ہدایت اور ان کا قبلہ رہا ہے اور اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنے جلیل القدر انبیاء و رسل اس میں مدفون ہیں ——— اس کے علاوہ یہ علاقہ دنیوی اور مادی برکتوں اور نعمتوں سے بھی مالا مال ہے۔ بہترین آب و ہوا ہے، پھلوں کی پیداوار کے لحاظ سے تو گویا جنت کا ایک خطہ ہے، الغرض بیت المقدس کا یہ علاقہ دینی اور دنیوی، روحانی اور مادی ہر قسم کی برکتوں سے مالا مال ہے، "بَارَكْنَا حَوْلَهُ" میں غالباً ان ہی سب برکتوں کی طرف اشارہ ہے، واللہ اعلم۔

آگے اس سفر معراج کا مقصد اور اس کی غرض و غایت بیان فرمائی گئی ہے، ارشاد ہے "لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا" یعنی ہم نے اپنے اس بندے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ سفر اس لیے کرایا کہ اپنی قدرت کی کچھ خاص نشانیاں اس کو دکھلا دیں اور بعض ان حقائق کا مشاہدہ کرا دیں جو اس دنیا کے دائرہ سے باہر پردۂ غیب میں ہیں ——— آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ" یعنی وہ اللہ اپنی ذات سے سمیع و بصیر ہے سارا عالم غیب و شہادت ہر وقت اس کی نگاہ میں ہے، کائنات کا کوئی ذرہ اس سے مخفی نہیں ہے، اور وہ عالم غیب و شہادت کی ہر آواز سنتا ہے اور یہ سننا اور دیکھنا اس کی ذاتی صفت ہے (إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ) پھر یہ بھی اس کے اختیار میں ہے کہ اپنے جس بندہ کو اور جس مخلوق کو جو چاہے دکھلائے اور جو آواز چاہے سنوا دے، اور جس بندے اور مخلوق کو وہ اپنی قدرت سے عالم غیب و شہادت کی کچھ چیزیں دکھلائے یا سنوا دے تو وہ ہرگز اس کے برابر اور اس صفت میں اس کا شریک نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ تو اپنی ذات سے سمیع و بصیر ہے اور یہ اس کی ذاتی اور قدیم ازلی صفت ہے "إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ"

یہاں تک سورت کی پہلی آیت کی تشریح ہوئی اور اسرا کا بیان اسی پر ختم ہو گیا، آگے دوسرا مضمون شروع ہے جس کا خاص تعلق بنی اسرائیل سے ہے۔

اسرا اور معراج سے متعلق کچھ مشہور سوالات اور اشکالات ہیں اور کچھ بحثیں ہیں جن کے بارہ میں کتابوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے ——— ایک اہم سوال اور بحث تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسرا اور معراج کا یہ سفر خواب تھا یا عالم بیداری کا واقعہ؟

اسی طرح کا دوسرا سوال اور دوسری بحث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سفر صرف آپ کی روح کو کرایا تھا اور یہ صرف ایک روحانی سیر تھی یا آپ کا یہ سفر جسم عنصری کے ساتھ ہوا تھا، مختصر لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ معراج روحانی تھی یا جسمانی ؟۔

صحابۂ کرام اور تابعین سے لے کر اس وقت تک اُمّت کی غالب اکثریت بلکہ کہنا چاہیئے کہ جمہور اُمّت اس کی قائل ہے کہ معراج خواب کی بات نہیں بلکہ عالم بیداری کا واقعہ ہے اور وہ صرف روحانی نہیں بلکہ جسم عنصری کے ساتھ ہوئی تھی۔ حدیث کی عام روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور قرآنِ مجید کے الفاظ اور خاص اندازِ بیان سے بھی یہی سمجھا جاتا ہے۔

اس آیت میں اسرا اور معراج کے اس واقعہ کو "اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ" کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے خواب یا صرف روحانی سیر کی تعبیر ان الفاظ سے کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی۔ اسکے علاوہ مضمون کو "سُبْحَانَ الَّذِیْ" کے الفاظ سے شروع کیا گیا ہے جس سے صاف معلوم ہوا کہ کسی بہت ہی غیر معمولی قسم کے اور محیر العقول واقعہ کا ذکر کیا جا رہا ہے، حالانکہ ایسے خواب تو ہم آپ بھی دیکھ سکتے ہیں اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں، اور جس کو روحانی سیر کہا جاتا ہے وہ بھی خواب سے ملتی جلتی ایک کیفیت ہوتی ہے، الغرض ان دونوں میں سے کوئی بھی ایسی اہم اور غیر معمولی بات نہیں ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب پاک میں غیر معمولی انداز میں اور "سُبْحَانَ الَّذِیْ" کے شاندار عنوان سے بیان فرمائیں، جس شخص کو عربی زبان اور محاورات سے ذرا سی بھی واقفیت ہو وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس انداز اور اس اہتمام سے ایسے ہی واقعہ کو بیان کیا جاتا ہے جو بہت غیر معمولی ہو اور لوگوں کی عقل میں آنا مشکل ہو۔ الغرض قرآنِ مجید کے خاص اندازِ بیان اور الفاظ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اِسرا اور معراج حضور کا خواب نہیں تھا، بلکہ عالمِ بیداری کا واقعہ تھا، اور یہ صرف روحانی سیر اور روحانی مشاہدہ بھی نہیں تھا — ہاں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ اس طرح کا سفر بھی نہیں تھا جس طرح کے سفر ہم اس دُنیا میں کرتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اِسرا اور معراج کا معاملہ ایک بالکل نرالا معاملہ تھا، اس عالم اور ہماری اس دُنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے، اس لیے اس کی حقیقت اور نوعیت کو ہم پوری طرح سمجھ نہیں سکتے، جس طرح خود نبوّت اور وحی کا معاملہ ہے کہ ہمارا اس پر ایمان تو ہے لیکن ہم اس کی

نوعیت اور حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے ــــ میرا خیال ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت معاویہ وغیرہ بعض صحابہ کے متعلق روایات میں جو یہ مذکور ہے کہ وہ حضرات اسرا اور معراج کو خواب کا واقعہ کہتے تھے تو میرے خیال میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کو ہمارے اس دنیا کے سفروں جیسا سفر نہیں مانتے تھے بلکہ اس کو دوسرے عالم کا ایک معاملہ سمجھتے تھے اور اس کو "رؤیا" سے تعبیر کرتے تھے، یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ اس کو حضور کا صرف ایک خواب سمجھتے ہوں، قرآن پاک نے اس کو جس غیر معمولی انداز میں بیان کیا ہے اُس کو پیش نظر رکھتے ہوئے عربی زبان و محاورات سے واقفیت رکھنے والا کوئی آدمی بھی اُس کو "خواب کی بات" نہیں کہہ سکتا ــــ پھر صحیح روایات میں یہ بھی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کا واقعہ لوگوں کے سامنے بیان کیا تو ابوجہل وغیرہ کفار نے اُس پر خوب مذاق اڑایا اور اس واقعہ کو معاذ اللہ حضور کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور پروپیگنڈا کیا کہ یہ ایسی بات کا دعویٰ کرتے ہے جو بالکل ناممکن ہے، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی آدمی ایک رات میں اتنا طویل سفر کر کے واپس آجائے ــــ تو اگر صرف خواب کی بات ہوتی تو اس میں کسی کے لیے بھی تعجب اور اعتراض کا موقع نہ ہوتا۔ الغرض ابوجہل وغیرہ نے معراج کے بارہ میں جو شور و غوغا مچایا اور اس سلسلہ میں حضور کے خلاف جس طرح پروپیگنڈہ کیا وہ بھی اس کی واضح دلیل ہے کہ حضور نے معراج کے واقعہ کو خواب کے طور پر یا صرف روحانی سیر کے طور پر بیان نہیں فرمایا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے ایک غیر معمولی انعام اور معجزہ کے طور پر بیان فرمایا تھا جو اُن کے نزدیک ناممکن اور خلاف عقل تھا اور معجزہ کی شان یہی ہوتی ہے ــــ ان سب باتوں کو سامنے رکھ کر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کسی صحابی یا تابعی نے اسرا اور معراج کو حضور کے دوسرے خوابوں کی طرح صرف ایک خواب قرار دیا ہو، اس لیے قریب قریب یقین کے ساتھ میرا یہ خیال ہے کہ جن بعض صحابہ یا تابعین سے یہ مروی ہے کہ انھوں نے اسرا اور معراج کو "رؤیا" کہا اُس سے اُن کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس طرح کا سفر نہیں تھا جس طرح کے سفر ہم اپنی اس دنیا میں مختلف قسم کی سواریوں پر کرتے ہیں بلکہ وہ ایک دوسرے عالم کا معاملہ تھا جس کی کوئی مثال اس دنیا کے ہمارے حالات اور واردات میں نہیں مل سکتی، اسی کو اُن بزرگوں نے "رؤیا" کے لفظ سے تعبیر کر دیا ہے ــــ ہمارے استاد حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ جنھوں نے قدیم آسمانی کتابوں کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس مقصد کے لیے عبرانی اور سریانی

زبانوں سے بھی واقفیت حاصل کی تھی، فرماتے تھے کہ انبیاء سابقین کے صحیفوں میں انبیاء علیہم السلام کے خاص واردات و معاملات کو بکثرت "رؤیا" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس سے مراد وہ نہیں ہوتا جس کو ہم لوگ "خواب" کہتے ہیں ــــ اور اسی سورہ بنی اسرائیل میں چند رکوع کے بعد "رؤیا" کا جو لفظ آیا ہے "وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنٰكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ الخ" تو بظاہر اس واقعہ اسراء و معراج ہی کو اس آیت میں "رؤیا" کہا گیا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے "رُؤْيَا عَيْنٍ أُرِيَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" میرے نزدیک یہ بالکل وہی بات ہے جو ہمارے استاذ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے، پس جن صحابہ یا تابعین نے معراج کو "رؤیا" کہا ہے اس کا مطلب یہی سمجھنا چاہیے!

اسراء و معراج کے بارہ میں ایک سوال یہ بھی اٹھایا جاتا ہے کہ اب سے قریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے جبکہ ہوائی جہاز اور راکٹ جیسی تیز رفتار کوئی چیز بھی ایجاد نہیں ہوئی تھی، ایک رات بلکہ اس کے بھی تھوڑے سے حصہ میں اتنا طویل سفر کیسے ہو گیا؟ ــــ لیکن یہ اور اس طرح کے سارے اشکالات کا یہ جواب کافی ہے کہ قرآن پاک نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل نہیں بلکہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ کا فعل بتلایا ہے اور اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں، اس کے حکم اور اس کی قدرت سے فرشتے ایک آن میں آسمان سے زمین پر اور زمین سے آسمان پر آتے اور جاتے ہیں، بس اسی قادر مطلق نے اپنی قدرت کاملہ سے اپنے بندہ اور رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سفر اس طرح کرایا، دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لیجئے کہ یہ سفر ایک خاص معجزہ تھا اور معجزہ تو وہی ہوتا ہے جو اس عالم اسباب کے لحاظ سے عام عقلوں کے لیے ناقابل فہم ہو ــــ اور ہر معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، اگرچہ اس کے نبی و رسول کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے، اسی لیے اس آیت میں اسراء کو اللہ تعالیٰ کا فعل قرار دیا گیا ہے (أَسْرٰى بِعَبْدِهٖ)

معجزہ کے بارہ میں ہمارے عقائد کی کتابوں میں بھی بنیادی عقیدہ کے طور پر یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو پیغمبر کی تصدیق کے لیے اس کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے، اسی طرح کرامت کے بارے میں عقائد کی کتابوں میں صاف صاف لکھا ہے کہ وہ ولی کا فعل نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو کسی متقی اور صالح بندہ کی عنداللہ مقبولیت ظاہر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر ظاہر کرتا ہے، اسی لیے معجزہ اور کرامت نبی یا ولی کے اختیار میں نہیں ہوتی کہ جب چاہیں ظاہر کریں اور دکھائیں

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

عصرِ حاضر کا اصل کام

تجدید ایمان کی ہمہ گیر جدوجہد

(ڈاکٹر اسرار احمد مدیر "میثاق" لاہور)

فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلاء موجودہ دور بجا طور پر مغربی فلسفہ و فکر اور علوم و فنون کی بالادستی کا دور ہے اور آج پورے کرۂ ارضی پر مغربی افکار و نظریات اور انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصورات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتداء آج سے تقریباً دو سو سال قبل یورپ میں ہوئی تھی اور جو اس کے بعد مسلسل مستحکم ہوتے اور پروان چڑھتے چلے گئے۔ آج کی دنیا سیاسی اعتبار سے خواہ کتنے ہی حصّوں میں منقسم ہو تقریباً ایک ہی طرزِ فکر اور نقطۂ نظر پوری دنیا پر حکمران ہے اور بعض سطحی اور غیر اہم اختلافات سے قطع نظر ایک ہی تہذیب اور ایک ہی تمدّن کا سکّہ پوری دنیا میں رواں ہے۔ کہیں کہیں منتشر طور پر کوئی دوسرا نقطۂ نظر اور طرزِ فکر اگر پایا بھی جاتا ہے تو اس کی حیثیت زندگی کی اصل شاہراہ سے ہٹی ہوئی پگڈنڈی سے ...... زیادہ نہیں ہے۔ ورنہ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ جو طبقے قیادت و سیادت کے مالک ہیں اور جن کے ہاتھوں میں اجتماعی زندگی اور اس کے جملہ متضمنات کی اصل زمام کار ہے وہ سب کے سب بلا استثناء ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں مغربی تہذیب و تمدّن اور فلسفہ و فکر کا یہ تسلّط اس قدر شدید اور ہمہ گیر ہے کہ بعض ان قوتوں کے نقطۂ نظر کا جائزہ بھی اگر دقتِ نظر سے لیا جائے جو مختلف ممالک میں مغربی تہذیب و تمدّن کے خلاف صف آراء ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مغرب کے اثرات سے بالکلیہ محفوظ نہیں ہیں اور

خود ان کا طرزِ فکر بہت حد تک مغربی ہے۔

بنیادی نقطۂ نظر تہذیبِ جدید کی بنیاد میں جو فکر کام کر رہا ہے وہ نہ تو کوئی ایک دن میں پیدا ہو گیا ہے اور نہ ہی کوئی سادہ اور بسیط شئے ہے بلکہ ان ڈیڑھ دو سو سالوں کے دوران فلسفہ کے کتنے ہی مکاتبِ فکر یورپ میں پیدا ہوئے اور کتنے ہی زاویہ ہائے نگاہ سے انسانوں نے انسان اور انسانی زندگی پر غور و فکر کیا ——— لیکن اس پورے ذہنی و فکری سفر کے دوران ایک نقطۂ نظر جو مسلسل پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پر اس پورے فکر کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں 'خیالی' اور 'ماورائی' تصوّرات کے بجائے 'ٹھوس' حقائق و واقعات کو غور و فکر اور سوچ بچار کا اصل مرکز و محور رہنے کی حیثیت حاصل ہے اور خدا کے بجائے کائنات، روح کے بجائے مادّہ اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصوّر کے بجائے، حیاتِ دنیوی کو اصل موضوعِ بحث قرار دیا گیا ہے۔ خالص علمی سطح پر تو اگرچہ یہ کہا گیا کہ ہم خدا، روح اور حیات بعد الممات کا نہ اقرار کرتے ہیں نہ انکار لیکن اس عدمِ اقرار و انکار کا نتیجہ بہر حال یہ نکلا کہ یہ تصورات، رفتہ رفتہ بالکل خارج از بحث ہوتے چلے گئے اور انسان کے سارے غور و فکر اور تحقیق و تجسس کا مرکز و محور کائنات، مادّہ اور حیاتِ دنیوی بن کر رہ گئے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جن بے پناہ قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے وہ انھیں جس میدان میں بھی استعمال کرے نتائج بہر حال رونما ہوتے ہیں اور ہر ڈھونڈنے والا اپنے اپنے دائرۂ تحقیق و جستجو میں نئی دنیائیں تلاش کر سکتا ہے ——— پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جس طرح کائنات کی عظمت و وسعت کے اعتبار سے مہرِ درخشاں کی حیثیت و وقعت ایک "ذرّہ فانی" سے زیادہ نظر نہیں آتی لیکن اگر ایک "ذرّہ فانی" کی حقیقت و ماہیت پر غور کیا جائے تو وہ بجائے خود "مہر درخشاں" کی عظمت و سطوت کا حامل نظر آتا ہے[1] اسی طرح حقیقتِ نفس الامری کے اعتبار سے چاہے خدا کے مقابلے میں کائنات، روح کے مقابلے میں مادّہ اور حیاتِ اخروی کے مقابلے میں حیاتِ دنیوی کیسے ہی حقیر اور کتنے ہی بے وقعت ہوں اگر نگاہوں کو ان ہی پر مرکوز کر دیا

---

[1] مہرِ درخشاں ذرّہ فانی ذرّہ فانی مہرِ درخشاں (کوثر نیازی)

جائے تو خود ان کی وسعتیں بے کراں اور گہرائیاں اتھاہ نظر آنے لگتی ہیں۔

چنانچہ یورپ میں جب "کائنات" اور "مادہ" تحقیق و جستجو کا موضوع ہے تو یکے بعد دیگرے ایسے ایسے عظیم انکشافات ہوئے اور بظاہر خفتہ و خوابیدہ مظاہرِ قدرت کے پردوں میں ایسی عظیم قوتوں اور توانائیوں کا سراغ ملا کہ عقلیں دنگ اور نگاہیں چکا چوند ہو کر رہ گئیں اور علم و فن کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو گیا —— قدرت کے قوانین کی مسلسل دریافت، فطرت کی قوتوں کی پیہم تسخیر اور نت نئی ایجادات و اختراعات نے ایک طرف تو یورپ کو ایک ناقابلِ شکست قوت بنا دیا اور دوسری طرف مادے کی یہ عظمت اور اس کی قوتوں کی یہ سطوت بجائے خود اس امر کی دلیل بنتی چلی گئیں کہ اصل قابلِ التفات شئی "مادہ" ہے نہ کہ روح اور کائنات اور اس کے قواعد و قوانین ہیں نہ کہ خدا اور اس کی ذات و صفات! —— !!

عالم اسلام پر مغرب کی سیاسی و عسکری یورش

فطرت کی ان نو تسخیر شدہ قوتوں سے مسلح ہو کر مغرب جب مشرق پر حملہ آور ہوا تو دیکھتے ہی دیکھتے ایک سیلاب کے مانند پورے کرۂ ارضی پر چھا گیا اور مشرقی اقوام اور ان کی عظیم حکومتیں اور سلطنتیں اس سیلاب میں ریت کے کچے گھروندوں کی طرح بہتی چلی گئیں۔ اس سیلاب کا اولین شکار چونکہ مشرق قریب اور مشرقِ وسطی تھے جہاں مسلمان آباد تھے۔ لہٰذا اس کی سخت یورش اسلام اور اہلِ اسلام پر ہوئی اور چند ہی سالوں کے اندر اندر پورا عالمِ اسلام یورپ کے زیرِ نگیں ہو گیا۔

عالمِ اسلام پر مغرب کا یہ استیلاء دوگونہ تھا۔ یعنی عسکری و سیاسی بھی اور ذہنی و فکری بھی۔ لیکن یورپ کی اولین اور نمایاں ترین یورش چونکہ سیاسی تھی لہٰذا عالمِ اسلام میں جو ردِ عمل اس کے خلاف پیدا ہوا اس میں بھی اولاً اسی کا احساس غالب نظر آتا ہے۔ ملّتِ اسلامی کے اس تلخ احساس نے کہ یورپ نے کہیں براہِ راست تسلط اور قبضے اور کہیں انتداب، تحفظ و حمایت کے پردے میں اسے اپنا محکوم بنا لیا ہے اور اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اس کی وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ بار ہا دردانگیز نالوں کی صورت اختیار کی اور اپنے شاندار ماضی کی حسرت بھری یاد اپنی "حمرِ رفتہ" اور عظمت و سطوتِ گزشتہ کے بازیافت کی شدید تمنا اور "گردشِ ایام کو پیچھے کی طرف لوٹانے" کی بے پناہ خواہش نے کبھی سید جمال الدین افغانی کی سیمابی شخصیت کا

ڈوب دھارا اور کبھی تحریک خلافت کی صورت اختیار کی لیکن حقائق نے ہر بار جذبات و خواہشات کا منھ چڑھایا۔ اور مغرب کی سیاسی بالادستی رفتہ رفتہ ایک تسلیم شدہ واقعہ کی صورت اختیار کرتی چلی گئی۔

اپنے سیاسی تسلط کو مستحکم کرتے ہی یورپ نے دنیائے اسلام میں اپنے افکار و نظریات کا پرچار اور اپنے نقطۂ نظر اور طرز فکر کی تبلیغ ـــــ یعنی ذہنی و فکری تسخیر کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ نگاہیں مغرب کی مادی ترقی سے پہلے ہی خیرہ ہو چکی تھیں۔ پھر زندہ قوموں میں ہمیشہ کچھ بنیادی انسانی اوصاف لازماً موجود ہوتے ہیں۔ کچھ ان کی بنا پر مرعوبیت میں اضافہ ہوا۔ نتیجۃً ایک مرعوب اور شکست خوردہ ذہنیت کے مسلمانان عالم کے سواد اعظم نے مغربی افکار و نظریات کو جوں کا توں قبول کرنا اور حرز جاں بنانا شروع کر دیا ـــــ خالص فلسفہ و عمرانیات کے میدان میں تو چونکہ خود مغرب میں بیشمار مکاتب فکر موجود تھے لہٰذا ان کے بارے میں تو پھر بھی کسی قدر قیل و قال اور رد و قدح یا کم از کم ترجیح و انتخاب کا معاملہ کیا گیا۔ لیکن سائنس چونکہ بالکل "حتمی" اور "قطعی" تھی اور اس کے نتائج بالکل محسوس و مشہود تھے اور اس میدان میں چون و چرا کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی۔ لہٰذا اس کا استقبال بالکل وحی آسمانی کی طرح ہوا اور اس کے نتیجے میں غیر شعوری طور پر ملحدانہ نقطۂ نظر اور مادہ پرستانہ طرز فکر رفتہ رفتہ عالم اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے ذہنوں میں سرایت کرتا چلا گیا اور خدا کے بجائے کائنات، روح کے بجائے مادے اور حیات اخروی کے بجائے حیات دنیوی کی اہمیت پوری امت مسلمہ، حتیٰ کہ اس کے خاصے دیندار اور مذہبی مزاج کے لوگوں کے نزدیک بھی مسلّم ہوتی چلی گئی۔

مدافعت کی اوّلین کوششیں اور ان کا ماحصل

مغربی فلسفہ و فکر کی اس یلغار کے مقابلے میں اسلام کی جانب سے مدافعت کی کوششیں بھی اس دوران میں ہوئیں اور بہت سے درد مند اور دین و مذہب سے قلبی لگاؤ رکھنے والے لوگوں نے ان کے تحفظ کی سعی کی۔ تحفّظ و مدافعت کی یہ کوششیں دو طرح کی تھیں: ایک وہ جن میں محض تحفّظ پر قناعت کی گئی، اور دوسری وہ جن میں مدافعت کے ساتھ ساتھ مصالحت اور کسر و انکسار کی روش اختیار کی گئی۔

پہلی قسم کی کوشش وہ تھی جسے بقول مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم اصحاب کہف کی سنت کا اتباع کہا جا سکتا ہے اور جس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ زندگی کی شاہراہ سے ہٹ کر کونوں کھدروں میں بیٹھ کر اپنے دین و ایمان کو بچانے کی فکر کرو۔ اس قسم کی کوششیں

اگرچہ بظاہر نری فراریت کا منظر نظر آتی ہیں لیکن در حقیقت ان کی اساس خالص حقیقت پسندی اور اس اعتراف پر تھی کہ مغرب کی اس یلغار کے کھلے مقابلے کی سکت اس وقت عالم اسلام میں نہیں ہے لہٰذا ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ یہ کہ اس سیلاب کے راستے سے ہٹ جایا جائے اور ہر طرح کے طعن و استہزاء کو انگیز کرتے ہوئے ایمان کی سلامتی کی فکر کی جائے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کامیابی بھی تھوڑی بہت اگر کسی کو ہوئی تو صرف اسی طریق کار کے اختیار کرنے والوں کو ہوئی اور اس کے نتیجے میں امت کے ایک حصے کا ایمان بھی سلامت رہ گیا۔ مادہ پرستی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روحانیت کی شمعیں بھی کہیں کہیں جلتی رہ گئیں اور قال اللہ تعالیٰ و قال الرسول ؐ کی صداؤں میں دین و شریعت کا ڈھانچہ بھی محفوظ رہ گیا ــــــ! اس قسم کی کوشش کا مظہر اتم برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تھا جو کہنے کو تو صرف ایک درس گاہ تھا لیکن واقعۃً اس کی حیثیت ایک عظیم تحریک سے کسی طرح کم نہ تھی ــــــ!

دوسری قسم کی کوششوں کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ ــــــ زمانے کا ساتھ بھی دیا جائے اور اسلام کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ اس مقصد کے تحت ایک طرف جدید افکار و نظریات کے صحیح و غلط اجزاء کو چھانٹ کر علیحدہ کیا جائے، اور دوسری طرف اسلام کی ایسی جدید تعبیر کی جائے جس سے اس کی حقانیت ثابت ہو جائے۔

اس قسم کی کوششوں میں اوّل اوّل مرعوبیت اور شکست خوردگی کے اثرات بہت نمایاں نظر آتے ہیں، چنانچہ مغرب کی عقلیت پرستی (RATIONALISM) کی کسوٹی پر ہند و مصر کے کچھ نیم متکلم قسم کے لوگوں نے اسلامی اعتقادات و ایمانیات کو پرکھنا شروع کیا۔ نتیجۃً اسلامی عقائد کی کثر بیشتر اور اس کے مادراء الطبیعاتی اعتقادات کی خالص سائنٹفک توجیہیں شروع کیں۔ ہندوستان میں سرسید احمد خاں مرحوم اور ان کے حلقہ اثر کے لوگوں اور مصر کے مفتی محمد عبدہٗ اور ان کے تلامذہ کی نیتیں کتنی بھی نیک رہی ہوں اور انھوں نے کتنے ہی خلوص کے ساتھ اس کی کوشش کی ہو کہ اسلام کی جدید تعبیر اور ماڈرن توجیہ کرکے اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ زمانے کا ساتھ دے سکے اور اس کے حلقہ بگوش اسے اپنے ساتھ لے کر ترقی کی اس راہ پر گامزن ہو سکیں، جسے یورپ نے اختیار کیا تھا، لیکن یہ بہرحال امر واقعہ ہے کہ ان کی ان کوششوں سے دین و مذہب کی جان نکل کر

رہ گئی اور مغرب کی مادہ پرستانہ ذہنیت کے تحت، مذہب کا ایک کم و بیش لامذہبی ایڈیشن تیار ہوا۔ جس کا اگر کوئی فائدہ ہوا تو صرف یہ کہ بہت سے ایسے لوگوں کو جو ذہن و فکر کے اعتبار سے ہی نہیں تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بھی خالص یورپین بن چکے تھے اپنے اوپر سے اسلام کا لیبل اتارنے کی ضرورت نہ پڑی اور وہ مسلم قومیت کے حلقے میں شامل رہ گئے اور دین کا یہ جدید ایڈیشن ان کی جانب سے مغرب کی خدمت میں بطور معذرت پیش ہو گیا۔

علوم عمرانی کا ارتقا | جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے مغربی فکر کی اساس خدا، روح اور حیات بعد الممات کے عدم اقرار و انکار کے پردے میں در حقیقت انکار پر تھی۔ چنانچہ ایک طرف تو خدا کے بجائے کائنات اور روح کے بجائے مادہ تحقیق و جستجو کا مرکز و محور بنے جس کے نتیجے میں سائنسی انکشافات و ایجادات و اختراعات کا سلسلہ شروع ہوا ۔۔۔۔ اور دوسری طرف حیات اخروی سرے سے خارج از بحث ہو گئی، اور حیات دنیوی گہرے غور و فکر اور شدید سوچ بچار کا موضوع بنی جس کے نتیجے میں مختلف عمرانی تصورات اور سیاسی معاشی نظریات وجود میں آئے اور ان کی تالیف و تدوین سے مختلف نظام ہائے حیات پہلے علمی و فکری سطح پر اور پھر عالم واقعہ میں ظہور پذیر ہونا شروع ہوئے، چنانچہ از منہ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام (FEDUAL SYSTEM) کے تحت جو سیاسی و معاشی ڈھانچہ عرصہ دراز سے دنیا میں رائج تھا، اس کی جگہ سیاسی میدان میں قوم پرستی، آمریت اور جمہوریت کا رواج ہوا اور معاشی میدان میں سرمایہ داری اور سوشلزم برسر کار ہوئے اور مختلف سیاسی و معاشی تحریکوں کا آغاز ہوا۔

اسلامی نظام حیات کا تصور اور بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں | عمرانیات کے میدان میں مغرب کے اس فکری ارتقاء یا بالفاظ صحیح افراط و تفریط کے دھکوں کا اثر عالم اسلام پر یہ پڑا کہ یہاں بھی لوگوں نے اسلام پر بطور نظام زندگی غور و فکر شروع کیا اور اسلام نے حیات دنیوی کے مختلف شعبوں کے لیے جو ہدایات دی تھیں ان کی تالیف و ترتیب سے "اسلامی نظام حیات" کی تدوین ہوئی اور ساتھ ہی اس نظام زندگی کو دنیا میں عملاً نافذ کرنے کے لیے مختلف ممالک میں تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

بیسویں صدی عیسوی کی یہ اسلامی تحریکیں، جو انڈونیشیا سے مصر تک متعدد مسلمان ممالک میں تقریباً ایک ہی وقت میں شروع ہوئیں، بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے سے بہت

مشابہ ہیں اور یہ کہنا بہت حد تک صحیح ہے کہ تقریباً ایک ہی تصورِ دین ان کی پشت پر کام کر رہا ہے اور ایک ہی جذبہ ان میں سرایت کیے ہوئے ہے ۔۔۔ پھر یہ بھی صحیح ہے کہ انکی وجہ سے عالم اسلام میں اسلام پر کم از کم ایک بہتر ضابطۂ حیات ہونے کے اعتبار سے عمومی اعتماد میں اضافہ ہوا ہے اور نوجوان نسل کے ذہنوں سے مغرب کی عام مرعوبیت میں بحیثیتِ مجموعی کمی واقع ہوئی ہے۔

مغربی فلسفہ وفکر اور تہذیب و تمدن سے مرعوبیت میں عمومی کمی کے کچھ دوسرے اسباب بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ مغرب کے سیاسی غلبے اور عسکری تسلط کا جو سیلاب تیزی سے آیا تھا وہ نہ صرف یہ کہ رک گیا ہے بلکہ مختلف ممالک میں قومی تحریکوں نے اس کا رخ پھیر دیا ہے اور مغرب اپنی سیاسی بالادستی کی بساط رفتہ رفتہ تہہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔[1] اور اگرچہ تحفظ و حمایت کے پردے میں سیاسی بالادستی اور تعاون و امداد کے پردے میں معاشی تفوق و برتری کے بندھن ابھی باقی ہیں تاہم تقریباً پورا عالم اسلام مغربی طاقتوں کی براہِ راست محکومی سے آزادی حاصل کر چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب و تمدن کا کھوکھلا پن تجربے سے ثابت ہو گیا اور خود مغرب میں محسوس کیا گیا کہ اس کی بنیاد غلط تعبیر پر ہے۔ خصوصاً مادہ پرستانہ الحاد جب اپنی منطقی انتہا کو پہونچا اور اس کی کوکھ سے سوشلزم اور کمیونزم نے جنم لیا اور انھوں نے انسانیت کی بچی کھچی اقدار کو بھی "ٹھوس" معاشی مسئلے کی بھینٹ چڑھانا شروع کیا تو خود مغرب پریشان ہو گیا اور وہاں بھی نہ صرف انسانیت بلکہ دبی آواز میں روحانیت تک کا نام لیا جانے لگا۔ تیسرے یہ کہ نہ صرف یہ کہ خود سائنس کی قطعیت اور حتمیت ختم ہو گئی اور کچھ نئے نظریات نے نیوٹن کی طبعیات اور اقلیدسی ہندسے کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں بلکہ خود مادہ ٹھوس نہ رہا اور تحلیل ہو کر قوتِ محض کی صورت اختیار کر گیا۔ چنانچہ مادراء الطبعیاتی عقائد کا اقرار نسبتاً آسان ہو گیا اور مذہب کو بحیثیتِ مجموعی کسی قدر سہارا ملا۔ چوتھے یہ کہ مختلف مسلمان ممالک میں جب آزادی اور خود اختیاری کے حصول کے لیے قومی تحریکیں اٹھیں تو چونکہ مسلم قومیت کی اساس بہرحال مذہب پر ہے لہٰذا جذبۂ قومی کی انگیخت کے لیے لامحالہ مذہبی جذبات کو اپیل کیا گیا جس سے احیائے اسلام کے تصور کو تقویت پہونچی۔

مندرجہ بالا اسباب و عوامل سے تقویت پاکر "احیائے اسلام" "قیامِ حکومتِ الٰہیہ" اور

---

[1] دولت برطانیہ نے جس طرح رفتہ رفتہ اپنی عظمت کی بساط لپیٹی ہے وہ تو اس دور کا ایک نہایت ہی عبرت آموز واقعہ ہے

"انفاذِ نظامِ اسلامی" کی تحریکیں مختلف مسلمان ممالک میں برسرِ کار ہوئیں، جن میں قوت و وسعت اور جذبہ و امنگ کے اعتبار سے مصر کی "الاخوان المسلمون" اہم تر تھی لیکن ایک ٹھوس اور مضبوط فکر کی حامل ہونے کے اعتبار سے برِّصغیر پاک و ہند کی "جماعتِ اسلامی" کو نمایاں مقام حاصل تھا۔

یہ تحریکیں تقریباً ثلث صدی[1] سے مختلف مسلمان ملکوں میں برسرِ عمل رہیں اور ملّتِ اسلامی کی نوجوان نسل کا ایک خاصا قابلِ ذکر حصّہ ان کے زیرِ اثر آیا ہے۔ لیکن عملاً ان میں سے کسی کو کوئی نمایاں کامیابی کہیں حاصل نہیں ہو سکی۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں اپنا وقت پورا کر چکی ہیں اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے خواب کی تعبیر کا وقت ابھی نہیں آیا۔ چنانچہ مصر میں "اخوان المسلمون" کا اندرونِ ملک تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے اور اس کے باقیات الصالحات جلاوطنی کے عالم میں دُوَلِ عرب کی باہمی آویزش کے سہارے جی رہے ہیں، رہی برِّصغیر کی تحریکِ اسلامی تو اس کا جزوِ اعظم پاکستانی ریاست کے نذر ہو چکا ہے اور اب اس کا مقام تحریکِ جمہوریت کی حاشیہ برداری سے زیادہ کچھ نہیں رہا۔

ان تحریکوں کی ناکامی کا سبب بظاہر تو یہ ہے کہ انھوں نے بے صبری سے کام لیا اور اپنے اپنے ملکوں میں سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی اکثریت کے ذہنوں کو بدلے بغیر سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا جس کے نتیجے میں قومی قیادتوں اور "ترقی پسند" عناصر سے قبل از وقت تصادم کی نوبت آگئی لیکن درحقیقت ان کی ناکامی براہِ راست نتیجہ ہے ان کے تصوّرِ دین کی خامی اور مطالعۂ اسلام کے نقص کا۔

تعبیر کی کوتاہی | ذرا دقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کا مطالعۂ اسلام اسی مغربی نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں مادہ روح پر اور حیاتِ دنیوی حیاتِ اخروی پر فوقیت حاصل ہے چنانچہ اسلام کے ان "ماوراء الطبیعاتی اعتقادات" کا جن کے مجموعے کا نام ایمان ہے، اقرار تو ان کے یہاں موجود ہے۔ لیکن انھیں کچھ زیادہ درخورِ اعتناء اور لائقِ التفات نہیں سمجھا گیا اور نگاہیں کلیتہً اس ہدایت و رہنمائی پر مرکوز رہیں جو حیاتِ دنیوی ... کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام نے دی ہیں اور جن کے مجموعے کا نام "اسلامی نظامِ زندگی" رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار تو موجود ہے لیکن "ایمان باللہ" کی وہ کیفیت کہ آفاق و انفس میں تنہا وہی فاعلِ مطلق، مؤثرِ حقیقی اور مسبب الاسباب

---

[1] واضح رہے کہ یہ تحریر چھ سال قبل کی ہے۔

دنظر آنے لگے بالکل مفقود ہے۔ آخرت کا اقرار تو کیا جاتا ہے لیکن اس پر ایسا ایمان کہ کُنْ فِی الدُّنیا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ[1] کی کیفیت پیدا ہو جائے قطعاً ناپید ہے۔ رسالت کا اقرار تو ہے لیکن محبتِ رسولؐ نام کو موجود نہیں ہے اور مقامِ رسالت کا تصوّر زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو ڈاک کے ہرکارے اور صرف اپنی زندگی میں ملّت کے مرکز یعنی رہبر و مطاع سے زیادہ نہیں[2] اور جو سنّت کے مقام سے زیادہ آگاہ ہیں انھوں نے بھی سنّتِ عادت اور سنّتِ رسالت کی تقسیم سے ایسا چور دروازہ پیدا کر لیا ہے جس سے کم از کم اپنی نجی زندگیوں کی حد تک زمانے کا ساتھ دینے کی آزادی برقرار ہے۔ اگر ایمان کا صرف وہ اقرار پایا جاتا ہے جو قانونی اسلام کی بنیاد ہے اور یہ کیفیت کہ ایمان انسان کا 'حال' بن جائے نہ صرف یہ کہ موجود نہیں ہے بلکہ اس کی کسی ضرورت و اہمیت کا احساس بھی سرے سے عنقا ہے!

اسی نقطۂ نظر کا کرشمہ ہے کہ دین اسٹیٹ (STATE) کا ہم معنی قرار پایا ہے اور عبادت اطاعت کے مترادف ہو کر رہ گئی ہے۔ نماز کا یہ مقام کہ وہ معراج المومنین[3] ہے۔ نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے اور نفسِ انسانی کا اس سے ایسا اُنس کہ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ[4] کی کیفیت پیدا ہو سکے ناپید ہے۔ اس کے برعکس زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو صلٰوۃ معاشرے کے ہم معنی قرار پائی ہے اور دوسروں کے نزدیک بھی اس کی اصل اہمیت اس حیثیت سے ہے کہ وہ مسلمان معاشرے کی اصلاح اور تنظیم کا ایک جامع پروگرام ہے۔ زکوٰۃ کا یہ پہلو کہ یہ روح کی بالیدگی اور تزکیے کا ذریعہ ہے اس قدر معروف نہیں جتنی اس کی یہ حیثیت کہ یہ اسلامی نظامِ معیشت کا اہم ستون ہے۔ روزہ کے بارے میں یہ تو خوب بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ضبطِ نفس (SELF CONTROL) کی مشق و ریاضت ہے۔ لیکن اس کی اس حقیقت کا یا تو سرے سے ادراک ہی نہیں ہے یا اس کے بیان میں 'حجاب' محسوس ہوتا ہے کہ یہ روح کی تقویت کا سامان اور جسد حیوانی کی اس پر گرفت کو کمزور کرنے کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ یہ حدیث

---

[1] حدیث نبوی صلعم: دنیا میں ایسے رہو جیسے اجنبی یا مسافر! [2] اس مکتب کی زور دار نمائندگی کا شرف ہمارے ہاں جناب غلام احمد پرویز کو حاصل ہے۔ یہاں اس مکتبِ فکر کے حوالے سے صرف یہ مقصود ہے کہ واضح ہو جائے کہ یہ بھی تعبیر کی اصلاً اسی غلطی کی اگلی منزل ہے! [3] حدیث نبوی صلعم: الصلوٰۃ معراج المومنین "نماز مومنوں کی معراج ہے۔"

[4] حدیث نبوی صلعم: میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

تو تحریر و تقریر میں عام بیان ہوتی ہے کہ "الصوم جُنّۃ"[1] اور اس کی تشریح پر خوب زور دیا جاتا ہے لیکن یہ حدیثِ قدسی کہ "الصوم لی وانا اَجزی بہ"[2] اول تو کم ہی بیان ہوتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہے تو بس سرسری طور پر[3]۔ اسی طرح حج کے بارے میں یہ تو معلوم ہے کہ اس کے ذریعے "خدا پرستی کے محور پر ایک عالمگیر برادری" کی تنظیم ہوتی ہے لیکن اس سے آگے اس کی روحانی برکات کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔

اسلام کی یہ نئی تعبیر براہِ راست نتیجہ ہے مغرب کے فلسفہ و فکر کے ہمہ گیر تسلط کا جس نے نقطۂ نظر کو ملحدانہ و مادہ پرستانہ بنا کر رکھ دیا۔ نتیجۃً روح اور اس کی حیاتِ باطنی خارج از بحث ہو گئی اور مادہ اور حیاتِ دنیوی ہی سارے غور و فکر کا موضوع اور سوچ بچار کا مرکز بنے۔ چنانچہ دین و مذہب کی بھی مادی تعبیر ہوئی اور کہنے میں تو اگرچہ یہ آیا کہ اسلام فلاحِ انسانی کا جامع پروگرام ہے جس میں فلاحِ اخروی اور فلاحِ دنیوی دونوں شامل ہیں۔ لیکن نگاہیں چونکہ فی الواقع صرف حیاتِ دنیوی پر مرکوز ہیں، لہٰذا آخری تجزیے میں اسلام ایک "سیاسی و عمرانی نظام" ——— (POLITICO-SOCIAL SYSTEM) بن کر رہ گیا اور "الٰہیات" کی حیثیت ایک "پردے" سے زیادہ نہ رہی۔ چنانچہ زندگی کا اصل مقصد یہ قرار پایا کہ اس نظامِ زندگی کو عملاً رائج و نافذ کیا جائے۔ رہی خدا کی معرفت و محبت اور اس کے سامنے تضرع و اخبات جو 'عبادت' کا اصل جوہر ہیں تو ان کی حیثیت بالکل ثانوی و اضافی ہو کر رہ گئی[4]۔

---

[1] حدیثِ نبوی صلعم: "روزہ ڈھال کے مانند ہے"۔ [2] حدیثِ قدسی: "روزہ میرے لیے ہے میں خود اس کی جزا دوں گا۔" یا ایک دوسری روایت کے مطابق: "روزہ میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا ہوں"۔ [3] واقعہ یہ ہے کہ اس حدیثِ قدسی کے صحیح مفہوم تک رسائی ایسے لوگوں کے بس میں ہے ہی نہیں جن کے دل و دماغ پر مادیت کے پردے پڑے ہوئے ہوں!

[4] چنانچہ اس دور کے ایک بہت بڑے متکلم اور داعیِ اسلام کا یہ فقرہ ایک ثقہ راوی نے روایت کیا ہے کہ "اسلام دراصل ایک سیاسی عمرانی نظام ہے جس پر الٰہیات کا پردہ ڈال دیا گیا ہے"۔ ؏ "چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است!"

[5] یہ صورتِ حال بھی خاصی 'قدامت پسند' اسلامی تحریکوں کے یہاں ہے ورنہ 'زیادہ ترقی پسند' لوگوں نے تو فکرِ مغرب کی منطقی انتہا یعنی سوشلزم اور کمیونزم کے زیرِ اثر اسلام کو سیاسی و عمرانی سے بھی آگے بڑھ کر محض ایک 'معاشی' پروگرام بنا کر رکھ دیا ہے یعنی ان کے نزدیک اسلام عبارت ہے محض ایک مخصوص "نظامِ ربوبیت" سے باقی رہے اعتقادات و ایمانیات تو ان کے ضمن میں جہاں سرسید مرحوم کی انتہا ہوئی تھی وہاں سے انھوں نے ابتدا کی اور جنت و دوزخ کی تعبیر اسی دنیا کے عیش و آرام اور کلفت و مشقت سے اور قیامت کی تعبیر ایٹمی دھماکوں سے کر کے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں فی الواقع "مذہبی" سے زیادہ "سیاسی"، "عمرانی" اور "دینی" سے زیادہ "دنیوی" ہیں۔ اور آخری تجزیے میں دوسری سیاسی معاشی تحریکوں سے صرف اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ اُن کے نزدیک سرمایہ دارانہ جمہوریت یا اشتراکیت بہتر نظام ہائے حیات ہیں اور اِن کے نزدیک اسلام انسانی زندگی کے جملہ مسائل کو بہتر طور پر حل کرتا ہے —— گویا درحقیقت مذہب کی اصل اقدار کے احیاء کا کام تو ابھی شروع نہیں ہوا ہے

نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

یہی سبب ہے کہ یہ تحریکیں بے لنگر کے جہازوں کے مانند اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہیں اور ان کا حال اکثر و بیشتر اس مسافر کا سا ہے جسے نہ تو منزل ہی کا پتہ رہا اور نہ یہ ہی یاد رہا کہ سفر شروع کہاں سے کیا تھا۔

ہم تو فانیؔ جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

احیاء اسلام کی شرطِ لازم "تجدید ایمان"

اسلام کی بنیاد ایمان پر ہے اور احیائے اسلام کا خواب ایمان کی عمومی تجدید کے بغیر کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا! مسلمان ممالک کی سیاسی آزادی و خود اختیاری بھی یقیناً بہت اہم ہے اور اس سے بھی ایک حد تک اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار ہوئی ہے اسی طرح اسلامی نظام زندگی کا تصور اور اس پر ایک بہتر نظام حیات ہونے کے اعتبار سے اعتماد بھی ایک حد تک مفید اور قابل قدر ہے اور جن تحریکوں کے ذریعہ یہ پیدا ہوا یا ہو رہا ہے ان کی سعی و جہد بھی احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے لیکن اصل اور اہم تر کام ابھی باقی ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ عالم اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگ اس امر کی جانب متوجہ ہوں اور جنھیں اس

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) سارا معاملہ ہی ختم کر دیا۔ تاہم باوجود اس کے کہ ہماری نگاہ میں یہ بھی اسلام کی مادّی تعبیر ہی کی منطقی انتہا ہے۔ مذہب کی یہ تعبیر ہمارا موضوع بحث نہیں اس لیے کہ چاہے اسے "قرآنی نظام" ہی کا نام کیوں نہ دیا گیا ہو اس کا خالص مادّی اور خلاف قرآن ہونا اظہر من الشمس ہے اور ہم نے اس "فکر" کی جانب کچھ اشارے بھی کیے ہیں تو محض ضمنی طور پر تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ دین و مذہب کی مادّی تعبیر کا سلسلہ بالآخر یہاں تک جاتا ہے۔ ے

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

کی اہمیت کا احساس ہو جائے وہ اپنی تمام تر سعی و جہد کو اس پر مرکوز کر دیں کہ امت میں تجدید ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو اور ایمان نرے اقرار اور محض قال سے بڑھ کر "حال" کی صورت اختیار کرے۔

ایمان لا محالہ کچھ ماورا الطبیعاتی حقائق پر یقین کا نام ہے۔ اور اس راہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ انسان "ان دیکھی" حقیقتوں پر دکھائی دینے والی چیزوں سے زیادہ یقین رکھے اور سر کے کانوں سے سنی جانے والی باتوں سے کہیں زیادہ اعتماد ان باتوں پر کرے جو صرف دل کے کانوں سے سنی جا سکتی ہیں۔ گویا "ایمان بالغیب" اس راہ کی شرط اولین ہے اور اس کے لیے فکر و نظر کا یہ انقلاب اور نقطۂ نظر اور طرز فکر کی یہ تبدیلی لازمی و لابدی ہے کہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی و خیالی نظر آئے لیکن ذات خداوندی ایک زندہ جاوید حقیقت معلوم ہو۔ کائنات کا پورا سلسلہ نہ از خود قائم معلوم ہو نہ کچھ لگے بندھے قوانین کے تابع چلتا نظر آئے بلکہ ہر آن و ہر سمت ارادۂ خداوندی و مشیت ایزدی کی کار فرمائی محسوس و مشہود ہو جائے۔ مادہ حقیر و بے وقعت نظر آئے لیکن روح ایک حقیقت کبریٰ معلوم ہو۔ انسان کا اطلاق اس کے جسد حیوانی پر نہ ہو بلکہ اس "روح ربانی" پر کیا جائے جس کی بدولت وہ مسجود ملائک ہوا[1] — حیات دنیوی فانی و ناپائیدار ہی نہیں بالکل غیر حقیقی و بے وقعت معلوم ہو اور حیات اخروی ابدی و سرمدی اور حقیقی و واقعی نظر آنے لگے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے مقابلے میں دنیا و مافیہا کی وقعت حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق "مچھر کے پر" سے زیادہ محسوس نہ ہو۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے جب تک امت کے ایک قابل ذکر اور مؤثر حصے میں نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی واقعتاً پیدا نہ ہو جائے "احیائے اسلام" کی آرزو ہرگز شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے گی۔

---

[1] آیۂ قرآنی "فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ"

—— ترجمہ: جب میں اسے پوری طرح بنا چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو گر جانا اس کے لیے سجدے میں۔

بوئے گل در برگِ گل

حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلویؒ اپنے مکتوبات کے آئینے میں

تلخیص و ترجمہ از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب (۱۰۱) خواجہ حسن مودودی لکھنویؒ کے نام

[چند اعتراضات کے جوابات]

آپ نے لکھا ہے کہ "مرشد کو چاہیے کہ وہ طبائع مختلفہ کا لحاظ رکھتے ہوئے نوع بنوع کے اشغال، تعلیم و تلقین کرے۔ ارباب بصیرت و کشف نے راہِ سلوک طے کرانے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا ہے" ــــــ مگر یہ کلیہ نہیں ہے۔

(دیکھیے) انبیاء علیہم السلام نے "بیک طور شریعت" اصلاح بنی آدم فرمائی ہے۔ ایمان و عمل، اخلاقِ حسنہ، معاملات میں طرفین کی رضامندی کے ذریعہ بنی آدم کی اصلاح اس طرح فرمائی کہ اُن کو دنیا سے اعراض ہوگیا۔ اور آخرت کی طرف توجہ ہوگئی۔ اہل اسلام نے اس طور شریعت کے ذریعے صلاح و فلاح پائی ہے۔

حضرت مجددؒ کے بارے میں آپ کا یہ قول کہ انھوں نے حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی نسبت حاصل کی ــــــ جس کا عکس اُن پر پڑا تھا حفاظت و نگہداشت نہیں کی اور ریاضات نہیں کیں۔ لہٰذا اُس نسبتِ حاصلہ میں خلل و فتور واقع ہوگیا اور انھوں نے اولیاء و صحابہ کرامؓ کے بارے میں ترکِ ادب کیا۔ حضرت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم سے مساوات کا دعویٰ کیا (اس کا

جواب یہ ہے کہ، اگر نسبت میں فتور واقع ہوتا تو ان سے کلمات عالیہ کیسے صادر ہوتے۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ جو امام اہل معرفت ہیں انھوں نے حضرت مجددؒ کے بارے میں فرمایا ہے کہ "آپ کے علوم سب صحیح ہیں اور قابل ملاحظہ انبیاء ہیں"

(ایک جگہ فرمایا) "ان کی مثل اس وقت زیر فلک کوئی نہیں (اولیاء میں) اُن کی مانند چند ہی حضرات گزرے ہیں؟

شیخ احمد ایک ایسے آفتاب ہیں کہ ہم جیسے ہزاروں ستارے اُن کے سایے میں گم ہیں ——— علماء و اہل دانش نے اُن کے معلومات اور مقامات کی صحت کی گواہی دی ہے ـــــ..... غرضیکہ حضرت مجددؒ فیض چشتیہ و قادریہ و سہروردیہ و کبرویہ و نقشبندیہ کے اور اُن نسبتہائے جدیدہ کے معدن ہیں جو اُن پر وارد ہوئیں ؎

خاص کند بندۂ مصلحت عام را

چونکہ یہ طریقہ پانچوں بلکہ اس سے زائد خاندانوں کے فیوض کا جامع ہے اس لیے ہم ہر نسبت کے رشحاتِ فیوض سے طالبین کو سیراب کر سکتے ہیں۔

اللہ کی نعمتوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات نیز حضرت پیر و مرشد مرزا مظہر جانجاناں شہیدؒ کے افاضات کا شکریہ ادا کرنا اس گنہگار کے بس کا کام نہیں ہے۔ ان نعمہائے کثیرہ کے مقابلے میں سوائے ندامت کے میرے پاس اور کیا رکھا ہے

سالہا سال ہوگئے کہ آپ اس قسم کی معترضانہ باتیں حضرت مجددؒ کے بارے میں لکھ رہے ہیں اور اب بھی اسی قسم کی باتیں لکھی ہیں۔ مکارم اخلاق سے یہ بات بعید ہے کہ حضرت مجددؒ کے سلسلے کے مریدوں کو اس قسم کے اعتراضات لکھے جائیں۔

آپ نے طریقۂ چشتیہ کی افضلیت کے بارے میں تحریر فرمایا ہے (اس کا جواب یہ ہے کہ) جس کسی کو کسی خاندانِ روحانی سے فیضیاب و منسوب کرتے ہیں اُس خاندان کے فضائل اس کی نظر میں جلوہ گر فرماتے ہیں ورنہ کسی خاندان و مشائخ پر شرف و فضل اتباع سنت اور طالبوں کی تہذیب و تربیت کے بقدر ہے۔

یہ بات (اس وقت) نقشبندیہ میں بہتر پائی جاتی ہے۔ تامل اور انصاف شرط ہے۔

اس طریقے میں بدعت کی کوئی ملاوٹ نہیں ہے اور اس کے فیوض عالمگیر ہیں۔ فالحمد للہ حق تعالےٰ جانتا ہے کہ مجھے خاندانِ عالیشان چشتیہ سے اس قدر نیازمندی ہے کہ ڈرتا ہوں کہ لوگ (بطور طعن) کہیں کہ میں اپنے طریقے میں مخلص نہیں ہوں۔ میں نے کسی کی روٹی کھانا اور شکریہ کسی کا ادا کرنا۔ اپنا شیوہ بنا لیا ہے ــــ طریقۂ حضرت مجددؒ پر کوئی جائے اعتراض نہیں ہے۔ اُنھوں نے اپنے بعض ایسے کلمات کی توجیہ و تاویل خود کی ہے جن پر اعتراض ہو سکتا تھا اور اُن کے مخلصین نے بھی تاویل و توجیہ کا کام انجام دیا ہے۔ لوگوں نے ان تاویلات و توجیہات سے قطعِ نظر کر کے زبانِ طعن دراز کی ہے۔ حالانکہ وہ (شریعت کی جانب سے) حسنِ ظن اور عدمِ طعن کے مامور تھے۔ آنجناب نے (اپنی معترضانہ) تحریروں میں فضول باتیں لکھی ہیں ــــ آنجناب صاحبزادے ہیں ایسی طویل لاطائل باتیں آپ کی شان کے مناسب نہیں ہیں

میری عمر سستی اور کوتاہی میں گزر گئی۔ اس شدتِ ضعفِ پیری میں تدارک و تلافی کس طرح ممکن ہے؟ ــــ اللہ تعالےٰ حضرت شیخ عبد القادرؒ ... اور حضرت خواجہ نقشبندؒ نیز حضرت مجددؒ کے توسّل سے زندگی کے اگلے اور پچھلے تمام گناہوں کو معاف کرے اور سیئات کو حسنات سے تبدیل فرمادے ــــ اور ایسی رضا جس کے بعد ناراضگی نہ ہو اور اپنے دیدارِ جانفزا کا اشتیاق جو لازمِ دل و جان ہو۔ عطا فرمائے ؎

منگر کہ دلِ ابن یمیں پُر خوں شد　　بنگر کہ ازیں سرائے فانی چوں شد

مُصحف بکف و پا برہ و دیدہ بدوست　　باپیکِ اجل خندہ زناں بیروں شد

اللہ تعالےٰ اس قطعے کے مطابق موت نصیب فرمائے۔

مکتوب (۱۰۲) میں سید احمد بغدادی کو تحریر فرماتے ہیں

سید صاحب عالی مراتب حضرت سید احمد بغدادی سلمہٗ اللہ تعالیٰ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ عنایت نامہ مرقومہ ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۸۱ھ جمادی الاولیٰ کو پہونچا۔ مسرت بخشی اور انتظار کو رفع کیا۔

آپ نے لکھا ہے کہ تم مجھ سے ناراضگی رکھتے ہو۔ ناراضگی کی وجہ معلوم نہیں ــــ

استغفراللہ یہ کیا بات لکھی۔ آپ جیسے لوگوں کا وجود اس کمترین درویشاں کے لیے باعث عزت و شرف ہے۔ کثر اللہ امثالکم ـــ یہ خیالات دل سے نکال دیں ـــ

اگر آنے کے لیے اس وقت راستہ میں رکاوٹیں ہیں تو وہیں ٹھہرنا ضروری ہے اس جگہ کی آب و ہوا آپ کے مزاج کے موافق نہیں ہے۔ اس لیے جہاں کہیں دل کی رغبت ہو سکونت اختیار کریں اور مشغول بجد رہیں۔ اور ہمارے طریقہ کا اجرا کریں

بارہا لکھا جا چکا ہے کہ اس حقیر کے خطاب و القاب میں مبالغہ نہ کیا کریں، طویل طویل خط لکھنے موقوف کریں۔ معلوم نہیں کہ اس بات کو کیوں قبول نہیں کیا جاتا ـــ اس قدر لکھنا کافی ہے "حضرت سلامت السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الحمد للہ اس جگہ خیریت ہے اور آپ کی خیریت مطلوب ہے۔ آپ کے حکم کے مطابق تعلیم و تلقین کر رہا ہوں۔ فائدہ بھی پہونچ رہا ہے۔ الحمد للہ"

کوشش کریں کہ جمعیت و توجہ اور حضور و واردات لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جائیں۔

...... اہل محبت سوز جگر کے ساتھ ساتھ گزشتہ احوال سے خطرہ میں اور آئندہ کے سوچ بچار میں رہتے ہیں، نہ معلوم آگے کیا پیش آئے۔

فقیر کا ذکر کسی سے نہ کریں اور نہ میرے متعلق ترغیب دیں۔ میرے ساٹھ سالہ سیر و سلوک کا حاصل یہ چار چیزیں ہیں (جو آگے آ رہی ہیں) اور بس!

یہ آپ کی استعداد کی خوبی ہے کہ لوگوں کو آپ کی صحبت میں یہ حالات پیش آتے ہیں۔

(۱) دل شکستہ (۲) سینہ برشتہ (۳) جان وارستہ (۴) دیدہ بیدار جان فرا بستہ

ے همه اندر زمن بتو این است   کہ تو طفلی و خانہ رنگین است

رویت حضرت حق سبحانہ اور زیارت نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم بہترین مقامات ہیں۔

خط مرسلہ اوائل ربیع الاول، ۳۰ ربیع الاول کو پہونچا تھا۔ اس کا جواب بھیج دیا گیا اور اس جواب میں بھی یہی بات لکھی تھی۔

آپ نے تنگی کے بارے میں لکھا ہے۔ (لہٰذا) فقر کی فاء سے فاقہ قاف سے قناعت اور راء سے ریاضت، یہ اشارات نظر میں رکھیں۔

فقر کو ہم نے اور آپ نے خود ہی اختیار کیا ہے۔ اب شکایت کیسی؟ ......

استقامت، رضا، شوق لقائے جاں فزا، دوام عافیت اور حاجات کی برآمدگی کا سوال اللہ تعالیٰ سے بوقت سحر اور بعد نماز فرائض کریں۔ اس سے جمعیت قلب حاصل ہوگی۔ بددلی کیوں ہے؟ دل کو جمع رکھیں۔۔۔ بندہ دعا سے غافل نہیں ہے۔ عزیزوں اور دوستوں کو سلام اور التماس دعا۔
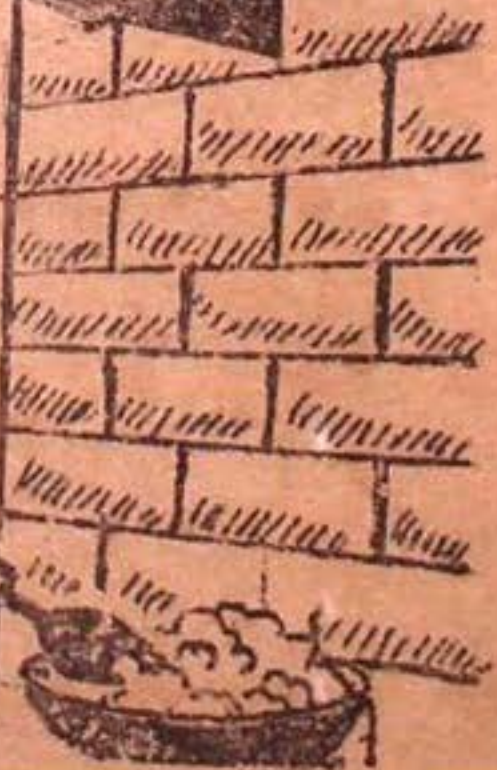
مال کی شرعی حیثیت

(از افادات حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دین سے عام طور پر ناواقفیت کی وجہ سے جہاں اور بہت سی باتوں کا آج لوگوں کو صحیح علم نہیں، ان
انھیں چیزوں میں سے ایک دنیا اور مال کا مسئلہ بھی ہے یعنی یہ کہ دنیا مذموم ہی ہے یا اس میں خیر کا بھی
کوئی پہلو ہے؟ اور مال کا شرع میں کیا درجہ ہے؟

اس وقت اسی مسئلہ پر کچھ کہنا چاہتا ہوں کہ اس زمانہ میں عام طور سے لوگ دنیا کو مذموم سمجھتے
ہیں حالانکہ میں آپ کے سامنے کتاب وسنت سے نصوص پیش کر سکتا ہوں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ
یہ خیال صحیح نہیں ہے ——— سنیے!

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (پ ۱۰)

یعنی آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں
اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو

اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو، تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیجدیں اور اللہ تعالیٰ بےحکمی کرنے والے لوگوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہونچاتا۔ (بیان القرآن)

صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ تجارت میں کساد بازاری ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ وہ سامان جسے تم نے تجارت اور نفع کے خیال سے خریدا ہے مگر ایام موسم میں تمہارے کہ معظمہ سے باہر رہنے کی وجہ سے ان کی بکری کے ایام تم سے فوت ہو جائیں اس لیے تم کو ان میں نقصان کا اندیشہ ہو۔

اسی طرح مسٰکن ترضونہا سے مراد یہ ہے کہ ایسی ایسی کوٹھیاں اور حویلیاں جن میں قیام کرنا تم کو پسند ہو۔

غرض یہاں ان تمام حیات دنیا کی زینتوں کو ان کی مذکورہ صفات کے ساتھ اس لیے بیان کیا کہ یہ بتادیں کہ اگر حُبّ دنیا کی کسی خاص مرتبہ پر ملامت بھی کی جائے، تو اس کے منافی نہیں ہے کہ انسان کے قلب میں ان چیزوں کی فی الجملہ محبت ہو۔

کیونکہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جن چیزوں کو دنیا سمجھا جاتا ہے ان کی نفس محبت منع نہیں ہے بلکہ منع یہ ہے کہ ان سب کی محبت کو اللہ و رسول کی محبت سے بڑھا دیا جائے جس کی علامت یہ ہے کہ ان چیزوں کی محبت انسان کو احکام الٰہیہ دینویہ پر عمل کرنے سے روک دے اور اگر ایسا نہ ہو تو دنیا کا کسی کے پاس ہونا کچھ مضر نہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر جلوہ افروز ہوئے۔ اس حال میں کہ آپ کے سر کے بالوں میں بالوں کی تراوٹ تھی۔ ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس وقت تو آپ بہت ہی خوش نظر آرہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں صحیح کہتے ہو۔ اس کے بعد لوگوں میں غنیٰ اور مالداری کی بات ہونے لگی۔ آپ نے فرمایا کہ غنیٰ میں کچھ مضائقہ نہیں ہے اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرے اور یہ بھی سمجھ لو کہ متقی آدمی کو اگر صحت اور عافیت حاصل ہو تو یہ صحت اس کے لیے تقویٰ کے ساتھ مالداری سے بھی بہتر ہے اور نفس میں خوشی اور انشراح کا ہونا یہ تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔ یعنی انسان کا ہر حال میں خوش رہنا اور منشرح رہنا یہ حالت

منجملہ خدا کی بخششوں کے ہے جس کو اللہ تعالیٰ عطا فرما دیں وہ بہت ہی خوش نصیب ہے۔

دیکھیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ غنی میں کچھ مضائقہ نہیں ہے مگر اس کی شرط تقویٰ بیان فرمائی یعنی آدمی متقی ہو تو اس کے لیے مالدار ہونا کچھ برا نہیں ہے اس لیے کہ مال فی نفسہٖ کوئی بری چیز نہیں ہے۔ کوئی سانپ بچھو نہیں ہے کہ آدمی کو ڈس ہی لے بلکہ اس کے تو جان بھی نہیں ہے محض ایک بے جان سی شے ہے اور آدمی جب متقی ہے یعنی اس کو خدا کا، آخرت کا خوف ہے تو وہ اس کو جائز اور حلال طریقے سے کسب کرے گا اور حقوق ادا کرے گا یا جائز محل میں صرف کرے گا پھر ایسے مال میں کیا مضائقہ ہے؟

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو ارشاد فرمایا۔

"لا باس بالغنی لمن اتقی اللہ عز وجل"

(یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرے اس کے لیے غنی میں کچھ مضائقہ نہیں)

ہمارے مدعا کے لیے یہ ارشاد کافی ہے لیکن ہم اور دوسری روایات سے بھی اس کی توضیح و تشریح کرتے ہیں، مشکوٰۃ شریف میں اسی باب میں ایک اور حدیث نقل کی ہے۔

عن ابی کبشة الانماری انه سمع رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول ثلث اقسم علیهن واحدثکم حدیثاً فاحفظوه۔

فاما الذی اقسم علیهن فانه ما نقص مال عبد من صدقة ولا ظلم عبد مظلمة صبر علیها الا زاده اللہ بها عزاً ولا فتح عبد باب مسألة الا فتح اللہ علیه باب فقر۔

واما الذی احدثکم فاحفظوه فقال انما الدنیا لاربعة نفر۔

(۱) عبد رزقه اللہ مالاً وعلماً فهو یتقی فیه ربه ویصل رحمه ویعمل للہ فیه بحقه فهذا بافضل المنازل۔

(۲) وعبد رزقه اللہ علماً ولم یرزقه مالاً فهو صادق النیة یقول لو ان لی مالاً لعملت بعمل فلان فاجرهما سواء۔

(۳) وعبد رزقه اللہ مالاً ولم یرزقه علماً فهو یتخبط فی ماله بغیر علم لا یتقی فیه ربه ولا یصل فیه رحمه ولا یعمل فیه بحق فهذا باخبث المنازل۔

(۴) وعبد لم یرزقه اللہ مالاً ولا علماً فهو یقول لو ان لی مالاً لعملت فیه بعمل فلان فهو نیته ووزرهما سواء۔

(رواہ الترمذی، مشکوٰۃ ص ۴۵۱ ج ۲)

حضرت ابو کبشہ انماریؓ سے روایت ہے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تین باتیں تو ایسی ہیں کہ میں ان پر تو قسم کھا سکتا ہوں اور ایک اور بات بیان کرتا ہوں تم لوگ اس کو سُن کر یاد کر لو، جن پر قسم کھا سکتا ہوں وہ تین باتیں یہ ہیں کہ ____

(۱) کسی انسان کا مال آج تک صدقہ کی وجہ سے کم نہیں ہوا (یعنی صدقہ دیتے وقت یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اس سے مال کم ہو جائے گا اور شیطان اس وسوسہ کے ذریعہ انسان کو اس سے باز رکھ سکتا ہو تو سُن لو کہ آج تک کوئی مثال ایسی نہیں پائی گئی کہ آدمی نے خدا کی راہ میں مال خیرات کیا ہو اور اس کی وجہ سے اس کا مال ختم ہو گیا ہو اور وہ فقیر ہو گیا ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ

(۲) کسی انسان نے ظلم کیے جانے کے بعد صبر سے کام نہیں لیا مگر یہ کہ اللہ تعالےٰ نے اس کی عزت اور بڑھا دی ہے اور اس کو پہلے سے زیادہ معزز بنا دیا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ

(۳) کسی شخص نے سوال کا دروازہ نہیں کھولا (یعنی دوسروں سے اپنی حاجتیں مانگنا شروع نہیں کیا) مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر فقر کا دروازہ کھول دیا ہے۔ (قسم والی باتیں تو ختم ہوئیں)

اب وہ بات سنو جس کو بیان کرنا چاہتا ہوں اور تم سے یاد کرنے کو کہہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اہل دنیا چار طرح کے ہوتے ہیں۔

(۱) ایک تو وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال بھی دیا ہے اور علم بھی۔ پس علم کی وجہ سے مال کے بارے میں وہ خدا سے ڈرتا ہے اور اللہ تعالےٰ اس کو اس کے مال میں حقِ مال یا حقِ علم ادا کرنے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ یہ شخص مرتبہ میں سب سے افضل ہے۔ اور افضل منازل پر فائز ہے۔

(۲) دوسرا وہ شخص ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو علم تو دیا ہے مگر مال نہیں دیا ہے تو یہ شخص بوجہ علم دین ہونے کے اپنی نیت درست کر لیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ کاش اگر میرے پاس بھی مال ہوتا تو میں بھی فلاں (دیندار) مالدار کی طرح اچھے اچھے دین کے کام کرتا تو اس کا اور اس دونوں کا اجر یکساں ہو گا۔ (ایک کو تو عمل صالح کرنے کا دوسرے کو اس کی حسن نیت کا)

(۳) تیسرا وہ شخص ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس کو مال تو دیا ہو مگر علم نہ عطا کیا ہو تو وہ علم کی روشنی نہ ہونے کے سبب اپنے مال میں خبطی ہو کر اندھا دھند تصرف کرتا ہے (یعنی اس کو خوب اچھی طرح سے اپنے نفس کی شہوات ولذات اور مناہی وملاہی میں صرف کرتا ہو نہ اسمیں اس کو خدا

تعالیٰ کا ڈر ہو اور نہ صلہ رحمی ہی کرتا ہو اور نہ کسی طرح کا حق مال ادا کرتا ہو تو اس شخص کا مرتبہ سب سے اخبث ہے یعنی اخبث المنازل میں پڑا ہوا ہے۔

(۴) چوتھا شخص وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ تو اس کو مال ہی دیا اور نہ ہی علم عطا فرمایا اس لیے وہ یہ کہتا ہے کہ کاش اگر میرے پاس بھی مال ہوتا تو فلاں (فاسق و فاجر) کی طرح میں بھی گلچھرے اڑاتا۔ پس چونکہ یہ اس کا عزم ہے اس لیے یہ اور وہ شخص جو کہ ان برائیوں کا کرنے والا ہے دونوں اس گناہ میں برابر ہوں گے۔

میں کہتا ہوں کہ دیکھیے یہاں جس شخص کا مرتبہ سب سے افضل بیان فرمایا گیا ہے وہ ایسا شخص ہے جس کے پاس مال بھی تھا پس مال کو زیادتی مرتبہ میں دخل ہوا یعنی وہ معین بنا اعلیٰ مرتبہ حاصل ہونے میں، لہٰذا اس کو مطلقاً مذموم کیسے کہا جا سکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ مال اور دنیا مطلقاً مذموم نہیں ہے بلکہ مذموم ان کا سوءِ استعمال ہے یعنی یہی دنیا اگر کفر و فسق کا اور معصیت اور ترک احکام الٰہی کا سبب بن جائے تو اس سے بڑھ کر کوئی شے منحوس اور مذموم نہیں ہے لیکن اگر اسی دنیا کو ایمان اور طاعت کا، تقویٰ و طہارت کا اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور معرفت کا موطن اور محل بنا لیا جائے تو اس کے عمدہ ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

اس حدیث میں علم اور مال دونوں کا تذکرہ کیا گیا ہے پس جہاں جہاں مذمت آئی ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ اس کو علم نہیں تھا اور نہ تو مال کے ساتھ ساتھ اگر علم بھی ہوا ہے (اور اس کے مطابق عمل بھی ہوا ہے) تو اس نے اسمیں چار چاند لگا دیا ہے اور افضل منازل پر انسان کو پہونچا دیا ہے۔ پس اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد لا باس بالغنیٰ لمن اتقی اللہ عزوجل کی پوری شرح موجود ہے کیونکہ یہاں پہلی قسم ہی بیان فرمائی ہے کہ ایک بندہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال بھی دیا ہے اور علم بھی چنانچہ اس علم ہی کی وجہ سے وہ اپنے اس مال میں خدا کا تقویٰ اختیار کرتا ہے یعنی صلہ رحمی کرتا ہے اور اس کے سامنے حقوق ادا کرتا ہے۔ (اس کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ یہ بندہ افضل درجہ پر ہے)

یہی میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ جس طرح اسلام دین اور ایمان یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں اسی طرح سے مال بھی خدا کی ایک نعمت ہے البتہ اگر آدمی اسمیں ایسا منہمک ہو جائے کہ خدا

ہی کو بھول جائے تو یہ اس کی جہالت ہے اور خبطی پن ہے اسی قسم کو حدیث شریف میں "اخبث المنازل" کہا گیا ہے کتاب و سنت میں مال کے متعلق یہ سب تفاصیل مذکور ہیں اور یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں پیدا فرمادیں اور ہمارے اندر حوائج اور ضروریات رکھی ہیں اور ان کو ذریعہ مال قرار دیا ہے اور پھر اسی کی تفصیل نہ بیان فرمائیں۔

آپ نے دیکھا کہ صرف اسی ایک حدیث میں کیسی مفصل گفتگو فرمائی۔ لیکن ہم لوگ اسے آپ کو بتلاتے ہی نہیں جس کی وجہ سے لوگ خرابیوں میں پڑے ہوئے ہیں ورنہ اگر آج ان عوام الناس کو دنیا کے حقوق اور اموال کے حدود بتائی جائیں تو یہ لوگ ہم سے آگے بڑھ جائیں اس لیے کہ ان کے اندر دین کی زیادہ طلب دیکھتا ہوں مگر اپنی کم علمی سے مجبور ہیں۔ اب علماء ان چیزوں کو واضح کردیں بس راستہ ان کے لیے صاف ہے۔

اور جس طرح سے یہاں فرمایا کہ مالداری میں کچھ مضائقہ نہیں ہے، اس شخص کے لیے جو اللہ سے ڈرے۔ اسی طرح سے ایک دوسری جگہ یوں فرمایا ہے کہ نعم المال الصالح للرجل الصالح یعنی صالح مال متقی آدمی کے لیے کیا ہی اچھی چیز ہے یعنی انسان اگر صالح ہو اور اس کے پاس مال بھی صالح ہو تو اس میں کیا مضائقہ ہے یہ تو نور علیٰ نور ہے اسی کو ایک دوسری روایت میں نعم المعونۃ فرمایا گیا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ

من اخذہ بحقہ نعم المعونۃ ھو یعنی اس مال کو جو اس کے حق کے ساتھ لے یعنی جائز طریقوں سے حاصل کرے اور صحیح مصرف میں صرف کرے تو یہ ایک اچھا معین اور عمدہ مددگار ہے۔

اسی طرح سے صاحب روح المعانی نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضرت سعید بن جبیر رضؓ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں دنیا کو جو متاعِ غرور فرمایا گیا ہے تو یہ جب ہے کہ یہ طلب آخرت سے انسان کو روک دے لیکن اگر یہی اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی جانب داعی ہو اور آخرت کی ذریعہ بنے تو پھر یہی دنیا نعم المتاع و نعم الوسیلۃ بھی ہے۔ یعنی نہایت ہی عمدہ برتنے کی چیز اور بہت ہی خوب وسیلہ ہے (روح پ ۲۷ صفحہ ۱۶)

اسی بات کو علامہ شاطبیؒ نے الموافقات میں یوں بیان فرمایا ہے کہ

فذم الدنیا انما ھو لاجل انہا تصیر ذریعۃً الی تعطیل التکالیف۔

یعنی نصوص میں جو دنیا کی مذمت آئی ہے تو وہ لذاتہٖ نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ کبھی وہ ذریعہ بھی بن جایا کرتی ہے۔ احکام الٰہیہ کے تعطل کا۔ یعنی دُنیا میں منہمک ہو کر انسان احکام شرعیہ ہی کو ترک کر دیتا ہے اور خدا ہی سے غافل ہو جاتا ہے اور دنیا دراصل اسی غفلت کا نام ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن   نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

یعنی دنیا نام ہے خدا تعالےٰ سے غافل ہو جانے کا۔ باقی عمدہ عمدہ کپڑے۔ چاندی سونا اور بیوی بچوں کا نام دنیا نہیں ہے بلکہ اسباب راحت کسی کے پاس اور زیادہ کیوں نہ ہوں اگر وہ سب اس کو خدا کی یاد سے غافل نہ کریں تو ان کا پاس ہونا کچھ مضر نہیں۔

علماء کی ان سب تصریحات سے معلوم ہوا کہ مال خود بُرا نہیں ہوتا بلکہ اس کو انسان کا استعمال بُرا بنا دیتا ہے۔

اس لیے مال والے کے لیے صالح ہونا نہایت ضروری ہے وہ صالح ہو گا تو مال کو بھی صالح بنائے گا۔ اور مال کا صالح ہونا یہی ہے کہ وہ انسان کے تابع ہو یعنی محکوم ہو انسان پر حاکم نہ ہو جائے اور اس کو انسان اپنی حد پر رکھے۔ مال ہاتھ کا میل ہے۔ انسان کا مکسوب ہے۔ خادم ہے اس لیے آدمی اس سے وہی کام لے جو اس کے مناسب ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے باقی اس کو اپنی حد سے بڑھا کر یہ کر دے کہ خود اس کا تابع اور محکوم ہو جائے۔ یہ قلب موضوع ہے اور اس کا مصداق ہے کہ ؎

کان مملوکی فاضحے مالکی

ان ھذا من اعاجیب الزمن

یعنی میرا غلام اور مملوک تھا مگر اب ہمارا آقا اور مالک ہو گیا ہے۔ یہ بھی اعجوبہ روزگار میں سے ہے۔

اسی طرح سے میں کہتا ہوں کہ مال کی وضع تو اس لیے تھی کہ وہ آپ کا خادم ہوتا اور آپ کے لیے زاد آخرت حاصل کرنے کا ذریعہ بنتا لیکن انسان ہی عبدالدینار اور عبدالدرہم ہو گیا ہے یہی قلب موضوع ہے۔

ایک دفعہ میں نے اسی بات کو اس عنوان سے بیان کیا تھا کہ بھائی مال کو جیب میں رکھو۔ بکس میں رکھو جائز ہے دل میں نہ رکھو اس لیے دل میں رکھنے کی چیز اللہ تعالیٰ کی محبت ہے۔

دل دیا ہے اس نے تخم عشق بونے کے لیے
آنکھ دی ہے اس نے ساری عمر رونے کے لیے

تو لوگوں نے اس کو بہت پسند کیا کہ خوب بات کہی کہ مال کی جگہ صندوق ہونا چاہیے قلب نہیں میں نے کہا کہ یہ بات میں ہی نہیں کہہ رہا ہوں، یہ مضمون تو کتاب و سنت کا ہے اور علمائے امت امت نے اس کو بیان کیا ہے۔ حدیث شریف میں یہ جو آیا ہے
تو اس کے متعلق مولانا روم مثنوی میں فرماتے ہیں کہ ؎

مال را گر بہر دیں باشی حمول　　نعم مال صالح گفتار سول

یعنی مال اگر دین کی خاطر کماؤ اور جمع کرو تو کچھ حرج کی بات نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نعم المال الصالح للرجل الصالح آگے مولانا روم نے اس کی ایک نہایت ہی عمدہ مثال بیان فرمائی ہے۔

فرماتے ہیں ؎

آب در کشتی ہلاک کشتی است　　آب از بیرون کشتی پشتی است

یعنی دریا کی پانی کو دیکھو کہ اگر وہ کشتی کے اندر آجائے تو اس کے لیے سامان ہلاکت ہے لیکن وہی پانی اگر نہ ہو تو کشتی چل بھی نہیں سکتی، چنانچہ کشتی کے نیچے پانی کا ہونا اس کے حق میں مدد اور اعانت ہے۔

بس یہی مثال دنیا کی اور قلب مومن کی سمجھو کہ اگر مال اور دنیا مومن کی کشتی قلب سے باہر رہے (جس کو میں نے کہا کہ جیب میں رہے یا صندوق میں رہے) تو اسمیں شک نہیں کہ اس کے دین کا محافظ اور اس کی عزت و آبرو کا وقایہ ہے جیسا کہ حدیث شریف میں بھی اس کو "ترس المومن" فرمایا ہے۔ ہاں اگر اس کی محبت قلب کے اندر گھس گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت پر غالب آگئی ہے تو بلاشبہ یہ مومن کے لیے دینی ہلاکت کا سبب بھی ہے۔　(باقی)

(جناب مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی)

یہ مختصر مضمون آل انڈیا ریڈیو دہلی کی فرمائش پر سرسری طور پر لکھا گیا تھا مگر میری دہلی میں عدم موجودگی کے سبب پڑھا نہ جا سکا ——— (زین العابدین)

اب سے تقریباً چار ہزار سال پہلے، خداوند جل وعلا کے ایک عاشقِ صادق حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیٰ نبینا وعلیہ التسلیم نے جس جس طرح راہِ خداوندی میں اپنی جان بازی وجاں سپاری قربانی و فداکاری کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ انسانیت کا ایک بے مثل واقعہ ہے، یہ مظاہرہ جس مقدس سرزمین میں ہوا وہ مکہ معظمہ کی سرزمین ہے۔ اس مظاہرہ کی یاد تازہ کرنے کے لیے دُنیا بھر کے خداپرستوں کو دعوت دی گئی کہ وہ یہاں آئیں اور حضرت ابراہیم کی قربانی و بندگی کے آثار و شعائر کو دیکھ کر اپنے دلوں میں عشقِ خداوندی کی انہی چنگاریوں کو روشن کریں جو ابراہیم خلیل اللہ کے دل میں دہک رہی تھیں۔

اس افسانۂ محبت کی ایک اہم یادگار کعبۃ اللہ ہے، جب حضرت ابراہیمؑ عزیزوں اور دوستوں کی قربانی، وطن کی قربانی، مال و دولت کی قربانی، اور سب سے زیادہ اپنے نورِ نظر لختِ جگر کی قربانی کی منزلوں سے پوری ثابت قدمی سے گزر چکے تو ان کو خلیل اللہ کے خطاب سے نوازا گیا اور امامتِ عالم کا تاج ان کے سر پر رکھا گیا۔

وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا (اور اللہ نے ابراہیم کو دوست بنا لیا)

اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ (میں تمہیں انسانوں کا مقتدا بنا رہا ہوں)

اب ان کو حکم ہوا کہ وہ خداوند جل جلالہ کی عبادت کے لیے ایک عالمی مرکز تعمیر کریں، چنانچہ وہ اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل علیہما السلام فوراً ارشاد خداوندی کی تعمیل میں لگ گئے۔ بیٹا پتھر اٹھا اٹھا کر دے رہا تھا اور باپ رکھ رہا تھا اور دونوں کے ہونٹوں سے اس دعا کے ترانے بلند ہو رہے تھے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ — اے پروردگار تو ہم سے یہ خدمت قبول کرلے تو خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔

حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی یہ تاریخی دعا قبول ہوئی اور ان کا تعمیر کیا ہوا یہ مقدس گھر تمام عالم کا روحانی مرکز بنا دیا گیا۔ اس کو مقام امن قرار دیا گیا اور رہتی دنیا تک خدا کے سچے پرستاروں کو حکم دیا گیا کہ وہ عمر میں کم از کم ایک مرتبہ یہاں آکر اپنی پیشانی خداوند رب العزت کے سامنے جھکائیں۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى۔ — (اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے بیت اللہ کو دنیا کے انسانوں کا مرکز اور امن گاہ بنایا۔ اور حکم دیا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو مصلّٰی قرار دو)

اسی مقدس گھر کی دیوار میں ایک پتھر ہے جس کو "حجر اسود" کہا جاتا ہے۔ یہ پتھر سیاہ رنگ کا ہے شکل بیضوی ہے اور زمین سے پانچ فٹ کی بلندی پر خانۂ کعبہ کی دیوار میں ایک کونے پر جسے رکن اسود کہتے ہیں لگا ہوا ہے۔ خانۂ کعبہ کے گرد جو سات چکر لگائے جاتے ہیں وہ اسی مقام سے شروع ہوتے ہیں اور یہیں ختم ہوتے ہیں، طواف کرنے والا حجر اسود کو بوسہ دیتا ہے۔ اگر زائرین کے ہجوم کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو اس پر ہاتھ رکھ دیتا اور پھر اس ہاتھ کو بوسہ دے لیتا، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دور سے اس کی طرف اپنے ہاتھ کا رُخ کر کے اسے بوسہ دے لینا بھی کافی ہے۔

یوں تو خانۂ کعبہ کے تقدس کی وجہ سے اس کا ہر حصہ مقدس ہے، مگر حجر اسود کو اس سلسلہ میں جو خاص امتیاز حاصل ہے اس پر حضرت ابن عباس کی اس روایت سے جسے حافظ ابن کثیر نے نقل کیا ہے، روشنی پڑتی ہے۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں :-

کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ شریف کو پانچ پہاڑوں کے پتھروں سے بنایا ہے (طور سینا، طور زیتا، کوہ لبنان، کوہ جودی اور کوہ حرا) جب حجر اسود کی جگہ تعمیر پہونچی تو حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل سے کہا بیٹا میں یہاں کوئی خوبصورت پتھر لگانا چاہتا ہوں تاکہ وہ ایک علامت کا کام دے۔ حضرت اسماعیل باپ کا یہ ارشاد سن کر ایک خوبصورت پتھر لائے، حضرت ابراہیم نے فرمایا اس سے زیادہ خوبصورت کوئی پتھر لاؤ، حضرت اسماعیل پھر تشریف لے گئے تو کوہ ابوقبیس نے چلاکر کہا آپ کی ایک امانت میرے پاس محفوظ ہے اسے لے لیجئے۔ یہ حجر اسود تھا جو طوفان نوح کے وقت سے اس پہاڑ میں محفوظ تھا۔ حضرت اسماعیل یہ پتھر لے آئے اور حضرت ابراہیمؑ نے اسے خانہ کعبہ میں لگا دیا۔

حجر اسود کی اہمیت کے سلسلے میں بعض دوسری روایات بھی مفسرین نے درج کی ہیں، مگر محققین کے نزدیک ان میں سے اکثر ضعیف ہیں، بہر حال حجر اسود کو دوسرے پتھروں کے مقابلہ میں ایک خصوصی امتیاز حاصل ہے۔ قبل از اسلام بھی قریش کے حلقوں میں اس کی بڑی اہمیت تھی، تاریخ کا یہ واقعہ اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک تقریباً ۳۵ سال تھی کہ قریش نے خانہ کعبہ کی نئے سرے سے تعمیر کرنی چاہی۔ پرانی عمارت توڑی گئی اور بڑے اہتمام سے نئی عمارت کی بنیادیں اٹھائی گئیں۔ تعمیر کے سلسلے میں خانہ کعبہ کے مختلف حصے مختلف قبائل میں بانٹ دیئے گئے تاکہ اس مقدس کام میں سب شرکت کر سکیں، جب دیوار کی تعمیر حجر اسود کے مقام تک پہونچی تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اس مقدس پتھر کو اس جگہ کون رکھے، جھگڑا اتنا بڑھا کہ تلواریں نیام سے نکل آئیں۔ آخر ایک معمر سردار ابوامیہ ابن مغیرہ نے یہ تجویز پیش کی کہ جو شخص علی الصباح سب سے پہلے خانہ کعبہ میں داخل ہو یہ کام وہی انجام دے۔ یہ تجویز سب نے مان لی۔ صبح کے دھندلکے میں جس کا چہرۂ انور سب سے پہلے صحن حرم میں چمکا وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے، سب آپ کو دیکھ کر پکار اٹھے یہ تو محمدؐ امین ہیں ان کا فیصلہ ہم کو بسر و چشم قبول ہوگا۔

حضورؐ نے سرداران قریش سے کہا کہ ایک بڑی چادر لاؤ، جب چادر آگئی تو آپ نے حجر اسود کو اٹھا کر اس میں رکھ دیا۔ اور تمام قبیلوں کے سرداروں سے کہا کہ وہ چادر کے کنارے پکڑ کر اسے

دیوار کعبہ کے قریب لے چلیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اب سرکار نامدار نے اس پتھر کو چادر میں سے اٹھا کر دیوار میں اس کی جگہ نصب کر دیا۔ اس واقعہ سے ایک طرف اس پتھر کی عزت و احترام کی شہادت ملتی ہو تو دوسری طرف رسول اکرم صلعم کی امانت و دیانت اور فہم و فراست پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اس اہمیت کے باوجود یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ یہ پتھر بہرحال ایک پتھر ہے، اس کا سارا تقدس محض اس وجہ سے ہے کہ اس کو دو مقدس پیغمبروں نے خصوصیت کے ساتھ اس جگہ کے لیے انتخاب کیا اس کو معبودیت کا مقام ہرگز حاصل نہیں، اگر کسی ناواقف کے دل میں اس قسم کا شبہ پیدا ہو تو اسے امیر المومنین حضرت عمر فاروق کا یہ واقعہ یاد رکھنا چاہیے کہ صحیحین کی روایت کے مطابق جب وہ طواف کرتے ہوئے حجر اسود کی طرف بڑھے تو اسے بوسہ دیا تو فرمایا۔

اِنی لاَعلم انک حجر لا تنفع ولا تضر ولولا انی رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقبلک ما قبلتک۔

(یعنی اے حجر اسود میں جانتا ہوں کہ تو صرف ایک پتھر ہے۔ تو نہ کسی کو نفع پہونچا سکتا ہے اور نہ نقصان اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھتا تو تجھے ہرگز بوسہ نہ دیتا۔

یوں بھی بوسہ دینا محبت کی علامت ہے عبادت کا انداز نہیں۔ عبادت کے لیے سر جھکا دیا جاتا ہے اور حجر اسود اتنی بلندی پر نصب ہے کہ اسے سجدہ کرنا ممکن ہی نہیں۔

حجر اسود کی تاریخ کا ایک الم ناک واقعہ یہ ہے کہ ۳۱۷ھ میں حکومت عباسیہ کے دور زوال میں، قرامطہ[1] کے فرقہ باطلہ کا ایک سردار ابو طاہر قرمطی، امیر مکہ کو مغلوب کر کے، خانۂ کعبہ میں داخل ہوا اور حجر اسود کو وہاں سے اکھاڑ کر کوفہ لے گیا اور جامع مسجد کوفہ کے ایک ستون میں اسے نصب کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ حجر اسود کی وجہ سے لوگ بجائے خانہ کعبہ کے جامع مسجد کوفہ کو زیارت گاہ بنالیں۔ مگر اس کی یہ آرزوئے باطل پوری نہ ہوئی، آخر ۲۲ سال کے بعد اسے واپس لیا گیا او پھر اپنی جگہ نصب کر دیا گیا۔

---

[1] قرامطہ شیعوں کے غالی فرقوں میں سے ایک فرقہ تھا اور ایک زمانہ میں اہل ایمان کے لیے سخت آزمائش کا سامان تھا۔　　(الفرقان)

جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب

اسلامی زندگی اور نظام شرعی کا قیام

(۲)

جماعتی زندگی کی تشکیل یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اس جماعتی زندگی کی تشکیل کس طرح ہوگی۔ اسے سمجھنے کے لیے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مشہور قول سے رہنمائی ملتی ہے جس میں وہ جماعتی زندگی کے بغیر اسلام کی نفی کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

لا اسلام الا بجماعة ولا جماعة الا بامارة ولا امارة الا بطاعة۔

یعنی جماعتی زندگی کے بغیر اسلام کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور جماعت کی تشکیل اسی صورت میں ممکن ہے جب افراد کسی امیر کو مرکز بنا کر اس کے گرد جمع ہو جائیں اور امارت کے فوائد اسی وقت ظاہر ہوں گے جب لوگ طاعت اور فرمانبرداری کریں۔

پس معلوم ہوا کہ اسلامی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان جماعت بن کر رہیں۔ ان کا امیر ہو جسے ان کی پوری زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل ہو اور مسلمان ہر مطابق شرع حکم میں اس کی اطاعت و فرمانبرداری کریں۔

امیر کی اطاعت کیوں اور کب تک؟ واضح رہے کہ امیر کی اطاعت اس کی ذاتی شخصیت کی وجہ سے نہیں کی جائے گی بلکہ اس کی اطاعت محض اس لیے کی جائے گی کہ وہ ہماری دینی زندگی کا ایسا مرکز و محور ہے جو ہمیں اللہ کی اطاعت اور رسول کی شریعت کے مطابق متحرک رکھتا ہے۔ پس امیر کی اطاعت درحقیقت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ اسی لیے جس لمحہ امیر اللہ کی رضا اور اس کے رسول کی شریعت کے خلاف معصیت کا حکم دے اس میں اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی ٹھیک جس طرح نماز میں ...... امام کی اتباع مقتدی پر واجب ہے لیکن جس لمحہ امام نماز کے مقررہ ضابطوں کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ وہ مقتدی اس غلطی میں امام کی اتباع نہیں کرتا بلکہ اسے اس

غلطی پر تنبیہ کرتا ہے اور اسے روکتا ہے۔ اسی لیے سیدنا ابو بکر صدیق رضؓ نے خلیفہ ہونے کے بعد فرمایا تھا کہ "اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کر دینا۔"

اس مضمون کو کہ امیر کی اطاعت مسلمانوں پر ضروری ہے اور معصیتِ خالق میں کسی مخلوق کی اطاعت نہ کی جائے۔ قرآن کی آیتوں اور آنحضورؐ کی پاک احادیث میں بار بار بیان کیا گیا ہے۔

قرآن پاک کہتا ہے

"یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم"

یعنی اے مسلمانو! تم اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت کرو نیز اپنے میں سے اولی الامر کی اطاعت کرو۔

بخاری اور مسلم کی روایت ہے۔

السمع والطاعة علی المرء المسلم فی ما احب وکرہ مالم یومر بمعصیة فاذا امر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة

یعنی مسلمان پر سمع و طاعت یعنی امیر کے حکم کو سننا اور ماننا لازم ہے چاہے یہ حکم اس کے جی کے مطابق ہو یا ناگوار۔ ہاں اگر کسی معصیت اور گناہ کا حکم دیا جائے تو اسے نہیں مانا جائے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت امام احمد بن حنبل، ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت ہے:

عن العرباض بن ساریہ قال صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات یوم ثم اقبل علینا بوجھہ فوعظنا موعظة بلیغة ذرفت منھا العیون و وجلت منھا القلوب فقال رجل یا رسول اللہ کان ھذہ موعظة مودع فاوصنا۔ فقال اوصیکم بتقوی اللہ والسمع والطاعة وان کان عبدا حبشیاً فانہ من یعش منکم بعدی فسیری اختلافا کثیراً فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المھدیین تمسکوا بھا وعضوا علیھا بالنواجذ وایاکم و محدثات الامور فان کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار۔

یعنی حضرت عرباض بن ساریہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک بار آنحضورؐ نے نماز پڑھائی اور پھر ہم لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر ایک بلیغ اور مؤثر وعظ فرمایا یہاں تک کہ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں اور دل لرز اٹھے۔ کسی نے کہا یا رسول اللہ! یہ تو وداعی اور رخصتی وعظ معلوم ہوتا ہے بس آپ ہمیں کچھ اور وصیت فرما دیجیے۔ حضورؐ نے فرمایا۔

میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرتے رہنا۔ امیر کا حکم سنتے اور مانتے رہنا، اگرچہ تمہارا

امیر حبشی غلام کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بہت سے اختلاف دیکھیں گے۔ ایسی حالت میں تم کو چاہیے کہ میرے طریقہ اور ہمارے راشد خلفاء کے طریقے کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور دیکھو نئی باتوں سے بچتے رہنا کہ ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں میں کتاب و سنت کی حیثیت

پس مسلمان جو ہر لمحہ رضائے الٰہی کا طلب گار ہے شریعتِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیرو ہے اور ایک مضبوط مرکز یعنی امیر سے اطاعت و تسلیم کے رشتوں میں بندھا ہوا ہے۔ اپنی زندگی کے جملہ معاملات میں احکام خداوندی کو ہی تسلیم کرنے کا پابند ہے۔ اس کے تمام نزاعات کا فیصلہ بس کتاب و سنت سے ہی ہو سکتا ہے اور وہ ہر لمحہ اپنے اوپر اپنی رضا سے اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کو نافذ کرتا ہے۔

قرآن کہتا ہے۔

"فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول"

یعنی اے مسلمانو! اگر کسی معاملہ میں تمہارے درمیان باہم نزاع پیدا ہو تو اللہ اور اس کے رسول کے پاس لے جاؤ۔

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب کبھی مسلمانوں میں کوئی اختلاف یا نزاع پیدا ہو تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ ان جھگڑوں کا فیصلہ دوسروں سے طلب کرنے کے بجائے اللہ اور رسول سے طلب کریں اور دوسری بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ مسلمانوں کے سارے جھگڑوں میں نافذ ہونے والا فیصلہ بس اللہ و رسول کا ہے۔ آج ہمارے درمیان اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سنت موجود ہے۔ پس آج بھی ہمارے سارے نزاعات میں کتاب و سنت کا فیصلہ ہی واجب التسلیم ہے کتاب و سنت سے فیصلہ طلب کرنا اور اس موقع پر یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ کتاب و سنت کے اسی پر عمل کرنا تقاضۂ ایمانی ہے فیصلوں کا ہی واجب التسلیم ہونا اور مسلمان کی زندگی میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کا ہی نافذ ہونا حکومت و طاقت پر موقوف نہیں بلکہ ہر مسلمان جب کلمہ پڑھ لیتا ہے اور اس یقین کا اظہار کر دیتا ہے کہ وہ بس خدا ہی کا بندہ ہے اسی کی خوشی چاہتا ہے اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ اللہ کی رضا کو جان سکتا ہے اور اللہ کی اطاعت

اور رسول کی اطاعت اس پر واجب ہے۔ اس عقیدہ اور یقین کے بعد خدا اور رسول کے احکام کو وہ اپنے اوپر نافذ کرنے میں کسی بیرونی دباؤ کی ضرورت محسوس کرے گا۔ اس کا اندرونی ایمان اور آخرت کی فکر مجبور کرے گی کہ وہ اللہ کے احکام پر عمل کرے۔ اگر کوئی خارجی رکاوٹ اسے اللہ کے حکم پر عمل کرنے سے روکے گی تو وہ ان موانع کو اپنے بس بھر دور کرنے کی کوشش کرتا رہے گا اور جن احکام پر اس کے لیے عمل کرنا ممکن ہوگا اسے وہ پوری مستعدی کے ساتھ کرتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں یہ کہا ہے کہ "مسلمانو! اگر تم کسی معاملہ میں جھگڑو تو اللہ اور رسول کے پاس لے جاؤ۔" وہاں یہ کہہ کر اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ "۔ اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر یقین رکھتے ہو۔ اس بات کی طرف بھی اشارہ کردیا کہ تمہارے ایمان و یقین کا تقاضہ ہے کہ تم کتاب و سنت کو ہی معمول بناؤ اور اپنی زندگی پر رسول کی شریعت کو نافذ کرو۔ احکام الٰہی کی یہ تنفیذ تمہارے داخلی داعیہ (یقین) کی وجہ سے ہونی چاہیے نہ کہ خارجی دباؤ (حکومت) کی وجہ سے۔

اللہ کے فیصلہ پر ہی عمل کرنا نتیجہ کے اعتبار سے بہتر ہے

اور آگے قرآن نے نفس کی اس مکاری پر بھی تنبیہ کردیا کہ وہ ایسے موقع پر انسان کو سبز باغ دکھاتا ہے کہ تمہارا غیر اللہ سے فیصلہ کرالینا شریعت سے ہٹ کر معاملات کو طے کرلینا زیادہ مفید ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ نہیں یہ جو تمہارا نفس تمہیں نمائشی فائدے دکھا رہا ہے اور ظاہری فوائد کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ یہ دھوکہ اور سراب ہے۔ اصل بھلائی اور مآل و نتیجہ کے اعتبار سے فائدہ اسی میں ہے کہ اپنے تقاضۂ ایمانی کے مطابق احکام الٰہی اور شریعتِ محمدیؐ پر عمل کرو۔ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۔

شریعت محمدی کے فیصلہ کو دل سے تسلیم کرنا تقاضۂ ایمانی ہے

یعنی یہی (کتاب و سنت سے فیصلہ کرانا اور اس پر عمل کرنا) بہتر ہے اور مآل و نتیجہ کے اعتبار سے اچھا ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضورؐ کے احکام کو بلا چون و چرا تسلیم کرنا اور ان پر اپنے دل کو راضی پانا ایمان کا تقاضہ ہے اور جو لوگ رسول کے فیصلہ کو چھوڑ کر دوسروں سے فیصلہ کراتے ہیں یا رسول کے فیصلہ پر دل کو راضی نہیں پاتے ہیں اور اس کی خاطر تنگی محسوس کرتے ہیں یہ بات ایمان کے خلاف ہے۔

قرآن کہتا ہے۔

" فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ

حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ؕ"

تیرے رب کی قسم، یہ مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک تم کو اپنے جھگڑوں میں حکم نہ بنالیں، پھر اپنے دلوں میں تیرے فیصلہ سے کوئی تنگی نہ پائیں بلکہ دل سے اسے تسلیم کرلیں۔

اور قرآن کی اگلی آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر اللہ کی طرف سے اپنے کو قتل کرلینے اور اپنے کو بے وطن کرلینے کا بھی فیصلہ ہے جو انتہائی تکلیف دہ ہے۔ جب بھی ایک مسلمان کی شان یہی ہے کہ اسے کر گزرے اور یہی طریق کار بہتر اور ثابت قدمی کا موجب ہے اور ایسے لوگ جو تسلیم و اطاعت میں اتنے آگے بڑھے ہوئے ہیں کہ اللہ کے فیصلہ پر قتل اور بے وطنی کو بھی برداشت کرنے کو تیار ہیں خدا کے خصوصی انعام اور فضل کے مستحق ہیں۔

ولو انا كتبنا عليهم ان اقتلوا انفسكم او اخرجوا من دياركم ما فعلوه الا قليل منهم ولو انهم فعلوا ما يوعظون به لكان خيرا لهم واشد تثبيتا و اذا لآتينهم من لدنا اجرا عظيما ولهديناهم صراطا مستقيما ومن يطع الله والرسول فاولئك مع الذين انعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء و الصالحين وحسن اولئك رفيقا ذلك الفضل من الله وكفى بالله عليما۔ (نساء)

اور اگر ہم ان پر فرض کر دیتے کہ اپنے کو قتل کر دو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو کم ہی لوگ اس پر عمل کرتے اور اگر وہ اس پر عمل کر لیتے جس کا انھیں حکم دیا جائے تو ان کے لیے بہتر ہوتا اور زیادہ ثابت قدمی پیدا ہوتی۔ اور ایسی صورت میں ہم ان کو اپنی طرف سے بڑا اجر دیتے اور ان کو سیدھی راہ دکھاتے اور جو اللہ کی اور رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ ان انبیاء، صدیقین شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے احسان کیا ہے اور یہ بہترین ساتھی ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ خوب جاننے والا ہے۔

قرآن نے ایسے لوگوں کو جو اپنے ظاہری اور محدود نفع کی خاطر غیر اللہ کی فیصلہ پر عمل کرتے ہیں اور غیروں سے فیصلے طلب کرتے ہیں، منافق قرار دیا ہے اور قرآن یہ کہتا ہے کہ کتاب اللہ پر ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ فیصلہ رسالت پر عمل کریں۔ لیکن یہ شیطان کی راہ پر چل کر غیر اللہ سے فیصلہ

طلب کرتے ہیں اور گمراہ ہوتے ہیں اور جب ان کو احکام الٰہی پر عمل کرنے کی دعوت دی جاتی ہے تو منھ بناتے ہیں اور جب اپنے اعمال بد کے نتیجہ میں کسی مصیبت کا شکار ہوتے ہیں تو تاویلات کرتے ہوئے سامنے آتے ہیں۔

"الم تر الی الذین یزعمون انھم اٰمنوا بما انزل الیک ۔۔۔۔۔۔ ویرید الشیطان ان یضلھم ضلالاً بعیداً واذا قیل لھم تعالوا الی ما انزل اللہ والی الرسول رأیت المنافقین یصدون عنک صدوداً فکیف اذا اصابتھم بما قدمت ایدیھم ثم جاؤک یحلفون باللہ ان اردنا الا احساناً وتوفیقاً" (نساء)

یعنی کیا آپ ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جو سمجھتے ہیں تجھ پر اترنے والی کتاب اور تجھ سے پہلے والے انبیاء کی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ پھر بھی چاہتے ہیں کہ غیر اللہ سے معاملات کا فیصلہ کرائیں حالانکہ ان کو اس سے انکار کرنے کا حکم دیا ہے اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو گمراہ کر دے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کے پاس تو آپ دیکھیں گے۔ منافقین کو آپ سے منھ پھیرتے ہیں۔ پس کیا ہوگا جبکہ ان پر ان کے اعمال کی وجہ سے مصیبت آتی ہے تو پھر آتے ہیں وہ آپ کے پاس۔ اللہ کی قسم کھاتے ہوئے کہ ہمارا مقصد تو بس میل ملاپ تھا۔

شریعت کا فیصلہ حاصل کرنے کے لیے قیام قضا ضروری ہے

مذکورۃ الصدر تفصیل کی روشنی میں جب یہ امر واضح ہو گیا کہ ہم بحیثیت مسلمان اللہ کی رضا کے طالب ہیں۔ ہمارے لیے بس قرآن و سنت دستور العمل ہے۔ ہم ایک جماعت ہیں بھیڑ نہیں اور جب تک امیر حق پر قائم رہے اس کی اطاعت میں اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ ہمارے نزاعات کو اللہ و رسول کی عدالت میں پیش ہونا چاہیے اور اس عدالت کا ہر فیصلہ ہمیں دل کی گہرائیوں سے قبول کرنا چاہیے۔ پس مسلمانوں کو اس کا موقع دینے کے لیے کہ وہ اپنے جملہ نزاعات میں شرع محمدی کا فیصلہ حاصل کر سکیں۔ امیر پر ضروری ہے کہ وہ قاضی مقرر کرے اسی لیے سیدنا عمر بن خطابؓ نے قضاء کو فریضۂ محکمہ قرار دیا ہے اس لیے نصب امیر، قضاء کا قیام شرعی عدالتوں کے سامنے اپنے مقدمات پیش کر کے شرعی فیصلہ حاصل کرنا اور ان کو دل و جان سے تسلیم کرنا ہمارا دینی اور اسلامی فریضہ ہے۔

قاضی فیصلہ میں کتاب و سنت کا پابند ہوگا

مذکورۃ الصدر تفصیل سے ہی یہ بات سمجھ میں آگئی کہ قاضی اپنے تمام فیصلوں میں کتاب و سنت کے پابند ہوں گے اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہیں کریں گے. قرآن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیہ من الکتاب و مھیمنا علیہ فاحکم بینھم بما انزل اللہ ولا تتبع اھواءھم عما جاءک من الحق. لکل جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجا۔ (مائدہ)

اور اتاری گئی آپ کے پاس کتاب حق کے ساتھ جو آپ سے پہلے کی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اس کی محافظ ہے پس ان کے درمیان اللہ کی کتاب کی روشنی میں فیصلہ کیجیے، اور حق سے الگ ہوکر ان کی خواہشات کے مطابق فیصلہ نہ کیجیے۔

قاضی کا فیصلہ اللہ و رسول کے فیصلہ کے قائم مقام ہوگا

اور جب قاضی کتاب و سنت کی روشنی میں پوری ایمانداری کے ساتھ فیصلہ کرے گا تو اس کا فیصلہ فیصلہ رسالت کا قائم مقام ہوگا اور قرآن کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ جان لینے کے بعد اس سے فرار و اختلاف جہنم کا موجب ہے۔

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدیٰ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نولہ ما تولیٰ ونصلہ جھنم وساءت مصیرا (نساء)

جو شخص ہدایت کے واضح ہونے کے بعد رسولؐ سے اختلاف کرتا ہے اور ان کا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے تو ہم اس پر اس کی اختیار کردہ راہ مسلط کر دیتے ہیں اور اسے جہنم میں ڈالتے ہیں اور یہ بدترین ٹھکانہ ہے۔

قاضی ظاہری حالات پر فیصلہ کرے گا

قرآن کی اس ہدایت کے بعد قاضی کے فیصلہ سے گریز کی کیا راہ رہ جاتی ہے؟ اس موقع پر یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ قاضی ظاہری حالت اور شہادت و ثبوت کی روشنی میں فیصلہ کرتا ہے۔ پس جو لوگ غلط بیانات دیکر اور جھوٹی شہادت دیکر اپنے موافق فیصلہ کراتے ہیں وہ اپنے لیے جہنم خریدتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے۔

"ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بھا الی الحکام لتاکلوا فریقا

من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون۔ (البقرہ)

یعنی تم ایک دوسرے کا مال حرام طریقہ پر مت کھاؤ اور ایسا مت کرو کہ تم مال دیکر یا دوسرے غلط طریقے اختیار کرکے حکام سے اپنے موافق فیصلے حاصل کرو اور لوگوں کا مال گناہ کے ساتھ کھاؤ حالانکہ تم اس کی حرمت کو جانتے ہو۔

اور آنحضورؐ نے فرمایا!

"انما انا بشر وانتم تختصمون الیّ ولعل بعضکم الحن بحجتہ من بعض فاقضی لہ علی نحو ما اسمع منہ فمن قضیت لہ بشئ من حق اخیہ فانما اقضی لہ بقطعۃ من النار"

یعنی میں آدمی ہوں۔ تم میرے پاس مقدمہ لاتے ہو۔ شاید تم میں سے کوئی اپنی بحث میں دوسرے سے بڑھ کر ہو۔ پس میں تو بیان اور شہادتوں کی بنیاد پر فیصلہ کر دیتا ہوں پس تم میں سے جو میرے فیصلہ کے ذریعہ اپنے بھائی کا حق پالیتا ہے۔ وہ درحقیقت "آگ کا ٹکڑا" حاصل کرتا ہے۔

پس قرآن وسنت کی روشنی میں آج ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اللہ کی مرضی پر چلیں۔ امیر کی اطاعت کریں۔ اپنی رضا سے اپنے اوپر اللہ کے فیصلے نافذ کریں۔ شرعی عدالت سے اپنے نزاعات اور معاملات کا فیصلہ کرائیں اور اس فیصلہ کو پوری طرح دل سے تسلیم کریں۔

میں دعاء کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ہمیں اور آپ کو حق وصداقت پر استقامت اور ایمان ویقین کے تقاضوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

محمد منظور نعمانی

تحدیثِ نعمت

کیا دیکھا، کیا پایا

(۶)

حکیم الامت حضرت تھانویؒ (۳)

(اس سلسلہ کی اس سے پہلی قسط میں حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں ۳۹ھ کی حاضری کا وہ غیر معمولی واقعہ تفصیل سے ذکر کیا جاچکا ہے جو بہت سوں کے لیے موجب حیرت ہوا ہوگا، اور اسی کے ضمن میں یہ بات بھی ذکر کی جاچکی ہے کہ اسی وقت سے ملک میں مسلم لیگ کا زور عوامی پیمانہ پر شروع ہوا اس سے پہلے مسلم عوام سے اُس کا کوئی رابطہ اور تعلق نہیں تھا۔

جیسا کہ معلوم ہے حضرت تھانویؒ نے ہمارے دوسرے اکثر اکابر کے طرزِ عمل کے برخلاف اپنے کو سیاسی تحریکات سے ہمیشہ الگ رکھا تھا اور اپنے لیے اس کو بہتر سمجھا تھا۔ اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ حضرت کا ذہن اور ذوق جمعیۃ العلماء کے سیاسی مسلک سے مختلف اور مسلم لیگ کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل سے قریب تھا اور ۱۹۳۷ء کے بعد یہ قرب جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے، بڑھتا ہی گیا۔

اسی زمانہ میں (یعنی سنہ ۱۹۳۷ء و سنہ ۱۹۳۸ء میں) یہ ہوا کہ کانگرسی حکومتوں کے بعض معاملات اور کارروائیوں پر مسلمانوں کے تعلق سے "الفرقان" میں سخت تنقیدیں کی گئیں۔ اسی کے ساتھ جمیعۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے بعض ایسے حضرات کے رویے (جن کو ہم لوگ اُس زمانہ میں جمعیتہ کا "بایاں بازو" اور "فارورڈ بلاک" کہا کرتے تھے) کھل کر اختلاف کا اظہار کیا گیا ــــ الفرقان کے ان مضامین کو مسلم لیگ کے حامی بعض اخبارات نے بھی نقل کیا۔ غالباً ان باتوں کی وجہ سے بعض حضرات نے یہ خیال کر لیا کہ راقم سطور مسلم لیگ سے قریب ہو رہا ہے ــــ اُس وقت کے اس ماحول اور اس صورتحال کو ذہن میں رکھکر مندرجہ ذیل واقعہ پڑھیے۔

ــــ سنہ اور مہینہ ٹھیک یاد نہیں، غالباً سنہ ۱۹۳۸ء کے اواخر یا سنہ ۱۹۳۹ء کے اوائل کی بات ہے، راقم سطور بریلی رہتا تھا، الفرقان وہیں سے نکلتا تھا، ایک دن حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا تار ملا جس کا مضمون یہ تھا کہ "ایک مشورہ کے لیے تمہاری ضرورت ہے"۔ ــــ میں غالباً اسی دن تھانہ بھون کے لیے روانہ ہو گیا۔ حضرت سے ملاقات ہوئی، حسب معمول سلام و مصافحہ ہوا، اسی وقت فرمایا کہ ایک معاملہ میں بات کرنے کی ضرورت تھی اس لیے میں نے آپ کو تکلیف دی ہے، لیکن وہ بات آپ سے مولوی ظفر کریں گے، وہ میری ہی بات ہو گی، یہ میں نے اس لیے مناسب سمجھا ہے کہ آپ زیادہ آزادی اور بے تکلفی سے بات کر سکیں ــــ مولانا ظفر احمد صاحب بھی اس وقت تشریف رکھتے تھے۔ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت ان کو اجازت دیدیں یہ رات کا کھانا میرے یہاں کھا لیں اور وہیں رات کو آرام کریں، اس طرح باتیں زیادہ اطمینان سے ہو سکیں گی ــــ یہی طے ہو گیا ــــ کھانے سے اور عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر وہ گفتگو ہوئی۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے فرمایا کہ ابھی چند روز پہلے نواب اسمٰعیل خاں[1] اور کنور جمشید علیخاں یہاں آئے تھے، انھوں نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ جمیعۃ العلماء اور خاص کر مولانا حسین احمد صاحب اپنی پوری طاقت کے ساتھ کانگرس کے ساتھ ہیں اور مسلمانوں کو اس کی حمایت کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس کا

---

[1] نواب اسمٰعیل خاں مرحوم (میرٹھی) اُس وقت ہمارے صوبہ یوپی کی مسلم لیگ کے صدر اور مسلم لیگ کی اہم شخصیتوں میں سے تھے اور مسلّم طور پر مسلمانوں کے صاحب کردار لیڈر تھے ــــ کنور جمشید علی خاں مرحوم (باغپت) بھی یوپی مسلم (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

مسلمانوں پر بہت اثر پڑ رہا ہے اور یہ سمجھا جا رہا ہے کہ ہمارے تمام علماء کرام کی رائے یہی ہے اس کی وجہ سے مسلم لیگ کے کام میں بہت رکاوٹ پڑ رہی ہے، ہم یہ درخواست لے کر حاضر ہوئے ہیں کہ حضرت کی طرف سے بھی مسلم لیگ کی کھلی تائید اور حمایت ہو، اس کے لیے حضرت ایک بیان تحریر فرما دیں اور ہم کو اس کی اشاعت کی اجازت دیدیں" ـــــــ حضرت نے فرمایا کہ "اگرچہ مجھے مسلم لیگ سے اور آپ حضرات سے ہمدردی ہے لیکن جس طرح کی تائید آپ چاہتے ہیں اس کے لیے جیسا اطمینانِ قلب ہونا چاہیے وہ مجھے نہیں ہے اس لیے اس سے معذور ہوں" ـــــ ان دونوں حضرات نے عرض کیا کہ حضرت کے اطمینان کے لیے جو شرط ہو ہم اس کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے" ـــــ حضرت نے مسلم لیگ کے نظام اور فیصلوں کے طریقہ کار کے بارہ میں ان سے دریافت کیا تو انھوں نے بتلایا کہ فیصلوں کا زیادہ تر دارومدار ورکنگ کمیٹی پر ہوتا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ اگر آپ حضرات یہ طے کر لیں کہ ورکنگ کمیٹی میں ایک آدمی وہ ہو گا جس کو میں منتخب کروں گا اور دینی معاملات میں اسی کی رائے کو فیصلہ کن سمجھا جائے گا تو میں اس طرح کی تائید کر سکوں گا جس طرح کی آپ چاہتے ہیں ـــــ (مولانا ظفر احمد صاحب نے بیان فرمایا کہ) اس بارہ میں دیر تک گفتگو رہی آخر میں انھوں نے عرض کیا کہ اس کا قطعی جواب چند روز کے بعد ہم دے سکیں گے ـــــ چند دن کے بعد وہ پھر (تھانہ بھون) آئے اور عرض کیا کہ حضرت کی شرط مان لی گئی ہے البتہ یہ گزارش ہے کہ جن صاحب کو حضرت نامزد فرمائیں وہ سیاسی مسائل و معاملات اور ہماری مشکلات سے واقف ہوں ـــــ حضرت نے فرمایا میں اس بات کا پورا لحاظ رکھوں گا اور اب غور کر کے نام کے بارے میں اطلاع دوں گا۔"

مولانا ظفر احمد صاحب نے یہ واقعہ سنانے کے بعد مجھے بتلایا کہ اس کے بعد حضرت نے ہم لوگوں سے مشورہ فرمایا، متعدد حضرات کے نام سامنے آئے لیکن کسی کے بارہ میں فیصلہ نہیں ہو سکا، آخر میں خود حضرت نے تمہارا نام لیا تو سب نے اطمینان ظاہر کیا اور یہی طے ہو گیا ـــــ حضرت نے تم کو تار دے کر اسی لیے بلوایا ہے کہ تمہاری منظوری کے بعد تمہارا نام وہاں بھیجدیا جائے۔"

(حاشیہ پچھلے صفحہ سے بقیہ) لیگ کی نمایاں شخصیتوں میں سے تھے، حضرت حکیم الامتؒ سے عقیدت کا خاص تعلق تھا اور آمد و رفت بھی رکھتے تھے۔

مولانا ظفر احمد صاحب کے اس بیان سے اپنے بارے میں حضرت حکیم الامت کا اس درجہ حُسنِ ظن اور اعتماد معلوم کرکے مجھے قدرتی طور پر بیحد خوشی ہوئی۔ اسی کے ساتھ انتہائی حیرت بھی ہوئی کہ میرے بارہ میں ایسی غلط فہمی کیوں ہوئی، میں اُس وقت جمعیۃ العلماء سے باضابطہ وابستہ تھا اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اسی کے سیاسی مسلک کو اصولی اور بنیادی طور پر صحیح سمجھتا تھا اگرچہ بعض معاملات میں میری مستقل ذاتی رائے تھی۔

میں نے مولانا ظفر احمد صاحب سے عرض کیا کہ میرے بارہ میں حضرت کو اور آپ حضرات کو غالباً غلط فہمی ہوئی ہے، میں تو مسلم لیگ کے راستہ کو اصولی طور پر صحیح نہیں سمجھتا، اس لیے جو کچھ آپ حضرات نے سوچا ہے اُس کا تو کوئی امکان ہی نہیں ہے، میں تعمیل نہیں کرسکوں گا اس کے علاوہ میں عرض کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں کوئی بھی سیاسی یا قومی جماعت کسی ایک آدمی کو اور وہ بھی مجھ جیسے ایک غریب مولوی کو ایسا اختیار اور بالاتر مقام ہرگز نہیں دے سکتی، مجھے تو شبہ ہے کہ شاید اس بارہ میں بھی کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ مسٹر جناح نے اس کے لیے رضامندی دیدی ہو، اور مسلم لیگ میں اصل شخصیت اُن ہی کی ہے۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے مجھے سمجھانے کی اور اپنی بات منوانے کی کوشش فرمائی لیکن میں اپنی رائے اور موقف پر قائم رہا ـــــ اس گفتگو کا سلسلہ دیر رات تک جاری رہا تھا۔ آخر میں مولانا نے فرمایا کہ اس وقت کے اپنے جواب کو آخری جواب قرار مت دو۔ آج رات کو استخارہ بھی کرو اور آخری جواب مجھے صبح دو! ـــــ میں نے عرض کیا کہ استخارہ تو وہاں ہوتا ہے جہاں کسی معاملہ میں تردد اور تذبذب ہو لیکن جس معاملہ میں قطعیت کے ساتھ ایک رائے قائم ہو وہاں استخارہ کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی ـــــ لیکن مولانا نے اس کے بعد بھی استخارہ کیلئے فرمایا۔ اب مجھے یاد نہیں کہ میں نے استخارہ کیا یا نہیں، صبح کو مولانا نے دریافت فرمایا تو میں نے عرض کیا کہ جواب وہی ہے جو رات عرض کرچکا ہوں۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے میری اور اپنی گفتگو کا ذکر حضرت حکیم الامتؒ سے کردیا ہوگا خود حضرت نے اس سلسلہ میں مجھ سے کوئی بات نہیں فرمائی ـــــ غالباً صرف اس لیے کہ میرے دل پر کوئی بوجھ نہ پڑے۔ مجھے اس کا بڑا قلق رہا کہ حضرت ... نے جس مقصد سے مجھے تا دیکھ

طلب فرمایا تھا وہ میرے ذریعہ پورا نہ ہو سکا لیکن دل کو اطمینان رہا کہ میرے اس رویہ سے حضرت کو ذرہ برابر گرانی نہ ہوئی ہو گی بلکہ اس سے خوشی ہوئی ہو گی کہ جس بات کو میں نے صحیح نہیں سمجھا اُس کے قبول کرنے سے معذرت کر دی ــــ پھر مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس مسئلہ کا آخری انجام کیا ہوا، راقم سطور کا یہ خیال ہے کہ پھر اس تجویز پر غالباً عمل ہی نہیں ہوا ــ تاہم جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے، بعد میں حضرت نے اپنے خاص انداز میں شرعی قیود و تحفظات کے ساتھ مسلم لیگ کی کھل کر تائید و حمایت بھی فرمائی ــــ اور ظاہر ہے کہ مسئلہ اجتہادی تھا جس میں غلطی ہونے کی صورت میں بھی ــــ بشرط اخلاص اجر موعود ہے

حضرت حکیم الامتؒ کا مستقل معمول تھا کہ صبح (غالباً ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر) خانقاہ تشریف لے آتے تھے اور دوپہر تک پورے انہماک اور یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تحریر کے کام میں مشغول رہتے، کسی غیر معمولی ضرورت اور خاص استثنا کے بغیر اس وقت میں کسی سے ملاقات بھی نہیں فرماتے تھے، جس رات کو مولانا ظفر احمد صاحب نے اپنے مکان پر مذکورہ بالا گفتگو فرمائی اس کی صبح کو میں خانقاہ کے ایک حجرہ میں تھا ۹ بجے کا وقت ہو گا، حضرت کے ایک خادم حضرت کا یہ پیام لائے کہ حضرت نے ارشاد فرمایا ہے کہ آج میں اس وقت فارغ ہوں اگر جی چاہے تو آجائیں، بحیرت ہوئی اور میں نے اس کو حضرت کی خاص الخاص عنایت ہی سمجھا ــ میں اسی وقت حاضر ہو گیا، جہاں تک یاد ہے اُس وقت کوئی اور صاحب حضرت کے پاس نہیں تھے ــ حضرت نے بغیر کسی تمہید و تقریب کے اور بغیر میرے سوال کے سلوک اور تزکیہ کی ضرورت اور دین میں اس کی اہمیت پر ایک تقریر شروع فرمائی یہ تقریر تسلسل کے ساتھ کم از کم ایک گھنٹہ سے زیادہ جاری رہی ــ اگر وہ قلمبند کی گئی ہوتی تو اس موضوع پر ایک کافی شافی تصنیف ہو جاتی، میں خاموشی اور توجہ سے صرف سنتا رہا۔

یہاں میں اپنا یہ حال بھی ظاہر کر دوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ میں سلوک و تصوف سے ذہنی طور پر کچھ دور ہو گیا تھا اور میرے اندر اُس کی کوئی طلب بھی نہیں تھی اور غالباً طلب کے اس فقدان ہی کا نتیجہ تھا کہ حضرت حکیم الامت کی اُس نہایت مبسوط اور مدلل تقریر کا بھی مجھ پر وہ اثر نہیں ہوا جو ہونا چاہیے تھا اور وہ فائدہ اُس سے میں نے اس وقت نہیں اٹھایا جو اٹھانا چاہیے تھا

بلاشبہ یہ بڑی محرومی تھی — لیکن اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا اور رائے پور کی خانقاہ میں وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر اب سے ۲۲-۲۳ سال پہلے "الفرقان" میں کیا جا چکا ہے ؎ اور اس ذہنی بیماری سے نجات مل گئی — فللہ الحمد والمنۃ۔

؎ "الفرقان" کا وہ مضمون جس میں رائے پور کی خانقاہ کا وہ واقعہ ذکر کیا گیا تھا، راقم سطور کے مرتب کیے ہوئے ایک رسالے "تصوف کیا ہے" میں بھی شامل کر دیا گیا تھا۔ یہ رسالہ اب سے قریباً ۲۰ سال پہلے شائع ہوا تھا اور اس کے بعد سے نایاب تھا۔ اس وقت وہ پھر طباعت کے لیے پریس میں گیا ہوا ہے۔

بقیہ صفحہ ۱۲ — بلکہ اللہ ہی کے اختیار میں ہوتی ہے، قرآن پاک میں جا بجا بیان فرمایا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے منکرین نے اُن سے جب معجزہ دکھانے کا مطالبہ کیا تو انھوں نے یہی جواب دیا کہ معجزات ہمارے اختیار کی چیز نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے انما الآیات عند اللہ — بہرحال معراج کا واقعہ بھی ایک عظیم معجزہ تھا اور جو کچھ ہوا براہ راست اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہوا اس لیے اس طرح کے سوال اور اشکال کی گنجائش ہی نہیں

جن امتوں اور گروہوں نے اس بات کو ذہن میں نہیں رکھا اور معجزوں اور کرامتوں کو خود نبیوں اور ولیوں کا فعل اور تصرف سمجھا وہ شرک میں مبتلا ہو گئیں، عیسائیوں میں بھی شرک یہیں سے آیا — افسوس ہے کہ بہت سے مسلمان کہلانے والے بھی اس معاملہ میں گمراہ ہوئے — اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہم کو اور آپ کو اس سے محفوظ رکھا ہے۔ اللّٰھم لک الحمد ولک الشکر۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اس سورت کی صرف پہلی آیت میں اسراء اور معراج کا بیان ہے اس کے آگے دوسرا مضمون شروع ہے۔ (باقی)

Regd. No. L-353

Monthly AL FURQAN

Kutchery Road, Lucknow U. P.

VOL. 41 NO. 10

NOVEMBER, 73

Phone No. 25547

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow-1

الفرقان
لکھنؤ
مدیر مسئول
محمد منظور نعمانی

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
ایک پونڈ
ہوائی ڈاک سے لیے مزید بحصول
ڈاک کا اضافہ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۱۰/-
بنگلہ دیش سے ۱۱/-
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت
فی پرچہ ...... ایک روپیہ ۱/

جلد ۴۱	بابت ماہ ذی القعدہ ۱۳۹۳ھ مطابق دسمبر ۱۹۷۳ء	شمارہ ۱۱

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ دسمبر تک آجائے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہئے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

نگاہِ اولیں

محمد منظور نعمانی

"الفرقان" کی عمر کا یہ اکتالیسواں سال ہے جو اب قریب الختم ہے، صرف ایک مہینہ ذی الحجہ کا باقی ہے۔ اب سے قریباً ایک سال پہلے جب اس کی عمر کے چالیس سال پورے ہوئے تھے تو اس اکتالیسویں جلد کے پہلے شمارہ کے افتتاحیہ میں، اللہ تعالیٰ کے اس عظیم انعام واحسان پر اسی سے ادائے شکر اور مستقبل میں صلاحِ عمل کی توفیق مانگنے کے ساتھ افتتاحیہ نگار مولوی عتیق الرحمن سلمہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی لکھا تھا ——— کہ

"اس چالیس سال میں کتنے ہی مضامین ومقالات "الفرقان" میں ایسے نکل چکے ہیں جن میں دینی اور فکری رہنمائی کا بڑا سامان ہے اور کچھ ایسے جن کی تاریخی اہمیت ہو، خود ناظرین الفرقان میں بھی اب غالباً زیادہ تر وہ لوگ ہیں جن کی نظر سے یہ نہیں گزرے، دوسروں کا تو سوال ہی کیا، اس لیے جی چاہتا ہے کہ ایسے مضامین کا ایک مجموعہ الفرقان کے خاص نمبر کی شکل میں شائع کر دیا جائے، الفرقان کے موجودہ حالات میں، اگرچہ یہ ایک مشکل کام ہو کیونکہ یہ بہت ضخیم نمبر ہوگا، لیکن ارادہ ہو کہ انشاء اللہ یہ کام اسی سال کے اندر کیا جائے۔"

لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ اپنی صحت کی مسلسل خرابی کی وجہ سے مولوی عتیق الرحمن اس کام کو شروع بھی نہیں کر سکے۔ اب بنام خدا اس عاجز نے پچھلی جلدوں کے مضامین ومقالات کے انتخاب کا کام شروع کر دیا ہے، آج یکم دسمبر ہے، ابتک شروع کے ۸ سال کے شماروں پر نظر ڈالی جا چکی ہے اور ان ۸ جلدوں سے انتخاب کا کام کر لیا گیا ہے، اس مقصد سے پچھلی جلدوں کا جو مطالعہ کیا گیا تو یہ بات سامنے آئی کہ بہت سے مضامین ومقالات جو ان پرانی جلدوں میں گویا دفن تھے ان کی مکرر اشاعت کا انتظام ضروری تھا، اللہ تعالیٰ کا کرم واحسان ہے کہ اس نے دل میں یہ

داعیہ پیدا کیا اور اس کام کا ارادہ کرلیا گیا، اللہ تعالیٰ ہی تکمیل و اتمام تک پہونچائے۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ ۹ دسمبر سے مکہ مکرمہ میں "رابطۂ عالم اسلامی" کا اجلاس شروع ہے اس میں شرکت کے لیے ۸ دسمبر کو لکھنؤ سے روانگی کا پروگرام بن چکا ہے، واپسی انشاء اللہ حج کے بعد ہی ہو سکے گی، اس وجہ سے ذی الحجہ کا شمارہ بھی بظاہر آخر ذی الحجہ میں تیار ہو سکے گا جو اس اکتالیسویں جلد کا آخری شمارہ ہوگا ۔۔۔ ارادہ یہ ہے کہ اس کے بعد جس قدر کم وقت میں ممکن ہو وہ نمبر شائع ہو جائے، مگر اس وقت صورت یہ ہے کہ اسی مہینے سے اس کاغذ کی قیمت میں جو "الفرقان" میں اور اکثر رسالوں اور اخباروں میں استعمال ہوتا ہے سرکاری طور پر غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے، جو کاغذ پچھلے کچھ دنوں پہلے قریباً ۱۶-۱۷ روپے فی رم ملا کرتا تھا معلوم ہوا ہے کہ اس کی قیمت اب ۲۴ روپے ہو گئی ہے اور اس اضافہ شدہ قیمت پر بھی ضرورت بھر کاغذ بہت مشکل سے دستیاب ہوتا ہے، الفرقان کی زیر تجویز خاص اشاعت کے لیے کاغذ کی بہت بڑی مقدار درکار ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہی راستہ کی مشکلات کو آسان فرمائے۔ امید یہ ہے کہ بہت دلچسپ اور بہت قیمتی اور مفید یہ مجموعہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ اُن مخلص و محسن دوستوں کو دنیا اور آخرت میں بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے جنھوں نے الفرقان کو دینی خدمت کا ایک مفید سلسلہ سمجھ کر اس کی زندگی اور بقاء کے لیے جدید خریدار فراہم کرنے کی کوشش فرمائی ۔۔۔ جن حضرات کی طرف سے یہ عملی تعاون ملا ہے اُن کی مجموعی تعداد ۳۰-۴۰ سے زیادہ نہ ہوگی اور ان کی کوششوں سے جو جدید خریدار فراہم ہوئے ہیں اُن کی تعداد ابھی سو تک بھی نہیں پہونچی ہے ۔۔۔ یہ اُس سے بہت کم بلکہ بیحد کم ہے جس کی توقع الفرقان کے ناظرین و محبین سے قائم کی گئی تھی۔ گزشتہ شمارہ میں بھی عرض کیا گیا تھا اور اب پھر گزارش ہے کہ اس سلسلہ میں جن دوستوں کا ارادہ کچھ کوشش کرنے کا ہے وہ جلدی ہی زیادہ سے زیادہ اس مہینے دسمبر کے آخر تک کرلیں، اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو بارآور اور قبول فرمائے۔

<u>تحدیث نعمت</u>:- صفحات میں گنجائش نہ ملنے کی وجہ سے اس شمارہ میں تحدیث نعمت کی قسط شامل نہیں ہو سکی یہ سلسلہ انشاء اللہ کافی عرصہ تک جاری رہے گا۔

چندہ میں اضافہ

الفرقان کے مالی مسئلہ کو حل کرنے کے سلسلہ میں بہت سے حضرات نے چندہ میں اضافہ کی تجویز پیش کی تھی اور بعض حضرات نے اپنی اس رائے پر اصرار بھی کیا تھا لیکن ادارہ نے اس کو مناسب نہیں سمجھا تھا مگر اب جبکہ اسی مہینے سے کاغذ کی قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے، چندہ میں اضافہ کے بغیر چارہ نہیں رہا، اس لیے دل کی سخت ناگواری کے ساتھ دو روپے کا اضافہ کرنا پڑا ہے، اب اس مہینے سے اس کا چندہ بجائے آٹھ روپے کے دس روپے ہے ـــ اُمید ہے کہ خریدار حضرات اس میں ہم کو معذور تصور کریں گے۔

یہاں یہ بات بھی لائق ذکر اور قابل شکر ہے کہ نئے خریداروں میں سے متعدد حضرات نے از خود چندہ دس روپے ہی بھیجا ہے ـــ

ـــــــ ناظم دفتر الفرقان لکھنؤ
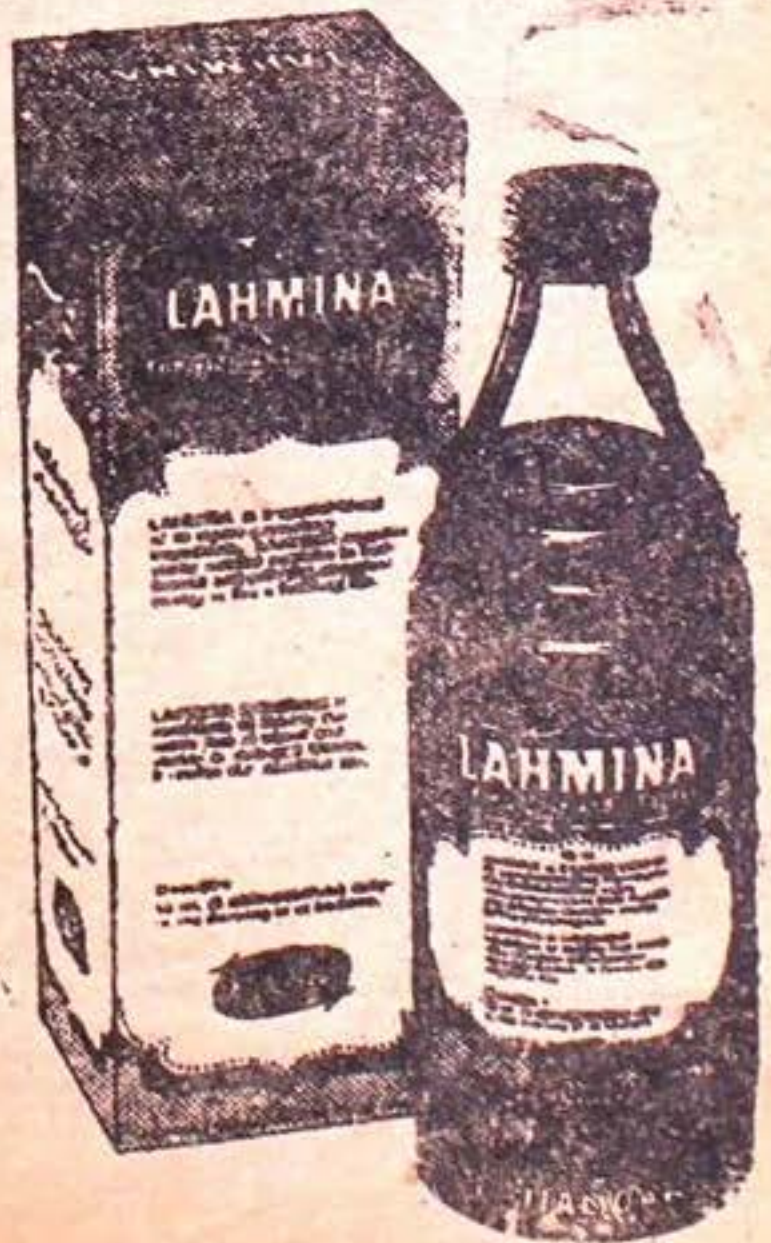
درسِ قرآن ۔۔ محمد منظور نعمانی

مرکزوالی مسجد ، ۱۰ اگست ۷۳ء

اسرا اور معراج
خواب تھا یا عالم بیداری کا واقعہ؟ عقلی اشکالات اور ان کا حل

بنی اسرائیل پر
اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت اور پیشگی آگاہی پھر نافرمانی اور سرکشی پر خداوندی عذاب کا تازیانہ

(۲)

گزشتہ شمارہ میں گنجائش کی کمی کی وجہ سے اس درس کا صرف ابتدائی حصہ دیا جاسکا تھا، ناظرین کرام اس میں سورہ بنی اسرائیل کا پہلا رکوع یعنی ابتدائی آٹھ آیتیں اور اُن کا ترجمہ اور صرف پہلی ایک آیت کی تفسیر و تشریح پڑھ چکے ہیں۔ ـــــ باقی آیات کی تفسیر و تشریح آج ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اسرا اور معراج کے معجزانہ سفر کا ذکر اس سورت کی صرف پہلی ایک آیت میں کیا گیا ہے، آگے دوسری آیت سے دوسرا مضمون شروع ہے جس کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے ـــــ اس مضمون کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کے لیے کتاب ہدایت (یعنی تورات) نازل کی تھی تو جب تک انھوں نے ہماری اس ہدایت کی پیروی کی اور نیکی اور فرمانبرداری کے راستے پر چلتے رہے وہ دُنیا میں بھی عزت اور اقبال کے ساتھ رہے اور جب انھوں نے اطاعت کے بجائے نافرمانی اور بندگی و سرافگندگی کے بجائے سرکشی کا راستہ اختیار کیا تو ان پر اُن کے بدترین دشمنوں کو مسلط کر دیا گیا جنھوں نے ان کو بہت ذلیل و خوار کیا اور

بالکل تباہ و برباد کر ڈالا ـــــ اور یہ ایک دفعہ نہیں بلکہ بار بار ہوا اور اس کے باوجود ہوا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو اس کے بارہ میں اسی کتاب ہدایت میں کھلی آگاہی دی تھی، آخر میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ نافرمانی اور سرکشی کی یہ سزا تو ان کو دنیا میں دی گئی، اور آخرت میں نہ ماننے والوں کے لیے جہنم کا عذاب ہے ـــــ اللہ کی پناہ!

ارشاد فرمایا گیا ہے "وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِبَنِي إِسْرَائِيلَ أَلَّا تَتَّخِذُوا مِنْ دُونِي وَكِيلًا ؕ" یعنی ہم نے اپنے بندے اور پیغمبر موسیٰ کو کتاب یعنی تورات دی تھی اور اس کو ہم نے بنی اسرائیل کے لیے اپنا ہدایت نامہ قرار دیا تھا اور اس میں خاص ہدایت یہ دی گئی تھی کہ میرے سوا کسی کو کارساز نہ ٹھیراؤ، صرف مجھ کو ہی کارساز اور مختار کل مانو اور میرے ہی ساتھ عبادت و بندگی کا وہ معاملہ کرو جو کسی کارساز ہستی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ "أَلَّا تَتَّخِذُوا مِنْ دُونِي وَكِيلًا ؕ" کا یہی مطلب ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے "ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ؕ" ـــــ حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کی قوم کا واقعہ سورۂ ہود میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے، نوح علیہ السلام نے سیکڑوں سال تبلیغ کی اور اس کی کوشش کی کہ ان کی قوم کفر و شرک کا راستہ چھوڑ کے ایمان اور عمل صالح والی زندگی اختیار کرے، لیکن قوم کے بہت بڑے حصہ نے آپ کی بات نہیں مانی، بہت تھوڑے لوگوں نے آپ کی دعوت کو قبول کیا اور ایمان اور عمل صالح کا راستہ اختیار کر لیا، آخری نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہلاکت خیز طوفان کی شکل میں خدا کا عذاب آیا اور وہ سب لوگ ہلاک و برباد کر دیئے گئے جنھوں نے نوح علیہ السلام کی ہدایت کے مقابلہ میں انکار اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا تھا، اور جن تھوڑے سے بندوں نے آپ کی ہدایت کو قبول کیا تھا وہ خدا کے حکم سے نوح علیہ السلام کے ساتھ اُن کی کشتی پر سوار ہو کر اس عذاب سے بچ گئے، انہی میں سے کچھ لوگوں کی نسل سے ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے اور اُن کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام سے بنی اسرائیل کا سلسلہ چلا ـــــ تو اس آیت (ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ) میں اس قدیم تاریخی واقعہ کو یاد دلا کر بنی اسرائیل سے فرمایا گیا ہے کہ تم ہمارے اُن بندوں کی نسل ہو جن کو ہم نے اُن کے ایمان اور اعمال صالحہ کی وجہ سے اپنے پیغمبر نوح کے ساتھ جو ہمارے بڑے شکر گزار بندے تھے، اُن کی

کشتی پر اپنے حکم سے سوار کرا کے طوفان کے عذاب سے بچا لیا تھا، تو اگر اپنے ان آباد و اجداد کی طرح تم نے بھی ہماری نازل کی ہوئی ہدایت کی پیروی کی اور ایمان اور اعمالِ صالحہ والی زندگی اپنائی تو تم پر بھی ہمارا ایسا ہی فضل و کرم ہوگا ـــــ اسی کے ساتھ یہ بھی اشارہ ہو گیا کہ اگر تم نے نہ ماننے کا اور سرکشی کا وہ رویہ اختیار کیا جو قومِ نوح کی اکثریت نے اختیار کیا تھا تو تم بھی خدا کے عذاب اور اس کی مار سے نہ بچ سکو گے، خدا کا قانون بے لاگ ہے، کسی سے اس کی رشتہ داری نہیں ہے

آگے کی آیتوں میں انہی بنی اسرائیل کے بارہ میں جو بیان فرمایا گیا ہے وہ بڑا ہی سبق آموز بلکہ لرزہ خیز ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے سبق لینے کی توفیق دے، جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے دراصل ہماری یعنی اُمتِ محمدیہ کی تنبیہ اور سبق آموزی کے لیے بیان کیا جا رہا ہے ـــــ ارشاد ہے۔ "وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ـــــ الیٰ قولہ تعالیٰ ـــــ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا"

یعنی ہم نے اُس کتاب میں (یعنی تورات میں) بنی اسرائیل کو آگاہی دے دی تھی کہ یہ ہونے والا ہے کہ تم اپنی بد اعمالیوں اور شیطانی حرکتوں سے علاقہ میں دو دفعہ فساد اور خباثت پھیلاؤ گے اور خدا کی بندگی اور فرمانبرداری کا راستہ چھوڑ کے سرکشی کا راستہ اختیار کرو گے ـــــ قرآن پاک میں یہاں صراحت کے ساتھ صرف اتنی ہی آگاہی کا ذکر فرمایا گیا ہے، لیکن جو لوگ قرآنِ مجید کے طرزِ بیان سے کچھ آشنا ہیں وہ سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اسی میں یہ آگاہی بھی مضمر ہے کہ جب تم فساد و بدعملی اور سرکشی کا یہ راستہ اختیار کرو گے تو ہماری طرف سے تم پر عذاب کا تازیانہ پڑے گا ـــــ آگے کی آیتوں میں بنی اسرائیل کے فساد کے ساتھ ان پر خداوندی عذاب کے تازیانوں کے پڑنے کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے اُس سے بھی یہ بات معلوم ہو جاتی ہے فساد اور سرکشی کی آگاہی کے ساتھ خداوندی سزا اور عذاب کی آگاہی بھی دی گئی تھی ـــــ اور كَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ؕ کے الفاظ سے تو یہ بات گویا صراحت ہی کے ساتھ معلوم ہو جاتی ہے۔

یہاں ایک بات یہ بھی قابلِ ذکر اور قابلِ لحاظ ہے کہ بنی اسرائیل کو دی جانے والی جس

آگاہی کا یہاں قرآن پاک میں ذکر کیا گیا ہے وہ صرف ایک "پیشینگوئی" نہیں تھی، بلکہ بنی اسرائیل کے لیے ایک اہم تنبیہ اور آگاہی تھی، اس کو بالکل اسی طرح کی آگاہی سمجھنا چاہیے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام اور امت کو بہت سے فتنوں کے بارے میں حدیثوں میں آگاہی دی ہے ـــــ حدیث کی کتابوں میں ایسی پچاسوں حدیثیں ہیں جن کو محدثین نے اپنی مرتب کی ہوئی کتابوں میں "کتاب الفتن" میں درج کیا ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کا مقصد نجومیوں اور کاہنوں کی طرح صرف پیشینگوئی سنانا ہرگز نہیں تھا، بلکہ امت کو باخبر کرنا تھا، تاکہ ان فتنوں کے ظہور کے وقت یہ حدیثیں امت کی رہنمائی کریں اور اللہ کے باتوفیق بندے ان حدیثوں کی روشنی میں اپنے کو ان فتنوں میں ملوث ہونے سے بچائیں۔

الغرض تورات میں بنی اسرائیل کو جو آگاہی دی گئی تھی جس کا ذکر اس آیت (وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ الخ) میں کیا گیا ہے وہ اسی طرح کی تھی اور اسی مقصد سے دی گئی تھی۔

آگے کی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ جب بنی اسرائیل میں پہلی دفعہ وہ فساد آیا جس کے بارے میں ان کو آگاہی دی جا چکی تھی اور انھوں نے ہماری ہدایت اور آگاہی کو پس پشت ڈال کر شیطنت اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا تو ہم نے ایسے دشمنوں کو ان پر مسلط کر دیا جو "أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ" یعنی نہایت خوفناک اور بڑے جلّاد تھے، وہ ان بنی اسرائیل کی بستیوں میں اور ان کے گھروں میں گھس گئے اور بالکل تباہ و برباد کر ڈالا ـــــ فرمایا گیا ہے "فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ ۚ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ۝

بہت سے مفسرین نے جن کی بنی اسرائیل کی تاریخ پر اچھی نظر ہے، یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس سے بابل کے بادشاہ بخت نصر کا حملہ مراد ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام سے قریباً ۶ سو سال پہلے بنی اسرائیل کی بستیوں پر ہوا تھا۔ اس نے بنی اسرائیل کو بُری طرح تباہ و برباد کیا تھا، ان کی بہت بڑی تعداد قتل ہوئی اور بہت بڑی تعداد میں قیدی بنا کر بابل لے جایا گیا اور ان کی بستیاں بالکل اُجاڑ دی گئیں۔

آگے بیان فرمایا گیا ہے کہ پھر ایک مدت کے بعد اللہ نے ان پر رحم فرمایا، ان کی مدد فرمائی اور خدا کی اس مدد سے پانسہ پلٹ دیا، بنی اسرائیل کو غلبہ نصیب ہوا، پھر ان کے مال و اولاد میں

بھی برکت ہوئی اور ان کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ارشاد ہے۔ "ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ أَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ أَكْثَرَ نَفِيْرًا ٥"

یہاں قرآن مجید میں بنی اسرائیل کی توبہ و انابت اور رجوع الی اللہ کا بظاہر کوئی ذکر نہیں فرمایا گیا، لیکن تورات میں اور بنی اسرائیل کی تاریخ میں اس کا ذکر ہے اور قرآن مجید کے خاص طرز بیان کے مطابق یہاں اس کو مضمر سمجھنا چاہیے۔ آیت کا مطلب یہی ہے کہ "بخت نصر کے لشکر کے ہاتھوں پامال اور تباہ و برباد ہونے کے بعد ان میں انابت پیدا ہوئی، جیسا کہ عام طور سے ہوا کرتا ہے۔ "گیا جب تنگ بتوں نے تو خدا یاد آیا۔"

بابل میں جب وہ قیدیوں والی ذلت و خواری کی زندگی گزار رہے تھے، ان میں انابت پیدا ہوئی، انھوں نے نافرمانی کی زندگی سے توبہ کی اور فرمانبرداری والی زندگی کا خدا سے عہد کیا تو اللہ تعالیٰ کا ان پر فضل ہوا اور اس کی خاص مدد سے ان کو دشمنوں پر غلبہ بھی نصیب ہو گیا اور ان کی نسل اور دولت میں بھی اللہ تعالیٰ نے خوب اضافہ کیا، اور بنی اسرائیل پھر سے ایک خوش حال اور طاقتور قوم بن گئے۔

آگے فرمایا گیا ہے "اِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا" یعنی ہم نے ان بنی اسرائیل کے اس دوسرے دور میں پھر ان کو جتا دیا تھا اور آگاہ کر دیا تھا کہ دیکھو آئندہ بھی یہی ہوگا کہ اگر تمھارا رویہ اچھا رہا جیسا کتاب و پیغمبر والی امت کا ہونا چاہیے تو تم کو ہماری طرف سے اس کا بہترین صلہ ملتا رہے گا، لیکن اگر تم نے بد عملی اور شرارت کی راہ اختیار کی تو سابق کی طرح اس کا برا نتیجہ بھی تمھیں بھگتنا ہوگا، جزا و سزا کا ہمارا یہ قانون اٹل ہے۔ (اِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا)

آگے فرمایا گیا ہے "فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ" الخ ــــ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل و کرم کے بعد جس کا ذکر اوپر کی آیت میں کیا گیا ہے، بنی اسرائیل نے پھر خدا کو اور اس کی ہدایت کو بھلا دیا اور نفس پرستی اور سرکشی کا وہ راستہ پھر اختیار کر لیا جس کے بارے میں ان کو آگاہی دی جا چکی تھی (لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ٥) تو خدا کی طرف سے ان پر پھر ان کے دوسرے نہایت خراب اور خونخوار دشمن مسلط کر دیے گئے، وہ خدا کا عذاب بن کر ان پر

نازل ہوئے، انھوں نے ان کو ایسی مار دی کہ صورتیں تک بگاڑ دیں اور جس طرح بخت نصر کے لشکر نے
ان کے دینی اور قومی مرکز اور ان کی عزت اور عظمت کے نشان بیت المقدس کو تباہ و برباد کیا تھا ان کے
نئے حملہ آور دشمنوں نے بھی ایسا ہی کیا اور اس کے علاوہ بھی جہاں تک قابو پایا سب برباد کر دیا، اور
یہ خدائے ذوالجلال کے عذاب کے طور پر ہوا۔ خدا نے بنی اسرائیل کی شرارت اور سرکشی کی سزا
دینے ہی کے لیے ان دشمنوں کو ان پر اس طرح مسلط کیا، اس کی طرف سے پہلے ہی جتا دیا گیا تھا
"وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا" (کہ اگر تم نے بدکرداری اختیار کی تو تم کو اس کی سزا ضرور بھگتنی ہوگی۔)
اکثر واقف مفسرین نے طیطوس رومی کے حملہ کو اس کا مصداق قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم ——— آگے
فرمایا گیا ہے "عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يَرْحَمَكُمْ وَإِنْ عُدتُّمْ عُدْنَا" یعنی بنی اسرائیل کی اس
دوسری دفعہ کی بربادی کے بعد بھی ان کو اس کی امید دلادی گئی تھی کہ اگر اب بھی معصیت کوشی
اور سرکشی کا راستہ چھوڑ کے نیکی اور فرمانبرداری کا راستہ اختیار کر لوگے تو تمھارا پروردگار پھر تم کو
اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے گا اور تم کو پھر ایک نئی زندگی عطا کر دی جائے گی۔ اور اگر اس کے
برخلاف تم نے پھر شرارت اور شیطنت کا راستہ اختیار کیا تو ہم پھر وہی کریں گے جو پہلے ہم نے
کیا تھا۔ یعنی جس طرح پہلے تم پر ہمارے عذاب کے کوڑے برسے تھے اسی طرح پھر برسیں گے۔
(وَإِنْ عُدتُّمْ عُدْنَا)

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا ——— بنی اسرائیل
سے متعلق جو سلسلۂ کلام سورت کی دوسری آیت سے شروع ہوا تھا وہ یہاں ختم ہو گیا ——— یہ اس
سلسلہ کی آخری آیت ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر اس بار بار کی تنبیہ اور ہمارے قہر و عذاب کے
بار بار کے تجربے کے بعد بھی تم نے ہدایت کی پیروی اور فرمانبرداری کا راستہ اختیار نہیں کیا اور کفر و
طغیان ہی کی راہ پر چلتے رہے تو ایسے مجرموں کے لیے دنیوی عذاب کے ان تازیانوں کے
علاوہ آخرت کی کبھی ختم نہ ہونے والی زندگی میں جہنم کا شدید عذاب ہے اور پھر جہنم کا جیل خانہ
ہی ان کا دائمی ٹھکانا ہے۔ "وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا"۔

یہاں ہمارے آپ کے لیے سوچنے سمجھنے کی خاص بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی یہ سرگزشت

ہم کو یعنی اُمتِ محمدیہ کو کیوں سنائی گئی اور اس کو قرآنِ مجید میں کیوں شامل کیا گیا؟ ـــــ

ـــــ قرآن پاک نہ تو تاریخ کی کتاب ہے اور نہ قصہ کہانیوں کی، وہ تو کتابِ ہدایت ہے۔ اُس میں بنی اسرائیل کے اور دوسری قوموں اور اُن کے نبیوں رسولوں کے جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، سب ہماری ہدایت اور سبق آموزی کے لیے بیان کیے گئے ہیں ـــ ان آیتوں کا کھلا سبق ہمیں اور آپ کو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری اُمت کو یہ ہے ـــ کہ کسی قوم، کسی نسل اور کسی اُمت سے اللہ تعالیٰ کی رشتہ داری نہیں ہے، اُس کا قانون بے لاگ ہے، بنی اسرائیل حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، اور حضرت یعقوب علیہم السلام جیسے جلیل القدر پیغمبروں کی اولاد تھے، اور یہ ایسی نسل تھی جس میں اللہ کے ہزاروں پیغمبر آئے، لیکن اللہ تعالیٰ کا معاملہ بندوں کے ساتھ ایسا بے لاگ ہے کہ جب تک یہ سیدھے چلے اور ان کی زندگی ایمان اور عملِ صالح والی زندگی رہی ان پر نعمتوں کی بارشیں ہوتی رہیں اور ان کو عزت اور سربلندی نصیب رہی، لیکن جب انھوں نے خدا اور اس کے پیغمبروں کا بتایا ہوا راستہ چھوڑ کر نفس پرستی اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا تو اللہ کی رحمت سے محروم ہو گئے، اور پھر نہایت خبیث قسم کے کفار ان پر مسلط کر دیے گئے جنھوں نے ان کو بری طرح تہس نہس کیا اور ان کے قبلے بیت المقدس تک کو برباد کر ڈالا۔ اور یہ سب اللہ کے حکم سے اور اس کی طرف سے ہوا۔

اُمتِ محمدیؐ کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی ہوا ہے، جب تک اس کی عام زندگی ایمان عملِ صالح اور تقوے والی رہی روم و فارس جیسی عظیم الشان اور نہایت طاقتور حکومتوں کے مقابلہ میں ان کو غلبہ حاصل رہا اور "انتم الاعلون ان کنتم مومنین" کا ظہور ہوتا رہا، لیکن جب ایمان اور تقوے کے بجائے اُمت میں نفاق اور فسق و فجور کا غلبہ ہو گیا تو اُن پر تاتاری جیسی وحشی اور خونخوار قوم مسلط کر دی گئی اور پھر وہی ہوا جو بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا تھا۔ "فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا" اس کے بعد بھی دنیا کے مختلف حصوں میں اللہ تعالیٰ کے اس بے لاگ قانون کا ظہور ہوتا رہا ہے، اور ہم آپ خود بھی کسی رنگ میں اس کا تجربہ کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم کو سبق لینے کی توفیق دے اور ہم پر رحم فرمائے۔ ہمارے لیے بھی اللہ تعالیٰ کا اور قرآن مجید کا پیغام یہی ہے ـــ "عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يَرْحَمَكُمْ ۚ وَإِنْ عُدتُّمْ عُدْنَا" ـــ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ـــ

بوئے گل در برگِ گل

حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلویؒ اپنے مکتوبات کے آئینے میں

(تلخیص و ترجمہ — از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

نواب شمشیر خاں کے نام مکتوب (۱۰۳)

..... والا مناقب عالی مراتب ... نواب شمشیر خاں بہادر السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ایمان و عرفان میں ترقی یہ ہے کہ گویا حضرت حق سبحانہٗ کو مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ترقی اسلام کی یہ ہے کہ اعمال ظاہر میں کامل حصہ ہو اور حبِ الٰہی کا ذوق بڑھ جائے۔ ترقی محبت میں یہ ہے کہ سوز دروں اور نالۂ دلکشا سے شوق کو تازہ رکھیں اور صداقت میں ترقی یہ ہو کہ ... مہر "زخلاصیِ صدیقاں" پر لگا دیں۔ ترقی جاہ و دولت دنیا یہ ہے کہ جہاں کو سخاوت سے معمور رکھیں۔ عافیت اور کامیابیوں کی دعا کی جاتی ہے۔ اور کامیابی نہیں ہوتی مگر ان ترقیات مذکورہ کے حاصل ہونے پر۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو ان مطالب میں بہرۂ کامل عطا فرمائے اور دوام اذکار و اشغال کے ذریعے سب کو ان مقاصد سے محظوظ کرے۔

دو دن ہوئے کہ عنایت نامہ وارد ہوا اور ذات والا صفات کی خیر خیریت نے مسرت بہم پہنچائی۔ الحمد للہ۔ لکھا تھا کہ تین شخص جو حافظ کلام مجید ہوں مقرر کر کے باندہ کو بھیج دیں۔ مگر حافظ تیس پارے روز پڑھے۔ اس قدر تلاوت مشکل ہے۔ ایک شخص کا دو وقت میں ایک منزل پڑھنا آسان ہے۔ (رعایۃ المسلمین کے لیے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا پسندیدہ عمل یہی ہو

لیکن امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک رکعت میں ختم قرآن کرتے تھے۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہر روز ایک قرآن ختم کرتے تھے ــــ ارباب شوق و محبت اپنی زندگی عبادت میں گزارتے ہیں ــــ زندگی بے بندگی کارآمد نہیں ہے ــــ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر جگہ خوش و خرم رکھے کہ آپ گوشۂ چشم عنایت بحالِ فقیراں رکھتے ہیں۔ درون خانہ اور جمیع اعزہ سے سلام کہیں اور اُن کو نماز، ذکر اور درود بر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نیز استغفار و کلمات طیبات کی تاکید فرمائیں۔

مکتوب (۱۰۴) سید احمد بغدادی کے نام

سیادت و منقبت مرتبت صاحبزادہ عالی منصب ....

بعد سلام مسنون و دُعائے حصولِ ترقی درجات۔ واضح ہو۔ الحمد للہ کہ فقیر عنایت الٰہی سے بخیریت ہے۔ شب و روز، حلقہ و مراقبہ میں اتباع پیران کبار سے اوقات کو اچھی طرح بسر کر رہا ہے۔ (خانقاہ میں) طالبین کبھی ایک سو ستر اور کبھی اس سے کم رہتے ہیں۔ اس وقت ایک سو چالیس ہوں گے۔ اگرچہ طالبین کی کثرت کے باعث اُن کی جانب توجہ کم ہوتی ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہم کو فائدہ ہوتا ہے۔ غرضکہ جمعیت و حضور کا شغل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ اپنے فضل سے آپ کے ذریعے اور دوسرے لوگوں کے ذریعے جنھوں نے عنایات الٰہی فیوض حاصل کیے ہیں ــــ میرے طریقے کو پائدار اور باقی رکھے ــــ عنایت نامہ آج سلامت بخشیں۔ خطوط کے آنے سے میں بہت خوش ہوتا ہوں۔ شدتِ انتظار نے متکدر کر دیا تھا۔ الحمد للہ کہ عنایت الٰہی سے آپ کی تحریر کے ذریعے تکدر رفع ہوا۔ اُمید کہ (آئندہ) اپنے باطن اور اپنے مستفیدین کے باطن کے متعلق لکھیں گے ــــ .... (مریدوں میں سے) جس کسی کو "حضورِ قلب" اور "لطیفۂ نفس" حاصل ہو وہ قابل اجازت ہے۔ تقدیر الٰہی سے موافق و ناموافق جو کچھ ظاہر ہو اُس پر شکر و استغفار کرنا لازم سمجھیں اور اس امر پر غور کریں کہ یہ ناموافق صورت حال کس بات سے پیش آئی۔ اُس بات سے اعراض کرنا واجب جانیں۔

حضرت مولوی بشارت اللہ (بہرائچی) یہاں ایک سال رہ کر وطن گئے ــــ غفر اللہ لہ

(واعرض عن الجاہلین (عفو کو اختیار کرو اور جاہلوں سے اعراض کرو) اس کو اپنی عادت بنائیں اور مجھ کو دعا میں یاد رکھیں ___ کیا ہی اچھی بات ہوگی کہ بغداد شریف اور اس کے علاقے میں بخیریت پہونچکر اشاعت طریقہ فرمائیں ___ دوستوں کا سلام دوستوں کو پہونچائیے۔

مکتوب (۱۰۷) مولانا عبد الرحمٰن شاہجہانپوریؒ[عہ] کے نام

(مولانا رومؒ کی طرف منسوب کیے ہوئے دو شعروں کے متعلق جو تفضیل امیر المومنین علی پر شیخین پر مشتمل تھے، معلوم کیا گیا تھا، اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں)

جس کسی کو عقل ہے وہ جانتا ہے کہ جہاد اکبر اور جہاد اصغر کا حکم تمام صحابہؓ کے لیے ہے۔ اصحاب کرام دونوں قسم کے جہاد کرتے تھے اور اعمالِ ظاہری میں متابعتِ رسولؐ کو لازم سمجھتے تھے۔ صبر و توکل اور تسلیم و رضا، اعمالِ باطن ہیں، تلاوت، تہجد اور صدقات اعمالِ ظاہر ہیں۔ کوئی مسلمان نہیں ہے جو ان اعمالِ ظاہر و باطن کو نہ کرے ورنہ مسلمانی کہاں رہے گی۔ پس اعمالِ باطن کو ترک کر کے محض اعمالِ ظاہر کو اختیار کرنا حقیقی مسلمانی نہیں ہے۔ حقِ صحابہ میں یہ گمان کرنا کہ وہ محض اعمالِ ظاہر کے عامل تھے "گمانِ رافضیاں" ہے۔

قرآن مجید سے مدح صحابہ ثابت ہے　　احمق لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے　　مگر مناقب جزئیہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہت کچھ مروی و منقول ہیں۔ ان مناقب سے ان کی ضرور فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ قدیم الاسلام ہونا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چچازاد بھائی ہونا، حضرت خاتونِ جنت کا شوہر ہونا اور فاتح خیبر ہونا وغیرہ مناقب تحفۂ اثنا عشریہ میں بھی ذکر کیے گئے ہیں۔ حضرت حق سبحانہٗ سے محبت اور اہل بیت عظام اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مکمل طور پر محبت چاہتا ہوں ___ اہل بیتؓ اجزائے پیغمبر خدا ہیں اور صحابہ کرامؓ

عہ آپ شاہجہانپور کے باشندے تھے۔ بہت سے بزرگوں کے پاس پہونچے کوئی مقصود حاصل نہیں ہوا۔ آخر بخدمتِ حضرت شاہ غلام علی مجددیؒ دہلوی حاضر ہوئے، منازل سلوک طے کر کے خلعتِ خلافت پائی، آپ اہل دنیا سے کلیۃً بے تعلق رہتے تھے ان کی جانب کوئی التفات نہیں کرتے تھے۔ نواب فرخ آباد آپ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور حاضر خدمت ہوا کرتے تھے انکی طرف بھی التفات نہیں فرماتے تھے۔ ضلع فرخ آباد اور شاہجہانپور میں آپکا سلسلہ رواج پذیر ہے۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دینِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشاعت کنندہ ہیں۔۔۔۔

غم مرگ اور غم آخرت نے مجھ کو گھیر لیا ہے۔ اللہ تعالےٰ بواسطہ صحابہ کرامؓ و اہلِ بیت عظامؓ خاتمہ بالخیر فرمائے (آمین) نیز اللہ تعالےٰ عقیدۂ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ اور عقیدۂ حضرت شیخ فرید الدین گنجشکرؒ جو اُس کتاب عقائد میں مندرج ہے جس کا درس حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کو دیا ہے اور سُنت پر عمل، ترکِ بدعت اور روافض و خوارج کے افراط و تفریط سے اعراض و اجتناب ہم مُریدوں کو نصیب فرمائے تاکہ نجاتِ دارین حاصل ہو (آمین) ظاہر ہے کہ یہ دو شعر مولانا رومؒ کی مثنوی کے نہیں ہیں۔ مولانا رومؒ اہلِ سُنت کے کامل ترین اولیاء و علماء میں سے تھے۔ تفضیلی نہیں تھے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسرارِ باطن (فقط) حضرت امیر المومنین علیؓ سے فرماتے دیگر صحابہؓ سے نہ فرماتے تو اس آیت کے خلاف ہوتا۔ "اِنَّا اَرْسَلْنَاکَ لِلنَّاسِ کَافَّةً" (ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے)

پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علم ظاہر و باطن تمام مسلمانوں کو تلقین فرمایا ہے۔ خود حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو علوم و احکام تمام مسلمانوں کو تلقین فرمائے تھے وہی علوم مجھ کو تلقین فرمائے ہیں"۔ لہٰذا حضرت علیؓ سے علوم باطنیہ کی تخصیص جیسا کہ بعض صوفیہ کہتے ہیں ــ ثابت نہیں ہے ــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض و واجبات، اخلاق حسنہ، حُسنِ معاملات، جہادِ اصغر، جہادِ اکبر، اتباعِ سُنن ہدیٰ، اعراض عن الدنیا اور اقبال بالآخرۃ سب کو تلقین فرمائے ہیں۔

حضرت علیؓ کے ارشاد مذکور کی روشنی میں تصفیہ قلب اور تزکیہ نفس نیز مرتبۂ احسان دکانک تراہ) سب اصحابؓ کو حاصل ہوا مگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالےٰ عنہم سے کثرتِ کرامات منقول نہیں ہے اس لیے کہ ظہورِ خوارقِ عادات و کرامات، باعثِ فضیلت نہیں ہے۔ اولیاء سے اس قدر کرامات مروی ہیں کہ صحابہ کرامؓ سے مروی نہیں ہیں۔ وجہ فضیلت، ترویج اسلام، موافقتِ مسلمانانؓ

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا بقیہ) ضمیمہ مقامات مظہری ص ۲۳ للشیخ عبد الغنی ابن ابی سعیدؒ

عہ جہادِ اکبر سے باصطلاح صوفیہ، ریاضت و تزکیۂ نفس مراد ہے اور جہادِ اصغر سے جہادِ معروف مراد ہے۔

اشاعتِ علومِ دین اور بدعت و محدثات سے اجتناب ہے۔ حضرت علیؓ کے اس قدر مناقب مروی ہیں کہ دیگر اصحابِ کرامؓ کے متعلق مروی نہیں ہیں لیکن فضیلت حضراتِ شیخینؓ کو حاصل ہے اس لیے کہ حضراتِ شیخینؓ سے امورِ اربعہ مذکورہ کثرت سے صادر و ظاہر ہوئے ہیں۔
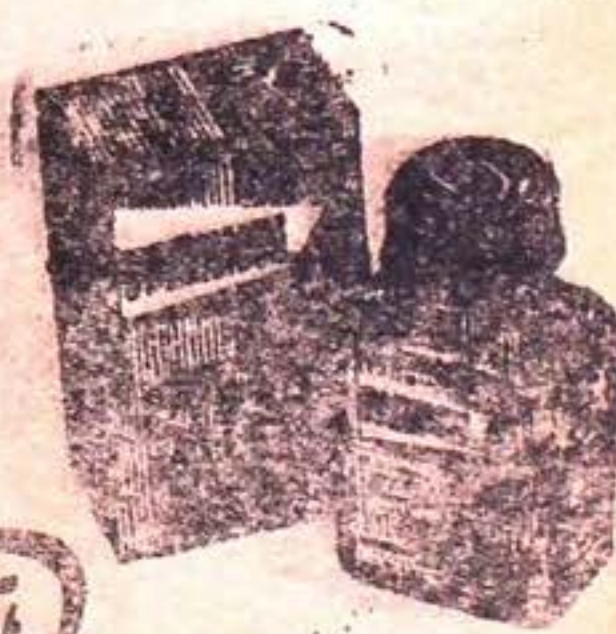
از افادات حضرت مولانا شاہ وصی اللہ قدس سرہٗ

مال کی شرعی حیثیت

(۲)

اور یہ جو میں نے کہا کہ مال مومن کے دین کا محافظ ہے تو یہ بھی اپنی جانب سے نہیں کہا بلکہ راس الاصفیاء حضرت سفیان ثوریؒ کا ارشاد ہے جسے صاحب مشکوٰۃ نے " باب استحباب المال والعمر للطاعۃ " کے تحت بیان کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ

۔ کان المال فیما مضٰی یکرہ فاما الیوم فھو ترس المؤمن وقال لولا ھذہ الدنانیر لتمندل بنا ھؤلاء الملوک وقال من کان فی یدہ من ھذہ شیئ فلیصلحہ فانہ زمان ان احتاج کان اول ما یبذل دینہ وقال الحلال لا یحتمل السرف.

یہاں حضرت سفیان ثوریؒ نے چار باتیں بیان فرمائی ہیں :۔

۱۔ ایک تو یہ فرمایا کہ پہلے زمانہ میں مال مکروہ سمجھا جاتا تھا لیکن آج کے دن تو وہ تو مومن کی ڈھال ہے مطلب یہ کہ اگلے زمانہ میں لوگوں کے ایمان قوی تھے آخرت اُن پر غالب تھی اس لیے نہ دنیا کی جانب ان کو التفات تھا اور نہ دنیا کی قلت ان کے دین میں مانع ہوتی تھی لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے آج اگر کوئی شخص اپنے دین کی حفاظت کر سکتا ہے تو مال ہی کے ذریعہ.

کر سکتا ہے۔ گویا یہ مال حفاظت دین کے لیے بمنزلہ سپر کے ہے۔ چنانچہ جس طریقہ سے دشمن کے حملے سے بذریعہ سپر بچا جا سکتا ہے اسی طرح سے اس زمانہ میں دین کا وقایہ اور عزت و آبرو کے لیے اگر کوئی چیز سپر بن سکتی ہے تو وہ مال ہو چنانچہ اپنے دوسرے ارشاد میں، اسی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

۲- اگر آج ہمارے پاس یہ درہم اور دنانیر (روپے پیسے) نہ ہوتے تو یہ امراء اور ملوک توہمیں رومال اور صافی ہی بنا لیتے یعنی ہمیں متبذل اور حقیر سمجھتے اور جس طرح سے کہ صافی سے میل کچیل صاف کیا جاتا ہے اسی طرح یہ ہم کو استعمال کرتے۔

۳- تیسری بات یہ فرمائی کہ جس کے پاس کچھ مال وغیرہ ہو تو اُس کو چاہیئے کہ وہ اس کی اصلاح کرے یعنی اسکو تلف ہونے سے بچائے اور تجارت وغیرہ کے ذریعہ اُس کو بڑھائے اسلیئے کہ یہ ایسا زمانہ ہے کہ انسان اگر محتاج ہوا تو سب سے پہلی چیز جسے وہ اپنی حاجت روائی کیلیئے استعمال کرے گا وہ اس کا دین ہوگا۔

مطلب یہ کہ وقت بدل چکا ہے ایمان میں ضعف آگیا ہے تقوے میں کمی ہوگئی ہے دین کا احترام اور اس کا اہتمام لوگوں کے قلوب میں اب پہلا جیسا باقی نہیں رہا۔ اس لیے اب جہاں انسان کی کوئی دنیوی ضرورت آئی اور اس کی تحصیل کے لیے اگر دین بھی استعمال کرنا پڑے گا تو اس کو اس میں بھی دریغ نہ ہوگا اور دنیا حاصل کرنے کے لیے دین کو برباد کرے گا۔

۴- چوتھی بات یہ ارشاد فرمائی کہ حلال مال اسراف کو برداشت ہی نہیں کرتا۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ حلال کمائی اتنی ہوتی ہی نہیں کہ آدمی اس میں اسراف روا رکھ سکے۔

اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان کو اپنی حلال آمدنی احتیاط سے صرف کرنی چاہیے ایسا نہ ہو کہ اس میں اسراف کرنے لگ جائے اور اسکی وجہ سے وہ ختم ہو کر اسکے رخ کو حرام کی جانب پھیر دے۔ انتہی

دیکھئے یہ حدیث مشکوٰۃ شریف میں موجود ہے اور حضرت سفیان ثوریؒ کا ارشاد ہو کہ جو بہت بڑے صوفی گذرے ہیں مگر مال کے بارے میں یہ ارشاد فرما رہے ہیں۔

بات یہ ہو کہ اپنے زمانہ میں لوگوں کا حال دیکھا ہوگا چنانچہ جو فرمایا وہ بالکل صحیح فرمایا ہم تو اپنے زمانہ میں کھلی آنکھوں اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ لوگ کس کس طریقہ سے دنیا کی معمولی معمولی چیزوں کی خاطر اپنے دین کو ختم کر دیتے ہیں، ایک مصلح کا یہی کام ہوتا ہے کہ وہ زمانہ اور حالات کا فرق دیکھ کر وقت کے مناسب حکم شرعی بیان کرتا ہو۔

آج دیکھا جاتا ہے کہ مال کی تحصیل کی خاطر لوگ بلا تکلف جھوٹ بولتے ہیں جھوٹا حلف اٹھا لیتے ہیں اور بعضوں کا تو سارے دن کا یہی مشغلہ ہی رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ کذب کی برائی ہی آہستہ آہستہ قلب سے نکل جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت سفیان ثوریؒ کا یہ ارشاد غایت و تجربہ و حکمت پر مبنی ہے اسلیے کہ امارت کا یہ خاصہ ہی ہے کہ اس میں اپنی برتری اور دوسروں کی تحقیر پیش نظر ہوتی ہے۔ اب اگر کسی نیک اور دیندار شخص کے پاس مال نہ ہوا یا کوئی شخص عالم ہو کر امراء کا دست نگر رہا تو ظاہر ہے کہ اس شخص سے اور لوگوں کو دینی نفع نہیں پہونچے گا بالخصوص امراء کو تو قطعی فیض اس سے نہیں ہوگا اور یہ شخص اُن کا مقتدار اور پیشوا تو ہو ہی نہیں سکتا اسلیے کہ اُن کے قلوب اس کی عظمت سے خالی ہوں گے اور کسی سے فیض حاصل کرنے کے لیے اس کی عظمت کا قلب میں ہونا نہایت ضروری ہے تو جو لوگ مالی میں اسے ہی محتاج اور اپنے کو محتاج الیہ سمجھ رہے ہیں اُن کے قلوب میں اس کی کیا عظمت ہوگی۔

اس پر آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔

نواب ڈھاکہ نے ایک مرتبہ حضرت تھانویؒ کو ڈھاکہ آنے کی دعوت دی حضرت نے بعض شرطیں پیش فرمائیں۔ طے ہونے کے بعد سفر فرمایا۔ کلکتہ میں نواب صاحب کے ایک عزیز ملے جو استقبال کے لیے آئے تھے۔ حضرت سے ملاقات کرتے ہی انھوں نے یہ کہہ دیا کہ حضرت آپ خوب تشریف لائے آپکے آنے سے بڑی مسرت ہوئی ورنہ تو ہم لوگ نا اُمید ہو گئے تھے۔

حضرت نے فرمایا کیوں نا اُمید کیوں ہو گئے تھے؟ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت نے اپنے آنے کے متعلق ایسی شرطیں لگا دی تھیں جن سے خیال ہوا کہ شاید تشریف نہ لائیں۔ حضرت نے فرمایا کہ کیا شرطیں لگا دی تھیں؟ کہا مثلاً ایک شرط یہی آپ نے لگا دی تھی کہ مجھے وہاں کچھ ہدیہ نہ دیا جائے؟ فرمایا کہ پھر یہ تو کوئی مشکل بات نہ تھی۔ کہا آپ خود فرمایئے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی

پس جس طرح سے دنیا اپنے آثار سوء (برائے اثرات) کی بنا پر مذموم ہو جاتی ہے مثلاً انسان اس میں منہمک ہو کر تکالیف شرعیہ اور احکام الہٰیہ ہی کو ترک کر دے۔ اسی طرح سے کبھی وہ ذریعہ بھی بنتی ہے مامور بہ پر عمل کرنے کا۔ لہٰذا اس جہت سے وہ بھی مطلوب و مامور بہ ہو جاتی ہے۔ اس مسئلہ کو صاحب موافقات نے عمدہ بیان کیا ہے۔

فرماتے ہیں کہ:۔

انا اذا نظرنا الی کونہ وسلیۃ فلیس ترکہ افضل بالاطلاق بل ہو ثلاثۃ اقسام۔

قسم یکون ذریعۃ الی منھی عنہ فیکون من تلک الجھۃ مطلوب الترک۔

وقسم یکون ذریعۃ الی مامور بہ کالمستعان بہ علی امر اخروی فی الحدیث نعم المال الصالح للرجل الصالح وفیہ ذھب اھل الدثور بالاجور والدرجات العلیٰ والنعیم المقیم۔ الی ان قال ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء بل قد جاء ان فی مجامعۃ الاھل اجراً وان کان قاضیا لشھرتہ لانہ یکف بہ عن الحرام وذلک فی الشریعۃ کثیراً لانہا لما کانت وسائل الی المامور بہ کان لہا حکم ما توسل بہا الیہ

وقسم لایکون ذریعۃ الی شئ فھو المباح المطلق و علی الجملۃ فاذا فرض ذریعۃ الی غیرہ فحکمہ حکم ذلک الغیر

یعنی ہم جب کسی مباح چیز کو (مثلاً مال ہی کو) اس حیثیت سے دیکھیں کہ وہ ذریعہ اور وسیلہ ہے، تو اس کا مطلقاً ترک کرنا افضل نہیں ہوگا بلکہ اس کی تین قسمیں ہیں:۔

(۱) ایک قسم یہ کہ وہ کسی منھی عنہ یعنی فعل حرام کا ذریعہ بنے تو اس جہت سے اس کا ترک مطلوب ہوگا۔

(۲) اور ایک قسم یہ ہے کہ وہ کسی مامور بہ کا ذریعہ بنے۔ مثلاً یہ کہ اس کو کسی امر اخروی

کا معین اور مددگار بنا لیا جاوے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ صالح مال صالح انسان کے لیے کیا ہی اچھی چیز ہے۔ اور حدیث شریف میں یہ بھی آیا ہے کہ اہل الموال اجر میں بازی لے گئے اور بلند درجات حاصل کرنے میں سبقت لے گئے اور نعیم مقیم کے حاصل کرنے میں آگے نکل گئے۔ حدیث طویل ہے آخر میں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ بلکہ حدیث میں تو یہاں تک آتا ہے کہ اپنے اہل کے پاس آنے میں (یعنی بیوی سے صحبت میں) بھی اجر ہے اگرچہ مقصود قضاء شہوت ہو اسلئے کہ کم سے کم اس سے یہ تو ہوگا کہ آدمی فعل حرام سے بچ جائے گا۔

غرض اس قسم کی چیزیں شریعت میں بہت ہیں اور یہ اس لیے کہ جب وہ کسی مامور بہ کا وسیلہ بنتی ہیں تو ان کا حکم بھی وہی ہو جاتا ہے جو اس اصل چیز کا ہے جس کے لیے یہ وسیلہ بنتی ہیں۔

(۳) اور ایک قسم یہ ہے کہ اس مباح کو کسی شے کا ذریعہ ہی نہ بنایا جائے، نہ کسی مامور بہ کا نہ منہی عنہ کا۔ یہ مباح مطلق ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ جب مباح کسی غیر کا ذریعہ بنے گا تو اسی کا حکم وہ بھی لے لے گا۔ (وہ واجب تو وہ بھی واجب۔ وہ حرام تو وہ بھی حرام)۔

(الموافقات صفحہ ۱۱۴ ج ۱)

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے نفرت نہیں فرمائی اور نہ اس کے زوال کے لیے دعا کی بلکہ یہ دعا فرمائی کہ

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنِ امْرَأَةٍ تُشَیِّبُنِیْ قَبْلَ الْمَشِیْبِ وَ اَعُوْذُبِكَ مِنْ وَّلَدٍ یَّكُوْنُ عَلَیَّ وَبَالاً وَّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ مَّالٍ یَّكُوْنُ عَلَیَّ عَذَاباً

یعنی اے اللہ میں پناہ چاہتا ہوں تیری ایسی عورت سے جو بوڑھا کر دے مجھے بڑھاپے سے پہلے اور پناہ چاہتا ہوں تیری ایسی اولاد سے کہ ہو مجھ پر وبال اور پناہ چاہتا ہوں تیری ایسے مال سے کہ ہو مجھ پر عذاب۔

دیکھیے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال سے پناہ نہیں مانگی بلکہ مال کے عذاب

پس جس طرح سے دنیا اپنے آثار سوء (برائے اثرات) کی بنا پر مذموم ہو جاتی ہے مثلاً انسان اس میں منہمک ہو کر تکالیف شرعیہ اور احکام الٰہیہ ہی کو ترک کردے۔ اسی طرح سے کبھی وہ ذریعہ بھی بنتی ہے مامور بہ پر عمل کرنے کا۔ لہٰذا اس جہت سے وہ بھی مطلوب و مامور بہ ہو جاتی ہے۔ اس مسئلہ کو صاحب موافقات نے عمدہ بیان کیا ہے۔

فرماتے ہیں کہ:-

انا اذا نظرنا الی کونہ وسلیۃ فلیس ترکہ افضل بالاطلاق بل ھو ثلاثۃ اقسام۔

قسم یکون ذریعۃ الی منہی عنہ فیکون من تلک الجھۃ مطلوب الترک۔

وقسم یکون ذریعۃ الی مامور بہ کالمستعان بہ علی امر اخروی فی الحدیث نعم المال الصالح للرجل الصالح وفیہ ذھب اھل الدثور بالاجور والدرجات العلی والنعیم المقیم۔ الی ان قال ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء بل قد جاء ان فی مجامعۃ الاھل اجراً وان کان قاضیا لشھوتہ لانہ یکف بہ عن الحرام وذلک فی الشریعۃ کثیراً لانہا لما کانت وسائل الی المامور بہ کان لہا حکم ما توسل بہا الیہ

وقسم لایکون ذریعۃ الی شیٔ فھو المباح المطلق و علی الجملۃ فاذا فرض ذریعۃ الی غیرہ فحکمہ حکم ذلک الغیر

یعنی ہم جب کسی مباح چیز کو (مثلاً مال ہی کو) اس حیثیت سے دیکھیں کہ وہ ذریعہ اور وسیلہ ہے تو اس کا مطلقاً ترک کرنا افضل نہیں ہوگا بلکہ اس کی تین قسمیں ہیں:-

(۱) ایک قسم یہ کہ وہ کسی منھی عنہ یعنی فعل حرام کا ذریعہ بنے تو اس جہت سے اس کا ترک مطلوب ہوگا۔

(۲) اور ایک قسم یہ ہے کہ وہ کسی مامور بہ کا ذریعہ بنے۔ مثلاً یہ کہ اس کو کسی امر اخروی

کا معین اور مددگار بنا لیا جاوے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ صالح مال صالح انسان کے لیے کیا ہی اچھی چیز ہے۔ اور حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ اہل الموال اجر میں بازی لے گئے اور بلند درجات حاصل کرنے میں سبقت لے گئے اور نعیم مقیم کے حاصل کرنے میں آگے نکل گئے۔ حدیث طویل ہے آخر میں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ بلکہ حدیث میں تو یہاں تک آتا ہے کہ اپنے اہل کے پاس آنے میں (یعنی بیوی سے صحبت میں) بھی اجر ہے اگرچہ مقصود وقضاء شہوت ہو اسلئے کم سے کم اس سے یہ تو ہو گا کہ آدمی فعل حرام سے بچ جائے گا۔

غرض اس قسم کی چیزیں شریعت میں بہت ہیں اور یہ اس لیے کہ جب وہ کسی مامور بہ کا وسیلہ بنتی ہیں تو ان کا حکم بھی وہی ہو جاتا ہے جو اس اصل چیز کا ہے جس کے لیے یہ وسیلہ بنتی ہیں۔

(۳) اور ایک قسم یہ ہے کہ اس مباح کو کسی شے کا ذریعہ ہی نہ بنایا جائے، نہ کسی مامور بہ کا نہ منہی عنہ کا۔ یہ مباح مطلق ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ جب مباح کسی غیر کا ذریعہ بنے گا تو اسی کا حکم وہ بھی لے لے گا۔ (وہ واجب تو وہ بھی واجب۔ وہ حرام تو وہ بھی حرام)۔

(الموافقات صفحہ ۱۱۴ ج ۱)

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے نفرت نہیں فرمائی اور نہ اس کے زوال کے لیے دعا کی بلکہ یہ دعا فرمائی کہ

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنِ امْرَأَةٍ تُشَیِّبُنِیْ قَبْلَ الْمَشِیْبِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَّلَدٍ یَّكُوْنُ عَلَیَّ وَبَالًا وَّاَعُوْذُ بِكَ مِنْ مَّالٍ یَّكُوْنُ عَلَیَّ عَذَابًا

یعنی اے اللہ میں پناہ چاہتا ہوں تیری ایسی عورت سے جو بوڑھا کر دے مجھے بڑھاپے سے پہلے اور پناہ چاہتا ہوں تیری ایسی اولاد سے کہ ہو مجھ پر وبال اور پناہ چاہتا ہوں تیری ایسے مال سے کہ ہو مجھ پر عذاب۔

دیکھیے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال سے پناہ نہیں مانگی بلکہ مال کے عذاب

(یعنی) سبب عذاب (بننے) پر پناہ مانگی ہے جیساکہ ایک اور دعا میں آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ

اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی دِیْنِیْ بِالدُّنْیَا وَعَلٰی آخِرَتِیْ بِالتَّقْوٰی۔

یعنی اے اللہ مدد کر میری میرے دین پر دنیا کے ساتھ اور میری آخرت پر تقوے کے ساتھ۔

دیکھئے اپنی اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے اُس ضرر اور زہر کو دور فرمانے کی درخواست فرما رہے ہیں جو تقوی نہ ہونے کے سبب اکثر اہل دنیا کی دنیا میں شامل ہو جاتا ہے اور یہ اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں یعنی دین اور دنیا بمنزلہ سوکن کے ہیں جن میں باہم عداوت رہتی ہے اور ہر ایک دوسرے پر غالب آنا چاہتی ہے یہی حال دین اور دنیا کا ہو کہ آدمی میں اگر دین کا غلبہ ہوا تو وہ دنیا کے زہر کو اتار دیتا ہے، اور دنیا اگر غالب آگئی تو وہ آدمی کے دین ہی کو کھا لیتی ہے باقی اسکی احتیاج بھی چونکہ سب ہی کو ہوتی ہے اسلیے آپ نے نفس دنیا اور نفس مال سے پناہ نہیں مانگی اور نہ مال کے ختم اور زائل ہونے کی تمنا فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ اے اللہ مجھے دین بھی دے اور دنیا بھی دے مگر اس طرح سے کہ میری دنیا کو میرے دین کا خادم اور معین بنا دے۔ پس اب اس کے بعد تو سارا قصہ ہی ختم ہو گیا مطلب یہ کہ جس طرح سے کہ دین اصل ہے اور مقصود ہے اور دنیا اس کی خادم اور اس کے تابع ہے تو میری دنیا کو بھی آپ اس کے درجہ پر رکھئے ایسا نہ ہو کہ میں اس کو اس کے درجہ سے بڑھا کر اصل اور مقصود بنا لوں۔

میں بھی آپ لوگوں کو یہی سمجھانا چاہتا ہوں کہ دنیا خوب کماؤ مال حاصل کرو اس میں کچھ حرج نہیں ہے لیکن تقوی کو نہ چھوڑو جس کی ظاہری علامت یہ ہے کہ دنیا کو مخدوم نہ بنالو بلکہ دین کا خادم ہی رہنے دو۔

حاصل یہ کہ ہر چیز کا ایک درجہ ہوتا ہے جب اس کو اپنے درجہ پر رکھو گے تو وہ محمود رہے گی اور اس کے درجہ سے بڑھا دو گے تو وہی چیز مذموم ہو جائے گی۔

دین کے ساتھ ساتھ اگر دنیا بھی آدمی کے پاس ہو تو سبحان اللہ کیا کہنا ہے

مَا اَحْسَنَ الدِّیْنَ وَالدُّنْیَا اِذَا اجْتَمَعَا
وَاَقْبَحَ الْکُفْرَ وَالْاِفْلَاسَ بِالرَّجُلِ

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (دین دنیا) دونوں کے اصلاح کی دعا مانگی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

اَللّٰھُمَّ اَصْلِحْ لِیْ دِیْنِیَ الَّذِیْ ھُوَ عِصْمَۃُ اَمْرِیْ وَاَصْلِحْ لِیْ دُنْیَایَ الَّتِیْ فِیْھَا مَعَاشِیْ وَاَصْلِحْ لِیْ آخِرَتِیَ الَّتِیْ فِیْھَا مَعَادِیْ وَاجْعَلِ الْحَیٰوۃَ زِیَادَۃً لِّیْ فِیْ کُلِّ خَیْرٍ وَّاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَۃً لِّیْ مِنْ کُلِّ شَرٍّ۔

یعنی یا اللہ درست رکھ میرا دین جو میرے حق میں بچاؤ ہے اور درست رکھ میری دنیا جس میں میری معاش ہے اور درست رکھ میری آخرت جہاں مجھے لوٹ کر جانا ہے اور کردے زندگی کو میرے لیے ترقی ہر بھلائی میں۔ اور کردے موت کو میرے لیے چین ہر برائی سے۔

سبحان اللہ سبحان اللہ کتنی جامع دعا ہے۔ دین۔ دنیا۔ آخرت۔ حیات اور موت کی درستگی کے بعد اب باقی ہی کیا چیز رہی؟

مال کے متعلق یہ تفصیل بزرگوں سے سنی تھی اور اب تو حدیث ہی سے اس کی سند مل گئی کہ آپ نے فرمایا کہ لا باس بالغنی لمن اتقی اللہ عزوجل اور حضرت سفیان ثوری نے اس کو ترس المؤمن فرمایا ہے۔ جب حدیث میں آیا ہے تو اب تو اس کے خلاف کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ جس طرح سے آپ نماز روزہ کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی طرح سے آپ کو مال کا انتظام اور اہتمام کرنا ہوگا اور اس کے حقوق کو سمجھنا پڑے گا۔ ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی وجہ سے آپس میں خوب گتھم گتھا رہے گی اور میں یہ بات یونہی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ دیکھا ہے کہ کہیں زمین کا مسئلہ باعث نزاع بنا ہوا ہے اور کہیں جائداد کا مسئلہ سبب مخالفت ہو رہا ہے اور کہیں روٹی کا مسئلہ ذریعہ شقاق بنا ہوا ہے جس کی وجہ سے لوگوں میں باہم خوب کشمکش ہے۔

لہ دین اور دنیا دونوں ہی کسی شخص میں جمع ہو جائیں تو کیا کہنا اور کس قدر برا ہو کہ انسان مفلس بھی ہو اور کافر بھی ہو۔

آ گے کہتا ہوں کہ یہ بھی اس زمانہ کا ایک مسئلہ ہے اور زبردست مسئلہ ہے اس کا حل جب سیکھو گے تب آئے گا۔ اور بجز شریعت کے کہیں اس کا حل بھی نہیں ہے۔ اسی کو کہتا ہوں کہ مال کا کمانا مشکل۔ اور اس کی حفاظت اس سے زیادہ مشکل اور اس کا خرچ کرنا اور تقسیم کرنا سب سے زیادہ مشکل ہے۔ زندگی میں اولاد کو دینا چاہو گے تو لڑکے لڑکی سب کو برابر برابر دینا ہوگا۔ اور اگر دینا چاہو گے بیوی کو بھی دے سکتے ہو یا جس کو چاہو دے سکتے ہو لیکن علماء نے فرمایا ہے کہ اپنی کل ملکیت بیوی کے حوالہ مت کر دو۔

امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ مال کو اپنے ہی قبضہ میں رکھو۔ بیوی کو سب مت دیدو بلکہ اس سے اپنے سب مال کی مقدار بتاؤ بھی نہیں اور اس کی حکمت کیا عمدہ بیان فرماتے ہیں فرماتے ہیں۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات حکمائے اسلام ہوئے ہیں۔) فرماتے ہیں کہ

اس سے کل مقدار اس لیے نہ بتاؤ کہ اگر مال کم ہوگا تو تم کو نظروں سے گرا دے گی اور تم اس کے نزدیک ذلیل ہو جاؤ گے۔ اور اگر مال زیادہ ہوا تو وہ تم سے ہمیشہ ناراض ہی رہے گی۔ کیوں کہ آج ایک فرمائش کل کو دوسری پرسوں کو تیسری، غرض کہ فرمائشوں کی بھرمار کر دے گی جن کو ظاہر ہے کہ تم پورا نہ کر سکو گے تو یہی کہے گی کہ روپیہ رکھے ہوئے ہیں اور ہم کو دیتے نہیں۔ غرض ایک حالت میں تو تم اس کو خوش نہ رکھ سکو گے اور ایک صورت میں اسکی نظروں ہی سے گر جاؤ گے۔

اس لیے کہتا ہوں کہ مال ہونے پر اگر تقویٰ نہ اختیار کرو گے تو پریشان ہو جاؤ گے۔ اور تقویٰ آئے گا علم کے ذریعہ جس کی وجہ سے یہ ہوگا کہ ——— انسان خدا سے ڈرے گا صلہ رحمی کرے گا اور اہل حقوق کے حقوق ادا کرے گا۔ (خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد) اور یہی وہ درجہ ہے جس کو حدیث شریف میں افضل المنازل فرمایا گیا ہے۔

یوں مال کی اور دنیا کی مذمت بھی نصوص میں وارد ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ مال اور اولاد کو فتنہ فرمایا اور فتنہ کتنی سخت چیز ہے۔ یا ارشاد فرمایا کہ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ یعنی حیات دنیا کا متاع آخرت کے مقابلہ میں بہت ہی قلیل ہے۔ اس سے بھی دنیا کی بے ثباتی کا پتہ چلتا ہے۔

اسی طرح صاحب روح المعانی نے اسی آیت کے تحت ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ ذو الحلیفہ سے گذرے آپ نے ایک بکری کو دیکھا کہ پیر ٹیک ٹیک کر دم توڑ رہی ہے آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ تم لوگ تو جانتے ہو کہ اب اس بکری کی اس کے مالک کے نزدیک کوئی قدر باقی نہ رہی؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ بیشک یا رسول اللہ! اس پر آپ نے فرمایا کہ۔

والذی نفسی بیدہ للدنیا اھون علی اللہ تعالیٰ من ھذہ علی صاحبھا و لو کانت تعدل عند اللہ جناح بعوضۃ ماسقی کافرا منھا شربۃ ماء۔

یعنی قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ بلا شبہ دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ بیقدری ہے جیسی کہ بیقدر یہ بکری اپنے مالک کے نزدیک ہے۔

اور پھر یہ فرمایا کہ، اگر دنیا کی وقعت اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کافر کو اس دنیا سے ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتا۔

صاحب روح المعانی نے آیت کی تائید میں روایت دنیا (یعنی دنیا کی بے حیثیتی) کی یہ روایت نقل کرنے اس کے بعد اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے جس میں ہر زمانہ میں ابتلا رہا ہے اور آج بھی لوگ مبتلا ہیں یہ فرمایا کہ:۔

ولا اری الاستدلال علی رداءۃ الاستدلالا فی مقام الضرورۃ۔ نعم ھی نعمت الدار لمن تزود منھا لآخرتہ۔

(روح ص۸۵ ج۱۰)

یعنی یہ رداءت دنیا اور اس کی مذمت پر ان نصوص سے جو استدلال کیا جاتا ہے وہ بر بنائے ضرورت ہی کے ہے ورنہ تو یہی دنیا ایک بہترین مقام بھی ہے ہر اس شخص کے لیے جو اس میں رہ کر توشہ تیار کرلے اپنی آخرت کے لیے۔

اور یہ جو میں نے کہا کہ ہر زمانہ میں لوگوں کو انھیں نصوص کے ظاہر کی وجہ سے دنیا

کھٹکی ہے لیکن جب اصل اور حقیقت پر غور کیا ہے تو غلط فہمی زائل ہوگئی ہے۔ اس پر پہلے زمانہ کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔

ایک عالم ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جاکر دیکھا تو نہایت ہی شاہانہ ٹھاٹھ۔ عالیشان محل۔ چوکی پہرہ ہے۔ یہ سب دیکھ کر افسوس کیا کہ میرا یہ سفر ضائع ہوا۔ یہ تو کوئی دنیا دار شخص معلوم ہوتے ہیں اور میں ان کو بزرگ سمجھ کر آیا تھا۔ یہ خیال کرکے محل کے نیچے زور سے یہ مصرع پڑھا۔

نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد

اور وہاں سے واپس چلے آئے اور پاس کی کسی مسجد میں جاکر قیام کیا اور سوچا کہ اب تو واپس چلنا ہی ہے کچھ دیر آرام کرلیں تو چلیں۔ وہیں لیٹ گئے۔ تھکے تو تھے ہی نیند آگئی، خواب میں دیکھا کہ میدان حشر قائم ہے اور ان کا ہی نام پکارا جارہا ہے کہ فلاں حاضر ہو۔ ایک شخص نے ان پر اپنے کسی حق کا دعویٰ کیا ہے اور اُن کا ہاتھ پکڑے ہوئے کہہ رہا ہے کہ لاؤ میرا حق دو۔ اُن کے پاس کچھ نہیں ہے جس سے اس کا حق ادا کریں۔ اتنے میں وہی بزرگ اپنی سواری پر سے گزرے ان کو گرفتار دیکھ کر سواری روک دی اور پوچھا کیا بات ہے ان کو کیوں پکڑ رکھا ہے لوگوں نے وجہ بتلائی انھوں نے جیب سے روپئے نکالے اور ان کے حق کو ادا کردیا۔ ان لوگوں نے ان کو چھوڑ دیا۔ یہ بزرگ آگے چلے گئے، اتنے میں ان کی آنکھ کھل گئی۔

سمجھ گئے یہ غیبی اشارہ ہے اور واقعی یہ بزرگ ہیں اور میرا حصہ انھیں کے یہاں ہے قیامت میں مجھے ان سے نفع پہونچے گا۔ خود ہی خواب کی یہ تعبیر دے کر ان بزرگ کے مکان پر پھر حاضر ہوئے۔ انھوں نے دور ہی سے دیکھ کر فرمایا کہ ارے بھائی خواب و خیال کی باتوں کا کیا اعتبار؟ انھوں نے دست بستہ معافی مانگی اور عرض کیا کہ حضرت مجھ سے بڑی بے ادبی ہوئی معاف فرمادیجئے۔ فرمایا کہ خیر معاف تو ہے ہی لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم نے اس وقت کہا کیا تھا؟

انھوں نے عرض کیا کہ حضرت وہی تو گستاخی تھی اب اُس کو نہ دھروائیے۔ فرمایا کہ نہیں

پھر کہو میں دوبارہ تم سے سننا ہی چاہتا ہوں۔ جب اصرار دیکھا تو کہا کہ میں نے یہ کہا تھا کہ ؎

نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد

فرمایا کہ تم نے بات تو ٹھیک ہی کہی مگر ناتمام کہی اسمیں دوسرا مصرع یہ لگالو ؎

اگر دارد برائے دوست دارد

سبحان اللہ بہت ہی عمدہ بات فرمائی۔ اور دنیا کو حق تعالیٰ کے لیے دولت رکھنے کا مطلب یہی ہے کہ انسان اس کا حق ادا کرے خدا کے راستہ میں اس کو خرچ کرے۔ اپنی اولاد پر اس کو صرف کرے۔ اپنی ازواج پر اس کو صرف کرے۔ اپنے احباب پر اکو صرف کرے۔ یہ سب برائے دوست ہی میں داخل ہیں اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر اور جامع لفظ تقوٰی کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے الا من اتقی اللہ

سنیئے۔ انسان اپنا کمایا ہوا مال اپنے بال بچوں پر صرف کرے۔ ان کے لیے اثاثہ اور میراث چھوڑ جائے۔ شرعاً یہ بھی مطلوب اور محمود ہے ورنہ تو عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ لوگ فقراء پر تصدق کرنے کو تو کچھ سمجھتے بھی ہیں لیکن اپنے بال بچوں اور آل اولاد پر اپنے مال کو صرف کرنا ثواب نہیں سمجھتے حالانکہ کتاب وسنت سے اسکے خلاف کا ثبوت ہوتا ہے۔

سنیئے۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ ان دنوں میں مکہ میں تھا اور جس سرزمین سے ہجرت کر چکا تھا اب وہاں مرنا مجھے پسند نہ تھا (اسی لیے اللہ والوں کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ موت مدینہ میں آوے) آپ تشریف لائے تو آتے ہی یہ دعا دی کہ اے اللہ ابن عفراء پر رحم فرما۔ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرے پاس کچھ مال ہے اجازت ہو تو میں ان سب کے لیے وصیت کر جاؤں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں ایسا ہرگز نہ کرنا۔ میں نے پھر عرض کیا کہ اچھا تو پھر کیا نصف کی وصیت کر جاؤں آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ عرض کیا کہ اچھا تو پھر کیا ثلث کی وصیت

کرجاؤں آپ نے فرمایا کہ ہاں غیر ثلث کی کر سکتے ہو۔ لیکن ثلث بھی بہت ہے اسکے بعد آپ نے جو ارشاد فرمایا وہی مجھے اس وقت بیان کرنا تھا وہ یہ کہ فرمایا کہ:-

انك ان تدع ورثتك اغنياء خير من ان تدعهم عالة يتكففون الناس في ايديهم وانك مهما انفقت من نفقة فانها صدقة حتى اللقمة ترفعها الى في امراتك وعسى الله ان يرفعك فينتفع بك ناس و يضربك آخرون ولم يكن له يومئذ الا ابنة

یعنی تم اپنے بعد اپنے ورثہ کو مالدار چھوڑ جاؤ یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ تم ان کو ایسا محتاج چھوڑ جاؤ کہ وہ تمہارے بعد دوسروں کے دست نگر ہو جائیں۔ اور بیشک تم نے جو بھی نفقہ اپنے زوجہ اور اولاد صرف کیا وہ سب کا سب صدقہ ہی ہے یہاں تک کہ وہ لقمہ بھی جو تم نے اپنی بیوی کے منہ میں ڈالا وہ بھی صدقہ ہے اور شاید کہ اللہ تعالیٰ تمھیں اس بیماری سے کھڑا کر دیں اور کچھ لوگوں کا نفع اور کچھ کا ضرر تم سے متعلق ہو جس وقت آپ نے یہ فرمایا اُن دنوں ان صحابی کی صرف ایک ہی لڑکی تھی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی صادق آئی اور حضرت سعدؓ اس بیماری سے اچھے ہو گئے، اور اس کے بعد ان کے بہت سی اولاد ہوئی یعنی چار لڑکے ہوئے اور بارہ لڑکیاں۔

تو دیکھئے اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال کو مذموم نہیں بتایا بلکہ آپ نے یہ فرمایا کہ تم اپنے ورثاء کو مالدار چھوڑ جاؤ یہ ان کو نادار چھوڑ جانے سے بہتر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اپنی اولاد کے لیے بھی مال جمع کر جانا۔ اور مال اپنے بعد چھوڑ جانا اللہ ورسول کے منشاء کے خلاف نہیں ہے۔

ایک شخص بہت مالدار تھے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے ان کا تعلق تھا ہر چھٹی میں تھانہ بھون جاتے تھے۔ خانقاہ میں بھی بہت روپیہ خرچ کرتے تھے وہاں کے

لوگوں کی دعوت کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ دیکھو میرا یہ مکان جو ایک لاکھ روپیہ کی مالیت کا ہے اس کو میں تمھارے مہر میں دیتا ہوں۔ ان کے اس معاملہ کا لوگوں میں بڑا چرچا ہوا لوگ کہتے تھے کہ دیکھئے اس زمانہ میں بیوی کا مہر کون دیتا ہے کون دلاتا ہے مگر انھوں نے اتنا بڑا مکان مہر میں دیدیا تو بات کیا تھی۔ بات یہی تھی کہ حضرت مولاناؒ کے یہاں پہونچ گئے تھے اس لیے تقویٰ اور دیانت سے ان کو حصہ مل گیا تھا جس کی وجہ سے مال کے حقوق خواہ وہ خالق کے ہوں یا مخلوق کے سب کو سمجھتے تھے اور ان کو ادا کرتے تھے اور اس کی وجہ سے دنیا کی ایسی محبت قلب میں باقی نہ رہ گئی تھی جو ان حقوق کی ادائیگی میں مانع بنتی۔

اب لوگ ان تعلیمات کو پیش نظر نہیں رکھتے جس کی وجہ سے آپس میں خوب نزاعات اور اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ اتفاق کا ذریعہ تو تعلیمات شرعیہ پر عمل کرنا ہی ہے۔

ہماری طرف ایک شخص تھا اس نے بہت مال کمایا تھا جب اس کا آخری وقت ہوا تو اپنے لڑکے سے پوچھا کہ مال کی وصیت کر دوں لڑکے کو اس کا یہ کہنا ناگوار ہوا اس نے جل کر کہا کہ ہاں خوب مال کمایئے اور زندگی بھر خوب کھایئے اور مزے اڑایئے، اور جب مرنے کا وقت آئے یعنی مال ہم لوگوں کو ملنے لگے تو دوسروں کے لیے وصیت کر جایئے۔

یہ سن کر وہ سمجھ گئے کہ لڑکے کو ہماری بات ناگوار گذری۔ میں نے جب سنا تو اس سے کہا کہ ایسا کیوں کرتے ہو اور یہی حدیث (حضرت سعدؓ والی) اس کو سنا دی کہ دیکھو بھائی تم یہ کرنا چاہتے ہو اور حدیث شریف میں تو ایسا آتا ہے۔ (باقی)
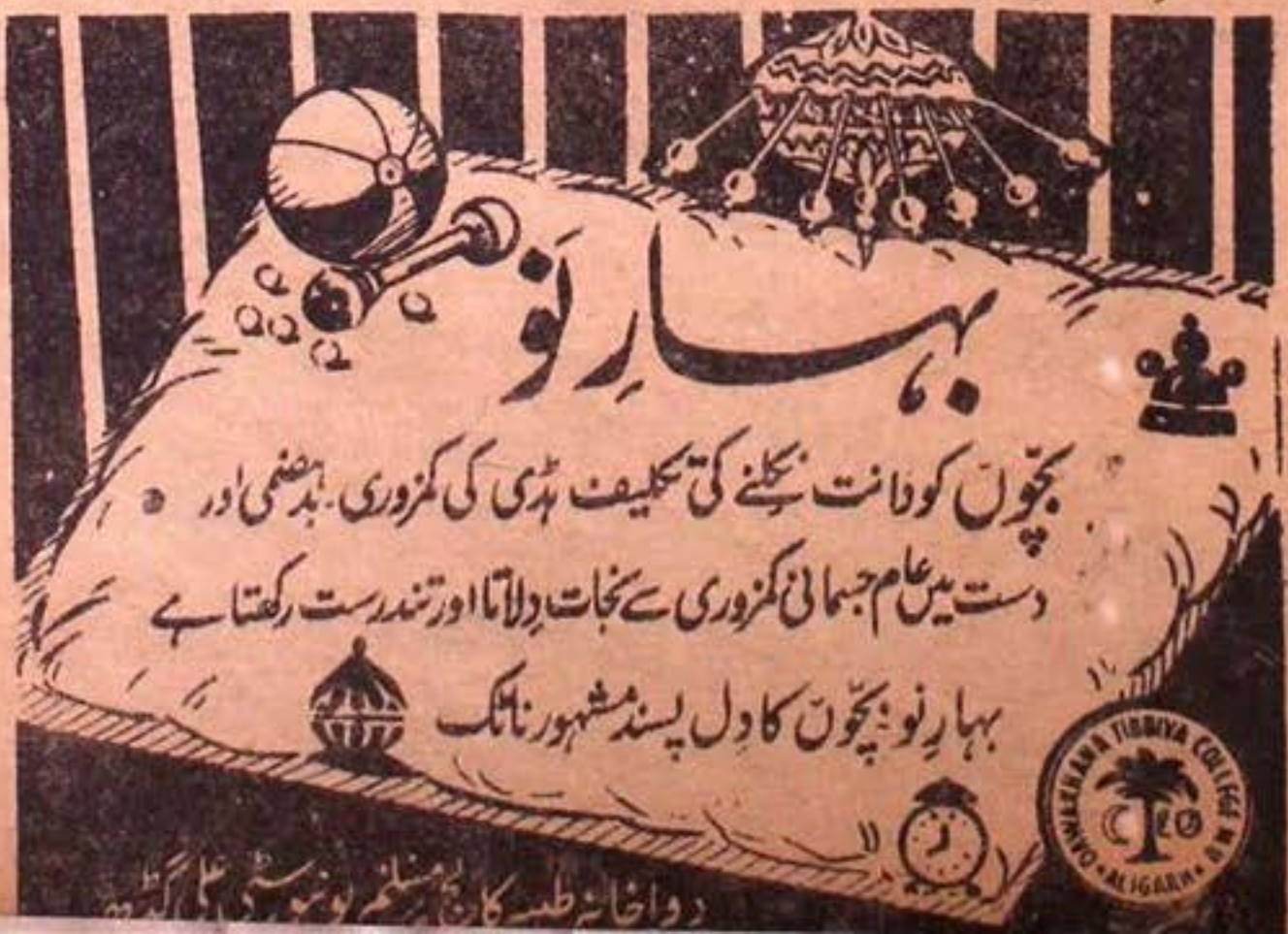
قضاء اور اس کی شرعی بنیاد

از جناب مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی
قاضی القضاۃ امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ

جب مسلمان کلمۂ اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ پڑھتا ہے تو وہ خدا پر اپنے پختہ یقین کا اظہار و اقرار کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی عہد کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی اللہ کی پسند کے مطابق گزارے گا۔ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بس اللہ تعالیٰ ہی کے حکم پر چلے گا۔ جھگڑے ہوں گے تو اُسے اللہ کے اتارے ہوئے قانون یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کے سامنے پیش کرے گا اور شریعتِ محمدی کے فیصلہ کو دل کی گہرائیوں سے قبول کرے گا۔ اور اگر ایک طرف ایمان کا دعویٰ ہو، اور دوسری طرف احکامِ خداوندی سے روگردانی ہو، شریعت کے احکام سے گریز ہو، اللہ کا فیصلہ چھوڑ کر دوسروں کا فیصلہ طلب کیا جاتا ہو تو سمجھئے کہ ایمان میں خامی ہے۔ اور اللہ سے تعلق کمزور ہے۔ قرآن کریم نے نفس کی اس کیفیت کو بڑے بلیغ انداز میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ قرآن پاک کہتا ہے :-

"اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا۔ اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں۔"

(نساء آیۃ ۵۰)

اور اگر آپس میں کوئی جھگڑا ہو جائے تو قرآن ہدایت دیتا ہے :-

"پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو رجوع کرو طرف اللہ کے اور رسول کے۔ اگر یقین رکھتے ہو اللہ پر۔ اور قیامت کے دن پر۔ یہ بات اچھی ہے اور بہت بہتر ہے اس کا

انجام:- (نساء آیت ۵۰)

اور جو لوگ خدا کے فیصلہ سے روگردانی کر کے شیطانی فیصلے قبول کرتے ہیں ان کا حال سنئے:-

"کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ایمان لائے ہیں اس پر جو اترا تیری طرف اور جو اترا تجھ سے پہلے۔ (مگر) چاہتے ہیں کہ قضیہ (جھگڑوں کا فیصلہ کرائیں) لے جائیں شیطان کی طرف۔ حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا۔ کہ طاغوت کا انکار کریں۔ اور چاہتا ہے شیطان کہ ان کو بہکا کر دور لے جائے"

(نساء آیت ۶۰)

ایسے لوگوں کو جب خدا کے حکم کی طرف بلایا جاتا ہے تو ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح جان چھڑا لیتے ہیں:-

"اور جب ان کو کہا جائے کہ آؤ اس (شریعت) کی طرف جسے اللہ نے اتارا ہے اور رسول کی طرف۔ تو آپ دیکھیں گے منافقین کو کہ وہ ہٹتے ہیں، تجھ سے رک کر (کسی نہ کسی طرح جان بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ کے فیصلہ سے گریز کرتے ہیں)۔

(نساء آیت ۶۱)

ابھی تو ان منافقین کا حال یہ ہے کہ باوجود دعویٰ ایمانی کے فیصلہ خداوندی سے گریز کرتے ہیں اور جان بچاتے پھرتے ہیں اور غیر اللہ سے فیصلہ کرتے ہیں۔ لیکن جب ان کے اس برے کرتوت کی وجہ سے ان پر خدا کا عذاب نازل ہونے لگے تو پھر کیا کریں گے:-

"پھر کیا ہو کہ جب ان کو پہونچے مصیبت اپنے ہاتھوں کے کیے ہوئے سے، پھر آویں آپ کے پاس قسمیں کھاتے ہوئے، اللہ کی کہ ہم کو غرض نہ تھی مگر بھلائی اور ملاپ۔ اور یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ جانتا ہے، جو ان کے دل میں ہے۔ سو آپ ان سے تغافل کیجیے۔ اور ان کو نصیحت کیجیے اور ان کے حق میں کہیے بات کام کی"

(نساء آیت ۶۲)

آگے قرآن پاک کہتا ہے کہ رسول کو تو اللہ تعالیٰ اس لیے بھیجتا ہے کہ بحکم خداوندی اس کی اطاعت کی جائے۔ اور ان کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے، اگر کچھ لوگ اس راہ میں غلطیاں کر چکے ہیں تو اب بھی ان کے لیے موقعہ ہے کہ وہ خدا کی طرف رجوع کریں:-

"اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کہ اس کا حکم مانیں اللہ کے فرمانے سے۔ (نساء)

قرآن کریم کے ان پاک ارشادات کا حاصل یہ ہے :۔

- اللہ کی۔ اُس کے رسول کی بات مانو۔ اور اپنے میں سے صاحب امر کے اُن احکام پر عمل کرو جو اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے مطابق ہوں
- کوئی نزاع آپس میں پیدا ہو جائے تو بس اللہ و رسول کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ کراؤ۔
- ایک طرف ایمان کا دعویٰ اور دوسری طرف غیر اللہ سے اپنے جھگڑوں کا فیصلہ کرانا منافقین کا کام ہے۔
- مومن ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے ہر اختلاف میں اللہ و رسول کے فیصلہ کو حرف آخر تسلیم کرے اور اس کو خوشی کے ساتھ قبول و منظور کرے۔

پس یہی وہ تعلیمات ہیں جن پر قضاء کی بنیاد ہے۔ قضاء کا مطلب بس اتنا ہے کہ "آپس میں جھگڑوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی شریعت اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق فیصلہ دیا جائے" ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمان قوت قاہرہ سے محروم ہیں دار القضاء کے قیام کا مقصود یہ ہے کہ "مسلمان جس حد تک ممکن ہو اپنے جھگڑوں میں خود اپنی مرضی سے شریعت خداوندی کے مطابق فیصلے حاصل کر سکیں" یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام نے اپنی قیمتی کتابوں میں یہ بات صاف صاف لکھ دی ہے کہ جہاں اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہ ہو وہاں مسلمانوں پر ضروری ہوگا کہ وہ اپنے میں سے کسی شخص کو امیر منتخب کرلیں۔ جو ان کے لیے قضاۃ کا تقرر کرے۔ مشہور فقیہ علامہ ابن عابدین شامی نے لکھا ہے :۔

> "وہ ممالک جہاں والی کفار ہوں تو (وہاں) مسلمانوں کے لیے جمعہ اور عید کا قائم کرنا جائز ہے۔ اور مسلمانوں کی باہمی رضا سے مقرر کیا ہوا قاضی وہاں "قاضی" قرار پائے گا۔
>
> پس مسلمانوں پر ضروری ہوگا کہ اپنے میں سے کسی مسلمان والی کی تلاش کریں"

اور علامہ ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں لکھا ہے :۔

> "جب کسی ملک میں ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ وہاں نہ مسلمان بادشاہ ہو اور نہ کوئی دوسرا ایسا والی جس کی طرف سے قاضیوں کا تقرر درست ہو۔ جیسی صورت حال قرطبہ جیسے ان مسلم

ممالک میں پیدا ہو چکی ہے۔ جہاں کفار کا غلبہ واقتدار ہے۔ ایسی صورت میں مسلمانوں پر واجب ہوگا کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک شخص پر متفق ہو کر اسے امیر بنالیں اور وہ ان کے مقدمات کے فیصلے کے لیے قاضی مقرر کرے اور وہی قاضی مسلمانوں کے باہمی نزاعات کا فیصلہ کیا کرے .....؟

صاحب نہر کہتے ہیں :-

"یہی وہ طریقہ ہے جس پر قلب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے پس اس پر بھروسہ کرنا چاہیئے"[1]

انہی مصالح شرعی کی رعایت کرتے ہوئے ہر دور میں علماء دین حنیف نے نظام قضاء کے قیام کو ایک ضروری کام قرار دیا ہے۔ علامہ ابن تیمیہ نے ایک جگہ لکھا ہے :-

"آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی ایسی جماعت پر اپنے میں سے کسی کو امیر مقرر کرلینا ضروری قرار دیا جو دوران سفر عارضی طور پر تھوڑے سے افراد کے اکٹھا ہو جانے سے بن جاتی ہے اور اس طرح اجتماع کی تمام قسموں کے احکام پر متنبہ فرمادیا۔ اور ولایت قضاء کا قیام تو دینی نقطۂ نظر سے اور اللہ تعالیٰ سے تقرب کے پیش نظر واجب ہے کہ یہ کام بہترین ثواب کا موجب اور خدا سے نزدیک کرنے والا ہے"[2]

اور امام سید سمہودی کا فتویٰ یہ ہے :-

"ایک زمانہ تک کسی علاقہ میں قاضیوں کے تقرر کا سلسلہ بند کردینا معصیت ہے"

فتاویٰ کبریٰ میں سید سمہودی کے اس فتویٰ کے بعد متصلاً مذکور ہے :-

---

[1] واما بلاد علیھا ولاۃ کفار فیجوز للمسلمین اقامۃ الجمع والاعیاد ویصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین فیجب علیھم ان یلتمسوا والیا منھم اھ وعزاہ مسکین فی شرحہ الی الاصل ونحوہ فی جامع الفصولین وفی الفتح اذا لم یکن سلطان ولا من یجوز التقلد منہ کما ھو فی بعض بلاد المسلمین غلب علیھم الکفار کقرطبۃ الآن یجب علی المسلمین ان یتفقوا علی واحد منھم یجعلونہ والیا فیولی قاضیا ویکون ھو الذی یقضی بینھم وکذا ینصبوا اماما یصلی بھم الجمعۃ اھ وھذا ھو الذی تطمئن النفس الیہ فلیعتمد۔ نہر" (شامی کتاب القضاء ص ۳۰۰ ج ۴) [2] کتاب الاختیارات لشیخ الاسلام ابن تیمیہ۔

"اس کی تائید علامہ مقدسی کے اس قول سے ہوتی ہے جو" اشارات" کے باب القضاء میں ہے کہ جب اہل شہر سب کے سب اس پر مجتمع ہو جائیں کہ کوئی شخص ان میں قضاء کا والی نہ ہو تو سب کے سب گنہگار ہوں گے۔" ؎۱

علامہ ابن حجر نے لکھا ہے:-

"جب کسی علاقہ پر اس کی مرکز سے دوری کے باعث یا اس وجہ سے کہ اس علاقہ کی خبریں مسلم والی تک نہیں پہونچتی ہوں یا وہاں کے لوگ سلطان کی اطاعت نہیں کرتے اگر دہ اس طرح کے اسباب کی وجہ سے) سلطان کا اثر و اقتدار اس علاقہ پر ختم ہو چکا ہو اور وہاں اس نے قاضی مقرر نہیں کیے تو وہاں کے ذمہ داروں پر واجب ہو گا کہ کسی کو اپنا والی مقرر کر لیں جو ان کے احکام شرعی کو انجام دے۔ اور ان کو منتشر چھوڑ دینا جائز نہ ہو گا۔ کہ اس سے بڑے نقصان کا اندیشہ ہے۔" ؎۲

علامہ ابو الحسن اصبحی شافعی سے پوچھا گیا کہ:-

"اگر کسی علاقہ میں با اقتدار حاکم موجود نہ ہو۔ عورتوں کے لیے ولی نہ ہو، بچوں کے لیے وصی نہ ہو، اسی طرح مسلمانوں کے دوسرے معاملات کے لیے کوئی ذمہ دار نہ ہو تو کیا اس ملک والوں کو اس کا اختیار ہو گا کہ وہ کسی فقیہ (قاضی) کو مقرر کر لیں جو ان کے ناموس اور اموال کے بارے میں شرع کی روشنی میں معاملات طے کرے"؟

تو انھوں نے جواب دیا:-

"ہاں! جب ان کے معاملات کا ذمہ دار والی موجود نہ ہو تو اہل حل و عقد میں سے تین آدمی اکٹھے ہو کر قاضی مقرر کر لیں۔" ؎۳

اکابر ہند کا رجحان

اکابر علماء ہند میں حضرت مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کا جو مقام ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ انھوں نے انگریزوں کا تسلط ہوتے ہی حسب ذیل فتویٰ دیا تھا:-

---

؎۱ و ؎۲ و ؎۳ فتاویٰ کبریٰ۔

"اگر کفار کی طرف سے مسلمان والی دار الحرب کے کسی مقام پر مقرر ہو تو اس والی مسلم کی اجازت سے جمعہ قائم کرنا درست ہے۔ ورنہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ ایک امین اور دیندار شخص کو سردار (والی) خود ہی مقرر کرلیں اور اس کے حکم سے جن نابالغوں کا کوئی والی نہ ہو نکاح پڑھایا جائے اور غائب اور یتیموں کے مالوں کی حفاظت کی جائے۔ اور موافق نصوص شرعیہ ان ترکات کی تقسیم کی جائے جن میں نزاع ہو۔ سوا اس بات کے کہ ملکی کاموں میں مداخلت اور تصرف والی کو نہیں کرنا چاہیئے۔" (فتاوی عزیزیہ اول)

اکابر علماء ہند نے اجتماعی حیثیت سے بھی اور انفرادی طور پر بھی قضاء شرعی کے قیام کی ہمیشہ اہمیت محسوس کی ہے۔ اور اس کے قیام کے لیے جد وجہد کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کے اساسی اصول وآئین وضوابط (جو دہلی کے اجلاس، ۷، ۸، ۹ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹، ۲۰، ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء میں منظور ہو کر شائع ہوئے) میں دفعہ ۳ شق واؤ کے تحت اغراض ومقاصد کے ذیل میں "شرعی ضرورتوں کے لحاظ سے فصل خصومات کے لیے محکمۂ دار القضاء قائم کرنا" بھی داخل ہے۔
جمعیۃ علماء ہند نے اپنے بارھویں اجلاس منعقدہ ۱۹۴۰ء بمقام جونپور بصدارت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے حسب ذیل تفصیلی تجویز منظور فرمائی:-

"تجویز ۵

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس ہندوستان میں مسلمانوں کی مذہبی، ترقی، اور اقتصادی اصلاح اور ہر نوع کی فوز وفلاح کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کے ماتحت اپنا امیر منتخب کر کے اس کے ہاتھ پر سمع وطاعت کی بیعت کریں۔ یہ ایک اہم فریضہ ہے۔ جس کی طرف جمعیۃ علماء ہند ۱۹۲۱ء سے مسلمانوں کو توجہ دلا رہی ہے، بہر حال مسلمانوں پر اس فریضہ کی ادائیگی لازم ہے۔"

اس تجویز کو حضرت مولانا عبد الصمد رحمانی علیہ الرحمہ کی اس توضیح کی روشنی میں پڑھیے جس میں موصوف نے قیام امارت کے مقاصد کو بیان فرمایا ہے:-

"(اس کا) مقصد مسلمانوں کی صحیح مذہبی تنظیم اور ان کی اسلامی زندگی کی استواری، اسلامی حقوق اور مفاد کی نگہداشت، اسلامی اصول وفروع اور اس کے احکام کو بروئے کار لانا،

اور بقدر وسعت اس کے اجراء اور تنفیذ کے مواقع پیدا کرنا تھا۔ اور نکاح وطلاق میراث وخلع کے احکام کی صحیح صورت میں اقامت تھا۔ اور حضرت مولانا شاہ عبد العزیز کے الفاظ میں اقامت جمعہ واعیاد، والنکاح من ولی من الصغار، وحفظ اال غائب و ایتام، قسمت ترکات متنازع فیہا علی السہام کے فرائض کو انجام دینا تھا۔

(تاریخ امارت)

۱۹۱۷ء کا میمورنڈم

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ نے اپنے خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن، بمبئی میں یہ لکھا ہے کہ قیام قضاء کے لیے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ۱۹۱۷ء میں حضرت مولانا محمد احمد کی سربراہی میں ایک مؤقر وفد وزیر ہند سے ملا۔ اس میمورنڈم کی تھوڑی سی تفصیل خود حضرت قاری صاحب موصوف کے الفاظ میں پڑھیے:۔

"اس میمورنڈم میں بنیادی مطالبے دو تھے، ایک یہ کہ ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کے اجراء کے لیے محکمۂ قضاء قائم کیا جائے .... دوسرا یہ کہ مسلمانوں کے مذہبی شعائر، مساجد، مدارس، مقابر، اوقاف، خانقاہوں، اور دوسرے دینی رفاہ عام کے تحفظ ونگرانی اور نظم ونسق کے لیے شیخ الاسلام کا عہدہ قائم کیا جائے۔ جو ان تمام شعائر کو تنظیم کے ساتھ چلانے کا ذمہ دار ہو"

مولانا عثمانی کا ارشاد گرامی

صوبہ بہار کے مشہور شہر گیا میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اجلاس کی صدارت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی نور اللہ مرقدہ نے فرمائی۔ اور اپنے خطبۂ صدارت میں وضاحت اور صراحت کے ساتھ فرمایا:۔

"ایسی حالت میں کہ مسلمان ایک غیر طاقت کے زیر حکومت ہیں اور ان کو اپنے معاملات میں مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ مسلمان اپنے لیے "والی" اور "امیر" مقرر کر لیں۔ دار القضاء قائم کر کے قضاۃ اور مفتیین کا تقرر کریں"

۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس ہوئی۔ اس سال مسلم کانفرنس دہلی نے صراحت کے ساتھ ایک خاص تجویز کے ذریعہ قیام دار القضاء کو اپنے مطالبہ میں شامل کر لیا تھا پھر ان

حضرات کی مزید تنبیہ اور تقویت کے لیے جمعیۃ علماء ہند کے ذمہ داروں نے ان تمام حضرات کے پاس اپنا خاص فارمولا خصوصیت سے بھیجدیا تھا (نقیب مجریہ ۲۰ رجب ۱۳۵۷ھ) تذکرۂ علماء ہند ص ۳۲-۳۳ پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا محمد سجادؒ صاحب اور حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی نے قیام امارت کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"اب .... ضرورت ہے کہ مرکزی نظام شرعی اور قیام امارت فی الہند کی تجویز شرعی کو عملی شکل دی جائے۔"

حضرت العلامہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ایک قیمتی تحریر اس سلسلہ میں ارقام فرمائی ہے۔ جو "مسئلہ امارت اور ہندوستان" نامی کتاب میں بطور مقدمہ شامل ہے۔ اس تحریر میں علامہ نے امارت شرعیہ اور دار القضاء کے قیام کی اہمیت کو بہت واضح لفظوں میں سمجھایا ہے۔

مولانا مونگیری نے فرمایا

قطب عالم حضرت مولانا محمد علی مونگیری فرماتے ہیں:-

"اسلام کے معاشرتی مسائل، فسخ نکاح، تفریق، خلع وغیرہ سب کے سب ایسے مسائل ہیں، جن میں قضائے قاضی شرط ہے۔ اور بغیر قضائے قاضی کے ان کا حل ممکن نہیں ہے۔ متقدمین و متاخرین تمام اس پر متفق ہیں، موجودہ زمانہ میں شرعی قاضی نہ ہونے کی وجہ سے کتنے مفاسد پیدا ہو رہے ہیں۔ اس پر واقعات مسلمانوں کی زندگی کے شاہد ہیں۔ حتیٰ کہ اب سنا جاتا ہے کہ بعض شریف عورتیں نعوذ باللہ ظالم شوہروں سے جابر ہونے کے لیے ارتداد کی راہ تک رہی ہیں۔"

اسی طرح یہ بھی معلوم ہے کہ مسلمانوں کا کسی کافر کے سامنے اپنے مقدمات کو فیصلہ کے لیے از خود لے جانا شرعاً حرام ہے۔ حتیٰ کہ کسی کافر کو حکم بنانا بھی جائز نہیں ہے۔ فقہائے کرام نے اس کی تصریح فرمادی ہے۔"

(خطبۂ صدارت اجلاس پنجم جمعیۃ علماء بہار ۱۹۴۳ء)

حضرت مولانا لکھنوی کا فتویٰ

حضرت مولانا عبد الحی صاحب لکھنوی کے پاس بنگال سے ایک سوال آیا کہ ایک نابالغ لڑکی کی شادی اس کے غیر ولی

مجبر نے کر دی تھی۔ اس نے بعد بلوغ، خیار بلوغ کو استعمال کرتے ہوئے خود ہی بغیر قضائے قاضی کے نکاح فسخ کر کے دوسرے سے نکاح پڑھا لیا۔ اس کے جواب میں مولانا موصوف نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:-

"خیار بلوغ کی بنا پر نکاح کے فسخ کرنے میں قضائے قاضی شرط ہے۔ اس لیے دوسرا نکاح ناجائز ہوا اور جن شہروں پر کفار کا قبضہ ہے۔ اور وہاں قضائے قاضی موجود نہیں ہے۔ اور ایسا واقعہ ہو جائے تو یہ کرنا چاہیے کہ جہاں قاضی ہوں وہاں معاملہ پیش کر کے انفصال طلب کرنا چاہیے مثلاً حجاز، مدم، رام پور، بھوپال وغیرہ۔"

(مجموعہ فتاویٰ عبدالحی صـ ۳۶/ج۲)

حضرت کشمیری کا ارشاد پشاور میں جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیری نے جو خطبۂ صدارت پڑھا، اس میں آپ نے "دار القضاء شرعی کا فقدان" کے عنوان کے تحت فرمایا:-

"سب سے زیادہ اہم مصیبت ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ ہے کہ ہندوستان میں دار القضاء شرعی مفقود ہے، مذہبی احکام و معاملات میں بہت سے امور ایسے ہیں جن میں قاضی شرعی کے فیصلہ کی ضرورت ہے۔ اور بغیر اس کے فیصلہ اور حکم کے وہ نافذ بلکہ جائز العمل نہیں ہوتے۔ نکاح۔ طلاق۔ خلع۔ میراث۔ وغیرہ کے بہت سے معاملات ہیں جو ابنائے زمانہ کی مذہبی تعلیم اور مذہبی تربیت نہ ہونے اور ہوائے نفسانی کی اتباع کی وجہ سے ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ بدون تنفیذی قوت کے ان کا سلجھاؤ نہیں ہو سکتا، علماء و مفتیانِ دین کا کام صرف حکم شرعی ظاہر کر دینا ہے، لیکن اس حکم کو جاری کرنے کی کوئی طاقت علماء اور مفتیوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس لیے تمام ایسے معاملات میں جن کو قاضی شرعی کی عدالت سے فیصل ہونا چاہیے تھا غیر مسلم ججوں کی عدالتوں سے فیصل ہوتے ہیں۔ اور شرعی احکام کے موافق وہ فیصلہ نافذ اور جائز العمل نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں موجودہ قانون وقت مسلمانوں کی ضرورت کے لیے ناکافی یا ان کی ضرورت کے بالکل منافی واقع ہوا ہے اور اس لیے حکومت کی عدالتوں سے ایسے فیصلے ہو جاتے ہیں جو مصالح

اسلامیہ کے بالکل خلاف اور احکام مذہبیہ سے متضاد واقع ہوتے ہیں۔

ان تمام وجوہ پر نظر کر کے جمعیۃ علماء ہند کئی سال سے متواتر جمہور مسلمین کو متنبہ کر رہی ہے کہ وہ جلد از جلد اس فریضہ کو ادا کریں۔ کہ اپنے معاملات وقضایا کے فیصلہ کے لیے شرعی قاضی مقرر کریں اور تمام ایسے معاملات جنھیں قاضی شرعی کے فیصلہ کی ضرورت ہے۔ اس کی عدالت میں رجوع کر کے اس کے شرعی فیصلہ پر کاربند ہوا کریں۔"

پھر حضرت موصوف نے مظلوم، مجبور، اور بے کس عورتوں کی مشکلات کا واحد حل قاضی کے فیصلہ کو قرار دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ:-

"مسلمان جبکہ باہمی اتفاق سے اپنے امیر اور قاضی منتخب کرلیں گے تو ان پر ان کے احکام اور فیصلوں کا تسلیم کرنا بھی لازم ہوگا۔ اور ان امیروں، قاضیوں کو شرعی فیصلہ دینے کا حق ہو جائے گا۔ اور اس طرح مسلمانوں کے شرعی معاملات قضائے شرعی کے ماتحت انجام پذیر ہوں گے ....

ہندوستانی صوبوں میں سے صوبہ بہار قابل مبارکباد ہے کہ اس نے امارت شرعیہ کا ایک نظام قائم کر رکھا ہے اور اس کے ماتحت بہت سے مفید قومی اور مذہبی کام انجام پاتے ہیں۔ اگر ہندوستان کے دوسرے صوبے بھی اس فرض کو ادا کریں تو پھر ان کی اجتماعی قوت سے ہر صوبہ کی مقامی حیثیت بھی بہت قوی ہو جائے گی۔ اور تمام ہندوستان میں ایک منظم محکمہ شرعیہ قائم ہو جائے گا۔"

(خطبہ صدارت اجلاس پشاور ۱۳۴۶ھ)

حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی تقریر

دار القضاء امارت شرعیہ کھو جیور جدید ضلع آرہ، بہار کے افتتاح کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی علیہ الرحمہ نے فرمایا:-

"آج کی دنیا میں شدید ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی زندگی کے تمام مسائل قرآن وسنت کی روشنی میں ڈھونڈیں اور مسلمان اسلامی قوانین نافذ وجاری کریں۔ نکاح وطلاق، فسخ وخلع، اور دیگر باہمی معاملات اپنے قائم کردہ امارت اور

دار القضاء کے فیصلہ سے حل کریں۔ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لیے جمعیۃ علماء ہند کے سامنے اول یوم سے جو سب سے اہم ترین کام پیش ہے وہ مسلمانوں کی اسلامی تنظیم اور نظام شرعی کا قیام ہے۔" (نقیب ۲۱ر دسمبر ۱۳۵۹ھ)

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کا ارشاد

پچھلے سال ۹۲ھ میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے "نظامِ قضاء کا قیام" کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا۔ جس میں انھوں نے قضاء کے قیام کو ہندوستانی مسلمانوں کے دینی و ملی فریضہ اور معاشرتی مسائل کا واحد شرعی حل قرار دیا۔ قضاء کی اہمیت اور تاریخ پر گفتگو کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں:۔

"حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دار العلوم دیوبند نے اپنے دور میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی اول صدر مدرسین دار العلوم، دیوبند کو قاضی مقرر فرمایا، پھر حضرت حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے بلا لحاظ مسلک، مختلف مسالک کے پانچ سو سے زیادہ علماء کرام سے نظام قضاء کے مسئلہ پر تائیدی دستخط حاصل فرمائے۔ یہ تائیدی تحریرات اور دستخط آج بھی محافظ خانہ دار العلوم میں محفوظ ہیں۔ اس مسئلہ کو متاخرین علماء میں حضرت مولانا محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پوری قوت سے اٹھایا۔"

موجودہ حالات کی مشکلات اور پیچیدگیوں پر بحث کرنے کے بعد قاری صاحب موصوف رقم فرماتے ہیں:۔

"ان حالات میں مسلمانوں کی جماعتی زندگی کا قیام اور بقدر استطاعت احکام شرعی اسلامی کے نفاذ کے لیے نظام قضاء کو ہندوستان گیر پیمانے پر پوری طرح منظم کر دینا ملت اسلامیہ کا فرض اولیں ہونا چاہیے۔

....

اس بارہ میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ امارت اور اس کے تحت محکمۂ دار القضاء کا ملک میں قیام کوئی دشوار امر نہیں، اور نہ اس میں کوئی خاص رکاوٹ ہے۔ اس کا ایک صوبائی نظام پچاس سال سے صوبہ بہار و اڑیسہ میں قائم ہے۔ صوبہ میں متعدد مقامات پر دار القضاء

قائم ہیں۔ جہاں امارت کی طرف سے قضاۃ مقرر ہیں..... مسلمان ان دار القضاؤں میں اپنے ہر طرح کے مقدمات لاتے ہیں اور بہت آسانی سے انصاف حاصل کرتے ہیں۔ اور سالہا سال کا تجربہ ہے کہ ان دار القضاؤں کے فیصل شدہ مقدمات بے چون وچرا مسلمانوں میں مانے جاتے ہیں۔ اس پورے پچاس سال میں غالباً صرف گیارہ مقدمات ہیں جن کی اپیل سرکاری عدالت میں کی گئی۔ مگر یہ بات خوشی کی ہے کہ سرکاری عدالت نے ان ہی فیصلہ جات کو برقرار رکھا جو قاضیوں نے کیے تھے۔

اگر پورے ملک میں اس طرح کے دار القضار قائم ہو گئے تو اس کی پوری توقع ہے کہ نکاح وطلاق اور فسخ وتفریق سے سو فیصدی اور دوسرے قسم کے بہت سے مقدمات ان دار القضاؤں میں دائر ہو کر فیصل ہوں گے۔ اور پھر ان کے ذریعہ مسلمانوں کے بہت سے اندرونی وبیرونی جھگڑے خود بخود طے پاتے رہیں گے۔

ایک غیر مسلم کا اعتراف اس تحریر کے خاتمہ پر بہتر ہے کہ ایک غیر مسلم کا اعتراف بھی پڑھتے جائیے۔ ہنٹر لکھتا ہے:-

"ہم جانتے ہیں کہ باقاعدہ قاضیوں کی غیر موجودگی میں مسلمانوں کے لیے ناممکن ہے کہ وہ اپنی زندگی مذہبی قواعد کے ساتھ بسر کر سکیں۔ ان کی اجازت بعض مذہبی مراسم میں ہی ضروری نہیں، بلکہ مسلمانوں کی روزانہ زندگی میں بھی کئی ایک چھوٹے چھوٹے مسئلے ایسے پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا صحیح حل صرف "قاضی" ہی کر سکتا ہے۔"

(ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۶۹، ۲۶۸)

پس قرآن وسنت اور علماء امت کے فتاویٰ کی روشنی میں پورے ملک میں نظام قضار کا قیام اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کو شرعی فیصلہ حاصل کرنا اور خصوصیت کے ساتھ معاشرتی وازدواجی زندگی کی مشکلات کو حل کرنا، ایک بڑا فریضہ ہے۔ دعا ہے کہ خدا تعالیٰ اصحاب ہمت علماء کو اس فریضہ کی انجام دہی کے لیے کھڑا کر دے ــــــ آمین۔

انشورنس، فقہی نقطۂ نظر سے

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

(۱)

سال گذشتہ پہلے "اسلام اور عصر جدید" میں اس کے بعد "الفرقان" میں محترم جناب ڈاکٹر نجات اللہ صاحب صدیقی کا گرانقدر مقالہ "انشورنس اسلامی معیشت میں" کے عنوان سے شائع ہوا۔ موصوف نے اپنے مقالے کا اصل مقصد و موضوع جو بیان کیا ہے وہ خود ان کے الفاظ میں "ایک اسلامی معاشرے کے سیاق میں انشورنس کی سند کی تنقیح و تحقیق" ہے۔

موصوف نے مقالے کے آغاز ہی میں اپنے مطالعے اور غور و فکر کے نتیجے میں اپنا یہ تاثر بھی ظاہر کر دیا ہے کہ "اس میں اُس قمار کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا جسے اللہ نے حرام کیا ہے"۔ اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ "سود کے بغیر بھی انشورنس کی تنظیم ممکن ہے"۔

(اسلام اور عصر جدید، ص ۵۲۔ شمارہ اپریل ۱۹۷۲ء)

اور پھر پورے مقالے میں (جو بہت تفصیلی اور جامع ہے) انشورنس کی اسکیم کا ایسا خاکہ پیش کیا گیا ہے جو انشورنس کی موجودہ اور رائج صورتوں سے قدرے مختلف[ع] ہے، اور مقالہ نگار کی نظر میں قمار اور سود دونوں سے پاک ہے۔

[ع] موصوف کی پیش کردہ صورت میں، انشورنس کرانے والے کو کمپنی سے رقم صرف اسی صورت میں مل سکتی ہو جبکہ وہ حادثہ پیش آجائے جسکی تلافی کے لیے یہ کرایا گیا تھا، اور ایک فرق یہ بھی ہو کہ کمپنی کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ وہ اس رقم سے کسی کو سود پر قرضے دے سکے، اور نہ وہ پالیسی خریدنے والوں ہی کو ان کی جمع کردہ رقم کا سود دے گی، جیسا کہ آجکل عموماً ہوتا ہے۔

مقالہ نگار کی حسنِ نیت اور اُن کے جویائے حق ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ انھوں نے اسلام اور معاشیات دونوں پر نظر رکھنے والوں کو اس پر نہ صرف غور کرنے بلکہ بحث کرنے کی بھی عمومی دعوت دی ہے۔ (اور راقم سطور سے تو اس کی خاص طور پر مکتوب کے ذریعہ فرمائش کی ہے)

یہاں کسی معاشیات کے ماہر کی حیثیت سے تو نہیں البتہ فقہ سے مناسبت رکھنے والے اور اس کی خدمت کرنے والے کی حیثیت سے چند معروضات کی شکل میں ان شبہات کا پیش کرنا مقصود ہے جو مقالے^ع کے اندر پیش کردہ انشورنس کی اسکیم کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں، اور جو انشورنس کے اسلامی ہو سکنے میں ایک اہم مانع کی حیثیت رکھتے ہیں، راقم سطور کے خیال میں اُن کے دور ہوئے بغیر کوئی دوٹوک فیصلہ کر دینا خلافِ احتیاط بلکہ شاید نامناسب اور عاجلانہ اقدام ہوگا۔

اصل مقالے اور اس کے مشتملات پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب یا غالباً ضروری ہوگا کہ وہ چند اصولی باتیں ذکر کر دی جائیں جو براہِ راست قرآن و سنت سے ماخوذ یا بیشتر علمائے راسخین کے اجتہادات کا متفقہ نتیجہ ہونے کی بناء پر "مسلمہ اصول" کا درجہ رکھتی ہیں کہ جن سے اس مسئلہ کے سمجھنے اور حل کرنے، نیز تجزیہ کرنے اور اس کے بعد صحیح رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی۔

(۱) اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق مقاصد اور ذرائع دونوں ہی کا صحیح اور مشروع ہونا ضروری ہے، ان میں سے کسی ایک کے بھی نادرست اور غیر مشروع ہونے کی صورت میں اس کی مطلوبیت تو ایک طرف جواز کی بھی گنجائش نہیں رہتی بلکہ وہ ممنوع قرار پاتی ہے (اس کی دلیل آگے میں آرہی ہے)

(۲) کسی چیز یا معاملے کے حرام یا حلال ہونے میں حقیقت کے ساتھ صورت کی بھی اہمیت ہے، اس لیے حقیقت اور صورت .... بدل جانے بلکہ صرف صورت کے بدلنے ہی سے کبھی حکم میں تبدیلی آجاتی ہے۔ حضرت بلال رضی کا یہ واقعہ اس پر شاہد ہے: "تمر کان عندنا ردی فبعت منه صاعین بصاع لمطعم النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال رسول اللہ عند ذلک اوہ عین الربو

ع ان سطور میں اصلاً تو زیر بحث مقالہ کے مشتملات پر ہی گفتگو کی گئی ہے، مگر ضمناً بعض ایسی دوسری چیزیں بھی زیر بحث آگئی ہیں جو اس بارے میں مختلف لوگوں نے پیش کی ہیں تاکہ اس مسئلہ کا ایک درجہ میں مکمل جائزہ سامنے آجائے۔

لاتفعل ولکن اذا أردت أن تشتری فبع التمر ببیع آخر ثم اشتر بہ[۲]" مطلب یہ ہے کہ پہلے جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے ایک قسم کی کھجور کا دوسری قسم کی کھجور سے براہِ راست تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع کیا اور اسے "اصلی سود" قرار دیا اور پھر خود مشورہ دیا کہ پہلے کھجور کو قیمتہ" فروخت کردو، اور پھر اسی قیمت سے دوسری قسم کی کھجور خرید لو، اب اگر اس طرح کی خرید و فروخت کے بعد وہی نسبت برقرار رہتی ہے تو بھی یہ دوسری شکل جائز ہوگی، کہ جسمیں کھجور سے کھجور کا تبادلہ نہیں ہے۔

(۳) اگر کسی شئے کا حکم نص میں موجود ہو تو دوسری غیر منصوص الحکم شئے کا بھی وہی حکم ہوگا، بشرطیکہ اس میں وہ وصف یا اوصاف موجود ہوں جنھیں علت کہا جاتا ہے اور جن پر حکم کا دارومدار ہے۔ اس وصفِ خاص کے علاوہ بقیہ تمام اوصاف میں اگر اختلاف بھی ہو تو بھی حکم نہیں بدلے گا۔

مثلاً گیہوں سے گیہوں کا تبادلہ کرنا ہو تو اس کا صحیح حدیث میں حکم موجود ہے کہ برابر سرابر ہونا چاہیے، کمی بیشی سود ہوگی جو جائز نہیں[۲]۔ لیکن چاول کا چاول سے تبادلہ کرنا ہو تو کیا حکم ہوگا؟ اس کا جواب قرآن و حدیث سے براہ راست نہیں تھا۔ لہٰذا اس کا حکم معلوم کرنے کے لیے غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ گیہوں کے حکم کا جس وصف یا علت پر مدار ہے، وہ وصف یا علت چاول میں بھی موجود ہے۔ لہٰذا جمہور علماء کے نزدیک دونوں کا حکم یکساں قرار پایا حالانکہ یہ دونوں دیگر بہت سے اوصاف کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف بھی ہیں۔ اسی طرح مثلاً نمک[۴] اور چونے میں (امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک) وہ وصف مشترک ہے جس پر "ربا" کا مدار ہے (یعنی اتحادِ قدر و جنس) لہٰذا چونے کا حکم، خرید و فروخت کے بارے میں، وہی ہوگا جو نمک کا ہے[۵]۔ حالانکہ دیگر بہت سے اوصاف کے لحاظ سے یہ دونوں اتنے مختلف ہیں کہ گویا دونوں میں کوئی مناسبت ہے ہی نہیں، اس کے باوجود یہ ہمہ جہتی اختلاف اس لحاظ سے اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ صرف ایک ایسے وصف کا اشتراک ہی اہم ہے جس سے حکم میں اتحاد کی شان پیدا ہوگئی۔

(۴) علّت اور حکمت دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، علّت پر حکم کا مدار ہوتا ہے، حکمت اور محض وقتی مصلحت پر نہیں، اس لیے اگر علّت موجود ہو اور حکمت نہ ہو تو حکم لگ جائے گا، اس کے برخلاف محض حکمت یا کوئی وقتی مصلحت پائی جاتی ہو اور علّت موجود نہ ہو تو حکم نہیں لگے گا جیسا کہ حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: "تلک الوصف التی تنظم کثرۃ ھی العلۃ التی یدور الحکم علی دورانھا"[۶]

۵ آگے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

(۵) کسی عقد یا معاملے کی صحت، یا اس کے شرائط معتبر ہونے اور از روئے شریعت لازم العمل ہونے کے لیے محض فریقین (معاملہ کرنے والوں) کی "رضامندی" کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عقد اپنی اصل وضع کے اعتبار سے مشروع ہو، اور اس میں طے شدہ شرطیں بھی شرعاً صحیح اور عقد کے تقاضے کے مطابق ہوں، ورنہ صرف طرفین کا راضی ہونا اس عقد کے حلال یا صحیح ہونے کے لیے کافی نہیں۔ جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے:۔ "الصلح جائز بین المسلمین الا صلحاً حرّم حلالاً او احلّ حراماً، والمسلمون علیٰ شروطهم الا شرطاً حرّم حلالاً او احلّ حراماً"۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے:۔ "ما بال رجال یشترطون شروطاً لیست فی کتاب اللہ، ما کان من شرط لیس فی کتاب اللہ فهو باطل وان کان مائة شرط، قضاء اللہ احق وشرط اللہ اوثق"۔)

(۶) کسی معاملے میں اسباب حلت و حرمت دونوں جمع ہوں تو اسباب حرمت کو ترجیح ہوگی اور وہ معاملہ حرام قرار دیا جائے گا (جس کی بہت سی نظیریں موجود ہیں، مزید تفصیل اگلی بحثوں میں آرہی ہے)

(۷) ہمارا ایمان ہے، اور یہی حقیقت بھی ہے، کہ اسلام قیامت تک کے لیے شمع ہدایت ہے، اس حقیقت اور عقیدہ کا لازمی نتیجہ ہے کہ اب کوئی مسئلہ ایسا پیش نہیں آسکتا جس کے بارے میں اسلامی شریعت سے رہنمائی نہ حاصل نہ ہو سکے، بلکہ ہر پیش آمدہ صورت کا حل شریعت میں ضرور ملے گا، لیکن اس "راہ نمائی" اور "حل کی موجودگی" کا مطلب یہ ہے (اور ہو بھی یہی سکتا ہے) کہ شریعت میں ایسے اصول موجود ہیں، جن کی روشنی میں جواب تلاش کیا جا سکے، اس لیے اب ہر نئے مسئلے کا حل ان اصول ہی کے ذریعے دریافت کیا جائے گا، اس کے علاوہ کسی اور طریقے سے نہیں۔

ے (پچھلے صفحہ کا حاشیہ) ایک دوسرے موقع پر (باب الفرق بین المصالح والشرائع) اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو فرمائی ہے، فرماتے ہیں:۔ قد اتفق من یعتد به من العلماء ...... علی ان حقیقة القیاس تعدیة حکم الاصل الی الفرع لعلة مشترکة لاجل مظنة مصلحة علة الخ پوری بحث مطالعہ کے لائق ہے دیکھئے حجۃ اللہ ازص ۱۲۸ تا ص ۱۳۰ جلد اول مطبوعہ مصر نیز "علم الفقہ" بعد المذاہب الخلافت بحث "العلة"

ان بنیادی باتوں کو ملحوظ رکھنے کے علاوہ مسئلہ انشورنس کا حل دریافت کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ حسب ذیل تفصیلات سامنے ہوں، اور یہ حقائق زیر بحث آئیں، اس کے بعد کسی صحیح نتیجے تک پہونچنا ممکن ہوگا، ورنہ صحیح طور پر شرعی حکم معلوم ہونا آسان نہ ہوگا۔

"ہر شے میں اصل حلت" ماننے والے علماء کا مذہب اختیار کرتے ہوئے بھی، انشورنس کے جواز کے لیے پہلے یہ اطمینان حاصل کرنا ضروری ہوگا کہ اس میں وہ خرابی (یا ایسی چند خرابیاں) تو نہیں ہے جو کسی عقد کے غیر صحیح اور حرام ہو جانے کا لازماً سبب بن جایا کرتی ہے، مثلاً یہاں اس بات کا اطمینان ضروری ہوگا کہ اس میں قمار، ربٰو اور غرر جیسے اسباب حرمت تو نہیں پائے جاتے ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک سبب تنہا حرمت پیدا کرنے کے لیے کافی ہے (اور اگر ایک سے زیادہ کا اجتماع ہو تو صورت اور سنگین ہو جاتی ہے) اس لیے فاضل مقالہ نگار نے یہی کوشش فرمائی ہے کہ انشورنس کا ان اسباب حرمت سے پاک ہونا ثابت ہو جائے اور موصوف اپنے تجزیے اور مطالعے سے اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ ان سب سے پاک ہے (جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے)

لیکن ہمارے خیال میں یہ تجزیہ ابھی مزید غور و فکر اور فقہی معیار سے جانچے جانے کا محتاج ہے، ذیل میں اس کے کچھ پہلوؤں پر گفتگو کی جاتی ہے۔

انشورنس کے اندر حرمت کے اسباب میں سے جو جو محتمل ہیں ان میں سب سے زیادہ سنگین اور پُر خطر "سود" ہے کیونکہ احادیث رسول ؐ بلکہ قرآن مجید میں بھی اس کے مبغوض عند اللہ اور ملعون ہونے کا جس شدید انداز میں ذکر ہے، کسی اور معاملے کا (میری معلومات کے مطابق) نہیں ہے، اس سے باز نہ آنا اللہ تعالےٰ کو دعوت مبارزت دینے کے مرادف قرار دیا گیا، اور اس کے ادنیٰ شائبے کو بھی بدترین جرم اور قبیح ترین گناہ کے برابر بتایا گیا ہے۔ (فان لم تفعلوا فأذنوا بحرب من اللہ۔ الربوٰ سبعون جزأ ایسرھا ان ینکح الرجل امہٗ) اس کی شدت اور ہیبت ناکی کی وجہ سے ہی اس کے شائبے تک سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ("دعوا الربا والریبۃ")

اس لیے اگر انشورنس کا صرف "ربا" (سود) میں ملوث ہونا ثابت ہو جائے تو بھی اس کے جواز کی گنجائش نہیں رہے گی، ظاہر ہے کہ زیر بحث معاملہ (انشورنس) میں ربا کی موجودگی یا عدم موجودگی کا پتہ چلانے کے لیے ضروری ہوگا کہ پہلے "ربا" کی حقیقت معلوم کی جائے کہ "ربا" کہتے

گئے ہیں؟ اس کے بغیر تو آگے بڑھا ہی نہیں جا سکتا!

اس بارے میں صاحب مضمون کا یہ فرمانا بالکل درست اور بجا ہے کہ "شریعت میں ہر اضافے کو علی الاطلاق ربا نہیں قرار دیا گیا" اور ہمارے علم میں آج تک کسی قابل ذکر عالم کا یہ مفروضہ نہیں آیا کہ "ہر اضافہ ربا ہے"

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت اور تسلیم شدہ امر ہے کہ کچھ اضافے ضرور "ربا" ہیں، اس میں کسی کو بھی تامل نہ ہوگا، تو پھر خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ معیار کون سا ہے جس کے ذریعے یہ معلوم ہو سکے کہ کس "اضافے" کو ربا سمجھا جائے اور کسے نہ سمجھا جائے کہ پھر وہ جائز قرار پائے؟

اس بارے میں اُمت کے اہم ترین اور دقیقہ رس علماء نے ان تیرہ چودہ صدیوں کے درمیان غور و فکر اور قرآن و سنت پر عمیق نظر ڈالنے کے بعد جو کچھ کہا ہے اور اس کی روشنی میں بطور قدر مشترک "ربا" کا جو مفہوم متعین ہوا ہے اور اس کی جو جامع تعریف سامنے آئی ہے اس سے فائدہ نہ اٹھانا بے قدری اور پیش آمدہ مسائل اور جدید معاملات میں "قدیم اصطلاحیں" سمجھ کر اسے نظر انداز کر دینا سوء ظنی ہوگی، اس بنا پر مناسب بلکہ ایک درجہ میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان حضرات کی بیان کردہ "ربا" کی جامع اور قانونی تعریف ذکر کر دی جائے تاکہ "ربا" کا حقیقی تصور ذہن میں آ جائے اور پھر زیر غور موضوع میں اس سے روشنی حاصل کر کے کسی نتیجہ تک پہنچنا آسان ہو۔[1]

کتب فقہ کے مطالعے سے بیشتر فقہاء و علماء "ربا" کی جس مجموعی تعریف پر متفق نظر آتے ہیں اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے: "اموالِ ربویہ میں کسی چیز کا ہم جنس کے ساتھ تبادلہ کرنے کا[2] معاملہ کیا جائے اور اس میں کسی ایک جانب سے[3] بلا عوض اضافے کا دینا بھی مشروط ہو۔ یعنی اضافے کی شرط بطور جزو معاہدہ ہو۔" اس طرح کے معاملے کے نتیجے میں جو اضافہ ہوگا وہ ربا کہلائے گا۔

نوٹ:- یہاں یہ وضاحت شاید بے محل نہ ہو کہ فقہا اور ائمہ مجتہدین کے درمیان "ربا" کی تعریف، علت ربا کی تعیین اور اس کے علاوہ بعض دیگر تفصیلات و فروعات میں بہت سے اختلافات ہیں، لیکن ان سب کا حاصل در حقیقت گویا بس یہ نکلتا ہے کہ "اموالِ ربویہ"

کون کون سے ہیں؟ (اور ان اشیاء کے تبادلے کا معیار کیا ہو؟) عموماً اس اختلاف کو فقہی تعبیر میں "علت ربوٰ" کا اختلاف کہا جاتا ہے (دوسرے کو "معیار" کا اختلاف کہا جا سکتا ہے) مگر حاصل ان سب کا قریب قریب یہی ہے۔[عٰ۵]

قرآن و سنت کے گہرے مطالعے[عٰ۶] کے بعد فقہاء کے کلام سے حاصل شدہ تعریف ربوٰ بھی

عہ سوائے اس اختلاف کے جو حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کے ایک قول سے پیدا ہوا تھا جس سے انھوں نے بعد میں رجوع کر لیا۔[۱۲] حضرت جابر بن زیدؓ نے حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کا وفات سے قبل رجوع کر لینا نقل کیا ہے (مبسوط، ج ۱۲، ص ۱۱۲)

عہ قرآن کی شارح احادیث نبویؐ کا جو شخص بھی گہری نظر سے مطالعہ کرے گا وہ "ربوٰ" کی اسی حقیقت تک پہونچے گا جو مذکورہ بالا الفاظ میں بیان ہوئی اور اگلی سطروں میں جس کو پھیلا کر پیش کیا گیا ہے ——— کیونکہ ———

۱؎ حدیث بلال (جو شروع میں بحوالہ مذکور ہو چکی ہے) نیز اس کے علاوہ ان احادیث سے کہ جن میں صاف صاف موجود ہے[۱۲]:- "فاذا اختلفت هٰذه الاصناف فبيعوا كيف شئتم" (مسلم ج ۲ ص ۲۵) معلوم ہو رہا ہے کہ جنس کا اختلاف ہو تو کمی بیشی کے ساتھ خرید و فروخت کرنا بلا تکلف درست ہے ——— اور ———

۲؎ قرض کی واپسی اضافہ کے ساتھ پسندیدہ ہونے والی احادیث (جن کا حوالہ آگے آ رہا ہے) سے پتہ چل رہا ہے کہ بلا شرط اضافہ "ربوٰ" نہیں ہے بلکہ "ربوٰ" کے لیے شرط کے ساتھ اضافہ ضروری ہے ——— اور

۳؎ یہ بات تو عقل عام سے بھی جانی جا سکتی ہے کہ بلا عوض اضافہ ہی "ربوٰ" ہے کیونکہ اگر ایک طرف کے اضافہ کا دوسری طرف بدل، عوض، موجود ہو تو وہ "ربوٰ" نہیں ہوگا۔

مثلاً اگر ایک شخص دس روپیہ کا نوٹ دیتا ہے، اور پانچ روپے کے گیہوں اور پانچ روپیہ نقد دوسرے شخص سے لیتا ہے، تو اسے کون "سود" کہے گا؟ حالانکہ ایک طرف سے نقد دس روپے ہیں اور دوسری طرف سے نقد پانچ ہی روپے، لیکن چونکہ ان پانچ روپوں کے ساتھ گیہوں بھی ہیں اس لیے یہ "ربوٰ" نہیں ہو سکتا، اس طرح کے سودے زمانۂ نبوت میں بھی یقیناً ہوتے رہے ہوں گے۔ ——— اور ———

۴؎ اموالِ ربویہ میں ہی "ربوٰ" کا پایا جانا محدود ہونے کی قید اس لیے ہے کہ اس طرح "ربوٰ" کا دائرہ محدود رہتا ہے ورنہ بہت وسیع ہو جائے گا جو ... غیر ضروری طور پر حرج ہوگا اور لوگ تنگی میں مبتلا بلا وجہ ہو جائیں گے نیز احادیث کا سیاق بھی بتلا رہا ہے کہ تمام اشیاء میں تبادلے کے وقت کمی بیشی ممنوع نہیں ہے بلکہ محدود اشیاء میں ہی ممنوع ہے اس لیے فقہاء کرام نے اسے "اموالِ ربویہ" ہی کے اندر منحصر سمجھا اور بتایا ہے۔

طرح غور کیا جائے تو اعتراف کرنا پڑ جائے گا کہ اس سے زیادہ محتاط اور جامع قانونی تعریف مشکل ہی سے اور کوئی ہو سکتی ہے۔

مذکورہ تعریف کے اجزاء کو پھیلا کر دیکھا جائے تو یہ اجزا نمایاں نظر آتے ہیں۔

(۱) ہم جنس چیز کے تبادلے کا معاملہ (عقد) ہو۔

(۲) وہ جنس "اموالِ ربویہ" میں سے ہو۔

(۳) اضافہ صرف ایک ہی جانب ہو، یعنی دوسری جانب سے اس کا کوئی واقعی ایسا بدل نہ ہو جسے شریعت بدل قرار دے۔

(۴) اس "اضافہ" کا لینا دینا، معاملہ کرتے وقت ہی بطور لازمی جزء کے طے ہو چکا ہو۔

یہاں یہ بتلانے کی ضرورت تو نہیں معلوم ہوتی کہ "اضافہ" کا پتہ چلانے کے لیے (تاکہ اس سے بچنا ممکن ہو) اموال ربویہ کا تبادلہ کرتے وقت کسی ایسے پیمانے کا استعمال شرعاً ضروری قرار دیا گیا ہے جس سے مقدار کا صحیح اور یقینی تعین ہو سکے، اس لیے ان اشیاء کا باہم تبادلہ اندازہ سے کرنا جائز نہیں رکھا گیا۔[14]

مذکورہ تفصیل کے سامنے[13] آجانے کے بعد یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی معاملے میں "ربا" کے پائے جانے کے لیے ان چاروں باتوں کا وجود ضروری ہے، اگر ان میں سے ایک بات بھی موجود نہ ہوگی، تو وہ "اضافہ" شرعاً "ربا" نہیں کہلائے گا، پھر اس کا لینا، دینا جائز ہوگا۔

چنانچہ اگر کوئی شخص دوسرے کسی شخص سے قرض لیتا ہے اور قرض کا معاملہ کرتے وقت اضافہ کی نہ شرط کی تھی نہ نیت، لیکن قرض ادا کرتے وقت اگر کچھ زیادہ دیتا ہے تو اس اضافہ کا لینا، دینا دونوں جائز ہوگا (بلکہ مستحسن) کیونکہ "ربو" کے چار اسباب میں سے ایک سبب (شرط کے ساتھ اضافہ) نہیں پایا گیا۔ یہ محض قیاس نہیں ہے، بلکہ احادیثِ رسول سے قرض ادا کرتے وقت زیادہ ادا کرنے کی (بغیر شرط کے زیادتی) تعریف اور حوصلہ افزائی کا ثبوت ملتا ہے، ایک طویل حدیث ہے جس میں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لیا ہوا قرض زیادہ ادا کرنے کا حکم دیتے ہوئے آخر میں فرمایا:- ان خیار الناس احسنھم قضاءً۔[15] اس کے علاوہ اور بعض نبوی عہد سے بھی خود نبی اکرمؐ کے قرض کی اضافے کے ساتھ واپسی کا ثبوت ملتا ہے۔[16]

مگر یہ بات خاص طور پر ملحوظ رکھنی ہوگی کہ بغیر شرط کیے اضافے کے ساتھ قرض کی واپسی کا کہیں ایسا رواج نہ پڑ جائے کہ وہ رواج ہی بمنزلہ شرط کے ہو جائے اور بقاعدہ "المعروف کالمشروط" اس طرح "ربٰو" بن جانے کا امکان پیدا ہو جائے۔ [عہ]

اس تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ بہت سی شکلوں میں "تعاونِ باہمی" اور ربا کے درمیان فرق محض اسی "شرط" کے پائے جانے یا نہ پائے جانے کی بنا پر ہو جائے گا، یعنی اضافہ اگر شرط کے ساتھ ہے تو وہ "ربٰو" ہو جائے گا ورنہ نہیں، حدیثِ نبویؐ کے مشہور شارح علامہ محی الدینؒ نووی شافعی (قرض اضافے کے ساتھ واپس کرنے کا جس حدیث میں تذکرہ ہے اس کے ذیل میں فرماتے ہیں: "لان المنھی عنه کان مشروطاً فی عقد القرض"[19]

"ربٰو" کی حقیقت اور اس کے پائے جانے کے اسباب سامنے آجانے کے بعد اب انشورنس کا حکم دریافت کرنا آسان ہو گیا، لہٰذا اب کسی ایک مفروضہ مثال کو سامنے رکھ کر غور کر کے دیکھا جائے، اور پھر صحیح نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی جائے، چنانچہ یہاں ایک مثال پیش کر کے اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

مثلاً ایک شخص عبدالرحیم نے (زندگی / مال کا) بیمہ بیس ہزار روپے کا کرایا۔ بیمہ کمپنی کی طرف سے پچاس روپے ماہوار کا پریمیم مقرر ہوا۔ ابھی عبدالرحیم بطور پریمیم صرف دو ہزار روپیہ ہی جمع کر پایا تھا کہ وہ واقعہ پیش آگیا جس کی تلافی کے لیے بیمہ کرایا گیا تھا (یعنی موت / مال کا نقصان / یا فقدان) لہٰذا کمپنی نے معاہدہ کی رو سے عبدالرحیم کو یا اس کے نائب ورثہ کو (موت کے بعد

عہ مشہور مصری فقیہ زین ابن نجیم مصری اپنی شہرۂ آفاق کتاب "الاشباہ والنظائر" کی بحث ثالث میں اسی قاعدہ "المعروف کالمشروط" کے ذیل میں سوال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:- "لو جرت عادة المقترض برد ازید مما اقترض هل یحرم اقتراضه تنزیلاً لعادة منزلة الشرط"

اس سوال کا جواب (مذکورہ کتاب کے مرتب و مبوّب) علامہ شیخ ابوالفتح مفتی الثغور السکندری یہ نقل کرتے ہیں "وقوله" هل یحرم" فی حاشیة ابی السعود نقلاً عن البیری نعم یحرم لظاهر ما فی شرح الطحاوی للاسبیجابی"[18]

کی صورت میں) بیس ہزار روپے دیئے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ اٹھارہ ہزار روپیہ کا اضافہ کس چیز کے عوض میں ہے؟ ظاہر ہے کہ یہاں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو عبد الرحیم نے کمپنی کو اٹھارہ ہزار روپیہ کے عوض دی ہو تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ یہ "اضافہ بلا عوض" ہے اور اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اضافی رقم اسی معاملہ (عقد) کے نتیجے میں ملی ہے جسے انشورنس (یا عقد تامین) کہتے ہیں اور اسکا عقد کا یہ بھی تقاضا ہے کہ کمپنی کی طرف سے اس رقم کے ملنے سے پہلے کچھ رقم عبد الرحیم پریمیم کے طور پر کمپنی کو دے چکا ہو، اگر پہلے کچھ بھی نہیں دیا تھا تو عبد الرحیم کو کمپنی کی طرف سے یہ مزید اٹھارہ ہزار روپے نہیں مل سکتے تھے۔

اب ان تمام چیزوں کو ہم مذکورہ تعریف ربو (یا اجزائے ربو) پر منطبق کر کے دیکھتے ہیں تو معاملے کی یہ تصویر بنتی ہے:۔

۱۔ ہم جنس چیز کا تبادلہ ہم جنس کے ساتھ کیے جانے کا معاملہ (عقد) ہے یعنی دونوں طرف روپیہ ہے۔

۲۔ وہ جنس اموالِ ربویہ میں سے ہے (یعنی روپیہ ہے جو باتفاق، اب اموالِ ربویہ میں شمار ہوتا ہے)

۳۔ اضافہ ایک ہی جانب ہوا (حادثہ کا شکار ہونے والے کی جانب) اور اس اضافہ کا کوئی واقعی عوض بھی نہیں دیا گیا، اور نہ آئندہ ہی دیا جانا متوقع ہے (اصل معاہدہ کی رو سے)

۴۔ یہ اضافہ یقیناً اس معاملہ (عقد) کے نتیجے میں ہوا جو طے ہو چکا تھا (اگرچہ اس وقت اضافی رقم کی تحدید یا تناسب کی تعیین نہیں ہوئی تھی لیکن ایسی عدم تعیین حلت کا سبب نہیں بنا کرتی بلکہ عدم تعیین اور جہالت عموماً حرمت (ممانعت) کا سبب ہی بنا کرتی ہے)

علاوہ ازیں یہ کہ اس اضافے کے مشروط ہونے اور پریمیم کے عوض میں ہونے کا پتہ مقالہ نگار کی اس عبارت سے بھی چلتا ہے:۔ "اس ادائیگی (پریمیم کی ادائیگی) کے عوض اسے اس بات کی ضمانت حاصل ہوتی ہے کہ اگر متعلقہ حادثہ پیش آ گیا تو اس کے نتیجے میں واقع ہونے والے مالی نقصان کی تلافی کی جائے گی۔"[۲] یہاں یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں معلوم ہوتی کہ کم

سے کم روپیہ وصول کرتے وقت انشورنس کرانے والا اور کمپنی دو الگ الگ اور مستقل فریق ہیں ورنہ تو لازم آئے گا کہ ہر ایک خود اپنے آپ سے وصول کر رہا ہے اور خود اپنے اوپر مقدمہ چلا رہا ہے، اگر رقم کی وصولیابی کے لیے مقدمہ لڑانے کی ضرورت پیش آجائے) اس تفصیل سے یہ بات بھی سامنے آگئی (جو پہلے بھی معلوم ہے) کہ اکثر انشورنس کرانے والوں کا مقصد[عہ] محض تعاون اور دوسروں کی مدد کرنا نہیں ہوتا بلکہ اُن کا اصل مقصود تھوڑی تھوڑی کر کے اپنی دی ہوئی رقم کے ذریعہ کئی گنا زیادہ (یا کم و بیش، ورنہ اقل درجہ میں اس کے برابر) یکجا بڑی رقم وصول کرنا ہوتا ہے جو چاہے ان میں سے، اس کے سہارے اپنے نقصان کی تلافی کرے یا جو مناسب سمجھے کرے، کمپنی کو بھی اس سے سروکار عموماً نہیں ہوتا، یہاں یہ وضاحت غیر ضروری معلوم ہوتی ہے کہ "ربٰو" کا براہِ راست تعلق رقم کے حاصل کرنے یا ہونے والے پہلو سے ہے اُسے خرچ کرنے والے پہلو سے نہیں ہے، یعنی اگر رقم کے حاصل ہونے والے ذریعے پر "ربٰو" کی تعریف صادق آجاتی ہے تو حکم میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ وہ شخص اس رقم کا کیا مصرف قرار دیتا ہے، آیا اپنے نقصان کی تلافی (یا حج بیت اللہ) اس کے ذریعہ کرتا ہے، یا تموّل اور عیش کوشی وغیرہ (یہ الگ بات ہے کہ غلط مصارف میں خرچ کرنے سے اسراف کا گناہ الگ ہوگا، لیکن صحیح مصرف پر خرچ کرنے سے بھی سود کی رقم کا لینا حلال نہ ہوگا)

اس طور پر دیکھنے کے بعد انشورنس اور سود میں اب بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ جس کی بنا پر ایک کو جائز اور دوسرے کو ناجائز کہا جا سکے۔ ہاں، ربٰو کی مذکورہ تعریف اور انشورنس میں ایک فرق یہ ضرور ہے کہ انشورنس میں، ایک اضافی رقم کا ملنا کسی مقررہ حادثے پر موقوف ہوتا ہے، اور "ربٰو" میں عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن اس فرق سے "ربٰو" کے متحقق ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑتی کیونکہ "ربٰو" کی تعریف میں منفی یا مثبت طور پر اس کا ذکر ہی نہیں ملتا۔ بلکہ اس فرق نے انشورنس کے

[عہ] اس حقیقت کا پتہ چلا جانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ کمپنی کی طرف سے نقصان کی تلافی کی ذمہ داری نہ لی جائے (ظاہر ہے اس صورت میں کمپنی کا نام بیمہ نہ رہ سکے گا) یہ "تعاون" کرنے والے تعاون کرتے ہیں یا نہیں؟ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اعداد و شمار کے ذریعہ کہ انشورنس کرانے والوں کی اکثریت کس قسم کے لوگوں پر مشتمل ہو آیا تعاون و ہمدردی کا جذبہ رکھنے والے، یا خود غرضی اور نفع اندوزی کے مرض میں مبتلا؟

بارے میں مزید ایک دوسرے "حرام معاملہ" یعنی قمار کا شبہ پیدا کر دیا (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) اس سے معلوم ہوا کہ مبینہ فرق نے اسے حلّت کی طرف نہیں بلکہ حرمت کی طرف ایک قدم آگے بڑھا دیا ہے۔

علاوہ ازیں یہ کہ "ربوٰ" میں بھی اضافہ کو عموماً کسی نہ کسی چیز سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً مدت سے، اس طرح انشورنس میں رقم ملنے کی شرط (حادثہ پیش آنا) مدتِ ربا کے متوازی ہو جاتی ہے۔

انشورنس اور سود میں فرق بتانے کے لیے کسی کا یہ کہنا کہ "کوئی بھی شخص اتنی بڑی مقدار میں سود اتنی چھوٹی سی رقم (یعنی پریمیم کی رقم) پر نہیں دیا کرتا" یا نہ دے سکتا ہے، بہت غیر علمی اور سطحی بات ہے، ایسا فرق احکام پر اثر انداز نہیں ہوا کرتا۔

اسی طرح پریمیم کی رقم کا معروف قرض سے مختلف ہونا یا۔ بالفاظِ صحیح۔ قرض دینے کے نام سے موسوم نہ ہونا بھی مسئلہ کی نوعیت بدلنے کا سبب نہیں بن سکتا، کیونکہ محض نام کی تبدیلی سے احکام نہیں بدلا کرتے، جب کہ یہاں حقیقت اور صورت دونوں وہی پائی جارہی ہیں جو ربا کی ہیں .... یعنی (حادثہ پیش آجانے کے بعد) جو رقم ملی ہے وہ اصل سے زیادہ[ع] ہے اور ادا کی ہوئی رقم (پریمیم) کی بنیاد پر اسی جنس[ع] کی ملی ہے اور اس معاہدے[ع] ہی کی وجہ سے ملی ہے جسے انشورنس کہتے ہیں، اور یہ رقم اموالِ[ع] ربویہ میں سے ہی ہے۔

یہاں یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں معلوم ہوتی کہ قدیم طریقوں میں بھی "ربوٰ" "قرض کی مشہور معروف شکلوں ہی کے اندر محدود نہیں تھا بلکہ اس کے علاوہ اور بھی شکلیں پائی جاتی تھیں جن میں سے اب بھی بعض موجود ہیں۔

انشورنس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ تعاون کی ایک شکل ہے لیکن محض نام سے حکم نہیں متعلق ہوتا، ... بلکہ حقیقت سے ہوتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ اگرچہ ہمیں معلوم نہیں کہ اس جیسی نوعیت رکھنے والے معاملات میں دی جانے والی رقم کو بھی کسی جگہ "زرِ تعاون" یا "چندہ" کا نام دے کر تعاون اور چندہ کی معروف اور اصلی شکل کی طرح اس صورت کو بھی جائز اور درست سمجھا جاتا ہے لیکن اگر کہیں ایسا ہوا یا ہوتا ہے تو اسے بھی ناجائز ہی کہنا یا سمجھنا چاہیے! اور سب جانتے

ع یہ بات زیرِ بحث مقالہ میں نہیں کہی گئی ہے۔

ہیں کہ تعاون اور چندہ کی عام طور پر جو شکلیں رائج ہیں اور درست سمجھی جاتی ہیں ان میں تعاون کرنے اور چندہ دینے والا شخص، وصول کرنے والوں سے اس رقم کو مع اضافے کے واپس لینے کا تصور بھی نہیں کرتا، چہ جائیکہ واپسی کا باقاعدہ معاہدہ کرتا ہو! مثلاً تعلیمی اور رفاہی اداروں میں چندہ اور تعاون دینے والے، یہ سوچتے بھی نہیں کہ انھیں یہ رقم اضافے کے ساتھ لوٹا دی جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ یہ خیال ہوتا یا ہو سکتا ہے کہ ان اداروں سے، ان کو یا ان کی اولاد کو (یا اور کسی طرح کا تعلق، مثلاً مذہبی تعلق رکھنے والوں کو) کسی نوعیت کا، مثلاً تعلیم و تربیت وغیرہ کا فائدہ پہنچ سکتا ہے، تو اس صورت میں "ربا" کدھر سے آسکتا ہے؟ جبکہ نہ معاہدہ ہے، نہ ہم جنس شئے کا تبادلہ، نہ اضافے کی شرط ہے اور نہ کوئی ایسی چیز!

اسی طرح اگر کوئی شخص مثلاً آج کسی مصیبت زدہ کی مدد اور اس کے ساتھ تعاون کرتا ہے اس خیال، اور اس امید کی بنا پر کہ کل مجھے بھی یہ مصیبت پیش آسکتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ آج کا مصیبت زدہ کل مدد کرنے کے لائق ہو جائے اور میری مدد کرے، آئندہ اگر یہ توقع پوری بھی ہو جاتی ہے تو بھی اسے "ربو" نہیں کہا جائے گا، کیونکہ یہاں نہ معاہدہ ہے نہ اضافے کی شرط! صرف توقع ہے، سو وہ ہوا کرے، اس سے حکم نہیں بدلتا۔ اور اگر یہ توقع پوری نہیں ہوتی تو اسے قانوناً اپنی دی ہوئی رقم کو اضافہ کے ساتھ واپس لینے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ بعض شکلوں میں بس اپنی دی ہوئی رقم واپس لے سکتا ہے (رجوع عن الہبہ کی شکل) کسی اضافے کا قطعاً حق نہ ہوگا اور اصل رقم کی واپسی بھی مستحسن ناپسندیدہ کام بلکہ بعض علماء کے نزدیک ناجائز ہی ہے۔

لیکن اگر یہاں کوئی شخص "تعاون" اضافے کے ساتھ واپسی کی شرط سے کرتا ہے تو وہ اضافہ "ربو" ہی ہوگا، اس کا نام تعاون (بلکہ جود و سخا بھی) رکھ دینے سے حکم نہیں بدلے گا۔[۲۱]

(باقی)

حوالجات مضمون کی آخری قسط کے ساتھ درج ہوں گے۔

Regd. No. L-335

Monthly **ALFURQAN** Kutchery Road, Lucknow U. P.

VOL. 41 NO. 11 DECEMBER, 73 Phone No. 25547

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow-1

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
ایک پونڈ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۱۰/
بنگلہ دیش سے ۱۱/-
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت
فی کاپی ..... ایک روپیہ

جلد ۴۱	بابت ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ مطابق جنوری ۱۹۷۴ء	شمارہ ۱۲

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہو، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۰ر مارچ تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھدیا کیجئے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو اگر ۱۰ر تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اسکی اطلاع ۱۰ر تاریخ تک آجانی چاہیئے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

محمد منظور نعمانی

ماہ ذی قعدہ (مطابق دسمبر) کا شمارہ، ذی قعدہ کے دوسرے اور دسمبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو گیا تھا، ناظرین کرام کو اس سے راقم سطور کے حجازِ مقدس کے سفر کا علم ہو گیا ہو گا۔

یہ عاجز رفیقِ محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی معیت میں، رابطۂ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) کے اجلاس کی شرکت کے لیے ۸ر دسمبر کو لکھنؤ سے روانہ ہو گیا تھا، ۱۰ر دسمبر کو ہم لوگ بمبئی پہونچے، رابطہ کا اجلاس ۹ر دسمبر سے شروع ہونے والا تھا لیکن ہم ۱۰ر دسمبر کو سعودی طیارہ سے جدہ کے لیے روانہ ہو سکے اور مکہ معظمہ ۱۱ر دسمبر کی صبح حاضری ہوئی۔

اندازہ تھا کہ رابطہ کا اجلاس زیادہ سے زیادہ ۱۰-۱۲ دن جاری رہے گا اور ذیقعدہ کا آخری ہفتہ شروع ہونے سے پہلے بہر حال ختم ہو جائے گا اور ہم حج سے پہلے ہی مدینہ طیبہ حاضر ہو سکیں گے اور حج کے بعد جلد ہی واپس ہو کر ۲۰ر ذی الحجہ تک لکھنؤ پہونچ جائیں گے ——— لیکن یہ سب اندازے غلط ہو گئے، رابطہ کا اجلاس ذی الحجہ کی ابتدائی تاریخوں تک چلتا رہا اور کام ختم نہیں ہو سکا اس لیے حج کے بعد بھی دو دن ۱۵ر اور ۱۶ر ذی الحجہ کو اس کی طویل نشستیں ہوئیں تب کام ختم ہو سکا ——— اس کے بعد مدینہ طیبہ حاضری ہوئی، ایک ہفتہ وہاں قیام رہا پھر مکہ معظمہ واپس ہو کر ۲۸ر ذی الحجہ کو بمبئی کے لیے روانگی ہو سکی اور کل ۲ر محرم (۲۶ر جنوری) کو راقم سطور لکھنؤ پہونچا ہے۔

حرمین پاک میں قیام جتنا بھی زیادہ نصیب ہو جائے بلاشبہ سعادت اور خوش نصیبی ہے لیکن پورے دو ہفتہ کی اس تاخیر کی وجہ سے یہ شمارہ غالباً وسط فروری تک ناظرین تک پہونچ سکے گا۔

الفرقان کی خاص اشاعت جس کا پچھلے شمارہ میں بھی ذکر کیا گیا تھا اس کی کتابت کا کام میرے اس سفر کے زمانہ میں بھی الحمد للہ جاری رہا اور واپسی پر یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سو صفحات سے بھی زیادہ کی کتابت

ہو چکی ہو۔ اس میں زیادہ تر مضامین وہ ہوں گے جو الفرقان کے ابتدائی ۱۲ برسوں میں شائع ہوئے تھے جبکہ وہ بریلی سے نکلتا تھا۔ غالباً چند ہی مضامین اس کے بعد کے دور کے آسکیں گے۔

انتخاب مضامین کے لیے جب الفرقان کے پچھلے فائلوں کا مطالعہ کیا گیا تو اندازہ ہوا کہ جو مضامین و مقالات اپنی مستقل افادیت اور خاص اہمیت کی وجہ سے اس کے مستحق ہیں کہ ان کو موجودہ دور کے ناظرین کے لیے خاص نمبر کی شکل میں دوبارہ شائع اور محفوظ کر دیا جائے وہ ۵-۶ سو صفحات سے کم میں نہ سما سکیں گے اور ظاہر ہے کہ اتنے ضخیم نمبر کی تیاری اور اشاعت کا موجودہ حالات میں کوئی امکان نہیں ہے، اسلیے یہ طے کیا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق و مدد شامل حال رہی تو ان سب مضامین و مقالات کو کم از کم دو نمبروں میں شائع کیا جائے گا۔ ایک نمبر تو یہی جو اسوقت تیار ہو رہا ہے اور ان شاء اللہ دو مہینے کے اندر اندر آخر مارچ یا شروع اپریل تک شائع ہو جائے گا ــــ اور دوسرا ان شاء اللہ آئندہ سال کے آغاز میں، واللہ ولی التوفیق۔

یہ نمبر جو اسوقت زیر تیاری ہے اسکی ضخامت کا اندازہ ڈھائی سو صفحے کے قریب ہے، اس سلسلہ میں سب سے مشکل مسئلہ اسوقت کاغذ کی فراہمی کا ہے، جیسا کہ گزشتہ اشاعت میں ذکر کیا جا چکا ہے کاغذ کی قیمت میں ابھی پچھلے دنوں ایک دم اتنا اضافہ ہو گیا ہے جو حد برداشت سے باہر ہے، اور اس قیمت پر بھی ضرورت کے بقدر کاغذ کا ملنا بہت ہی مشکل ہے۔ پوری کوشش کے باوجود ابھی تک ضرورت کے مقابلہ میں چوتھائی کاغذ بھی فراہم نہیں ہو سکا ہے۔ اگر کاغذ جلدی فراہم نہ ہو سکا تو نمبر کی اشاعت میں مزید تاخیر ناگزیر ہو گی۔

یہ شمارہ سنہ ۱۳۹۲ھ کا آخری شمارہ یعنی ماہ ذی الحجہ کا شمارہ ہے، جو محرم میں شائع ہو رہا ہے، ــــ اس کے بعد ان شاء اللہ خاص نمبر ہی ناظرین کرام کی خدمت میں پہونچے گا ــــ اگر اس کی تیاری میں زیادہ دیر لگتی نظر آئی تو ممکن ہے کہ ناظرین کرام کو انتظار کی زحمت سے بچانے کے لیے نمبر سے پہلے ماہ محرم سنہ ۱۳۹۳ھ کا شمارہ شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا جائے۔

آخری اطلاع:۔ افسوس ہو کہ کاتب صاحب کی علالت کی وجہ سے ذی الحجہ کے اس شمارہ کی تیاری میں مزید دو ہفتے کی تاخیر ہو گئی۔ اب یہ فیصلہ کر لینا پڑا کہ اس نمبر کے بعد محرم (فروری) کا شمارہ شائع کیا جائے گا، اس کے بعد ان شاء اللہ "نمبر" ہدیہ ناظرین ہو گا۔ ــــــــ ناظم دفتر الفرقان

درسِ قرآن ۔ محمد منظور نعمانی

مرکز والی مسجد ۔ ۲۷ جنوری ۷۳ء

○ سورۂ کہف کی خاص اہمیت و فضیلت

○ قرآن پاک کی تنزیل اللہ تعالےٰ کی عظیم ترین نعمت

○ نزولِ قرآن کا خاص مقصد مجرمین کو آگاہی اور مومنین صالحین کو بشارت

○ یہ دُنیا دارالابتلا ہے اور یہاں جو کچھ ہے فانی ہے

حمد و صلوٰۃ ، اعوذ اور بسم اللہ کے بعد

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا ۝ قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْہُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝ مَّاکِثِیْنَ فِیْہِ اَبَدًا ۝ وَّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا ۝ مَا لَہُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِہِمْ کَبُرَتْ کَلِمَۃً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاہِہِمْ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا کَذِبًا ۝ فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ

نَفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝

(سورۃ الکہف ع ۱)

ساری حمد و ستائش اس اللہ کے لیے جس نے اپنے خاص بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر الکتاب نازل فرمائی (یعنی قرآن) اور اس میں کسی قسم کی ذرا بھی کجی نہیں رکھی، بالکل سیدھی اور راست، اس واسطے (نازل فرمائی) کہ وہ (مجرموں کو) خدا کی طرف سے آنے والے سخت ہولناک عذاب سے آگاہی دے اور ڈرائے، اور ان ایمان والوں کو جو اعمال صالحہ کو اپنا معمول اور دستور بنالیں، خوشخبری دے کہ ان کے لیے (ان کے پروردگار کی طرف سے) بڑا اچھا اجر ملنے والا ہے (یعنی جنت اور اس کی نعمتیں) وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ نیز ان (گمراہ اور گستاخ) لوگوں کو (خدائے ذوالجلال) کے شدید عذاب سے) ڈرائے اور آگاہی دے جنھوں نے کہا کہ (معاذ اللہ) خدا اولاد رکھتا ہے۔ ان کے پاس اس کی کوئی علمی سند نہیں اور نہ ان کے باپ دادوں کے پاس تھی ۔ بڑی ہی بھاری اور سنگین بات ہے جو ان کے منھ سے نکلتی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ بالکل ہی جھوٹ کہتے ہیں۔

(اے پیغمبر) تو کیا تم رنج و غم سے اپنی جان کو ہلاک کر ڈالوگے ان (بدبخت منکروں) کے پیچھے اگر وہ اس خداوندی فرمان (یعنی قرآن عزیز) پر ایمان نہ لائیں۔

(معلوم ہونا چاہیئے کہ) روئے زمین پر جو کچھ ہے اسے ہم نے زمین کی زینت و زیبائش کا سامان بنا دیا ہے تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں کون نیکو کار ہوتا ہے، اور ہم ہی ایسا کرنے والے ہیں کہ جو کچھ روئے زمین پر ہے اس کو نیست و نابود کرکے) ایک صاف چٹیل میدان کر دیں گے۔

(سورہ کہف آیت ۱ سے ۸ تک)

(تشریح و تفسیر) یہ سورہ کہف شروع ہوئی، یہ بھی مکی سورت ہے اور ان سورتوں میں سے ہے

جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص اہمیت اور فضیلت بیان فرمائی ہے ——— میں نے اسی
درس میں بار بار عرض کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام اور فرمان ہونے کی حیثیت سے ہر سورت اور ہر آیت
کو یکساں اہمیت اور فضیلت ہے اور سب پر ایمان لانا فرض ہے، کسی ایک آیت کا انکار بھی کفر ہے ———
اس کے باوجود بعض سورتوں اور آیتوں کی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص فضیلتیں بیان
فرمائی ہیں، مثلاً الحمد شریف، اور قل ہو اللہ، قل یا ایہا الکافرون، اور سورۂ بقرہ اور آل عمران اور
سورۂ ملک وغیرہ سورتوں کے حضور نے خاص خاص فضائل بیان فرمائے ہیں، اسی طرح آیتوں
میں آیۃ الکرسی اور سورۂ بقرہ اور آل عمران کی آخری آیتوں کی خاص فضیلتیں اور برکتیں حدیثوں
میں وارد ہوئی ہیں ——— ان خاص فضائل اور برکات کا تعلق میرے نزدیک معانی اور مضامین سے
ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اس سورۂ کہف کے بھی حضور نے خاص فضائل اور برکات بیان فرمائے ہیں۔ ایک حدیث
میں وارد ہوا ہے کہ جو شخص شروع سورۂ کہف کی دس آیتیں پڑھے گا وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ
رہے گا۔ اس پڑھنے سے مراد غالباً یہ ہوگا کہ ان آیتوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس پر دل سے یقین
کرکے ان کی تلاوت کو اپنا معمول بنا لیا جائے ——— ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جو کوئی جمعہ کو
سورۂ کہف پڑھے گا وہ اگلے جمعہ تک ہر فتنہ سے محفوظ رہے گا۔ ایک اور حدیث کا مضمون ہے کہ
جو کوئی جمعہ کو سورۂ کہف پڑھے گا اس کے لیے ایک خاص نور پیدا ہوگا جو قیامت کے دن بھی اس
کے لیے روشنی فراہم کرے گا۔

اس طرح کے بعض اور فضائل بھی اس سورت کے حدیثوں میں وارد ہوئے ہیں۔ اور
جیسا کہ میں نے عرض کیا ان فضائل کا تعلق اس کے مضامین سے ہے۔ اس سورت میں ایسے
حقائق اور واقعات خاص طور سے بیان ہوئے ہیں جن میں فتنوں سے حفاظت اور بچاؤ کے لیے
بڑی رہنمائی اور بڑی روشنی ہے ——— دوسرے مضامین کے علاوہ اس سورت میں تین نہایت اہم
اور بصیرت افروز واقعات بیان ہوئے ہیں جن کا ذکر قرآن میں کسی دوسری جگہ بالکل نہیں ہے،
——— آپ جانتے ہیں کہ قرآن پاک میں بہت سے واقعات بار بار بھی بیان ہوئے ہیں، مثلاً حضرت
موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت نوحؑ، حضرت ہود، حضرت

صالح، حضرت شعیب، اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے واقعات قرآن مجید میں بار بار اور جا بجا بیان فرمائے گئے ہیں ـــــ اور بعض واقعات ایسے بھی ہیں، جو نہایت اہم اور سبق آموز ہیں لیکن ان کا بیان قرآن پاک میں صرف ایک ہی جگہ کیا گیا ہے، مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ جس کو قرآن میں "احسن القصص" فرمایا گیا ہے صرف ایک جگہ سورۂ یوسف میں بیان ہوا ہے، اسی طرح سورۂ کہف میں جو خاص تین واقعے بیان فرمائے گئے ہیں، یعنی اصحاب کہف کا واقعہ، حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کا واقعہ اور ذوالقرنین کا واقعہ، ان کا ذکر قرآن مجید میں صرف اسی سورۂ کہف میں کیا گیا ہے ـــــ حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں واقعوں میں فتنوں سے اور خاص کر دجالی فتنوں سے حفاظت کے لیے بڑی رہنمائی اور بڑی روشنی ہے۔

اس وقت میں نے اس سورت کی ابتدائی آٹھ آیتیں تلاوت کی ہیں ـــــ پہلی آیت ہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا قَیِّمًا" اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی حمد کی ہے اور اس احسان اور انعام پر کی ہے کہ اس نے لوگوں کی ہدایت کے لیے اپنے خاص بندہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر "الکتاب" نازل فرمائی، یعنی قرآن پاک نازل فرمایا۔

میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ قرآن پاک کی زبان میں بلکہ تمام صحف سماویہ کی زبان میں کتاب آسمانی اور خداوندی ہدایت نامہ ہی کو کہتے ہیں، اسی لیے اہل کتاب کو "اہل کتاب" کہا جاتا ہے۔ یہاں "الکتاب" سے مراد قرآن مجید ہے۔ اگلی آسمانی کتابوں میں اس کی پیشینگوئی اسی عنوان سے کی گئی تھی۔ اس کا نازل فرمانا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے، اس پہلی آیت میں اسی احسان پر اللہ تعالیٰ نے اپنی حمد کی ہے۔

قرآن مجید کی بہت سی سورتیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حمد سے شروع ہوتی ہیں۔ سورۂ فاتحہ اور سورۂ انعام بھی اسی طرح "الحمد للہ" سے شروع ہوئی تھیں ـــــ اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہیئے کہ ہماری اس دنیا میں یہ اچھا نہیں سمجھا جاتا کہ کوئی خود اپنی تعریف کرے، اور بیشک کسی مخلوق کو ہرگز زیبا نہیں کہ وہ اپنی کسی خوبی کی تعریف کرے، کیونکہ اگر کسی میں کوئی خوبی اور کمال یا حسن و جمال ہے تو وہ خدا کا عطا کیا ہوا ہے۔ کسی کے پاس کوئی ذاتی خوبی اور کمال نہیں ہے، اس لیے کسی کے لیے ہرگز زیبا نہیں کہ وہ اپنی تعریف کرے، اگر تعریف کی بھی جائے گی تو اس لحاظ

سے کی جائے گی کہ اللہ نے اس کو یہ کمال دیا ہے اور ایسا بنایا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل زیبا ہے کہ وہ اپنی حمد کرے اور بندوں کو اپنی حمد کرنے کا حکم دے، کیونکہ اس کی پاک ذات میں سارے کمالات اور ساری خوبیاں ہیں اور سب ذاتی ہیں، اور مخلوق پر اس کے بے انتہا احسانات ہیں، اور ان پر عظیم ترین احسان یہ ہے کہ بندوں کی ہدایت کے لیے اور ان کو جنت تک پہونچانے کے لیے اس نے رسول بھیجے اور کتابیں نازل فرمائیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل فرما کر اس عظیم نعمت کا بالکل ہی اتمام فرما دیا۔ "وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي"۔ وجہ یہ ہے کہ اس نعمت سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہے ۔۔۔ ہمارا آپ کا ایمان ہے کہ دنیا اور اس کی ہر چیز فانی ہے، یہاں جو نعمتیں اور لذتیں ہیں وہ بھی چند روزہ ہیں، لیکن جنت اور اس کی نعمتیں اور لذتیں غیر فانی اور ابدی ہیں۔ اس لیے دنیا کی ساری نعمتیں مل کر بھی جنت کی ایک نعمت کے برابر نہیں، اسی لیے فرمایا گیا ہے "قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ"، اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا مقام تو جنت سے بھی بلند ہے۔ (وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ) پس جو نعمت جنت تک اور اللہ کی رضا تک پہونچانے والی ہو اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں، اور اس کا حق ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد ہو، اور وہ قرآن پاک کا حضور پر نازل فرمانا ہے۔ تو سورہ کہف کی اس پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے اسی عظیم احسان پر اس کی حمد فرمائی گئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہاں بھی "عبدہ" کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ میں اس سے پہلی سورت "بنی اسرائیل" کی پہلی آیت "سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ" کی تشریح میں تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ کسی بندہ کے لیے عبدیت کے مقام سے اونچا کوئی مقام نہیں ہے اس لیے قرآن پاک میں جہاں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی بڑے انعام کا ذکر فرمایا گیا ہے وہاں یہی لفظ "عبدہ" استعمال کیا گیا ہے، اس لفظ میں ایک خاص پیار بھی بھرا ہوا ہے جس کو اہل زبان اور اہل علم سمجھ سکتے ہیں۔

اسی آیت میں قرآن کی صفت میں فرمایا گیا ہے "وَلَمْ يَجْعَل لَّهُ عِوَجًا" اس کے بعد فرمایا گیا ہے "قَيِّمًا" ۔۔۔ "لَمْ يَجْعَل لَّهُ عِوَجًا" کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کسی طرح کی ذرا بھی کجی اور کسی قسم کا پیچ و خم نہیں ہے، اور "قَيِّمًا" کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جو کچھ ہے سیدھی اور صاف بات ہے، حق ہے اور سچائی ہے ۔۔۔ قرآن پاک کی یہ صفت دوسری آیتوں میں بھی بیان

فرمائی گئی ہے، ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے "قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ" دوسری جگہ فرمایا گیا ہے
اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ۔

آگے کی دو تین آیتوں میں قرآن کے نزول کا خاص مقصد بیان فرمایا گیا ہے — ارشاد ہو
لِیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ
اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝ مَّاكِثِیْنَ فِیْهِ اَبَدًا ۝

مطلب یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کتاب قرآن نازل کرنے کا ایک خاص مقصد یہ ہے کہ وہ مجرموں اور نافرمانوں کو خدائے ذوالجلال کی طرف سے آنے والے شدید اور ہولناک عذاب سے خبردار کریں اور ڈرائیں، اور ان ایمان والوں کو جو اعمالِ صالحہ کو اپنا معمول اور دستور العمل بنالیں، اس "اجرِ حسن" کی (بہت ہی اچھے صلہ کی) یعنی رضائے الٰہی اور جنت کی خوشخبری دیں جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ (مَاكِثِیْنَ فِیْهِ اَبَدًا)

اس آیت میں خدا کی طرف سے آنے والے جس عذاب کو "بَاْسًا شَدِیْدًا" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ظاہر یہی ہے کہ اس سے دوزخ کا عذاب مراد ہے، وہی اس کا مستحق ہے کہ اس کو "بَاْسًا شَدِیْدًا" کے لفظ سے تعبیر کیا جائے، پھر "مِنْ لَّدُنْهُ" کے لفظ نے اس میں اور بھی شدت اور ہولناکی پیدا کر دی ہے — اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا۔

اسی طرح جس انعام اور ثواب کو "اجرِ حسن" کہا گیا ہے اس سے مراد جنت اور اس کی نعمتیں ہیں کیونکہ اسی کی صفت ہے "مَاكِثِیْنَ فِیْهِ اَبَدًا" (یعنی مومنین صالحین ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے) ہمارا ایمان ہے کہ دنیا اور اس کی ہر نعمت اور لذت فانی اور چند روزہ ہے دنیا میں کسی کو ہر طرح کا عیش حاصل ہو لیکن موت کا دھڑکا سارے عیش کو بے لطف اور مکدر کر دیتا ہے۔ کسی فارسی شاعر نے کہا تھا

مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد میدارد کہ بر بندید محملہا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اَللّٰهُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَةِ"۔
(اے اللہ عیش تو بس آخرت ہی کا عیش ہے)، جو انشاء اللہ جنت میں حاصل ہوگا، قرآن پاک

میں جنت اور جنتیوں کے بارہ میں جابجا فرمایا گیا ہے "خَالِدِیْنَ فِیْھَا اَبَدًا" یہاں اس آیت میں فرمایا گیا ہے "مَاکِثِیْنَ فِیْهِ اَبَدًا" واقعہ یہ ہے کہ ابدیت کا پروانہ بجائے خود بہت بڑی نعمت ہے۔

اس سے آگے کی آیت میں اُن مجرمین کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کو صاحبِ اولاد قرار دے کر اُس کی شان میں نہایت ناپاک گستاخی کی ہے۔ — فرمایا گیا ہے۔

وَّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ کَبُرَتْ کَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا کَذِبًا ۝

مطلب یہ ہے کہ اس قرآن کے نازل کرنے کا ایک خاص مقصد یہ بھی ہے کہ بالخصوص ان نہائی گمراہ اور بدبخت لوگوں کو جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی شان میں یہ ناپاک گستاخی کی ہو کہ اسکو بیٹے بیٹیوں والا قرار دیا ہے خدا وند ذوالجلال کے عذاب شدید سے خبردار کرے اور ڈرائے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کو صاحبِ اولاد کہنا اور کسی کو اس کا بیٹا یا بیٹی بتانا اللہ پاک کی شان میں نہایت ناپاک گستاخی ہے اور بڑا ہی شدید جرم ہے اسلئے اس کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا۔ ہمارے مدرسوں کی زبان میں اس کو "تخصیص بعد التعمیم" کہتے ہیں — قرآن مجید کے اس طرز بیان سے معلوم ہوا کہ یہ نہایت ہی شدید جرم ہے۔ خود اس آیت میں بھی فرمایا گیا ہے "کَبُرَتْ کَلِمَةً" یعنی یہ بہت ہی سنگین مجرمانہ بات ہے۔ قرآن پاک میں ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے۔ "تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝ یعنی کسی کو خدا کی اولاد قرار دینا ایسی خبیث گستاخانہ بات ہے کہ آسمان پھٹ پڑے اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑوں میں زلزلہ آجائے اور وہ لرز کر گر جائیں —

الغرض اس جرم کی شدت اور سنگینی کی وجہ سے اس کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا ہے "مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ" مطلب یہ ہو کہ اس گمراہانہ عقیدہ کی کوئی علمی سند ان لوگوں کے پاس نہیں ہے اور ان کے باپ دادوں کے پاس بھی نہیں تھی یہ بالکل من گھڑت اور سراسر جھوٹ ہے (اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا کَذِبًا)۔

قرآن مجید سے ایسے تین گروہوں کا پتہ چلتا ہے جو خدا کے لیے اولاد مانتے تھے، ایک نصاریٰ جو حضرت مسیح علیہ السلام کو "ابن اللہ" کہتے تھے، دوسرے یہودیوں کا کوئی فرقہ تھا جو حضرت عزیر کو "ابن اللہ" مانتا تھا، اور عرب مشرکین فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔۔۔ اس آیت کا تعلق ان سب ہی سے ہے، لیکن اس گمراہی کے سب سے بڑے علمبردار عیسائی رہے ہیں۔۔۔

آگے چھٹی آیت ہے "فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا"۔۔۔

نحو کی کتابوں میں ہم نے یہی پڑھا تھا کہ "لَعَلَّ" ترجی کا کلمہ ہے یعنی کسی چیز کی امید کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور یہ معنی اس آیت میں بنتے نہیں اس لیے اس میں طرح طرح کی توجیہیں کی جاتی ہیں، لیکن عربیت کے بعض ماہرین نے لکھا ہے کہ لَعَلَّ استفہام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، تو اگر اس آیت میں استفہام انکاری کے معنی میں لے لیا جائے تو کسی تکلف اور توجیہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میرے نزدیک یہی راجح ہے۔ اور اس بنا پر آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر کیا تم ان لوگوں کے پیچھے جو کفر و شرک سے نکل کے ایمان کی طرف نہیں آتے اور ہدایت کو قبول نہیں کرتے، اپنی جان کو ان کے غم میں ہلاک کر ڈالو گے؟ ۔۔۔ یعنی تمہاری ذمہ داری بس یہ ہے کہ ان کو حق کی اور ایمان و توحید کی دعوت دو اور اچھی طرح سمجھانے کی کوشش کرو، لیکن اگر یہ تمہاری مخلصانہ تبلیغ و دعوت کے بعد بھی کفر و شرک پر جمے رہیں اور ایمان نہ لائیں تو ان کا غم نہ کھاؤ اور اس کے لیے اپنی جان نہ گھلاؤ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ تھا کہ مشرکین مکہ آپ کے انتہائی دشمن اور گویا خون کے پیاسے تھے، ہر طرح کی اذیتیں دیتے تھے لیکن آپ کے دل کی انتہائی چاہت یہ تھی کہ ان کو بھی ایمان کی دولت نصیب ہو جائے اور یہ بھی جنتی اور خدا کے محبوب بندے بن جائیں، اور ان کے نہ ماننے کا آپ کو ایسا رنج و غم تھا جیسا کہ کسی کو اپنی پیاری اولاد کی مفارقت کا ہو، یہ رنج و صدمہ آپ کو گھلائے دیتا تھا۔۔۔ اسی بارے میں فرمایا گیا ہے، کہ کیا آپ اس غم میں کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے؟ " (فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا) قرآن پاک میں یہ بات مختلف الفاظ میں بار بار فرمائی گئی ہے، کہیں فرمایا "لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ" کہیں فرمایا "لَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ" مطلب یہی ہے کہ آپ

اپنی جان پر اس رنج اور صدمہ کا بوجھ نہ ڈالیں اور صدمہ سے خون خشک نہ کریں، آپ کا کام بس دعوت دینا ہے، ہدایت ملنے نہ ملنے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، آپ نے دعوت و خیر خواہی کا حق ادا کر دیا، آپ کامیاب ہیں، انھوں نے قبول نہیں کیا یہ ان کی محرومی ہے۔

اس کے آگے جو دو آیتیں ہیں اُن کا مطلب یہ ہے کہ اس دُنیا کو اللہ تعالیٰ نے امتحان و آزمائش کی جگہ بنایا ہے اور جب امتحان و آزمائش کا یہ کام پورا ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو بالکل نیست و نابود کر دے گا۔

یہ بالکل اُصولی اور بنیادی بات فرمائی گئی ہے، اگر یہ بات سامنے رہے کہ یہ دُنیا اور یہاں کی ساری بہاریں بس چند روزہ ہیں اور یہاں کی زندگی ایک امتحان اور آزمائش ہے تو آدمی میں کبھی غفلت اور سرکشی نہ آئے اور بس خدا کی رضا اور آخرت کی فلاح نصب العین کے طور پر ہمیشہ اُس کے پیش نظر رہے　　اللہ تعالیٰ یہ چیز ہم سب کو نصیب فرمائے۔ اگر یہ ہے تو سب کچھ ہے، اور اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں، بس محرومی ہی محرومی ہے، اللہ محروم نہ فرمائے۔

اس کے آگے اصحاب کہف کے واقعہ کا بیان ہے جو اللہ کے بندوں کے لیے بہترین نمونہ اور مثال ہے۔

بوئے گل در برگِ گل

حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلویؒ اپنے مکتوبات کے آئینے میں

تلخیص و ترجمہ از — مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب (۱۰۸) شیخ غلام مرتضیٰ کے نام۔

بخدمت شریف شیخ صاحب ..... بعد سلام مسنون، گزارش ہے کہ رقیمہ کریمہ وارد ہو اور مسرت پہونچائی۔ اس کے مندرجات سے آگاہی ہوئی۔

(آپ کے لیے) اس ضعف پیری و مرض میں سفر ہرگز مناسب نہیں ہے۔ خلوت میں رہ کر در اختلاط روئے خلق پر بند کر کے گزشتہ اعمال پر استغفار و ندامت ہو اور مستقبل کے بارے میں اندیشہ ہو کہ نہ معلوم کیا پیش آئے۔ تلاوت و درود اور مدارک مافات کے ساتھ ساتھ معمول کے مطابق برائے حصول ذوق ذکر اسم ذات اور نفی و اثبات اگر جہر متوسط سے کیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

دوام توجہ بحضرت ذات، نفی وساوس اور رجوع بمشائخ کرامؒ سے اوقات کو معمور رکھیں تو موجب قرب الٰہی ہے ——— اللہ توفیق بخشے۔ آمین ——— یہ پیر عمر ضائع کردہ فرصت نہیں رکھتا کہ ان اعمال میں مشغول رہے۔ اس پیری اور ضعف قویٰ کے عالم میں اور ایسے مرض کی صورت میں کہ تلاوت و نماز مشکل ہے اور بغیر مدد کے اٹھنا اور استنجا و وضو کے واسطے جانا دشوار ہے۔ نیز مسجد میں اور اپنے پیر و مرشد کے مزار پر حاضر ہونا ایسا ہے جیسے طویل سفر کرنا۔ اس لیے میں مزار تک بھی نہیں جا سکتا۔ لوگوں کا ہجوم اور دعا کے لیے ارباب حاجت کی آمد و رفت کا سلسلہ بہت زیادہ

ہے ــــ الحمد للہ کہ صالحین کے ساتھ تشبہ اختیار کیا جاتا ہے۔ من تشبہ بقوم فھو منھم۔ (جو جس قوم کا تشبہ اختیار کرتا ہے وہ انہی میں سے ہے)

میں اور یہ نعمہائے متکاثرہ و متواترہ محض حضرت منعم حقیقی عم نوالہٗ کا فضل و انعام ہے اور حضرت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات ہیں نیز حضرت پیر و مرشد (مرزا مظہر جانجاناںؒ) کی بے شمار نوازشوں کا نتیجہ جزاھم اللہ عنی خیر الجزاء ــــ ایک گیاہ ضعیف کو نواز دیا، خاک افتادہ کو ذلت و خواری سے بچا لیا ــــ اللہ اللہ۔

اگر بر روید از تن صد زبانم — کجا من شکر یک نعمت گزارم

(اگر میرے جسم پر سیکڑوں زبانیں اُگ آئیں تب بھی میں اللہ تعالیٰ کی ایک بھی نعمت کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔

اپنے ساتھ اللہ تعالیٰ کے معاملات جمالی اور سلوک ہائے خوشحالی کس طرح بیان کروں وان تعدو نعمۃ اللہ لا تحصوھا (اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو گے تو شمار نہیں کر سکو گے)

معاش کا معاملہ ہے تو وہ بھی فراغت در فراغت ہے۔ میرے اجداد میں سے شاید کسی کو اس کا سواں حصہ بھی میسر نہ ہوا ہو گا۔ دگر معاد کو لو تو فیوض، برکات اور کرامات اس فقیر پر اس طرح ہیں کہ معلوم نہیں ان نوادر حالات سے اس وقت کسی کو نوازا گیا ہو۔

سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون وسلامٌ علی المرسلین والحمد للہ رب العلمین۔

(اس کے بعد مراقبہ کا طریقہ لکھ کر تحریر فرمایا ہے کہ)

جو کچھ نفلی نماز میسر ہو سکے اس کا معمول رہے، زبان کو لایعنی الغویات، غیبت، سخن چینی اور عیب گوئی سے پاک رکھنا چاہیے۔ استغفار اپنے لیے تمام مسلمانوں کے لیے اور اس کے لیے جس کا کوئی حق تمہارے اوپر ہو لازم ہے ــــ اگر کسی پر لعن طعن کیا ہو یا کسی کی غیبت و بدگوئی کی ہو تو اس کے لیے بھی استغفار لازم ہے ــــ گزشتہ اعمال کی ندامت اور آئندہ کا اندیشہ نقد وقت ہونا چاہیے۔ آپ کے صاحبزادہ شیخ فضل علی سلمہ اللہ تعالیٰ بھی اس تحریر پر عمل کرنا ضروری سمجھیں ــــ والسلام

تمام عزیزوں اور دوستوں کو اس ناچیز کا سلام کہیں اور دعاء خیر کو بھی کہیں ــــ بات کم کرنا، مخلوق میں کم رہنا، کم بولنا اور ہر امر میں توسط و اعتدال اختیار کرنا اور دوام ذکر ــــ یہ باتیں

طریقہ طالبان حق سبحانہٗ ہیں ـــــ (میرے ضعف کا یہ عالم ہے کہ) ادنیٰ حرکت نے نماز میں سانس چڑھ جاتا ہے اور ساق ور ان کو تکلیف ہوتی ہے ـــــ اسباب حیات اور قوت اعضاء نے جواب دے دیا ہے محض ارادۂ قادر قوی سبحانہٗ سے (فقط) صورتِ حیات باقی ہے۔

غلبہ احوال محبت کے ساتھ شہود حضرت حق سبحانہٗ کی کیفیت کے عالم میں ایسی موت کی آرزو کرتا ہوں جو ابن یمین کبردی کے اس قطعے کے موافق ہو۔

منکر کہ دل ابن یمین پر خون شد الخ

مکتوب (۱۰۹) روم کے علماء و صلحاء کے نام

(مولانا خالد رومیؒ کی تعریف و توصیف میں)

بعد حمد و صلوٰۃ ـــــ بخدمت علماء و فضلاء و حفاظ و امراء و حکام روم

گزارش ہے کہ جمع فضائل ظاہر و باطن مولانا خالد سلمہٗ اللہ تعالیٰ اشارہ غیبی سے دہلی میں مجھ ناچیز کے پاس آئے اور فقیر کے ہاتھ پر سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت کر کے اذکار و اشغال اور مراقبات میں مشغول ہوئے۔

عنایات الٰہی سے بواسطہ مشائخ کرام ان کو حضور و جمعیت، بیخودی، جذبات، واردات، کیفیات اور حالات و انوار حاصل ہوئے اور نقشبندی سلسلہ کی نسبت قلبی سے مناسبت بہم پہونچائی ......

ان حالات و مقامات کو دیکھ کر .. ان کو اجازت و خلافت دی گئی تاکہ طالبین کو تلقین و ارشاد کریں۔

اب وہ وطن میں پہونچکر، ریاضت اور نسبت باطن کی نگہداشت میں مشغول ہوئے ہیں اور ان کو قبولیت عامہ حاصل ہوئی ہے۔ انھوں نے حضرت خواجہ نقشبندؒ کی روحانی توجہ سے اشاعت طریقہ نقشبندیہ کا کام اس علاقہ میں کیا۔ فالحمد للہ ـــــ ان کا ہاتھ میرا ہاتھ ہے۔ ان سے انکار و عداوت مجھ سے انکار و عداوت ہے۔ ان کا مقبول میرے پیران کبار ـــــ یعنی خواجہ نقشبندؒ و خواجہ احرارؒ و خواجہ محمد باقیؒ و حضرت مجددؒ کا مقبول ہے ـــــ ان کی تعظیم و تکریم اس ملک کے مسلمانوں پر ضروری ہے۔ ان مسلمانوں کے لیے حفاظت اور مزید حیات کی دعا اس فقیر پر واجب ہے خیر الناس من ینفع الناس بہترین آدمی وہ ہے جو مخلوق کو فائدہ پہونچائے۔

مولانا خالد کے وجود کو غنیمت سمجھیں اور ان کی محبت و دوستی اور رعایت آداب ضروری خیال

تکملہ ......

اسلام ان چند اہم چیزوں پر مشتمل ہے ـــــ توحید، ایمان، اعمال اور مرتبۂ احسان تصدیق، مرتبۂ احسان جان و یقین سے ـــــ سبحان اللہ مولانا خالد کی صحبت میں یہ مرتبۂ احسان حاصل ہوتا ہے۔ آنحضرت کی طرف توجہ اور دنیا سے اعراض تقویٰ ہے۔ جملہ صحابۂ کرامؓ میں ایک ایسا فیض پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا تھا کہ جس سے سکینہ و اطمینان قوی ہوتا تھا۔ آگے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی فیض دلہائے اولیائے پر وارد ہوا......

حضرت مجدد خواجہ محمد باقیؒ کے اصحاب میں حضرت سید آدم بنوری حضرت مجددؒ کے اصحاب میں اور مولانا خالدؒ ہم جیسے کے اصحاب میں امتیاز رکھتے ہیں ... حاسدوں کی ایذا و عداوت حضرت مولانا خالدؒ سے دریغ کریں اور ثواب کو بیچ کر لیں ورنہ حق سبحانہ ناصر و معین کافی ہے......

حضرت مجددؒ نے اعتراضات کے جوابات خود لکھے ہیں اور مخلصوں نے بھی جوابات لکھے ہیں۔

کلام اولیاء میں تاویل کی گنجائش ہے۔ تمام اولیاء اور حضرت مجددؒ کا کلام شرع ہے جائے اعتراض نہیں رکھتا۔ معترضین کو بے ادبی سے منع کرنا چاہیے کیونکہ منکر اولیاء محل خطرات میں ہے۔

بزرگوں نے کہا ہے کہ قلوب عارفین سے کبھی کچھ ایسے معانی برآمد ہوتے ہیں کہ الفاظ و عبارات ان کے سا اور معاون نہیں ہوتے پس ان کا انکار ہی بہتر ہے ـــــ مولانا خالد کی توجہ سے لاکھوں مسلمان ذکر قلب اور ذکر لطائف کو پہنچے ہیں۔ اور ڈاکو زنی اور بدعت کو چھوڑ کر صالح بن گئے اور ہزاروں نے حضور و جذبات پر فائز ہو گئے۔

اے بھائی انصاف کرنا چاہیے کہ یہ سعادت کہاں سے آئی.... حضرت رب سبحانہ نے ان فضائل تک ان کو بواسطۂ پیران نقشبندیہ پہنچا دیا ہے۔ ہم ان سے امید دعا و ہمت رکھتے ہیں۔

مکتوب (۱۱۰) مولانا خالد رومیؒ کے نام

جامع کمالات ظاہر و باطن مجمع فیوض الٰہیہ حضرت مولانا خالد سلمہ اللہ تعالیٰ ـــــ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ کہ آج کی تاریخ ۲۲ ذی الحجہ ۱۲۳۶ھ تک فقیر بخیریت ہے اور مشائخ کرامؒ کے حکم کے مطابق تعلیم و تلقین طریقہ میں اپنے اوقات معمور رکھتا ہے۔ رقیمہ کریمہ وارد ہوا، اخبار خیریت سے

مسرور گیا۔ اشاعت طریقہ جو آپ کے ذریعہ ہو رہا ہے اور طالبین کو جو فیض آپ کے ذریعہ پہونچ رہا ہے وہ منعم حقیقی کی درگاہ میں کروڑوں حمد و شکر کا، آنحضرت پر ہزاروں درود و صلوٰۃ اور مشائخ کی بیشمار تعریف و توصیف کا موجب ہے (یہ امر بھی قابل صد شکر ہے) کہ آپ جیسا مقبول بارگاہ الٰہی ظاہر ہوا۔ حضور و توجہ اور یاد داشت (جس کو مرتبۂ احسان و شہود و مشاہدہ کہتے ہیں) کے سبب سے دل کا وسواس اور آرزو سے خالی ہونا اور دل کا حضرت حق سبحانہٗ کی طرف توجہ میں مستغرق رہنا یہی ہے مشاہدہ اور یہی ہے غایت تمنائے عارفاں (الحمد للہ) یہ امر آپ کے ذریعہ اس ملک میں رواج پذیر ہوا اور لوگ اتباع شریعت پر بہت زیادہ قائم ہو گئے۔ یہ کام بھی آپ کے ذریعہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس نسبت شریفہ کا اس سے زیادہ رواج بخشیں، آمین۔ آپ کے مستفیدین پر جو در حقیقت میرے مستفیدین ہیں بلکہ جمیع محبین و مخلصین پر آپ کی رضائے خاطر اور ہر امر میں آپ کی اتباع لازم ہے۔

اگر اعمال میں کچھ فتور ہو اور خدمت مرشد میں اخلاص باطن باقی ہے تو مرید خراب نہیں ہوتا۔

(آرزو ہے کہ) بدیدۂ گریاں و بسینۂ بریاں اس جہاں سے جاؤں ع

مصحف بکف و پا بدہ و دیدہ بدوست

ہر فیض جو کہ امت پر وارد ہوا وہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض ہے مگر ظہور کے لحاظ سے محل کی خصوصیات ضروری ہیں۔ نور آفتاب شیشوں میں حسب الوان رنگہائے گوناگوں میں چمکتا ہے۔ اسرار توحید وجودی سیر لطیفۂ قلب میں ظاہر ہوتے ہیں۔

ز دریا موج گوناگوں بر آمد ز بے رنگی برنگ چوں بر آمد

یہ توحید غلبۂ محبت کے شعبدوں میں سے ایک شعبدہ ہے۔ جو ذکر، مراقبہ، عبادت اور خلوت سے حاصل ہوتا ہے غلبہ محبت کی وجہ سے مجنوں جس طرف نظر ڈالتا تھا لیلیٰ کی صورت کا مشاہدہ کرتا تھا۔ حضرت مجددؒ نے دوسرے قسم کی توحید (توحید شہودی) بیان فرمائی ہے اور فرمایا ہے کہ مشرب انبیاء علیہم السلام یہ ہے کہ حق حق اور عبد عبد ہے۔ (مکرر) یہ بات کیا لکھوں کہ آپ کے مستفیدین و محبین سب کے سب آپ کے تابع رضا رہیں اور کوئی شخص کسی قسم کا کوئی اختلاف نہ کرے ——— والسلام

مکتوب ۱۴۱۱

(حضرت مجددؒ پر طعن کرنے والوں کا جواب)

دبہ نستعین۔ قال اللہ سبحانہٗ وکان حقاً علینا نصر المؤمنین۔

(ہمارے فضل پر مومنوں کی نصرت واجب ہے)

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی نقشبندی سہرندیؒ نے حفظ قرآن اور تحصیل علم کے بعد طریقۂ چشتیہ و قادریہ و سہروردیہ اپنے والد ماجد سے ـــــ جو حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کے سلسلہ میں خلیفہ و مجاز تھے ـــــ حاصل کیا تھا اور طریقۂ کبرویہ شیخ یعقوب کشمیریؒ سے حاصل کیا اور حضرت شیخ المشائخ خواجہ محمد باقی احراری سے طریقۂ نقشبندیہ اخذ کیا۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی صحبت اور توجہات کی برکت سے آنجناب نے نسبت نقشبندی حاصل کی نسبت دوام آگاہی اور حضور حضرت حق سبحانہٗ کا دوسرا نام ہے۔ عنایت پیر و مرشد کی برکت سے اور جذبات فضل الٰہی سے طریقۂ جدیدہ ان کو مرحمت ہوا۔ اور یہ طریقۂ لطائف عشرہ کو متضمن ہے اور کچھ ان کے علاوہ کو بھی۔ ہر لطیفہ کیفیت علم و معرفت جدا رکھتا ہے۔ الحمد للہ کہ علماء و عقلاء اس کے حق ہونے پر شہادت دیتے ہیں۔ توجہ بقلب، نسبت باطن، توجہ بحضرت حق سبحانہٗ کو اس کو مرتبۂ احسان کہتے ہیں ترک بدعت، اتباع سنت مثل اصحاب کبارؓ، اخلاص اور اولیاء کی خدمت میں نیازمندی حضرت مجددؒ کا طریقہ ہے اور جو لوگ بے سوچے سمجھے حضرت مجددؒ کے کلام پر اعتراض کرتے ہیں، مخلصوں نے ان اعتراضات کے جواب دیے ہیں۔ ان کے کلام پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

پس اس طریقہ پر جو طریقۂ اصحاب کرام ہے حضرت مجددؒ اور مجددیوں کو کافر کہنا یہ کیسا مسلمانی ہے؟ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کی تکفیر کرے اگر وہ کافر نہیں ہے تو کہنے والا خود کافر ہو جائے گا اور عقیدۂ اہل سنت، توجہ بحضرت حق سبحانہٗ اور اتباع سنت و ترک بدعت نیز اخلاص حضرات مشائخ اگر کفر ہوگا تو پھر دین اسلام کیا ہے۔ جاننا چاہیے کہ مشائخ عظام عقیدۂ اہل سنت و جماعت اور ترک بدعت پر کاربند تھے۔ لیکن تعزیہ بنانا مرثیہ پڑھنا، سامنے تصویر رکھنا، پتھر تراش کر اور قدم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس کا نام رکھ کر

مخلوق کو سنگ پرست بنانا، عورتوں کا ناچ دیکھنا، داڑھی کٹانا، توبہ، ابطلہ اور طمانیت ترک کر کے نماز ضائع کرنا، لہو و لعب، مرغبازی اور نغمہ، تار و طنبور ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ باتوں کو عمل میں لانا، بزرگوں کا طریقہ نہیں ہے۔ ان باتوں کو حلال جاننا کفر ہے ورنہ فسق تو ضرور ہے۔ عجب مسلمانی ہے کہ طریقۂ صحابہ کو کفر کہتے ہیں اور خود یہ کہ مذکورہ معاملات کرتے ہیں۔

گرمئ قلب کی وجہ سے تاثیر اور کشف اور خرق عادات یہ باتیں کفار سے بھی ہو جاتی ہیں ظاہر و باطن میں اتباع پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کرنا صراط مستقیم ہے اور یہی مسلمانی ہے اور نزولِ قرآن اسی واسطے ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حقیر مسکین اور جمیع مسلمانوں کو یہ بات عطا فرمائے اور اس پر ہمت کے ساتھ رکھ کر مخلصین و محبین میں سے کر دے۔

مکتوب (۱۱۳) بنام سید احمد بغدادی (در جواب عریضہ)

سیادت و شرافت مرتبت حضرت سید احمد سلمہ اللہ تعالیٰ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ، دو ایک عنایت نامے پہنچے۔ مسرور و شاد کام کیا۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء۔ ان عنایت ناموں نے آپ کے محاسن صفات ذاتیہ اور مکارم اخلاق پر خوب وثوق کے ساتھ واقف کرایا اور مندرجہ پر مطلع کیا۔

حق یہ ہے کہ آپ جیسے عزیزوں کا موجود ہونا یعنی مولانا خالد، سید اسمٰعیل، میاں ابو سعید اور ان کے صاحبزادہ احمد سعید اور میاں رؤف احمد اور مولوی بشارت اللہ و مولوی کرم اللہ اور دیگر اعزہ سلمہم اللہ و جعلہم اللہ للمتقین اماما کا اس طریقہ میں داخل اور اس فقیر سے منسوب ہونا اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمتوں میں سے ہے جو شکر و سپاس سے مستغنی ہیں۔

ل آپ دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبد القادرؒ، شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبد العزیزؒ سے تحصیل علم کی اور مدت تک ان حضرات کی خدمت میں رہ کر حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ سے بیعت کی۔ ۱۲۴۳ھ میں حرمین شریفین گئے حج و زیارت سے فارغ ہو کر سورت پہنچے اور وہاں کے علماء و مشائخ نے علم روحانی و فیوض حاصل کیے پھر دہلی آئے اور پھر حج کے ارادہ سے سورت آئے اور ۱۲۵۲ھ میں وہیں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔

کما فی الحدیقۃ الاحمدیہ و نزھۃ الخواطر جلد ہفتم۔

از دست و زبان کہ بر آید — کز عہدہ شکرش بدر آید

(یعنی کس کے ہاتھ اور زبان سے ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ شکر سے عہدہ برآ ہو جائے)

شکر نعمتہائے حق چنداں کہ نعمتہائے حق

امید کہ اپنے قلبی حالات اور مستفیدین کے حالات (دوام توجہ، حضور، جذبات اور واردات متواتم) کو لکھ کر مسرور فرمائیں گے۔

ہم لوگ کہ فضل الٰہی سے فقر محمدی کی زیب و زینت سے شرف حاصل کیے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم کو دائمی شکر و رضا اور تسلیم بر فیصلہ قضا عطا فرمائے۔

رضیت باللہ ربا و بمحمد نبیا۔ اللھم ارزقنا حبک وحب حبیبک ورضائہ وشفاعتہ۔

(میں راضی ہوا اللہ تعالیٰ سے اس کے رب ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر۔ اے اللہ ہمیں اپنی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت عطا فرما اور اپنی رضا، ان کی رضا اور ان کی شفاعت بھی) آمین۔

...... ہم ضعیف تکالیف فقر کی طاقت نہیں رکھتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے تنگدستی و تنگی دنیا اور تنگی آخرت سے پناہ مانگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دونوں عالم میں دوام عفو و عافیت مانگتے ہیں اور شکر و رضا کی توفیق مانگتے ہیں۔

از افادات حضرت مولانا شاہ وصی اللہ قدس سرہٗ

مال کی شرعی حیثیت

(۳)

مال کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ۔

آیت کی تفسیر سُنئے۔ حضرت مولانا بیان القرآن میں فرماتے ہیں کہ (اگر یتیم بالغ ہو جاویں جس کا مقتضیٰ اُن کے مال کا جو تمہارے پاس رکھا ہے اُن کو سپرد کر دینا ہے جیسا کہ آگے آتا ہے لیکن اگر وہ کم عقل ہوں تو) تم (اُن) کم عقلوں کو اپنے (یعنی اُن کے) وہ مال مت دو جن کو خدائے تعالیٰ نے تمہارے سب کے لیے مایۂ زندگانی بنایا ہے (مطلب یہ کہ مال قدر کی چیز ہے اس لیے اُن کو ابھی مت دو کیونکہ بے قدری کر کے اُڑا دیں گے) البتہ اُن مالوں میں (سے) اُن کو کھلاتے رہو اور پہناتے رہو اور اُن سے معقول بات کہتے رہو (یعنی اُن کی تسلی کرتے رہو کہ مال تمہارا ہے تمہاری خیر خواہی کی وجہ سے ابھی تمہارے ہاتھ میں نہیں دیا ذرا سمجھدار ہو جاؤ گے تو تم ہی کو دے دیا جائے گا، اور (جب مال سپرد کرنے کے لیے ہوشیاری دیکھنا ضرور ہے تو) تم یتیموں کو (بالغ ہونے سے پہلے ہوشیاری اور تمیزداری کی باتوں میں) آزما لیا کرو (کیونکہ بالغ ہونے کے وقت تو سپردگیٔ مال کا وقت ہے تو آزمائش پہلے سے چاہیے۔

مثلاً کچھ کچھ سودا سلف ان سے منگوا لیا اور دیکھا کہ کیسے سلیقہ سے خرید کر لائے، یا کوئی چیز فروخت کے لیے دے دی اور دیکھا کہ اس کو کس طرح فروخت کیا) یہاں تک (ان کو آزمایا جائے) کہ جب وہ نکاح (کی عمر) کو پہونچ جاویں (یعنی بالغ ہو جاویں) پھر (بعد بلوغ) اگر ان میں ایک گونہ تمیز دیکھو (یعنی حفاظت و رعایت مصالحِ مال کا سلیقہ اور انتظام ان میں پاؤ) تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دو (اور اگر ہنوز سلیقہ یا انتظام نہ معلوم ہو تو چندے اور حوالہ نہ کیا جاوے)

دیکھئے اس آیت میں سفہاء (یعنی کم عقلوں) کو اُن کے اموال کے دینے کو بھی منع فرمایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سَفَہ یعنی عدم تمیز مانع تفویضِ مال ہے خواہ سلیقہ ہی نہ ہو خواہ سلیقہ تو ہو مگر اس سلیقہ سے وہ کام نہ لیتا ہو یعنی انتظام نہ کرتا ہو بلکہ مال کو اڑاتا ہو لہٰذا دونوں صورتوں میں مال ابھی نہ دیا جاوے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مال قابلِ قدر چیز ہے۔

پہلے مجھے خیال ہوتا تھا کہ مفسرین "قیاماً" کا کیا ترجمہ کرتے ہیں تو دیکھا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ مایۂ زندگانی فرمایا ہے اور صاحبِ روح المعانی نے مناطِ معاش فرمایا ہے اور فرمایا کہ مراد قیام سے مابہ القیام اور مابہ التعیش ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مال کو سببِ زندگانی اور ذریعۂ عیش بنایا ہے۔

اور لفظ قیاماً میں جیسا کہ ابو البقاء نے فرمایا ہے تین لغات ہیں ایک تو یہ کہ مصدر ہو، دوسرے یہ کہ یہ قیماً جمع قیمۃ کی ہو اور اس تقدیر پر معنی یہ ہوئے کہ اموال بھی نفوس کے حق میں بمنزلہ قیمت کے ہے اس لیے کہ ان نفوس کا بقاء اموال ہی سے ہے، علماء نے اس میں اور بھی لغات ذکر کیے ہیں چنانچہ فرمایا ہے کہ یہ معنی میں قامت کے ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو تمھاری قامت (یعنی جسم) کے بقاء کا سبب بنایا ہے۔

غرض ان تمام قرأۃ میں (آیت میں) اموال کی مدح کی جانب اشارہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ مال کی مدح فرما رہے ہیں اور اس کو قابلِ قدر اور ایک ذی خطر چیز قرار دے رہے ہیں۔ چنانچہ سلف یوں کہا کرتے تھے کہ مال مومن کی ڈھال ہے اور یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں مال چھوڑ جاؤں اور اللہ تعالیٰ اس پر مجھ سے حساب فرمالیں یہ کہیں زیادہ بہتر ہے اس سے کہ میں لوگوں کا دست نگر رہوں۔

عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے تھے کہ دراہم و دنانیر دنیا میں اللہ کے خواتیم یعنی (مُہر) ہیں کہ بذاتِ خود نہ تو کھائے جاتے ہیں اور نہ پیے جاتے ہیں۔ لیکن جب تم انھیں توڑ دو یعنی (خرچ کردو) تو وہ تمھاری حاجت پوری کرتے ہیں۔

قیس ابن سعد فرماتے ہیں :- اللّٰھمّ ارزقنی حمداً ومجداً فانہ لاحمد الّا بفعالٍ ولا مجد الّا بمالٍ۔

یعنی فرماتے ہیں کہ اے اللہ مجھے تعریف والا اور عزت والا بنا دیجیے۔ اور حمد ہوتی ہے نیک کرداری پر اور عزت ملتی ہے مال خرچ کرنے سے (پس مجھے آپ حَسَنُ الفعال اور کثیر المال بنا دیجیے)

ابو الزناد سے کہا گیا کہ آپ مال سے کیوں محبت کرتے ہیں حالانکہ وہ آپ کو دُنیا سے قریب کر دیتا ہے۔ تو فرمایا کہ ہاں (یہ صحیح ہے) اس نے اگر مجھے دُنیا سے قریب کر دیا ہے تو دُنیا سے بچا بھی لیا ہے۔

منثور الحکم میں ہے کہ فقر رسوائی ہے اور غنیٰ بزرگی و بڑائی ہے اور حال کی تنگی رذالت ہے اور سوال ذلت ہے۔ چنانچہ سلف کہا کرتے تھے اور لوگوں کو حکم دیتے تھے کہ تجارت کرو، اور کماؤ اس لیے کہ تم ایسے زمانے میں ہو کہ اگر تم میں سے کوئی محتاج ہوا تو سب سے پہلے اپنے دین ہی کو کھائے گا۔

ابو العتاھیہ کہتا ہے ؎

اجلّک قومٌ حین صرت الی الغنیٰ
وکلّ غنیٍّ فی العیون جلیلٗ

اذا مالت الدنیا علی المرءِ رغّبت
الیہ ومال الناس حیث یمیلٗ

ولیس الغنیٰ الّا غنیً زین الفتیٰ
عشیّۃ یقری اوغداۃ ینیلٗ

یعنی جب تم مال والے ہو جاؤ گے تو تم کو قوم بھی بڑا گرداننے گی اس لیے کہ ہر امیر لوگوں کی نگاہوں میں کبیر ہوتا ہے۔ (میں حضراتِ اہلِ علم سے کہتا ہوں کہ اس پر غور فرمائیں) اور جب دُنیا کسی

انسان کی جانب رُخ کرتی ہے تو عام لوگوں کی رغبت اور میلان بھی اسی کی جانب ہو جاتا ہے۔ اور غنی تو وہی ہے جو امیر کی شان کو بڑھائے خواہ ضیافت کی شام میں یا بخشش کی صبح میں۔

صاحب رُوح المعانی نے وارزقوهم منها واکسوهم کی تفسیر نہایت ہی عجیب و غریب فرمائی ہے، فرماتے ہیں:۔

ای اجعلوها مکانا لرزقهم وکسوتهم بان تتجروا وتربحوا حتی تکون نفقاتهم من الارباح لا من صلب المال لئلا یاکله الانفاق۔ (صہ۱۸۱ روح ۴)

یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا کہ اُن کو اس مال میں سے کھلاؤ اور پہناؤ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اموال کو جو تمہارے پاس ہیں۔ ان کے کھانے کپڑے کا ظرف اور مکان بناؤ بایں طور کہ اس میں تجارت کرو اور اس مال کو بڑھاؤ تاکہ ان کے نفقات (یعنی کھانا اور پہننا) نفع میں سے ہو اصل پونجی سے نہ ہو ورنہ تو یہ انفاق اُن کے اصل مال ہی کو کھا جائے گا۔ پس یہ تو مال کو مظروف بنانا ہوا نہ کہ ظرف کیونکہ ظرف میں سے کھایا جاتا ہے ظرف کو نہیں کھایا جاتا۔

دیکھئے علماء کے ان اقوال سے معلوم ہوا کہ دُنیا اس درجہ مذموم نہیں ہے جیسا کہ لوگوں نے اس کو سمجھ رکھا ہے، اور یہ معلوم ہوا کہ اس خیال کا منشا نصوص سے جہل اور اسلاف کی تصریحات سے لاعلمی ہے۔

مال کا کھانا اور اس کا جمع رکھنا اور پھر اس کا خرچ کرنا اس دُنیا کا ایک اہم مسئلہ ہے جس پر عقلاء نے بھی ہر زمانہ میں بحث کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز اس درجہ ضروری ہو اُس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح صرفِ نظر فرما سکتے تھے۔ چنانچہ شریعت نے اس سے بحث فرمائی ہے اور سنت میں بھی اس پر خوب خوب گفتگو موجود ہے۔ (جیسا کہ ہم آگے تفصیل بیان کرتے ہیں) پھر جب کتاب و سنت میں اس پر گفتگو فرمائی گئی ہے تو پھر صحابہ نے بھی اس مسئلہ سے اعتناء کیا۔ چنانچہ علامہ علی فکری نے اپنی کتاب السمیر المہذب میں اس مسئلہ پر اچھی گفتگو فرمائی ہے۔ یہاں ہم اُس کا کچھ اقتباس نقل کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

ومعنی الاقتصاد القصد فی النفقة وهو العدل فیها والتوسط بین

الاسراف والتقتیر فلا یجاری الانسان من ہو اغنی منہ فی اسرافہ وتبذیرہ فیقع فی اسر الاستدانۃ ویصبح فقیرا معدما فیقبحہ کل من رأہ ویبغضہ کل من علم امرہ۔

مطلب یہ ہے کہ اقتصاد کے معنی ہیں خرچ میں میانہ روی اختیار کرنا، یعنی نہ تو انسان اسراف اور فضول خرچی ہی کرے اور نہ مصارف ضروریہ ہی میں کمی کرے، پس انسان کو چاہیے کہ اللّے تللّے مال خرچ کرنے میں اپنے سے زیادہ مال والے کی ریس نہ کرے، ورنہ تو اس کا انجام یہ ہوگا کہ یہ شخص قرض کی قید میں گرفتار ہو جائے گا اور بالکل ہی فقیر و محتاج ہو کر رہ جائے گا اس کے بعد یہ حال ہوگا کہ جس شخص کو اس کا یہ حال معلوم ہوگا وہ اس سے نفرت کرے گا اور ہر شخص اپنے پاس سے اس کو دُور دُرائے گا........

اس طرح لکھتے لکھتے آگے فرماتے ہیں:۔

ربما انّ المرء یجھلُ احوال زمان ولا یامن صروف الایّام ولا یدری ما اذا کانت غبطتہ تدوم او باب رزقہ یبقی مفتوحا کان حقا علیہ ان یستعدّ للایام قبل وصولھا الیہ وان یتدارک الاعسار قبل الوقوع فیہ بان یجمع فی ایام الیسارہ ما یقاوم بہ اعسارہ وذالک بالاقتصاد فی المعیشۃ۔

یعنی انسان چونکہ آنے والے حالات و زمانہ کے تقلبات سے ناآشنا ہوتا ہے اور زمانہ کب بدل جائے اس کا کچھ اعتبار نہیں، اور وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ آج جو وہ رشکِ زمانہ بنا ہوا ہے یا اس پر رزق کا جو دروازہ کھلا ہوا ہے تو کل کو بھی وہ باقی رہے گا یا نہیں، (غرض جب حال یہ ہے) تو اس پر لازم ہے کہ ایامِ مصیبت آنے سے پہلے اس کی تیاری کر رکھے اور تنگدستی میں پڑنے سے پہلے اس کے دفعیہ کا سامان کرلے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ فراخی اور خوش حالی کے زمانہ میں کچھ پس انداز کرلے جس کے ذریعہ تنگی اور پریشانی کا مقابلہ آسان ہو اور ظاہر ہے کہ یہ چیزیں معیشت میں اقتصاد (یعنی اعتدال) ہی کی بدولت وقوع پذیر ہو سکتی ہیں۔ آگے فرماتے ہیں:۔

وقد ورد ھذا المعنی فی الحدیث الشریف وھو قولہ صلی اللّٰہ

علیہ وسلم رحم اللہ امرأ کسب طیباً وانفق قصداً وقدم فضلاً لیوم فقرہ وحاجتہ۔

یعنی یہ مضمون حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ رحم کرے اس شخص پر جو طیب کا کسب کرے یعنی رزق حلال کمائے اور اعتدال و میانہ روی کے ساتھ اس کو خرچ کرے یعنی نہ بخل کرے اور نہ فضول خرچی کرے اور حوائج ضروریہ سے جو بچ رہے اس کو وقت ضرورت کے لیے اٹھا رکھے مثلاً بڑھاپے کے زمانے کے لیے اس لیے کہ غالب احوال میں وہ فقر و حاجت کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس حدیث کو نقل کر کے علامہ علی فکری فرماتے ہیں کہ:-

فما احسن ھذا الادب الشرعی وما اشد حاجۃ الناس الیہ علی اختلاف طبقاتھم وادوارھم واطوارھم۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال کے متعلق جو یہ ادب شرعی تعلیم فرمایا ہے بہت ہی خوب ہے اور ہر جگہ ہر طبقہ کے لوگ اور ہر زمانے کے لوگ اس کے محتاج ہیں۔ آگے لکھتے ہیں کہ:-

والاقتصاد علی ھذہ الصورۃ التی علمنا ایاھا الشارع الحکیم من الواجبات الشخصیۃ التی ینبغی ان یراعیھا الانسان فی واجب الکسب من التجارۃ والزراعۃ والصناعۃ۔

یعنی اقتصاد کی یہ صورت جس کی شارع حکیم نے ہمیں تعلیم فرمائی ہے منجملہ واجبات شخصیہ کے ہے جس کا لحاظ ہر انسان کو اپنے کسب واجب میں خواہ وہ تجارت ہو یا زراعت و صناعت ہو ضروری ہے۔

اس کے بعد مولف نے اقتصاد یعنی اعتدال فی النفقہ کے اثبات میں کتاب و سنت اور اسلاف امت کے اقوال نقل فرمائے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:-

(۱) قال اللہ تعالیٰ ولا تبذر تبذیرا ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین ط

(۲) وَقَالَ تَعَالیٰ وَالَّذِیْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا ۔

(۳) وَقَالَ تَعَالیٰ وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَةً اِلیٰ عُنُقِکَ وَلَا تَبْسُطْهَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۔

(۱) اور بے موقع نہ اڑانا، بے شک بے موقع اڑانے والے شیطانوں کے بھائی بند ہیں۔

(۲) اور جب وہ خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ کرنا اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔

(۳) اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن ہی سے باندھ لینا چاہیے اور نہ بالکل ہی کھول دینا چاہیے، ورنہ الزام خوردہ تہی دست ہو کر بیٹھ جاؤ گے۔

(۱) وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اقتصد اغناہ اللہ ومن بذر افقرہ اللہ۔

یعنی جس نے میانہ روی سے کام لیا اللہ تعالیٰ اس کو غنی بنا دیں گے اور جس نے فضول خرچی کی اللہ تعالیٰ اس کو فقیر بنا دیں گے۔

(۲) وقال علیہ السلام: ولا عال من اقتصد۔

یعنی جس نے میانہ روی اختیار کی وہ کبھی فقیر نہ ہوگا اور نہ محتاج۔

(۳) وقال علیہ السلام: الاقتصاد فی النفقۃ نصف المعیشۃ۔

یعنی خرچ میں انتظام و اعتدال رکھنا آدھی معیشت (کمائی) ہے۔

وقال ابوبکر صدیق رضؓ: انی لأبغض اھل بیت ینفقون رزق ایام فی یوم واحد۔

یعنی میں ان گھر والوں کو ناپسند کرتا ہوں جو چند دنوں کی روزی ایک ہی دن میں ختم کر دیں۔

وقال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ: ان اللہ یحب القصد والتقدیر ویکرہ السرف والتبذیر۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ میانہ روی اور حساب کتاب سے خرچ کرنے کو پسند فرماتے ہیں اور اسراف اور فضول خرچی کو ناپسند فرماتے ہیں۔

وقال علی کرم اللہ وجہہ ، دع الاسراف مقتصداً واذکر فی الیوم غداً۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فضول خرچی کو چھوڑو اور میانہ روی اختیار کرو، اور کل کی فکر و انتظام آج ہی سے کر رکھو۔

وقال معاویہ رضی اللہ عنہ ، حسن التقدیر نصف الکسب۔

عمدگی کے ساتھ خرچ کرنا آدھی کمائی ہے اور اسی پر انسان کی حسن معیشت کا دارومدار ہے۔

وقال احد علماء الاقتصاد : من ربی ابنہ علی الاقتصاد افادہ اکثر مما یترک لہ ثروۃً وافرۃً۔

اقتصادیات کے ایک عالم کا مقولہ ہے کہ جس نے اپنی اولاد کی پرورش اقتصاد پر کی یعنی اُسے اقتصاد سکھایا تو اس نے اس کو کہیں زیادہ نفع پہونچایا اس سے کہ اس کے لیے بہت زیادہ مال چھوڑ جاتا۔

آخر میں مولف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

وصفوۃ القول ان الاقتصاد واستفضال شئ من النفقۃ اساس تدبیر المنزل ومن اول واجبات الشخصیۃ وھو الملجأ الامین الذی یلجأ الیہ ارباب الاسر فیجدون فیہ الھدوء والراحۃ والسرور وحریۃ التمتع بالنعیم والخیرات التی افاضھا الخالق تعالیٰ علیھم۔

حاصل کلام یہ کہ اقتصاد اور اپنی آمدنی میں سے کچھ بچا لینا یہ تدبیر منزل کی اساس ہے، اور شخصی واجبات میں سے پہلی چیز ہے جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک بے خطر اور اطمینان بخش پناہ گاہ ہے جس کی جانب اہل خاندان پناہ پکڑتے ہیں، چنانچہ اسی میں اپنے لیے راحت و سکون پاتے ہیں اور نشاط و سرور دیکھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جو انعامات اور بھلائیاں بخشی ہیں اُن سے نفع اُٹھانے کی آزادی محسوس کرتے ہیں۔......

(۱۰) اسی سلسلۂ کلام میں حضرت مولانا نے فرمایا کہ قرآن پاک میں عباد الرحمٰن کا ایک وصف یہ بیان فرمایا گیا ہے) "وَالَّذِیْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا۔ یعنی وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں کہ معصیت میں خرچ کرنے لگیں اور نہ تنگی کرتے ہیں کہ خدمت ضروریہ میں بھی خرچ کی کمی کریں، اور ان کا خرچ کرنا اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ جو بیان فرمایا ہے کہ وہ فضول خرچی اور تنگی دونوں نہیں کرتے تو اس سے سمجھ لیا گیا تھا کہ ان کا انفاق بین بین ہے پھر اس کے بعد بھی وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا فرما کر تنصیص اور تصریح فرمائی کہ ان کا فعل خیر الامور کے قبیل سے ہے کیونکہ مشہور ہی ہے کہ خیر الامور اوسطہا اور ظاہر یہ ہے کہ مراد انفاق سے عام ہے خواہ اپنے نفوس پر خرچ کرتے ہوں خواہ دوسروں پر خرچ کرتے ہوں اور خرچ میں میانہ روی اختیار کرنا انسان کے عاقل اور فہیم ہونے کی دلیل ہے۔ جیسا کہ ابو درداءؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ من فقه الرجل رفقه فی معیشته یعنی انسان کی سمجھ اور دانشمندی سے اپنی معیشت کا درست رکھنا ہے۔ نیز حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ منجملہ اسراف کے یہ بھی ہے کہ تمہارا جو جی چاہے کھانے لگ جاؤ اور اس میں شک نہیں کہ نظم کے ساتھ خرچ کرنا دشوار امر ہے۔ یہ بھی آسان ہے کہ آدمی جو چاہے خرچ کر ڈالے اور یہ بھی آسان ہے کہ بالکل بخیل اور کنجوس ہو جائے لیکن یہ کہ خرچ کرے اور موقع اور محل پر کرے یہ مشکل چیز ہے، اس میں عقل و تدین کی ضرورت ہے، مال اپنی ذات کے لحاظ سے بُری چیز نہیں ہے اسکے متعلق حدیث شریف میں آیا ہے نعما المال الصالح للرجل الصالح یعنی صالح مال صالح انسان کے لیے کیا ہی اچھی چیز ہے، ایک اور حدیث میں آتا ہے من اخذ بحقه فنعم المعونة هو یعنی جو شخص مال کو جائز طریقوں سے حاصل کرے تو یہ ایک اچھا معین اور عمدہ مددگار ہے، ایک اور حدیث میں آتا ہے نعم المتاع ونعم الوسیلة یعنی نہایت عمدہ برتنے کی چیز اور بہت ہی خوب وسیلہ ہے۔ مال ہی کی وجہ سے حضرت صدیقؓ کی مدح قرآن میں ان لفظوں میں آئی ہے۔

وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ

مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۙ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۚ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ؀

اور اُس (نار) سے ایسا شخص دور رکھا جائے گا جو بڑا پرہیزگار ہے اور اپنا مال محض اس غرض سے دیتا ہے کہ گناہوں سے پاک ہو جائے یعنی محض رضائے حق اس کا مطلوب ہے، اور بجز اپنے عالیشان پروردگار کے رضا جوئی کے اس کے ذمہ کسی کا احسان نہ تھا کہ اس کا بدلہ اُتارنا مقصود ہو، یہ شخص عنقریب خوش ہو جائے گا۔

ان کے بہت سے اوصاف تھے منجملہ اُن کے انفاق مال بھی تھا، ایکمرتبہ حضرت عمرؓ کے پاس کچھ مال آیا، اتفاقاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال طلب فرمایا حضرت عمرؓ نے یہ خیال کیا کہ ہر مرتبہ ایسے موقع پر حضرت صدیقؓ ہی بڑھ جاتے ہیں آج شاید میں ان سے بڑھ جاؤں، یہ خیال کر کے آدھا مال لے آئے اور خدمت اقدس میں پیش کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ عمرؓ کچھ گھر والوں کے لیے بھی چھوڑ آئے؟ عرض کیا جی ہاں! آدھا اُن کے لیے چھوڑ آیا ہوں آدھا لے آیا ہوں، اتنے میں حضرت صدیقؓ بھی تشریف لے آئے اور مال پیش کیا، آپ نے اُن سے بھی یہی سوال فرمایا کہ کچھ گھر والوں کے لیے بھی چھوڑ آئے ہو؟ عرض کیا کہ گھر خدا اور رسول کو چھوڑ آیا ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم دونوں کے مراتب کا فرق تم دونوں کے جواب سے ظاہر ہے۔ دیکھئے حضرت صدیقؓ کو اللہ اور رسول کی یہ رضا جو حاصل ہوئی تو اخلاص فی الانفاق کی وجہ سے تو ہوئی، اور سنئے مکہ میں حضرت خدیجہؓ ایک مالدار عورت تھیں ان کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کا خیال خود پیدا ہوا، نکاح کے بعد ان کی خواہش کے مطابق ان کا تمام مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تصرف کے تحت داخل ہو گیا اس طور پر آپ بظاہر بھی غنی ہو گئے، اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ میں فرمایا ہے وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى یعنی ہم نے آپ کو نادار پایا پس غنی بنا دیا۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ اس سے مراد آپ کا حضرت خدیجہؓ سے نکاح ہونا ہے، حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد آپ اُن کو اکثر یاد فرماتے تھے۔ ایک دن حضرت عائشہؓ نے کہا کہ آپ حضرت خدیجہؓ کو بہت یاد کرتے ہیں حالانکہ اللہ نے اُن سے اچھی بی بی آپ کو عنایت فرمائی ہے، آپؐ نے فرمایا کیا کہتی ہو؟ اُن سے اچھی بی بی، نہیں ہرگز نہیں، مجھے ان سے بڑھ کر اچھی بی بی نہیں ملی، اس لیے کہ انھوں نے مجھے اُس وقت دیا جب کہ اور لوگوں نے مجھے محروم کیا، اسی طرح سے انھوں نے میری تصدیق اس وقت کی

اور ایذا اٹھائیں، جس وقت دوسروں نے میری تکذیب کی۔ دیکھا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی فضیلت دو جہت سے بیان فرمائی ایک تصدیق دوسرے انفاق مال، اگر ان کے پاس مال نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جی کیسے خوش کرتیں اور وہ بھی ایسی خوشی کہ خود تو دنیا سے تشریف لے جا چکیں اور اپنی محبت اور یاد باقی چھوڑ گئیں۔ یہ مال، اور اس کے انفاق ہی کی وجہ سے ہوا کہ انھوں نے زندگی میں اپنا تمام مال رسول اللہ علیہ وسلم پر قربان کر دیا۔

اور اسی مال نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں چار چاند بھی لگائے ہیں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ ایک کافر کے غلام تھے، وہ انھیں بہت ایذائیں دیتا تھا، گرمی کے زمانے میں جلتے پتھر اور تپتی ریت پر لٹا کر کہتا تھا کہ اسلام سے پھر جاؤ اور وہ احد احد کہتے رہتے تھے۔ ایک دن حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے اس منظر کو دیکھ لیا، بیتاب ہو گئے، اس کافر سے کہا تم اپنے اس غلام سے میرے فلاں غلام سے بدل لو گے؟ اس نے کہا ہاں، مگر وہ تمہارا غلام بھی لوں گا اور اس کے ساتھ اتنا نقد بھی لوں گا۔ جب اس کو دے سکتا ہوں، حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا منظور، غلام اور نقد دے کر بلال رضی اللہ عنہ کو چھڑا لیا اور آزاد کر دیا۔ اس پر وہ کافر ہنستا تھا اور اپنے لوگوں میں اپنی ہوشیاری پر فخر کرتا تھا کہ میں نے صدیق رضی اللہ عنہ کو ٹھگ لیا ہے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ میں نے دھوکا نہیں کھایا ہے بلکہ آخرت کا سودا کیا ہے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا مرتبہ تھا اس کو کافر کیا سمجھ سکتا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ مال کا صحیح مصرف اللہ کے رسول یا وہ لوگ ہیں جو رسول کے متبع ہیں۔ اور مال کی جو مذمت ہے وہ کفر کے ساتھ اور اس کے تبع رکھنے کے ساتھ ہے اور جہاں اللہ و رسول کے حکم کے مطابق انفاق پایا جائے وہاں تو مدح ہی ہے۔ مال کی دنیا میں بہت ضرورت ہے اور ہر ایک کو ضرورت ہے۔ نبی کو بھی ضرورت ہے۔ ولی کو بھی ضرورت ہے۔ مومن کو بھی ضرورت ہے اور فاسق و فاجر کو بھی ضرورت ہے، حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ مال جمع کرنے سے اجتناب کرنا پہلے زمانہ میں تھا اور اب تو ہمارے زمانہ میں یہ حال ہے کہ اگر آدمی پر کوئی وقت پڑے تو سب سے پہلی چیز جو وہ صرف کرے گا وہ اپنا ایمان ہوگا۔ اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ اگر ہمارے پاس مال نہ ہوتا تو یہ امیر لوگ تو ہمیں صافی بنا لیتے اور سب سے اچھا فیصلہ اس بارے میں مولانا روم نے فرمایا ہے۔ مثنوی میں فرماتے ہیں ۔

اے بسا امساک از انفاق بہ	مال حق را جز بہ امر حق مدہ

یعنی بہت سا امساک (یعنی مال کا خرچ نہ کرنا) انفاق (یعنی مال خرچ کرنے) سے بہتر ہوتا ہے۔ مال حق تعالیٰ کا ہے لہٰذا ان کے مال کو انھیں کے حکم سے خرچ کرو۔ اور فرماتے ہیں کہ ؎

مال را گر بہر دیں باشی حمول	نعم مال صالح گفتا رسول

"یعنی مال کو اگر دین کی خاطر جمع کرو (تو کچھ حرج نہیں ہے کیونکہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ صالح مال صالح شخص کے لیے کیا ہی اچھی چیز ہے۔ آگے اس کی ایک مثال دی ہے اور اس میں شک نہیں کہ غضب کی مثال ہے، اور مولانا روم تو اس کے ماہر ہیں، فرماتے ہیں ؎

آب در کشتی ہلاک کشتی است	آب اندر زیر کشتی پشتی است

یعنی مال کی مثال پانی کی سی ہے جس کا حال یہ ہے کہ اس میں نفع و ضرر دونوں کا پہلو ہوتا ہے چنانچہ پانی اگر کشتی کے اندر آجائے تو کشتی کے غرق ہونے کا سبب ہے اور اگر یہی پانی کشتی کے نیچے ہو یعنی کشتی پانی میں ہو تو اس کے چلنے کا ذریعہ ہے۔"

اسی طرح سے مال اگر دل میں ہے تو یہ ایسا ہے جیسے پانی کشتی میں ہو یعنی اس کی ہلاکت کا پورا سامان ہے اور اگر قلب سے باہر ہو یعنی جیب اور بکس میں ہو تو دنیا میں انسان کی زندگی کی گاڑی اسی کے سہارے چلتی ہے اور اس کا مصداق ہے کہ نعم المال الصالح للرجل الصالح یعنی مال بھی صالح ہو اور جس کے پاس ہو وہ بھی صالح ہو تو وہ مال محمود ہے اور ایسا مال ہونا شرعاً مطلوب ہے اور اسی کے مقابلہ سے کہا جا سکتا ہے بئس المال الطالح للرجل الطالح یعنی مال بھی صالح نہ ہو اور آدمی بھی صالح نہ ہو بلکہ فاسق یا کافر ہو تو یہ تو کریلا اور نیم چڑھا کا مصداق ہے۔

اسی مضمون کو شیخ سعدی یوں بیان فرماتے ہیں ؎

چو ہر ساعت از تو بجائے رود دل	بہ تنہائی اندر صفائے نہ بینی
دگر مال و جاہ است و زرع و تجارت	چو دل با خدا ہست خلوت نشینی

یعنی جب ہر وقت تمھارا دل ادھر ادھر بارہ باٹ رہے گا تو تم خلوت اور تنہائی میں رہنے کے باوجود اپنے قلب میں کچھ بھی صفائی نہیں پاؤ گے، باقی یوں دولت ہو، سونا چاندی ہو، کھیتی اور تجارت ہو مگر دل خدا کے ساتھ لگا ہوا ہو تو تم خلوت نشین ہی ہو (خلوت در انجمن یہی ہے) یہ امور

چونکہ سبب غفلت نہیں ہے لہٰذا ان کا ہونا کچھ مضر نہیں

اس سے معلوم ہوا کہ کامل کا اور حکم ہے اور ناقص کا اور۔ یہی دنیا کامل کے پاس ہوگی تو اور خدا سے تعلق کا ذریعہ بنے گی اور ناقص کے پاس ہوگی تو اس کو خدا سے اور غافل بنائے گی۔ اور اسی مال اور اسی دنیا کی مذمت وارد ہے اور کفار اسی مال اور اولاد کے فتنہ میں انبیاء علیہم السلام سے بگڑ گئے تھے، ان کے مقابلے میں اسی کی وجہ سے تمرد اور سرکشی اختیار کی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں ان کا یہ قول نقل بھی فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان کے تکبر کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ یوں کہتے تھے کہ نحن اکثر اموالاً و اولاداً۔۔۔۔۔

ظاہر ہے کہ جب مال کا یہ مصرف بنایا جائے گا تو وہ مذموم اور وبال تو ہوگا ہی مال کو عبادت شر کی ایذا رسانی کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیئے بلکہ ہو سکے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا میں خرچ کرنا چاہیئے یا کسی اللہ والے کا دل اس سے خوش کر دے، ممکن ہے کہ وہ دعا ہی کر دے اور اس کا کام بن جائے، اور اس میں کچھ زیادہ مال کی ضرورت نہیں ہے البتہ فہم اور اخلاص شرط ہے، اس پر یہ واقعہ سنیئے!

(۱) چند بزرگ سفر کر رہے تھے راستہ میں ایک باغ سے ہو کر گذرے کچھ نوجوان لوگ وہاں اپنا بُننے کا کام کر رہے تھے ان حضرات نے اسی باغ میں قیام کیا اور اپنے سامان میں سے توشہ نکال کر کھانے ہی جا رہے تھے کہ ان میں سے ایک شخص آیا اور کہا کہ حضرت یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ لوگ ہماری زمین پر اپنا کھانا کھائیں اسے تو آپ رکھ لیجئے پھر کھا لیجئے گا، میں گھر سے کھانا لے کر آتا ہوں، یہ کہہ کر گھر گیا اور وہاں سے کھانا تیار کرا کر لے آیا اور انھیں کھلایا جب کھانا کھا چکے تو ان میں سے ایک نے کہا کہ بھائی اس نے ہم پر احسان کیا ہے اس کو دنیا دے دو۔ دوسرے بزرگ بولے اسے نہیں دنیا میں ہلاک ہو جائے گا دین دے دو۔ تیسرے بزرگ بولے اس دنیا میں دین کے ساتھ دنیا کی بھی تو ضرورت پڑتی ہے لہٰذا دین دنیا دونوں دے دو۔ چنانچہ اسی کی دعا کر دی۔ دیکھئے! ایک وقت کے کھانا کھلانے کی وجہ سے یہ شخص کامیاب ہوا۔

۱؎ ان بزرگوں کے اس قول میں دنیا یا دین یا دونوں دینے سے مراد ان کی دعا کرنا ہو، جیسا کہ آگے صراحتہً مذکور ہے ۱۲

(۲) اسی طرح ایک عالم نے اپنی کتاب میں ایک واقعہ لکھا ہے جس کا ظاہر ذرا انوکھا سا ہے، لیکن بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص کہتا تھا کہ میں نے خدائے تعالیٰ کو روپیہ میں پایا، مراد اس کی اس سے یہ تھی کہ اس نے کسی وقت روپیہ کسی حاجت مند کو دے دیئے تھے وہ تھے صاحب نسبت بزرگ انھوں نے دعا کر دی اور وہ کامیاب ہو گئے۔ اسی کو کہتا ہوں کہ مال کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اہل اللہ کے راضی کرنے اور ان کی دعا لینے میں صرف کیا جائے تاکہ انسان کو دین بھی ملے اور دنیا بھی ملے اور یہ اس کا صحیح استعمال ہے۔ اور اس کا سوء استعمال یہ ہے کہ اس کو اللہ کی معصیت میں صرف کیا جائے یا اللہ کے نیک بندوں کی ایذا رسانی میں۔ ایک عالم نے نہایت عمدہ بات لکھی وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کی مخالفت مالداروں ہی نے کی غریبوں نے نہیں کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ مال فی نفسہٖ کوئی بری چیز نہیں برائی اس کے استعمال اور اس سے پیدا ہونے والے برے آثار میں ہے مومن کے پاس اگر مال ہو تو سبحان اللہ کیا کہنا وہ اس سے اللہ کی رضا حاصل کرے گا جس طرح حضرت صدیقؓ نے حضرت بلالؓ کو خرید کر لیا، اور جنت خرید لے گا مال کے متعلق ہر زمانہ میں لوگوں کو کچھ غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔ شیخ سعدیؒ نے گلستاں میں "جدال سعدی با مدعی در بیان توانگری و درویشی" کا عنوان قائم کر کے اسی مسئلہ پر اپنا ایک مناظرہ بیان فرمایا۔ ان کا مقابل امیروں کی برائی کرتا تھا، شیخ فرماتے تھے کہ سب مالدار برے نہیں ہیں اور مال کا ہونا بھی برا نہیں ہے۔ گفتگو طویل ہے۔ بات بڑھتے بڑھتے ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی جس کو شیخ نے خود لکھا ہے "دشنامم داد، سقطش گفتم، گریبانم درید، زنخدانش شکستم" ؎

او در من و من در و فتادہ — خلق از پے ما دواں و خنداں
انگشت تعجب جہانے — از گفت و شنید ما بدنداں

فرماتے ہیں کہ اس نے مجھے گالی دی، میں نے بھی اسے سخت سست کہا، اس نے میرا گریبان پھاڑ ڈالا میں نے بھی اس کی ٹھوڑی توڑ دی، غرض وہ مجھ میں اور میں اس میں دونوں خوب گتھم گتھا ہو گئے اور مخلوق ہماری طرف ہنستی ہوئی دوڑی اور ہمارے حالات اور بات چیت معلوم کر کے لوگوں نے تعجب سے دانتوں میں انگلی دے لی۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ بالآخر ہم دونوں اپنا مقدمہ قاضی کے پاس لے گئے اور اس کے فیصلے پر رضامندی ظاہر کی چنانچہ

قاضی نے جب ہماری حالت دیکھی اور ہماری بات سنی تو تفکر کا سر نیچا کیا اور بہت دیر تک غور کرتا رہا۔ پھر سر اٹھایا اور مجھے مخاطب کر کے کہا کہ۔

"اے کہ توانگراں را ثنا گفتی و بر درویشاں جفا روا داشتی بدانکہ ہر جا گل است خار است

و با خمر خمار است و بر سر گنج مار است و آنجا کہ دُرِ شاہوار است نہنگ مردم خوار است"

"یعنی سنو! تم نے جو امیروں کی تعریف کی ہے تو یہ سمجھ لو کہ جہاں پھول ہوتا ہے کانٹا بھی ہوتا ہے۔ خمر کے ساتھ خمار ہوتا ہے۔ خزانہ پر سانپ ہوتا ہے اور جہاں دُرِ شاہوار ہوتا ہے وہیں گھڑیال مردم خور بھی ہوتا ہے" اسی طرح بہت کچھ کہنے کے آخر میں کہا کہ مقربانِ حضرت حق وہ امراء ہیں جو درویش سیرت ہیں۔ اسی طرح وہ درویش بھی ہیں جو تونگر ہمت ہیں۔ مالداروں میں سے بہتر وہ شخص ہے جو درویشوں کا غم کھائے اور عمدہ فقیر وہ ہے جو امیروں کے یہاں نہ جائے۔ اس کے بعد انہوں نے سخن درویش کی جانب کیا اور امراء کی دو قسمیں بیان کیں۔ ایک وہ لوگ جو مناہی و ملاہی میں مشغول ہیں اور ایک وہ جو خوانِ نعمت بچھائے ہوئے ہیں اور دستِ کرم پھیلائے ہوئے ہیں اس طرح دنیا و آخرت دونوں کے جامع ہیں۔ اس مضمون کو قاضی نے بہت ہی مرتب انداز سے ادا کیا۔ شیخ کہتے ہیں کہ قاضی کا یہ فیصلہ سن کر ہم دونوں نے صلح کر لی اور معافی کے تدارک کے لیے ہر ایک نے دوسرے کی پیشانی چومی اور بات کو ان دو بیت پر ختم کیا۔

مکن ز گردشِ گیتی شکایت اے درویش — کہ تیرہ بختی اگر ہم بریں نسق مُردی

توانگرا چو دل و دست کامرانت ہست — بخور ببخش کہ دنیا و آخرت بُردی

یعنی اے درویش تو گردش زمانہ کی شکایت نہ کر کیونکہ اگر تو اسی حال پر مر جائے گا تو بدبخت ہوگا اور اے امیر جبکہ اللہ تعالیٰ نے تیرے ہاتھ میں مال دیا ہے اور تجھے دل دیا ہے تو پھر خوب کھا اور کھلا تاکہ تیری آخرت بھی بن جائے اور دنیا میں بھی کوئی تیری مذمت نہ کرے۔

میں کہتا ہوں کہ شیخ نے قاضی کا فیصلہ اچھا نقل کیا ہے لیکن اس سے عمدہ بات مجھے وہ معلوم ہوئی جو خود شیخ سعدی نے بوستان میں فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ مال خود تو مقصود ہے نہیں بلکہ اس سے چیزیں خریدی جاتی ہیں تو جب کہ مال اشیاء کی خریداری کے لیے ہے تو کیوں نہ انسان اس سے محبوب کا ناز و انداز ہی خریدے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ محبوب حقیقی کی مرضیات میں مال صرف کر دو اس کا صحیح استعمال یہی ہو سکتا ہے۔

غرض میں اس وقت زیادہ کچھ نہ کہہ کر یہ کہنا چاہتا تھا کہ مال اور دنیا اپنی ذات کے لحاظ سے مذموم نہیں ہے بلکہ اس کے سوءِ استعمال کو برا کہا جاتا ہے۔ (بشکریہ "معرفت حق" الہ آباد)

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

انشورنس، فقہی نقطۂ نظر سے

(۲)

[یہ اس مضمون کی دوسری اور آخری قسط ہے۔ یہ پورا مضمون سہ ماہی رسالہ "اسلام اور عصر جدید دہلی" میں شائع ہو چکا ہے۔ محترم مضمون نگار کی نظرِ ثانی اور بعض ترمیمات کے ساتھ اب الفرقان میں شائع ہو رہا ہے]

خلاصہ یہ کہ انشورنس اور عقدِ ربا میں بہ لحاظ حقیقت و صورت، ایسا کوئی فرق نہیں نظر آتا جس سے حکم میں فرق کیا جاسکے، یوں تھوڑا بہت فرق تو "ربا" کی معروف شکلوں کے درمیان بھی پایا جاتا ہے! ایک فرق مقالہ نگار نے بیان کیا ہے:

"انشورنس کرانے والے افراد پریمیم کے طور پر مجموعی طور پر جو رقم ادا کرتے ہیں اتنی ہی رقم افراد کے اس گروہ کو مجموعی طور پر واپس دی جاتی ہے نہ کم نہ زیادہ۔"

اس فرق کا حاصل غالباً یہ ہے کہ معروف سود کے ذریعے ایک طرف افلاس آتا ہے دوسری طرف بظاہر خوش حالی آتی ہے اور اس طرح دولت کا توازن بگڑ جاتا ہے نیز بغیر محنت کے دولت میں یکطرفہ اضافہ ہوتا ہے، بر خلاف انشورنس کے، کہ اس کے ذریعے کسی کو رقم مل جانے سے توازن پر اثر نہیں پڑتا، اور دولت کی مجموعی سطح (ان افراد کے درمیان) پہلے ہی کی طرح برقرار رہتی ہے۔

لیکن اس فرق کو مصلحت اور حکمت کا فرق تو کہا جاسکتا ہے، علت کا نہیں، حالانکہ حکم کا مدار علت پر ہوتا ہے نہ کہ حکمت پر (دیکھیے اصول فقہ) اور علت یہاں موجود ہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ سود کی معروف صورتوں میں بھی بعض ایسی شکلیں ممکن ہیں جن میں دولت کی مجموعی سطح برابر رہے، مثلاً جمشید اور رستم کے درمیان سودی قرض کا معاملہ ہوا، جمشید نے رستم کو اس معاہدہ کی بنا پر سو روپیہ اصل رقم پر اضافہ کرکے واپس کیے۔ اس کے بعد رستم کو اتفاقاً ایسے سودی قرض لینے

کی ضرورت پیش آگئی، اور اس بار رستم نے اسفندیار کو سود پہ سود یعنی سود کے ادا کیے۔ بعد ازاں اسفندیار کو جمشید سے سود پر قرض لینا پڑ گیا اور اس مرتبہ اسفندیار نے جمشید کو اصل رقم پر سود در سود بڑھا کر معاہدے کی رو سے دیے۔ اب اس مفروضہ مثال پر غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف یہ کہ دولت کی مجموعی سطح ان افراد کے درمیان برقرار رہی بلکہ ہر فرد الگ الگ بھی واقعۃً کسی مالی نقصان سے دوچار نہیں ہوا تو کیا اس وجہ سے یہ معاملات سودی نہیں رہے اور جائز ہو گئے؟

رہا یہ کہ انشورنس میں بعض "دنیاوی منافع" اور "سماجی فوائد" ہیں سو اس کا انکار نہیں لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بعض دنیاوی منافع کس حرام معاملے میں نہیں ہوتے؟ اگر کوئی نفع نہ ہو تو وہ معاملہ کیا ہی کیوں جائے؟ اور اسے حرام قرار دینے کی ضرورت ہی کب پیش آئے۔

انشورنس کا جواز ثابت کرنے کے لیے (سودی معاملات سے مذکورہ فرق دکھلانے کے علاوہ) عام طور پر "عاقلہ" اور "دیت" کا تذکرہ کچھ اس انداز میں کیا جاتا ہے کہ جیسے اس پر قیاس کیا جا رہا ہو یا کیا جا سکتا ہو۔ حالانکہ دونوں میں اتنا واضح فرق ہے کہ اس کی موجودگی میں "قیاس" کر لینا سمجھ میں نہیں آتا تطویل سے بچنے کے لیے دیت اور انشورنس کے درمیان موجود فرق کی سب تفصیلات نہیں، بلکہ جو بہت واضح ہیں ان ہی کے بیان پر اکتفا کیا جائے گا۔

اولین اور سب سے نمایاں فرق تو یہی ہے کہ "قتلِ خطا کا مجرم" اس کے نتیجے میں خود کچھ نہیں پاتا، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ 'عاقلہ' براہِ راست (یا بواسطہ حکومت) مقتول کے ورثہ کو دیت کی رقم دیتے ہیں، کیونکہ درحقیقت اس دیت کا وجوب ہی عاقلہ پر ہوتا ہے جیسا کہ صاحب ہدایہ علامہ برہان الدین مرغینانی رحمہ (دقیقہ رسی اور محتاط فقیہانہ عبارت نگاری میں اپنی نظیر آپ ہیں) فرماتے ہیں[۲۲] "وقتل الخطاء تجب به الدیۃ علی العاقلۃ والکفارۃ علی القاتل" اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ عاقلہ اپنا واجب ادا کرتے ہیں، نہ کہ قاتل کا، اور وہ رقم مقتول کے ورثہ کو ملتی ہے، قاتل کو نہیں ملتی، یہاں یہ بتلانے کی تو ضرورت نہیں کہ مقتول

عہ قتلِ خطا میں شریعت نے قاتل کے بجائے اس کے رشتہ داروں (یا ہم پیشہ لوگوں) پر خوں بہا واجب کیا ہے، ان ہی لوگوں کو "عاقلہ" کہا جاتا ہے۔ "دیت" "خوں بہا" کو کہتے ہیں۔

کے ورثہ قاتل کے نہ تو وکیل ہوتے ہیں اور نہ اس کے قائم مقام، بلکہ براہ راست (یا مقتول کے قائم مقام کی حیثیت سے) دیت کے مالک بنتے ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے کہ خطا کار قاتل سبب وجوب بنا ہے، مگر وجوب عاقلہ پر ہوتا ہے نہ کہ اس پر۔ (شریعت میں اس قسم کی نظیریں اور بھی ملتی ہیں، مثلاً نابالغ بچوں کے صدقۂ فطر کا وجوب، بچوں کے باپ پر ہوتا ہے اور سبب وجوب نابالغ بچے بنتے ہیں۔)

اس کے علاوہ اور بھی کئی فرق ہیں، مثلاً دیت میں پہلے سے کسی رقم کا ادا کیا جا چکا ہونا بالکل ضروری نہیں ہوتا، بلکہ اس بات کا غالب گمان ہے (اور یہی ۹۹ فیصد صورتوں میں ہوتا ہے) کہ اس شخص کو جس کے جرم کے سبب عاقلہ نے دیت ادا کی ہے، عمر بھر اس مد میں کچھ دینا ہی نہ پڑے۔ اور اگر بالفرض یہ ادا کر چکا ہے یا آئندہ اسے ادا کرنا ہی پڑ جائے تو یہاں نہ معاہدہ ہے، نہ اضافے کی شرط، اور جس طرح اس کی ملکیت میں کچھ نہیں آیا، اسی طرح اس مد میں اس کی دی ہوئی رقم اس شخص کی ملکیت میں بھی نہیں آئی تھی، جس کی خطا کی دیت اس نے ادا کی تھی، لہٰذا یہاں تبادلے کی ظاہری شکل بھی سرے سے پائی ہی نہیں گئی۔ اور اگر بالفرض یہ بھی مان لیا جائے کہ دیت کا وجوب مجرم[5] ہی پر ہوتا ہے اور دیت کی رقم (عاقلہ) اصلاً اسی کو دیتے ہیں تو یہاں معاہدہ بہرحال نہیں ہے بلکہ یہ صورت گویا "اعزہ کے نفقہ کا بار اٹھانے" جیسی ہو گی کہ آج مثلاً بیٹے کو نفقہ کی ضرورت ہے تو باپ اٹھا رہا ہے، کل باپ کو ضرورت ہو گی تو بیٹا یہ بار اٹھائے گا، بھلا کون معاہدہ کہہ سکتا ہے؟ اور اگر کوئی اسے معاہدے کا نام دیتا بھی ہے تو یہاں عرف عام سے بحث نہیں، شریعت کی اصطلاح سے غرض ہے، کیونکہ شرعاً ربا کا وجود اس معاہدہ کی وجہ سے ہوتا ہے جسے "معاملہ" شرعاً بھی کہا جا سکے (واضح رہے کہ ربا ایک خالص شرعی حقیقت ہے اور اس سے بچنا "حق شرع" کی بنا پر ہے۔ اسی لیے باہمی رضامندی سے بھی وہ حلال نہیں ہوتا۔)

اس تفصیل کے بعد "دیت" اور "انشورنس" میں کوئی ایسی مشابہت نہیں رہ جاتی جس کی بنا پر ایک کو دوسرے پر قیاس کیا جا سکے! یہاں ایک اور بات کہہ دینا بھی شاید بے محل نہ ہو، وہ یہ کہ اگر شریعت نے (قاتل پر تاوان ڈالنے کے علاوہ) الگ سے مقتول کے رشتہ داروں پر بھی مقتول کے ورثہ کی مدد کرنا (مثلاً ابعد رشتہ داروں کا اقرب کو خطیر رقم دینا) لازم کیا ہوتا اور اس کا نام "دیت" ہوتا تو "انشورنس" اور "دیت" میں فی الجملہ مشابہت پیدا ہو جاتی، مگر ظاہر ہے کہ شریعت نے یہ صورت تجویز نہیں کی۔

---

۵ جیسا کہ بعض علماء نے اشارہ کیا بھی ہے۔ دیکھیے شامی۔

جس کی ایک مصلحت آئندہ سطروں سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

دیت کے شرعی حکم کی موجودگی میں "انشورنس" کی اسکیم پر غور کیا جائے تو ایک قابلِ توجہ یہ بات نظر آنے لگتی ہے کہ ادھر اس مقتول کے ورثہ کو دیت کی خطیر رقم ملی (یا اس کا استحقاق حاصل ہوا) دوسری طرف اگر مقتول زندگی کا بیمہ کرا چکا تھا، تو ان ہی ورثہ کو وہ رقم بھی ملی، یا ملنی چاہیے جو بیمہ کمپنی معاہدے کی رو سے ادا کرنے پر مجبور ہے، اس طرح ان ورثہ کو دو طرف سے گراں قدر رقم مل جائے گی۔

اس حرص و آز کی دنیا میں جبکہ اخلاقی قدریں دم توڑ رہی ہیں، یہ صورت حال کیا اس نقطۂ نظر سے خطرناک نہیں ہو سکتی کہ یہ ورثہ اپنے اس مورث کی موت کو اس کی زندگی پر ترجیح دینے لگیں اور اس کی زندگی کے بجائے موت کے خواہاں ہو جائیں، سوچنے کا مقام ہے کہ یہ احساس یا خواہش انسان کو کیسی کیسی خرابیوں بلکہ جرائم تک میں مبتلا کر دیتی یا کر سکتی ہے، پھر جو بھیانک حادثہ پیش آجائے مستبعد نہیں ہوگا۔

اس پہلو کے سامنے رکھنے سے "بیمہ" کے اصل محرک "خطر محض" کا مقابلہ کرنے کے علاوہ دوسرے امکانات اور جذباتی محرکات کے احتمال سے بھی انکار مشکل ہوگا، اس طرح اس اسکیم میں "افادی" پہلوؤں کے علاوہ فی الجملہ مضر اثرات کے لیے بھی سوء ظن کی گنجائش نکل آتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ پہلو بھی نظر انداز نہ ہونا چاہیے کہ جس قسم کے خطرات کو "خطر محض" سمجھا جاتا ہے، وہ بھی عموماً یا ان کی معتد بہ صورتیں کسی انسانی غلطی یا کم سے کم حزم و احتیاط میں کسی درجہ کوتاہی سے پیش آتے ہیں۔ اب یعنی انشورنس کرا لینے کے بعد "خطر محض" پیش آجانے سے مالی نقصان کی تلافی کا مکمل یقین حاصل ہو گیا اور خسارہ برداشت کر سکنے کا احتمال بھی ختم ہو گیا تو یہ شخص اور زیادہ بے پروائی اور بے فکری اختیار کرے گا یا کر سکتا ہے (کیونکہ عام انسانی فطرت ہی بے پروا اور سہولت پسند واقع ہوئی ہے) جس کا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے کہ "خطر محض" قسم کے واقعات زیادہ پیش آنے لگیں، اور قومی دولت کی تباہی اور اس کے ضائع ہونے کے امکانات بڑھ جائیں، اس طرح یہ علمی دریافت اور انکشاف "سماج کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچانے کا سبب ہو جائے اور "اللہ کی نعمت" ثابت ہونے کے بجائے، یہ نقمت کا مظہر بن جائے کیونکہ ظاہر ہے کہ انشورنس براہِ راست قومی دولت میں تو کوئی اضافہ کرتا نہیں زیادہ سے زیادہ شخصی نقصان کی تلافی کر دیتا ہے سو وہ اس شخص کی حد تک ہو ہی جائے گی۔ تو اس

خود غرضی اور سہل انگاری کے زمانے میں محض "قوم" کی خاطر کوئی کیوں دل سوزی کرنے لگا۔

اس پر یہ اضافہ اور کر لیجیے کہ اگر یہ "خطر محض" کسی دوسرے کی غلطی سے پیش آیا (مثلاً کپتان کی غفلت سے جہاز ڈوبا) تو اس نقصان رسیدہ شخص کو (مثلاً جہاز کے مالک کو) بعض شکلوں میں قانون شرعی کی رو سے، ضمان بھی مل سکتا ہے (کتب فقہ میں تفصیل دیکھی جا سکتی ہے) اور انشورنس کرا لینے کے بعد اُسے بیمہ کمپنی کی طرف سے تلافی نقصان کا پورا اطمینان ہے ہی، اس طرح یہ شخص نقصان نہیں بلکہ اپنا فائدہ اسی "خطرہ" میں سمجھ سکتا ہے (بلکہ سمجھنا چاہیے) تو سود و زیاں کے اس عالم میں ایسے "نقصان نما" فائدہ کے لیے از خود خفیہ کوشش کر کے "خطر محض" کا وجود میں لے آنا کیا بعید سمجھا جائے گا؟ اور اب تو یہ احتمالات، احتمالات نہیں رہ گئے، بلکہ چشم سر کے سامنے واقعات بن کر آ رہے ہیں۔ اس لیے احتیاط اور دور اندیشی کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ یہاں "خیر" کی توقع کے ساتھ ساتھ اس "شر" کا امکان بھی سامنے رہے۔

گزشتہ صفحات میں "انشورنس" اور "ربو" کا جو موازنہ پیش کیا گیا ہے وہ صرف اس پہلو کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے کہ معہود خطرہ پیش آ جانے پر پالیسی ہولڈر کو کمپنی کی طرف سے بڑی رقم مل گئی حالانکہ اس نے پریمیم کے طور پر بہت تھوڑی رقم دی تھی، رہا انشورنس کا وہ پہلو کہ صرف پریمیم تو ادا ہوا مگر کمپنی سے کچھ وصول نہیں ہوا (خطرہ پیش نہ آنے کی بنا پر) بلکہ وہ رقم گویا سوخت ہو گئی یا اس کا بدل (زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے) وہ ذہنی تحفظ ہے جو اسے پریمیم ادا کرتے ہی وصول ہو گیا؛ اس بارے میں یہ عرض کرنا ہے (قطع نظر اس سے کہ یہ "ذہنی تحفظ" مال کا بدل شرعاً بننے کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں اور اس کی کوئی نظیر ملتی ہے یا نہیں؟ اور قطع نظر اس سے کہ "تعلیق التملیکات بالمخاطرۃ[ع]" والی صورت پائی جا رہی ہے یا نہیں؟) کہ اس رقم کو "ہبہ بالشرط" کی صورت پر محمول کر سکنے کی گنجائش نکل آتی ہے .... بشرطیکہ پریمیم کی رقم کو کمپنی کی ملکیت میں دیا جانا تسلیم کیا جائے اور کمپنی کے پاس اس رقم کے پہونچتے ہی اس کی ملکیت مان لی جائے، حالانکہ یہ بات یہاں نہیں پائی جاتی (تفصیل آگے آ رہی ہے) اور ہبہ چونکہ ان معاملات میں سے ہے جو خاص طرح کی شرطیں لگانے سے بھی غیر معتبر یعنی فاسد نہیں ہوتے[۲۵] اس لیے کہا جا سکتا تھا کہ اگر صرف اتنی ہی بات ہوتی تو کمپنی کے لیے اس رقم کے استعمال کی شرعاً گنجائش نکل سکتی تھی۔

یہاں یہ بیان کر دینا شاید نامناسب نہ ہو کہ بعض فقہاء نے ایسے ہبہ کو نامناسب بتایا ہے جس میں ہبہ کرنے والے نے زیادتی کے ساتھ واپسی کی نیت رکھی ہو اور شرط نہ کی ہو لیکن شرط کرنے کے بعد تو بالاتفاق

ع اس جملہ کی تشریح آگے آ رہی ہے۔

حرام ہے، ان حضرات کا استدلال سورہ روم کی آیت ۳۹ " وما آتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ " سے اور سورہ مدثر کی آیت ۶ " ولا تمنن تستکثر " سے ہے۔"

اگر انشورنس میں صرف یہی دو ایک قابلِ اعتراض باتیں ہوتیں (یعنی اضافے کے ساتھ واپسی کی صرف نیت ہوتی' یا محض ہبہ بالشرط ہوتا) تو اس کی "افادیت" کے پیش نظر جواز کی گنجائش نکل آتی اور کراہت گوارا کر لی جاتی مگر جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، اس میں ربٰو کے احتمال کے ساتھ قمار کا بھی پورا سامان نظر آتا ہے اور میرے خیال میں اس طرح کے فرق سے بھی قمار کے احتمالات کا سدباب نہیں ہو سکتا جس کو صاحب مضمون نے بہت بسط و تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان تفصیلات کی افادیت سے انکار نہیں ــــ مگر ابھی اس راہ کے بہت سے کانٹے باقی رہ گئے ہیں۔

فاضل مقالہ نگار نے دونوں (قمار اور انشورنس) کے درمیان ایک اہم فرق یہ دکھایا ہے جسے خود موصوف نے "بنیادی" قرار دیا ہے کہ جس خطرے کے پیش نظر انشورنس کرانے والا انشورنس کراتا ہے اس کا وجود اور اس خطرے اس کا تعلق' اس کے انشورنس کرانے یا نہ کرانے پر منحصر نہیں ہے بلکہ ہر حال میں پایا جاتا ہے (د، ج ۱، ص ۱۷، ش جولائی ۷۲ء) ..... "برخلاف قمار بازی کے" (ص ۵۷)۔

یہاں پہلی بات یہ عرض کرنی ہے کہ اس عبارت سے گمان ہوتا ہے کہ مقالہ نگار کی نظر میں قمار اور انشورنس کے درمیان ایک لازمی اور اہم فرق یہ ہے کہ قمار کا خطرہ ہمیشہ اختیاری ہوتا ہے اور انشورنس کا خطرہ غیر اختیاری حالانکہ قمار میں بھی جس چیز پر ہار جیت کو معلق کیا جائے وہ غیر اختیاری اور (مقالہ نگار کے الفاظ میں) "خطر محض" قسم کی ہو سکتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قمار سے انشورنس کی مشابہت یا مماثلت کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ ایک کی طرح "موقوف علیہ" دوسرے میں بھی غیر اختیاری ہے یا اختیاری' بلکہ اصل مشابہت کی وجہ یہ ہے کہ ایک کی طرح دوسرے میں بھی رقم کا ملنا ایسی چیز پر موقوف کیا گیا ہے جس کا وجود میں آنا نہ آنا کوئی بھی شق یقینی نہیں' بلکہ دونوں ہی محتمل ہیں اور فریقین میں سے کسی کے بھی ارادہ و اختیار سے وجود میں آنے والی وہ چیز نہیں ہے اور اس کا وجود بھی غیر یقینی ہے اب وہ خواہ حادثہ ہو یا کوئی اور چیز۔

فقہاء قمار اور ایسے معاملات جن میں قمار پایا جاتا ہے' جس کی وجہ سے وہ ممنوع ہوتے ہیں' کی تعریف عموماً اس طرح کرتے ہیں: تعلیق التملیک بالخطر " (ہدایہ ج ۳ ص ۲۷۰' ج ۳ ص ۲۸' المبسوط

تفسیر قرطبی ج ۱۲ ص ۶۰، وغیرہ کتب فقہ) اس تعبیر کا پورا مفہوم یہ ہے کہ کسی معقد کی تکمیل یا (اس کے نتیجے میں)
کسی شے کی ملکیت کا انتقال کسی ایسی چیز پر معلق کر دیا جائے جس کے واقع ہونے یا نہ ہونے (دونوں ہی)
کا امکان ہو اور دونوں میں سے کوئی ایک شق بھی یقینی طور پر وقوع میں آنے والی اور اختیاری نہ ہو۔
چنانچہ حدیث میں رقبیٰ کو مردود و باطل قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس میں مکان وغیرہ ملکیت کے انتقال کو
موت پر موقوف کہا جاتا تھا (زمانہ جاہلیت میں یہ طریقہ رائج تھا) ہدایہ کے شارح فقیہ شمس الدین قاضی
زادہ کے نقل کردہ الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوتا تھا۔ معنی الرقبیٰ هذه الدار لآخرنا موتا كانه
يقول اراقب موتك وتراقب موتي فان مت قبلك فهي لك وان مت قبلي فهي لي فكان هذا
تعليق التمليك ابتداء بالخطر وهو موت المالك قبله وذا باطل۔
(یعنی مکان کا مالک اپنے مکان کی ملکیت دوسرے کی طرف یہ کہہ کر منتقل کرتا تھا کہ اگر میں پہلے مر گیا تو یہ مکان
تیرا ہو جائے گا ورنہ میرا رہے گا تو گویا ہر ایک دوسرے کی موت کا منتظر رہتا تھا۔ ایسی شکل کو تعلیق التملیک
بالخطر کہا جاتا ہے اور وہ باطل اور غیر معتبر ہوتی ہے) اور یہی بات قمار میں پائی جاتی ہے بلکہ قمار کی حقیقت
اصلاً یہی ہے جیسا کہ علامہ احمد ابن محمد دیار بکری اسی اصول (تعلیق التملیک بالخطر) کے ذیل میں تحریر کرتے
ہیں ہذہ التعلیقات لا تحتمل لاداءته الى معنى القمار (یعنی ملکیت منتقل کرنے کے لیے ایسی کسی غیر
یقینی چیز کے ساتھ وابستہ کرنا شرعاً جائز نہیں جس کا عدم اور وجود دونوں محتمل ہوں کیونکہ اس سے قمار کی
شان پیدا ہو جاتی ہے)

اس تفصیل کے بعد یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قمار نام ہے ایسے معاملے کا جس میں کسی چیز کی ملکیت
یا (بالفاظ دیگر) ملکیت کا انتقال کسی ایسی بات پر باختیار خود معلق کر دیا جائے کہ جس کا وجود میں آنا یا نہ
آنا غیر یقینی ہو (آئندہ اختصار کے خیال سے ایسی بات کو "موقوف علیہ" سے تعبیر کیا جائے گا) اس تفصیل
سے یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ "موقوف علیہ" کا فریقین میں سے کسی کی ذات سے تعلق تھا یا نہیں
تھا اور اس کا وجود پہلے سے ممکن ہوتا یا نہیں تھا قمار کی صورت پیدا ہونے یا نہ ہونے پر اس کا کوئی اثر
نہیں پڑتا" اس لیے یہاں یہ بحث ہی سرے سے غیر متعلق ہے کہ وہ واقعہ جس پر ملکیت کا انتقال (مثلاً
بیمہ کمپنی کی طرف سے بڑی رقم کا پالیسی ہولڈر کی طرف انتقال) موقوف رکھا گیا ہے وہ اس شخص کا ارادی
فعل ہے یا نہیں؟ اور اس واقعہ کا (یعنی ہم نے جس کے لیے "موقوف علیہ" کی تعبیر اختیار کی ہے)

ان کی ذات سے تعلق ہے یا نہیں؟ یہ بحث سرے سے غیر ضروری اور زائد ہے کیونکہ یہاں صرف اس کی ضرورت ہے کہ موقوف علیہ غیر یقینی ہو، اور اس کی کہ یہ معاہدہ (جس کے نتیجے میں یا تو بہت بڑی رقم ملے گی یا صرف "خیالی اطمینان" اور ذہنی تحفظ حاصل ہوگا) اس کا اختیاری فعل ہو، اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ آئندہ جن فوائد کی توقع ہے ان کا حاصل ہونا نہ ہونا (یعنی اس بڑی رقم کا ملنا یا نہ ملنا) اس کے اس فعل (معاہدہ) کا نتیجہ ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ معاہدہ انشورنس ہی کا نتیجہ ہے (اگر اس کا نتیجہ نہ ہوتا تو بغیر اس معاہدہ کے بھی خطرہ پیش آنے کی صورت میں اسے یہ رقم ملنی چاہیے تھی، حالانکہ ایسا نہیں ہوتا جیسے سب جانتے ہیں) بالکل یہی صورت قمار میں بھی ہوتی ہے کہ شرط بدکر یا بازی لگا کر وہ ایک مقدار مال کی دیتا ہے اور اس مال پر غیر معمولی رقم (فائدہ) کا ملنا نہ ملنا ایک اور چیز پر موقوف رکھتا ہے جس کا وجود اور عدم وجود دونوں غیر یقینی ہیں، ہاں شرط بدنا یا بازی لگانا اس کا اپنا ارادی اور اختیاری فعل ہے جس طرح انشورنس کا معاہدہ کرنا ارادی فعل ہے۔

یہاں ایک دوسرے انداز میں تجزیہ کر کے وضاحت کی جاتی ہے۔

قمار پائے جانے کے لیے (فریقین اور معاہدہ کے علاوہ) عموماً تین چیزیں ہوتی ہیں۔

۱۔ کسی ایک فریق کی جانب سے مثلاً معمولی نقد رقم کی ادائیگی۔

۲۔ دوسرے فریق کی طرف سے بڑی رقم دینے کا پختہ وعدہ۔

۳۔ "موقوف علیہ" یعنی وہ بات جس کے وجود میں آنے یا نہ آنے پر ایک فریق دوسرے کو بڑی رقم دے گا۔ (اور اگر وہ شرط نہیں پائی گئی تو نہیں دے گا بلکہ پہلے شخص کی دی ہوئی رقم سوخت ہو جائے گی۔ یا اُلٹا اسے ہی بڑی رقم دینا پڑے گی)

ان اجزاء کی ایک مثال سے وضاحت کی جاتی ہے:

فرض کیجیے، خسرو اور پرویز دو دوست ہیں، خسرو نے پرویز سے کہا "ہمارا مکان بہت بوسیدہ ہو گیا ہے اب کی برسات میں گر جائے گا" پرویز (جو کہ انجینیر بھی ہے) نے کہا نہیں گر سکتا، بس اسی بات پر بحث چلی اور یہاں تک پہنچی کہ دونوں میں یہ طے ہو گیا کہ اگر یہ مکان گر گیا تو پرویز خسرو کو دو ہزار روپے دیگا، بشرطیکہ خسرو، پرویز کو ابھی دو سو روپے دیدے۔ اب اگر مکان گر جاتا ہے تو (از روئے معاہدہ) پرویز مجبور ہے کہ وہ خسرو کو دو ہزار روپے دے اور اگر نہیں گرا تو خسرو کی دی ہوئی رقم (دو سو روپیہ) سوخت ہو گئی۔

یہاں مکان کا گرنا غیر اختیاری بھی ہے اور اس شرط لگانے پر اس کا گرنا موقوف نہیں ہے اس کے بغیر بھی اس کے گرنے کا خطرہ موجود تھا، تو کیا یہ شکل قمار نہیں کہلائے گی؟ اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ "موقوف علیہ" کا موجود ہونا یا نہ ہونا قمار کا سبب اس معاہدے کے بعد ہوتا۔ اس سے پہلے نہیں سمجھے؟ اب انشورنس کے معاہدے کو اس پر منطبق کر کے دیکھتے ہیں تو یہ صورت سامنے آتی ہے۔

عـ۱ انشورنس کرنے والا خسرو کی جگہ۔

عـ۲ کمپنی پرویز کی جگہ (انشورنس کا معاہدہ کرنا بازی لگانے یا شرط بدنے کی جگہ چونکہ یہ بھی ایک معاہدہ ہوتا ہے)

عـ۳ موت یا وہ حادثہ جس کے نقصان کی تلافی کی غرض سے انشورنس کرایا مکان گرنے کی جگہ رکھ کر دیکھا جاتا ہے تو قمار کی تعریف صادق آتی ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ قمار کی جو تصویر کشی "مضمون" میں کی گئی ہے وہ ان دونوں پر یکساں صادق آتی ہے چنانچہ یہاں ہم وہی الفاظ بس نام کا اضافہ کر کے پیش کیے دیتے ہیں:

"پرویز نے بازی لگا کر یا شرط بد کر اپنے لیے ایسا خطرہ مول لیا جو پہلے سے موجود نہ تھا، یا اگر موجود تھا تو خود اس کی ذات سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا" (اس جگہ پرویز کے بجائے خسرو رکھ دیا جائے تو بھی ٹھیک بات یہی ہوگی۔ فرق یہ ہوگا کہ یہاں دو ہزار کی جگہ دو سو کا خطرہ ہے۔)

اب اس عبارت کو انشورنس کی شکل پر منطبق کر کے دیکھتے ہیں تو بھی ٹھیک یہی بات صادق آتی ہے۔ دیکھیے! "انشورنس کرانے والا" انشورنس کرا کر ایسا خطرہ (پریمیم کے ضائع ہو جانے کا خطرہ) مول لیتا ہے جو پہلے سے موجود نہ تھا، یا اگر تھا تو خود اس کی ذات سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔" وہ اگر چاہتا تو انشورنس نہ کراتا، اگر وہ انشورنس نہ کراتا تو اس رقم کے نقصان (پریمیم کی رقم کے نقصان) کا خطرہ پیش نہ آتا۔ اس مثال کو الٹ کر انشورنس کرانے والے کی جگہ "کمپنی" کو رکھ کر بھی منطبق کر کے دیکھتے ہیں تو ٹھیک یہی بات رہتی ہے (اس فرق کے ساتھ کہ یہاں خطیر رقم کے دیے جانے کا خطرہ ہے جبکہ پہلی صورت میں معمولی رقم یعنی پریمیم کی رقم کا خطرہ تھا جو تھوڑی بھی ہو سکتی ہے اور بہت بھی)

بہرصورت قمار کی تصویر اس میں بھی نظر آتی ہے۔ ان مثالوں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ کسی واقعہ کا فی نفسہ لازمی یا اختیاری ہونا اسی طرح فی نفسہ اس کا نفع بخش یا نقصان دہ ہونا علیحدہ بات ہے۔

اور اس پر کسی معاملے کو معلق کر دیا جانے کے بعد اس نفع یا نقصان کا سبب بن جانا دوسری بات۔ پہلی حیثیت میں وہ ارادی یا غیر ارادی، اختیاری ہو یا غیر اختیاری نافع ہو یا ضرر رساں، اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں اور نہ اس سے مسئلہ میں فرق پڑتا ہے۔ البتہ دوسری حیثیت (موقوف علیہ ہونے کی حیثیت) یہاں موثر ہوتی ہے جو بہرحال فریقین کے ارادہ و اختیار سے قائم ہوئی ہے اب جب اس کی حیثیت "موقوف علیہ" کی بن گئی اور اس میں یہ شان بھی پائی جا رہی ہے کہ اس کا وجود غیر یقینی ہے تو اب جس عقد کو اس پر موقوف رکھا جائے گا اس میں قمار کی شان پیدا ہو جائے گی۔ غور سے دیکھا جائے تو انشورنس میں یہی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ اس لیے انشورنس اور قمار میں کوئی حقیقی فرق نہیں رہ جاتا۔ اس کے علاوہ اور جو فرق بیان کیے گئے ہیں وہ سب یا مصلحت و حکمت کے زمرے میں شامل کیے جانے کے لائق ہیں یا مصرف والے پہلو سے متعلق ہیں۔ (حالانکہ قمار کا تعلق آمد والے پہلو سے ہے) لہذا ان فروق سے مسئلے کی نوعیت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور یہاں بھی وہی کہہ دینا کافی ہوگا جو "ربو کی تفصیل" کے تحت بیان ہو چکا ہے اور اس کے علاوہ مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

یہاں ایک بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ "کمپنی" اپنا کوئی الگ وجود نہیں رکھتی بلکہ وہ ان ہی سب سے عبارت ہے جو انشورنس کرانے والے ہیں، لہذا کمپنی کا "معاوضہ" پیش کر دینا خود ان کا نقصان کی تلافی کر لینا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنا ذخیرہ فنڈ قائم کر کے اس سے تلافی کرے اور یہ بھی کہ کمپنی کے ممبروں میں سے کسی ایک کا نقصان گویا کمپنی ہی کا نقصان ہے (اس لیے اس کا لینا دینا ظاہری ہے حقیقی نہیں) اس پر یہ عرض کرنا ہے کہ یہ بات اس وقت صادق آ سکتی ہے جبکہ کمپنی کا کاروبار محض "انشورنس" کے ساتھ مخصوص نہ ہو بلکہ اس میں شریک ان تمام افراد کی پونجی کا ریزرو ہی اصل ہو تب کم سے کم اس چیز پر ملکیت کمپنی کی تسلیم کی جائے جس کو انشورنس کرایا گیا ہے۔ جیسا کہ سود کی بحث میں عرض کیا جا چکا ہے ان میں سے ہر شخص اسلامی نقطہ نظر کے مطابق مستقل ایک اکائی ہے۔ محض انشورنس کرانے سے ان کی انفرادی حیثیت ختم نہیں ہو جاتی۔ چنانچہ نقصان ہو جانے کے بعد رقم کا مطالبہ کرتے وقت ان کی یہ حیثیت بہت نمایاں ہو جاتی ہے۔

یہاں ایک بات اور بھی صاف کر دینے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ آیا پریمیم کی رقم کا کمپنی کو مالک تسلیم کیا جائے یا وکیل۔ اگر مالک تسلیم کیا جاتا ہے تو پھر کمپنی از روئے شرع اس پر مجبور نہیں کی جا سکتی کہ وہ رقم

بیمہ کرانے والوں ہی کو واپس کرے اور اسے کسی دوسرے کو دینے سے بھی نہیں روکا جا سکتا کیونکہ کمپنی کے مالک بن
جانے کے بعد کسی کا کوئی حق اس جمع شدہ رقم پر رہتا ہی نہیں۔ اس طرح انشورنس کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے اس
کے علاوہ کمپنی کو مالک مان لینے کی شکل میں ایک یہ بھی عجیب و غریب صورت مان لینی پڑ جائے گی کہ سب
مالک بنانے والے ہی ہیں، حقیقی طور پر مالک بننے والا کوئی نہیں، کیونکہ کمپنی تو ان ہی سب پریمیم ادا کرنے
والوں سے عبارت ہے، یہ کہ ہر ایک شریک دوسرے شریک کو مالک بنا رہا ہے۔ اتنی ہی رقم کا (کیونکہ
پریمیم کی مقدار یکساں ہوتی ہے) جتنی کہ وہ دوسرے سے لے رہا ہے۔ اس طرح یہ سب لغو اور ایک لایعنی فعل کے
مرتکب قرار پاتے ہیں۔ ان خلاف عقل و شرع باتوں کے لازم آنے کی وجہ یہی ہوئی کہ پریمیم ادا کرنے والے
کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ وہ (کمپنی) اس رقم کا مالک بنا رہا ہے لہٰذا یہ درست نہیں ہو سکتا تو اب
یہ بات مانے بغیر چارہ نہیں کہ پریمیم ادا کرنے والے کمپنی کے کارکنوں کو مالک نہیں بلکہ اپنا وکیل اور
نمائندہ بناتے ہیں اور ہر شخص ان نمائندوں کو اپنے مال میں مشروط طور پر تصرف کا اختیار دیتا ہے (کمپنی
کی شرائط تسلیم کر لینے کا یہی مطلب ہے) اور اپنے مال میں کسی دوسرے کو بلا عوض استعمال اور تصرف کا حق
دیدینا "عاریت" کہلاتا ہے (یعنی فقہی اصطلاح میں) اور روپیہ یا غلہ وغیرہ میں تصرف یعنی استعمال کا حق
دینے (یعنی عاریت دینے) کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اصل چیز باقی نہ رہے کیونکہ اسے باقی رکھتے ہوئے اصل
فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اس لئے کہ اس کا استعمال حقیقی یہی ہے کہ اسے خرچ کیا جائے۔ اور اصل مالک کو
اس کا بدل واپس کیا جائے۔ قرض کی حقیقت در اصل یہی ہے۔ یعنی روپیہ یا غلہ وغیرہ کی عاریت کا نام اصطلاح
میں قرض ہو گیا ہے۔ اور دوسری ایسی چیزوں میں کہ جن کی ذات کو باقی رکھتے ہوئے فائدہ اٹھایا جا سکتا
ہے اس کا نام عاریت ہی رہا۔

چنانچہ فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے کہ قرض درحقیقت عاریت ہے مثلاً ملک العلماء علامہ کاشانی
فرماتے ہیں:۔ ان الاقراض اعارۃ لامبادلۃ الا تری انہ لایلزم الاجل فیہ کما فی العاریۃ
ولو کان مبادلۃ للزم فیہ الاجل[۲۰] یعنی قرض دینا عاریت کے طور پر دینا ہے بیع نہیں ہے (کیونکہ اسمیں عاریت
کے اثرات ہیں بیع کے نہیں مثلاً یہ کہ اس میں اگر مدت کی تعیین کر دی جائے تو بھی وہ لازم نہیں ہوتی
حالانکہ اگر یہ بیع ہوتی تو ضرور لازم ہو جاتی۔ ہدایہ میں تو یہ بات بہت واضح طور پر لکھی ہے۔ دیکھیے:۔
عاریۃ الدراہم والدنانیر والمکیل والموزون والمعدود قرض لان الاعارۃ تملیک المنافع ولا یمکن

الانتفاع بہا الا باستہلاک عینہا... لان من قضیۃ الاعارۃ رد العین فاقیم رد المثل مقامہ ۳۲

یعنی درہم دینار اور اس کے علاوہ تمام ایسی چیزیں جو وزن یا ناپ اور گنتی سے بیچی جاتی ہیں (غلہ جات وغیرہ) ان کی عاریت کا نام قرض ہے کیونکہ عاریت نام ہے اپنی چیز سے کسی دوسرے کو فائدہ اٹھانے اور استعمال کا حق دینے کا، لیکن غلہ اور دوسری دکھانے پینے کی چیزوں نیز درہم و دینار کا استعمال اور ان سے اصلی فائدہ اٹھانا انھیں خرچ کیے بغیر ممکن نہیں، اس لیے واپسی کے وقت بجائے اصل چیز کی واپسی کے اس کا بدل واپس کر دینا کافی سمجھا گیا۔

حاصل کلام یہ کہ کمپنی کے پاس تمام ممبران کا روپیہ قرض کے طور پر جمع ہے، اب اگر وہ کسی ممبر کو (انشورنس کرانے والے کو) کچھ دیتی ہے تو گویا اس کا قرض واپس دیتی ہے، اگر اس مقدار سے زیادہ دیتی ہے جو وہ ممبر ادا کر چکا ہے تو وہ قرض اضافہ کے ساتھ واپس کرتی ہے (جس کی تفصیل گزر چکی ہے) اور مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات صاف ہو ہی گئی ہے کہ اس کی حیثیت ہر شریک کی طرف سے اس کے حصہ کے بقدر وکیل کی ہے لہٰذا اب اگر وہ کسی کو اس کے اصل حصے سے کچھ زیادہ دیتی ہے تو اس زیادتی میں وہ نیابت کرتی ہے ان تمام شرکاء کی (بجز اس لینے والے کے) لیکن چونکہ جیسا اصل مالکوں کے لیے بھی یہ جائز نہیں تھا کہ اس طرح کی زیادتی کے ساتھ قرض کی رقم واپس کریں تو ان کے نائبین (کمپنی کے کارکنان) کے لیے بھی یہ جائز نہ ہوگا، کیونکہ اس طرح کے معاملے کرنے کا شرعاً انھیں اختیار ہے اور نہ انھیں۔ (دیکھیے اصول ۴ ش)

یہاں ضمناً یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ کم سے کم اس وقت (یعنی رقم واپس لیتے وقت) اس شخص کی حیثیت منفرد ہو گئی اور کمپنی اس کی اب نمائندہ نہیں ہے ورنہ دائنی اور مدعی علیہ دونوں کا ایک ہی شخص میں جمع ہونا لازم آئے گا، جو عقل عام کے بھی خلاف ہے اور شریعت کے بھی)۔

ان تفصیلات کے بعد اس بحث کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ پریمیم تحفظ کی لاگت ہے یا نہیں؟ اور محض ذہنی تحفظ کے مقابل مال رکھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ لیکن اتنا کہہ دینا شاید بیجا نہ ہو کہ یہ "تحفظ" اور "اطمینان" کو بدل مال قرار دینے کی کہیں شریعت میں نظیر نہیں ملتی۔ اس کے لیے چوکیداری کی اجرت سے نظیر لانا مضحکہ خیز ہوگا، کیونکہ وہاں محض ذہنی تحفظ نہیں ہے بلکہ چوکیدار کا عمل ہے، وقت ہے اور محنت ہے اور ان میں سے ہر بات اجرت کا استحقاق اور مال کا بدل بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ برخلاف یہاں کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں پائی جا رہی بلکہ غور کیا جائے تو اس تحفظ کا سرا مال سے جڑا نظر آئے گا۔

تو گویا یہ اس تحفظ کی اُجرت نہیں بلکہ اس "مال" کی پیشگی فیس ہے جس کا حاصل ہونا متوقع ہے۔ اس تجزیے کے بعد تو اس کے ربوٰ ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا! (کیونکہ عموماً "انٹرسٹ" کو مال کا کرایہ کہا جاتا ہے)

بعض لوگ اسے کفالت سے تشبیہ دیتے ہیں مگر وہ بھی صحیح نہیں، لیکن اگر بالفرض اسمیں اور کفالت میں کوئی مناسبت ہو بھی تو محض کفالت کرنے پر اُجرت دینا کیا مشروع ہے؟ اور اگر بالفرض کسی قسم کی کفالت میں اُجرت کی گنجائش نکل بھی آتی ہو تو بھی ایسی صورت میں جبکہ "شئ مکفول" اجرت کے ہم جنس ہو (اور اموالِ ربوٰ میں سے بھی ہو) کسی طرح یہ اُجرت جائز نہیں ہو سکتی۔

اب صرف ایک بات یہ قابلِ ذکر رہ جاتی ہے کہ کہا جاتا ہے انشورنس کے بہت سے منافع ہیں۔ سماجی، اقتصادی، تجارتی وغیرہ۔ سو اس کا جواب اوپر کہیں گزر چکا ہے کہ بعض دنیاوی منافع کا ہونا حلال ہو جانے کا لازمی سبب نہیں ہوتا۔ قرآن وحدیث سے صریح طور پر جن چیزوں کا حرام ہونا معلوم ہے اُن میں بھی کیا بعض منافع نہیں ہیں؟ ام الخبائث "شراب" اور فساد کی جڑ "جوئے" تک میں بعض منافع دنیویہ موجود ہونے کا ثبوت قرآن مجید سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آخرت کی مضرۃ (اثم)ؔ کی وجہ سے انھیں حرام قرار دیا گیا۔

اس سلسلے میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ جس "میسر" (جوئے) کی حرمت کا قرآن مجید میں صاف اعلان کیا گیا ہے، اس کے بارے میں بعض قابلِ اعتماد مفسرین نے نقل کیا ہو کہ نزول قرآن کے زمانے میں عرب کے اندر یہ رواج تھا کہ اس کے ذریعے جیتی جانے والی رقم جیتنے والا اپنے اوپر خرچ نہیں کرتا تھا، بلکہ فقراء پر اس رقم کو تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اب غور کیجیے کہ جوئے کے ذریعے بظاہر کتنا اچھا، اور نفع رساں کام ہوتا تھا، مگر اس کے باوجود وہ حرام کیا گیا۔ اس مثال سے یہ اصول بھی ثابت ہوتا ہے کہ محض مقصد کا اچھا ہونا، حلال ہونے اور مشروع کیے جانے کے لیے کافی نہیں، بلکہ ذریعے کا بھی اچھا ہونا ضروری ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مقالۂ زیر بحث میں پیش کردہ انشورنس کے تجزیے سے اس کے اندر ربوٰ یا قمار کے احتمال کی نفی نہیں ہوتی ——— اور جتنے فرق بیان کیے گئے ہیں وہ حکم میں فرق کرنے کے لیے کافی نہیں معلوم ہوتے ——— اس کے علاوہ بھی بعض اور باتیں ایسی ہیں جنھیں یہاں ذکر کیا جاتا تو شاید مناسب نہ ہوتا مگر چونکہ یہ معروضات ویسے بھی اندازے سے زیادہ طویل ہو گئیں اس لیے اتنے

ؔ بعض مفسرین نے "اثم" کے عام معنی لیے ہیں جس میں دنیا و آخرت دونوں کی مضرتیں شامل ہیں۔

پر نفس کیا جاتا ہے۔

آخر میں ایک بات یہ کہہ دینا بھی مناسب معلوم ہو رہا ہے کہ انشورنس کی اسکیم کی ایسی عملی شکل بھی ممکن ہے جس میں یہ شرعی قباحتیں نہ ہوں، مگر اس کا پیش کرنا تفصیل کا تقاضا رکھتا ہے اور فرصت کا بھی۔

:حوالہ جات:

۱. اسلام اور عصر جدید ص ۵۲ شمارہ اپریل ۱۹۷۲ء

۲. بخاری ج ۱ ص ۲۹۲ و مسلم ج ۲ ص ۲۶ (الفاظ حدیث مسلم شریف سے لیے گئے ہیں۔)

۳. تقریباً تمام حدیث کی کتابوں میں یہ حدیث موجود ہے۔ مثلاً ترمذی ص ۱۶۹ ج ۱، مسلم ص ۲۴، ۲۵ ج ۲۔ (مطبوعہ اصح المطابع دہلی) المبسوط ج ۱۲ ص ۱۱۰۔

۴. نمک کا حکم حدیث میں موجود ہے۔

۵. "ربٰو" کی علت کے بارے میں فقہاء کے اختلاف، اور کون سا وصف کس کے نزدیک علت ہے؟ اس سب کی کی تفصیل کے لیے دیکھئے عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ج ۵ ص ۴۹۰۔ ۴۹۱ (مطبوعہ دار الطباعۃ العامرہ) فتح القدیر ج ۵ ص ۲۷۶ (مطبع الکبری الامیریہ مصر) شرح مسلم للنووی ج ۲ ص ۲۵، ہدایہ ثالث ص ۶۱۔ ۶۲....

(امین کمپنی دہلی)

۶. حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱ ص ۴۷، (مطبع خیریہ مصر)

۷. ترمذی و ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۵۲۔

۸. بخاری ج ۱ ص ۲۹۰۔

۹. قرآن مجید سورۂ بقرہ آیت ۲۷۹

۱۰. ابن ماجہ بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۴۶۔

۱۱. ابن ماجہ، دارمی بحوالہ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۴۶۔

۱۲. ہمارے موضوع سے متعلق ربا کی دو مشہور قسموں میں سے صرف ایک قسم یعنی "ربا الفضل" ہے، لہٰذا یہاں اسی کی تعریف اور تنقیح پیش کی جا رہی ہے، دوسری قسم "ربا النسیئۃ" سے اس وقت ہمیں سروکار نہیں اس لیے یہاں اس سے تعرض نہیں کیا گیا ہے۔ (واضح رہے کہ لفظ ربا کا املا تین طرح صحیح ہے، ربا۔ ربٰو۔ ربیٰ)

۱۳۔ اس بحث کی تفصیل کے لیے دیکھئے عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری جلد پنجم از ص ۴۹۰ تا ۵۰۳ ۔ شرح مسلم للنووی جلد ثانی از ص ۲۵ تا ۲۷ ۔ اور دیگر شروح حدیث و کتب فقہ ۔ اصطلاحی تعریف فقہ کی مشہور کتاب تنویر الابصار ۔۔ (متن در مختار) سے ماخوذ ہے۔ ساتھ ہی بعض دوسری معتبر کتابیں بھی پیش نظر ہیں جن کے مشتملات کی امکانی رعایت کرنے کی بھی مذکورہ تعریف میں کوشش کی گئی ہے مثلاً بدائع الصنائع ج ۵ ۔ ص ۱۸۳ ، رد المحتار ج ۴ ۔ ص ۱۷۸ ۔ ۱۷۶ ۔

۱۳۔ حضرت عبد اللہؓ ابن عباس کے مرجوع عنہ قول کے لیے دیکھیے بخاری ج ۱ ص ۲۹۱ ۔

۱۴۔ "ربوٰ" کی تفصیلات کے لیے جن حوالوں کی نشان دہی کی گئی ہے ۔ تقریباً ان سب میں یہ حکم بھی مذکور ہے۔

۱۵۔ صحیح مسلم ج ۲ ۔ ص ۳۰ ۔

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ رد المحتار ۔ ج ۵ ۔ ص ۲۳۴ و ۲۹ ۔ کتاب المبسوط للسرخسی ج ۱۲ ۔ ص ۵۴ ۔

۱۸۔ اتحاف الابصار والبصائر بترتیب الاشباہ والنظائر ۔ ص ۲۰۷ مطبوعہ مصر ۔

۱۹۔ شرح مسلم للنووی ج ۲ ص ۳۰ مطبوعہ اصح المطابع دہلی ۔

۲۰۔ اسلام اور عصر جدید ص ۵۰ شمارہ جولائی ۱۹۷۲ء

۲۱۔ خلاصہ یہ کہ عوض کا مشروط ہونا الگ چیز ہے اور اس کا محض مقصود ہونا دوسری چیز ۔ مقصد محض ایک طرح سے نیت وارادہ کا نام ہے ، اس پر کسی دوسرے کا مطلع ہونا بھی بالکل ضروری نہیں ، اس کے برخلاف شرط کے کردہ ایک معاہدہ ہے جو دو فریق کے مابین ہوتا ہے ، لہٰذا اس پر دوسرے کا مطلع ہو کر راضی ہونا ضروری ہے یہی فرق ہے تجارت اور ہبہ میں کہ پہلی چیز میں عوض مشروط ہوتا ہے دوسری میں مشروط قطعاً نہیں ہوتا زیادہ سے زیادہ ارادہ و نیت میں ہوتا ہے ۔ جیسا کہ شمس الائمہ سرخسی فرماتے ہیں ۔ " لان العوض فی التجارات مشروط وفی التبرعات مقصود و معنی اظہار الجود ایضاً مقصود " المبسوط ج ۱۲ ص ۵۴ ۔

۲۲۔ ہدایہ جلد رابع ص ۴۵۸ (کتب خانہ رحیمیہ دیوبند)

۲۳۔ مقالہ نگار نے اپنے مقالے کے شروع میں خطرات کی دو قسمیں بیان کی ہیں (۱) کاروباری خطر (۲) خطر محض ۔ اس دوسری قسم کے خطرات سے بچنے یا اس کے ذریعے ہو پہنچنے والے نقصان کی تلافی کی غرض سے ہی انشورنس کرایا جاتا ہے ۔ خطر محض کی تعریف موصوف نے یہ کی ہے " جن کے پیش آجانے سے صرف نقصان کا اندیشہ وابستہ ہے ۔ نفع کی امید کا ان سے کوئی تعلق نہیں " (اسلام اور عصر جدید ص ۵۴ ۔ ۵۵ ۔

شمارہ اپریل ۱۹۷۰ء)

۲۴. یہ ایک خالص فقہی تعبیر ہے جو قمار اس جیسے معاملات کے لیے بولی جاتی ہے، مزید تشریح آگے آتی ہے۔

۲۵. فتاویٰ عالمگیری ج ۴. ص ۲۹۶، ہدایہ ج ۳. ص ۲۶۵، اس قاعدہ کی اصل حدیث عمریٰ ہے کی گئی ہو جیسا کہ ہدایہ اور اس کے مشہور شارح اکمل الدین محمد البابرتی (م ۷۸۶ھ) وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ واصل ذلک ما روی ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اجاز العمریٰ وابطل شرط المعمر فی رجوعھا الیہ بعد الموت المعمر لہ وجعلھا میراثا لورثۃ المعمر لہ، (عنایہ ج ۷، ص ۱۳۱ (مطبوعہ مطبع امیریہ مصر) حدیث مذکور حدیث کی تقریباً تمام معتبر کتابوں میں مختلف الفاظ اور اجمال و تفصیل کے فرق کے ساتھ ملتی ہے. مثلاً مسلم ص ۳۷. ۳۸، ج ۲، ابو داؤد ص ۱۴۴. ۱۴۵، ج ۲.

۲۶. تفصیلات کے لیے دیکھیے تفسیرات احمدیہ ص ۱۹۰.

۲۷. نتائج الافکار ج ۷، ص ۱۴۴ (تکملہ فتح القدیر)

۲۸. عنایہ بر فتح ج ۱ ص ۱۹۷ (مطبع الامیریہ مصر)

۲۹. مقالے میں قمار کی تشریح اس طرح کی گئی ہے.

"جو کھیلنے والا بازی لگا کر یا شرط بد کر اپنے لیے ایسا خطرہ مول لیتا ہے جو پہلے سے موجود نہ تھا، یا اگر موجود تھا تو خود اس کی ذات سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا"...."قمار کی تمام ممکن شکلوں اور اس کی مروجہ قسموں میں یہ بات مشترک ہے کہ وہ شخص جو بازی لگا کر ہار جانے کا خطرہ مول لیتا ہے اگر چاہتا تو بازی نہ لگاتا اور اگر وہ بازی نہ لگاتا یا شرط نہ بدتا تو اس کو رقم کے نقصان کا خطرہ نہ پیش آتا." (اسلام اور عصر جدید ص ۵۶ شمارہ جولائی ۱۹۷۲ء)

۳۰. یہاں زیادہ سے زیادہ کہا جا سکتا ہے کہ کمپنی کی حیثیت مالک ہی کی ہے مگر اس کی ملکیت ایک غیر یقینی چیز کے وجود میں نہ آنے پر موقوف ہے. یعنی اس پر کہ وہ حادثہ پیش نہ آئے جس کے نقصان کی تلافی کے لیے یہ انشورنس کرایا گیا ہے، تو اس طرح "تعلیق التملیک بالخطر" والی صورت پیدا ہو جائے گی جو قمار ہے اور جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے. خلاصہ یہ کہ انشورنس کا معاملہ، قمار اور سود دونوں سے یا دونوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں نظر آتا. ۳۱. بدائع الصنائع، ج ۵، ص [illegible] ۳۲. ہدایہ ثالث ص ۲۶۵.

۳۳. روح المعانی ج ۲، ص ۱۱۴، تفسیر آیت یسئلونک عن الخمر والمیسر الخ

۳۴. شروع میں یہ اصول تفصیل سے بیان ہو چکا ہے، دیکھیے اصول ۱!

محمد منظور نعمانی

تحدیثِ نعمت

کیا دیکھا — کن کو پایا

(۷)

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ (۴)

حضرت حکیم الامتؒ کی وفات سے قریباً دو سال پہلے کی بات ہے، کافی عرصے سے حضرتؒ کی علالت اور مزاج کی ناسازی کا سلسلہ چل رہا تھا۔ ناچیز راقم سطور نے زیارت اور عیادت ہی کی نیت سے تھانہ بھون کا سفر کیا بریلی سے سہارن پور پہونچا وہاں سے تھانہ بھون جانے والی چھوٹی لائن کی ٹرین کے ایک ڈبہ میں سوار ہوگیا۔ اتفاق سے اسی ڈبے میں دو صاحب اور بھی تھے۔ جو حضرتؒ کی زیارت ہی کے لیے جا رہے تھے ان میں ایک صاحب بجنور کے کسی کالج یا اسکول کے استاد تھے جن کو میں نے اس سے پہلے بھی کئی بار تھانہ بھون میں دیکھا تھا ——— وہ حضرت حکیم الامت سے بیعت تھے اور خاص درجہ کا تعلق رکھنے والوں میں سے تھے۔ افسوس ہے اس وقت مجھے ان کا نام یاد نہیں آیا ——— دوسرے صاحب جو ان کی رفاقت میں جا رہے تھے غالباً سیوہارا ضلع بجنور کے ایک مولوی صاحب تھے یہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ تھے اور آج پہلی ہی دفعہ حضرتؒ کی زیارت کے لیے تھانہ بھون جا رہے تھے۔ حضرتؒ کے جلالی مزاج کے بارے میں جو عام شہرت ہمارے حلقہ میں بھی تھی،

یہ مولانا صاحب اس کی وجہ سے بہت خائف تھے اور ان کے رفیق ان کو بتلا رہے ہیں کہ یہ شہرت بالکل غلط ہے حضرت کے مزاج میں بڑی شفقت ہے۔ ہاں بے اصولیوں اور بے عنوانیوں سے حضرت کو تکلیف و ناگواری ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے کبھی مزاج میں برہمی بھی آجاتی ہے وہ ان کو بتلا رہے تھے کہ آپ بس ان چند باتوں کا لحاظ رکھیں ۔۔۔

مجھے چوں کہ ہمیشہ حضرت کی عنایتوں اور شفقتوں ہی کا تجربہ ہوا تھا اور اپنے بارہ میں یہ بھی خوش گمانی تھی کہ حضرت کے مزاج کو میں نے سمجھ لیا ہے، اس لیے خواہ مخواہ میں بھی ان مولوی صاحب کا اتالیق بن گیا۔ اور حضرت کی عنایتوں، شفقتوں کے تجربے ان کو سنا سنا کر مطمئن کرنے لگا۔ اور حضرت کے کسی بڑے مزاج داں صحبت یافتہ کی طرح ان کو مشورے بھی دینے لگا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد تھانہ بھون پہونچ کر اپنی حقیقت معلوم ہو گئی۔

ظہر کی نماز جماعت سے خانقاہ میں پڑھی اس سے پہلے حضرت سے ملاقات نہیں ہو سکی حضرت جب نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے اپنی نشست گاہ کی طرف جانے لگے تو ابھی حضرت صحن مسجد ہی میں تھے اور سخت ضعف ونقاہت کی وجہ سے حضرت کے قدم بہت ہی آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے کہ مجھ سے یہ بے تمیزی سرزد ہو گئی کہ بجائے اس کے کہ اس کا انتظار کرتا کہ حضرت اپنی نشست گاہ پر پہونچ کر اطمینان سے بیٹھ جائیں فرط شوق سے راستہ ہی میں حضرت کے سامنے آکر سلام عرض کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیے حضرت نے ٹھہر کر مصافحہ تو فرما لیا لیکن ساتھ ہی بڑے مظلومانہ انداز سے فرمایا۔

بیمار پہ تو رحم کھانا چاہیئے

حضرت کے ان الفاظ سے اس وقت دل کی جو کیفیت ہوئی اور اپنی بے تمیزی کے احساس سے قلب پر جو بوجھ پڑا اس کو لفظوں میں ادا نہیں کیا جا سکتا ــــ بہر حال میں اپنی غلطی کے احساس اور اس سے پیدا ہونے والے تاثر میں ڈوب گیا حضرت خانقاہ کی سہ دری میں اپنی نشست گاہ پر جا کر تشریف فرما ہو گئے، دوسرے سب لوگ بھی مجلس کے معمول کے مطابق بیٹھ گئے۔ میں پیچھے اس طرح بیٹھا کہ حضرت کی نظر نہ پڑے۔ حضرت نے حاضرین پر نظر ڈالی اور میرا نام لے کر فرمایا کہ "میرا خیال ہے کہ وہ سے" میں نے عرض کیا حضرت میں حاضر ہوں حضرت نے بڑی شفقت اور عنایت کے ساتھ قریب بلایا اور بالکل برابر میں بیٹھنے کے لیے حکم فرمایا" مجھے تعمیل کرنی پڑی لیکن جیسا کہ چاہیے تھا۔ ادب سے غالباً

دو زانو بیٹھا حضرت نے فرمایا بے تکلف آرام سے بیٹھیے۔ اس طرح سے مجھے انشراح ہوگا۔ میں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔ لیکن اپنی غلطی اور بے تمیزی کا بے حد اثر تھا۔ حضرتؒ نے غالباً اس کے ازالہ ہی کے لیے اس دن کی مجلس میں اس نالائق پر بہت ہی غیر معمولی عنایت مبذول فرمائی۔

جب عصر کی اذان پر مجلس ختم ہوئی تو قیام کے بارے میں دریافت فرمایا۔ میں نے عرض کیا آج رہوں گا کل واپسی کا ارادہ ہے ___ فرمایا کہ آجکل میں بیماری اور ضعف کی وجہ سے صرف ظہر اور عصر کی نمازیں یہاں (خانقاہ کی مسجد میں) پڑھتا ہوں۔ مغرب، عشاء اور فجر کی نمازیں نہیں پڑھتا۔ اگر طبیعت اچھی رہی تو میں مغرب کے بعد آپ کو اطلاع کر دوں گا۔ آپ کا جی چاہے تو اس وقت گھر پر ہی آجائیں۔

مجھ جیسے بے مایہ اور ذلیل آدمی پر عنایت و شفقت کی یہ آخری حد تھی ___ ورنہ جہاں تک معلوم ہے بہت ہی خاص استثنائی صورتوں کے علاوہ حضرتؒ کا یہ معمول بالکل نہیں تھا۔

میں نے مغرب کی نماز خانقاہ کی مسجد میں پڑھی جب نوافل سے فارغ ہوا تو مولانا جمیل احمد تھانوی تشریف لائے اور مجھ سے فرمایا کہ حضرتؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری طبیعت اس وقت اچھی ہے اگر آپ کا جی چاہے تو میرے پاس آجائیں ___ میں حاضر ہوگیا۔

حضرتؒ ایک تخت پر تشریف فرما تھے۔ اس کے بالکل برابر میں پلنگ تھا، جو تخت سے تقریباً ایک بالشت اونچا رہا ہوگا۔ سرہانے ایک بڑا سا تکیہ بھی لگا ہوا تھا۔ میں حاضر ہوا تو حضرتؒ نے مجھے اس پلنگ ہی پر بیٹھنے کی لیے ارشاد فرمایا۔ مجھے یہ بات اپنے لیے کچھ خلاف ادب معلوم ہوئی کہ میں حضرت سے بلند جگہ پر بیٹھوں اس لیے مجھے کچھ تامل ہوا۔ حضرت نے محسوس فرمالیا اور پھر پلنگ ہی پر بیٹھنے کے لیے فرمایا، مجبوراً تعمیل کی۔ تقریباً ایک گھنٹہ یہ حاضری نصیب رہی طبیعت کی ناسازی اور سخت ضعف و نقاہت کے باوجود ارشادات کا سلسلہ مسلسل جاری رہا۔

اس زمانے میں میرا حافظہ ایسا تھا کہ اگر دو چار دن کے بعد بھی اس صحبت کے ملفوظات قلمبند کرنے کی کوشش کرتا تو بڑی حد تک حضرت ہی کے الفاظ میں قلم بند کر لیتا لیکن افسوس اُس وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ کچھ مدت کے بعد حافظہ میں اتنا فرق پڑ جائے گا۔

اس مجلس اور اس صحبت کا ایک ملفوظ ابتک بھی اچھی طرح یاد ہے لیکن اب روایت بالمعنی ہی ہوگی۔ سلسلہ کلام میں اپنی اصول و اوقات کی پابندی کی عادت کے بارے میں فرمایا کہ بعض

مقتضیات دوستوں کو اس سے شکایت پیدا ہوتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ میں دوسروں کی رعایت نہیں کرتا حالانکہ میں اپنے نزدیک رعایت کی پوری کوشش کرتا ہوں۔ ہاں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اپنے اصول و اوقات کی بھی حتی الوسع پابندی کروں۔ اس سے کام میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ بیان فرمایا کہ ایک دفعہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ جو میرے استاد تھے تشریف لائے میرے ہی یہاں قیام تھا۔ میں ان دنوں میں (مثنوی شریف کی شرح) "کلید مثنوی" لکھ رہا تھا اور اس کا ایک وقت مقرر کر لیا تھا۔ لکھنے کی جگہ بھی مقرر تھی جب اس کے لکھنے کا وقت آیا۔ تو میرے دل میں اس کا تقاضہ پیدا ہونے لگا، پہلے تو میں نے سوچا کہ آج ناغہ کر دوں پھر خیال ہوا کہ دل ادھر لگا رہے گا اور اس کا وقت گذر جانے کے بعد بھی دل پر ناغہ کا اثر رہے گا اور جیسی یکسوئی اور فراغ قلب کے ساتھ حضرت کی خدمت میں بیٹھنا چاہیے وہ بات نصیب نہ ہوگی تو میں نے طے کیا کہ حضرت مولانا سے اپنا حال عرض کر دوں، پھر جو فرما دیں اس پر عمل کروں۔ چنانچہ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ میں مثنوی شریف کی شرح لکھ رہا ہوں اور اس کے لیے یہ وقت مقرر کر لیا ہے عادت کے مطابق موقعہ بھی ہے اس کا تقاضا ہے۔ لیکن اس کے لیے بھی دل آمادہ نہیں کہ حضرت یہاں تشریف فرما ہوں اور میں کسی کام کے لیے الگ جا بیٹھ جاؤں۔ حضرت نے فرمایا کہ اس وقت جا کر ضرور لکھو اس کے بعد میں نے سوچا کہ جتنی دیر میں غیر حاضر رہوں گا اتنے وقت میں حضرت کو کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے جو کچھ سمجھ میں آیا اس کا میں نے انتظام کیا پھر ایک عزیز کو جو میرے نزدیک فہیم بھی تھے سب سمجھایا اور ان سے کہا کہ میری واپسی تک وہ حضرت کی خدمت میں رہیں، اس کے بعد میں کلید مثنوی لکھنے چلا گیا لیکن اس دن صرف ایک شعر کی شرح لکھی اس سے آگے لکھنے کے لیے خود دل آمادہ نہیں ہوا اور جلدی ہی حضرت کی خدمت میں آ گیا۔ حضرت نے دریافت فرمایا کہ اتنی جلدی کیوں آ گئے۔ میں نے عرض کیا کہ بس ایک شعر کی شرح لکھ کر دل کا تقاضا ختم ہو گیا۔ اس کے آگے لکھنے کے لیے دل ہی نہ چاہا اس لیے چلا آیا۔

اسی سلسلۂ کلام میں اس سیہ کار کے بارے میں ایک بات ایسی ارشاد فرمائی جس کا مصداق میں اپنے کو کسی طرح نہیں پاتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے خاص کرم سے حضرت کی زبان کی برکت سے وہ چیز نصیب فرما دے وما ھو علیہ بعزیز —"

اس دفعہ کی حاضری میں حضرت قدس سرہٗ کی جو خاص اخلاص اور غیر معمولی عنایات نصیب ہوئیں، میرا خیال ہے کہ سب اس کا طفیل تھا کہ مجھ سے ایک بے تمیزی سرزد ہوئی جس پر حضرت نے یہ فرما کر کہ ـــ بیمار پر زور جسم کھانا چاہیے۔ مصلحانہ تنبیہ فرمائی جس سے مجھے اپنی غلطی اور بے تمیزی کا شدید احساس ہوا۔ اور میں اس احساس و تاثر میں ڈوب گیا۔ حضرت نے اس کے ازالہ کیلئے اور میری تطییب خاطر کے لیے یہ غیر معمولی عنایتیں فرمائیں اس طرح اپنی ایک غلطی اور بے تمیزی بھی اتنے عظیم خیر کا وسیلہ بن گئی۔

واقعہ یہ ہے کہ کریمانہ اخلاق تو بس ان اللہ والوں ہی کا حصہ ہے اللہ تعالیٰ تخلقوا باخلاق اللہ کی نعمت کا کوئی حصہ اس سیہ کار کو بھی نصیب فرمائے۔

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Kutchery Road Lucknow U. P.

VOL. 41 NO. 9 OCTOBER, 73 Phone No. 25547

41 January 74